DUE DATE

Cl. No. ______________ *Acc No.* ______________

Late Fine Ordinary Books **25 Paise** per day. Text Book **Re 1/-** per day Over Night Book **Re. 1**/- per day.


نشاء
10/-


اعلیٰ درجے کی ساریوں کا تازہ ترین اسٹاک
● فینسی پاٹولا ● پیور سلک ● بالوچری
● کانتھا اسٹیچ ● کورا سلک ● کنجی ورم
● گودوال ● سائوتھ سلک ● راجکوٹ سلک
● گھرچولا ● پانیڑ ● جامیوار
● پرنٹیڈ کریپ ● پرنٹیڈ شیفون ● شیاموئے ساٹن
● بنی کریپ ٹیسیل کے ساتھ ● گیریجا سلک
● گوری سلک اور بنارسی کے دیگر اسٹاک
NAURATANS
SAREE EMPORIUM
نورتنس ساری ایمپوریم
ایورسٹ ہاؤس
۴۶سی ، چورنگی روڈ، کلکتہ-۷۱ ۷۰۰۰۰ ● فون۔ ۲۲۶۲-۲۴۲


سب سے زیادہ فروخت ہونے والا
اے۔آر۔چاند تارا مارکہ گل
ہمیشہ استعمال کیجیے
Phone : 660 4527
Gram : "SPECIALGUL" (HOW)
Mfd. By: HAJI. A. RAHIM KHAN & SONS
132, G.T. ROAD, (SOUTH), SHIBPUR, HOWRAH-711102
P.O. BOX NO. "97" (HOW)
Branch : THERPAKHNA, H.B. ROAD, RANCHI-834007
Phones : 25997, 26352

انشاء

ISSN 0971-6009

جلد ۱۱ | عید نمبر مطابق جنوری فروری ۱۹۹۶ء | شمارہ ۱-۲

فہرست

مدیر

ف۔ س۔ اعجاز

فی شمارہ ۸ روپے

زرسالانہ ۹۰ روپے

مغربی ممالک سے

۱۲ پونڈ یا ۲۰ امریکی ڈالر

قیمت عید نمبر ۱۰ روپے

منتظم

ثاقب فیروز

رقومات بذریعہ منی آرڈر، بینک ڈرافٹ، چیک صرف INSHA PUBLICATIONS کے نام میں روانہ فرمائیں ورنہ قابل قبول نہ ہوگی۔ برطانیہ سے (BPO) کے ذریعہ رقومات بھیجی جائیں۔

ماہنامہ "انشاء" انشاء پبلی کیشنز

خط و کتابت، مضامین بھیجنے کا اور ترسیل زر کا پتہ ۲۵ بی۔ زکریا اسٹریٹ۔ کلکتہ ۷۳ - فون ۲۶۱۶-۴۶-۲۵

عید مبارک

نعت

کنول سیال کوٹی (کلکتہ)

بے تابیٔ غم کا یہ مرے دل پہ اثر ہو
اے رحمتِ کونین عنایت کی نظر ہو

ممکن ہی نہیں کفر کا ایماں پہ اثر ہو
جب جلوۂ محبوبِ خدا پیشِ نظر ہو

اس شخص کی تقدیر کو سب کیوں نہ سراہیں
طیبہ میں بسر جس کی ہر اک شام و سحر ہو

پھیلا ہے اجالا یہ محمد ہی کے دم سے
ہو چشمِ بصیرت تو حقیقت پہ نظر ہو

مشکل نہیں پہچان بھی باطل و حق کی
اللہ کا قرآں اگر پیشِ نظر ہو

وابستہ ہیں تجھ سے رسول اے دامانِ رحمت
دنیا کی خبر ہو کہ نہ ہو تیری خبر ہو

آ جائیں نظر سارے اللہ کے جلوے
اک شرط مگر یہ ہے کہ مومن کی نظر ہو

یہ میرے ربّ سے کنول کی بھی حسرت
سرکار کی چوکھٹ پہ مری عمر بسر ہو

مظہر عظیم آبادی

نعت پاک

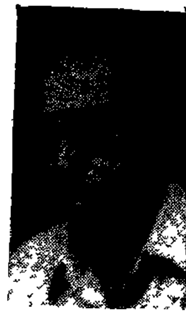
دل میں ضیائے عشق محمد اگر نہ ہو
سورج نکل بھی جائے تو اپنی سحر نہ ہو

خیر البشر کے سائے میں آجائے زندگی
یہ آرزو اگر ہے تو پریشاں بشر نہ ہو

لب پر ابھی ہمارے درود و سلام ہے
اے زندگی ٹھہر ابھی زیر و زبر نہ ہو

آباد ہو نہ پائیں زمانے کی بستیاں
دنیا میں ایک شہر مدینہ اگر نہ ہو

بعد از درود حق سے دعاء مانگتا ہوں میں
مظہر مری دعاء میں بھلا کیوں اثر نہ ہو



عید کی نظمیں

رزاق افسر
۳۹۱۳ بزم اردو
حیدر علی روڈ ۔ لشکر محلہ
میسور ۵۷۰۰۰۷

(۱)

کیا ہلال عید دیکھا
رات آنکھوں میں کٹی ہے
کیونکہ صبح عید کی تیاریوں میں
قد سے اونچی قیمتوں میں
کچھ کمی ممکن نہیں
ہاں اضافہ ہے یقینی
اور مجھے حاصل نہیں ہے دست غیب

(۲)

ہر طرف چرچے ہلالِ عید کے
ایسی افراط خوشی میں
شہر کی سڑکوں پہ سنتا جا رہا ہوں
" عید کی خیرات بابا "
" عید کی خیرات بابا " کی صدائیں
چل رہا ہے ساتھ میرے اک سوال
عید کیوں سب کے لئے آتی نہیں ؟

(۳)

عید کی آمد سے میری
جیب ساری ڈھل گئی ہے
کچھ کمی لگتی ہے پھر بھی
اہتمام عید میں

(۴)

مجھے پتہ ہے
کہ عید کے مسکراتے دامن پر
میری مجبور آنکھوں سے
برستے ہوئے آنسو
ستارے نہیں بن سکتے
پر یہ خوشی کیا کم ہے
کہ عید میرے ہاں سے
خالی ہاتھ نہیں لوٹی

(۵)

رویت ہلال کے
روشن لمحوں
اور عید کی بہار آفریں
رواں دواں خوشیوں میں
اگر میں تمہیں یاد آؤں
اور اس گھڑی درمیاں کے فاصلے
تمہاری آنکھوں سے چھلک پڑیں
تو سمجھ لینا
کہ عید نے
مجھے بھی گلے لگایا ہے
اگر ایسا نہ ہو سکا
تو سیدھی سی بات ہے
کہ عید کی خوشیاں
مجھ سے کوسوں دور ہیں

(۶)

اے میرے دوست
مجھے پتہ ہے
کہ میرا نامہ عید
تمہارے خلوص کا
بدل نہیں ہو سکتا
لیکن اسی مجبوری کا
کیا کیا جائے
اس کے سوا
کوئی چارہ بھی نہیں
یہی وہ تار عنکبوت ہے
جو درمیاں کے فاصلوں کے
تانے بانے جوڑ کر
ہماری فکر و نظر کو
سرور عید کی مے پلاتا ہے
ذرا سوچو تو سہی
اگر یہ وسیلہ بھی
اپنے بس میں نہ ہوتا
تو درمیاں کے فاصلے
کتنے محکم بن جاتے

نور جمالی
کلن شاہ تکیہ
بھدوہی - وارانسی - ۲۲۱۴۰۱

جشن عیدالفطر

پھر ہوا سامان لطف و انبساط
عید ہے گویا کہ فصل کردگار
سبزہ و گل کیا چمن ہی کھل اٹھا
ہے نظر میں صورتی کافی بہار

یہ سماں، یہ رنگ، یہ کیف و سرور
دے رہا ہے دل کو پیغام نشاط
سارا عالم نور میں ڈوبا ہوا
انبساط و انبساط و انبساط

عید گہ کی سمت کس انداز سے
جا رہا ہے قافلہ در قافلہ
اب صدا کے ماننے والے ہیں یہ
دیکھو اے دنیا طریق مصطفےٰ

وہ اٹھی اللہ اکبر کی صدا
ہو گئی قائم قطار اندر قطار
سر کئی جھک گئے پیش صدا
اس ادا پر آگیا رحمت کو پیار

اللہ اللہ ماہ کی یہ ارتباط
آج کا دن کس قدر ہے خوشگوار
اب تو دل کو ہو گیا کامل یقیں
جشن عیدالفطر ہے جشن بہار

نجیب رامش
3/28 روی شنکر نگر، بھوپال

ہلال عید

ہلال عید ہمیں مسکرا کے دیکھو ذرا

کہ ہم نے اپنی انا کا غرور توڑ دیا
نظر کو حرص و ہوس کی خطا پہ ٹوکا ہے
کچل دیا ہے ہر اک وسوسے کے پیکر کو
خیال و فکر کی بہکی ندی کو روکا ہے

کنارہ کش ہے لذت کی ہر طلب سے حواس
عروس کا کرب سہا، پھول کی بقا کے لئے
لہو میں جیتے وحشی کی سرزنش کی ہے
بدن پہ صبر کیا روح کی جلا کے لئے

یہ جسم مائل و سرکش بھی مگر اس کو
اصول صبر و اطاعت سکھا کے آئے ہیں
کنویں میں گھل سا گیا تھا جو خواہشات کا زہر
ہم اس کے واسطے تریاق ڈھونڈ لائے ہیں

ہلال عید ہمیں مسکرا کے دیکھو ذرا

کہ اب ہمیں کوئی موہوم سی خوشی مل جائے
بس ایک لمحہ کو حالات جگمگانے لگیں
جبیں پہ لاکھ چراغوں کی لو کا عکس پڑے
بدن ستار کی مانند تھرتھرانے لگیں

بس ایک خواب سی بن جائے شور کی دنیا
لہو میں چاند اتر آئے لب چمک اٹھیں
کہیں جو چھیڑتے ہوئے رنگ پائیں، رنگ جائیں
کہیں جو گرم سی خوشبو ملے مہک اٹھیں

کرن کا جسم چھوئیں موج کی ردا اوڑھیں
طلوع سحر پہ اکسائے سانس کی جھنکار
ہلال عید! ہمیں مسکرا کے دیکھ ذرا
کہ سب پہ ناچ اٹھیں سارے ان کہے اشعار

انیس احمد خاں انیس
ایڈوکیٹ سپریم کورٹ - نئی دہلی

نعت

کوئی چھپ کر عبادت کر رہا ہے
خدا غار حرا میں جھانکتا ہے

کلام اللہ کا ثابت ہے قرآں
کہ امی کی زباں سے بولتا ہے

خدا خود روبرو ملتا ہے اس سے
کبھی جبریل کو وہ بھیجتا ہے

اسی نے جوڑا ہے ٹوٹے دلوں کو
اسی نے چاند کو شق کر دیا ہے

وہی امی ہے استاد زمانہ
ہر اک استاد اس سے پڑھ رہا ہے

پسینہ سوکھنے سے پہلے اجرت
ادا مزدور کی وہ کر رہا ہے

انیس اسلام کی تاریخ ہے وہ
وہی اسلام کا جغرافیہ ہے

روزے کی عمدگی

تحریر بنت الاسلام

روزے سے پورا فائدہ حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ روزہ رکھتے ہوئے ان تمام اصول و قواعد کا دھیان رکھا جائے جو اس کی عمدگی کی ضمانت ہیں۔ جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت کی روشنی میں پتہ چلتا ہے کہ روزے کو بہترین شکل میں رکھنے کے لیے مندرجہ ذیل امور کی طرف توجہ نہایت ضروری ہے۔

۱۔ روزے کے دوران گناہوں سے بچنے کی ہر ممکن کوشش کرنا۔

۲۔ روزہ رکھ کر زیادہ سے زیادہ نیکیاں کرنے کی سعی کرنا۔

۳۔ سحری اور افطار کے معاملے میں شرعی احکام کا دھیان رکھنا وغیرہ۔

۱۔ گناہوں سے پرہیز حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے جھوٹ بولنا اور جھوٹ پر عمل کرنا ہی چھوڑا تو خدا کو اس بات کی حاجت نہیں کہ وہ اپنا کھانا پینا چھوڑ دے۔ (بخاری)

یہ حدیث پاک واضح کر رہی ہے کہ روزہ رکھ کر اپنے اعضاء و جوارح کو گناہ سے بچانا بھی ضروری ہے، ورنہ اس روزے کی حیثیت فاقے ہی کی ہوگی جس کی خدا کو کوئی حاجت نہیں۔ روزے کے مقاصد میں سے ایک بڑا مقصد یہی ہے کہ انسان کا نفس برائیوں سے پاک ہو اور وہ نیک اعمال اختیار کرے۔ اب جو شخص روزہ رکھ کر بھی اپنے آپ کو گناہوں سے نہیں بچاتا وہ روزے کے ایک بہت بڑے مقصد کو ختم کر دیتا ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ روزہ (عذاب الہیٰ کے لیے) ڈھال ہے (یعنی اس کے ذریعے عذاب الہیٰ سے بچاؤ ہوتا ہے) پس روزہ دار کو چاہیے کہ نہ فحش بات کہے، نہ جہالت کرے اور اگر کوئی شخص اس سے لڑے یا اسے گالی دے تو وہ دو مرتبہ کہہ دے کہ میں روزہ دار ہوں (بخاری)

"میں روزہ دار ہوں"۔ یعنی چونکہ میں نے روزہ رکھا ہوا ہے، اس لیے میں تمہاری جہالت کا جواب جہالت سے نہیں دے سکتا۔ اس لیے تم میرے ساتھ جہالت سے مت پیش آؤ۔

اب جو شخص پورے انتیس یا تیس دن اپنی زبان اور دوسرے اعضاء کو گناہوں سے بچانے کی کوشش جاری رکھے گا، اسے انشاء اللہ گناہوں سے بچنے کی مشق ہو جائے گی اور اس طرح ہر سال کی یہ تربیت اسے اس قابل بنا دی جائے گی کہ باقی گیارہ مہینوں میں بھی وہ پاک زندگی گزار سکے۔ اور اسی مقصد کے لیے اسے یہ مشق کرائی جاتی ہے۔

یہاں یہ وضاحت کر دینا ضروری ہے کہ رمضان کے دوران گناہوں سے بچنے کی خاص ہدایت سے یہ مراد نہیں کہ باقی گیارہ مہینوں میں ان کی چھٹی دے دی گئی ہے۔ بلکہ رمضان کے دوران کی خاص ہدایات سے مراد یہی ہے کہ اس مبارک مہینے میں پرہیزگاری کی خصوصی مشق کی جائے تاکہ انسان کو پرہیزگار رہنے کی عادت ہو جائے اور وہ باقی گیارہ مہینوں میں بھی پرہیزگاری کی زندگی گزارے۔

سید علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ اپنی تصنیف "کشف المحجوب" میں روزے کے دوران کی احتیاطوں کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں

"پس روزے کی فرضیت ایک ماہ کے لیے ہے اور یہ حکم ہر بالغ و عاقل مسلمان پر عائد ہوتا ہے جو صحت مند اور مقیم ہے اور اس ایک ماہ کی ابتدا ماہ رمضان کا نیا چاند دیکھنے سے ہوتی ہے، یعنی ماہ شعبان ختم ہوتے ہی اور روزہ رکھنے کے لیے اور بھی متعدد شرائط ہیں۔ مثلاً یہ کہ پیٹ کو کھانے

اور پیٹ سے روکو تو چاہیے کہ آنکھ کو نظارۂ محرم اور نظر شہوت سے بچائے رکھو اور اسی طرح کان کو لغو باتوں کے سننے اور چغلی خوروں کی خرافات سے محفوظ رکھو ۔ زبان کو بیہودہ گوئی اور فضول بکواس سے بچائے رہو اور تن کو دنیا کی غلامی اور شریعت کی خلاف ورزی سے محفوظ رکھو ۔ روزہ تو درحقیقت اسی صورت میں صحیح ہوگا ۔ کیونکہ خود پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جب تو روزہ رکھے تو تیری آنکھ ، کان اور زبان کا بھی روزہ ہونا چاہیے ۔ یہ فرمایا ہے کہ بہت سے روزہ دار ایسے ہوتے ہیں جنہیں بھوک اور پیاس کے سوا روزے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا" ۔

روزے کے دوران جن امور کی ممانعت ہے ان میں بعض تو ایسے ہیں جو فی نفسہ جائز ہیں ۔ صرف روزے کے دوران ان کی اجازت نہیں ۔ مثلاً کھانا پینا وغیرہ ۔ اور بعض ایسے ہیں جو روزے میں بھی منع ہیں اور فی نفسہ بھی ناجائز ہیں مثلاً جھوٹ ، غیبت ، دنگا فساد اور دوسرے گناہ ۔ اب یہ عجیب بات ہے کہ ہم لوگ روزہ رکھ کر ان امور سے تو بچتے ہیں جو فی نفسہ جائز ہیں مگر روزے میں ممنوع ہیں اور ان امور سے بچنے کی کچھ ضرورت محسوس نہیں کرتے جو روزے میں منع ہونے کے علاوہ فی نفسہ بھی گناہ ہیں ۔

سید علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ "کشف المحجوب" میں روزے کے دوران میں اپنے تمام حواس کو قابو میں رکھنے کی نصیحت فرماتے ہیں ۔ جو کچھ آپ نے فرمایا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو پانچ حواس دیئے ہیں ۔ دیکھنا ، سننا ، چکھنا ، سونگھنا اور چھونا ۔ روزہ دار کے لیے ضروری ہے کہ روزے کے دوران ان پانچوں حواس کو خدا کے احکام کے تابع رکھے ۔ یعنی

اسی شے کو دیکھے جسے دیکھنے کی خدا کی طرف سے اجازت ہے ،
اسی بات کو سنے جسے سننا شریعت اسلامی میں حلال ہے ،
اسی چیز کو سونگھے جسے سونگھنے کو خدا نے جائز قرار دیا ہے ،
اسی شے کو چھوئے جسے چھونے سے خدا کی ناراضی حاصل نہ ہوتی ہو ،
اور چکھنے کے معاملے میں بھی اسی حد پر قائم رہے جو اللہ تعالیٰ نے مقرر کر دی ہے ۔

عبادات کا معاملہ ہو یا دوسرے نیک اعمال کا ایک خاص ہدایت جو خدائے بزرگ و برتر اور اس کے مکرم رسولؐ کی طرف سے دی گئی ہے ، یہ ہے کہ ریا اور دکھاوے سے پرہیز کیا جائے ۔ یہی احتیاط روزے کے معاملے میں بھی ملحوظ رکھنا ضروری ہے ۔ ویسے صورت تو یہ ہے کہ روزے کا نظام فی الحقیقت ایسا ہے کہ اس میں ریا کی گنجائش ہی نہیں ۔ کیونکہ اگر کوئی شخص کسی کے سامنے کچھ نہ کھائے مگر تنہائی میں جا کر کھا پی لے تو کسی کو کیسے پتہ چل سکتا ہے کہ اس نے روزہ رکھا ہے یا نہیں ۔ اب جو شخص کسی کے سامنے بھی نہیں کھاتا اور تنہائی میں بھی اس پابندی کو قائم رکھتا ہے ۔ ظاہر ہے کہ وہ خدا ہی کے لیے روزہ رکھ رہا ہے ۔ تاہم اس بات کی گنجائش پھر بھی موجود ہے کہ انسان روزہ رکھ کر اپنے روزے کا اشتہار دیتا پھرے یا بار بار روزے کی تکلیف کا ذکر کرتا رہے اور اس طرح اپنے روزے کے حسن کو خراب کرے اس لیے روزے جیسے "ریا سے بالا" عمل کے لیے بھی اس احتیاط کی طرف توجہ دلانے کی ضرورت ہے کہ اسے دکھاوے کا ذریعہ نہ بنایا جائے ۔

بلاشبہ سارا دن بھوکے پیاسے رہنے کے باعث جسم کمزوری بھی محسوس کرے گا اور بھوک پیاس بھی ستائے گی ، مگر ایک سچے مومن سے یہی توقع رکھی جاتی ہے کہ وہ ان تکالیف کو صبر ، حوصلے اور وقار کے ساتھ برداشت کرے ۔ نہ زبان سے کسی تکلیف کا اظہار کرے اور نہ خواہ مخواہ نڈھال ہو کر دکھائے بلکہ خوش و خرم رہے اور حتی الامکان کوشش کرے کہ تر و تازہ دکھائی دے ۔ چہرے کی کیفیات بہت حد تک دل کی کیفیات کا پرتو ہوتی ہیں ۔ اگر روزہ دار روزے کی تکالیف سہتے ہوئے مسرور و مطمئن ہوگا کہ الحمدللہ ، راہ خدا میں تکالیف سہنے کی سعادت حاصل ہو رہی ہے ، انشاء اللہ اس کا چہرہ تھکن ، سستی اور کمزوری کے اثرات سے بہت حد تک خالی رہے گا ۔

موسم گرما کے لمبے لمبے دنوں کے دوران پیاس کی تکلیف کو تصور میں لائیے اور پھر سوچیے کہ جو انسان یہ سب تکلیف سہہ کر پھر دکھاوے کا شکار ہونے کے باعث اپنے روزے کے حسن کو خراب کر لیتا ہے ، وہ کتنے خسارے کا سودا کرتا ہے ۔

ماہنامہ استقامت، کلکتہ

اللہ رب العالمین فرماتا ہے کہ "روزہ میرے لیے ہے اور میں ہی اس کا بدلہ دوں گا"۔ اس لیے جو روزہ دار اپنے روزے سے پورا فائدہ اٹھانے کا خواہشمند ہو، اس کے لیے ضروری ہے کہ اپنے روزے کو ہر چھوٹی بڑی آفت سے، بچاکر صرف "خدا کے لیے" رکھے تاکہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے اسے وہ اجر عطا فرمائے جس کی اس نے کوئی حد بندی بھی نہیں فرمائی، یعنی بے حساب اجر!

۲۔ روزے کے دوران نیکی کی طرف خصوصی توجہ دینا۔ حضرت سلمان فارسیؓ بیان کرتے ہیں کہ شعبان کی آخری تاریخ کو رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو ایک خطبہ دیا۔ اس میں آپؐ نے فرمایا کہ

اے لوگو! تم پر ایک عظمت اور برکت والا مہینہ سایہ فگن ہو رہا ہے، اس مہینے میں ایک رات ایسی ہے (یعنی شب قدر) جو ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس مہینے کے روزے فرض قرار دیئے ہیں اور اس کی راتوں میں (بارگاہ خداوندی میں) کھڑے ہو کر عبادت کرنے کو نفل عبادت مقرر کیا ہے۔ جو شخص اس مہینے میں خدا کی رضا اور قرب حاصل کرنے کے لیے کوئی (ایسا) بھلائی کا کام کرے گا (جسے نفل کی حیثیت حاصل ہوگی) تو اسے اتنا ثواب ملے گا جتنا دوسرے دنوں میں کوئی فرض کام کرنے سے ملتا ہے اور جس نے اس مہینے میں کوئی فرض ادا کیا تو اسے اتنا ثواب ملے گا جتنا دوسرے دنوں میں ستر فرض ادا کرنے سے ملتا ہے اور یہ صبر کا مہینہ ہے اور صبر کا ثواب جنت ہے اور یہ باہمی ہمدردی اور غم خواری کا مہینہ ہے، اور یہ وہ مہینہ ہے جس میں مومن کا رزق بڑھایا جاتا ہے۔ جس نے اس مہینے میں کسی روزہ دار کو روزہ افطار کروایا تو ایسا کرنا اس کے لیے اس کے گناہوں کی بخشش کا اور اس کی گردن کے دوزخ سے نجات پاجانے کا ذریعہ بن جائے گا اور اس کو اتنا ہی اجر ملے گا جتنا اس روزہ دار کو، بغیر اس کے کہ روزہ دار کے اجر میں سے کچھ کم کیا جائے۔ (اس پر) ہم نے عرض کیا کہ اے خدا کے رسولؐ، ہم سب کے پاس تو وہ سامان موجود نہیں ہوتا جس سے ہم روزہ دار کا روزہ افطار کروائیں۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ ثواب خدا اس کو بھی عطا فرمادے گا جو دودھ کی لسی کے ایک گھونٹ پر یا پانی کے ایک گھونٹ پر ہی کسی روزہ دار کا روزہ افطار کروادے۔ اور جس نے روزہ دار کو سیر کیا اسے اللہ میرے حوض (حوض کوثر) سے ایسا سیراب کرے گا کہ اس کے بعد اسے پیاس نہیں لگے گی یہاں تک کہ وہ جنت میں پہنچ جائے گا۔

اور (حضورؐ نے فرمایا کہ) رمضان ایک ایسا مہینہ ہے جس کا ابتدائی حصہ رحمت ہے اور درمیانی حصہ بخشش ہے اور آخری حصہ دوزخ سے آزادی ہے اور جس نے رمضان میں اپنے غلام سے کام کا بوجھ کم کردیا، اللہ اسے بخش دے گا اور آتشِ دوزخ سے رہائی عطا کرے گا (شعب الایمان للبیہقی)

اس حدیث میں حضورؐ نے واضح فرمادیا ہے کہ جو نیکی رمضان کے دوران میں کی جائے اس کا اجر اس نیکی کی نسبت جو سال کے دوسرے دنوں میں کی جائے بہت زیادہ ہوتا ہے۔ اب جس شخص کے دل میں دینی اور دنیوی خیر و برکت حاصل کرنے کی سچی چاہت ہوگی وہ تو اس موقع کو انتہائی غنیمت سمجھے گا کہ تھوڑی مشقت کرکے اپنے لیے زیادہ بھلائی سمیٹ لے۔ جب اسے قلبی یقین ہوگا کہ اس مبارک مہینے میں تھوڑی سی محنت کرکے میں جتنا اجر حاصل کرلوں گا اسے غیر رمضان میں ستر گنا محنت کرکے حاصل کر سکوں گا تو پھر وہ کیوں اس نادر موقع سے فائدہ اٹھانے کی سعی نہ کرے گا اور اس کا روزہ رکھ کر نیکیوں اور بھلائیوں کے لیے سعی کرنا اس کے روزے کو حسن اور عمدگی بخشے گا۔ حضورؐ کے اپنے طرز عمل سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ رمضان کے دوران حضورؐ خاص طور پر عبادت و ریاضت اور نیکیوں اور بھلائیوں کی طرف بہت زیادہ توجہ فرمانے لگتے تھے۔

حضرت ابن عباسؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم خیر کی بخشش اور مخلوقِ خدا کو نفع پہنچانے میں اللہ کے سب بندوں سے فائق تھے، اور رمضان المبارک میں آپؐ کی یہ کریمانہ صفت اور زیادہ ترقی کر جاتی تھی۔ رمضان کی ہر رات کو جبرئیل آپؐ سے ملتے تھے اور رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم انہیں قرآن سناتے تھے۔ پس جب حضرت جبرئیل آپؐ سے ملتے تو

آپ کی اس کریمانہ نفع رسانی اور خیر کی بخشش میں خدا کی بھیجی ہوئی ہواؤں سے بھی زیادہ تیزی آجاتی تھی۔ (بخاری)

لہٰذا ہر وہ روزہ دار جو اپنے روزے سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کا خواہشمند ہو، اس کے لیے ضروری ہے کہ روزہ رکھ کر اپنے وسائل و ذرائع کے لحاظ سے زیادہ سے زیادہ نیکی کرنے کی کوشش کرے۔ نیکیوں کی ایک قسم تو یہ ہے کہ خالق کا ذکر اور عبادت کی جائے اور دوسری یہ ہے کہ مخلوق کو نفع پہنچانے کی کوشش جاری رہے۔ قرآن پاک کی تلاوت کرنا، نماز تراویح ادا کرنا۔ اس کے علاوہ کلمات ذکر، کلمہ شریف اور درود شریف وغیرہ کا ورد رکھنا، غریبوں کی مالی امداد کرنا، بیماروں کی تیمارداری کرنا، لوگوں کو درس و تدریس یا زبانی گفتگو کے ذریعے ہدایت کی راہ دکھانا، ضرورت مندوں کے کام کر دینا، حاجت مندوں کی حاجتیں پوری کرنا، نیکی اور بھلائی کے کاموں میں شرکت کرنا، مجالسِ خیر میں جاکر شامل ہونا، گھر کے ملازموں کے کاموں میں کمی کر دینا یا کام کرنے میں ان کی امداد کرنا۔ اہل خانہ کو زیادہ آرام پہنچانے کی کوشش کرنا۔ یہ سب وہ نیکی کے کام ہیں جو اپنے ساتھ بے پناہ اجر لاتے ہیں۔

ایک نیک بخت خاتون سے جو اب اللہ کو پیاری ہو چکی ہیں، ایسا یہ طریقہ سنایا ہوا تھا کہ جیسے ہی رمضان شروع ہوتا وہ اہل محلہ میں سے تنگ دست عورتوں کے کپڑے سینا شروع کر دیتیں۔ اپنے اوپر ذمہ داریاں اتنی تھیں کہ ان کے لیے خود کپڑا خرید نا ممکن نہیں تھا۔ اس لیے کپڑے تو غریب عورتیں خود ہی لیتیں مگر سلائی یہ خاتون کر دیتیں۔ غریب طبقے کی عورتوں کے پاس عموماً نہ تو سینے کی مشینیں ہوتی ہیں اور نہ انہیں کپڑے سینے آتے ہیں اس لیے کپڑے سلانے ہوں تو انہیں دوہرا بوجھ پڑتا ہے کہ ایک تو کپڑا خریدنے پر پیسے صرف کریں اور پھر سلائی کی رقمیں دے کر انہیں سلائیں۔ ان کا یہ بوجھ یہ نیک بی بی بٹا لیتیں اور ان کی سلائی کے پیسے بچ جاتے تو اس سے غریب عورتیں بے انتہا خوش ہوتیں اور بڑے چاؤ سے اپنے اور اپنے خاوندوں اور بچوں کے لیے عید کے کپڑے سلواتیں۔ ان خاتون کا یہ طرز عمل کہ وہ رمضان کے دوران غریب گھرانوں کے کپڑے سیتی رہتیں، محلے کے غریب گھروں میں خوشی اور مسرت کی ایک لہر دوڑا دیا کرتا تھا۔ جب وہ ان لوگوں کے کپڑے سی رہی ہوتیں تو جن عورتوں کے کپڑے سل رہے ہوتے، وہ اور ان کے بچے کمال خوشی سے ان کے پاس بیٹھ کر اپنے کپڑے سلتے دیکھتے رہتے اور ساتھ ساتھ یہ تبصرہ کرتے رہتے کہ یہ کپڑا تو وہ آخری جمعے کے دن پہنیں گے اور یہ عید کے دن زیب تن کریں گے۔ اس طرح سارا رمضان وہ غریب محلے داروں کی خوشیوں کا ذریعہ بنی رہتیں اور ان کی قلبی دعائیں اور محبتیں سمیٹتی رہتیں۔

اسی مثال پر قیاس کر کے اور بے شمار ایسے طریقے سوچے جاسکتے ہیں جن سے کام لے کر انسان رمضان کے دوران نیکیاں سمیٹ سکتا ہے۔ ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ اپنے اپنے وسائل و ذرائع کی مناسبت سے اپنے لیے ایسی نیکیاں چن لے جو اسے رمضان کے دوران میں زیادہ سے زیادہ خیر و برکت دلا سکیں۔ اہل ثروت حاجت مندوں کی امداد کی طرف دھیان دیں اور جو تنگ دست ہوں مگر علم دین رکھتے ہوں اور لکھنا بولنا جانتے ہوں وہ لوگوں کو ہدایت دینے کی طرف توجہ کریں اور جن کے پاس یہ بھی نہ ہو مگر ہوں تندرست، وہ حاجتمندوں کے جسمانی کام کر کے ہی نیکیاں سمیٹنے کی سعی کریں۔ غرضیکہ ہر شخص اپنی مخصوص صلاحیتوں اور اپنے وسائل سے کام لے کر زیادہ سے زیادہ بھلائی کے لیے کوشش کرے اور تلاوت قرآن پاک، تراویح اور عبادت و ریاضت تو غریب امیر سبھی کے کرنے کے کام ہیں۔ پھر اپنے آپ کا محاسبہ کرتے رہنا اور یہ کوشش کرنا کہ ہم رمضان کے دوران اپنی عادات کی زیادہ سے زیادہ اصلاح کریں، یہ بھی ایک ایسی مصروفیت ہے جو روزہ دار کی توجہ چاہتی ہے اور اس میں پیسے کی کمی یا زیادتی کا بھی کوئی دخل نہیں۔ خوش حال کو بھی اپنی اصلاح کی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی تنگدست کو، اور غریب بھی عموماً تزکیہ نفس کا اتنا ہی محتاج ہوتا ہے جتنا امیر۔ اس سلسلے میں یہاں ایک خاتون کے طریق کار کو پیش کیا جاتا ہے۔ اس خیال سے کہ شاید یہ کسی اور کے لیے بھی مفید ثابت ہو۔

ان کا کہنا ہے کہ رمضان کے دوران میں میں آئندہ آنے والے پورے سال کا پروگرام طے کرتی ہوں۔ رمضان کے آخری عشرے میں پہلے تو بار بار خدا سے دعا کرتی ہوں کہ وہ میری رہنمائی کرے اور پھر عموماً ستائیسویں کی رات کو ذکر و دعا کر کے غور و فکر میں مصروف ہو جاتی ہیں کہ اس سال رمضان سے پہلے پہلے مجھے کیا کیا کام کرنے ہیں۔ عام گھرداری کے کاموں سے لے کر ذاتی مطالعہ اور تبلیغی سرگرمیوں تک تمام اقسام کے

کاموں کا ایک نقشہ مرتب کر لیتی ہوں ۔ اس نقشے میں پہلے تو یہ ہوتا ہے کہ پورے سال میں کون کون سے کام کس حد تک کرنے ہیں، مثلاً۔

پورے سال میں کلام پاک کتنی دفعہ ختم کرنا ہے ۔

سارے سال میں حدیث کا علم کہاں تک حاصل کرنا ہے ۔

کتنی کتب کا مطالعہ کرنا ہے ۔

تبلیغ دین کے سلسلے میں کیا کیا کام کرنے ہیں مثلاً اجتماعات کتنے کیے جائیں ۔ مضامین وغیرہ کتنے لکھے جائیں، ملاقاتیں کتنی کی جائیں ۔

تزکیہ نفس کے سلسلے میں اپنی کس کس خاص خامی کو دور کرنا ہے ۔ گھر کی ضروری اشیاء میں سے کون کون سی چیز اس سال کے دوران بنانی ہے ۔ مثلاً بستر یا گھر کا دوسرا ضروری سامان ۔

بچوں کی تربیت اور تعلیم کے سلسلے میں کن چند خاص مقاصد کو حاصل کرنا ہے ۔ وغیرہ وغیرہ ۔

اس کے بعد پھر یہ طے ہوتا ہے کہ ان میں سے کون کون سے کام روزانہ کیے جانے والے ہیں، کون کون سے ہفتہ وار اور کون کون سے ماہوار، اور پھر ان کا ٹائم ٹیبل بنا لیتی ہوں اور کوشش کرتی ہوں کہ روزمرہ اور ہفتہ وار اور ماہوار کام اس ٹائم ٹیبل کے مطابق ہوں ۔

انہوں نے یہ بھی بتایا کہ اگر میں یہ کہوں کہ جو پروگرام میں طے کر لیتی ہوں اور جو ٹائم ٹیبل بنا لیتی ہوں، ٹھیک اسی کے مطابق پورا سال گزرتا ہے تو یہ غلط ہوگا ۔ کیونکہ حالات میں چھوٹی موٹی تبدیلی آئے دن آتی ہی رہتی ہے اور اس کے مطابق میں اپنے ٹائم ٹیبل میں جزئی تبدیلیاں کرتی رہتی ہوں اور بعض اوقات بیماری، سستی، گھریلو کاموں کی زیادتی یا کسی ناگہانی حادثے کے باعث میں کئی کئی ہفتے اپنے طے شدہ پروگرام اور ٹائم ٹیبل کے مطابق کام نہیں کر سکتی ۔ تاہم ستائیسویں کی رات کو جو پروگرام اور ٹائم ٹیبل میں اپنے آئندہ سال کے لیے بناتی ہوں، اللہ کی خصوصی رحمت اور فضل و کرم کے باعث وہ مجھے بے پناہ فائدہ دیتا ہے اور جب سے یہ کام شروع کیا ہے میری قوت کار بھی آگے سے بہت بڑھ گئی ہے ۔ کاموں میں نظم ضبط بھی نسبتاً زیادہ پیدا ہو گیا ہے اور کام بھی بہ حیثیت مجموعی پہلے سے بہت زیادہ ہو جاتا ہے ۔

انہوں نے یہ بھی کہا کہ میرا ایمان ہے کہ اس کی اصل وجہ میرا بنایا ہوا پروگرام اور ٹائم ٹیبل نہیں بلکہ یہ مبارک مہینہ، یہ مبارک رات اور دعائیں ہیں جو میں اپنے سال بھر کے کاموں کا خاکہ تیار کرنے سے پہلے بھی اور بعد میں بھی کرتی ہوں !

یہ بات یہاں صرف اس لیے بیان کی گئی ہے کہ بسا اوقات ایک انسان کے تجربات یا سوچ دوسرے بے شمار انسانوں کو سوچ کی نئی نئی راہیں سجھا دیتی ہے ۔ ہمارا ایمان ہے کہ سال کا یہ مہینہ بہت زیادہ بابرکت اور عظمت والا ہے ۔ ہماری یہ تمنا ہونی چاہیے کہ اس سے جتنی زیادہ برکت حاصل کر سکیں، کر لیں ۔ انسان اپنے نفع کے معاملے میں حریص واقع ہوا ہے اور اسے اپنے نفع کے لیے حریص ہی ہونا چاہیے ۔ اس کی اس "حرص" کا اچھا یا برا ہونا اور اس کا اللہ کے حضور پسندیدہ یا ناپسندیدہ ہونا منحصر ہے اس بات پر کہ وہ کس شئے کو "نفع" سمجھتا ہے ۔ کیا اسی عارضی دنیا کے عارضی اور حقیر مال و دولت اور ساز و سامان اور عہدہ و جاہ کو ؟ یا اس ہمیشہ رہنے والی زندگی کے دائمی سکھ آرام، سکون و آرام اور عزت و مرتبہ کو ؟ جن کی حرص اول الذکر کے لیے ہے، ان کی حرص کمینی اور احمقانہ ہے اور اللہ تعالیٰ اس حرص کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور اہل دنیا میں سے بھی دانشمند اسے قابلِ نفرین ہی سمجھتے ہیں اور جن کی حرص آخر الذکر کے لیے ہے، ان کی حرص سیر چشمی اور دانائی پر مبنی ہے اور خالق و مخلوق دونوں اس حرص کو قابلِ احترام سمجھتے ہیں ۔

سحری و افطار کے اصول رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے سحری اور افطار کے بارے میں خصوصی ہدایات دی ہوئی ہیں ۔ جن کا خلاصہ یہ ہے سحری ضرور کھائی جائے اور افطار ٹھیک وقت پر کر لیا جائے، خواہ مخواہ دیر نہ لگائی جائے ۔

حضرت انسؓ بن مالک بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سحری کھاؤ کیونکہ سحری کھانے میں برکت ہے ۔ (بخاری)

حضرت عمرو بن العاص بیان کرتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہمارے اور اہلِ کتاب کے روزوں میں صرف سحری کے

فرق ہے۔ (مسلم)

یعنی اہل کتاب سحری نہیں کھاتے اور ہم سحری کھاتے ہیں۔ سحری کی برکت واضح ہے کہ جو شخص سحری کھاکر روزہ رکھے گا وہ روزے کو بہتر طور پر برداشت کرے گا بہ نسبت اس شخص کے جو سحری نہیں کھائے گا۔

اس کے علاوہ سحری کی اپنی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ اس سے انسان کو نیند توڑ کر اٹھنے اور روزے کا اہتمام کرنے کی مشق ہوتی ہے اور اس طرح سستی اور کسل پر قابو حاصل ہوتا ہے۔ بعض لوگوں کو اس طرح پچھلے پہر نیند چھوڑ کر اٹھنا مشکل معلوم ہوتا ہے کہ وہ رات کے پہلے پہر ہی روزے کی نیت کر لیتے ہیں اور بغیر سحری کھائے روزہ رکھ لیتے ہیں، حالانکہ یہ طریقہ اتنا پسندیدہ نہیں جتنا پسندیدہ یہ طریقہ ہے کہ حضورؐ کے فرمان کے مطابق سحری کے وقت سحری کھاکر روزہ رکھا جائے۔ اب یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ جس نے سحری نہیں کھائی اس کا روزہ نہیں ہوا، تاہم یہ ضرور ہے کہ حضورؐ کی ہدایات کے مطابق روزہ رکھنا زیادہ عمدہ اور زیادہ پسندیدہ روزہ ہوتا ہے۔

سحری کی طرح افطار کے بارے میں بھی ہدایت دی گئی ہیں کہ غروب آفتاب کے ساتھ ہی افطار کر لیا جائے۔

حضرت سہلؓ بن سعد بیان کرتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لوگ ہمیشہ بھلائی پر رہیں گے جب تک کہ افطار جلدی کرتے رہیں گے (مسلم)

ظاہر ہے کہ جلدی سے یہ تو مراد نہیں کہ ابھی سورج موجود ہی ہو اور روزہ دار روزہ افطار کر لے بلکہ جلدی یہ ہے کہ جیسے ہی سورج غروب ہو روزہ کھول لیا جائے اور خواہ مخواہ دیر نہ کی جائے۔ اس سلسلے میں حضورؐ کی ایک اور حدیث بھی ہے۔

حضرت ابن ابی اوفیٰ بیان کرتے ہیں کہ ہم ایک سفر میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے۔ آپؐ نے ایک شخص سے فرمایا کہ اترو اور میرے لیے ستو گھول (تاکہ میں روزہ افطار کروں) اس شخص نے عرض کیا یا رسول اللہؐ، (ابھی تو) سورج (باقی معلوم ہوتا ہے) آپؐ نے (دوبارہ) فرمایا کہ اترو اور میرے لیے ستو گھول۔ اس شخص نے (پھر) عرض کیا کہ یا رسولؐ اللہ (ابھی) سورج (باقی معلوم ہوتا ہے) آپؐ نے (تیسری دفعہ) فرمایا کہ اترو اور میرے لیے ستو گھول۔ اس پر وہ شخص اترا اور اس نے آپؐ کے لیے ستو گھولے اور آپ نے پی لیے اور پھر اپنے ہاتھ سے اس طرف اشارہ کیا اور فرمایا کہ جب تم رات کو دیکھو کہ اس طرف بڑھ آئی ہے تو سمجھ لو کہ روزہ دار کے روزہ افطار کرنے کا وقت ہو گیا۔ (بخاری)

ابن ابی داؤد میں بیان ہوا ہے کہ حضورؐ روزہ افطار کرتے وقت یہ دعا پڑھا کرتے تھے۔

اللهم لک صمت و علی رزقک افطرت

(اے خدا میں نے تیرے ہی لیے روزہ رکھا اور تیرے ہی دیئے ہوئے رزق سے افطار کرتا ہوں)

کتب احادیث سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ حضورؐ کھجور یا پھر پانی سے روزہ افطار کرنا پسند فرماتے تھے۔

حضرت سلمان بن عامر سے بیان کرتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی روزہ افطار کرے تو اسے چاہیے کہ کھجور سے افطار کرے اور اگر کھجور نہ ملے تو پانی سے افطار کرے کیونکہ پانی انتہائی پاک ہے۔ (ترمذی)

روزے کی عمدگی کے بارے میں جو کچھ بیان ہوا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ روزہ صرف خاص خاص خواہشات کو پورا نہ کرنے کا نام ہی نہیں بلکہ روزے کے دوران ان تمام ناپسندیدہ اور ناجائز امور سے خصوصی طور پر پرہیز لازمی ہے جنہیں خدا تعالیٰ نے "گناہ" قرار دیا ہے۔ لہٰذا روزہ رکھ کر جھوٹ، بدزبانی، غیبت، چغلی، بعض رنجی، طعن و تشنیع، دنگا فساد، دھوکا فریب، ریاکاری، بددیانتی، بدعملی وغیرہ تمام اعمال بد سے بچنا ضروری ہے اور روزہ سحری کھاکر رکھا جائے اور غروب آفتاب کے ساتھ ہی کھول لیا جائے اور اس نیت سے رکھا جائے کہ خدا کے احکام کی اطاعت کرکے اس سے اجر حاصل کرنا ہے

ماہنامہ ھتاء کلکتہ

ڈاکٹر اظہار مسرت یزدانی
Behind BMH Dispensary
Nagore - 341001

جشن امید

پھر نئے سال کو سینے سے لگائیں آؤ
آج امید کا ہم جشن منائیں پھر سے

ایسی امید کہ جو پچھلے کئی سالوں سے
قلب و احساس میں آوارہ پھرا کرتی ہے
ایک جھلسے ہوئے صحرا کے بگولے کی طرح

ایک امید جسے روٹی کا ٹکڑا کہئیے ا
ہاں وہی روٹی کہ جو روز ازل سے اب تک
نسل آدم کے لئے باعثِ تذلیل رہی
جس کے ارمان میں فردوس بدر ہوکر بھی
کسی انساں کو آسانی سے روٹی نہ ملی
آج تک نائبِ اللہ کی تسکین نہ ہوئی

ایک امید جسے کہئیے بدن کی پوشاک
ہاں وہ پوشاک کہ جو دشت نصیبوں کے لیے
شہر تہذیب میں بسنے کی ضمانت ٹھہری
جس کا ہر دور کی قدروں پہ اثر ہوتا ہے
وقت کے ساتھ بدلتے ہیں تقاضے جس کے
جس کی محرومی میں ہر سال ہزاروں انسان
عزم انسان کی سرحد سے گزر جاتے ہیں
ٹھنڈ کا سامنا ہوتا ہے تو مرجاتے ہیں

ایک امید جو افلاس کے ماروں کے لیے
پھوس کے گھر کے تصور سے نہیں ہے بڑھ کر
وہ تصور جو کبھی پیکر معنی نہ بنا
ہائے وہ لوگ جنہیں سایہ میسر نہ ہوا
زیر افلاک ہی پلتے ہیں مکینِ فٹ پاتھ
ہیں عمارات کے معمار رہینِ فٹ پاتھ

ایک امید جسے قومی محبت کہیے
وہ محبت جو محرک تھی غلامی کے دنوں
ایک مرکز پہ ہر اک فرد کو لے آئی تھی
وہ مسلمان تھا ہندو تھا کہ سکھ عیسائی
ایک ہی صف میں ہر اک شخص کھڑا تھا یارو
جنگ آزادی کی مل جل کے لڑا تھا یارو

کتنا نایاب تصور ہے وہ حب قومی
ہے جو تاریخ کا اب ایک سنہری صفحہ
یافقط ذکر بزرگوں کی زباں پر جس کا
اب جو لگتا ہے ہمیں صرف کہانی جیسا

آج روٹی ہے نہ کپڑا ہے نہ گھر ہے نہ خلوص
آج انساں کے لئے زیست کا سرمایہ ہے
چند مجبور خیالات کا بے ربط ہجوم

ایسے مجبور خیالات کا جمگھٹ لے کر
اتنے مخدوش سوالات سے بوجھل ہوکر
آج امید دبے پاؤں چلی آئی ہے
یاس کے گھر میں نئے سال کی دلھن بن کر

ایسی دلھن کہ یقیں کا کوئی دولھا شاید
اس کی پھوٹی ہوئی تقدیر میں لکھا ہی نہیں

یاس و حرماں کی تصویر بنی ہے امید ا
ناامیدی کے مقابل میں کھڑی ہے امید ا
تھی جو گزرے ہوئے برسوں میں وہی ہے امید ا
پھر بھی محسوس یہ ہوتا ہے نئی ہے امید ا

ایسی امید کا پھر جشن منائیں آؤ
پھر نئے سال کو سینے سے لگائیں آؤ



مقبول فدا حسین کی نئی پوسٹر حقیقت

یہ ہندوستان ہے۔ یہاں آج کل فن اتنا آزاد ہے کہ منہ اندھیرے ہی بنا پائل گھنگھرو بج اٹھتے ہیں۔ چنانچہ ایک دن ہندوستان کے مایہ ناز مصور مقبول فدا حسین، جو اپنی برہنہ پائی کے لئے بھی مشہور ہو چکے ہیں، نے اپنی عمر کے ۸۰ ویں سال میں نامور ہندی فلم اداکارہ مدھوری دکشت کو فلم "ہم آپ کے ہیں کون" میں دیکھ کر اپنے ننگے تلووں میں انوکھی کھجلاہٹ محسوس کی۔ مدھوری کے رقص دیکھنے کے لئے اس مصور نے "ہم آپ کے ہیں کون" بار بار دیکھی۔ مدھوری کی مدھر مدھر مسکان انگ انگ کی تھرک اور نرت کے بھاؤ نے فدا حسین کو مسحور کر ڈالا۔ مصور خیال ور خیال ڈبکیاں لینے لگا۔ جس پینٹر نے اولاً گھوڑے کے کوٹھوں کے حسن اور چستی کو اپنی مصوری کی شناخت بنایا تھا اور اسے نسائی دلفریبی اور جنسی کشش کی بہترین تمثال قرار دیا تھا یک بہ یک اس نے اخفاپسندی کو خیرباد کہہ دیا اور ہر قسم کے تکلف کو بالائے طاق رکھ کر اپنے چتر میں صنف نازک کے لئے وضاحتی رویے کا پرستار بن گیا۔ حالت یہاں تک پہنچی کہ اس وقت وہ اپنے فن مندر میں چاروں طرف اپنے ہاتھوں سے بنائی ہوئی مدھوری دکشت کی تصاویر کا بازار سجائے بیٹھا ہے۔

تبدیلیاں ناگزیر ہیں۔ مشاہدات و محسوسات کا تنوع اور تغیر فن کار کو نئی تجربیت سے روشناس کراتا ہے۔ فنی شبیہ گری کے لئے مصور میں ایک خاص قسم کی جمالیاتی جذباتیت کا موجود ہونا بہت ضروری ہے۔ جذباتی اور عقلی عناصر ایک دوسرے سے جدا نہیں کئے جاسکتے۔ اس کے برعکس یہ ایک دوسرے میں پیوست یا باہم رشتہ ہو کر فنی ضرورتوں کو پورا کرتے ہیں۔ احساس خیال کا محرک ہوتا ہے اور فکر کا اظہار جذبے کے ذریعہ ہی ممکن ہے۔ جب ہم ایک تصویر کو دیکھتے ہیں جو کسی مصور کے عمل کا نتیجہ ہوتی ہے تو نہ صرف ہم مصور کے احساس کے خلوص اور ہیئت کے حسن کو پرکھتے ہیں بلکہ اس رویے کو بھی کسوٹی پر کستے ہیں جسے مصور نے اپنے موضوع یا معروض کے لئے اپنایا ہوتا ہے۔ اس فنی رویے کو غالب کے اس شعر کی مدد سے بخوبی سمجھا جاسکتا ہے۔

شوق ہر رنگ رقیب سر و ساماں نکلا
قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا

غالب نے واقعی کتنی سچی بات کہی ہے کہ شوق ہر رنگ میں بے سروسامانی کا سبب بنتا آیا ہے۔ چنانچہ قیس کی مجنونیت ایک مثال بن چکی ہے اور اس کی بے سروسامانی کو جو اس کے شوق سے برآمد ہوئی فنکاروں نے قابل ستائش قرار دیا۔ مصور اپنا موقلم اپنے خون دل میں ڈبو کر عریاں قیس کا حلیہ اپنی پینٹنگ میں بناتا ہے اور یہ دکھانے کی کوشش کرتا ہے کہ وہ نقالی کے عمل میں کتنی مہارت حاصل کر چکا ہے۔

مقبول فدا حسین کے آرٹ کے بارے میں کوئی جامع تبصرہ کرنا ہمارے بس کی بات نہیں۔ یہ کام تو مصوری کا کوئی ناقد ہی انجام دے سکتا ہے لیکن موصوف اپنی پینٹنگز کے علاوہ دیگر اوصاف کے لئے بھی مشہور ہیں۔ جن میں ان کے افکار، خوش گفتاری، مذاق شعر و سخن اور فنی ایثار سے سوا ہوتی ہوئی ان کی تجارتیت کا ذکر آتا ہے۔ آخرالذکر وصف ایک آرٹسٹ کو عافیت کوش یا لالچی بنادیتا ہے۔ اور جوہر حیات و کائنات کو اس کی تخلیق میں داخل ہونے سے روکتا ہے۔ تخلیق کو خالص جذباتیت، سنسنی خیزی یا جنسی تلذذ پیدا کرنے کی غایت تک محدود کر دیا جائے تو شبیہہ کے ذریعہ اجاگر ہونے والی فکر اپنے معنی کھو بیٹھتی ہے اور اس آرٹ کو ایک فوری تصور کا نتیجہ قرار دینے کے سوا چارہ نہیں رہ جاتا۔ ایسا ہو سکتا ہے کہ ایک مصور زندگی سے کشید کی ہوئی سچائیوں کو ٹھیک اسی طرح پیش کرے جس طرح وہ واقع ہوئی ہوں یا ایک اداکار اسٹیج پر ایسا برتاؤ کرے جیسا کہ وہ عملی زندگی میں کرتا ہے لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ اس اداکار کی تخلیق کردہ امیج پرکشش ثابت نہ ہو یا حقیقت سے عاری ہو۔ اس کے برعکس کوئی آرٹسٹ ان پریوں کی داستان تحریر کر سکتا ہے جن کا حقیقت میں کوئی وجود نہیں ہوتا لیکن داستان میں اس کے گڑھے ہوئے کردار کھرے اور اصلیت سے قریب معلوم ہوتے ہوں۔ اس لحاظ سے یہ فیصلہ کرنا دشوار نظر آتا ہے کہ فدا حسین نے پچھلے برسوں میں فن کو تجارتی بنایا ہے یا تجارت کو فن میں تبدیل کرنے میں

کامیابی حاصل کی ہے۔ دنیا پہلے سے زیادہ آرٹ کی دلدادہ ہو گئی ہے۔ ایک آراستہ ڈرائنگ روم میں ہزاروں روپے کی پینٹنگز دیوار کی زینت بنائی جاتی ہیں۔ فدا حسین عالمی آرٹ منڈی میں پکاسو اور اس قبیل کے دیگر مصوروں کی تصاویر کی بڑھتی ہوئی مانگ اور چڑھتی ہوئی قیمتوں سے بہت متاثر ہیں۔ حالیہ عرصہ میں انہوں نے اپنے فن کو رنگ ساز کمپنیوں اور ٹکسٹائل ملوں کے لئے نفع بخش بنایا ہے۔ ان کے لئے پبلسٹی کا حربہ بن کر فدا حسین نے فن کو ایک تماشا بنا ڈالا ہے۔ وہ شخصیتیں جو اپنی محبوبیت کی بنا پر عوام کے دلوں میں پہلے سے گھر چکی ہوں فدا حسین ان پر ریجھنے میں دیر نہیں لگاتے۔ اندرا گاندھی، ستیہ جیت رے، مدر ٹریسا کے نام گنوائے جاسکتے ہیں۔ ہندو دیومالا کی دیویوں اور دیوتاؤں کے چتر بھی کلکتہ میں فدا حسین نے بنا کر اپنی شہرت کو چار چاند لگائے۔ اور اب دلی اور لندن میں مدھوری دکشت ایسی مقبول ہیروئن کی سیریز پیش کرکے ایکبار پھر انہوں نے یہی بات ثابت کی ہے۔ اور ظاہر کیا ہے کہ وہ ۸۰ سال کی عمر میں کسی فنی تحریک کے ہاتھوں نقصان جھیلنے کی بجائے اپنے دل کی (یا مدھوری کے دل کی) "دھک دھک" کو سننے میں زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں۔ لندن میں ان کی بنائی ہوئی مدھوری کی ایک تصویر ۱۲ لاکھ روپے میں نیلام ہو گئی۔ حسین کا دعویٰ ہے کہ مدھوری نسائیت کا مظہر ہے۔ چاہے وہ میکا کا سوانگ رچائے یا موہنی اور رادھا کا۔ حسین کو مدھوری کے گلیمر میں ہندوستانی کلچر کا نچوڑ نظر آتا ہے۔ ان کی نظر میں مدھوری ہندوستانی رقص کا ایک نیا اسلوب تراش رہی ہے۔ ہندوستانی نرت کے بھاؤ میں وہ فدا حسین کو لاجواب نظر آتی ہے۔ مدھوری کی شکل میں انہیں ایک بڑی اداکارہ مل گئی ہے جو ان کے تخیل کو بلندی پر لے اڑی ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ ہندوستان میں اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ ہندوستانی کلچر سے اپنا ناتہ توڑ چکا ہے۔ آج کالی داس کا کوئی نام لیوا باقی نہیں رہ گیا۔ نئی دہلی میں مدھوری سیریز کی نمائش گاہ میں حسین سے ایک لڑکی نے آٹو گراف مانگتے ہوئے سوال کیا کہ انہوں نے مدھوری کے رقص کے پوز، اس کے بدن کے خطوط اور زاویے اور اس کے کاسٹیوم اپنی تصاویر میں منتقل کئے لیکن اس کا چہرہ کیوں نہیں بنایا تو حسین نے جواب دیا ہمیشہ چہرہ ہی اہم نہیں ہوتا، بدن کی زبان کہیں زیادہ اہم ہوتی ہے۔ چنانچہ مقبول فدا حسین کو مدھوری کی نقش بدن اور اس کے حرکات رقص میں اس کا پیٹ، اس کی ناف اس کے چہرے سے زیادہ پر فریب معلوم ہوتے ہیں۔ مدھوری کو حسین نے ایک جینئیس قرار دیا ہے اور کہا ہے "بمبئی کی فلم انڈسٹری صرف اس کا گلیمر پیش کرتی ہے جب کہ میں نے اپنی تصاویر میں اس کے گلیمر سے صرف نظر کرنے کی کوشش کی ہے میں چاہتا ہوں کہ عوام اسے ہندوستانی نسائیت کی علامت کے طور پر قبول کریں۔ عورت میرا پسندیدہ موضوع ہے۔ وہ شکتی ہے"

مقبول فدا حسین کو عورت میں خاص دلچسپی ہے۔ یہ کوئی انوکھی بات نہیں ہے۔ مرد کو عورت میں دلچسپی ہو سکتی ہے اور ایک گلیمر زدہ فنکار کے تو کیا کہنے! بڑھتی ہوئی عمر میں کئی مردوں کی حس زیادہ تیز ہو جاتی ہے۔ لب چومنے تک دلچسپی کا اظہار تو نیلسن منڈیلا بھی کرتے رہتے ہیں۔ ایک بار اداکارہ شبانہ اعظمی کو بھی اچھی خاصی بیک بائٹی سے نواز چکے ہیں۔ لیکن "ہم آپ کے ہیں کون" کی ہیروئن حسن کے ڈریسیز کی نقالی پورے ہندوستان میں لڑکیاں اور عورتیں کرتی پھر رہی ہیں، گو ناظرین نے اس اونچی حیثیت کے لائق نہیں سمجھا جو حسین اسے دلوانے پر مصر ہیں۔ مدھوری دکشت (ہی) کو ہندوستانی نسائیت کا پیکر یا مظہر ثابت کرنے کی کوشش عجیب ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ حسین کے دماغ میں ہندوستانی نسائیت کا تصور کیا ہے اور جو تصور عورت کا ان کے دماغ میں ہے کیا ضروری ہے وہی ہندوستان کی اکثریت کا بھی ہو۔ آرٹ کے ذریعہ ایک عورت سے دلبستگی کا اظہار آرٹسٹ کی ذہنی و جنسی کیفیت تو بیان کر سکتا ہے لیکن آرٹ کی قدر و قیمت پر کوئی حتمی فیصلہ دینا بہرحال اس روپے کے ذریعہ ممکن نظر نہیں آتا۔ اس کے برعکس آرٹسٹ کی تاجرانہ سرشت کا پتہ اس سے چلتا ہے۔

اگرچہ حسین کی "مدھوری سیریز" سے ہونے والی آمدنی کا بٹوارہ حسین اور مدھوری دونوں میں ہو رہا ہے تاہم ہندوستان میں جنس لطیف ایک بازاری استعارہ نہیں بن سکی۔ فدا حسین نے شہوانیت اور جمالیات میں ایک تمیز بہرحال باقی رکھنے کی کوشش کی ہے۔ جس کے لئے وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ ان کی تمنا کا دوسرا "نقش قدم" کہاں پڑتا ہے، یہ دیکھنا ابھی باقی ہے۔ اس کے لئے ان کی اگلی "پوسٹر حقیقت" کا انتظار کیا جائے۔

تلاش خر

لطیف رشیدی
Safety Sec
OFC
Shahjahanpur – 242001

طغراخاں کا شمار شہر کے پرانے کتب فروشوں میں ہوتا تھا ۔

عام طور سے دیکھا گیا ہے کہ کتب فروش عالم و فاضل اور حلوائی مٹھائی خور نہیں ہوتے ۔ کتب فروشوں پر ہی کیا موقوف ہے کسی کتابوں کے رکھوالے جسے عرف عام میں لائبریرین کہتے ہیں کو بدھی جیوی ہوتے نہیں سنا گیا حالانکہ وہ کتابوں کے درمیان اس طرح گھرا رہتا ہے جیسے مردہ اپنی قبر میں ۔ جس طرح وقت کا زمانے وار تھپیڑ آدمی کو قبر میں پہنچا دیتا ہے اسی طرح وہ کسی کو لائبریرین اور کسی کو چپراسی بنا دیتا ہے ۔

لیکن طغرا خاں کا معاملہ ان لوگوں سے قدرے مختلف ہے ۔ وہ بیک وقت کتب فروش بھی تھے ، عالم و فاضل بھی اور گھڑی ساز بھی ۔ فالتو وقت پرانی گھڑیوں کو ٹھیک کرنے میں لگاتے اور اس طرح گھڑی گھڑی کا حساب رکھتے تھے ۔

آج بھی طغرا خاں کو لوگ یاد کرتے ہیں تو ان کی شکل و شباہت کے ساتھ ان کی گھڑیاں بھی ذہن کے پردے پر چمک اٹھتی ہیں ۔ بھاری بھرکم جسم ، ناک پر گاندھی جی والا چشمہ ، منہ میں بنارسی پان ، سفید کرتا پاجامہ اور سر پر اونچی باڑھ کی سیاہ ٹوپی سب کو یکجا کر دیجئے تو طغرا خاں کی صورت بنتی ہے ۔ ان کا قدیم طرز کا ڈرائنگ روم کتابوں اور گھڑیوں سے بھرا ہوا تھا ۔ دیواروں پر مختلف قسم کے گھڑیاں گھنٹے آویزاں رہتے تھے ۔ میز پر ٹائم پیس قسم کی اور قدیم جیبی گھڑیاں بجی رہتی تھیں ۔ اور اس پر طرہ یہ کہ ہر گھڑی میں مختلف ٹائم ۔ ہندوستان کے علاوہ دنیا کے بڑے شہروں کا لوکل وقت بتانے والی گھڑیاں وہاں موجود تھیں ۔ ذرا ذرا دیر بعد ڈرائنگ روم کسی وال کلاک یا کسی الام گھڑی کی کھنک سے گونج اٹھتا تھا ۔ اس ڈرائنگ روم میں بیٹھا ہوا شخص خود کو کسی میوزیم میں بیٹھا ہوا محسوس کرتا تھا ۔ سینکڑوں گھڑیوں کے درمیان ہوتے ہوئے بھی وہ وقت کا صحیح اندازہ کرنے سے قاصر تھا

گھڑیوں کے علاوہ جدھر نظر پڑ جاتی کتابیں ہی کتابیں نظر آتیں ، نئی کتابیں ، کرم خوردہ کتابیں ، پانی میں بھیگی ہوئی ، سڑی گلی اور آگ میں جلی ہوئی ، ہر طرح کی کتابیں وہاں موجود تھیں ۔ پرانے رسائل جن کے سرورق دھندلے پڑ چکے تھے ، پرانے اخباروں کے ڈھیر ، غرض یہ کہ ہر رنگ ، شکل و ہئیت کی کتابیں ، رسالے اور اخبار وہاں موجود تھے ۔

مخاطب کو طغرا خاں ان کتابوں اور گھڑیوں کی لائف ہسٹری کے بارے میں بتاتے ۔ "فلاں کتاب جو میز پر رکھی ہے ، میں نے ایک ردی فروش سے صرف دو روپے میں خریدی تھی ۔ اس کا پہلا اور آخری ایڈیشن ۱۸۶۸ء میں چھپا تھا ۔ اب اس کتاب کے صرف دو نسخے رہ گئے ہیں ۔ ایک خدا بخش لائبریری پٹنہ میں اور دوسرا اس کمترین کے پاس ۔ اور وہ کتاب جو بیضوی میز پر رکھی ہے ، جس کے اوراق کچھ جلے ہوئے ہیں ، ایک بھڑبھونجے کے یہاں سے دستیاب ہوئی تھی ۔ ارے میاں وہ تو اسے بھاڑ میں جھونکنے جا رہا تھا کہ میں نے دیکھ لیا ۔ یہ دیوان حافظ کا مصور نسخہ ہے کسی اعلیٰ ایرانی کے ہاتھ کا لکھا ہوا جس کی نظیر انڈیا آفس لائبریری لندن میں بھی نہیں ملے گی ۔ "

"ارے وہ وال کلاک جو صوفے کے اوپر ٹنگا ہے شہنشاہ جارج پنجم کے زمانے میں سویڈن کے ایک مشہور گھڑی ساز نے تیار کیا تھا۔ اس وقت سے لے کر آج تک بند نہیں ہوا۔ اور وہ چھوٹی سی زنانہ گھڑی جو میں نے شیشے کی الماری میں رکھی ہے، نپولین نے اپنی محبوبہ کو تحفے میں دی تھی۔ اور وہ گھڑی جس میں لکڑی کے دو مرغے ہیں عرب کاریگروں کی ایجاد ہے۔ یہ مرغ ہر گھنٹہ گزرنے کے بعد بانگ دیتے تھے لیکن اب یہ گھڑی خراب ہے۔ یہ گھڑی برسوں عباسی حکمرانوں کے محلوں کی زینت بنی رہی۔"

مخاطب ان کی باتوں کے سحر میں کھو جاتا تھا۔ اسے معلوم ہوتا کہ کتابوں اور گھڑیوں کے بارے میں اس کی معلومات صفر ہیں اور طغرا خاں سب کچھ جانتے ہیں۔ اگر وہ ان کے سامنے اسکول کی کتابوں کا ذکر کر دیتا تو طغرا خاں چراغ پا ہو جاتے "ارے میاں۔ اسکول کی کتابیں بھی کوئی کتابیں ہیں۔ سب کچھ پڑھنا لیکن خدارا اسکول کی کتابیں مت پڑھنا ورنہ تباہ ہو جاؤ گے۔ آج کل کی نسل یہ کتابیں ہی پڑھ کر خراب ہوئی ہے۔ میں نے سنا ہے کہ اسکولوں میں الجبرا بچوں کو جبراً پڑھایا جاتا ہے۔ بچوں کو اخلاقیات پڑھانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ بجائے اخلاق سکھانے کے غلط تاریخ پڑھ کر بچوں کے دلوں میں تعصب اور نفرت گھر کر جاتی ہے یہاں تک کہ بچے باپ کو خبطی سمجھنے لگتے ہیں۔ اکبر الہ آبادی نے ٹھیک ہی کہا تھا

ہم ایسی کل کتابیں قابل ضبطی سمجھتے ہیں
جنہیں پڑھ کے لڑکے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں

"نہ جانے کیسے یہ شعر انگریزوں کی نظر سے بچ گیا ورنہ اکبر الہ آبادی سے جواب طلب ہو جاتا کیوں کہ اسکولوں کا نظام بھی انگریزوں نے چلایا تھا اور اس کی ریڈر اور پرائمر بھی انہوں نے ہی بنائی تھیں۔ بھلا انگریز اس قسم کا شعر کیونکر برداشت کر سکتے تھے کہ ان کی کتابیں قابل ضبطی قرار پائیں۔"

ایک مرتبہ طغرا خاں کو خیال آیا کہ کتابوں اور گھڑیوں کے ساتھ ایک عدد گدھا بھی ہونا چاہیے۔ گدھے کی اہمیت کے بارے میں بتاتے ہوئے انہوں نے کہا کہ ہر بڑے آدمی اور دانشور کے پاس ایک عدد گدھا ضرور ہوتا ہے۔ سند میں ملا نصیر الدین کا ذکر کیا جس نے صرف گدھے کی وجہ سے شہرت پائی ورنہ اس کے پاس ایک بلی بھی تھی۔ لیکن بلی کو وہ شہرت نہ مل سکی جو گدھے کو مل گئی۔ مشہور و معروف عروضی اخفش صاحب کو جب گدھا میسر نہ آسکا تو اس نے بکرے پر اکتفا کیا۔ بکرے کو وہ اپنے مرتب کیے ہوئے اوزان فعلن، فاعلاتن۔ فاعلات کی گردان سناتے رہتے تھے۔ اگر بکرا سر ہلا کر ہاں کر دیتا تو وہ بحر شاعری کے لئے مخصوص ہو جاتی ورنہ رد کر دی جاتی۔ بکرے کے ذریعے منظور شدہ اوزان شاعروں نے برسوں استعمال کیے۔ اب شاعر ان اوزانوں کے علاوہ بھی شعر کہنے لگے ہیں۔ یعنی اب وہ ان بحور میں شاعری کرتے ہیں جن کی اجازت بکرے نے نہیں دی تھی۔ نتیجہ دیکھ لیجئے آج کی شاعری دل پر اثر نہیں کرتی دماغ پر خلل انداز ہوتی ہے۔ یہ بکرا بہت بڑا عروض داں تھا اور ان بزرگ کے پاس آنے سے پہلے پہاڑی ڈھلانوں پر اپنی بکریوں کے ساتھ مترنم سروں میں بانسری بجایا کرتا تھا۔

اکثر بڑے لوگ عموماً کتے پالنے کے شوقین ہوتے ہیں۔ وہ وفاداری کو بہت ترجیح دیتے ہیں اسی وجہ سے دنیا کے ایک بڑے حصے پر حکومت کر گئے مسلمانوں کو اپنے دور حکومت میں کبوتر پالنے کا شوق ہوا جو مالک سے اتنی وفا نہیں نبھاتا جتنی محبت اسے اپنے گھر سے ہوتی ہے۔ کبوتر بزدل جانور ہے، اس کے ساتھ رہتے رہتے ان کے دل بھی کبوتر کی طرح دھڑکنے لگے اور حکومت بھی ہاتھ سے جاتی رہی۔ ہندوؤں کو طوطا پالنے کا شوق تھا۔ طوطا چشمی کا خوف مسلمانوں نے انہیں سے سیکھا۔ طوطا پالنے والے کا طوطا چشم اور خود غرض ہو جانا ضروری ہے کہ صحبت کا اثر ضرور ہوتا ہے۔

لیکن سمجھدار لوگ ہمیشہ سے گدھا پالتے آئے ہیں۔ اور اب تو گدھا پالنا ایک فیشن بن گیا ہے۔ جس منسٹر یا لیڈر کو دیکھو اس کے پاس ایک گدھا ضرور ملے گا۔ اسی طرح ہر دانشور کے پاس ایک یا دو عدد گدھے ہوتے ہیں۔ گدھے کی خصوصیات بہت ہیں۔ یہ ہر بات کو چپ چاپ خاموشی سے سر جھکا کر سن لیتا ہے۔ بات کتنی ہی سخت یا سنجیدہ کیوں نہ ہو بعض اوقات یہ کان تک نہیں ہلاتا۔ بردباری اور حلم تو کوئی گدھے سے سیکھے۔ جب دل

میں آتا ہے ڈھینچوں کرنے اور دولتی جھاڑنے سے بھی نہیں چوکتا خواہ دولتی کی زد میں مالک ہی کیوں نہ آجائے۔ کئی مرتبہ ایسا ہوا ہے کہ پالتو گدھے نے وہ زور کی دولتی جھاڑی کہ منسٹر صاحب مع کرسی کے الٹ گئے۔ گدھے نے کرسی سیدھی کی اور دم کٹا کر اس پر بیٹھ گیا۔ طغرا خاں کہا کرتے تھے دولتی جھاڑنے کے علاوہ گدھے میں اور کوئی عیب نہیں، سب وصف ہی وصف ہیں۔

طغرا خاں کو گدھے کی خواہش نے اتنا ستایا کہ وہ اخبار میں اشتہار دینے پر مجبور ہوگئے۔ کئی گدھوں کے فوٹو دیکھے اور کوائف ملاحظہ فرمانے کے بعد انہوں نے دو گدھوں سے ملنے کا فیصلہ کیا۔ ایک دلی میں رہتا تھا دوسرا بمبئی میں۔ دلی والے گدھے کو پہلے دیکھا وہ کچھ نامناسب لگا اس لئے بمبئی والے گدھے کو دیکھنے کا فیصلہ کیا۔ کہنے والے کہتے ہیں جب طغرا خاں بمبئی والے گدھے کی جانچ پرکھ کر رہے تھے تو اس نے وہ زور کی دولتی جھاڑی کہ خاں صاحب اوندھے منہ چار منزلہ عمارت کی بالکنی سے نیچے جا گرے۔ طغرا خاں پر کیا بیتی یہ تو آپ سمجھ ہی سکتے ہیں لیکن گدھا شان بے نیازی سے بالکنی سے اپنی گردن بڑھا کر نیچے اکٹھا ہوئی بھیڑ کو دیکھ کر ڈھینچوں ڈھینچوں کرتا رہا۔



محدب شیشہ



محدب شیشہ

مسعود مفتی

زکوٰۃ کا مہینہ تھا۔ قصبے کی مسجد میں مولوی صاحب جمعہ کا وعظ کر رہے تھے۔

"یتیم، مسکین اور بیوائیں عرش کا سہارا ہیں۔ ان کے آنسو پونچھو۔ ان کے سر پر ہاتھ دھرو۔ اپنی کمائی میں سے ان کو حصہ دو"

سامنے نمازیوں کی قطاریں خاموشی میں غرق تھیں۔ کچھ دیوار یا کھمبے کے سہارے اونگھتے ہوئے، کچھ پنکھے کی ڈنڈی یا کھڑے گھٹنے پر سینہ بھرا سر ٹکائے ہوئے۔ کچھ کھلی آنکھوں سے سوئے ہوئے۔ حافظ عمر دراز کی آنکھیں بند تھیں، دماغ سویا ہوا تھا، ہونٹ باہم چپکے ہوئے تھے، لیکن ہاتھ جاگ رہے تھے، جو بڑی تیزی سے تسبیح کے دانے پھیر رہے تھے۔ مکمل جاگنے والوں میں بشیر سبزی فروش کے دماغ میں منڈی کے بھاؤ کھد بد مچا رہے تھے۔ ڈاک خانے کے بابو کے ذہن میں تنخواہ اور اخراجات باہم کشتی لڑ رہے تھے اور لاریوں کے اڈے والے منشی کے دماغ میں صبح آٹھ بجے کی لاری میں گزرنے والی عورت کا خوبصورت چہرہ گھوم رہا تھا۔ مگر ماسٹر برکت علی گردن اٹھائے وعظ کا ایک ایک حرف غور سے سن رہا تھا اور جب مولوی صاحب نے منبر سے کچھ آگے جھک کر کہا۔

"بیوہ کی ایک آہ سات آسمانوں میں سوراخ کر دیتی ہے۔ ایسی بیوہ کی ایک دفعہ مدد کرنے والے کو ستر ہزار نیکیوں کا ثواب ملتا ہے۔ وہ سیدھا جنت میں جاتا ہے"۔ تو ماسٹر برکت علی کا سارا جسم اک دم کانپ اٹھا اور پگڑی سر پر جماتے ہوئے وہ بلند آواز میں پکارا "بخشنا میرے مولا"۔

ماسٹر برکت علی قصبے کے ان چند لوگوں میں سے تھا، جو خواہش سے نہیں بلکہ محض اتفاق سے میٹرک پاس کر لیتے ہیں۔ اس قصبے میں سرکاری تعلیمی سرگرمیاں چار جماعتوں کے بعد ختم ہو جاتی تھیں۔ اور چیچک زدہ چہرے کی طرح پرائمری اسکول اپنی بوسیدہ چھتوں کے نیچے سے دن بھر پہاڑوں کے الاپ براڈ کاسٹ کیا کرتا۔ اس اسکول میں چند سال زبردستی گزارنے کے بعد گاؤں کے بچے یا تو ڈھیلی دھوتیاں اور گومڑسی پگڑیاں باندھ کر لٹھ لیے مویشی ہنکاتے رہتے۔ یا گھر کے دروازے کی چوکھٹ پر تھالی میں چھوٹی سی دوکان سجا کر قسمت آزمائی کرنے کے بعد کھیتوں میں ڈھکیل دیئے جاتے اور یا کوئی بھولا بھٹکا انگریزی کا قاعدہ اٹھا کر فالتو وقت میں ماسٹر برکت علی کے پاس آن بیٹھتا۔ پہلے قاعدے کے کونے مڑتے۔ پھر اوپر والا صفحہ رنگ بدلتے حروف کو چھپا لیتا۔ اور روز وہ غائب ہو جاتا تو اگلے صفحہ پر ارتقائی منازل طے کرنے لگتا۔ جس دن سارا قاعدہ غائب ہو جاتا تو طالب علم کو اگلی جماعت میں چڑھا دیا جاتا۔ جہاں پھر ایک موٹا قاعدہ خریدا جاتا۔ چار پانچ قاعدوں پر طبع آزمائی کرنے کے بعد طالب علم چونگی کا محرر یا ڈپو کا ملازم یا عرضی نویس بننے کے قابل ہو جاتا۔ ماسٹر برکت علی کے مکان کے باہر والے کمرے کے دروازے پر پہلے چاک سے اور پھر کوئلے سے "انگریزی کالج" لکھا ہوا تھا حالانکہ وہاں الف سے آم بے سے بلی بھی اتنی ہی شدت سے پڑھایا جاتا تھا۔ جتنا سی۔ اے ٹی کیٹ۔ درجن بھر کے قریب طالب علم یہاں ہمیشہ رہتے تھے اور جب چھٹیوں میں شہر جا کر پڑھنے والے طالب علم گاؤں آتے تو والدین کو بھی عارضی طور پر ماسٹر برکت علی کا شاگرد بنا دیتے تھے تاکہ ان کی کمزور انگلش درست ہو سکے۔ فیس اور شاگردانہ خدمات سے اس کا گزارہ اچھا چل جاتا تھا۔

ماسٹر برکت علی چھریرے جسم کا لمبا آدمی تھا۔ عمر چھتیس سال۔ لمبوترا ساد بلا چہرہ حس کے رخساروں کی جگہ دو نمایاں گڑھے قبل از وقت آنے والی جھریوں کو ہضم کر رہے تھے۔ اونچی شفاف پیشانی کے نیچے دو ذہین آنکھیں۔ شفقت بھری مسکراہٹ سے لبریز رہتی تھیں۔ آنکھوں کے باہر کونوں

میں سورج کی شعاعوں کی مانند باریک سلوٹیں تھیں جو ہنستے وقت بڑی نمایاں ہو جاتی تھیں۔ سیدھی ستواں ناک۔ پتلے ہونٹ اور بشاش چہرہ۔ سر پر خاکی کلاہ کے گرد سفید ململ کی پگڑی۔ جس کا شملہ کلف کی مقدار کے مطابق رکوع و سجود کرتا رہتا۔ دھاری دار قمیص اور ڈھیلی سی شلوار کے نیچے دھول سے اٹے ہوئے بوٹ۔ جن کے کھلے ہوئے حصوں کو تہوار کے موقعہ پر تسمے سمیٹ لیتے۔ جو چند دنوں بعد اپنی موت آپ مرجاتے اور پھر برساتی پتنگوں کی طرح اگلے تہوار کو دوبارہ جنم لیتے۔

ماسٹر برکت علی لائق تو اتنا ہی تھا۔ جتنا الماری میں گرد جمی کتابوں کے ڈھیر والا آدمی ہو سکتا ہے۔ لیکن اس کی شرافت اور نیکی کا قصبہ بھر مداح تھا۔ وہ زندگی کی سیدھی سڑک پر چلتا آیا تھا جس میں کبھی موڑ آیا تھا نہ کھڈ، جس کے قریب نہ کبھی رومان کے چشمے پھوٹے نہ جذبات کی دھوپ چھاؤں نے کبھی آنکھ مچولی کھیلی۔ کبھی حالات کی کنکریاں چبھیں، نہ قسمت نے روڑے اٹکائے۔ ایک دفعہ شادی ہوئی تھی تو سات سال تک جیسے سفر بھول سا گیا تھا۔ بیوی بے اولاد مر گئی۔ تو چند روز رک کر راستا ماپ کر پھر سے زندگی کی ڈگر پر چل پڑا تھا۔ جب سے اس نے قصص الانبیاء میں پڑھا تھا کہ قیامت کے روز بخشش کا سب سے آسان طریقہ خدا کے بندوں کی خدمت کرنا ہے، اس روز سے اس نے عہد کر لیا تھا کہ اپنی زندگی اسکول کے لیے خصوصاً اور خدمت خلق کے لیے عموماً وقف کر دے گا۔ تاکہ لوگوں کو سدھار سکے۔ اس لیے بیوی کی وفات کے سات سال بعد بھی اپنے آپ کو دوبارہ شادی پر آمادہ نہ کر سکا تھا کیوں کہ بیوی اس کے اس عہد میں حائل ہوتی۔ اس کے بعد تو وہ گھڑی کا پرزہ بن گیا تھا۔ زندگی ایک معمول کے مطابق گزر رہی تھی جیسے گاڑی اپنی پٹڑی سے بال برابر بھی ادھر ادھر نہیں ہٹتی۔ روزانہ سب کی خیر صلا پوچھتا۔ بغیر تسموں کے بوٹ اتار کر شلوار گھٹنوں تک اٹھالیتا اور خدمت خلق کے جذبے سے سرشار ہو کر کنویں کی چرخی پکڑ کر پانی بھرنے لگتا۔ گاؤں کی عورتوں کو ماسٹر کی شرافت پر پورا بھروسہ تھا۔ اسی لیے وہ بغیر کسی تکلف کے پانی بھروا لیتیں۔ وہ ڈول انڈیلتے وقت سوال جواب بھی کرتا جاتا۔

"کیوں جیناں اب تو تمہارا گھڑا اس قصوری کے گھر نہیں جاتا۔ میں نے سمجھایا تو بہت تھا"۔

"ہمیں بھائی اللہ تیرا بھلا کرے میرا تو تو نے گھر بچالیا۔ جیناں گھڑا جمائے مجسم انکسار بن جاتی۔

"اب گھر پہ رہے تو مجھے بتانا"۔ نے اٹھا اپنا گھڑا اور وہ ڈول کا باقی پانی اپنے پاؤں جوڑ کر ان پر ڈال دیتا۔

"ماسی، شیدے نے شہر سے کوئی خط لکھا یا نہیں" وہ ایک پاؤں سے دوسرے کی میل رگڑتا ہوا پوچھتا۔ اور ماسی گھڑا چھوڑ کر ہاتھ ملنے لگتی۔

"نہ پتر کوئی نہیں"

"فکر نہ کر میں اگلے مہینے شہر جاؤں گا تو اچھی خبر لوں گا اس کی"۔

"اسے کہنا جو تیرا میرے لال ضرور جانا اور اس سے کہنا" اور گھڑا بھر جاتا لیکن ماسی کے پیغامات جاری رہتے۔ حتیٰ کہ شادو اس کا گھڑا ہٹا کر اپنی گاگر رکھ دیتی۔ ماسٹر برکت علی خاموشی سے پانی بھر دیتا وہ جوان لڑکیوں سے بات چیت کا زیادہ قائل نہ تھا۔ لیکن جب گاگر اٹھا کر اس کے سر پر رکھتا تو اہمیت جتانے کے لیے ایک آدھ بات کر لیتا

"شادو کب اب تو شہر لوکا سینیاں نہیں جاتا"

اور شادو گاگر کے گلے میں ہاتھ ڈالتی ہوئی پلو منہ پر رکھ لیتی۔ "نہیں ویرجی تم نے اسے بالکل سیدھا کر دیا ہے"۔

اور ماسٹر برکت علی ان لوگوں کو نیک بنا ڈالتا جو گاؤں کی عورتوں کو ماں بہن سمجھتے۔ اور پھر آسمان کی طرف منہ اٹھا کر پکار اٹھتا۔ "بخشنا میرے مولا سب کی مہیاتی ہو رکھ" عورتیں پانی لے جاتیں تو وہ لنگوٹ کس کر نہانے لگتا۔ اور صابن ملتے ملتے گنگناتا۔ "میرے مولا بلا لو مدینے مجھے"۔ کنویں کی چکی پر بیٹھ کر سارا دن گپ لگانے والے چند ملنگ جو رے بھی عین اسی وقت نہانے آن ٹپکتے۔ تاکہ ماسٹر برکت علی کے صابن اور تیل سے فائدہ اٹھاسکیں۔ نہانے کے بعد ماسٹر برکت علی گڑھے صاف کر کے پانی سے بھر دیتا تاکہ پرندے پانی پی سکیں اور خود واپس چلا جاتا۔

واپسی پر ماسٹر برکت علی راستے میں گھروں کو کبھی نہ بھولتا۔ ماما جلال سے اس کی بواسیر کے بارے میں ضرور پوچھتا۔ تیسرے چوتھے روز جیواں

دائی کو اس کے لڑکیوں کے نام چھٹی لکھ دیتا ۔ منگنی شدہ لڑکیوں کے والدین سے گاہے بگاہے پوچھتا کہ لڑکی کے جہیز کے سلسلے میں اگر مدد کی ضرورت ہو تو اسے بتائیں ۔ کنواری لڑکیوں کے والدین کو وہ تسلیاں دیتا کہ وہ اس کے ہوتے ہوئے رشتوں کا فکر نہ کریں ۔ سردیوں میں رنگو کے دادا کے لیے کبھی کبھار چائے کا بنڈل ہی لے جاتا ۔ تاکہ اس کی گرمی کا سامان رہے ۔ کبھی کسی جگہ سر پھٹول ہو جاتا تو اپنا فرض سمجھ کر صلح کرا دیتا ۔ چونکہ گزشتہ برسوں میں اکثر گھروں کا ایک آدھ بچہ اس کا شاگرد تھا ۔ اس لیے استاد کا روایتی احترام اس کی دخل اندازی کو ہمیشہ خوش آمدید میں تبدیل کر دیتا ۔

اپنے اسکول میں ماسٹر برکت علی شاگردوں کا بہت خیال رکھتا ۔ ہر ماہ فیس دینے کا وقت آتا تو وہ دو ایک شاگردوں کو خاموشی سے روپے واپس دے دیتا ۔ جا بیٹا لے جا ۔ مجھ سے کیا پردہ ۔ میں جانتا ہوں پچھلے مہینے تمہارا خرچ تنگ رہا ۔ بچیوں سے البتہ فیس کبھی نہیں لی جاتی تھی ۔ کیونکہ لڑکی کسی ایک کی نہیں سارے گاؤں کی لڑکی ہوتی ہے ۔

جمعہ کے روز بیواؤں کے متعلق مولوی صاحب کا وعظ سن کر جب ماسٹر برکت علی باہر نکلا تو وہ اپنی غفلت پر استغفار پڑھ رہا تھا کہ زندگی کے اتنے سال ہاتھ سے نکل گئے ۔ لیکن وہ کسی دکھیا بیوہ کا مداوا نہ بن سکا ۔ برخلاف اس کے نہ معلوم اس نے کتنی بیوہ عورتوں کا دل دکھایا ہوگا ۔ اس نے دل کو تسلی دینے کے لیے سوچا کہ پیشتر ازیں اسے خدا کے نزدیک بیوہ کے درجہ کا بھی تو علم نہ تھا ۔ اور وہ سر جھٹک کر پکار اٹھا ۔ " توبہ اللہ میرے توبہ مجھے بخشنا " ۔ اور پھر تھکی چال سے آگے چلتا گیا ۔

گلی کے موڑ پر چند آوارہ بچے ایک کتے کی دم میں رسی باندھے تالیاں پیٹ رہے تھے ۔ ماسٹر برکت علی نے انہیں ڈانٹا ۔ کتے کو چھڑایا ۔ اور جس لڑکے کے ہاتھ میں رسی تھی اسے کان سے پکڑ کے چلانے لگا ۔ لڑکا ایک ہاتھ سے کان چھڑانے کی کوشش میں ساتھ ساتھ لپکتا چلا آرہا تھا ۔

" کیوں بے کس کا لڑکا ہے تو " ۔

" سی اوئی جی نوراں کا " ۔ لڑکا کان کے درد میں مبالغہ کرتا بولا ۔

" نوراں ؟ کون سی نوراں ؟ کہاں رہتے ہو تم ؟ "

" اوئی مر گیا جی اوئی وہ ٹیلے پر " ۔ اس کی آنکھ بند ہوئی جا رہی تھی ۔

اور ماسٹر برکت علی کو خیال آیا کہ وہی نوراں ہے ، جس کا خاوند پچھلے سال ہیضہ سے مر گیا تھا ۔ ماسٹر برکت علی اس کے حالات سے بے خبر تھا ۔ پھر بھی اسے اتنا معلوم تھا کہ موت کے وقت متوفی کے جاننے والے نوراں کی غربت کا ذکر بڑے ہمدردانہ انداز میں کیا کرتے تھے ۔

" کیا نام ہے تیرا ؟ " ۔

" جی غفورا " ۔ ماسٹر برکت علی نے اس کا کان چھوڑ دیا ۔ اور سوال کرنے لگا ۔ اسے معلوم ہوا کہ غفورا کوئی کام نہیں کرتا ۔ بلکہ گلیوں میں آوارہ پھرتا رہتا ہے ۔ اور اس کی ماں محنت مزدوری کر کے گزارہ چلاتی ہے ۔ ماسٹر برکت علی کی آنکھیں چمکنے لگیں ۔ گھنٹہ بھر پہلے کا سنا ہوا وعظ اس کے کانوں میں گونجنے لگا ۔ بیوہ کی مدد کا بہترین طریقہ اس کے آوارہ بچے کو سدھارنا تھا ۔ اس نے بڑے پیار سے بچے کو ساتھ آنے کو کہا ۔ اور گھر کو چلا ۔

" لے غفورے پڑھ تو بھلا کیا لکھا ہے ۔ میرے دروازے پر ؟ "

غفورے نے شرما کر سر جھکا لیا ۔ " جی میں پڑھا ہوا نہیں ہوں " ۔

" اچھا ۔ اچھا کوئی بات نہیں " ۔ ماسٹر برکت علی خندہ پیشانی سے درگزر کرتا ہوا بولا ۔

کمرے میں لا کر اس نے بلیک بورڈ کی طرف اشارہ کیا ۔ جس پر اردو کے ابجد لکھے ہوئے تھے ۔ لیکن غفورا وہ بھی نہ پڑھ سکتا تھا ۔ ماسٹر نے ہنس کر ایک ہلکی سی چپت اس کے گال پر لگائی اور سر پر ہاتھ پھیرتا ہوا بولا ۔ " نالائق دس برس کی عمر میں اتنا بھی نہیں پڑھ سکتا " ۔ پھر اس نے چاولوں کی میٹھی پٹی اسے کھانے کو دی ۔ اور جب لڑکا کچھ گھل مل گیا تو ماسٹر برکت علی نے اپنے باورچی خانے میں جا کر مونگ کی دال کا لفافہ خالی کیا اور پھاڑ کر ایک نئے قاعدے کا جزدان بنا ڈالا ۔

"آغفورے تجھے تصویریں دکھاؤں"۔ غفورا اب کافی بے تکلف ہو گیا تھا۔ وہ شوق سے ماسٹر کے قریب آن بیٹھا اور ماسٹر برکت علی اسے آم۔ بلی۔ گدھے اور لنگور کی تصویریں دکھانے لگا۔

"یہ تصویریں لوگے"۔ اس نے پیار سے پوچھا۔ غفورے کی شرارتی ہنسی میں خواہش کروٹیں لے رہی تھی۔

"یہ لو شاباش"۔ وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیرتا ہوا بولا"۔ یہ گھر لے جاؤ۔ کل پھر آنا۔ یہاں اسکول میں تمہیں پڑھاؤں گا۔ جب یہ قاعدہ پڑھ چکوگے تو تمہیں اور قاعدہ دوں گا۔ جس میں اس سے بھی اچھی تصویریں ہوں گی۔ شاباش اب سیدھے گھر جاؤ کل پھر آنا"۔

غفورے نے شیشے کے آبگینے کی طرح قاعدہ دونوں ہاتھوں میں مضبوطی سے پکڑ کر سینے سے چپکا لیا اور باہر نکل کر بھاگ اٹھا۔ ماسٹر برکت علی دروازے میں کھڑا ہو کر مسکرا مسکرا کر دیکھتا رہا اور جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تو واپس مڑتے ہوئے کانوں کو ہاتھ لگا کر بولا۔ "بخشنا مجھے میرے مولا۔ میری یہ خدمت قبول کر"

دوسرے روز ماسٹر برکت علی لڑکوں کو پڑھا رہا تھا تو غفورے نے گلی میں ادھر ادھر گھومتے ہوئے تین چار مرتبہ خواہش مندانہ اندر جھانکا۔ لیکن جب ماسٹر برکت علی نے پیار سے بلایا تو بھاگ گیا۔

اس کے بعد دو دن تک غفورا نظر نہ آیا۔ ماسٹر برکت علی کو ایسا معلوم ہوا جیسے پل صراط پر سے گزرتے گزرتے اس سے جنت کا پاسپورٹ چھین کر ایک دم دوزخ میں دھکا دیا گیا ہو۔

"ارے بشیرے ہمارا غفورے نیلے والے کو بلالا۔ سکول بند ہونے پر اس نے کہا۔ تھوڑی دیر بعد بشیرا غفورے کو ہاتھ پکڑ کر تقریباً گھسیٹتا ہوا یہاں لایا اور جب ماسٹر نے اسے پچکارا تو وہ شرماتا لجاتا، جھجکتا اندر آ گیا۔ ماسٹر برکت علی نے اسے اپنے داہنے بازو میں سمیٹ کر اپنے ساتھ لگا لیا۔ اور تھوڑی انگلی سے اٹھاتے ہوئے بولا

غفورے بیٹے تو آیا نہیں میرے پاس

غفورا شرما کر ادھر ادھر منہ پھیرنے لگا مگر جب ماسٹر نے بہت اصرار کیا تو کہنے لگا۔" بے بے کہتی تھی مت جایا کرو۔ ہمارے پاس فیسوں اور کتابوں کے پیسے نہیں ہیں

تو۔ اللہ تو۔ پگڑی کے پلو سے آنکھیں پونچھ کر وہ روندھے ہوئے گلے سے بولا۔ اور دروازہ میں جا کر زور سے ناک صاف کرنے لگا۔

ایک رومال میں تھوڑے ستو اور گڑ لے کر ماسٹر برکت علی نے غفورے کو انگلی سے لگایا۔ اور نوراں کے گھر کی طرف چل دیا۔ ماسٹر کو گھر میں آتا دیکھ کر نوراں کا منہ ایک دم لال ہو گیا جیسے چھوٹی کے گھر ہاتھی آ جائے۔ ماسٹر برکت علی کہتا ہی رہا کہ کھڑے کھڑے بات کر لوں گا۔ لیکن نوراں نے جھٹ پٹ چارپائی پر سے سرسوں کا ساگ جھاڑ دیا اور دھولی کا دھلا ہوا کھیس بچھا کر خود ذرا فاصلے پر سیڑھی پر بیٹھ گئی۔ دوپٹے کا پلو منہ میں پکڑ کر آدھا چہرہ اور ایک آنکھ ڈھک لی

"دیکھو بہن جی" ماسٹر برکت علی نے گلا صاف کر کے کہنا شروع کیا۔ میں یہ نہیں پوچھنے آیا کہ غفورے کو سکول کیوں نہیں بھیجا۔ بلکہ یہ کہنے آیا ہوں کہ غفورا میرے سگے بھائی کی طرح ہے۔ فیس، کتابوں اور ہر ضرورت کا میں خود ذمہ دار ہوں۔ اس کا ابا ہوتا تو اور بات تھی"۔

ابا کا نام آتے ہی نوراں کے جسم پھڑک اٹھے۔ آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ آنسو پونچھنے میں پردہ ختم ہو گیا۔ وہ خود تو چلا گیا مجھے ان مصیبتوں کے لیے چھوڑ گیا" اس کی آنسوؤں میں جھڑی بندھ گئی۔

"اللہ کی حکمت تو کچھ میں نہیں آتی بی بی۔ لیکن تم کیوں فکر کرتی ہو۔ لڑکی کا تو سارا گاؤں ہی میکہ ہوتا ہے۔ ہم کس لیے بیٹھے ہیں۔ غفورے کا ماسٹر نئے میرا بھی حصے والا تھا"

ماہنامہ انشاء کلکتہ

اور پھر نوراں خاوند کی موت، موت کے بعد عزیزوں کا برتاؤ۔ اور موت سے چند روز پہلے کی باتیں آنسوؤں کے اور ہچکیوں کے گھونٹ لے کر سناتی رہی اور ماسٹر برکت علی خدا، رسول، حدیث، حکایتوں اور کہاوتوں سے اس کو تسلیاں دیتا رہا۔ بالآخر جب وہ اٹھا تو نوراں مسرور تھی کہ خدا نے ایک فرشتہ اس کی مدد کو بھیج دیا ہے اور ماسٹر برکت علی مسرور تھا کہ اس بیوہ کی مدد کرنے سے اس کی عاقبت سدھر جائے گی۔ غفورے کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اس نے ایک ٹکو دیا۔ اور پھر سیدھا مسجد میں جاکر سجدہ میں گر پڑا۔ اور رو رو کر خدا سے التجا کرتا رہا کہ وہ اسے ان کی سرپرستی میں ثابت قدم رکھے اور اس کے عوض روز قیامت کو بخش دے۔

چند ماہ کے عرصہ میں غفورا ماسٹر برکت علی کا شاگرد خاص بن گیا۔ چاک کا ڈبہ اور جھاڑن اس کی تحویل میں رہتا۔ ٹاٹ بچھانے، گننے لپیٹنے اور بورڈ صاف کرنے کا ذمہ دار تھا۔ طالب علموں کے لیے پانی کا گھڑا بھرنا اس کا فرض تھا، ماسٹر برکت علی کو پیاس لگتی تو وہ غفورے کو آواز دیتا۔ کنوئیں کے ٹھنڈے پانی سے حقہ تازہ کرنے اور چلم بھرنے کا حق صرف غفورے کو حاصل تھا۔ وہ خود بھی بہت سمجھدار اور باتمیز بچہ بن گیا تھا۔ اور ساتھ ہی ساتھ الف آم۔ بے بلی۔ سے بڑھ کر وہ روٹی لائی ہے۔ کس نے کھائی ہے تک پہنچ چکا تھا۔ سیاہی میں لتھڑی ہوئی انگلیوں سے تختی پر سو تک گنتی بھی لکھ لیتا تھا۔ اور ٹین کی چیچک زدہ سلیٹ پر تھوک رگڑنے کے بعد بڑی بڑی رقوم جمع بھی کرلیتا تھا۔ ماسٹر کے گھر کے اندر والے آلے میں اس کے لیے چاولوں کی پنی ہمیشہ پڑی رہتی تھی۔ دوپہر کا کھانا وہ ماسٹر کے ساتھ کھاتا۔ اور جب ماسٹر بال کٹواتا تو غفورے کے سر پر بھی چٹیل میدان بن جاتا۔ جس پر وہ آم کی گٹھلی رگڑ کر خوب چمکالیتا۔

اپنے گھر میں بھی غفورا کافی سکھی تھا کیونکہ ہر مہینے ماسٹر برکت علی فیس اکٹھی ہوتے ہی شام کو چپکے سے جاکر نوراں کو کچھ روپیے دے آتا۔ فصل کے موقعہ پر جب دانے وغیرہ اسے لاکر دیتے تو کئی روز تک غفورا چھوٹے چھوٹے تھیلے بھر کر لے جاتا رہتا۔ تہوار کے موقع پر غفورے کو نئے کپڑے ملتے اور نوراں کے یہاں گڑ شکر، چنے اور دالوں کی پوٹلیاں پہنچ جاتیں۔ ماسٹر برکت علی بھی گاہے گاہے نوراں کے گھر جاکر روزمرہ کے حالات سنوارتا رہتا۔ اور نوراں پرنم آنکھوں سے دعائیں دیتی دیتی بچھ جاتی۔ ماسٹر برکت علی اس کے گھر سے نکلتا تو اکثر پکار اٹھتا۔ "بخشنا مجھے میرے مولا"۔

اب ماسٹر برکت علی کو نماز میں زیادہ مزہ آنے لگا تھا۔ صبح کھڑکی میں بیٹھ کر وہ قرآن پاک کی تلاوت کرتا تو جھوم جھوم جاتا۔ وعظ میں مولوی صاحب اگر روز حشر اور اگلے جہان کا ذکر کرتے یا سزا اور جزا کے متعلق خدا اور بندے کا خود ساختہ مکالمہ پیش کرتے تو ایک اطمینان بخش مسکراہٹ ماسٹر کے ہونٹوں پر کھیلتی رہتی۔ جیسے کوئی بیوپاری مال کی قیمت پیشگی ادا کرنے کے بعد مطمئن سا نظر آئے۔ اس نے فیصلہ کرلیا تھا کہ اب وہ شادی بالکل نہیں کرے گا بلکہ اخراجات میں سے چار پانچ سال بچت کرنے کے بعد وہ حج کو جائے گا۔ اور اس عزم کو تازہ رکھنے کے لیے اس نے اپنے کمرے میں رسول کریم کے روضہ مبارک کی خوبصورت سی تصویر لگادی، جسے دیکھ کر وہ اپنے پروگرام کی کامیابی کے لیے دعائیں مانگا کرتا ساتھ ہی ساتھ بچت کرنے کے لیے وہ اپنے رہن سہن میں بھی انتہائی کفایت شعار ہوگیا۔

ایک روز ماسٹر برکت علی شام کے وقت نوراں کے گھر سے نکلا تو گلی میں کوئی زور سے کھنکارا۔ ماسٹر نے مڑکر دیکھا تو شرفو کانا سامنے بیری کے درخت کے نیچے کھڑا مسکرا رہا تھا۔

"سلاما لیکم! ماسٹر جی"۔ اس کی آواز میں شرارت ہمک رہی تھی۔

"وعلیکم السلام! سنا بھئی شرفو کیا ہو رہا ہے"۔ ماسٹر صاحب نے خوش خلقی سے کام لیا۔

"بس بادشاہو۔ مولا کی دنیا کا رنگ کچھ رہا ہوں۔ اس نے طنز آمیز لہجے میں کہا اور ماسٹر برکت علی کچھ نہ سمجھتے ہوئے دل ہی دل میں اس کی چلبلی طبیعت سے لطف اندوز ہوتا چلا آیا۔ !!

چند روز بعد ماسٹر برکت علی شہر جانے کے لیے لاری کے اڈے پر پہنچا تو وہاں منشی کے پاس شرفو کانا اور بلو وغیرہ بیٹھے تھے دور سے ماسٹر کو آتے دیکھ کر انہوں نے ایک دوسرے کو کہنیاں ماریں اور شرفو کانا تالی بجاکر گانے لگا۔ یاریاں لائیاں نیں۔ اسی توڑ نبھاؤ گے۔ ماسٹر برکت علی کے پہنچتے

پہنچتے بس آگئی اور وہ جلدی سے ٹکٹ خریدتے ہوئے اس کی طرف لپکا۔ عجلت میں اسے ایسا محسوس ہوا جیسے منشی نے کوئی بات زیر لب کہی اور باقی سب قہقہہ لگا کر ہنسنے لگا۔ وہ مڑا لیکن کنڈکٹر بولا۔

"شتابی، شتابی آؤ۔" ماسٹر جی دیر ہو رہی ہے "اور وہ لپک کر بس میں جا چڑھا۔

اگلے دن شہر سے واپس آتے ہوئے جب وہ بازار سے گزرا تو بشیر سبزی فروش کی دوکان پر بلو کھڑا مولیاں کھا رہا تھا۔ اس نے آہستہ آہستہ کوئی بات بشیر کے کان میں کہی اور وہ دونوں غور سے ماسٹر کی طرف دیکھنے لگے۔

جمعہ کے روز ماسٹر برکت علی سادھو کر مسجد کی طرف چلا۔ راستے میں آٹے کی چکی پر شرفو کانا اپنے بے فکرے دوستوں کے چکر میں لہک لہک کر گا رہا تھا اور باقی سب تالیوں پر تالیاں بجا رہے تھے۔ ماسٹر کو دیکھ کر بالکل خاموشی چھا گئی۔ وہ اسے معمول کے مطابق احترام سمجھتا ہوا تمکنت سے آگے گزر گیا لیکن ابھی دس قدم ہی گیا ہوگا کہ شرفو کانا سینے پر ہاتھ رکھ کر چلایا۔ "ہائے میرا دل گیا" ۔ کسی نے منہ میں انگلی ڈال کر زور سے سیٹی بجائی۔ کوئی زبردستی مصنوعی کھانسی کھانسا اور کوئی پکارا۔ ہائے میرے رانجھے" ۔ اور پھر ایک طویل قہقہہ برس پڑا۔ ماسٹر برکت علی اسے لڑکیوں کا باہمی مذاق اور پھکڑپن سمجھتے ہوئے آگے نکل گیا

دو تین روز گزر گئے۔ ماسٹر برکت علی چارپائی پر لیٹا حقے کے کش لگا رہا تھا کہ اتنے میں عصورا روتا روتا سکول واپس آن پہنچا۔

"مجھے شرفو نے مارا ہے" وہ ہچکیاں لیتا ہوا بولا

"ارے!" ماسٹر برکت علی اٹھ کر بیٹھ گیا "کیوں مارا، میرے بچے کو اس نے" اور اسے پاس بٹھاتے ہوئے پوچھنے لگا۔

"وہ کہتا تھا اوں اوں تلاشی دو"

"تلاشی" ماسٹر حیران رہ گیا "کیسی تلاشی؟"

"ہاں، مول مول، وہ کہتا تھا تیرے ماسٹر نے اوں تیری ماں کے نام پیار کا رقعہ بھیجا ہوگا۔!!"

ماسٹر برکت علی ایسے تڑپا گویا اس کا ہاتھ بجلی پر جا پڑا ہے۔ اور پھر وہ ایک دم سن سا ہو کر رہ گیا۔ پتھر کے بت کی طرح وہ چارپائی پر سیدھا بیٹھ گیا۔ پھٹی پھٹی آنکھیں ایسے پھیل گئیں جیسے جنگل کا ایک وحشی تیتر محل میں آن پہنچا ہو۔ اور ان آنکھوں سے اس نے ترو کانے کی گزشتہ دنوں کی مسکراہٹ کو ایک نئے انداز میں دیکھا اور پھر اس مسکراہٹ کے پیچھے چھپا ہوا دل اور بدنامی کا ایک سیلاب پھنکارا اور گھسیٹتا ہوا بازار کی طرف لپکا جہاں شرفو نائی والے کی دوکان پر حجامت بنوا رہا تھا

"کیوں شرفو تو نے اس بچے سے کیا کہا ہے" بڑی مشکل سے اس نے اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

شرفو کی آنکھ بھی پھڑک گئی۔ اس نے معنی خیز نظروں سے دوکاندار کی طرف دیکھا اور پھر بے شرمی سے ہنس پڑا" ۔ ہی ہی ہی۔ ماسٹر جی کیوں فکر کرتے ہو تم، وہ تو ذرا تمسخر کیا تھا۔ تم اپنا کام جاری رکھو۔ مولا نے مال دیا ہے خوب عیش کرو۔ ہاہاہا!!!"

وہ ابھی لگا بیکل قہقہہ ختم ہونے سے پہلے ہی ماسٹر برکت علی گھونسوں اور پتھروں سے اس پر ٹوٹ پڑا۔ حرام زادے جھوٹے، کذاب، کمینے، لفنگے، بدمعاش۔ وہ بادل کی طرح پھٹ پڑا۔ دونوں آپس میں گتھم گتھا ہو گئے۔

نائی والا دکان دار شاپ سے نیچے کود پڑا۔ دوسرے دوکان دار ترازو ہاتھوں میں لیے گردنیں کھینچ کر دیکھنے لگے۔ راہ گیر اور گاہک ادھر ادھر سے اکٹھے ہو گئے۔ اور دونوں کو کھینچ کر علیحدہ کیا۔ ترو کانا نہایت غلیظ گالیاں بکتا ہوا بھاگنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ماسٹر برکت علی ہمک ہمک کر اسے پکڑ رہا تھا اور بار بار کہہ رہا تھا کہ "مجھے اس بد کردار کو مزہ چکھانے دو"۔

ماسٹر برکت علی کا احترام لوگوں کے دلوں میں بیٹھا ہوا تھا۔ لڑائی کی وجہ معلوم کیے بغیر انہوں نے ترو کانے پر لعن طعن شروع کر دیا۔ جس نے ماسٹر برکت علی جیسے شریف آدمی پر ہاتھ اٹھایا تھا۔ کسی نے پوچھا۔ "بات کیا ہوئی" ۔ تو ماسٹر پھر آپے سے باہر ہو گیا۔ "یہ کمینہ مجھ پر بہتان تراشتا ہے

میں اسے ٹھیک کردوں گا"۔

"منہ دھوکر آؤ ماسٹر" ۔ شرفو ڈھیلے لہجے میں بولا ۔ "آیا مجھے ٹھیک کرنے والا ۔ میں بہتان باندھتا ہوں ۔ یا تیری قلعی کھولتا ہوں" ۔ اور پھر شرفو نے گندی گندی گالیاں دیتے ہوئے ۔ اپنی ایک آنکھ نچانچا کر بلند آواز میں لوگوں کو بتایا کہ ماسٹر برکت علی نے چھپ کر نوراں سے ناجائز تعلقات قائم کر رکھے ہیں ۔ وہ شرفو کو دبانا چاہتا ہے تاکہ بات باہر نہ نکلے ۔

لوگ اک دم خاموش ہوگئے ۔ چند ایک نے فوراً یقین کر لیا ۔ چند ایک ماسٹر برکت علی کے متعلق اس قسم کی چیز سوچنے تک کو گناہ سمجھتے تھے ۔ بعض ایسے بھی تھے جو اس کی تائید یا تردید کیے بغیر اس الزام میں دلچسپی لینے لگے ۔

"یہ سب بکواس ہے" ۔ ماسٹر برکت علی چلایا ۔ مجمع جیسے اک دم ہوش میں آگیا ۔ بھنبھناہٹ کی ایک لہر اٹھنے لگی ۔

ماسٹر برکت علی ایسا آدمی نہیں شرفو ۔ "ڈاک خانے کے بابو نے کہا" ۔ جیسا تمہارا اپنا دماغ ہے ۔ ویسا ہی دوسروں کے متعلق سوچتے ہو" ۔

"حد ہوگئی بابوجی" ۔ شرفو تڑپ کر بولا ۔ "میرے ساتھ ابھی چلو مسجد میں قرآن اٹھانے کو تیار ہوں ۔ کہ میں نے خود نوراں اور ماسٹر برکت علی کو بغل گیر ہوتے دیکھا ہے" ۔ وہ اپنی بات اوپر رکھنے کے لیے جھوٹی قسم پر اتر آیا ۔

قسم کا دعویٰ سن کر کئی اور لوگ شرفو کی بات پر ایمان لے آئے ۔ ماسٹر برکت علی گولی کی طرح لپکا ۔ لیکن لوگوں نے اسے ہٹالیا ۔ اور پھر دو چار آدمی پکڑ کر اسے گھر کی طرف لے چلے ۔ سارا راستہ ماسٹر برکت علی اسے یقین دلاتا رہا کہ شرفو بالکل جھوٹ بولتا ہے ۔ اور وہ بھی ماسٹر کے ساتھ متفق تھے ۔ گھر جاکر ماسٹر چارپائی پر لیٹا سوچ رہا تھا کہ شام تک شرفو کو ہر طرف سے لعن وطعن ہو جائے گی ۔ اور لوگ ماسٹر کی نیت جانتے ہوئے اس پر شبہ نہیں کریں گے ۔ کیونکہ شرفو کا ماتین سال جیل میں کاٹ آیا تھا ۔ اور ایسے آدمی کی بات ماسٹر برکت علی کے مقابلے میں کہاں مانی جائے گی ۔ اس نے کروٹ بدل کر بظاہر بڑے اطمینان سے سونے کی کوشش کی ۔

ماسٹر برکت علی تو واپس آگیا تھا ۔ لیکن اس انکشاف کی نوعیت نے ایک گوند کی طرح لوگوں کو بازار کے فرش پر چپکائے رکھا ۔ اکثر لوگ ماسٹر کی نیکی پر شبہ نہیں کرتے تھے ۔ چند ایک کہتے تھے کہ شرفو کو جھوٹ بولنے کی ضرورت ہے ۔ بعض کا خیال تھا کہ شرفو نے محض ایک بات کی ہے ۔ باقی اللہ بہتر جانتا ہے ۔ کسی نے کہا ماسٹر برکت علی فصل کے موقعہ پر نوراں کو دانے بھجواتا ہے تو آخری گروہ کے چند لوگ شرفو کی بات پر ایمان لے آئے ۔ کوئی بولا "سنا ہے ماسٹر برکت علی نوراں کو ماہوار بھی کچھ دیتا ہے" تو چند اور لوگ بھی ماسٹر کو شرفو کے زاویے سے دیکھنے لگے ۔

ہر گھڑی گزرنے پر ماسٹر کے حامیوں میں کمی ہوتی گئی ۔ کیوں کہ باہم تبادلہ ، خیال سے یہ ثابت ہوگیا کہ ماسٹر برکت علی دانے ، فیس اور دوسری چیزیں نوراں کو بھجواتا ہے ۔ ماہوار روپے دیتا ہے ۔ اور اس کے بچے کو اسکول میں لاڈ سے رکھتا ہے ۔ رائے عامہ یا تو بلتی ہی نہیں ۔ لیکن جب بلتی ہے تو چھلانگیں مارتی چلی جاتی ہے ۔ چنانچہ یہ ثبوت مضبوط سیڑھیاں تھیں جن پر چڑھ کر کئی لوگوں کے تخیل نے نوراں کے گھر میں سارے کمروں کو ماسٹر برکت علی کے دیئے ہوئے دانوں سے بھرے دیکھا ۔ کئی ایک کو الہامی انداز میں پتہ چل گیا کہ فلاں وقت ماسٹر برکت علی فلاں سمت کس مقصد سے جارہا تھا ۔ اکثر لوگوں پر فوراً واضح ہوگیا کہ برکت علی کی کفایت شعاری کی اصل وجہ کیا ہے ۔ ماسٹر کے شادی نہ کرنے کا راز بھی سمجھ میں آگیا ۔ کیونکہ نتیر گھوسی کا خیال تھا کہ جس آدمی کو پینے کو دودھ مل جائے ، اسے بھینس پالنے کی کیا ضرورت ہے ۔ اور منفی جنسی اقدار کے محدب شیشے میں سے جب لوگوں نے عادتاً جھانکا تو یہ ثبوت ہر لحظہ بڑے ہی بڑے ہوتے گئے ۔ حتیٰ کہ اصل ماسٹر برکت علی ان کے نیچے دب گیا ۔

شام تک بازار میں یہ موضوع زیر بحث رہا ۔ لاریوں کے اڈے پر چکی والے کے ترازو کے پاس دہی والے کی دوکان کے سامنے ٹوٹے ہوئے بنچوں پر   چوراہے میں بوہڑ کے درخت تلے   شام کو تنور پر   بھوسے کی دوکان پر   سہ پہر کو رانوں کی بھٹی پر

راہ چلتے ملاقاتیوں نے تازہ ترین اطلاعات کا تبادلہ کیا   خاوندوں نے بچوں کی غیر موجودگی میں اپنی بیویوں کو بتایا   بیویوں نے ساگ چیرتے ہوئے اپنی سہیلیوں سے کہا   دوسرے دن بھنگنیں ایک گھر والوں کی رائے دوسرے گھر لے گئیں   کنواری

لڑکیوں نے دبی گھٹی ہنسی اور آنکھوں کے اشاروں سے تبصرے کیے۔ جوان لڑکوں کے تخیل نے ماسٹر اور نوراں کے تعلقات کے پردے پر پوری فلم دیکھ ڈالی۔ بوڑھوں نے توبہ اور استغفار کے ساتھ اس قصہ میں مرتب قیامت کے آثار دیکھے اور گھر جاکر اپنی جوان اولادوں کو کڑی نظر سے گھورا۔

ماسٹر برکت علی اپنے کمرے کا دروازہ کھولے چارپائی پر لیٹا حقہ پیتا رہا۔ اکا دکا لوگ ادھر سے گزرتے۔ ماسٹر برکت علی الف سے بے تک سارا قصہ سناکر اپنی معصومیت ثابت کرنے کی کوشش کرتا۔ لوگ کوئی فیصلہ دیئیے بغیر کھسکنے کی کوشش کرتے۔

دوسرے دن مدرسے میں چھٹی تھی۔ ماسٹر برکت علی بازار میں نکلا۔ وہ لوگوں کے پاس جاجاکر اپنی بے گناہی کا یقین دلاتا۔ لوگ خاموشی سے سنتے رہتے۔ کوئی ہوں ہاں کر دیتا۔ لیکن زیادہ تسلی نہ دیتے۔ ماسٹر زیادہ جوشیلا ہوتا گیا۔ اس کے دلائل میں سرسری پیدا ہوتی گئی۔ اور آواز بلند ہوتی گئی وہ ایک گروہ سے ہٹ کر دوسرے گروہ کے پاس جاتا لیکن وہ بات کرتا تو لوگ زیر لب مسکرانے لگتے ایک دوسرے کو کنکھیوں سے دیکھتے اور لاتعلق سے ہوکر ادھر ادھر کھسکنے کی کوشش کرتے۔

ماسٹر برکت علی بڑا حیران ہوا۔ بالآخر کسی نے اسے بتایا کہ لوگوں کا خیال ہے کہ وہ جھوٹا ہے۔ تبھی اتنی شدت سے اپنے آپ کو معصوم ظاہر کر رہا ہے۔ ماسٹر برکت علی کا خون کھولنے لگا۔ لیکن ماتھے پر ٹھنڈے پسینے آگئے۔ چکی کے پاس لوگوں کا گروہ کھڑا تھا۔ اس نے وہاں جاکر نہایت جوش سے کہنا شروع کیا کہ نرا الزام ہے۔ وہ خود بالکل معصوم ہے۔ نوراں سے اس کا تعلق نہیں۔ کبھی کبھار اسے بیوہ سمجھ کر اور خدا کا حکم جان کر وہ اس کی مدد کرتا ہے۔ لیکن لوگ اس دلیل پر ہنسنے لگے۔ انہوں نے ایک دوسرے کو ٹھوکے دیئیے۔ اور معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔

ماسٹر برکت علی کی رگ رگ صدمے سے نڈھال ہو گئی۔ وہ جانتا تھا کہ گاؤں کی فضا میں اس قسم کی بدنامی اس کی قطرہ قطرہ جوڑی ہوئی عزت کو ایک ہی دفعہ مٹا دے گی۔ گھر جاکر وہ چارپائی میں منہ لپیٹ کر باقی سارا دن اور ساری رات گھٹتے ہوئے کتاب کی طرح کروٹیں لیتا رہا۔

صبح مسجد میں جب جماعت کھڑی ہونے لگی تو امام نے ماسٹر برکت علی کے بجائے ایک دوسرے آدمی سے کہا۔ "چلو شاہ جی تکبیر پڑھو"۔ اور وہ تکبیر پڑھنے لگا۔ ماسٹر کا نماز میں بھی دل نہ لگا۔ وہ جلدی لوٹ آیا۔ واپسی پر جب قرآن کی تلاوت کرنے لگا تو حروف اس کی آنکھوں کے سامنے ناچنے لگے۔ پھر غائب ہو جاتے اور ٹوٹ ٹوٹ جاتی اور پڑھتے پڑھتے اسے یک لخت محسوس ہوتا کہ اس کا دھیان قرآن کی سطروں کی بجائے پرسوں والے واقع میں جکڑا ہوا ہے۔

تھوڑی دیر بعد جب سکول کھلا تو صرف لڑکے حاضر تھے۔ بچیاں سب غائب تھیں وہ اسے اتفاق سمجھ کر خاموش ہو رہا۔

رات کو عشا کی نماز میں سنت پڑھتے وقت اس نے دیکھا اس کے دونوں طرف دو گز جگہ خالی ہے اور لوگ پرے ہٹ کر نماز پڑھ رہے ہیں۔

صبح مسواک کرتے وقت اس نے گزرنے والی ایک بوڑھی سے پوچھا۔ "ماسی کدھر چلی سویرے سویرے"۔ تو ماسی جواب دیئیے بغیر کندھا دباتی آگے کو چلی گئی۔ وہ کنوئیں پر گیا تو ماسی آدھا بھرا گھڑا اٹھاکر کھسک گئی۔ شادو اپنی گاگر وہیں چھوڑ کر کہیں مل گئی۔ لیکن جب ماسٹر زبردستی جیناں کا گھڑا بھرنے لگا تو وہ نیچی نگاہ کیے خاموشی سے ایک طرف کھڑی رہی پھر گھڑا اٹھاکر ایک طرف چپکے سے چل دی۔ اور ماسٹر برکت علی نے دیکھا تھوڑی دور جاکر بوہڑ کے درخت کی اوٹ میں اس نے پانی زمین پر انڈیل دیا اور خالی گھڑا اٹھائے واپس چلی گئی۔

گھر کی طرف واپسی پر ماسٹر نے دور سے دیکھا کہ رنگو کا دادا دہلیز پر بیٹھا سوٹی پی رہا تھا۔ لیکن جب وہ قدرے نزدیک پہنچا تو بوڑھا انجان بن کر اندر چلا گیا۔

راستے میں اس نے دو ایک راہ گیروں سے بات کی تو وہ گفتگو بڑھانے کی بجائے ختم کرنے کی کوشش کرتے اور پھر جلدی سے کھسک جاتے۔ دن چڑھا تو سکول میں صرف شاگرد آئے انہوں نے بتایا کہ باقی سب کو والدین نے سکول جانے سے منع کر دیا ہے۔

ماسٹر برکت علی کمرے کا دروازہ بند کر کے چارپائی پر منہ لپیٹ کر پڑا رہا۔ اس کے کان جلتے رہے۔ دماغ میں چکیاں چلتی رہیں۔ پپوٹے پھڑکتے

رہے۔ دل ڈوبتا رہا۔ ماتھا کبھی بھٹی بن جاتا کبھی برف کی سل۔

ظہر کی نماز کے بعد اس نے مولوی صاحب سے فرمایا کی۔ اور بتایا کہ وہ بالکل نیک نیتی سے ان کے فرمان کے مطابق ایک بیوہ سمجھ کر نوراں کی مدد کرتا رہا ہے۔ وہ بار بار کہتا "مولوی صاحب میں بالکل بے قصور ہوں" ۔ مولی صاحب لاتعلق سے ہو کر داڑھی پر ہاتھ پھیرتے رہے۔ اور پھر واپس مڑتے ہوئے کہنے لگے۔ "نیت کا حال تو قادر مطلق ہی جانتا ہے۔ لیکن جب سب لوگ ایک بات کہہ رہے ہیں تو کچھ بات تو ہوگی۔"

اور ماسٹر برکت علی کو ایسے محسوس ہوا کہ جیسے اس کے رگ وپے سے آنسوؤں کا سیلاب پھوٹ پڑے گا۔ لیکن اس کی آنکھیں خشک ہی رہیں۔ اور بجائے آنسوؤں کے ان میں انگارے دہکنے لگے۔ کنپٹیوں پر جیسے کسی نے دھما دھم ہتھوڑے مارنے شروع کردیئے۔ بڑی آہستگی سے اس نے اپنے جسم کو گھسیٹ کر اٹھا۔ ہاتھوں سے ٹٹول کر حوتی اٹھائی اور ہارے ہوئے جواری کی طرح تھکے تھکے قدموں سے واپس چلا آیا۔ اس کے جسم کا سارا رس جیسے نچڑ سا گیا ہو۔

ماسٹر برکت علی بند کمرے میں چارپائی پر لوٹتا رہا۔ کبھی پاؤں اٹھا کر دھما دھم ادوائن پر مارنے لگتا۔ کبھی سر پکڑ کر بیٹھ جاتا۔ پھر اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگتا۔ کھڑکی میں کھڑا ہو جاتا۔ لیکن گلی میں کسی کے آنے کی آواز سن کر منہ چھپانے کو واپس بھاگتا۔ وہ کافی دیر رسول اکرم کے روضہء مبارک کی تصویر کو ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا۔ حتیٰ کہ وہ آہستہ آہستہ کانپنے لگی۔ کمرے کی دیواریں ہولے ہولے گھوم سی گئیں اور پھر ماسٹر برکت علی ایک دم بلک بلک کر رو دیا۔

شام کے وقت ماسٹر برکت علی کو بڑے زور کا بخار آنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد اس پر ہذیان کی کیفیت طاری ہو گئی۔

اسی شام نوراں نے فیصلہ کیا کہ وہ گاؤں چھوڑ کر چلی جائے۔ کیونکہ اسے مزدوری ملنا بند ہو گئی تھی۔ اور تمام گھروں نے اس کے داخلے کی ممانعت کردی تھی۔ وہ جہاں جاتی عورتیں اشاروں میں باتیں کرتیں۔ اور ان کی چبھتی ہوئی نظریں اس کے جسم کو چھید ڈالتیں۔ دوسرے دن صبح سویرے جب وہ گاؤں سے نکلنے لگی تو اس نے سوچا ماسٹر برکت علی سے ملتی چلے۔ اس کے مکان پر پہنچ کر غفورے نے دروازے کو ہاتھ لگایا تو وہ کتاب کے ورق کی طرح آسانی سے کھل گیا۔ نوراں اور غفورے اندر چلے گئے۔

اندر کمرے میں صبح کا دھندلکا چھایا ہوا تھا۔ اس روشن اندھیرے میں نوراں نے دیکھا کہ چارپائی پر ماسٹر برکت علی مرا پڑا تھا۔

چند ماہ بعد زکوٰۃ کا مہینہ پھر آگیا۔ مولوی صاحب مسجد میں کھڑے وعظ کررہے تھے۔ "دکھیا اور بے سہارا بیوہ کی ایک آہ ساتویں آسمان میں سوراخ کردیتی ہے۔ ایسی بیوہ کی مدد کرنے والا سیدھا جنت میں جاتا ہے۔ اگر دین و دنیا کی عزت چاہیے ہو تو بیواؤں کی مدد کرو۔"



قتیل شفائی
(لاہور)

غزل

گزرے دنوں کی یاد برستی گھٹا لگے
گزروں جو اس گلی سے تو ٹھنڈی ہوا لگے

مہمان بن کے آئے کسی روز اگر وہ شخص
اس روز بن سجائے مرا گھر سجا لگے

جب تشنگی کی آخری حد پر ملے کوئی
آنکھ اس کی جام اور بدن مے کدہ لگے

میں اس لئے مناتا نہیں وصل کی خوشی
مجھ کو رقیب کی نہ کہیں بددعا لگے

دریا میں ہے بس ایک تھپیڑے کا انتظار
شاید یونہی سفینہ کنارے پہ جا لگے

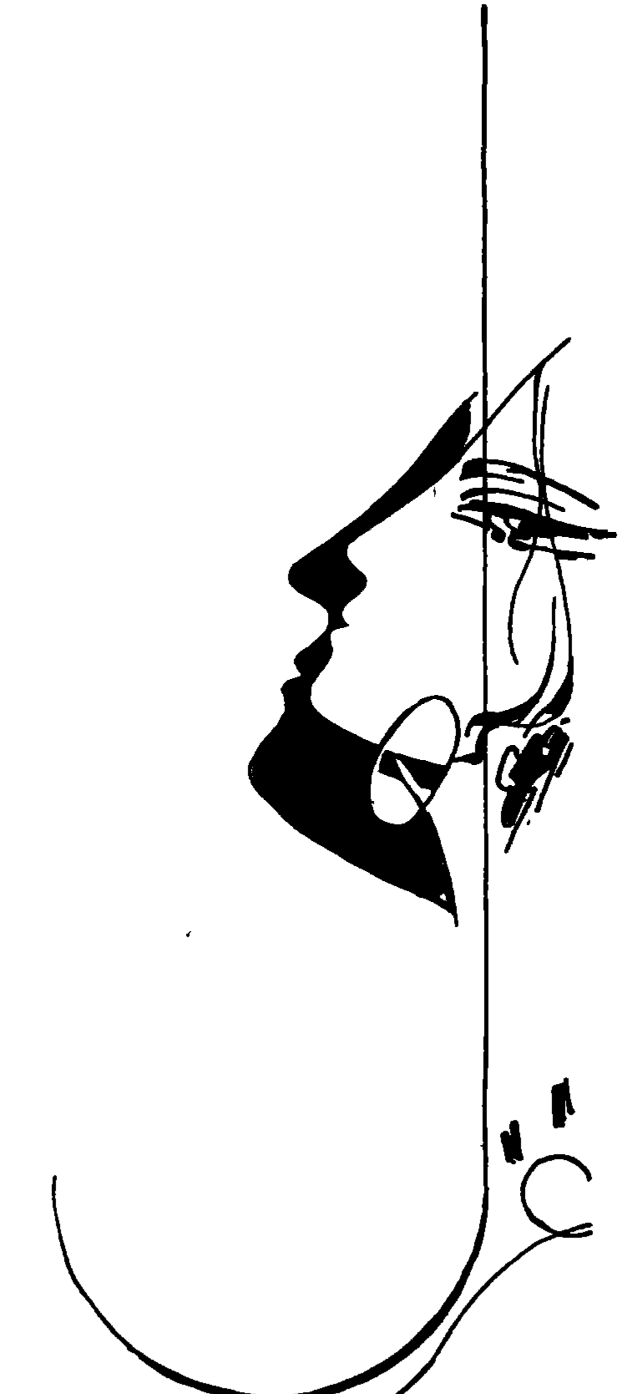
وہ قحط دوستی کا پڑا ہے کہ ان دنوں
جو مسکرا کے بات کرے آشنا لگے

ایک ایسی خوش جمال پری اپنی سوچ ہے
جو سب کے ساتھ رہ کے بھی سب سے جدا لگے

دیکھا نہ رنگ ، بیٹھ کے بہروپیوں کے بیچ
اپنے سوا ہر ایک مجھے پارسا لگے

عمریں گنوا کے پاتے ہیں شہرت جو ہم قتیل
وہ بھی کسی رئیس کی اب داشتہ لگے

ترکِ وفا کے بعد یہ اس کی ادا قتیل
مجھ کو ستائے کوئی تو اس کو برا لگے



ہائے یہ دور ترقی

ڈاکٹر شباب للت (شملہ)



دربار میں تھا جلوہ فگن ایک حکمراں
سائل برائے داد رسی جمع تھے وہاں

فریادیوں کی سن کے شکایات و مشکلات
نپٹا رہا تھا زیرِ سماعت معاملات

دیتا تھا ساتھ ساتھ ہی احکامِ انسداد
لیتا تھا جیت یوں وہ رعایا کا اعتماد

بیتا مقدموں کی سماعت میں دن تمام
واپس محل کو جانے لگا شاہِ نیک نام

اتنے میں ہی پکار کسی کی سنائی دی
در پر کسی نے عدل کی آکر دہائی دی

تاجر تھا اک مدد کے لیے گڑگڑا رہا
بیتی تھی اس پہ جو تھا وہ روکر سنا رہا

بولا کہ چور کرگئے بندے کو خستہ حال
کل شب چرا کے لے گئے میرا متاع و مال

سلطانِ وقت نے کیا تاجر سے یہ سوال
کیوں خود تجھے نہ اس کی حفاظت کا تھا خیال

چوروں نے جب چرایا ترا مالِ بے بہا
کیا کر رہا تھا ایسے میں تو بندہء خدا ؟

بولا کہ شب کو عالی پنہ سو رہا تھا میں
راحت کی میٹھی نیند میں تب کھو رہا تھا میں

جھنجھلا کے بادشہ نے کہا تب یہ رعب سے
کیوں سوگیا تھا ، بندہء غافل ! جواب دے

تاجر نے سادگی سے یہ فوراً دیا جواب
میں واقعی مزے سے تھا اس وقت محوِ خواب

بے فکر ہو کے نیند میں یوں کھو گیا تھا میں
تو جاگتا ہے ، سوچ کر یہ سوگیا تھا میں

سلطان اس جواب سے شرمندہ ہوگیا
فوراً وزیرِ اعلیٰ کو فرمان یہ دیا

تاجر نے جو کہا وہ حقیقت ہے واقعی
اس نے دلایا یاد ہمیں فرضِ منصبی

فی الفور آپ یہ عمل آرائی کیجئے
تاجر کے کل زیان کی بھرپائی کیجئے

ہوتی رہے گی بعد میں چوری کی چھان بین
اس کو لگے نہ ٹھیس جو تاجر کا ہے یقین

اس شخص کے زیان کا پورا معاوضہ
سرکار کے خزانے سے فوراً کریں ادا

چوری کا مال چور سے کروانا بازیاب
مجرم کی حسبِ ضابطہ پاداش و احتساب

کرتی رہے گی شاہی پولیس جس کا ہے یہ کام
کیوں نیند ہو رعایا کی اس کے لئے حرام

عہدِ کہن کے پڑھ کے کچھ ایسے ہی واقعات
دانش قبول کرتی نہیں یہ عجیب بات

جس عہد میں تھے عدل کے ایسے طریق و طور
کہتے ہیں لوگ کیوں اسے پسماندگی کا دور

کیسا یہ آج دور ترقی ہے آگیا
تھامے ہوئے عنان حکومت ہے مافیا

کرامت بخاری
۲۷۰ - اے، فیصل ٹاؤن
جی او آر V - لاہور

تلاش

میں سماعت کا کاسہ لئے شہر میں
ڈھونڈھتا پھر رہا ہوں مکاں در مکاں
وہ صدا جو اچانک کہیں کھوگئی
راستے میں کہیں مجھ سے گم ہوگئی
تھک گئی، چھپ گئی یا کہیں سوگئی

راستہ جیسے دشت بلا ہوگیا
ایک پل میں نہ جانے یہ کیا ہوگیا
شہر کا شہر چپ کی ردا اوڑھکر
سوگیا دفعتاً مجھ سے منہ موڑکر

میں سماعت کا کاسہ لئے شہر میں
ڈھونڈھتا پھر رہا ہوں مکاں در مکاں
کوئی آواز دے کے بلائے مجھے
وہ کہاں ہے صدارا بتائے مجھے



جیالعل دت رفیق
لندن

غزل

کون آیا تھا رہ گزر پہ مرے
غم کے نشتر چبھے جگر پہ مرے

گل خنداں کی مہک آئی ہے
کون آئے گا آج گھر پہ مرے

چاہنے والا ہے میرا کوئی
گل کھلے ہیں یہ کیسے در پہ مرے

در کھلا ہے قفس کا اڑجاؤں
رعشہ سا کیوں ہے بال و پر پہ مرے

محو تھا تیری جستجو میں میں
خون کیوں جم گیا جگر پہ میرے

منزلیں غم کی ہورہی تھیں طے
قافلہ ساتھ تھا سفر پہ مرے

کیا مرے خواب کی تھی یہ تعبیر
آج دستک ہوئی تھی در پہ میرے

تھے نگہبان جب کہ شمس و قمر
برق کوندی ہے کیوں شجر پہ مرے

دل کی بستی رفیق کیوں اجڑی
حملہ آور تھا وہ نگر پہ مرے

ظفر گورکھپوری
A – 302, Florida,
Andheri (w) Bombay
58

غزل

اک سانس کا خیمہ ہے، اقامت بھی بہت کم
سو کام بھی در پیش ہیں، مہلت بھی بہت کم

دل یوں تو نظر آئے ہے مٹھی کے برابر
کھل جائے تو آفاق کی وسعت بھی بہت کم

اس پونجی میں کیا خرچ کریں، کتنا بچائیں
دی اس نے ہمیں درد کی دولت بھی بہت کم

ہم لوگ ہیں احساس کے وہ مردہ مکانات
آتے ہیں جدھر سنگ ملامت بھی بہت کم

کس شے کے عوض، کون سی شے ہاتھ لگی ہے؟
اب آئے ہے ہونٹوں پہ شکایت بھی بہت کم

زخم اتنے تو گہرے ہوں کہ بھرنے میں لگے عمر
اپنے لئے آزار کی لذت بھی بہت کم

اک عالم تنہائی ظفر ایسا بھی گزرا
محسوس ہوئی اس کی ضرورت بھی بہت کم



محبت اور زمین

ڈاکٹر سید محمد ظفر امام نظام پوری
نیویارک (یو-ایس-اے)

صبح زندگی- زندگی کی یہ پر نور صبح- ابھی صبح نہیں ہوئی تھی اور چاروں طرف اندھیرا پھیلا ہوا تھا، اس اندھیرے میں، مگر الفت سے منور گلیوں میں کسی کے دبے دبے قدموں کی دھیمی دھیمی آواز- اور اس خاموش فضا میں اس دھرتی کی اس نرم مٹی پر پڑنے والے قدم، آج احساس ہوتا ہے زمین متبرک ہے یا اس پر پڑنے والے قدم اور وہ نقش پا جو کبھی کبھی گمراہ کر دیتے اور کبھی کبھی زندگی کو زندگی سے اتنا قریب کر دیتے کہ احساس ہوتا کہ بس زندگی یہی ہے، یہی ہے- اس دھرتی کو چومیں یا اس دھرتی پر پڑنے والے قدموں کی پرستش کریں۔

اس خاموش ماحول میں قریب تر آتی دبے دبے قدموں کی آواز، سینے میں مقید دل کی بے قرار دھڑکن، جیسے چٹانوں سے ٹکراتی موج بے کراں ہنگامہ۔ دل کی پر شور آواز جو سماعت کی محتاج نہیں اور جو سیدھے دل سے نکل کر دماغ تک جا پہونچی۔ اور چند قدم اور-

وقت کی دھول کتنی ہی گہری کیوں نہ ہو جائے، دھرتی پر ابھرتے قدموں کے نشان، انسان کے دل ذہن اور ضمیر میں نمایاں ہوتے رہتے ہیں۔ ہاں یہ الگ بات ہے کہ یادوں کی پروائیاں وقت کی دبیز گرد پر آہستگی سے گزر کر بھی یادوں کے نقوش کو تہہ و بالا کرتی رہتی ہیں۔ یادیں عذاب ہیں۔ یہ تو ایسا خواب ہیں جس میں زندگی ہر طرف پر نور نظر آتی ہے!

ہر طرف کہاسہ پھیلا ہوا تھا اور اس کہرے میں کوئی دلبر شناسا چہرہ صبح کا نور لیے نمودار ہوا اور اس کی قربت کی تمازت نے گویا ایک خلاء قائم کر دیا ہو، اور وہاں ایک ایسی فضا ایسا ماحول قائم ہو چکا تھا، جہاں ارد گرد کچھ بھی نظر نہیں آرہا تھا سوائے اس زندگی سے پر اور مسرت سے معمور چہرے کے- اور گہرے کہاسے میں گھرے اوروں کی نگاہوں سے دور- مگر ایک دوسرے کے قریب زلفوں کے آبشار میں ایک متبسم چہرہ، اور قربت، رخسار کی تمازت، آنکھوں کی حرارت، متحرک لبوں کی خاموش آواز- قریب اور قریب۔ اے حسن جاوداں اور قریب- ہر طرف حسن کی پر نور شعاعیں اور کہاسے میں گھری زندگی کی علامت صرف تنفس کی صدا۔

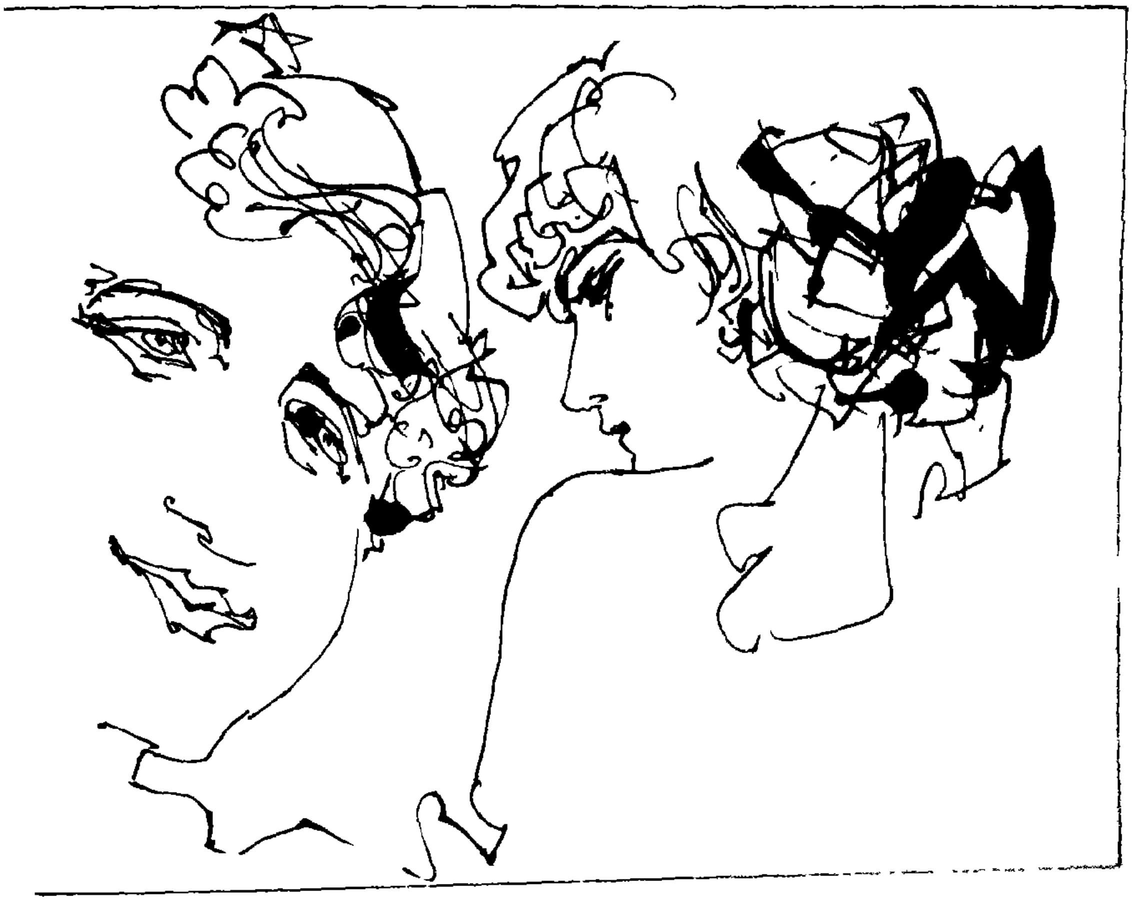
یہ خواب نہیں۔

یہ در و دیوار، یہ خطہ گیاہ اور راستہ اور اس کے کنارے چھوٹا سا درخت۔ نہیں نہیں ابھی صبح نہیں ہوئی ہے، ہر طرف اور ہمارے چہار طرف کہاسہ پھیلا ہوا ہے اور ہم اس کہر میں ملفوف ہیں۔

اور یہ کیسی خوشبو ہے۔

نہیں نہیں یہ تصور نہیں یہ ہارسنگار کے پھولوں کی خوشبو ہے۔ اور اس درخت کے نیچے ہم اپنا اپنا دامن مسرت اور پھولوں سے بھرنے آئے ہیں۔ نرم، سفید اور زرد پھولوں کی چادر زمین پر بچھی ہے، مگر تم اور ہم اپنے اپنے قدم بہت ہی سنبھال سنبھال کر اٹھاتے اور رکھتے ہیں۔ ہمارے اقدام کی نزاکت پھولوں سے بھی زیادہ نازک ہے۔ ایک معاشرہ ایک سماج اس سے وابستہ ہے۔

یہ صبح، یہ تنہائی، یہ اندھیرا اور کہر سے پھیلی ایسی روشنی جو ہر چیز کو بے نور کر رہی ہے، میں دھیرے سے تمہارا نرم و نازک ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیتا ہوں اور تمہارا ایک ہاتھ اب بھی درخت کی ایک شاخ پر ہے اور جس کی ایک جنبش سے نرم و نازک پھولوں کی بارش اور زمین کی بھینی بھینی



خوشبو ہمارے پورے وجود کو ماورائی بناتی جارہی ہے، تم اپنے ہاتھ کو میرے ہاتھ میں ابھی اور رہنے دو، کہ ان ہاتھوں کے ارتعاش سے ایسا نغمہ۔ جاں فزا پیدا ہورہا ہے، جس سے زندگی موت پر فاتح ہوتی ہے۔ اور میں ڈراؤڑ اخاموش خاموش۔ تمہاری بڑی بڑی آنکھوں میں دیکھنے کی میری جرات اور ہمت نہیں، کیونکہ جب تم پوری آنکھیں کھولتی ہو تو ایسا لگتا ہے صبح ہو گئی۔ اور میں ابھی اندھیرے میں رہنا چاہتا ہوں، کچھ دیر اور ابھی کچھ دیر اور ابھی۔ ہوا کا ایک نرم و نازک جھونکا تمہاری زلفوں کو بکھیر کر میرے خوابوں کا محرک بن گیا ہے۔

ہر طرف کتنی خاموشی ہے۔ کبھی کبھی پتوں کی سرسراہٹ اور یہ پورا ماحول، اور اس وقت پوری دنیا خوابیدہ ہے، ابھی صبح دور ہے۔ یہ صبح کاذب ہے۔ مگر چاندنی۔

تم ڈر رہی ہو تو میں بھی خائف ہوں، مجھ پر عائد پابندیاں، میری ذمہ داریاں اور مجھ سے وابستہ توقعات۔

مگر یہ لمحہ، جاوداں، یہ تصوروں سے پر تصور، ایک حقیقت، ایک اتفاقی حادثہ اور خوابوں کی ملاقات، جذبات کے متلاطم سمندر میں، ہماری تنہائی۔ اور سماج اور معاشرہ کے کنارے، ہمیں ان سے دور نہیں ہونا چاہیے۔

کیا تمہیں ٹھنڈ لگ رہی ہے۔

کیسی ٹھنڈ، زندگی کی آگ ہر طرف روشن ہے، اور ہماری قربت، اب ہمارے درمیان کوئی فاصلہ نہیں، ہوا بھی ہمارے درمیان سے نہیں گزر سکتی، اور ایسا لگتا ہے کہ ہم صدیوں سے کھڑے ہیں اور برسوں اسی طرح ساکت و جامد کھڑے رہیں گے۔

ایک خواب — کاش، ہم ایسی ہستی ہوتے جو کسی کو نظر نہ آتے۔ نادید اور منجمد خواب کی طرح ہار سنگھار کے درخت کے نیچے ہم کھڑے رہے اور پھولوں کی بارش ہوتی رہی اور خوشبو ہمارے چاروں طرف پریشان پریشان پھرتی رہی۔

تمہارے نرم رخسار، میرے چہرے پر ان کا لمس، ایک تنویمی عمل — میں احساس کی اس دنیا میں تمہارے اتنے قریب ہو کر یہ بھی نہیں جان سکتا تم کیا محسوس کر رہی ہو، تمہاری حیا بار آنکھیں — نہیں نہیں تمہیں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ ایک جلتی ہوئی شمع جو زندگی کو روشن کر رہی ہے۔ مگر زندگی اندھیرے کی طالب ہے۔ اور میرے ہاتھ دھیرے دھیرے تمہاری زلفوں سے گزر رہے ہیں اور تمہاری زلفیں کمر تک جا پہنچی ہیں۔

کیا اس خواب ناک، خاموش دنیا میں کوئی آواز سنائی دیتی ہے۔ یعنی صرف ایک دل کے دھڑکنے کی آواز۔ یہ کیسی ہم آہنگی ہے، یہ ہمارے دلوں کی آواز کا ادغام ہے ساکت اور جامد نہ جانے کتنی دیر کھڑے رہے —

تمہارے نرم رخسار کی تمازت، میرا احساس جل رہا ہے، میرے اندر ایک آگ سی لگی ہے، نہیں نہیں یہ آگ، ہم دونوں میں سے کسی کو نہیں جلا سکتی، یہ آگ۔ نار ابراہیم سے بھی زیادہ متبرک ہے۔

پھر تم اتنی خاموش کیوں ہو، تمہاری یہ خاموشی، مجھے شبہات کی دلدل میں ڈال دیتی ہے۔

تم ہی نہیں۔ تمہارا سراپا، تمہارا سارا وجود، تمہاری ساری خوشی تمہارا وقار مجھے بہت ہی عزیز ہے، اور میں تمہاری اس خاموشی کا راز جاننے کے لئے بے قرار ہوں، مگر تمہاری آنکھوں میں دیکھنے سے خائف بھی۔

کہ جب تم مسکراتی ہو۔ ساری کائنات مسکرا دیتی ہے۔ اور ہر طرف نور کی کرنیں بکھرنے لگتی ہیں۔

وقت۔

کتنا وقت گزر گیا، وقت تو ایک احساس ہے اور یہ احساس پورے ماحول سے متاثر ہوتا ہے۔ ہمارے ارد گرد کہرے کی مخملیں چادریں ہیں اور بس پھر ہماری دنیا ہے۔

اس ہار سنگھار کا پھولوں سے بھرا یہ درخت۔ اور ہمارا وجود، جیسے سائے اور جن پر پھول دھیرے دھیرے برس رہے ہوں۔

یہ منجمد وقت کی ایک تصویر ہی تو ہے۔

میرے بازوں میں وہ کسمسائی۔

اور اس کے نرم و نازک لبوں سے میری انگلیاں مس ہوئیں۔

اور میں نے دھیرے سے اس کے لبوں کو چھوا۔ پھولوں کا یہ لمس۔!

اور اس کے لب دھیرے دھیرے وا ہونے لگے۔ میں نے کہا تم کچھ نہ بولو، کچھ بھی نہیں اور میں نے اپنے لب اس کے لبوں پر رکھ دیئے۔ ایسا مکمل سکون، ایسی خاموشی جیسے آواز کا کوئی وجود نہ ہو۔ ایسی لذت اور سرشاری، ایسی لذت اور انبساط، ایسی لذت حیات افزا، ایسی لذت جاوداں، ایسی لذت رواں، ایسی لذت پر حرارت، ایسی لذت جاں فزا، ایک خواب گراں، سب کچھ اس خوابیدہ ماحول میں ضم ہوتا جارہا تھا۔ جیسے وقت کا کوئی وجود نہ ہو اور اس کمرے میں اپنی دنیا کے باہر کوئی دنیا نہ ہو۔ سکوت مکمل سکوت۔ صرف زندگی کی رازداں سانسوں کی آواز۔ خوابیدہ بیداری روح پر طاری تھی۔ اور وقت کا یہ لافانی روپ۔

اور دور کہیں نقرئی گھنٹیوں کی آوازیں، نوائے بلبل اور پرندوں کی صدائے دلنواز۔ اس نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں کھول دیں۔۔

اور میں ان آنکھوں میں دیکھتا ہی رہ گیا۔ صبح ہو چکی تھی۔ ہر طرف نور ہی نور تھا۔ ایک طلسم ٹوٹ رہا تھا۔ ایک خواب مسمار ہو رہا تھا اور وقت ریزہ ریزہ ہو کر بکھر رہا تھا۔

اور صبح کی اس روشنی اور اس دھند میں بھی اس کا سفید مکاں اور اس کا دروازہ اب نظر آ رہا تھا اور پھر دھیرے دھیرے ایک خواب کی طرح یا بہت ہی نرم و نازک کاغذی رومال کی طرح ہم نے ایک دوسرے کو الگ کیا۔

اور اب ہر طرف روشنی پھیل رہی تھی، سفید اور پیلے پھول بکھرے تھے، ان پر اس کے قدم پڑتے جا رہے تھے اور پھر اسی دروازہ میں جاکر وہ ایک خواب کی طرح غائب ہو گئی

جیسے کہیں کچھ نہ تھا۔

جیسے خواب کے دروازے بند ہو چکے ہوں!

تصور ایک خواب بن چکا تھا۔ کہیں بھی تو کچھ نہ تھا سوائے ایک ہلکی سی دھند کے۔ ہما اور اس کا سایہ۔ ؟مگر اس ہار سنگار کے درخت کے نیچے گزارے ہوئے یہ لمحے اور میں دونوں ہاتھوں میں پھول بھر بھر کر اس طرح لٹا رہا تھا جیسے دونوں جہانوں کی دولت مجھے مل گئی ہو، اور جیسے اس مسرت کا عرصہ ہمیشہ ہمیشہ برقرار رہے گا انگ انگ میں ایک نیا احساس جاگ اٹھا تھا، روح جسم کی اس لذت فشانی پر متبسم تھی اور ضمیر مطمئن، جذبات پر سکون تھے دل اس لافانی جذبے کی لذت سے سرشار تھا۔ یہ صبح ماحاصل حیات تھی۔ اور دن یادوں کا ناقابل فراموش یادوں کا خزانہ لیے تھا۔ اور میں شاداں، فرحاں چہرے پر بے پناہ سکون خود اعتمادی اور تبسم لئے۔ جیسے نیند میں چلتے چلتے گھر پہونچا۔ تو اس بزرگ ہستی نے وضو کرتے کرتے رک کر، مجھے اس انداز سے آتے دیکھ کر کہا "میں نے کتنی بار کہا ہے، صبح صبح پھول والے درختوں کے نیچے نہ جاؤ۔ ان پر سایہ رہتا ہے۔"

اور میں نے آج اتنے برسوں بعد، بہت ہی خوبصورت سفید لباس میں ملبوس اور گلے میں ہلکے زرد رنگ کا دوپٹہ ڈالے۔ دنیا کے اس مشغول ترین ایرپورٹ پر دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔

ہم ایک دوسرے کے سامنے ایک مجسمہ کی طرح خاموش کھڑے تھے، اس کا وہی رنگ روپ، وہی آنکھیں، وہی لب۔ وقت کی اس تصویر کو میں دیکھتا رہ گیا۔ اس کے لبوں پر ایک تبسم تھا، نگاہیں جھکی جھکی تھیں اور جب پلکیں اٹھیں تو اب بھی صبح کا پیغام دے رہی تھیں۔ ہم دونوں خاموش

تھے۔

نہ جانے اس کی آنکھوں میں کتنے سوال تھے، مگر میری نگاہیں بھی جھکی تھیں۔ہم ایک دوسرے کے مجرم تھے۔

نہیں ----

میں اپنے سارے خوابوں کو سرزمین وطن پر چھوڑ کر اس دنیا میں چلا آیا تھا جہاں انسان اپنے خوابوں کو حقیقت میں بدل دیتا ہے، ہاں میں رنگ و بو حسن جام و سبو کی دنیا کو چھوڑ کر اپنے خواب کو سرمایہ حیات بنا کر اس دور دیس میں چلا آیا۔ہاں مجھے اس سے طمانیت اور خوشی ہوتی ہے جب کسی کے دل کا کامیاب آپریشن۔اس کے چہرے کی شگفتگی اور بحالی اور میری نمایاں کامیابی میرے دل کو سرشار کر دیتی ہے۔

اور میرا دل۔

میں اسے خاموشی سے دیکھتا رہا، جیسے وہ کچھ کہنا چاہ رہی ہو اور کہہ نہیں پا رہی ہو، جیسے میں کچھ پوچھنا چاہ رہا ہوں، مگر دل سوال کرنا نہیں چاہ رہا تھا۔بہت دیر کھڑے، ہم ایک دوسرے کو دیکھتے رہے اور نگاہیں ہی ایک دوسرے کے دل کا حال کہتی رہیں۔

نہیں یہ دنیا کا مصروف ترین ایرپورٹ نہیں تھا، نہ سہی، ایرپورٹ کے اندر بھی ایک درخت تھا، ہم اس کے قریب کھڑے تھے ہر طرف کہرا نہیں روشنی ہی روشنی تھی، ہر طرف ہنگامہ تھا مگر، ہم دونوں خاموش کھڑے تھے۔وہ سراپا میرے سامنے تھی ہر طرف حیات افزا خوشبو پھیلی تھی۔اور ہم اس طرح کھڑے رہے۔

اور وقت، نہ جانے وقت کو کیا ہو گیا تھا آج۔ہر طرف وقت کی اہمیت نمایاں تھی، ہر طرف وقت کی حکمرانی تھی۔اور اچانک فضا میں آواز گونجی "ایرانڈیا کی فلائٹ ۱۹۱۷ دہلی جانے کو تیار ہے وہ مسافر جن کے نام ویٹنگ لسٹ میں تھے اب ان کی سیٹیں کنفرم کی جاتی ہیں۔

"تسنیم خالد ----"

وہ جو ایک مجسمہ کی طرح تھی یہ نام سن کر متحرک ہو اٹھی اور میں نے کہا

"اب تم تسنیم خالد ہو؟"

اس نے نگاہیں جھکا لیں۔

"جہاز کا سفر آرام دہ ہو اور فضاؤں میں پرواز کرتے ہوئے کوئی خواب نہ دیکھنا۔" میں نے کہا۔

وہ دھیرے سے مسکرائی اور نظریں اٹھا کر میری جانب دیکھا۔

اس کی آنکھیں پرنم تھیں اور پھر وہ نگاہیں نیچی کئے ہوئے چلی گئی۔

اور میں دیکھتا رہا۔اب وہ میرے خوابوں کی سرزمین کی طرف مائل پرواز تھی اور جب اس کے قدم اس دھرتی پر پڑیں گے۔کس سے کون زیادہ متبرک ہے۔میرا دل فیصلہ کرنے سے قاصر تھا۔مگر اے سرزمین وطن شاید تو ان قدموں سے زیادہ متبرک ہے۔

میرے پاس تو صرف یادیں ہیں اور وہ ایک سائے ہی کی طرح سے تو میری زندگی سے گزر گئی۔

عاصی کاشمیری
788 _ WOODBOROUGH ROAD
NOTTINGHAM (UK)

غزل

عذاب جان کو بھی ہے عتاب سر پر ہے
غموں کا بوجھ ہے جو بے حساب سر پر ہے

سوال پردہ کا ہر اک جواب سر پر ہے
کھلا کھلا سا ہے چہرہ ، نقاب سر پر ہے

رہ حیات میں سایہ نظر نہیں آتا
سفر طویل ہے اور آفتاب سر پر ہے

کبھی یہ قبر پہ اشکوں کے ساتھ رکھا ہے
کبھی یہ سہرے میں شامل گلاب سر پر ہے

میں ان سے مل کے بہت ہی ہوا ہوں خوش عاصی
جدائیوں کا مگر اک عذاب سر پر ہے



حنیف نجمی
ماؤن مودہا، محلہ اپرودس
پوسٹ راگول ضلع ہمیرپور (یو-پی)

غزل

وہ جن کا تن بدن دھانی بہت ہے
دلوں میں ان کے ویرانی بہت ہے

میں اک مدت سے یونہی جل رہا ہوں
مرے چاروں طرف پانی بہت ہے

لباس نو بہ نو حاصل ہیں جن کو
انہیں کے تن پہ عریانی بہت ہے

تقاضا ان سے کیا کرتے وفا کا
کہ دل اپنا بھی سیلانی بہت ہے

میں چار آنکھوں سے دنیا دیکھتا ہوں
جبھی تو مجھ کو حیرانی بہت ہے

جسے دیکھا تھا کل ، آج اس سے مل کر
نہ جانے کیوں پشیمانی بہت ہے

نہ برکھا ہے نہ کوئی بند ٹوٹا
ندی میں پھر بھی طغیانی بہت ہے

نگاہوں میں بصیرت ہو تو نجمی
اندھیروں میں بھی تابانی بہت ہے

بدنام بشر
بگان پاڑا، وارڈ - ۷
پوسٹ ضلع - پاکوڑ - بہار

بے غیرت

میں ---- کہ بے روزگاری کے
گھنے، گھپ دشت میں برسوں
بھٹکتا ہی رہا گم صم
کہیں بھی روشنی، جگنو،
ستارہ نہ ملا مجھ کو
کہ پل دو پل کہیں ہنس لوں !
گلی، کوچے،
محلے کے بڑے بزرگ
حقارت سے
مجھے تکتے ہی رہتے ہیں
میں بے غیرت کہ زندہ ہوں
جھکائے سر
گزر ہی جاتا ہوں چپ چاپ
کہ جیسے ہوں کنواری ماں محلے کی
شکم میں میرے ہے کوئی
حرامی شے مہینوں کی ---- !!

خورشید ازہر
معلم، پی۔ ڈبلیو۔ اسکول
آزاد نگر، جمشید پور ۸۳۱۰۱۲

انشاء

روشنی سب کو ملے انشاء تری
زندگی ایسی بنے انشاء تری

حلقۂ شائق کی ہے یہ آرزو
عمر بڑھتی ہی رہے انشاء تری

خوشبوؤں سے چپہ چپہ سیر ہو
یوں کلی کھلتی رہے انشاء تری

ہو مدیر و کارکن کی یہ لگن
مانگ تاروں سے سجے انشاء تری

تیرگی ہو دور ہندوستان سے
شمع گھر گھر میں جلے انشاء تری

سب کو لازم ہے کہ رکھیں ذہن میں
بات جو اچھی لگے انشاء تری

ہے دعا خورشید ازہر کی یہی
مانگ پبلک میں بڑھے انشاء تری

عقیل شاداب
برج راج پورہ
کوٹا ۔ ۳۲۴۰۰۶

انشاء (زندگی کا استعارہ)

اک رسالہ ۔ اک جریدہ ۔ ایک عہد
ترجمان زندگی
نسل نو کی
جس نے کی ہے تربیت
ایک کوزہ
جس میں دریا بند ہے
ایک قطرے میں سمندر
ایک ذرے میں ہے صحرا
اس کے ہر اک حرف میں
ہے اک حکایت
لفظ و معنی کا خزینہ
آبگینہ
جیسے الہامی صحیفہ
جیسے نورانی کتاب
علم کا وہ
ماہ تاب و آفتاب
پرورش پایا **نیاز عصر** کی
آغوش میں
اور اک پودہ تناور بن گیا
علم و حکمت کا وہ جوہر بن گیا
آج وہ پروردہ۔ **اعجاز** ہے
اک **نیاز نو** کی وہ
آواز ہے
محو ہے وہ اک نئی تاریخ کی تخلیق میں
عقل و دانش کا
درخشندہ ستارہ
زندگی کا استعارہ



حیوان

مقصود الہٰی شیخ
مدیر "راوی" - براڈفورڈ (برطانیہ)



جنید ہے

میرا نام جنید عباسی ہے۔ مجھے ڈی پورٹ کیا گیا تو واپسی پر جان کا خطرہ ہے۔ مجھے قتل کر دیا جائے گا۔

میں یہاں دیپ لگتا ہوں تو کچھ میں نہیں آتا، کہاں سے شروع کروں سخت الجھاوا ہے کچھ بھی آساں نہیں جن باتوں کا تعلق میری ہجرت کے ساتھ جڑتا ہے، وہ سب ایک دم کوں کیسے کا اچھی بری یادیں

یادیں کیسے ۔۔ کیسے والی،

سمن میری کلاس فیلو تھی وہ بہت پیاری لڑکی تھی سنجیدہ، خاموش، باوقار۔ ان خصوصیات سے اس کی خوبصورتی بڑھ گئی تھی۔ مجھے سب سے زیادہ اس کی آنکھیں پسند تھیں رنگ کھلتا ہوا اور نقش بھی اچھے تھے چھریرے بدن کے ساتھ قد، مجھ سے چھوٹا - ہاں لڑکیوں میں بڑا تھا۔

بہت دنوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے ---- پھر تعارف ہوا۔

میں نے بتایا، میں اکیلا ہوں۔ یہ اکانہ چھکا دور دیس سے، برباد ہو کر، اس کے شہر میں قدم جمانے آیا ہوں۔

وہ مجھ سے بھی زیادہ مظلوم نکلی۔ دو سال پہلے اس کے ابو ایک دکان پر خریداری کر رہے تھے۔ وہاں بم پھٹا۔ اس کے چیتھڑے اڑ گئے۔ اس کے جسم کے کئی حصے اکٹھا ہونے پر شناخت ہو سکی ۔۔

اس حادثے میں دونوں طرف کے آدمی مرے تھے۔

اس کے ابو تو کسی طرف کے نہ تھے ۔۔
مگر دونوں فریقین نے سمن کے گھرانے کو اپنا مخالف سمجھ لیا!

پہلی برسی کے دوسرے دن سمن کے بھیا زین کا ایک دوست آیا۔ دروازے پر دستک دی۔ چھوٹی چمن اسے پسند کرتی تھی۔ علی کی الگ سی دستک پہچان کر وہ بھیا کے پیچھے رات کے چور کی چال چلتی گئی۔ اسے دیکھ کر علی گھبرا گیا۔ اشارے سے روکا، منع کیا۔ دروازہ زین کھول چکا تھا۔ علی کے پیچھے کھڑے آدمی

نے ایک گولی سے بھیا کو پھر علی کو نشانہ بنایا۔

چمن کی حالت ابھی تک نہیں سنبھلی۔

وہ اور ماں گھر پر ہوتی ہیں۔

سمن کالج آتی ہے۔

کالج کے قریب، بیچ کے خالی اوقات میں، ایک ہمدرد رشتہ دار کی دکان پر پارٹ ٹائم کام کرتی ہے۔

گھر واپسی پر گلی کے بچوں کی ٹیوشن کرتی ہے۔

میں بھی پڑھائی کے ساتھ ساتھ ملازمت کر کے گزارا کر رہا تھا۔

کالج کینٹین میں تعارف اور ملاقاتوں کے بعد،

وہ ہماری پہلی ڈیٹ تھی!
گرمیوں کی ٹھنڈی شام تھی
چاند کی چودھویں تھی
ہم ساحل پر دور تک نکل گئے

ہم چاند کو، اپنے سایوں کو اور ایک دوسرے کو دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہے تھے۔ دل بھرتا نہ تھا۔ جب ساتھ ساتھ چلتے ہوئے ایک دوسرے کو دیکھ نہ سکتے تو آمنے سامنے ہو کر الٹے سیدھے قدموں سے چلتے۔ بڑے مگن تھے۔ پہلے باتیں ختم ہی نہ ہو رہی تھیں پھر کم ہوئیں تو کبھی ہاتھ تھام لیا، خالی نظریں ملیں تو مسکرانے لگتے۔ اب گفتگو میں وقفہ پڑ چکا تھا ------ ذرا فاصلے پر کچھ لوگ ہماری طرف آتے دکھائی دیئے۔ ایک صورت کچھ کچھ آشنا دکھائی دی۔ کوئی جان پہچان نہ تھی۔ کالج میں شاید دیکھا ہو۔ ان لوگوں نے ہمیں بے رحم اجنبیوں کی طرح گھیر لیا، سمن سمٹ کر میرے ساتھ لگ گئی۔ ایک ہاتھ آگے بڑھا چھوٹے قد اور گھٹے جسم کا ہمارا ہی ہم عمر ہوگا۔ اس نے اپنے گروہ کے لیڈر جس کی صورت ہمیں آشنا سی لگی تھی، کے اشارے پر سمن پر جھپٹ کر مجھ سے الگ گھسیٹا۔ سخت ناگوار گزرا۔ مجھ سے رہا نہ گیا۔ میری آواز کی تلخی اور گونج ان لوگوں کو بڑی بری لگی۔ لیڈر کھڑا رہا باقی چاروں پانچوں میرے ساتھ گتھم گتھا ہو گئے۔ مجھے اتنا پیٹا گیا کہ میں بے بس ہو گیا

" اس نے میرا نشانہ بنایا۔ پستول کا رخ میری طرف کر کے چلانے لگا تو فضا میں سمن کی " نہیں ---- نہیں " کی چیخ اتنی بلند ہوئی کہ میں بے سدھ ہوتے ہوئے چونک پڑا بند ہوتی آنکھوں سے میں نے دیکھا، ہاتھ سے نکلتے غیر ہوتے لمحوں میں سمن متوحش اور بت بن چکی تھی ------

یکایک چاندنی بھیانک ہو گئی۔ ایک مہیب اندھیرا بن گئی۔ میں نے سمن کو ان کے ساتھ جاتے دیکھا ------ پھر کچھ یاد نہیں آتا!

ہسپتال سے نکل کر، کٹے وقت کی دھجیاں
جوڑنے پر جان پڑا ----
مجھے ہسپتال پہنچوانے والا،
میری جان بچانے والا،
کوئی اور نہ تھا ------
سمن تھی۔
حقیقت جان کر، حسرت جاگی، میں مر کیوں نہ گیا؟

سمن مجھ سے ملنے سے کترانے لگی۔

کہتی وہ میری جان نہ بچاتی تب بھی اس کے پاس کچھ باقی نہ بچتا۔ جہاں اسے یہ اطمینان ہے کہ میں بچ گیا وہاں یہ قلق بھی ہے کہ میرے لئے اس کے پاس کچھ نہیں ہے۔ میں نے جھٹلایا۔ میرے لئے وہ اب بھی سمن ہے چاندنی ہے میری روشنی۔ پاک، پوتر قابل محبت۔ اسے یقین ہی نہیں آتا تھا۔

اور جب میں نے یقین دلانا چاہا تو ہم ایک دوسرے کی ہمدردی اور چاہت کے اتھاہ سمندر میں ڈوب گئے۔

ایک ہی راستہ رہ گیا تھا،

میں نے کہا قاضی کے پاس چلو، کورٹ میں چلو، محبتوں کے سمندر سے اٹھی وابستگی کو مٹھی میں بند کر لیتے ہیں۔ اسے ضد تھی۔ اصل حقیقت، امر حقیقت ملن ہے۔ باقی سب ڈھکوسلے ہیں، ڈھکوسلوں سے نفرت جنم لیتی ہے۔ شوہر کبھی بیوی کے کوڑھ کو نہیں بھولتا

کیا میں "اس" رات کی یاد اپنے دل دماغ سے کھرچ سکوں گا؟؟؟
کیسے، اس کا دکھ دور کرتا؟
وہ بڑے کٹھن دن رات تھے۔

محبوب کے قدموں میں سینہ چیر کر دل رکھا جا سکتا ہے۔ محبت کی تجسیم ممکن نہیں لٹ جانے کا غم اس کا صبر و یقین اور اعتماد سب کچھ کھا گیا تھا۔ وہ، وہ نہ تھی۔ "میں بھی کہاں" میں رہا تھا!

ہماری چاہت، ہماری مجبوری بن گئی۔
ہمارا تعلق دلدل بنتا جا رہا تھا۔

ہماری محبت ہر راستے سے جنس کی بند
گلی میں محبوس و مقید ہوتی جارہی تھی، ہم بڑا
عجیب کھیل، کھیل رہے تھے۔
میں کھسکتا وہ آنچل گرا دیتی، بازو عریاں
کر دیتی، بلاؤز سرکا دیتی۔
میں مریض تھا، وہ دوا تھی۔ وہ مریض
تھی، میں قریب تھا، حبیب تھا!
ہماری روحیں بھی جسم بن چکی تھیں،
جسم ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہا تھا۔ گوشت گل سڑ رہا
تھا۔ ہڈیاں چٹخ رہی تھیں -------
۔ ملتے، کرب میں رہتے۔ ملاقات بجائے
خود اذیت تھی۔ مسلسل احساس گناہ میں
گرفتار پھڑپھڑا رہے تھے پھر
-- ----

میں نے کہا،
کیسے کہا؟
بس کہہ دیا
اب نہ آیا کرو
میں کسی سے شادی کرنے جارہا ہوں،
میں یہ شہر چھوڑ رہا ہوں میرا دل تم سے
بھر گیا ہے
اس نے بڑی گہری نظروں سے دیکھا
اس کی نظروں میں ایک پوری عورت
تھی جو کائنات ہوتی ہے کائنات کا حسن ہوتی
ہے جو ہر حالت میں مقدس ہوتی ہے وہ
ماں بیٹی اور بیوی ہوتی ہے جب وہ چوتھے
رشتے کا روپ لیتی ہے تب بھی ان رشتوں
سے کٹی نہیں ہوتی
وہ پہلے مجھے دیکھتی رہی
پھر واپس ہونے لگی ----

رک گئی -----
اس نے کہا،
اس نئے موڑ پر، تعلق اس طرح توڑتے
ہیں کہ تقدیس پھر سے پلٹ آئے۔
میں نے کہا
تم آج بھی میرے لئے مقدس ہو

جانے وہ کس تقدس کی تلاش میں تھی۔
شاید خود بھی نہیں جانتی تھی۔
کہنے لگی ---------
تم جس سے شادی کر لو -------
"
پھر ندیا بہنے لگی، وہ رونے لگی۔
مجھے ڈر لگتا ہے"
میں بھی ڈرتی ہوں'
جس بھی نہ اجڑ جائے۔'
شاید وہ دل دہلا کر گئی تھی۔ کئی روز
تک نہ آئی کئی ہفتے گزر گئے ہمیں ملنے کی
عادت تھی شاید اب نہ ملنے کی عادت پڑے
گی۔ میں رہ نہ سکا۔ یہ پچھتاوا مجھے اس کے
گھر لے گیا کہ آج تک ایسا کیوں نہ ہوا۔ اب
راستہ یک طرفہ نہ رہا تو میرے دل میں منزل
کی طرف جانے کی پر سرور مسرتیں جاگ
اٹھیں --------
وہاں سناٹا تھا
ہولناک سناٹا اور خاموشی طاری تھی۔
دروازہ دستک سے کھل گیا۔
صحن میں، چارپائی پر ماں بیٹھی تھی۔
مجھے دیکھ کر ماں بیٹھی کی بیٹھی رہی۔
وہ مجھے پہچان گئی تھی۔ پہلی بار دیکھا مگر

جیسے شروع سے جانتی ہے۔
جانے کتنی دیر ہم چپ کی زبان بولتے
رہے۔ بڑی خاموش خاموش گفتگو ہوئی پھر
بڑی جدوجہد سے ماں میرے مقابل کھڑی
ہو گئی۔
اس نے بڑی مشکل سے کہا۔
------ مجھ سے رویا نہیں جاتا
------ "
بیٹے ------
ممتا بھری آواز میں ایک بول بولنے کے
بعد وہ بڑی کوشش کرکے دوبارہ چارپائی پر
بیٹھ گئی ---- ڈھے گئی۔
کوئی راستہ ڈھونڈنے نکلی تھی۔ خضر تو نہ
ملے، عزرائیل مل گئے۔
لاش ساحل سے اٹھاکر لائے تھے پر
سوکھی تھی۔ مٹھی میں سینٹ کرسٹوفر کا بیج تھا
زنجیر ٹوٹی ہوئی تھی۔
وہی لوگ ہوں گے -----
وہی جس کو بھی اٹھاکر لے گئے

پتہ نہیں وہ زندہ ہے یا وہ بھی مر گئی

میں نے سب سنا۔ میرے کانوں میں
ایک بوڑھی اور نحیف آواز کسی صیقل کی
ہوئی تلوار کی طرح اتر رہی تھی۔ وہ میری
تسلیوں سے ماورا تھی۔ اس کو کچھ نہ کہنا ہی اس
کے پیروں میں پھول ڈالنا تھا۔ اس کا دکھ ہی
اس کی متاع بن گیا تھا۔ اس کا درد ہی مداوا
بن گیا تھا۔
ایک دم اس چپ چاپ گھر میں روشنی

بھر گئی ، شور مچ گیا ۔ در و دیوار چیخ چیخ کر
بولنے لگے ۔ دھاوا بول دیا گیا ۔ چھاپہ پڑا

ماں سے کہلوایا گیا میں سمن کا قاتل ہوں،
چمن کو اغوا کرنے والا ہوں۔
میں اس افسردہ عورت کو دیکھ کر ٹوٹ
رہا تھا ۔ ریزہ ریزہ ہو رہا تھا۔
وہ میری طرف دیکھ کر کہتی -----
نہیں --- نہیں ---
ان کی طرف دیکھ کر کہتی -----
ہاں -----ہاں ---ہاں
میرے سامنے وہی ساحل تھا ۔ داغ داغ
چاندنی تھی ۔ دریدہ شب تھی ۔
تھانے میں کرسی پر وہی بے رحم آشنا سی
صورت تھی ۔ اس کے گرد کھڑے لوگوں میں
وہ پستہ قد، گٹھیلا سور بھی کھڑا تھا ۔ اب اس کا
ہاتھ میری طرف بڑھ رہا تھا۔
میں نے پہلے سے تحریر اعتراف جرم کے
کاغذ پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا۔
اذیت اور کرب اور ٹوٹنے کی رات پھر
شروع ہو گئی -----
وہ ان میں سے نہیں ہو سکتا
کوئی فرشتہ ہو گا
اس کی صورت تک اندھیرے میں نظر نہ
آئی
نہیں جانتا وہ کہاں سے آیا تھا
اس نے مجھے کھول دیا
کہا
اپنا کمبل مجھ پر ڈال کر بھاگ جاؤ ،
نکل جاؤ ، فرار ہو جاؤ -----

بیان -----
"میں بیان لکھوانے کے لئے تیار ہوں
سیاسی پناہ چاہتا ہوں ۔ میرا تعلق مخالف
پارٹی سے ہے -----
میں جان بچا کر آیا ہوں، واپس بھیجنے پر
قتل کر دیا جاؤں گا ۔ اب میرا وہاں کوئی نہیں
میری منگیتر، میرے " ان لاز " سب ہلاک
کر دیئے گئے ہیں وہاں کوئی "لا" نہیں ہے
-----!!!"

ہمارے دوست

ظفر اقبال کو صدمہ

ان کی والدہ کا کلکتہ میں ۹ر فروری ۹۶ء کو طویل اور شدید علالت کے بعد انتقال ہو گیا ۔ تدفین ۱۰ر فروری کو سولہ آنہ قبرستان میں ہوئی۔

خدا مرحومہ کی مغفرت فرمائے اور انہیں گوشۂ جنت عطا کرے۔

ہم اپنے دوست ظفر اقبال اور برادران گرامی شوکت کمال، انور کمال، شاہد کمال، پرویز کمال اور ان کے جملہ اہل خاندان کے دکھ میں شریک ہیں۔

ف ۔ س ۔ اعجاز

خوف بھری نظریں

سنسان راستوں کو
خوف بھری نظروں سے
بے کیف وہ دیکھتی ہے
سوچتی ہے
پھولوں کو دیکھ کر گم صم ہو جاتی ہے
کبوتروں کو دانہ کھلاتی ہے
دھڑکتے دل سے شام کرتی ہے
ہنستی روتی ہے
لیکن
جب شام ہوتے ہی میں گھر آتا ہوں
پیر چھوتی ہے میرے
میری آرتی اتارتی ہے
خوب دعائیں مانگتی ہے
صبح پھر یہی مینکا
خوف زدہ سی لگتی ہے
چوکھٹ کے پاس کھڑی
مجھے گھورتی رہتی ہے
تب تک
جب تک میں خوف بھری سڑکوں سے
اوجھل نہ ہو جاؤں

شہاب اختر شہاب
(للحتہ للاتھا اسٹورس، لہڑاپلی جھریا---!!!

نیلوفر فضل
۱۴، اسمعیل مدن لین
کلکتہ - ۱۲

غزل

ں زندگی نے مجھ پہ ستم کیا کیا نہیں
پے اڑے ہیں ہوش کہ خود کا پتا نہیں

ں روٹھ کر خوشی گئی میری حیات سے
لی سی میرے لب پہ ہنسی کی صبا نہیں

گی تھی زندگی کی دعا پر نصیب سے
غا تو خیر دور ہے مرے دیا نہیں

رہ تھا انتقام کا دل میں میرے مگر
لے کے وقت ہاتھ ہی میرا اٹھا نہیں

ے تباہ حال ہیں دنیا میں باوفا
ر بے وفاؤں کو کوئی کہتا برا نہیں

ے دل نہ چھیڑ اس کی جفاؤں کا تذکرہ
ہ دیا ہے زخم کہ اب تک بھرا نہیں

ہ زندگی میں یوں تو بہت دوست نیلوفر
ے کے بعد کوئی بھی رویا ذرا نہیں

ریحانہ نواب
کلکتہ



غزل

اے صبح وطن تیرا انداز نرالا ہے
ذہنوں میں اندھیرا ہے آنکھوں میں اجالا ہے

اللہ ری یہ دوری اور اس پہ یہ مجبوری
ہر راہ میں کانٹے ہیں اور پاؤں میں چھالا ہے

تم پیاس کی آنکھوں سے دیکھو تو ذرا اس کو
جمشید کا ساغر بھی مٹی کا پیالا ہے

آئینۂ عبرت ہے ہر نقش قدم میرا
اک پاؤں کی لغزش نے کتنوں کو سنبھالا ہے

کیوں دل میں جلن ہوتی آنسو نہ اگر پیتے
پانی کی نخوت نے پھر آگ میں ڈالا ہے

ہر دانے میں پوشیدہ سو دام ہیں ریحانہ
اور بھوک کہتی ہے سونے کا نوالا ہے

نور جہاں نوری
4 LEANDER COURT,
LONDON NW9 5GQ

غزل

میرے لئے سلام کہ دشنام کچھ بھی ہو
دست صبا سے بھیجئے پیغام کچھ بھی ہو

خوشبو ہے، جلترنگ ہے، شعلہ ہے، برق ہے
مجھ کو نہیں غرض کہ ترا نام کچھ بھی ہو

میں رہ نورد شوق ہوں چلتی ہی جاؤں گی
منزل ملے، نہ مل سکے انجام کچھ بھی ہو

رنگوں میں ایک رنگ محبت کا رنگ ہے
رنگوں کے امتزاج پہ الزام کچھ بھی ہو

زہراب ڈال کر بھی پلادے وہ پیار سے
پی لوں گی میں خوشی سے تہ جام کچھ بھی ہو

افسردہ زندگی ہو کہ آسودہ زندگی
لیتی رہوں گی نام ترا کام کچھ بھی ہو

ہر سمت جلوے دیدنی نوری کے ہوگئے
رم جھم ہو یا دھنک ہو لب بام کچھ بھی ہو

نسیم شاہجہاں پوری
نارین جلال نگر
شاہجہاں پور (یوپی)



غزلیں

بے انجام و بے آغاز
تیری ہستی راز ہی راز

دل کو بخشا سوز و گداز
تیرے غم کی عمر دراز

تیرا جلوہ ! جلوہ طراز
حد نظر تک راز ہی راز

درد سلامت ! ناممکن
میں اور منت چارہ ساز

ان کے جلوے، میرا دل
آئینے میں آئینہ ساز

دیدۂ و دل دونوں بدخواہ
کوئی نہیں اب محرم راز

کوئی اگر سمجھے تو نسیم
خاموشی بھی ہے آواز

ذوقِ طلب ہو گر کامل
خود کھنچ آتی ہے منزل

دونوں عالم کا حاصل
ان کی محبت، میرا دل

ان کی یادوں کے قرباں
تنہائی بھی ہے محفل

ایک نگاہِ بے پروا
عرضِ تمنا کا حاصل

جانتے ہیں اربابِ جنوں
فاصلہ ہائے دیدۂ و دل

جب ٹوٹے آواز نہ ہو
اللہ اللہ شیشۂ دل

ان کے درد سے مجھ کو نسیم
بے مانگے سب کچھ حاصل

نثار جیراجپوری
اعظم گڑھ - ۲۷۶۰۰۱

غزل

اب کسی خواہش کا دل میں ساز باقی ہی نہیں
گنبدِ جاں میں کوئی آواز باقی ہی نہیں

کھل نہیں پاتے نشیمن میں بھی اپنے پنکھ اب
شل ہیں بازو قوتِ پرواز باقی ہی نہیں

عمر کی ویرانیوں میں آرزوؤں کی تھکن
گونجتی ہے بے صدا آواز باقی ہی نہیں

گنگ ہو کے رہ گئی ہے شہر قاتل کی زباں
کھل گئے سب راز کوئی راز باقی ہی نہیں

شہر کی آب و ہوا ہے ان فصیلوں میں اسیر
جن فصیلوں کا کوئی ہمراز باقی ہی نہیں

سو گئیں ساری بہاریں آرزو کی فصل میں
موسموں میں اب کوئی انداز باقی ہی نہیں

ڈوبتی آنکھیں لبوں پہ ہے زمانے کی خراش
اے نثار ان میں وہ اب انداز باقی ہی نہیں

کامیابی

ستارہ لطیف خانم
بریڈفورڈ (برطانیہ)

سارا دن بارش ہوتی رہی تھی۔ بارش سے بچنے کے لئے بھاگتے ہوئے لوگ سڑکوں اور گلیوں میں یوں نظر آتے جیسے بدروح سائے شہر ویران اور بارش کی سلیٹی دھند میں لپٹا ہوا سا لگتا تھا۔

جب وہ دونوں ریلوے سٹیشن پہنچے اس وقت بھی بارش اپنے زوروں پر تھی۔ پلیٹ فارم ویران، مسافروں کے انتظار میں کھڑی ٹرین پر بارش کے قطرے موتیوں کی طرح لڑھک رہے تھے۔

آج صبح جب اعزاز کی آنکھ کھلی تو وہ بستر پر تنہا تھی۔ پرنالوں سے گرتے ہوئے بارش کے پانی نے اس کا استقبال کیا۔ اس صبح کی بس یہی ایک پہچان تھی۔ تنہائی اور بارش۔ اس کا گھر میں تنہا ہونا کوئی نئی بات نہ تھی۔ جمشید اس کا شوہر عموماً گھر سے باہر رہا کرتا تھا۔ آج وہ ایک بوجھ سا لیے نیند سے جاگی تھی۔ جیسے کوئی اس کا دل مسوس رہا ہو۔ اس نے لیٹے سوتے ہوئے دماغ میں اداسی کا جواز تلاش کرنا چاہا۔ وہ جانتے ہوئے بھی اداسی کی وجہ سے نظریں چرا رہی تھی، مگر اداسی ایک خونخوار درندے کی طرح اپنے تیز نشتر سے پنجوں کے ساتھ جس اسی انتظار میں تھی کہ ابھی اس کو چیر پھاڑ کر ختم کر دے گی، اس نے کروٹ بدلی۔ اسی اثناء میں اس کے بیڈ روم کا دروازہ کھلا دروازے کے ہینڈل سے ذرا سا اوپر مراد کا خوبصورت بالوں سے بھرا سر نظر آیا۔ جو آہستگی سے دروازہ بند کر رہا تھا پھر اس کا خوبصورت چہرہ جس کی کالی کالی آنکھوں میں اس درد کا عکس نمایاں تھا جو اس کے اپنے اندر موجزن تھا۔ اس کے کپڑے سلوٹوں سے بھرپور تھے۔ وہ دوڑتا ہوا اس کے پاس آکر اس کے بستر میں گھس گیا۔ اس نے اسے پیار سے اپنے ساتھ لپٹا لیا۔ وہ کچھ اس کے ساتھ لپٹا رہا۔ وہ اس کے جسم سے اٹھتی سوئی سوئی بھینی بھینی تازہ ڈبل روٹی کی سی خوشبو (جو تمام بچوں کا خاصہ ہے جب وہ سو کر اٹھیں) میں کھو ہی گئی۔ اس کا دماغ معطر سا ہو گیا۔ وہ دونوں مسلسل میں ایک دوسرے کے ساتھ لپٹے رہے۔ ان دونوں کے درمیاں ایک سکون آمیز خاموشی تھی۔ وہ دونوں دنیا سے دور بہت دور ایک جنت میں تھے۔

کچھ دیر بعد دونوں ماں بیٹا کچن میں گئے۔ اس نے اس کا پسندیدہ ناشتہ تیار کیا۔ مگر وہ کھا نہ سکا۔ اس کی اداسی کا رنگ نمایاں تھا۔

"آپ حلیم کو بتا دیں گی ماں کہ میں اس کے سکول نہیں جا سکتا۔ اس نے یہ سوال نہ جانے کتنی بار کیا تھا۔ ہاں ہاں میں اسے بتا دوں گی کہ تم اس کے سکول نہیں جا سکو گے۔ وہ صبح سے یہ سوال کتنی بار دہرا چکا تھا۔ میرے دور جانے کا مطلب یہ تو نہیں کہ کہ ہم اب دوست نہیں رہے۔ ہماری دوستی تو رہے گی نا، اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔ ہاں میں حلیم سے کہوں گی کہ مراد تمہارا دوست ہے اور رہے گا۔ وہ تمہیں خط بھی لکھا کرے گا۔ اعزاز نے وعدہ کرتے ہوئے کہا۔ "اوہ میری جان میں یہ سب کچھ کیوں کر کہہ پاؤں گی۔ تمہارے ساتھ یہ سب کچھ ہوتا ہے کیسے دیکھ سکوں گی" سوچتے ہوئے اس کا دل جیسے رو دیا

مگر اب وقت آگیا تھا جیسے وہ دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ یہاں ٹھنڈے اور مختلف آوازوں سے گونجتے پلیٹ فارم پر اسے اپنا بیٹا رضاکارانہ کچھ اجنبی لوگوں کے حوالے کرنا تھا۔ اچھے تربیت یافتہ لوگ جو اس کی دیکھ بھال کریں گے۔ مگر ان لوگوں کو یہ تو نہیں معلوم کہ یہ سوتے میں باتیں کرتا ہے۔ ہاتھ منہ دھوتے وقت صابن اس کے کانوں میں رہ جاتا ہے۔ اور کئی بار تو کپڑے بھی الٹے پہن لیا کرتا ہے۔ "یہ لمحہ" یہ میری زندگی کا سب سے برا

لمحہ ہے ۔اس نے یاس بھرے دل سے سوچا۔

اس نے ذرا جھک کر اسے اپنے قریب کر لیا۔ وہ اسے گلے لگانا چاہ رہی تھی ۔ وہ ذرا پیچھے ہٹ گیا۔ جیسے اس سے دور نہ رہنے کی کشمکش میں ہو۔ اس نے ہزار مسکرانے کی کوشش کی مگر دل تھا کہ بس سے باہر ہوتا جارہا تھا۔ پھر بھی وہ بھرپور بہادری کا مظاہرہ کرتے ہوئے مسکرائی ۔ اس نے دیکھا کہ اگر وہ آنکھ جھپکتا تو آنسو ٹپک پڑتے جو اس کی پلکوں پر امڈ آئے تھے ۔ "اچھا میرے بیٹے میری جان اللہ حافظ و نگہبان " اس نے جلدی سے کہا ۔ وہاں سکول میں خوب دل لگا کر پڑھنا، نئے نئے دوست بنانا، کھیلوں میں حصہ لینا، تمام کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا ۔ اور ۔ اور اس کی آواز کی بناوٹی خوشی ان دونوں کو بہلا نہ سکی ۔ اس کی آواز لڑکھڑا گئی ۔ تم دیکھنا وقت کتنا جلدی گزر جائے گا ۔ جب تم کرسمس کی چھٹیوں میں واپس آؤ گے تو تجھے دیکھو گے کہ ابھی تک تمہارا بیڈ روم صاف کرنے کو پڑا ہے ۔ ہے نا ۔ اس نے پھر سے کوشش کرتے ہوئے کہا ۔ آپ میرے کھلونے پھینک تو نہیں دیں گی؟" نہیں ہرگز نہیں میری جان" اور ۔ اور میں تمہیں خط بھی لکھا کروں گی اور ٹیلیفون پر ڈھیر ساری باتیں ہوا کریں گی ۔ اس کی آواز پھر کہیں کھو سی گئی ۔ "یہ سب کچھ ٹھیک نہیں ہے " اس نے سوچا ۔ اس کا دماغ درد اور غصے کے بھنور میں چکرا رہا تھا، رشید چاہے جو بھی کہیں یہ سب کچھ غلط ہو رہا ہے ۔ یہ بے رحمی کی حد ہے اسے کوئی بھی شئے متاثر کر سکتی ہے ۔ ابھی یہ بہت چھوٹا ہے ۔ اسے ابھی میری ضرورت ہے ۔ اتنے میں ایک لڑکا ان کی طرف بڑھا ۔ اور اس نے مراد کا بازو ہلاتے ہوئے کہا "کیا تم رشید ہو" ۔ مجھے مسٹر ایڈورڈ نے تمہاری دیکھ بھال کے لئے مقرر کیا ہے ۔ "اوہ کیا یہ ابھی سے مسٹر رشید کہلائے گا" اعزاز نے بے چینی سے سوچا ۔ ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے ۔ یہ اسے رشید نہیں کہہ سکتے ۔ اس نے دیکھا مراد کچھ ہچکچایا اور شرما کر پیچھے ہٹ گیا ۔ لڑکے نے ہنستے ہوئے اس کے سوٹ کیس کو ٹھوکر لگائی ۔ اچھا تو یہ تمہارا ہے ؟ آؤ ۔ میرے ساتھ چلو ۔ اس سے پہلے کہ ہم دونوں کے لئے کوئی سیٹ ہی نہ بچے ۔ اس نے ایک حسرت بھری نگاہ ڈالی اور مراد سکول کے یونیفارم کے ایک سیلاب میں بہتا ہوا ٹرین پر سوار ہو گیا ۔

" خدا کا شکر ہے چھٹیاں ختم ہوئیں ۔ اب ذرا چین ہو گا " اسے احساس ہوا کوئی اس سے مخاطب تھا ۔ اعزاز نے نگاہ پھیر کر دیکھا ایک عورت جو بے حد میک اپ کئے ہوئے تھی اس سے باتیں کر رہی تھی ۔ ان دونوں کے علاوہ اور بھی والدین کا گروپ سا بنا ہوا تھا ۔ اس کا اترا ہوا چہرہ دیکھ کر وہ عورت مسکرائی ۔ اور اپنے ناخن پالش زدہ ہاتھ اس کے بازو پر رکھتے ہوئے بولی ۔ شاید یہ تمہاری پہلی بار ہے ۔ ہے ناں ؟ مجھے ہمیشہ پتہ چل جاتا ہے ۔ لیکن تم زیادہ فکر نہ کرو ۔ یہ بچے بورڈنگ سکول سے جلد مانوس ہو جاتے ہیں ۔ "آپ کو معلوم ہے یہ مانوس ہو جاتے ہیں ؟" اعزاز نے استفسار کیا ۔ مگر اس کا تو دل ڈوبا جا رہا تھا ۔ "یقین کرو ایسا ہی ہے "اور ویسے بھی انسان کو اپنے کاموں کے لئے فرصت درکار ہوتی ہے اور یہ فرصت سکول کے دنوں میں مل ہی جاتی ہے ۔ وہ عورت ہنس دی ۔ "اگر اتنی ہی فرصت درکار ہے تو پھر انسان کو بچے پیدا کرنے کی ایسی کیا ضرورت پڑی ہے " اعزاز نے بغیر سوچے ہی کہہ دیا ۔ وہ عورت گڑبڑا سی گئی ۔ ارے عالیہ ۔ کیسی ہو، اس نے تقریباً چلاتے ہوئے کہا اور اسے وہیں چھوڑ کر چل دی ۔ اعزاز ان دونوں کو محو گفتگو دیکھ رہی تھی، مراد بچوں کے ہجوم میں نہ جانے کہاں کھو گیا تھا ۔ اعزاز نے پاگلوں کی طرح گاڑی کے ڈبے کی کھڑکیوں میں جھانکنا شروع کر دیا ۔

ابھی چند ہی ہفتوں کی بات ہے کہ رشید اسے اپنا پرانا بورڈنگ سکول دکھانے لے کر گئے تھے ۔ گرمیوں کا موسم ہونے کے باوجود بھی سکول کی ٹھنڈی اور پرانی یخ بستہ عمارت دیکھ کر اس کا دل بھر آیا تھا ۔ کھیل کا وسیع و عریض میدان سبزے سے ہرا بھرا تھا ۔ سکول کی بڑی بڑی کھڑکیوں کے پاس گلاب کی کیاریوں میں خوش رنگ پھول ہوا میں لہلہا رہے تھے مگر پھر بھی وہ اعزاز کے دل کو بہلا نہ سکے ۔ عمارت کے اندر بنے ہوئے چھوٹے چھوٹے کمرے، قطار در قطار لگے ہوئے تام چینی کے باتھ ٹب میں جن کی چینی جگہ جگہ سے اکھڑی ہوئی تھی ۔ تاریک بجھا بجھا سا ڈرائینگ ہال جس کے درمیان ایک بڑا سا ڈائیننگ ٹیبل جس پر موم جامے کا میز پوش بچھا تھا ۔ ساری عمارت کا معائنہ کر کے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے یہ ایک اعلیٰ سکول نہیں کوئی جیل خانہ ہو ۔

واپسی پر ڈرائیو کرتے ہوئے رشید نے دریافت کیا بھئی اعزاز تم اتنی خاموش کیوں ہو ۔ تمہیں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ۔ یقین جانو مراد کو یہ جگہ بہت پسند آئے گی ۔ اسے یہاں ایک اچھا آدمی بننے کی تربیت دی جائے گی ۔ اور ویسے بھی مجھے اس جگہ سے بے حد پیار ہے یقیناً مراد یہاں خوش

رہے گا۔ رشید نے اسے تسلی دی۔ "ہمارا مراد یہاں ایک سلجھا ہوا جوان بنے گا"۔ وہ تو ابھی چند دن پہلے سات سال کا ہوا ہے۔ آپ نے کبھی سات سالہ نوجوان آدمی دیکھا ہے؟ وہ ہنس دیا۔ اس کی ہنسی میں طنز کا عنصر نمایاں تھا۔ "ایسی باتیں کرنا صرف تمہارا ہی کام ہے" اپنے گھر کی چہار دیواری میں تمہیں کیا معلوم کہ باہر کی دنیا کیسی ہے۔ باہر کی دنیا بے حد ظالم اور بے حس ہے۔ اس سے نپٹنے کے لئے انسان کو سخت ہونا پڑتا ہے۔ باہر کی دنیا میں زندہ رہنے کے ڈھنگ سیکھنے پڑتے ہیں۔ "تمہاری طرح، اس نے پوچھا۔ اس نے قہر بھری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ ہاں۔ اگر تم ہی سننا چاہتی ہو تو ہاں۔ میری طرح۔ اور تمہیں یہ بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ میں اگر کامیاب انسان نہ ہوتا تو اتنے اعلیٰ سکول میں اپنے یعنی ہمارے بیٹے کو یہاں تعلیم نہ دلوا سکتا۔ اس سکول میں صرف اور صرف اعلیٰ گھرانوں کے بچے تھے۔ موبائیل ٹیلیفون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اور وہ گفتگو میں مصروف ہو گیا۔ کوئی کاروباری بات چیت ہو رہی تھی۔ اعزاز نے کھڑکی سے باہر دیکھنا شروع کر دیا اور بھاگتے ہوئے منظروں میں کامیابی کے معنی تلاش کرنے لگی۔

یقیناً کامیابی ہر شخص کے لئے مختلف معانی کی حامل ہے۔ رشید کے لئے اس کا مطلب طاقت، پہچان، جائیداد تھا۔ اس کا مطلب خطروں سے کھیلنا۔ ہمیشہ انتہا کی حدوں کو چھونا۔ اپنے آپ کو امتحاں میں ڈالنا۔ اوروں کے امتحان لینا۔ دوسرے لوگوں کے صبر کا پیمانہ ناپتے رہنا۔ اس کا مطلب ہر حال میں جینا۔ اس کا مطلب دن بدن مغرور و خود سر ہوتے جانا۔ دوسروں کے جذبات سے لاپرواہی برتنا۔ گھریلو ذمہ داریوں اور گھر والوں کو درخور اعتنا نہ سمجھنا۔ اور اب اپنے بیٹے کو خود وقت دینے کے بجائے چند اجنبی لوگوں کے حوالے کرنا تاکہ اس کی طرح کامیاب آدمی بن سکے۔ دور گھر سے دو سو میل دور بورڈنگ سکول میں

ریل گاڑی کے دروازوں نے بند ہونا شروع کر دیا تھا۔ اچانک کھڑکی کے پاس اسے مراد کا چہرہ نظر آیا۔ چند انچ کے فاصلے پر اس کا اپنا چہرہ تھا۔ دونوں ایک دوسرے کے طرف اداس اداس دیکھ رہے تھے۔ اس نے کھڑکی کے گیلے شیشے پر اپنا ہاتھ رکھ کر پھیلا دیا۔ اور اس نے اندر سے اس کی پھیلی ہوئی انگلیوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ ایک تھرکتا ہوا آنسو اس کی آنکھ سے گر کر اس کے گال پر پھسلنے لگا۔ اسی لمحے اعزاز کو ایک انجانی سوچ نے جھنجھوڑ کر رکھ دیا کہ وہ کچھ کرے۔ ایک ادھیڑ سا آدمی ہاتھ میں چند پیپر تھامے اس کے پاس سے گزرا۔ یقیناً وہ ناموں کی فہرست اٹھائے ریل کی سیڑھی چڑھنے کو تھا۔ اس نے اس کا بازو تھام لیا مسٹر ایڈورڈ۔ جی۔ آپ مسز رشید ہیں ناں؟ ح جی ہاں میرا بیٹا اسی کمپارٹمنٹ میں ہے۔ ذرا اس کو بلا دیں۔ پلیز ذرا اسے میرے پاس لے آئیں۔ مسٹر ایڈورڈ نے اپنی رسٹ واچ کی طرف دیکھا۔ مگر۔ پلیز۔ ایک ضروری بات کہنا ہے۔ "مائیں" بھلا ان بچوں کو ماؤں کی ایسی کیا ضرورت ہے وہ اس کی آنکھوں کی تحریر پڑھ چکی تھی۔ "پلیز" اس نے مصنوعی مسکراہٹ سجاتے ہوئے دہرایا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ مسکرا دیا۔ بہت اچھا۔ مگر یاد رہے آپ کے پاس صرف چند لمحے ہیں۔ گاڑی بس چلنے ہی والی ہے۔ ہاں میں جانتی ہوں آپ ذرا جلدی کریں ناں۔ آخری مسافر بھاگم بھاگ گاڑی میں سوار ہو رہے تھے۔ گارڈ نے سیٹی بجائی۔ ٹرین بس چلنے ہی کو تھی کہ دروازے پر اسے مراد نظر آیا۔ اعزاز نے اسے اپنی باہوں میں سمیٹ لیا۔ اس نے دیکھا مسٹر ایڈورڈ حیرانگی سے چلا رہا تھا۔ مسز رشید۔ مسز رشید آپ یہ کیا کر رہی ہیں۔ آپ ایسا نہیں کر سکتیں۔ ہاں میں ایسا کر سکتی ہوں بلکہ ایسا کر چکی ہوں اس نے چلاتے ہوئے جواباً کہا۔ گاڑی کا دروازہ بند ہوا اور چل دی۔

مراد کے بازو اس کی گردن کے گرد اس قدر سختی سے لپٹے ہوئے تھے کہ وہ تقریباً اس کا گلہ گھونٹ رہے تھے اس نے ہاتھوں سے اس کی گرفت کو ذرا ڈھیلا کیا اور بے تحاشہ ہنستے ہوئے اسے گول گول گھمانے لگی۔ اور تقریباً چکراتے ہوئے اسے پلیٹ فارم پر بٹھا دیا۔ اور اس کے ساتھ خود بھی بیٹھ گئی اس کا دل بے طرح دھڑکے جا رہا تھا۔ ان کے ارد گرد کھڑے لوگ انہیں عجیب نظروں سے گھورے جا رہے تھے۔ مگر اعزاز ان سب سے بے نیاز اپنے بیٹے کے معصوم چہرے کو دیکھے جا رہی تھی۔ اس نے انگلیوں سے اپنے بیٹے کے گالوں سے آنسوؤں کے نشان دور کیے۔ مراد تمہیں معلوم ہے کامیابی کے معنی کیاں ہیں؟ اس نے اس سے پوچھا۔ مجھے نہیں معلوم۔ اس نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ کیا۔ اس کا مطلب خوش رہنا ہے؟ ہاں۔ ہاں میری جان۔ اس کے سچ اور سچے معنی یہی ہیں۔ اس نے پیار سے اس کا سر چوم لیا۔ چلو اب گھر چلیں۔ گھر۔ مراد نے اوپر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ہاں گھر اس نے ایک لمبی سانس لیتے ہوئے کہا۔ کیا مجھے اب سچ مچ لندن بورڈنگ سکول نہیں جانا، مگر ڈیڈی۔ کیا کہیں گے؟ اس کی کالی کالی آنکھوں میں خیال کی

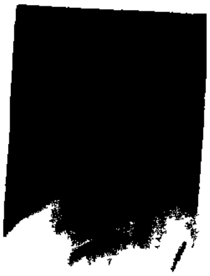
پرچھائیاں دوڑنے لگیں۔ تم اس کی فکر نہ کرو۔ میں تمہارے ڈیڈی کو سمجھادوں گی۔ اعزاز نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

مجھے تمہارے ڈیڈی سے ڈھیر ساری باتیں کرنا ہے۔ جب وہ ٹوکیو سے واپس آئیں گے تو میں انہیں سب سمجھادوں گی۔ اس نے مراد کا ہاتھ تھاما اور چل دی۔ دوسرے والدین بھی واپس جارہے تھے۔ واپس اپنے بچوں کے بغیر اپنی زندگی گزارنے کے لئے اس نے مسکراتے ہوئے سوچا۔ باقی ماندہ والدین کے گروہ نے اسے یوں نظرانداز کردیا کہ جیسے وہ کبھی ان کے گروہ میں شامل ہی نہ تھی۔ اس نے لگے بندھے قاعدے سے روگردانی کرکے خود کو ان سے جدا کرلیا۔ اس نے قہقہہ لگایا۔ بارش اب رک چکی تھی۔ سٹیشن سے باہر سڑک پر جابجا چھوٹے چھوٹے گڑھوں میں تیل کی قوس قزح چمکتی نظر آئی تھی۔ مراد نے اس کا ہاتھ اونچا کرکے چھلانگ لگائی۔ کیا میں اب حلیم کے سکول جاؤں گا۔ میں نے اس کا سکول دیکھا ہے مجھے بے حد پسند ہے۔ ہاں بیٹا تم اب یہیں بریڈفورڈ ہی میں پڑھوگے۔ مراد خوشی سے جھوم اٹھا۔ میں حلیم کے ساتھ ڈے بوائے ہوں گا۔

تجدید ممبری

ملک میں اور بیرون ملک جن ممبروں پر سابقہ عرصہ کی رکنیت فیس باقی ہے ان سے گزارش ہے کہ وہ بلاتاخیر ممبری چندہ بذریعہ منی آرڈر، بینک ڈرافٹ، برطانوی پوسٹل آرڈر بنام " انشاء پبلی کیشنز"، روانہ کردیں۔ اور آئندہ ۱۲ عام شماروں کیلئے بھی زرسالانہ بھیج دیں۔ ——— انشاء

ننگا سچ



جمیل آفتاب
چاندور بازار ۴۴۴۷۰۴
ضلع امراوتی (مہاراشٹرا)

آشو بیٹے! ۔۔۔۔ ٹی ۔ وی شروع کر کے دیکھو کہ کہیں چترہار شروع تو نہیں ہو گیا؟" آٹا گوندھتے گوندھتے باورچی خانے میں سے ماں نے اپنے آٹھ سالہ بچے کو آواز دی۔

"میں اپنے اسکول کا ہوم ورک کر رہا ہوں ممی ۔ پلیز مجھے ڈسٹرب نہ کیجئے۔" لڑکے نے جھنجھلاتے ہوئے جواب دیا۔

"ہوم ورک بعد میں کر لینا بیٹے" ۔ ماں نے اب کی مرتبہ نہایت ہی پیار سے پچکارتے ہوئے کہا۔

"اچھی بات ہے۔" لڑکے نے پیشانی پر بل ڈالتے ہوئے جواب دیا اور ٹی ۔ وی آن کر دی۔

"ممی! ۔ ابھی گانے شروع نہیں ہوئے ہیں ۔ ایڈورٹائزمنٹ آرہی ہے۔" لڑکا ٹی ۔ وی شروع چھوڑ کر اپنی کاپی کتابوں کے پاس جا بیٹھا۔

"مالا ڈی گولیاں۔

جی ہاں! ہر رات سونے سے پہلے صرف ایک گولی۔

گولی کھائیں آپ، جب تک نہ بچہ چاہیں آپ۔"

شاید میری ممی کی طرح اس ٹی ۔ وی والی عورت کی بھی طبیعت ہمیشہ خراب رہتی ہوگی ۔ اسی لیے وہ یہ گولی ہر رات سونے سے پہلے کھانے کا کہہ رہی ہے میری ممی بھی وہی گولی ہر رات سونے سے پہلے ضرور کھاتی ہے ۔ وہ دل ہی دل میں سوچنے لگا ۔ وہ بے حد ذہین تھا ۔ حالانکہ صرف تیسری جماعت کا طالب علم تھا مگر چونکہ انگلش میڈیم کا طالب علم تھا اس لئے انگریزی زبان میں چھپی ہوئی ہر چیز کو پڑھنے میں اسے خوب مزہ آتا تھا ۔ اب وہ ہوم ورک کی کاپی بند کر کے پوری طرح ٹی ۔ وی کی ایڈورٹائزمنٹ کا لطف لینے میں مصروف ہو گیا تھا۔

آشو بیٹے! گانے شروع ہو جائیں تو مجھے آواز دے دینا ۔ یہاں اسٹوو کی آواز میں مجھے کچھ بھی سنائی نہیں دے رہا ہے۔" ماں نے اونچی آواز میں ہدایت کی

"جی ممی۔"

"سپر ڈی لکس نرودھ

پیار کا ربلی احساس

دو بچوں میں انتر کا سب سے اتم سادھن

اب آپ کے شہر کے ہر میڈیکل اسٹور میں موجود"

آشو اس اشتہار کو سمجھنے کی کافی دن سے کوشش کر رہا تھا، مگر یہ کوشش اس کی دسترس سے دور تھی ۔ اسی اثناء میں اس کے والد اپنے ایک دوست کے ہمراہ تشریف فرما ہوئے۔

"انکل کو سلام کرو بیٹا ۔" والد صاحب نے پیار سے آشو کو مخاطب کیا۔

"السلام علیکم!"

ماہنامہ انشاء کلکتہ

"وعلیکم السلام ! - بڑا پیارا بچہ ہے -" مہمان نے آشو کے گال پر ہلکی سی چپت لگاتے ہوئے کہا۔
"رکمنی رکمنی ۔ شادی کے بعد کیا کیا ہوا؟
کون ہارا کون جیتا
کھڑکی میں سے دیکھو ذرا "

"ممی ! جلدی آیئے گانے شروع ہو گئے -" آشو نے زور سے ، خوشی بھرے لہجے میں ماں کو پکارا۔ لیکن دوسرے ہی پل ، والد صاحب کی موجودگی کا احساس ہوتے ہی وہ فوراً خاموش ہو گیا۔ آشو کی والدہ پردے کی اوٹ سے ٹی ۔ وی دیکھنے لگیں ۔ والد صاحب کے ڈر سے آشو نے کتاب کھول تو لی مگر اس کی تمام تر توجہ کا مرکز ٹی ۔ وی میں گانا گانے والی وہ بے شرم ہیروئن رہی جو نت نئے انداز سے تھرک تھرک کر اپنے سینے اور کولھوں کو مٹکا رہی تھی اور ہیرو لنگور کی طرح اچھل کود کر گانا گا رہا تھا۔

"پاپا ! -" اچانک آشو نے نہایت ہی معصومیت کے ساتھ اپنے باپ سے سوال کیا۔ "نرودھ کسے کہتے ہیں؟ اور اسے کس لیے استعمال کرتے ہیں ؟" آشو کا یہ سوال سنتے ہی کمرے میں یوں سناٹا چھا گیا گویا اچانک بجلی فیل ہو گئی ہو۔

"ایسے گندے سوال نہیں پوچھا کرتے بیٹا۔" والد صاحب نے جھجک اور پیار کے ملے جلے انداز میں جواب دیا۔

"لیکن پاپا۔ آپ ہی تو کہتے ہیں کہ ہر جوان ، بچے اور بوڑھے کو فوری علاج کی پوری معلومات رکھنی ضروری ہے۔"

"بالکل ضروری ہے۔" والد صاحب سمجھاتے ہوئے بولے "مگر اس سوال کا فوری علاج سے کیا تعلق؟"

"تعلق ہے پاپا۔ کیونکہ نرودھ نام کی دوائی میڈیکل میں ملتی ہے اس لئے مجھے یہ بھی تو معلوم ہونا چاہیے تاکہ اسے کب ، کہاں ، کیسے اور کس بیماری کے لیے استعمال کرتے ہیں ؟" آشو ایک لمحہ رک کر پھر بولا ۔ "کیا اسے گولی کی طرح پانی کے ساتھ پیتے ہیں یا پھر کسی زخم پر بینڈی پلاسٹ کی طرح لگاتے ہیں ۔ ؟" کمرے میں موجود تینوں جاندار چہرے یہ سوال سنتے ہی ترم سے پانی پانی ہو گئیں ۔

دہلی کے مشاہدات و تجربات

رئیس الدین فریدی
کلکتہ



۲۵/ جنوری ۵۰ کو سورج نکلتے ہی اس خوف سے کہ مالک مکان پھر قرقی لے کر نہ آجائے گھر کے سب سامان اور بیوی بچوں سمیت شاہ صاحب گنج میں جسے گھوڑے کی قبر بھی کہتے ہیں شرماجی نے گھر پہونچا دیا۔ بھائی نے جو میری بیوی کی بڑی بہن کے ہوتے تھے پورے گھر نے خاطر مدارات میں کوئی کسر نہیں رکھی۔ سفر کے لئے کافی کھانا بھی پکادیا۔ رات کو جب پورا حیدرآباد آٹھویں یوم جمہوریہ کی خوشی میں بقعہ نور بنا ہوا تھا میں ایسی حالت میں جسے بے سروسامانی کا عالم ہی کہہ سکتے ہیں موجودہ خستہ حالی اور تاریک مستقبل کا خطرہ دل میں لئے نامپلی اسٹیشن آیا جہاں سے ایکسپریس ٹرین سکندرآباد جاتی اور وہاں طویل فاصلے کی ٹرینوں میں جڑ جاتی تھی سردی بہت تھی اور اس سے بچنے کا سامان کم کافی شوٹنگ کی بات تھی مگر سردی میں ہندوستانی ریلیں جو بہ مسافروں کی کثرت اور کھڑکیاں بند ہونے کی وجہ سے ضرورت سے زیادہ گرم ہو جاتی ہیں اس لئے دن رات میں ۴۸ گھنٹے کوئی خاص تکلیف نہ ہوئی مگر جب گاڑی نے نئی دہلی کے اسٹیشن پر چھوڑا تو ہاتھ پیر شل ہی محسوس نہیں ہوئے بلکہ ساتھ چھوڑتے لگنے لگے اور منہ سے بات کی جگہ صرف بھاپ نکلنے لگی۔ نہ اپنی کہی جائے نہ دوسرے کی سنی جائے۔ خدا خدا کر کے ایک تانگے والے کو پرانی دہلی کے اسٹیشن پر پہونچانے کے لئے راضی کیا۔ تانگے میں بستر، صندوق اور برتنوں کا تھیلا لادا۔ تانگہ پیچھے کی طرف کو اتنا جھکا کہ اپنے آپ کو اور سامان کو اس کے اوپر رکھنا مشکل ہو گیا۔ پرانی دہلی کے اسٹیشن سے مرادآباد جانے والی گاڑی پکڑی تو بند کھڑکیوں کی وجہ سے سردی تو کم رہی مگر سارے ڈبے کا ماحول انتہائی روح فرسا اور دم ربا تھا۔ فرش پر غسل خانے اور پاخانے کا گندہ پانی بہتا ہوا، مونگ پھلی کے چھلکوں کا قالین بچھا ہوا، تنڈوں پر طرح طرح کا بے تکا سامان اور تمباکو نوشی کا دھواں بھرا ہوا جس سے دم گھٹ رہا تھا۔ دوائیں اور مونگ پھلی بیچنے والوں اور بھکاریوں کی نظم و نثر کی گوہار کانوں کے پردے پھاڑ رہی تھی اور آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ ریل گاڑیوں کی حالت میں ابھی تک کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ اگرچہ طرح طرح کی نام نہاد ایکسپریس اور سوپر ایکسپریس ٹرینوں کی کاغذی بھرمار تھی۔ ان میں سے اکثر کے نام نہاد رزرو برتھوں والے ڈبوں میں بھی دو دو چار چار اسٹیشنوں کے مسافر ٹکٹ یا بغیر ٹکٹ کے بھر جاتے تھے۔ دن کو سانس لینے اور رات کو پاؤں پھیلانے اور آنکھ جھپکانے کی مہلت نہ ملتی تھی۔ صرف بابوجی غیر مستحق مسافروں سے اپنا نذرانہ وصول کرتے رہتے تھے۔ اسٹیشنوں کے افسر بھی رشوت لے کر بابو لوگوں کو طویل فاصلے کی ٹرینوں میں کنڈیکٹر کی ڈیوٹی دیتے تھے اور وہ افسر کو دی ہوئی رشوت سے سوگنی وصول کرنے کا اختیار حاصل کر لیتے تھے۔ گاڑیوں کے وقت پر چلنے

ماہنامہ الشناء کلکتہ

کا تو کوئی سوال ہی نہ تھا۔ میلوں، ریلیوں اور راتوں کے دنوں میں وہ گھنٹوں لیٹ ہوتی تھیں اور کوئی ہڑتال یا فساد ہو جائے تو پھر گھنٹوں کا سفر کئی کئی دن میں طے ہوتا تھا۔ اور مولانا محمد اسماعیل میرٹھی کی وہ نظم یاد آجاتی تھی جو بچپن میں پڑھی تھی۔ جس میں انہوں نے ریل گاڑیوں کے چلن کو ملکہ وکٹوریہ کا بڑا احسان بتایا ہے اور کہا ہے۔

کوئی کا علم گر نمایاں نہ ہوتا
تو یہ ہند رشک گلستاں نہ ہوتا
نہ یہ ریل ہوتی نہ ہوتا یہ انجن
ہر اک راہ کا قطع آساں نہ ہوتا

مطلب یہ کہ اس زمانے میں ریل کا سفر بڑا سہولت بخش اور آرام دہ ہوگا جو اس چاند سورج تک جانے کے دور میں نمونہ سقر بنا ہوا تھا۔ خدا خدا کر کے امروہے کا اسٹیشن آیا اور ریل گاڑی کے عذاب سے نجات ملی اگرچہ سردی نے گوشت کو پھر قلفی ملائی بنانا شروع کر دیا تھا۔ ریلوں کا کم و بیش یہی حال آج تک ہے۔ امروہہ آتے ہی میں نے پہلا کام یہ کیا کہ انیس الرحمان کو جو دہلی آکر آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے دفتر میں کام شروع کر نے کی اطلاع حیدر آباد ہی میں دے چکے تھے۔ امروہہ آنے کا ایک کارڈ ڈال دیا۔

دوسرے دن ہی ان کا تار مل گیا جس میں دہلی آنے کی دعوت دی گئی تھی۔ دوسرے دن مفصل خاکہ بھی مل گیا۔ ان دنوں ڈاک کا نظام نہایت عمدہ تھا کیونکہ رفیع صاحب نے بڑی محنت و مشقت کے بعد اسے تیز رفتار کر دیا تھا اور بڑے شہروں کی ڈاک جس میں کارڈوں، لفافوں اور اخباروں کو اولیت حاصل تھی رات کی ہوائی ڈاک کے ذریعے ۲۴ گھنٹے کے اندر ہی پہونچ جاتی تھی اور چھوٹے مقامات کی ایک سے دو تین دن کے اندر ہی، اگرچہ محصول بہت کم تھا۔ آج کل تو صرف رجسٹرڈ خط ہی دو چار دن میں مل جاتے ہیں باقی ڈاک کئی کئی دن میں ملتی ہے۔ مقامی خط اور اخبار تو اور بھی دیر میں ملتے ہیں۔ تاروں کی بڑی تعداد ڈاک سے روانہ کی جاتی ہے محصول بڑھتا چلا جارہا ہے اور رفتار عمل سست اور بے ڈھنگی ہوتی چلی جارہی ہے۔ ملکہ وکٹوریہ کے زمانے میں کارڈ ایک پیسے میں اور لفافہ دو پیسے میں ملتا تھا اور دور دراز مقامات تک تین چار دن میں پہونچ جاتا تھا اور تار ایک بڑے شہر سے دوسرے کو چند گھنٹے کے اندر۔ اب ڈاک کی اشیاء میں بے حد اضافہ ہوگیا ہے مگر ان کو پہونچانے کے انتظامات میں اتنا اضافہ نہیں ہوا ہے، دوسرے پہلے کارکن بڑے چست تھے اور اب بے انتہا سست ہوگئے ہیں۔

انیس الرحمان کی ہدایت کے مطابق دہلی پہونچ کر گلی قاسم جان کی ایک پرانی مگر وسیع عمارت میں واقع اخبار الجمعیتہ کے دفتر پہونچا جو دوسری منزل پر تھا اور ظل عباس وہیں کام کرتے تھے۔ وہ مجھے رکشا پر جامع مسجد کے پچھواڑے کی اس گلی میں لے گئے جس میں آج کل ناز ہوٹل اور ڈاک خانہ ہے۔ ان کا قیام اسی گلی کی ایک عمارت کی دوسری منزل پر تھا جہاں پرانی عمارتوں کے زینے کنجوسوں کے دل کی طرح تنگ ہیں اس لئے سامان اوپر لے جانے میں بڑی دشواری ہوئی۔ اس مکان میں استاد رحیم الدین ڈاگر رہتے تھے اور یہیں سے انہوں نے "آفتاب موسیقی" نام کا رسالہ نکالا تھا وہ تو بند ہو چکا تھا مگر اس کے ایڈیٹر حاصل عباسی جو گورکھپور کے رہنے والے تھے ایک بڑے کمرے اور دالان میں جس کے آگے آنگن بھی تھا مقیم تھے۔ وہ اب سعودی عرب کے باشندے ہو چکے ہیں اور عربی لباس میں کبھی کبھی ہندوستان آجاتے تھے چنانچہ ایک مرتبہ کلکتہ بھی آئے تھے۔ وہ بعض دوسرے لوگوں کو بھی وہاں ٹھہرا لیتے تھے اور ظل عباس بھی وہیں رہتے تھے۔ اس لئے ایک پلنگ مجھے بھی مل گیا۔ کھانا جامع مسجد کے قریب کے ہوٹلوں سے معمولی قیمت پر ملنے لگا۔ جو اچھا تو نہیں مگر پیٹ بھراؤ ضرور ہوتا تھا۔ دہلی میں مرچیں بہت کھائی جاتی ہیں اس لئے شروع شروع میں کھانا کھاتے وقت بے اختیار آنسو نکل پڑتے تھے جن کا ازالہ کیلے سے کیا جاتا تھا جو دو تین پیسے میں مل جاتا تھا۔ ناشتہ ٹیا محل کے بازار کے نکڑ کی ایک دودھ کی دکان پر کرتا تھا جو پہلوان کی دکان کہلاتی تھی اور چار پیسے کا دودھ اور پانچ پیسے کی چھوٹی ڈبل روٹی کام دے جاتی تھی۔ کبھی عیاشی کو طبیعت چاہتی تھی تو گلی قاسم جان کے حاجی کے ہوٹل یا اردو بازار میں نئے نئے کھلے ہوئے فلورا ہوٹل کی مہمان نوازی سے استفادے پر کمر باندھ لیتا تھا۔

صبح اٹھ کر انیس الرحمان سے ملنے گیا جو سید محمد جعفری کے مردانہ مکان میں چیلوا

کے کوچے میں مقیم تھے۔ یہ جعفری صاحب جو شکل و صورت اور لباس سے چھوٹے جواہرلال لگتے تھے دہلی کے ممتاز شہری اور کانگریس کے خاص توپی تھے۔ ان کی تاریخ بھی کافی دلچسپ تھی۔ پہلے مولانا محمد علی کے اخبار ہمدرد میں کام کیا۔ مولانا محمد علی اور خواجہ حسن نظامی میں قلمی جنگ چھڑ جانے کے بعد جو خواجہ صاحب کی خلافت کی تحریک کے خلاف لکھے ہوئے ایک خط کے انکشاف کے بعد شروع ہوئی تھی۔ یہ ہمدرد سے الگ ہو گئے اور مولانا محمد علی کی مخالفت کے لئے ایک اخبار سام ملت جاری کر دیا جس پر مولانا نے اس کو ملت فروش کا خطاب دے دیا۔ اب اس کا اخبار تو نہ تھا مگر ایک لیتھو مشین رہ گئی تھی جو ممکن ہے مولانا کے ہمدرد پریس کی ہو اور اسی تعلق سے انہوں نے مکان کے دروازے پر ہمدرد پریس کی چھوٹی سی تختی لگا رکھی تھی مولانا محمد علی کا قیام اور اخباروں کے دفتر کوچہ چیلاں کے ایک مکان میں تھے مگر اب وہاں ان کا کوئی نام و نشان بھی نہیں۔ ممکن ہے وہ مکان اب بھی موجود ہو۔ انیس الرحمان نے مجھے بتایا کہ لال بہادر شاستری نے ریل کے ایک حادثے کے بعد ریلوے کی وزارت سے استعفا تو دے دیا ہے مگر اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ وہ ۵۷ کے انتخابات کے لئے کانگریس کی انتخابی مہم چلانے کی آزادی حاصل کرنا بھی چاہتے تھے اسی لئے اب وہ کانگریس کی انتخابی مہم کے انچارج ہیں اور انہوں نے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے دفتر واقع ۷ / جنتر منتر روڈ میں ایک شعبہ نشر و اشاعت قائم کر دیا ہے جس میں اردو کا کام ان کے دے کیا گیا ہے۔ میرے لئے کام کی نوعیت یہ بتائی کہ کچھ مضمون لکھنے ہوں گے اور باہر سے جو مضمون آئیں گے ان پر نظر ثانی کرنی ہوگی اور ان کو اخباروں کو اشاعت کے لئے بھیجنا ہوگا۔ اخباروں کے سلسلے میں یہ طریق کار تھا کہ ان کو ہر مضمون اس شرط پر بھیجا جائے گا کہ وہ اس کی اشاعت کے دن ایک یا دو ہزار پرچے زیادہ چھاپ کر کانگریس کمیٹی کے دفتر سے دیئے جانے والے پتوں پر روانہ کر دیں جو اردو کے علاقوں کے کانگریسی امیدواروں اور کانگریسی کمیٹیوں کے ہوں گے اور اس کا معاوضہ ان کو اخباروں کی قیمت سے دگنا دیا جائے گا۔ اسی طرح کا انتظام دوسری زبانوں کے لئے بھی ہوا تھا۔ ایک بڑے ہال میں کارکن بیٹھتے تھے۔ دروازے کے قریب ایک کمرہ شاستری جی کے لئے تھا جس میں وہ تھوڑی دیر آکے بیٹھتے تھے بنگالی کا کام مس مکل مکرجی کے پاس تھا ایک اور بنگالی گوہا تھے جو کانگریس سوشلسٹ نامی ہفتے وار کے ایڈیٹر تھے۔ ان دونوں سے میرے بہت اچھے تعلقات تھے۔ ہندی کے شعبے میں بھی کئی دوست ہو گئے تھے جن میں سے ایک دو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ بھی تھے اور یہ ساری محفل نہایت منظم اور دوستانہ تھی دوسرے دن سے ہی میں نے کام شروع کر دیا جس کا معاوضہ تین سو روپے ماہوار مقرر ہوا۔ جس عمارت میں دفتر واقع تھا وہ بہت وسیع کوٹھی تھی۔ آگے کی طرف کئی ہالوں اور کمروں کی دو منزلہ عمارت تھی۔ جہاں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے دفاتر کئی ہال اور کمرے تھے۔ ان کے آخر میں ایک بڑے کمرے میں باورچی خانہ تھا جس کے سامنے میزیں اور کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ یہاں دوپہر کے کھانے کی ایک عمدہ تھالی آٹھ آنے میں ملتی تھی۔ پوری عمارت ایک وسیع سبزہ زار کے اندر تھی جس کے ایک طرف کو اونچی کرسی کے دس بارہ بڑے بڑے کمرے ایک قطار میں بنے ہوئے تھے۔ ان کے پیچھے ملازمین کے کوارٹر تھے معلوم ہوا تھا کہ یہ عمارت ایک مسلمان ٹھیکے دار کی تھی جس نے نئی دہلی کی تعمیر میں اہم حصہ لیا تھا۔ اندرا گاندھی اور سنڈیکیٹ کی ٹکر کے بعد یہ عمارت کانگریس (او ۔ تنظیمی) کو مل گئی تھی اور اندرا کانگریس کا دفتر اکبر روڈ کو منتقل ہو گیا تھا۔ میرے ساتھ ظل عباس اور احمد علی علوی بھی کام کرتے تھے اور اس طرح خلافت ہاؤس کا تھوڑا بہت لطف واپس آگیا تھا۔ ایک اور سہولت یہ ہو گئی تھی کہ بڑے بڑے کانگریسی لیڈروں جیسے جواہرلال، اندرا گاندھی، ڈاکٹر بی۔ سی۔ رائے، کملا پتی ترپاٹھی، فخرالدین علی احمد کے درشن کثرت سے ہونے لگے تھے جو مجلس عامہ کے جلسوں میں شرکت کے لئے آتے رہتے تھے۔

اپریل میں انتخابی کام ختم ہو گیا اور ایک مہینے کی پیشگی تنخواہ کے ساتھ ملازمت کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ صرف انیس الرحمان رہ گئے تھے۔ ان کے پاس کلکتے سے روزانہ ہند کے ڈائرکٹر طیب بھائی ظریف کا ایڈیٹر کی ضرورت اور کسی موزوں آدمی کی سفارش

ماہنامہ انشاء کلکتہ

کے لئے خط پہونچا تو انہوں نے میرا نام لکھ دیا پھر ایسا ہی خط مولانا حفظ الرحمان کو بھی ملا تو انہوں نے بھی مجھے کلکتہ چلے جانے کی تاکید کی کیونکہ طیب بھائی جمعیتہ علمائے ہند کے معاونین میں بھی شامل تھے ۔ مگر کرنا خدا کا یہ ہوا کہ انیس الرحمان پر کانگریس کے دفتر ہی میں فالج گرا اور جسم کا داہنا حصہ بے کار ہو گیا ان کو فوراً ارون (اب لوک نایک جے پرکاش نرائن) ہاسپٹل میں داخل کر دیا گیا اور شاستری جی کئی بار ان کو دیکھنے گئے اور بہترین علاج کی تاکید کر دی جس کا خرچ کانگریس برداشت کر رہی تھی اور ان کی تنخواہ بھی جاری تھی ۔ بیمار پڑنے سے پہلے انہوں نے مجھے پیام وطن میں کام دلوادیا تھا جسے جموں و کشمیر کے وزیر اعظم بخشی غلام محمد نے شیخ عبداللہ اور نیشنل کانفرنس سے غداری کا داغ اپنے دامن سے ہلکا کرنے کے خیال سے نکلوایا تھا ۔ کلکتہ جانے سے بچنے کے لئے اس طرح کچھ سامان ہوتا نظر آرہا تھا ۔ جس کی طرف طبیعت قطعی مائل نہیں ہو رہی تھی کیونکہ روزنامہ ہند کو میں کانگریس کے دفتر میں روزانہ ہی دیکھتا تھا اور اس کی شکل و صورت اور پالیسی مجھے قطعی ناپسند تھی ۔ ان دنوں اس میں اور کلکتہ کے سب سے پرانے اخبار "عصر جدید" میں میونسپل کارپوریشن کے اشتہار زیادہ سے زیادہ جگہ میں چھاپنے کا مقابلہ چل رہا تھا اور وہ اشتہار جو انگریزی میں بمشکل ایک کالم میں چھپتے تھے یہ دونوں اخبار کئی کئی صفحات میں اس طرح چھاپتے تھے کہ ایک سطر میں صرف ایک دو لفظ ہی ہوتے تھے ۔ ڈاکٹر بی سی ۔ رائے کی حکومت تھی اور وہ ان کے بلوں کی ادائیگی کرادیتے تھے ۔ مجھے اخباروں کی یہ گت بنتے دیکھ کر بڑی کوفت بھی ہوتی تھی اور بڑی شرم بھی آتی تھی ۔ ان دنوں ان اخباروں کو اشتہارات کا معاوضہ آٹھ آنے فی کالم انچ سے زیادہ نہ ملتا تھا ۔ اس لئے آمدنی بڑھانے کے لئے کاغذ برباد کیا جاتا تھا ۔ اس طرح ایک اور فائدہ یہ ہوتا تھا کہ کاغذ کا کوٹہ زیادہ مل جاتا تھا جسے آمدنی کا اچھا ذریعہ بنالیا جاتا تھا ۔

پیام وطن عبدالباقی خان بہار کے ایک زمیندار خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور خود کو کمانڈر نبی بخش خان کی اولاد بتاتے تھے جو غدر کے ایک بڑے مقامی مجاہد راجہ کنور سنگھ کے سپہ سالار تھے ۔ تن و توش کے اتنے بھاری تھے کہ بھولا سا چہرہ اور سر جسامت کے مقابلے میں حقیر نظر آتے تھے ۔ اردو اور انگریزی اچھی لکھتے تھے اسی لئے لاہور میں سرکاری ملازمت بھی مل گئی تھی اور سکندر حیات خاں کی یونینسٹ وزارت کے دنوں میں پنجاب کے ڈائرکٹر آف انفارمیشن بھی ہوگئے تھے وہاں سے الگ ہونے کے بعد لاہور سے ایک شاندار اخبار "آزاد" بھی نکالا تھا جس میں پنجاب سے بڑے بڑے صحافی جمع کرلیے تھے مگر وہ زیادہ دن نہ چل سکا تو دہلی آکر انگریزی اور اردو میں اورینٹ پریس کے نام سے ایک خبری ایجنسی قائم کی تھی جو ان کی علحدگی کے بعد مسلم لیگ کی طرفدار ہو گئی تھی اورینٹ پریس سے علحدگی کے بعد انہوں نے بخشی غلام محمد کی مالی امداد سے "پیام وطن" جاری کیا جس پر مالکہ کی حیثیت سے ان کی نئی بیوی شاہدہ باقی نکہت کا نام شائع ہوتا تھا ۔ جو رام پور کی رہنے والی تھیں ۔ نہ معلوم کس طرح دہلی کے کارخانے دار ، تاجر اور بڑے مجلسی آدمی لالہ شنکر پرشاد کے پاس پہونچ گئی تھیں کیونکہ آواز بڑی پرکشش تھی اور دیکھنے میں بھی انیس کے اس مصرعے کا مصداق تھیں ۔

سانچے میں تھے ڈھلے ہوئے سب اس کے جوڑ بند

لالہ جی کے انتقال کے بعد بے گھر بے در ہو گئی تھیں مگر نہ معلوم کس طرح باقی صاحب کو انہوں نے اپنے قبضے میں کرکے ان سے نکاح کر لیا تھا ۔ یہ معلوم نہیں کہ پیام وطن ان کی طرحداری اور دل نوازی کے طفیل میں نکا تھا یا باقی صاحب کی قابلیت کے اعتراف میں ۔ لیکن اخبار کی انتظامی حالت خراب تھی ۔ بخشی صاحب کی فیاضی گھٹنے لگی تھی تو شاہدہ نے آمدنی بڑھانے کے لئے ایک شاندار گدے دار موٹر خریدی اور مخمور دہلوی کی حسین بیٹی کو اس میں بٹھا کر بڑے بڑے لوگوں سے ملانے لگیں ۔ اس لڑکی کی شادی انہوں نے اپنے ایک عزیز لڑکے رئیس احمد خاں سے کرر کھی تھی ۔ جو دفتر میں چپراسی کا کام کرتا تھا مگر اس کے باوجود اخبار میں نئی جان نہ پڑ سکی ۔ اس کا دفتر ترکمان دروازے کے قریب پاکستان سے آئے ہوئے دولت مند پناہ گزینوں کی بنوائی ہوئی شاندار عمارتوں کی قطار کی پہلی عمارت کی پانچویں منزل پر تین کمروں میں تھا ۔

ایڈیٹوریل وہ خود ہی لکھتے تھے ۔ ان کے معاون بہار کے ولایت علی اصلاحی تھے جو پٹنہ کے اخباروں میں کام کر چکے تھے اور پیام وطن بند ہوجانے کے بعد پٹنہ جاکر دفتر اطلاعات میں کام کرنے لگے تھے اور پھر بنگلہ دیش کو نکل گئے تھے ۔ ایک پنجابی پناہ گزیں دیوان صاحب تھے اور خاص مضمون نگار دیوان برندر ناتھ (ظفر پیامی) جو خود بھی پناہ گزیں تھے اور بعد میں انہوں نے اپنی بیوی سورما جی کی مدد سے پریس ایشیا انٹرنیشنل جاری کیا جو اب ان کے انتقال کے بعد بھی جاری ہے ۔ اس ایجنسی کے ذریعہ انہوں نے کئی غیر ملکوں خصوصاً عراق سے اچھے تعلقات قائم کر لیے تھے اور میاں بیوی نے کئی بار عراق اور بعض دوسرے ملکوں کے دورے بھی کر لیے تھے

منیجر آر ایس لوج نے ایک سابق فوجی تھے جو بھائی جی کہلاتے تھے ان سے مالک اور مالکہ سخت نالاں تھے اور چاہتے تھے کہ ان کا کام بھی میں ہی سنبھال لوں اور ایک بار ان کے چھٹی پر جانے کے بعد میں نے ان کی جگہ بادل ناخواستہ کام بھی کیا مگر ایک دن جاں جاتے جاتے رہ گئی تو کان پکڑ لیے ہوا یہ کہ باقی صاحب نے ایک دن جب کہ جون کی تڑاخے دار گرمی پڑ رہی تھی مجھے ایک چیک دے کر بینک بھیجا جو قیص بازار میں تھا تاکہ اسے بھنا کر چاوڑی بازار سے کاغذ خریدوں اور اسے قلی باروں کے حیدر برقی پریس میں پہنچادوں جہاں پیام وطن کا کوئی خاص نمبر چھپ رہا تھا میں نے ایس ۔ سنگھ کا بند فراش کی ٹکاں کی طرف ایک گلی میں سے

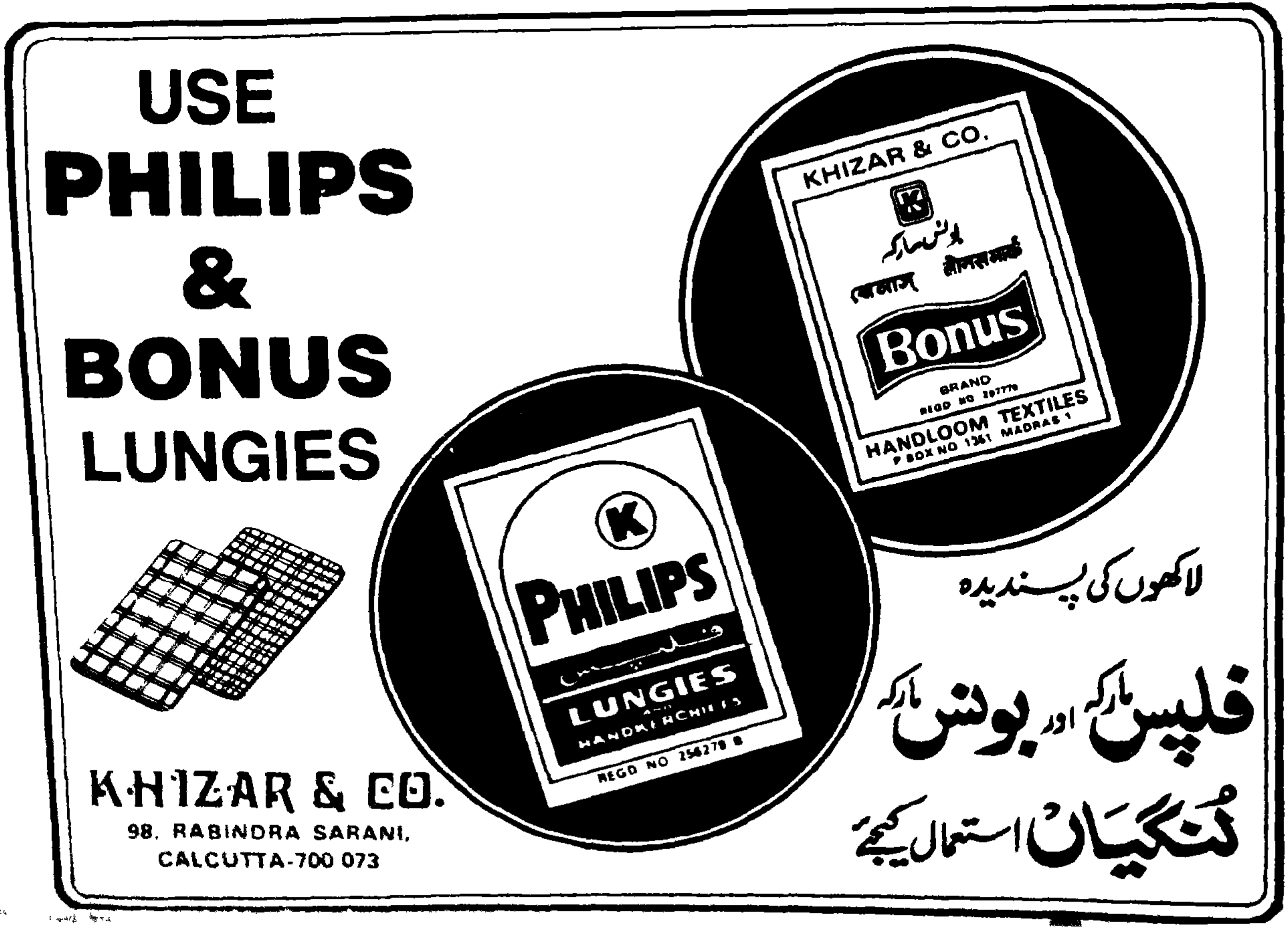
ماہنامہ استعارہ کلکتہ

ہو کر جا ہی رہا تھا کہ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا اور کھڑے رہنا ناممکن ہوگیا ۔ میں نے بڑی مشکل سے ہوش و حواس کو کسی قدر یکجا کیا اور جیب سے کچھ پیسے نکال کر سامنے کے پھل والے کو دے کر اشارے سے آلو بخارے دینے کو کہا تو ایک آلو بخارا کھاتے ہی آنکھیں کھل گئیں ۔ ورنہ میں تو سمجھا تھا کہ یہاں سے ہاسپٹل میں پہونچایا جاؤں گا اور ممکن ہے وہاں مردہ قرار دے دیا جاؤں ۔ دراصل میرے اوپر لو کا حملہ ہوا تھا جو شمالی ہند میں ہر سال سیکڑوں کی جان لیتی ہے ۔ خیر یہ صعوبت برداشت کرلینے کے بعد جے ۔ ایس ۔ سنگھ کی دکان کے منیجر سے مختصر طور پر یہ معلوم ہوگیا کہ پیشاچی کی فوج کے سورما بھائی جی باقی صاحب کو کس طرح لوٹ رہے ہیں مگر میں نے باقی صاحب سے کچھ نہ کہا تاکہ میری کی چکی کا پاٹ میری گردن میں نہ آجائے ۔ وہ انیس الرحمان کو دیکھنے کو روز ہی جاتے تھے اور جس دن خود نہیں جاسکتے تھے مجھے دس بارہ روپے ان کے لئے پھل لے جانے کو دے دیتے تھے کیونکہ میں روزانہ ہی جاتا تھا ۔ اس طرح تین مہینے گزر گئے ۔ انیس الرحمان دواؤں کے اثر اور اپنی محنت سے ایک بار تو اٹھ ہی گئے اور کسی قدر چلنے ، پھرنے ، بولنے اور لکھنے کے قابل بھی ہوگئے اور شفا خانے سے جعفری صاحب کے مکان پر اور وہاں سے اپنے وطن داناپور چلے گئے اور سید فیضان احمد جو ان کے قریبی عزیز ہیں اور ہمدرد دواخانہ میں ملازم تھے اور اب کلکتے میں حکیم سید فیضان احمد کے نام سے ہمدرد دواخانے کے اسٹاکسٹ صوبائی طبی

کونسل کے ممبر اور طبیہ کانفرنس کے نائب صدر اور مرکزی کانفرنس کے ممبر ہیں اور غیر مستند حکیموں کا رجسٹریشن کراکے طبیہ کالج کی عمارت کے بانی مبانی ہیں ان کے بہت کام آئے ۔ ہم لوگ اسپتال جاکر ان کو چلاتے تھے وہ خود بھی لٹو کے ذریعے بے کار ہاتھ کو کارآمد کرنے کی کوشش اور بائیں ہاتھ سے لکھنے کی مشق بھی کرتے رہتے تھے جس سے معمولی طور پر لکھنے کے قابل ہوگئے تھے ۔ کچھ دنوں بعد وہ داناپور سے دہلی واپس آگئے اور شاستری جی نے ان کے لئے معقول رقم کا انتظام کردیا جس سے انہوں نے گلی قاسم جان میں ایک مکان خریدا ۔ ایک ہفتہ وار " پرچم ہند " اور اس کے بعد روزنامہ " ملک و ملت " نکالا مگر انتظامی خرابی کی وجہ سے حیدرآباد کی طرح یہاں بھی کامیاب نہ ہوسکے اور دونوں اخبار بند ہوگئے ۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے بیٹوں شاہد انیس اور عامد انیس نے کاروبار کرکے اپنی مالی حالت اچھی کرلی اور عامد نے رسالہ " اخبار نوجواں " جاری کردیا جو کھیل کود کے لئے وقف ہے نہایت شاندار ہے اور سارے ملک میں مقبول ہے ۔ اسباب ظاہری کی بناء پر یہ کہہ سکتا ہوں کہ انیس الرحمن نے فالج کو خود ہی دعوت دی ۔ وہ مرغن کھانوں کے بے حد شوقین تھے جس سے دن بدن فربہ ہوتے چلے جارہے تھے اور کسی کی نہیں سنتے تھے ۔ ایک حملے سے اٹھ بیٹھنے کے بعد بھی وہ مرغن کھانوں سے باز نہ آئے اس لئے دوسرے حملے میں جاں سے ہی چلے گئے ۔ وہ میرے بڑے قدرداں اور ہمدرد

تھے ۔ دونوں کے گھرانوں میں برادرانہ تعلقات تھے جن کو ان کے پس ماندگان ابھی تک بڑے خلوص سے نبھارہے ہیں ۔ ۴۵ء تک جب وہ الہ آباد سے اپنا سیاسی رسالہ " نئی دنیا " ڈاکٹر سید محمود کی سرپرستی میں نکالتے رہے تو مجھ سے ہر اہم مسئلے پر اردو اخبارات کی رائیں ترتیب دے کر منگواتے تھے اور تھوڑا بہت معاوضہ بھی دیتے تھے ۔ جب پرچم ہند نکلا تو ان کی فرمائش پر اس کے لئے بمبئی سے شذرات لکھ کر بھیجتا تھا اور اس کام کا بھی معاوضہ ملتا تھا دہلی آنے کے کچھ دنوں بعد تک میرا قیام حاصل عباسی کے پاس ہی رہا پھر حافظ علی بہادر خاں نے اپنے مکان پر آجانے کی دعوت دی ۔ جو کچھلی والوں کی مسجد کی گلی میں واقع تھا ۔ وہیں امام جی اور مفتی عتیق الرحمن عثمانی بھی رہتے تھے ۔ حافظ صاحب کو یہ مکان بخشی غلام محمد کی سفارش سے ملا تھا ۔ وہ مسلم زون میں واقع ہونے کی وجہ سے پاکستانی پناہ گزینوں کی دست برد سے بچا ہوا تھا مسلم زون کا مطلب تھا ایسا علاقہ جس میں پناہ گزین نہ بسیں اور بچے کھچے مسلمان وہاں آباد رہ سکیں ۔ بخشی صاحب کی عنایت ہی سے انہوں نے ایک رسالہ نما ہفتہ وار اخبار " دور جدید " نکال دیا تھا ۔ پہلی منزل میں ایک ہال تھا جو اخبار کا دفتر تھا ۔ اس کے بعد صحن تھا اور اس سے ملے ہوئے دو کمرے تھے ۔ بڑے کمرے میں کاتب اور چپراسی رہتے تھے ۔ چھوٹا کمرہ جس میں صرف ایک چارپائی ہی آسکتی تھی مجھے مل گیا تھا ۔ گرمی کے دن تھے اور جب صحن کے پتھر تپتے تھے تو میں بھی خود کو جیتے جی جہنم میں محسوس کرتا تھا ۔ شام کو چارپائی صحن میں لے آتا تھا تو سکون کا کچھ سامان ہو جاتا تھا ۔ دن کا زیادہ تر وقت پیام وطن کے دفتر میں گزرتا تھا مگر وہاں بھی غضب کی گرمی رہتی تھی لو کی وجہ سے دروازے اور کھڑکیاں بند ، پنکھے سے ہوا کی جگہ آگ نکلتی تھی ۔ دیواریں جو کنکریٹ کی تھیں کمروں کو تنور بنائے رکھتی تھیں ۔ وہاں ٹھنڈا پانی کہاں مل سکتا تھا لہذا پیاس بجھانے کے لئے بار بار نیچے جانا پڑتا تھا جہاں رام لیلا کے میدان کے کنارے پر ایک کوٹھری میں پیاؤ قائم تھا جس کے اندر ریت کے اوپر پانی کے مٹکے رکھے رہتے تھے اور ان کا پانی کسی قدر غنیمت ہوتا تھا حافظ جی نے ایک تین سو صفحے کی کتاب ترجمے کے لئے میرے حوالے کی اور ایک روپیہ فی صفحہ اجرت دینے کو کہا ۔ یہ وزیر دفاع کرشنا مینن کی وہ تقریر تھی جو انہوں نے ہندوستان سے کشمیر کے الحاق کو صحیح ثابت کرنے کے لئے مجلس اقوام میں کی تھی اور کئی دن جاری رہی تھی ۔ میں نے اس کا ترجمہ کر دیا تو وہ دور جدید کے دو خاص نمبروں کی صورت میں شائع ہو گیا ۔ معلوم ہوا تھا کہ ان کو اس خدمت کا کافی بڑا معاوضہ ملا تھا مجھے صرف دو ڈھائی سو روپے ہی ملے اور ترجمہ کرنے والے کا نام غائب ہی رہا ۔ صرف اتنا کرم کیا کہ ایک دن کشمیر کے دفتر اطلاعات میں لے جاکر اس کے انچارج بامزے صاحب سے جو کشمیری ہندو تھے اور بعد میں حکومت ہند کے رجسٹرار آف نیوز پیپرس ہو گئے تھے مترجم کی حیثیت سے میرا تعارف کرادیا اور انہوں نے اتنی نوازش کی کہ کشمیر کے متعلق میری ایک تقریر ریکارڈ کرا کے ۵۰ روپے دے دیئے ۔ یہ تقریر بعد میں پی آئی بی کی طرف سے کئی زبانوں میں اشاعت کے کئے اخباروں کو بھی بھیجی گئی اور شائع بھی ہوئی ۔ اس سلسلے میں ایک عجیب واقعہ بھی ہو گیا ۔ میں تقریر ریکارڈ کرانے گیا تو ریڈیو ہاؤس کے دروازے کی دکان سے دو پیسے میں کینچی کا ایک سگریٹ خرید کر اسے پیتا ہوا عمارت کے اندر داخل ہوا تو سامنے سے مولانا حفظ الرحمن اور مفتی عتیق الرحمن صاحبان آتے نظر آئے ۔ اب مجھے احساس ہوا کہ اوہو یہ تو رمضان کا مہینہ ہے اور سگریٹ کو چھپانے کی ناکام کوشش کرنے لگا ۔ دونوں بزرگ یہ دیکھ کر مسکراتے ہوئے آگے بڑھ گئے ۔ وہ عید کے بارے میں اپنی تقریریں ریکارڈ کرانے آئے تھے ۔ ان دنوں ساغر نظامی اور روش صدیقی ریڈیو کے اردو شعبے میں کام کر رہے تھے اور ان سے ملنے کے لئے بھی کبھی کبھی ریڈیو اسٹیشن چلا جاتا تھا اور وہ چائے بسکٹ سے تواضع کر دیتے تھے ۔

دور جدید کے دفتر میں آنے سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ رات کو کام سے فارغ ہو کر مولوی سمیع اللہ کی کتابوں کی دکان پر حاضری دینے میں بڑی سہولت ہو گئی جس کا نام تو کتب خانہ عزیزیہ تھا مگر عرف عام میں خانقاہ عزیزیہ تھی ۔ مولوی سمیع اللہ چونکہ مفتی کفایت اللہ کے داماد بھی تھے اس لئے مسلم حلقوں کو ان سے دلچسپی تھی مگر وہ خود بھی کچھ کم خوبیوں کے مالک نہ تھے ۔ دہلی میں نئے نئے آنے والوں کو پتے بتاتے تھے ۔ ادیبوں اور


USE
PHILIPS
&
BONUS
LUNGIES
KHIZAR & CO.
Bonus
BRAND
HANDLOOM TEXTILES
P BOX NO 1361 MADRAS 1
PHILIPS
LUNGIES
HANDKERCHIEFS
REGD NO 256278 B
K·H·IZ·AR & CO.
98. RABINDRA SARANI,
CALCUTTA-700 073
لاکھوں کی پسندیدہ
فلپس مارکہ اور بونس مارکہ
لنگیاں استعمال کیجئے

شاعروں کو سر آنکھوں پر بٹھاتے تھے ۔ اگرچہ دکان کے باہر صرف ایک بلر ہلر بنچ اور کرسی ہی پڑی رہتی تھی مگر ان پر بیٹھنے والوں میں بڑے بڑے لوگ شامل تھے اور ان نشست گاہوں کی عظمت تخت طاؤس سے بھی زیادہ تھی ۔ جب یہ بھرجاتی تھیں تو کچھ حاضرین دکان کے اندر بھی بیٹھ جاتے تھے ان میں جگر صاحب بھی شامل تھے ۔ بتایا کرتے تھے کہ جب نیتاجی کانگریس سے الگ ہوکر فارورڈ بلاک کی تنظیم کے لئے دورہ کررہے تھے تو ان کی دکان کے سامنے کے میدان میں جسے تکونا ہونے کی وجہ سے سنگھاڑہ کہا جاتا تھا انہوں نے ہی ان کی تقریر کے لئے جلسے کا انتظام کیا تھا اور وہ ان کی دکان کے اندر بھی بیٹھے تھے ۔ وہاں مستقل بیٹھنے والوں میں دہلی کے نوشیروان عادل میر مشتاق بھی تھے جو کانگریس چھوڑکر سوشلسٹ پارٹی میں آگئے تھے اور کئی مزدور تنظیموں سے وابستہ ہونے کی وجہ سے ان کی شکایتوں کا علاج بتاتے رہتے تھے ۔ عام شہریوں خصوصاً مسلمانوں کی مدد کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے ۔ وہ رات کو بنیان اور لنگی میں بنچ پر آکر بیٹھ جاتے تھے اور پان کھاتے رہتے تھے ۔ ان کی مشغولیت دکان بند ہوجانے کے بعد بھی جاری رہتی تھی ۔ الحمدللہ کہ وہ ان سطروں کی تحریر کے وقت بھی حیات ہیں اور ۹۰ سال کی عمر ہوجانے کے بعد بھی خدمت خلق جاری ہے ۔ وہ مجرد ہیں اور ان کا قیام قریب ہی کی ایک عمارت کی دوسری منزل پر اس جگہ ہے جسے میری یاد کی حد تک اردو ہال کہا جاتا ہے اور وہ دہلی کے ممتاز قومی لیڈر آصف علی مرحوم کی مجاہدہ اعظم اہلیہ سے منسوب ہے جنہوں نے ۴۲ء کی تحریک میں کارہائے نمایاں انجام دیئے تھے ۔

مولوی سمیع اللہ کی دکان پر آنے والوں کی فہرست بڑی طویل ہے ۔ بس یوں سمجھ لیجئے کہ ان کی دکان پر حاضری دینے کا مطلب دہلی کے تمام اردو شاعروں ، ادیبوں اور مشاہیر سے نیاز حاصل ہوجانا ہی ہوتا تھا ۔ چند نام جو ذہن میں محفوظ ہیں کچھ اس طرح ہیں ۔ جوش ملیح آبادی ، عرش ملسیانی ، جگر مرادآبادی ، ساغر نظامی ، روش صدیقی ، سلام مچھلی شہری ، زبیر رضوی ، گلزار دہلوی ، جگن ناتھ آزاد ، بسمل سعیدی ، استاد محمد رفیق رسا ، آغا محمد طاہر ، بسمل شاہجہاں پوری ، انور صابری ، عزیز وارثی ، حکیم عبار بھٹی ، پنڈت رام کرشن مضطر گوڑوی ، نریش کمار شاد ، منشی گوپی ناتھ امن ، لالہ دھرم پال گپتا وفا ، ستیش چندر سکسینہ طالب ، برج لال جگی رعنا ، گوپال متل ڈاکٹر پریم لال شفا ، گربچن داس چندن اور جامع مسجد کے امام عبداللہ بخاری ۔ ان لوگوں سے الگ الگ مختصر تعارف کرانا بھی کار دشوار ہے ۔ پھر بھی جو لوگ کسی قدر محتاج تعارف معلوم ہوتے ہیں ان کے بارے میں دوچار لفظ لکھے بغیر رہنا بھی قرین انصاف و مروت نہ ہوگا ۔ سلام مچھلی شہری چھوٹے قد کے مائل بہ فربہی اور سانولے رنگ کے تھے ریڈیو کے اردو شعبے میں قلمی کام کرتے تھے ۔ اچھے شاعر تھے مگر بلا کے شراب نوش ۔ ساری تنخواہ کے علاوہ دوستوں سے لیا ہوا ناقابل ادائیگی قرض سب شراب و کباب میں اڑادیتے اور بیوی بچوں سے فاقے کراتے تھے ۔ رات کو خانقاہ عزیزیہ میں آکر مجھے زبردستی اپنے ساتھ لے جاتے تھے اور شراب خانوں ہی کیا عجیب و غریب کوٹھریوں کی بھی سیر کراتے تھے ۔ فیض بازار کے ہوٹل بند ہونے کے وقت وہاں سے نکالے جاتے تھے ۔ جب نشے سے آزاد ہوتے تھے تو سمجھداری کی باتیں بھی کرلیتے تھے ۔ اپنے سوا کسی اور ریڈیائی شاعر اور ادیب کو خاطر میں نہیں لاتے تھے صرف خوشامد کی روٹی کھانے والا کہتے تھے ۔ ساغر کے حالات تو پہلے ہی لکھ چکا ہوں ۔ ان کی کہانی کا آخری حصہ یہ ہے کہ ریڈیو سے الگ ہوکر بھی وہ شاعری کرتے رہے اور جدوجہد آزادی کی لمبی چوڑی منظوم داستان بھی لکھ ڈالی ۔ آخر سرطان کی مہلک اور دردناک بیماری میں مبتلا ہوکر راہی ملک بقا ہوئے اور ان کی اہلیہ نے ان کی یاد میں ساغر اکاڈمی قائم کی ۔ زبیر میرے ہم وطن بھی ہیں اور لڑکپن میں حیدرآباد میں بھی نظر آجاتے تھے ۔ ریڈیو کے اردو پروڈیوسر ، ڈائرکٹر اور شاعر کی حیثیت سے کافی نام پیدا کرچکے ہیں ۔ روش صدیقی جسمانی طور پر جتنے کم حسنہ تھے شکل و صورت میں اتنے ہی حسین اور ان کی شاعری ان کے جسم کی طرح نہیں ان کی صورت کی طرح تھی سخت سردیوں میں کھلے ہوئے ٹرک میں شاہجہاں پور کے ایک مشاعرے میں شرکت کے لئے گئے اور وہیں تھوڑے سی رقم کی لالچ میں قربان شعر خوانی ہوگئے ۔ پنڈت آنند موہن زتشی گلزار دہلوی پنڈت تربھون ناتھ زار دہلوی کے بیٹے ہیں جو یادگار داغ کہلاتے

تھے ۔ وہ خود ایک سرکاری سائنسی تجربہ گاہ میں ملازم تھے اور اس کی طرف سے نکلنے والے اردو کے ایک شاندار اور مفید رسالے "سائنس کی دنیا" کے ایڈیٹر بھی تھے ۔ وہ آج بھی دہلی کی اردو مجلسوں کی جان اور سیکولر زندگی کا شاہکار ہیں ۔ مجھ سے بڑے بے تکلف ہوگئے تھے ۔ رات کو عزیزیہ کتب خانہ بند ہوجانے کے بعد سنگھاڑے میں ہم لوگوں کی خاص محفل جمتی تھی جو آدھی رات تک رہتی تھی اس کے شرکاء میں عزیز وارثی، عنبار کھتی، کشوری لال جوہر بھی شریک رہتے تھے ۔ بارہ بجے کے بعد گلزار مجھے کھینچ کر اپنے مکان لے جاتے تھے جو بازار سیتارام کی گلی کشمیریاں کے کوچہ پاتی رام میں تھا ۔ ہمارے آنے کے بعد ان کی والدہ کھانا گرم کرتی تھیں اور گلزار اسے مردانہ بیٹھک میں لاکر کھاتے تھے ۔ ملازمت سے سبکدوش ہوجانے کے بعد گلزار نئی دہلی میں سکونت پذیر ہوگئے اور اپنی اہلیہ کی ایک میوزیکل اسٹور چلانے میں مدد کرتے ہیں جو ان ہی کی طرح اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں ۔ گلزار سے اپنی دوستی کا مفصل ذکر اپنی کتاب سبزہ و گل میں بھی کیا ہے مگر وہاں غلطی سے میں نے ان کی والدہ کو عیسائی لکھ دیا ہے حالانکہ وہ بھی خالص کشمیری پنڈت خاندان کی ہیں اور وکٹوریہ ان کا اصل نام نہیں بچپن کی عرفیت ہے ۔

استاد محمد رفیق رسا درمیانہ قد ، چھریرا بدن ، چھوٹی سی داڑھی ، دوپلیا ٹوپی ، صدری ، کرتا ، پاجامہ ، منہ ہمیشہ پان سے بھرا ہوا اور داڑھی پر پیک کی چھینٹیں ۔ بڑے حیرز مان اور حاضر جواب مگر ہمیشہ تبسم بہ لب ۔ نئی نئی گالیوں کے موجد ۔ دبستان ذوق کی یادگار ۔ خود بھی طرز قدیم کے معیاری شاعر اور مشاعروں میں تحت اللفظ میں اس زور سے شعر خوانی کرتے تھے کہ گردن آگے کو بڑھ جاتے تھے اور شاگرد اٹھا اٹھا کر پیچھے لاتے تھے ۔ دو تین ہندو نوجوان آگے پیچھے رہتے تھے جن کو وہ کلام دیتے تھے تاکہ وہ ترنم سے پڑھ کر مشاعرے لوٹیں رات کو جب سنگھاڑے میں آجاتے تھے تو کارخنداری زبان کی جمنا بہادیتے تھے اب وہ بھی دہلی کو سونا کرنے والوں میں شامل ہوچکے ہیں ۔ منشی گوپی ناتھ امن لکھنو کے رہنے والے مگر دہلی میں مستقل طور پر مقیم ۔ ابتداء میں اخبار "تیج" سے وابستہ رہے جسے سوامی شردھانند نے آریہ سماج کے پرچار کے لئے نکالا تھا ۔ سوامی جی کے ایک مسلمان کے ہاتھوں قتل کردیئے جانے کے بعد دیش بندھو گپتا اس کے ایڈیٹر ہوئے ۔ ان کے ایک ہوائی حادثے میں ہلاک ہوجانے کے بعد امن صاحب ان کے جانشین ہوئے ۔ پھر امن صاحب کے کانگریس کی سیاست سے پوری طرح وابستہ ہوجانے کے بعد جمناداس اختر اس کے ایڈیٹر ہوئے ۔ پھر دھرم پال گپتا وفا ۔ امن صاحب دہلی میونسپل کمیٹی کے ایڈمنسٹریٹر ہونے کے بعد دنیا سے رخصت ہوئے ۔ وہ ہمیشہ گاندھی ٹوپی ، شیروانی اور پاجامہ پہنتے رہے ۔ قد وقامت میں کہتر مگر علم ادب اور اخلاق میں بہتر تھے ۔

آغا محمد طاہر درمیانہ قد ، بھاری جسم ، داڑھی مونچھ سے آزاد ، تیکھے نقوش ، مسکراتا چہرہ ، کرتا بنڈی اور کشتی نما ٹوپی لباس ، ہاتھ میں ہلکی سی چھڑی ۔ علامہ محمد حسین آزاد کے دھیوتے تھے ۔ سارا خاندان لاہور میں خوشحال یہ دہلی کے گلی کوچوں میں قلندر ۔ جامع مسجد ڈاک خانے والی گلی کے ایک پرانے مکان کی دوسری منزل کی ایک کوٹھری میں قیام کرتے تھے ۔ لکھنے کا حال معلوم نہیں مگر بولتے تھے دلی کی کھری اردو ۔ ایک نوجوان لڑکا خدمت کے لئے اور بس ۔ جامع مسجد کی طرف سے جب بھی گزرتے مولوی سمیع اللہ کی دکان پر ضرور ٹھہرتے ۔ دونوں میں بڑی بے تکلفی بھی تھی اور سنجیدہ مذاق بھی ہوجاتا تھا ۔ ایک دن جو آئے تو دبی زبان سے مولوی سے قرض کی ادائیگی کا مطالبہ کر بیٹھے ۔ مولوی نے بپھر کر کہا کہ اب ہمارا تمہارا احساب تو اللہ کے گھر ہی ہوگا ۔ اس پر آغا بولے کہ ارے وہاں تو تمہاری گردن میں بڑے بڑے ہاتھ ہوں گے میرے چھوٹے چھوٹے ہاتھ کیا کام دیں گے اور مسکراتے ہوئے ہاں سے رفوچکر ہونے لگے تو مولوی صاحب یہ کہہ کر پکارتے رہ گئے کہ دیکھو کم بخت کیسی صفائی سے تبرا کہہ گیا ہے ۔ ۵۷ء میں میرے سامنے ہی ۶۰ ۔ ۶۵ سال کی عمر میں اچانک ہی انتقال ہوگیا ۔ حال ہی میں ایک ادبی رسالے میں ایسی تحریر نظر سے گزری جس سے معلوم ہوا کہ آغا طاہر صرف ہنسوڑا اور دلی کی گنگا جمنا اور نظام الدین اولیاء کی باولی کے پانی سے دھلی اردو کے رٹو توتے ہی نہیں بلکہ ایسے ادیب بھی تھے جن کی عظمت کو چوٹی کے ادیب بھی مانتے تھے ۔ تحریر ڈاکٹر وجاہت حسین صدیقی عرف عندلیب

شادانی کی تھی جو ڈھاکا یونیورسٹی میں السنہ
شرقیہ کے پروفیسر اور کئی کتابوں کے مترجم
ہونے کے ساتھ معتبر مصنف اور مولف بھی
تھے۔ ان کی ابتدائی ادبی کوشش رباعیات بابا
طاہر اصفہانی کا ترجمہ اور تشریح کی کتاب الدرر
الزاہر فی رباعیات بابا طاہر ۔ تھی جس کا
انتساب انہوں نے ہمارے اردو بازار والے
آغا محمد طاہر سے کیا تھا اور کتاب کا آغاز ان کی
تصویر سے ہوا تھا۔

بسمل شاہجہاں پوری بڑے تن و توش اور عظیم الشان داڑھی کے مالک شاہجہاں پوری پٹھان اور پولیس میں کانسٹیبل تھے۔ زوردار عاشقانہ شعر کہتے اور بڑے طنطنے سے سناتے تھے۔ پولیس والے بھی بڑا احترام کرتے تھے۔ نماز روزے کے بے انتہا پابند تھے اور ڈیوٹی پر بھی نماز ادا کرلیتے تھے۔ جب ۴۷ء کی تباہی و بربادی کو روکنے کے لئے مسلمانوں کی درخواست پر جواہرلال نے کنور مہندر سنگھ بیدی کو مشرقی پنجاب سے دہلی بلایا تو یہ ٹریفک پولیس میں تھے انہوں نے ان کو اپنا باڈی گارڈ بناکر اپنے ساتھ لے لیا۔ اب نوکری تو کیا رہی دوستانہ اور برادرانہ رفاقت ہوگئی۔ بیدی صاحب نے اپنی خود نوشت سوانح حیات میں ان کا ذکر بھی تفصیل سے کیا ہے اور ایک لطیفہ تو ایسا لکھا ہے کہ اسے نقل کئے بغیر آگے بڑھنا مشکل ہے۔ ان کے بیان کے مطابق ایک دن دہلی سے باہر ہونے والے ایک مشاعرے میں جانا تھا۔ بیدی صاحب نے حسب معمول ان سے ساتھ چلنے کو کہا تو انہوں نے گھر جاکر کپڑے بدل کر آنے کی اجازت چاہی۔ گھر گئے تو کافی دیر نہ آئے۔ اب بیدی صاحب اپنی جیب میں دوسرے شاعروں کو بھر کر ان کے گھر پہونچے تو دروازے پر آکر یہ کہہ کر چلے گئے کہ ابھی حاضر ہوا مگر آنے میں کافی دیر ہوئی۔ جب آئے اور اتنی دیر لگانے کا سبب دریافت کیا گیا تو کہا کہ بیوی پڑوس میں گئی ہوئی تھیں۔ ان سے ملنے میں دیر ہوئی پھر نجی کام کیا تو نہانا ضروری ہوگیا۔ اس سوال پر کہ آخر اس وقت نجی کام کرنے کی کیا ضرورت تھی یہ جواب دیا کہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ سفر پر جانے سے پہلے حق زوجیت ادا کردینا چاہیے۔ پھر تو یاران طریقت سارے راستے اسی فلسفہء زوجیت پر بحث کرتے منزل پر پہونچے۔

انور صابری جمعیتہ علمائے ہند اور مجلس احرار کے خاص شاعر تھے اور ان کے جلسوں میں بڑی پاٹ دار آواز میں نعتیں اور نظمیں پڑھا کرتے تھے۔ تن و توش کے اعتبار سے گاما پہلوان کے چیلے معلوم ہوتے تھے مگر تھے بڑے خوش مزاج۔ ان کے لئے یہ لطیفہ مشہور تھا کہ ایک دن قاضی کے حوض سے جامع مسجد کے لئے رکشا چکانے لگے تو اس نے ڈبل کرایہ طلب کیا۔ وجہ پوچھی تو جواب ملا کہ جناب آپ کو دو پھیروں میں پہونچانا پڑے گا۔ جب مولوی سمیع اللہ کی دکان پر آتے تھے تو وہ یہ ضرور کہتے تھے ارے مولوی رکشا والے کو کرایہ تو پورا دے دیا ہے۔ کئی سال ہوئے کہ جنت میں نعت خوانی کو چلے گئے۔

عزیز وارثی اور حکیم عنبار ہمدرد دواخانے میں ملازم تھے اور دونوں شعر کہنے کا سلیقہ رکھتے تھے۔ حکیم عنبار کا پورا نام مشتاق احمد خاں بھی تھا۔ ضلع بارہ بنکی (یو۔پی) کا موضع بھٹی ان کا آبائی وطن تھا۔ مگر پٹنہ میں سکونت اختیار کرلی تھی۔ ان کے بڑے بیٹے رضوان احمد وہیں سے روزانہ اخبار عظیم آباد ایکسپریس نکالتے ہیں حکیم صاحب کا انتقال بھی ۸۶ء میں پٹنہ ہی میں ہوا۔

مضطر بھی پنجاب کے مہاجر اور اردو فارسی کے عالم تھے۔ اخبار ملاپ کے لئے روزانہ ایک قطعہ لکھنا ذریعہ معاش تھا۔ پہلوان نما جوان تھے مگر نسبتاً کم عمری ہی میں قلب مضطر کو قرار آگیا۔

نریش کمار شاد دبلے پتلے آدمی کسی دفتر میں ملازم اور شراب خانہ خراب کے ہاتھوں اور زمانے کی ناقدری سے بڑے ناشاد رہتے تھے۔ قطعات حسب حال اور برجستہ لاجواب لکھتے تھے۔ ان کی لاش ایک دن صبح کو ایک نالے سے ملی اور سائیکل نالے کے پل پر پڑی ہوئی تھی۔ یہ معلوم نہ ہوسکا کہ بے خودی کے عالم میں گرے یا خودکشی کی یا کسی نے دھکیلا۔

گوپال متل بھی لاہور سے آئے تھے۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ آدمی تھے۔ کمیونزم کے سخت مخالف تھے اور اس غرض سے ایک معیاری رسالہ "تحریک" بھی نکالتے تھے اچھے شاعر بھی تھے اور غزلوں کا مجموعہ "صحرا میں اذان" بڑی شان سے چھپوایا تھا۔ ایک سوویت ادیب کے مخالف کمیونزم ضخیم ناول کنیسر وارڈ کا ترجمہ بھی کیا تھا۔ اس بات کا افسوس رہا کہ پنڈت ہری چند اختر سے ملاقات نہ ہوسکی جو

اردو بازار کی جان، اچھے شاعر اور بڑے حاضر جواب تھے۔ وہ میرے آنے سے پہلے ہی ہری کو پیارے ہو چکے ہیں۔

کلکتے کو روانگی کا فیصلہ

دہلی کے قیام کے دنوں میں میری دوسری بیٹھک جمعیتہ علماء کا دفتر تھی جس کی بڑی وجہ مولانا حفظ الرحمن کی مہربانی تھی۔ انہوں نے اپنی عملی زندگی امروہے کے مدرسہ اسلامیہ کی صدر مدرسی سے شروع کی تھی اور امروہے میں کئی سال قیام کرنے کی وجہ سے اس کے باشندوں کی بڑی حاجت روائی بھی کرتے تھے اس زمانے میں جمعیتہ علماء کا دفتر ایک رہائشی علاقے کے چھوٹے سے دو منزلہ مکاں میں تھا۔ بعد میں قریب کے کئی چھوٹے چھوٹے گھروں کو لے کر مدنی ہال تعمیر ہوا اور جمعیتہ کے دفتر کے علاوہ اخبار الجمعیتہ کا دفتر بھی وہیں آگیا۔ بعد میں اخبار بند ہوگیا اور جمعیتہ کا دفتر نئی دہلی کی مسجد عبد النبی کو چلا گیا اور مدنی ہال کچھ لوگوں کی سکونت اور جلسوں کے لئے رہ گیا۔ مولانا حفظ الرحمن سے میں بڑی بے تکلفی سے بات چیت کیا کرتا تھا۔ جس کا سلسلہ بمبئی کی ملاقاتوں میں شروع ہوا تھا اور حیدرآباد میں بھی قائم رہا تھا۔ ان کے حاشیہ نشیں اس پر حیرت بھی کرتے تھے کہ مولانا نے ایک داڑھی منڈے کو منہ لگایا ہے مگر مولانا بہت خوش اخلاق اور وسعت نظر کا مظاہرہ کرتے تھے۔ میں کبھی کبھی اس بات پر بحث کرنے لگتا تھا کہ مسلمان کٹر مسلمان ہوکر قومیت مشترکہ کا جزو کیسے ہو سکتے ہیں مگر مولانا اس

نظریہ پر مضبوطی سے قائم تھے کہ پکے مسلمان کو سچا ہندوستانی بننے سے کوئی چیز روک نہیں سکتی۔ پاکستان بننے کے بعد عام ہندوؤں کی فرقہ پرستی میں جو شدت پیدا ہوئی تھی وہ اس سے خوش نہ تھے اور اس کا علاج ان کے نزدیک یہ تھا کہ مسلمان ان کا ساتھ دیں یا کانگریس میں آجائیں تو وہ ہندوؤں کی فرقہ پرستی کو دبا سکتے ہیں مگر نہ مسلمانوں نے پوری طرح ان کا ساتھ دیا نہ ہندوؤں کی فرقہ پرستی میں کمی آئی۔ اس کے برعکس وہ بڑھتی ہی چلی گئی یہاں تک کہ جبلپور کے ۱۹۶۱ء کے فسادات کے بعد وہ بھی کل ہند مسلم مجلس مشاورت کے قیام پر رضامند ہوگئے جس کا مقصد ہندوؤں اور مسلمانوں کو قریب لاکر فرقہ وارانہ فسادات کا سدباب کرنا بتایا گیا تھا مگر ہوا یہ کہ مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ ایک زمانے میں جب علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر کے لئے مسلمانوں کے ایک خاص فرقے کے مذہبی پیشوا کا نام بار بار زیر غور آرہا تھا۔ میں ان کی حمایت کی وجہ دریافت کر بیٹھا اس پر کہا کہ وہ جمعیتہ علمائے ہند کا کام چلانے کے لئے ۴۰ ہزار روپے سالانہ دے رہے ہیں۔ ان کی بات نہ مانی جائے تو مجھے کام چلانے کی دوسری صورت بتا دیجئے۔ اس پر مجھے مسلمانوں کی حالت پر سخت حیرت ہوئی جن کی ہزاروں جامیں اور اربوں روپے کی املاک ان کی وجہ سے بچی تھیں۔ مگر جمعیت کی مالی مدد سے منہ چرا رہے تھے۔ یہاں یہ بتادینا بھی شاید بے جا نہ ہوگا کہ آج جو ہمدرد ٹرسٹ طب یونانی اور

مسلمانوں کی بڑی تعلیمی خدمت کر رہا ہے اور تغلق آباد میں کروڑوں روپے کی عمارتوں میں کئی اداروں کو چلا رہا ہے اس وقت صرف ہمدرد دواخانے تک محدود تھا جس کی عمارت لال کنویں کے بازار میں تھی اور پنجابی پناہ گزین اس پر قبضہ کرنے کو بھی بے چین تھے مگر مولانا نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر اس کی حفاظت کی تھی۔ اس کے بعد ان کے دوست اور رفیق کار قاضی سجاد حسین میرٹھی بھی اس کے نگرانوں میں شامل ہوگئے تھے۔ ان کے ذریعے جمعیتہ کے حامی لوگوں کو وہاں ملازمت بھی ملنے لگی تھی۔ مولانا مجھے بھی وہاں بھیجنا چاہتے تھے اور قاضی صاحب سے کہہ بھی دیا تھا۔ ایک بار جب میں نے تقاضا کیا تو غصے سے کہا کہ کوئی مناسب جگہ خالی ہوگی تو مل جائے گی۔ اسی وقت کیا دوائیں کوٹنے کے لئے لے جاکر بٹھادوں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ مجھے اخبار الجمعیتہ سے وابستہ کرنا چاہتے تھے کیونکہ وہ اس کی حالت سے مطمئن نہ تھے۔ نہ اس کی حالت واقعی قابل اطمینان تھی۔ اس کے ایڈیٹر مولوی محمد عثمان فارقلیط جنہوں نے اپنی عملی زندگی آریہ سماجیوں اور عیسائیوں سے مناظرے کرنے سے شروع کی تھی سیاست میں بھی مناظرہ باز ہوگئے تھے اور مسلمانوں کے لئے جب بھی کوئی وجہ شکایت پیدا ہوتی تھی تو اس سختی سے تحریری مجادلہ کرتے تھے کہ مولانا کو سرکاری حلقوں میں صفائی دینا مشکل ہو جاتا تھا اور پکڑ دھکڑ بھی ہو جاتی تھی۔ ناز انصاری اور بہار برنی میں بھی کو ما چھائی چلتی رہتی تھی جو مولوی عثمان

کی حالت کے دنوں میں بہت بڑھ جاتی تھی اور ایک مرتبہ تو یہاں تک ہوا کہ ان دونوں کی جنگ سے بچنے کے لئے بہار برنی کی خاطر ہفتے وار ایڈیشن بھی شروع کیا گیا جس سے اخبار کی مالی حالت اور خراب ہو گئی کیونکہ اس کے خریدار کم تھے اور چندہ دینے میں بھی چور تھے سیکڑوں پرچے مفت ہی جاتے تھے ۔ مولانا چاہنے کے باوجود اسٹاف کے خلاف کوئی قدم اس وجہ سے نہیں اٹھاسکتے تھے کہ اس کے اراکین جمعیتہ کے لیڈروں کے رشتے دار تھے جو ان کے خلاف کوئی کارروائی ہونے پر مولانا کے پیچھے پڑجاتے ۔ مولوی عثمان نے مولانا کی ذہنی کیفیت پڑھ لی تھی اس لئے کبھی کبھی وہ حقیقت حال معلوم کرنے کے لئے مجھ کو الجمعیتہ میں کام کرنے کی پیشکش بھی کردیتے تھے مگر مایوس رہتے تھے ۔ کیونکہ مولانا ایک تو پالیسی میں نرمی کرنے کو آمادہ نہ تھے نہ جمعیتہ کے لیڈروں کی مخالفت مول لینے کو ۔ پھر میں اس جنجال میں کیسے پڑسکتا تھا وہ جمہوریت پسند تھے اور جمہوریت کو چلانے کے لئے انسان کو بزدلی اور مفاہمت پسند ہونا ہی پڑتا ہے کیونکہ جمہوریت میں دوسروں کو ساتھ لے کر چلنا ضروری ہوتا ہے اور جب دوسرے لالچی ، بے اصول اور اور زر ہوس پرست ہوں تو پھر جمہوریت خالص کس طرح رہ سکتی ہے ۔

اب میری جان بڑی کشمکش میں تھی پیام وطن سے پیسے ملنا مشکل ہوگیا تھا کوئی اور صورت آمدنی کی نہ تھی کلکتہ جانے کو جی نہیں چاہتا تھا کیونکہ میرے دوست سہیل عظیم آبادی جو افسانہ نگاری میں منشی پریم چند کے مقلد تھے اور پٹنہ چھوڑ کر سری نگر ریڈیو میں اردو شعبے کے انچارج ہوگئے تھے جب ادبی آب و ہوا کی تبدیلی اور سری نگر میں نہاتے وقت بدن سے چپٹ جانے والے صابن کو چھڑانے کے لئے دہلی آتے تھے تو یہ تاکید کرجاتے تھے کہ چار سو روپیے سے کم کی تنخواہ اور رہنے کے لئے گھر کا انتظام ہوئے بغیر ہرگز مت جانا لیکن عین اسی عالم میں ڈاکٹر ہیرالال چوپڑا طیب بھائی کی وکالت کرنے دہلی آگئے اور مولانا سے مجھے کلکتہ بھیجنے پر آمادہ کرنے کی فرمائش کی ۔ مولانا نے مجھے بلاکر ان سے ملایا اور فوراً کلکتہ چلے جانے کی تاکید ہی نہیں کی بلکہ چوپڑا صاحب کے دیئے ہوئے ڈیڑھ سو روپیے بھی کرائے کے لئے میری جیب میں ٹھونس دیئے کیونکہ طیب بھائی سے بھی ان کے چندے کے تعلقات تھے ۔ میں نے بہت کہا کہ مولانا ڈھائی سو روپیے میں میں کیا کروں گا اور کلکتے میں خود کہاں رہوں گا اور بیوی بچوں کو کہاں رکھوں گا مگر وہ سختی سے اپنے فرمان پر ڈٹے رہے اور یہ کہتے رہے کہ وہاں جاکر کام کروگے تو معاملات کی صورت بہتر ہوجائے گی ۔ اب مولوی کے فتوے اور حکم کی تعمیل مجھے جنت کی جگہ دوزخ میں لے گئی ۔ میں باقی صاحب سے بھی کچھ کہے بغیر ہی امروہے کو روانہ ہوگیا تاکہ وہاں سے کلکتہ جاؤں ۔ دہلی چھوڑنے سے پہلے ۱۵/ اگست ۵۷ء کو یوم آزادی کے دن لال قلعے سے ہونے والی جواہر لال نہرو کی تقریر بھی سن لی جس میں انہوں نے ہندوستانیوں کو بہت سے سنہرے خواب دکھانے کا فرض ادا کیا تھا اور کچھ دیر کے لئے میں بھی اپنے روشن مستقبل کا خواب دیکھنے پر مجبور ہوگیا تھا اور یہ بھول گیا تھا کہ

آرزوؤں سے بنا کرتی ہیں تقدیریں کہیں

دو ہی دن بعد باقی صاحب کا ایک پوسٹ کارڈ ملا جس میں انہوں نے مجھے "قیامت خاموش" قرار دینے کے بعد واپس آجانے کو لکھا تھا اور تنخواہ کی ادائیگی کے متعلق کچھ وعدے بھی کئے تھے مگر اب تو تیر کمان سے نکل چکا تھا ۔ چند روز بعد میں والدہ اور بیوی بچوں کو ملول چھوڑکر اور اپنا دل بھی مسوس کر کلکتہ روانہ ہوگیا ۔

پیام وطن میں کام کرنے والوں کے ذکر میں ایک اور صاحب کو شامل کرلینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے وہ تھے بسنت کمار چٹرجی جو کبھی کبھی خاص نمبر ترتیب دینے کے لئے بلائے جاتے تھے اور وہ ان نمبروں کے لئے کتابوں سے مضامین کا ترجمہ بھی کرتے تھے اور کتابوں کی تصویریں کاٹ کاٹ کر اخبار میں لگاتے اور ان کو گنجا کرڈالتے تھے ۔ دہلی آنے سے پہلے وہ کلکتے کے اردو اخباروں میں بھی کام کرچکے تھے اور دہلی میں کسی دفتر میں بھی کام کرتے تھے ۔ ان کی شرافت اور انسانیت کا یہ عالم تھا کہ ان کی بیوی ڈیڑھ دو سال کی بچی چھوڑکر دنیا سے سدھار گئی تھیں تو انہوں نے دوسری بیوی کی مدد لینے کے بجائے بچی کی پرورش کی ساری ذمے داری اپنے سر لے لی تھی ۔ سائیکل کے پیچھے لوہے کا جالی دار کھانچا لگوالیا تھا اور جہاں بھی جاتے تھے بچی ساتھ رہتی تھی ۔ اب ان کا انتقال ہوچکا ہے ۔

حیدرآباد میں بھی کاکوری کے ایک علوی صاحب کو بھی اپنی بچی کو اسی طرح پالتے دیکھا تھا۔ اب تک میں صرف ایک ہی اردو داں بنگالی ہندو سے واقف تھا جو حیدرآباد کے شانتی رنجن بھٹاچاریہ تھے جو حیدرآباد میں بھی ملتے رہتے تھے اور کلکتہ آکر محکمہ اطلاعات میں ملازم بھی ہوگئے تھے اور اردو میں کتاب پر کتاب لکھتے چلے جارہے تھے یہاں تک کہ بنگالی کی ایک اہم کتاب اردو میں ترجمہ کرکے ساہتیہ اکاڈمی کے اعزاز و انعام کے بھی مستحق ہوگئے تھے۔ ۹۳ء میں ان کا بھی انتقال ہوگیا

(پہلی قسط)

شہنشاہ ظہیرالدین محمد بابر اور "بابر نامہ"

برصغیر میں مغل ہند جمالیات کے تخلیقی رشتے کا نقطہ آغاز!

شکیل الرحمن
Former Union Minister for Health and Family Welfare
" Madhuban"
A_ 267, South City, Gurgaon_ 122001 (Haryana)

ظہیرالدین محمد بابر غازی (۱۴۸۳ء - ۱۵۳۰ء) گیارہ بارہ سال کی عمر میں سمرقند کے مشرق میں ایک چھوٹی سی ریاست فرغانہ کا حکمراں بنا، اس کے والد عمر شیخ مرزا کا رشتہ سلطان تیمور سے تھا اور اس کی والدہ قتلق نگار خانم (۱) کا تعلق چنگیز خاں کے خاندان سے تھا، عمر شیخ مرزا سلطان تیمور کا چوتھا جانشین تھا اور قتلق نگار مغولستان کے حاکم یونس خاں چغتائی تاشقندی کی بیٹی تھی۔ جس کا سلسلہ چنگیز خاں سے جاملتا ہے۔

جدید تحقیق کے مطابق بابر کی پیدائش کی تاریخ ۱۴/ فروری ۱۴۸۳ء (۶/ محرم ۸۸۸ھ) ہے اور ان کے انتقال کی تاریخ ۲۶/ دسمبر ۱۵۳۰ء ہے۔ بابر نامہ کے حیدرآباد والے نسخے کے مطابق بابر ۸۹۹ھ (جون ۱۴۹۴ء) میں رمضان شریف کے مہینے میں پیدا ہوا اور بارہ سال کی عمر میں فرغانہ کا سلطان بنا۔ اس کی ولادت کی تاریخ اس شعر سے بھی نکالی گئی ہے۔

اندر ششں ۔ محرم زار آں شہہ مکرم   تاریخ مولدش داں ہم در ششں محرم!

اکبرنامہ میں یہ شعر اس طرح ہے۔

چوں در ششں محرم زار آں شہہ مکرم   تاریخ مولدش داں ہم در ششں محرم!

(مولانا حسامی قراکولی)

" بابر نامہ " کے مختلف نسخے بابر نامہ کے مختلف نسخوں میں اختلافات ہیں۔ ہمیں ان کا علم ہے، فارسی ترجموں میں تاریخوں اور واقعات کی ترتیب میں فرق ہے، عالم یہ ہے کہ بابر کے صرف ۱۸ برسوں کی ایک ڈائری سامنے آتی ہے۔ ۴۷ سال اور ۱۰ مہینے کے بہت سے واقعات نہیں ملتے، بہت سے صفحات گم ہو چکے ہیں۔ اکثر صفحات مکمل بھی نہیں ہیں۔ بعض اہم واقعات کا علم نہیں ہوتا، اکثر مقامات پر خلاسا ہے، کہیں بعض واقعات مکمل نہیں ہیں اور کہیں بعض جملے نامکمل ہیں، بابر نامہ کو ترکی زبان سے فارسی زبان میں منتقل کرتے ہوئے مترجموں نے اکثر واقعات اور کچھ ایسے واقعات کہ جن سے ان کی دلچسپی نہیں تھی نظرانداز کر دیا ہے، یہ بتانا بھی ممکن نہیں ہے کہ بابر نے اپنی خودنوشت سوانح حیات کے لئے کون سا عنوان یا نام پسند کیا تھا۔

---

(۱) ابوالفضل (اکبرنامہ) اور فرشتہ کے مطابق قتلق نگار خانم ہے۔
کچھ لوگوں نے قتلغ نگار خانم لکھا ہے۔
اور بعض حضرات نے تغلق نگار خانم اور قتلغ مہر نگار۔





بابر نامہ کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

o فرغانہ اور سمرقند

o کابل

اور o ہندوستان

شیخ زین الدین فارسی زبان کے استاد تھے جنہوں نے بابر کے عہد میں "طبقات بابری" کے نام سے "بابر نامہ" کے اس حصے کو فارسی زبان میں منتقل کیا تھا کہ جس کا تعلق ہندوستان کے بعض تجربوں میں ہے۔ یہ حصہ انتہائی اختصار کے ساتھ، بہت سے واقعات کو نظرانداز کرکے پیش کیا گیا تھا، حقیقت یہ ہے کہ اس میں ہندوستان کے صرف چند مہینوں کے تجربوں پر روشنی ڈالی گئی ہے، پانی پت کی جنگ کا ذکر بھی موجود ہے، شیخ زین الدین شاعر بھی تھے اور ایک اچھے انشا۔ پرداز بھی، بابر ان کا بڑا مداح تھا، راناسانگا کی شکست کے بعد بابر کا جو فرمان جاری ہوا اسے شیخ صاحب ہی نے تحریر کیا تھا، یہ فرمان تزک بابری میں شامل ہے۔ عبدالقادر بدایونی نے "منتخب التواریخ" میں لکھا ہے کہ انہوں نے بابر کی مثنوی "مبین" کی ایک شرح لکھی تھی۔(۱) ۹۴۰ھ میں انتقال ہوا، اپنے قائم کئے ہوئے مدرسہ اکبرآباد میں دفن ہوئے، ملا عبدالقادر بدایونی نے "منتخب التواریخ" میں ان کی چند رباعیوں کو پیش کیا ہے اور بتایا ہے کہ ان کا تخلص وفائی تھا۔

محققین کہتے ہیں کہ ۱۵۱۲ء میں حصار کے ایک خیمے میں آگ لگ جانے کی وجہ سے بابر نامہ کے کئی حصے ضائع ہوگئے تھے۔ ۱۵۲۹ء میں بھی ہمایوں کے عہد میں اکثر صفحات گم ہوگئے تھے۔

ہمایوں کے دور میں بابر نامہ کے دو نسخے ترکی زبان میں تیار ہوئے تھے، ایک نسخہ ۱۵۳۱ء میں مکمل ہوا تھا یعنی بابر کے انتقال کے چھ ہفتے بعد اسے علی الخطیب نے تیار کیا تھا اور دوسرا نسخہ حیدر مرزا کا تھا۔ اکبر کے عہد میں "واقعات بابری" کے نام سے بابر نامہ کا ایک ترجمہ فارسی زبان میں ہوا عبدالرحیم مرزا نے شہنشاہ کی ہدایت پر ۱۵۸۹ء میں ترجمہ کیا تھا جس کا ذکر ابوالفضل نے اکبر نامہ میں کیا ہے، عبدالرحیم مرزا کا ترکمانی ذہن اسلوب میں نمایاں ہے۔ بعض حصے ایسے ہیں جن سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ مرزا کا انداز فارسی کے اساتذہ کا نہیں ہے، بہت سے ترکی لفظوں کا ترجمہ نہیں کیا ہے اور ایسے الفاظ ترکی نسخے کے مطابق ہیں۔ اکثر جملوں کے مفاہیم واضح نہیں ہوتے، عبدالرحیم مرزا کے فراہم کئے ہوئے مواد ہی کو ابوالفضل نے "اکبر نامہ میں بنیاد بنایا ہے، کہا جاتا ہے ابوالفضل کے لئے اکبر نے واقعات بابری کی ترتیب اور اس کے ترجمے کی ہدایت دی تھی، واقعات بابری نے بلاشبہ بابر نامہ کو مقبول بنانے میں بڑا حصہ لیا ہے۔ ۱۵۸۹ء میں یہ نسخہ مرزا نے شہنشاہ کی خدمت میں پیش کیا تھا۔

شاہ جہاں کے کتب خانہ میں "پادشاہ نامہ" کا ایک نسخہ موجود تھا، رام پور والے نسخے کے متعلق یہ تحقیق ہوچکی ہے کہ یہ شاہ جہاں کے کتب خانے میں موجود تھا۔

جہانگیر نے تزک جہانگیری میں بابر نامہ کے ترکی نسخے کا ذکر کیا ہے اور یہ کہا ہے کہ یہ نسخہ اس کی نظر سے گزرا۔ وہ بابر کی اپنی تحریر ہے۔ صرف چار حصے ایسے ہیں جو بابر کے لکھے ہوئے نہیں ہیں۔ اس نے یہ نہیں بتایا ہے کہ وہ چار حصے کون سے ہیں عبدالرحیم مرزا، جہانگیر کے اتالیق تھے اور انہوں نے اس کی ذہنی تربیت میں حصہ لیا تھا، مرزا کے پاس جو نسخہ تھا غالباً وہی اس کی نظر سے گزرا ہوگا۔ کہا جاتا ہے یہ نسخہ جہانگیر کے کتب خانے میں عرصہ تک محفوظ رہا اور پھر کسی طرح بخارا پہنچ گیا۔

---

(۱) بابر نے یہ مثنوی اپنے بیٹے کامران کی ذہنی تربیت کے لئے لکھی تھی جس میں فقہی، مذہبی اور اخلاقی مسائل پر دو ہزار اشعار ہیں، ابوالفضل اور بدایونی نے اسے "مبین" کے نام سے موسوم کیا ہے۔ اسپنگر (Spenger) نے اسے "فقہ بابری" کہا۔ "درفقہ مبین" کے نام سے بھی مشہور ہے۔ بابر نے خود اس سے مثالیں دی ہیں، بری زائن (Berezine) نے اسے حاصل کیا تھا جس کے بہت سے حصے اس نے شائع کردیئے تھے۔ المنسکی (Alminisky) کی نظر سے بھی یہی حصے گزرے تھے، قیاس یہ ہے کہ یہ نسخہ خواجہ کلاں کے پاس تھا جنہیں بابر نے ۷/ مارچ ۱۵۲۰ء کو ایک نسخہ بھیجا تھا۔ (ملاحظہ ہو بابر نامہ مترجم بیورج ص ۴۳۷ ـ ۴۳۸)

بابر ایک صاحب اسلوب فنکار تھا، اس کے ترکی اسلوب کی باریکیوں کو بھی فارسی ترجموں میں پیش کرنا ممکن نہ ہوسکا ہے۔ اس کی کلاسیکی ترقی اپنی آب و تاب رکھتی تھی، شاعر بھی تھا اور حساس فطرت نگار بھی، فرغانہ، سمرقند، کابل اور ہندوستان کو اس نے ایک بڑے فنکار کی نظر سے بھی دیکھا ہے۔ ۱۵۸۹ء میں اکبر کے عہد میں جو ترجمہ ہوا اس کی بہت سی خامیوں کا ذکر ہوتا رہا ہے اس لئے بھی بہت سے واقعات پیش نہ ہوسکے اور بابر کے ترکی اسلوب کی معنویت بہتر طور پر ابھاگر نہ ہوسکی۔

۱۵۲۹ء میں خواجہ کلاں کا امراری نسخہ بھی نامکمل رہا، قیاس یہ ہے کہ ۶۵۲ صفحات پر مشتمل یہ نسخہ سمرقند بھیجا گیا تھا، ممکن ہے یہ اب بھی وہاں کہیں محفوظ ہو، ہمایوں کے دور کا ایک مخطوطہ شاہی کتب خانے میں ۱۵۵۶ء سے ۱۵۶۷ء تک محفوظ رہا ہے، محمد حیدر کا ترجمہ (۱۵۳۶ء) ۱۵۴۷ء تک کشمیر میں تھا، کہا جاتا ہے کہ کاشغر میں جو نسخہ موجود ہے وہ محمد حیدر ہی کا ہے، کسی طرح کشمیر سے وہاں پہنچ گیا۔ ۱۸۱۰ء تک "بابر نامہ" کا ایک فارسی ترجمہ پشاور میں محفوظ رہا ہے۔ ۱۹۲۱ء تک اس کے حوالے ملتے رہے ہیں، علی کشمیری نے ۱۶۲۹ء میں ۹۷ واقعات و حقائق کا ترجمہ کیا تھا جو برٹش میوزیم میں ہے، ابوالفضل کے ایک عزیز نور محمد نے ۱۶۲۵ء میں ۷۱ حقائق و واقعات کو فارسی زبان میں منتقل کیا تھا، حیدر آباد کا نسخہ ۱۷۰۰ء کا ہے، کہا جاتا ہے کہ یہ اورنگ زیب کے عہد میں مرتب ہوا تھا۔

بخارا کے مسودے اور نسخے بھی بہت اہم ہیں، "واقعہ نامہ پادشاہی" کے لئے عبدالوہاب نے اصل مسودے کو پیش نظر رکھا تھا۔ نظر ترکستانی کا ترجمہ لینن گراڈ میں ہے، بخارا کے نسخے کے کئی ترجمے دنیا کے مختلف کتب خانوں میں رہے ہیں، بعض ترجموں سے یہ علم نہیں ہوتا کہ ان کے مترجم کون تھے، مغربی مترجموں نے حیدر آباد اور بخارا کے نسخوں کی مدد سے جو عمدہ کام کیا ہے، ہمیں اس کی بہت حد تک خبر ہے۔ کورٹیل (Courteille) نے فرانسیسی زبان میں بابر نامہ کو پیش کر کے یہ ثابت کیا کہ "ترک بابری" دنیا کی ایک عمدہ ترین سوانح حیات ہے، لیڈن (Leyden) اور ارسکن (Erskine) نے اسے انگریزی زبان میں منتقل کیا، سب سے عمدہ کام بیوریج (Annette Susannath Beveridge) نے کیا، بابر نامہ کا یہ ترجمہ انتہائی مفید مقدمہ اور حواشی اور ضمیموں کے ساتھ پہلی بار ۱۹۲۲ء میں شائع ہوا۔ ۱۸۲۴ء میں جے سینکوفسکی (J Senkovski) اور ۱۸۳۸ء میں ملا فیض خانوف (Faizkhanov) کے ترجمے آچکے تھے، ان دونوں نے بابر نامہ سے گہری دلچسپی کا اظہار کیا تھا اور اہم واقعات و حقائق کے ترجمے کئے تھے۔

ابتدا میں بابر نامہ کے مختلف حصوں کو علیحدہ کر کے پیش کرنے کا رواج رہا ہے لہذا مترجم عموماً واقعات کا انتخاب کرتے اور انہیں فارسی زبان میں منتقل کر دیتے، شہزادوں کو انہیں تحائف کی صورت میں پیش کیا جاتا رہا ہے یہی وجہ ہے کہ بہت سے واقعات کے تعلق سے اختلافات پیدا ہوتے رہے، بہت سے واقعات و حقائق کی جانب توجہ نہیں دی گئی کہ جن کی آج بڑی اہمیت ہوسکتی تھی۔

شخصیت کی تعمیر و تشکیل _ والد اور اسلاف سے رشتوں کے روحانی پہلو

شہنشاہ بابر کی شخصیت کی تشکیل میں جہاں چغتائی روایات کی اعلیٰ اور عمدہ قدروں نے حصہ لیا تھا وہاں مغلوں اور ترکوں کی سخت کوشی، حوصلہ مندی اور بلند نگاہی اور تیموری روایات کے حسن و جمال نے بھی حصہ لیا تھا، بابر ایک فلسفیانہ ذہن کا مالک تھا اور اس کی آبیاری میں اسلام کی اخلاقی اور روحانی اقدار کا حصہ کم اہم نہ تھا۔ وہ شاعر اور ترکی زبان کے ایک صاحب اسلوب فنکار کی حیثیت سے بھی متاثر کرتا تھا، ایک سحر انگیز اسلوب کا خالق تھا فنون لطیفہ اور خصوصاً فن تعمیر اور ادبیات سے اس کی گہری دلچسپی تھی، باغوں کی خوبصورت تعمیر و تشکیل میں، ہمیشہ گہری دلچسپی کا اظہار کرتا رہا

سلطان تیمور کی شخصیت بابر کے لئے ایک نمونہ تھی، اس نے اپنی والدہ قتلق نگار خانم اور اپنی نانی دولت بیگم سے تیمور کی شجاعت، علم دوستی علم پروری اور فنون سے اس کی گہری دلچسپی کی بچی کہانیاں سنی تھیں، تیمور کی بنائی ہوئی خوبصورت ترین عمارتیں اس کے سامنے تھیں، فنِ مصوری

سے سلطان کی گہری دلچسپی کے واقعات بھی سنے تھے اور اپنی میراث کو مختلف شہروں میں دیکھا تھا پھر اس حقیقت کا علم ہے کہ سلطان تیمور نے چینی فنکاروں سے گہری دلچسپی کا اظہار کیا تھا، اس کے حکم سے ہزاروں ایسے طومار اور تغرے جمع کئے گئے تھے جو چینی مصوروں اور فنکاروں کے آرٹ کے عمدہ ترین نمونے تھے، تیمور نے ان فنی نمونوں کا ایک رشتہ اپنی فنی روایات سے قائم کیا، اس کے عہد کے مصوروں نے ان کے گہرے اثرات قبول کئے اور اپنی تصویریں بنائیں، یہ فنی نمونے ترکی بھی پہنچے اور ہندوستان بھی آئے۔ ہمیں اس بات کی بھی خبر ہے کہ تبریز کی فتح (۱۳۸۶ء) اور بغداد کی فتح (۱۴۰۱ء) فنی اعتبار سے بھی بڑی اہمیت کی حامل ہیں، تیمور کے ساتھ صرف فوجی نہ تھے بلکہ فنکار اور مصور بھی تھے، سمرقند میں جب اس نے اپنے محل کی تعمیر کی تو اس محل کے ایک حصے میں بغداد کے مصوروں اور فنکاروں کو رکھا جنہوں نے کئی منقش اور منور باتصویر نسخے تیار کئے۔ "شاہنامہ" سلطان تیمور کو بے حد پسند تھا لہذا آمیزش کے خوبصورت نتائج سامنے آئے ان کی پہچان تیمور کے بعد ہراتی اور شیرازی مصوروں کے فن میں صاف طور پر ہو جاتی ہے۔

سلطان تیمور نے اچھے معماروں کی بھی بے حد قدر کی۔ سمرقند میں اس نے جانے کتنے فنکار معماروں کو جمع کر رکھا تھا جس کی وجہ سے یہ شہر فنِ تعمیر کی جمالیات کا ایک عمدہ نمونہ بن گیا، پتھر کے خوبصورت ستونوں کے ساتھ سمرقند کی جامع مسجد فنِ تعمیر کا ایک معیار بن گئی، کہا جاتا ہے کہ ۱۳۹۹ء میں بی بی کے مدرسے کا خاکہ خود تیمور نے تیار کیا تھا۔

بابر کے سامنے شخصیت کا معیار غیر معمولی نوعیت کا تھا، اس نے سلطان تیمور کی صرف کہانیاں نہیں سنی تھیں بلکہ اس کے سامنے فنون کے جو نمونے تھے ان کا اس نے بغور مطالعہ اور مشاہدہ بھی کیا تھا۔ گیارہ بارہ سال کی عمر میں تخت نشین ہوا تو اس کی نانی دولت بیگم نے اسے اپنی مکمل نگرانی میں رکھا، پڑھی لکھی ہوشیار خاتون تھیں۔ دولت بیگم نے دراصل بابر کو اعلیٰ اقدار سے آگاہ کیا، صرف یہی نہیں بلکہ جب بابر حکمراں بنا تو کم عمر سلطان کی مکمل رہنمائی کرنے والی یہی خاتون تھیں۔ حکومت کے تمام مسائل پر بابر ان سے مشورے کرتا تھا قتلق نگار خانم (بابر کی والدہ) کے والد یونس خان اپنے دور کے ایک نامور دانشور تھے اور انہوں نے ترکی اور فارسی کی تعلیم اپنے والد ہی سے حاصل کی تھی، دولت بیگم نے قتلق نگار خانم اور بابر دونوں کی تربیت میں نمایاں حصہ لیا ہے۔

بابر کے والد عمر شیخ مرزا، مرزا ابوسعید کے چوتھے لڑکے تھے۔ تین بھائی بڑے اور چار چھوٹے تھے۔ ۸۶۰ھ میں سمرقند میں پیدا ہوئے، نوجوان ہی تھے جب کابل کے نگران مقرر ہوئے، ان کی شخصیت پر اس دور کے مشہور سیاست دان اور مدبر بابائے کابلی کا گہرا اثر ہوا جو ان کے اتالیق کی حیثیت سے کابل میں ہر وقت ساتھ تھے، سلطان ابوسعید کے انتقال کے بعد تخت نشین ہوئے اور بہرام اور تاشقند پر قبضہ کر لیا۔ تصوف، موسیقی اور شاعری سے گہری دلچسپی تھی، قتلق نگار خانم سے شادی کی وجہ بھی غالباً یہی تھی کہ ان کا خاندان علم دوستی اور علم پروری کے لئے مشہور تھا۔

عمر شیخ مرزا کے دربار میں صوفی بھی تھے اور فنکار بھی۔ ان میں اکثر ان کے دوست اور ہمدرد تھے، کوہستانی موسیقی سے گہری رغبت تھی، اکثر نماز اور تلاوت کے بعد کوہستانی موسیقی سنا کرتے، ننھا بابر ان کے پاس بیٹھتا جسے وہ مذہبی تعلیم دیتے، تلاوت کے آہنگ کا احساس عطا کرتے، خواجہ عبداللہ احراری اس دور کے ایک نامور صوفی گزرے ہیں جن کی صحبت میں عمر شیخ مرزا نے اخلاقی اور روحانی صفات و اقدار کو سمجھنے کی کوشش کی، بابر کی پیدائش کے بعد وہ عمر شیخ مرزا کے پاس آئے تھے اور شہزادے کا نام تجویز کرنے میں پیش پیش تھے۔ حضرت احراری کا انتقال اس وقت ہوا جب بابر کی عمر صرف سات سال تھی، عمر شیخ مرزا اور ان کے گھر کے ماحول پر حضرت احراری کی شخصیت کا اتنا گہرا اثر تھا کہ بابر متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا، وہ انہیں ہر وقت قریب محسوس کرنا چاہتا تھا، ہندوستان آنے کے بعد بھی وہ خواجہ صاحب کی یاد سے غافل نہ رہا، ان کی منظوم تالیف "والدیہ" کا ترکی زبان میں منظوم ترجمہ کیا، کہتا ہے۔

> "جمعہ کے دن تیسویں تاریخ جسم میں ایسی حرارت معلوم ہوئی کہ جمعہ کی نماز مسجد میں مشکل سے پڑھی گئی، ظہر کے بعد احتیاطاً کتب خانہ میں گیا، بہت دیر تک بے چینی رہی دوسرے دن ہفتہ کو بخار ہوا، کچھ جاڑا بھی بڑھا، سہ شنبہ

ستائیسویں صفر کی رات کو دل میں آیا کہ خواجہ عبداللہ کے رسالہ "والدیہ" کو نظم کروں، حضرت خواجہ کی روح سے ملتجی ہوا اور دل میں دعا کی کہ یہ نظم آنحضرت کو قبول ہو۔ اس کے قبول ہونے کی دلیل یہ ہے کہ جس طرح "قصیدہ بردہ" مقبول ہوا اور اس کا کہنے والا مرض فالج سے اچھا ہوا اسی طرح میں بھی تندرست ہو جاؤں۔

اسی نیت سے وزن مسدس مخبون و عروب کی، تبرکی، مجنون محذوف میں جس میں مولانا عبدالرحمن جامی کا سبحہ بھی ہے رسالہ نظم کرنا شروع کیا، اسی رات میں نے تیرہ شعر لکھ ڈالے، بطریق التزام ہر روز دس بیتوں سے کم نہ لکھیں، شاید کوئی دن ناغہ ہوا ہو۔ اگلے سال بھی اور کئی بار اور بھی ایسا بخار کم سے کم چالیس دن تک رہا ہے خدا کی عنایت اور حضرت خواجہ کی برکت سے جمعرات کے دن انتیسویں کو ذرا افاقہ ہو گیا اور پھر صحت ہو گئی۔ ہفتہ کے دن ربیع الاول کی اٹھارویں تاریخ نظم تمام ہو گئی، ایک دن میں باون شعر ہوئے۔"

تزک بابری [اردو] مرزا نصیرالدین حیدر گورگانی ص ۳۳۶)

اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ روحانی رشتے کی نوعیت کیا تھی، اپنے بزرگ اور والد کے بزرگ دوست اور مرشد کی روحانی فضیلتوں پر کیسا اعتماد تھا خاندانی ماحول اور عمر شیخ مرزا کے صوفیانہ مزاج کا کتنا گہرا اثر شخصیت پر قائم تھا۔ اس بات کا بھی شدت سے احساس ہوتا ہے کہ بابر کا صوفیانہ مزاج کیسا تھا۔ اور روحانی تجربات و اقدار پر اس کا کتنا پختہ یقین و اعتماد تھا، بابر کو اعلیٰ ترین روحانی اور مادی اقدار کا احساس ابتداء سے ملتا رہا ہے، عمر شیخ مرزا نے شاعروں اور موسیقاروں کی بڑی حوصلہ افزائی کی، سمرقند شعراء کی محفلوں میں بیٹھ کر شعری تجربوں کی مختلف کیفیتوں سے متاثر ہوتا رہا ہے۔ ان کے شعری میلان کو ابھارنے میں عمر شیخ مرزا اور ان کے رفیقوں نے یقیناً بڑا حصہ لیا ہے۔ اس کی تخلیقی صلاحیتیں روایات سے گہرا رشتہ رکھتی ہیں، عمر شیخ مرزا ۲۶ سال حکمراں رہے۔ ۸۹۹ھ میں ۳۹ سال کی عمر میں کبوتر خانے کی چھت سے گر جانے سے انتقال ہوا۔

اس دور کے ایک بڑے دانشور یونس خاں (قتلق نگار خانم کے والد) کا تعلق بھی عمر شیخ سے بڑا گہرا رہا ہے یونس خاں تعمیرات کے معاملے میں بڑے باشعور تھے۔ عمارتوں اور باغوں کی تعمیر و تشکیل میں لوگوں کو مفید مشورے اور ہدایتیں دیا کرتے تھے، تحریر و تقریر، موسیقی و نغمہ اور مصوری اور فن تعمیر سے ان کی گہری دلچسپی کا اثر بھی عمر شیخ مرزا کے گھریلو ماحول پر تھا۔ یونس خاں کی دوسری لڑکی خوب نگار خانم کے لڑکے حیدر مرزا دغلت نے "تاریخ رشیدی" لکھی تھی۔ اپنے نانا کا ذکر کرتے ہوئے اس نے لکھا ہے کہ بارہ سال تک مولانا شرف الدین علی یزدی کے ساتھ رہ کر اسلام کی اعلیٰ ترین قدروں اور روحانی پاکیزگی کے رموز سے آگاہی حاصل کی، مولانا یزدی کے انتقال کے بعد وہ عراق اور آذربائیجان کی جانب چلے گئے، شیراز میں علماء و فضلا کی محفلوں میں شریک ہوتے رہے، اسی شہر میں استاد یونس کے نام سے مشہور ہوئے، قرآن حکیم کی تلاوت میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے، قرأت خوب کرتے، موسیقی اور مصوری کے بھی ماہر تھے۔

عمر شیخ مرزا کا اپنا کتب خانہ تھا، اکثر قرآن پاک کی تلاوت کے بعد مختلف مثنویوں کو ترنم سے پڑھتے اور بابر انہیں سنتا، والد کے صوفیانہ مزاج اور گھر کے صوفیانہ ماحول کا اس پر بڑا گہرا اثر رہا ہے۔ ترکی زباں میں سلطان تیمور کے ملفوظات نے بھی اسے متاثر کیا تھا (ان ہی ملفوظات کی بنیاد پر شریف الدین علی نے ظفر نامہ لکھا تھا، اس کا سرچشمہ مولانا نظام الدین شامی کا ظفر نامہ ہے جو تیمور کی فرمائش پر لکھا گیا تھا اور تیمور کی زندگی میں مکمل ہوا تھا یہ ظفر نامہ اب تک شائع نہ ہو سکا) تیمور کی شجاعت اور بلند نگاہی اور فن تعمیر سے اس کی گہری دلچسپی کے جو اثرات بابر پر ہوئے ان کی پہچان "بابر نامہ" سے بخوبی ہو جاتی ہے۔ تیمور نے تاریخ اسلام اور نامور اور گمنام بزرگوں اور صوفیوں سے بھی گہری دلچسپی لی تھی۔ تزک بابری میں ایک جگہ خود کہتا ہے کہ وہ اکثر محدثین و ارباب اختیار و قصص کو ملاتا اور ان سے پیغمبروں، اولیاؤں اور بادشاہوں کی کہانیاں سنتا، تاریخ کے نشیب و فراز اور عروج و زوال کے واقعات معلوم کرتا، سلاطین کی شخصیتوں سے سبق حاصل کرتا، معرفت کے موضوع سے خاص دلچسپی تھی۔ ظاہر ہے بابر کے سامنے سلطان کی شخصیت کا یہ پہلو بھی موجود تھا۔

(جاری)

انجم عظیم آبادی
(کلکتہ)



شکایت بیجا

وہ کل کچھ بھی نہیں تھا
مگر اس کو یکایک آج کچھ
ایسے مواقع مل گئے
جن کے سہارے اڑ رہا ہے آسمانوں میں
زمیں کو دیکھتا ہے اب
حقارت کی نگاہوں سے

وہی اشجار سایہ دار
جن کی چھاؤں میں وہ
بیٹھتا تھا
نگاہوں سے ہوئے ہیں
اس کی اوجھل
زمیں کی سمت جب بھی دیکھتا ہے
لکیریں ہی لکیریں بس
نظر آتی ہیں اس کو

مگر اس میں قصور اس کا بھی کیا ہے
بلندی پر پہنچ کر سب
یہی تو دیکھتے ہیں

غزل

دل میں قندیل مسرت میں جلاؤں کیسے
تو نہیں پاس تو میں عید مناؤں کیسے

زہر آلود فضا اور یہ مسموم ہوا
ایسے ماحول میں گیت اپنا سناؤں کیسے

آتش غم میں شب و روز میں جلتا ہی رہا
دل پہ جو گزری ہے وہ تم کو بتاؤں کیسے

وقت روٹھا ہے تو نوساد کوئی بات نہیں
وہ جو روٹھا ہے تو میں اس کو مناؤں کیسے



نوشاد مومن
۸۵ ج، توپسیا روڈ
کلکتہ — ۳۹

روانگی

ف۔س۔اعجاز

مے کدہ شام کا پھر سے روشن ہوا
ایک خواہش مرے کام پھر آگئی
تیرے رنگین تصور میں ڈوبا ہوا
اپنا دل، اپنے دل کی تمنا لئے
منتظر دید کا، قرب کا منتظر
کون سا نام لے کر پکاروں تجھے
کیا پکاروں تجھے،
میری آواز تو سن نہیں پائے گی
دور مجھ سے ہے تو
اس قدر دور ہے
جتنا سورج سمندر میں ڈھلتا ہوا
پھر بھی جان بہار
آن کی آن میں
تخیل مجھے لے کر اڑ جائے گا
تو مجھے اپنے در پر کھڑا پائے گی
نہ چاندی، نہ سونا، نہ موتی سمندر کے لگے ہوئے
میری جھولی میں ہیں
میں تو بس گنگناتی جوانی لئے
تیرے در پر اچانک پہنچ جاؤں گا
مٹھیوں میں ہی ایک ایسا الاؤ لئے
تن بدن جس سے تیرا دہکنے لگے
مے کدہ شام کا پھر سے روشن ہوا
ایک خواہش مرے کام پھر آگئی
میں روانہ ہوا

ڈاکٹر محبوب راہی
بارشی ٹکلی ۔ اکولہ ۴۴۴۴۰۱

غزل

تو کیا سوائے مرنے کے چارہ نہیں کوئی
تو کیا اے موت تیرا مداوا نہیں کوئی

ہر لمحہ ٹوٹتا ہے، بکھرتا ہے ہر نفس
یہ زندگی ہے کھیل تماشا نہیں کوئی

پہچان اپنی اپنی سبھی کی ہے منفرد
مجھ سا یہاں کوئی نہیں تجھ سا نہیں کوئی

جب اپنے ساتھ چھوڑ گئے تب پتہ چلا
اپنے سوا زمانے میں اپنا نہیں کوئی

ہر رشتہ کی اساس ضرورت پہ رکھی ہے
بے وجہ تو کسی کا بھی ہوتا نہیں کوئی

راہی الاپتے ہو وہی سچ کا راگ پھر
یہ جانتے ہوئے بھی کہ سنتا نہیں کوئی

درد چاپدانوی
۱۰/۱۱۹ جریب چوکی ۔ کانپور ۲۰۸۰۱۲

غزل

ہر سمت ظلم و جور کا بازار گرم ہے
دل داغ داغ ہے تو جگر زخم زخم ہے

ادراک پر غرور نہ دعوائے فہم ہے
اے بدگماں یہ صرف ترے دل کا وہم ہے

ملتا نہیں وفا سے جواب وفا کہیں
کیا کیجیے کہ اب یہی دنیا کی رسم ہے

ٹکرا کے حادثات سے بھی ہنس رہا ہوں میں
باحوصلہ ہوں اب بھی جواں میرا عزم ہے

راہ وفا میں کوئی مٹے گا نہ میرے بعد
ایسا لگے ہے رسم وفا مجھ پہ ختم ہے

میرے لبوں پہ اس کی شکایت نہ آئے گی
لہجہ ہے اس کا سخت مگر دل تو نرم ہے

اے درد میں ہوں سارے جہاں کا شریک درد
انسانیت خدا کی قسم میرا دھرم ہے

سہیل غازی پوری
۱۰۵۵/۹ ۔ دستگیر سوسائٹی، کراچی ۷۵۹۵۰

غزل

کتاب زیست کے عنواں لہو چراغ ہوا
حروف جاں کے نگہباں لہو چراغ ہوا
سمجھنا چاہوں تو شاید انھیں سمجھ نہ سکوں
ہیں دیکھنے میں تو آساں لہو چراغ ہوا
وہاں وہاں ہے دھنک رنگ آئینوں کی قطار
جہاں جہاں ہیں فروزاں لہو، چراغ ہوا
کوئی بھی رنگ، کوئی وقت، کوئی موسم ہو
رہیں گے سب میں نمایاں لہو چراغ ہوا
کبھی تو کوئی غزل اس کے نام سے بھی کہو
تبھی تو ہوں گے غزلخواں لہو چراغ ہوا
سبھی ہیں ایک ہی محفل کے حاشیہ بردار
سہیل گردش دوراں، لہو چراغ ہوا

ایوب اثر
شاہجہاں پور 242001

غزل

دل اگر مل جائیں طرز گفتگو کیا دیکھنا
بات جب اپنائیت کی ہو تو خو کیا دیکھنا
ہم نے جب اپنے چمن کا خود ہی سودا کر لیا
خاک میں ملتی ہوئی اب رنگ و بو کیا دیکھنا
زندگی کے سب مزے لیتے ہیں اب یہ سوچ کر
دوسری دنیا میں خود کو سرخرو کیا دیکھنا
چھوڑ کر پھولوں کو جب کانٹوں بھری راہیں چنیں
پھر بھلا پیروں سے یہ رستا لہو کیا دیکھنا
چل دیا جو غم کی راہوں میں اکیلا چھوڑ کر
اس طرح اس کو اثر اب کو بہ کو کیا دیکھنا





- (اوپر) جانی واکر مکالماتی کامیڈی کی ادا
- (نیچے) گرودت کی ایک فلم میں وحیدہ رحمٰن کے ساتھ۔

سکون کے لئے دولت کیا ہے؟

جانی واکر کی قابلِ تعریف زندگی

انگریزی: سستا شیلی

اردو ترجمہ: انشاء

نوجوان بدرالدین جب بمبئی میں بس کنڈکٹر ہوا کرتا تھا اس وقت بھی اس کی آنکھوں میں ستارے ناچتے تھے اور وہ اپنے آپ کو فلمی ستاروں کے جھرمٹ میں گھرا دیکھنے کا خواب دیکھا کرتا تھا۔ اس کے والد اندور کے ایک کپڑا مل میں سنر کا کام کرتے تھے۔ ان کا گھر ایک بڑے بنگلے میں واقع تھا جہاں وہ اپنی بیوی اور دس بچوں کے ساتھ رہا کرتے تھے۔ لیکن ایک دن مل کا دیوالیہ پٹ گیا اور انہیں بمبئی منتقل ہونا پڑا جو خوابوں کا شہر بھی تھا اور خوابوں کا تاجر بھی۔

"شروع میں ہمیں بڑے سخت دنوں کا سامنا کرنا پڑا تھا" جانی واکر نے اپنا ایام گزشتہ کو یاد کرتے ہوئے بتایا "۱۹۴۲ سے لے کر ۱۹۴۴ تک میں نے بس کنڈکٹر کا کام کیا۔ ۲۶ روپے ماہوار میری تنخواہ تھی جبکہ ۱۲ آدمیوں کا کنبہ میرے سہارے تھا۔ مجھے اب بھی یاد ہے کہ کس طرح میرے والد ماہم سے ریل کے مل تک کام کی تلاش میں پیدل جایا کرتے تھے چونکہ بس یا ٹرین سے سفر کرنے کے لئے ان کے پاس پیسے نہیں ہوا کرتے تھے۔"

اب قسمت دیکھئے کہ بیس سال بعد وہی جانی واکر دنیا میں بہتی سے مہنگی چیز خریدنے کا اہل ہو گیا اور وہ بھی اپنے بوتے پر۔ یہ خود جانی واکر کا کہنا ہے۔ "دنیا میں سب سے قیمتی شے سکون ہے اور میں اسے خرید سکتا تھا۔ کیا آپ کو میرا یقین نہیں آیا؟ نہیں آیا تو سنئے میں بتاؤں یہ کیسے ممکن ہوا۔ ۱۹۶۲ء سے ۱۹۶۴ء میں میں اپنے کیریر کی بلندی پر تھا۔ اس عرصے میں بمبئی میں تیار ہونے والی تقریباً اسی فیصد فلموں میں میرا رول ہوا کرتا تھا۔ مجھے ہر روز سولہ سے اٹھارہ گھنٹے کام کرنا پڑتا تھا۔ حتیٰ کہ میرے پاس کھانے، سونے اور آرام کرنے تک کا وقت نہیں ہوتا تھا۔

"مجھے اعتراف ہے کہ آمدنی زبردست ہو رہی تھی۔ لیکن ایک دن مجھ پر ایک انکشاف ہوا۔ میں نے اپنے آپ سے سوال کیا کہ جب نوکر کا تھا تو ٹھیک سے کھا نا نہیں کھا سکتا اور اب کروڑ لاکھوں کما رہا ہے اب بھی ٹھیک سے کھانا نہیں کھا سکتا۔ یہ پاگل جیسی دوڑ بھاگ کس لئے؟ یہ پیسے کی دوڑ بھاگ کس کام کی اگر مجھے اپنی کامیابی کے لئے اپنی انتہائی بنیادی ضرورتوں کو نظر انداز کرنا پڑے؟ میں نے اسی وقت یہ ٹھان لیا کہ میں یہ سب بند کر دوں گا۔ اور میں نے اپنے پچاس فیصد معاہدوں سے چھٹکارا حاصل کر لیا۔

• فلموں سے انکار کا مطلب تھا موٹی دولت کو ٹھکرانا۔ میں شام ساڑھے چھ بجے کے بعد کام کرنے پر رضامند نہیں تھا چاہے کوئی پروڈیوسر مجھے ایک گھنٹے کے ایک لاکھ روپے ہی دینے کو کیوں نہ تیار ہوتا۔ یہ فیصلہ بڑا سخت تھا۔ مجھے یقین ہے کہ لوگ مجھے بیوقوف سمجھ رہے تھے کہ میں بڑی بڑی پیشکشیں لوٹا رہا ہوں لیکن مجھے اپنے فیصلے پر کبھی افسوس نہیں ہوا۔ چونکہ اس تمام ٹھکرائی ہوئی دولت کے عوض میں نے اپنے لئے اس جہان کی سب سے قیمتی شے خرید لی تھی۔ وہ تھی سکون!"

اس اپنے حساب میں مزید کوئی عقل کی بات رہی ہوگی جو جانی واکر کو راس آگئی۔ درحقیقت وہ اس پرانے فلسفے کی زندہ مثال ہے کہ اگر کوئی آدمی اپنے ساتھ جیں سے جی لیتا ہے تو وہ دنیا کے ساتھ بھی سکون سے گزار سکتا ہے۔ کہنے کو تو یہ محض ایک فلسفہ ہے لیکن اس میں پوری سچائی ہے۔ چونکہ جانی واکر نے فلمی آفروں کے ذریعے آنے والی سبھی دولت کو نہیں ٹھکرایا صرف اس کا ایک حصہ چھوڑ دیا تھا۔

"آدمی کے سر پر ایک مضبوط اور خوبصورت چھت کا ہونا، ایک گاڑی کا صحیح حالت میں موجود ہونا اور ایک ٹیلی فون میسر ہونا۔ یہ سب زندگی کی ضروریات بن گئی ہیں۔ اس سے زیادہ جمع کی ہوئی دولت اس کے لئے رحمت سے زیادہ زحمت بن کر رہ جاتی ہے۔ چونکہ پھر آدمی کو ہمیشہ اپنے بینک بیلنس کو چوکس رکھنے کی فکر دامن گیر رہتی ہے۔ صحت، دولت، خاندان اور سماجی زندگی یہ چار پہیے ہیں جو سکھ کے ضامن ہوتے ہیں بشرطیکہ یہ چاروں ایک ساتھ برقرار رہیں۔ میں دنیا کا سب سے زیادہ سکھی آدمی ہوں چونکہ میں ان چاروں میں ایک توازن قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا ہوں۔" جانی واکر نے فخریہ کہا۔

بہرحال جانی واکر نے ایک ہی رات میں پورا خواب نہیں دیکھ ڈالا تھا۔ اسے بھی سخت ترین محنت اور جدوجہد کے عرصے سے گزرنا پڑا اگرچہ اسے کبھی تحقیر نہیں جھیلنا پڑی۔

اس کا ایک دوست اسسٹنٹ ڈائرکٹر تھا۔ لہٰذا بدرالدین اسے ہمیشہ ٹہوکا دیتا رہتا تھا کہ وہ اسے کوئی کام دلوا دے۔ بالآخر ایک دن وہ اسے سنٹرل اسٹوڈیو لے گیا (جواب اٹھ چکا ہے)۔

جانی واکر نے بتایا " میرے دوست نے میرے لئے سفارش کرنے سے پہلے میری ڈھیروں تعریفیں کی ہوں گی جس کی وجہ سے مجھے ایک ویلن کے چمچے کا رول مل پایا۔ میں گھبرایا ہوا اور بدحواس تھا۔ میں ڈائرکٹر کے پاس گیا اور اعتراف کیا کہ مجھے اداکاری کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ پہلا موقع تھا جب مجھے کسی اسٹوڈیو میں قدم رکھنے کی اجازت مل پائی تھی۔ میں نے تو اس سے قبل کسی فلم کی شوٹنگ بھی نہیں دیکھی تھی۔ بس مجھے یہ بھروسہ تھا کہ میں اداکاری کر لوں گا۔

" ریہرسل تو ٹھیک ہو گئے " جانی واکر نے اضافہ کیا " چونکہ سیڑھی جو مجھے پینا تھی وہ ریہرسل کے وقت سنگھائی ہوتی نہیں تھی۔ لیکن آخری ٹیک کے لئے جلتی ہوئی سیڑھی مجھے تھمادی گئی۔ میں نے جیسے ہی اس کا ایک کش لیا اس کا دھواں میرے پھیپھڑے میں گھس گیا اور مسلسل کھانسی نے میری حالت خراب کر دی۔

" میں بہت حیران ہوا اور مجھے یقین ہو گیا تھا کہ اب میری اداکاری کا اسکرول ہو جائے گا۔ لیکن ہدایت کار کو مجھ سے ہمدردی تھی۔ مجھے سیٹ سے بھگا دینے کے بجائے اس نے مجھے دس منٹ کا وقفہ دے دیا۔ اس کے بعد کہیں جا کر میں اپنا اولین شاٹ دے پایا۔ اس فلم کا نام تھا " آخری پیغام " اور یہ ۱۹۴۸ء کی بات ہے۔" اس فلم میں اداکاری کے لئے جانی واکر کو ایک دن کا معاوضہ دس روپے دیا گیا تھا۔ آٹھ دن کے شیڈول کے خاتمہ پر ۸۰ روپے ہوگئے جو جانی واکر کے لئے بڑی دولت تھی کہ اب تک اسے بہت قلیل رقم ملا کرتی تھی اور بڑی عسرت میں گزارا کرتی تھی۔

معاوضے میں اسی طرح کے ساٹھ دینا تھا یہاں تک کہ اسے پہلا صحیح موقع لوکیش کی فلم " بازی " میں ملا۔ اس فلم کے اداکار دیو آنند، گیتا بالی اور کلپنا کارتک تھے اور ہدایت کار گرو دت تھے۔ جانی واکر کو اس فلم میں صرف ایک جیل کے اندر ایک شرابی کا رول کرنے کا موقع ملا لیکن اس نے اس کی زندگی بدل دی۔ اسی فلم میں نام جانی واکر رکھا گیا جو ایک وہسکی کا نام تھا اور یہ نام اس لئے پسند کیا گیا کہ وہ فلموں میں ایک شرابی کا کردار ادا کیا کرتا تھا۔ اس فلم میں اس کا رول مختصر ہونے کے باوجود اس کی موجودگی کو ناظرین نے محسوس کیا۔ لیکن سب سے زیادہ اہم بات یہ ہوئی کہ لوکیش اداکار اور گرو دت اس کے کیرئیر کے مستقل رہ گئے۔ اس کے بعد وہ گرو دت کی ہر ایک فلم میں اور لوکیش کی کئی فلموں میں دیکھا گیا۔

کیا یہ گروہ بندی تھی ؟

بقول جانی واکر " گروہ بندی " کی اصطلاح ایک منفی معنویت رکھتی ہے چونکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ ایک " گروپ " میں بس گنتی کے چند افراد ہوا کرتے ہیں اور اس میں دوسروں کا داخلہ ممنوع ہوتا ہے۔ میں اس کی وضاحت یوں کروں گا۔ میں نے جب ان کے ساتھ کام کیا میرا ان سے ایک رشتہ قائم ہوگیا۔ ایک مضبوط تعلق ہو گیا۔ لہٰذا یہ میں سمجھتا تھا کہ وہ اکثر ایک ایسے رول کے بارے میں غور کرتے جو ان کے خیال کے مطابق میرے لئے موزوں ہوتا جسے میں نبھا سکتا تھا۔

" گرو دت اور لوکیش کے علاوہ دیدمو ہن، جاوید بابو، لیکھ راج بھاکری اور دوسرے کئی تھے جو مجھے اکثر و بیشتر اپنی فلموں میں منتخب کیا کرتے تھے " جانی واکر نے یاد کرتے ہوئے بتایا۔

کہتے ہیں ایک وقت تھا جب جانی واکر کے لئے مخصوص رول لکھے جاتے تھے۔

" یہ صحیح نہیں ہے " جانی واکر نے وضاحت کی " میرے کردار ہمیشہ کہانی کا ایک ضروری حصہ ہوا کرتے تھے۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ رول میرے لئے لکھے گئے ہوں۔ البتہ کردار کو ڈیولپ کرتے وقت اگر فلمساز مجھے سائن کر چکا ہوتا تھا تو میری خصوصیات کو اپنے ذہن میں ضرور رکھتا تھا۔"

جانی واکر جو گرو دت کا رفیق خاص بن گیا تھا اس سدابہار فلم ساز کی حد درجہ عزت کرتا ہے " گرو دت اپنے وقت کے بہترین تکنیک کار تھے اور گیتوں کو فلمانے کی ان میں زبردست صلاحیت تھی۔ وہ نہ صرف ایک بڑے فلمساز بلکہ بڑے انسان بھی تھے۔ وہ اپنی یونٹ کے لوگوں پر بہت مہربان رہا کرتے تھے۔ ان کا برتاؤ اور رویہ سماس ہ کے جیسا کبھی نہیں ہوا کرتا تھا۔ ان کے اسٹوڈیو میں ایک بیڈمنٹن کورٹ ہوا کرتا تھا جہاں وہ اپنے ماتحتوں کے ساتھ بیڈمنٹن کھیلا کرتے تھے۔ انہیں پتنگ اڑانا بہت پسند تھا۔ ہم ایک خاندان کے افراد کی طرح کام کرتے تھے۔ ہم نے جن فلموں میں ایک ساتھ کام کیا ان میں میں نے ان کے دوست کا کردار ادا کیا ہے لیکن نجی زندگی میں میں ان کی بہت عزت کرتا تھا۔ میں ان سے ہنسی مذاق بھی نہیں کرتا تھا باوجودیکہ وہ ایک ٹھنڈے دل و دماغ اور پُرسکون مزاج کے آدمی تھے۔"

جانی واکر اور گرو دت ایک بار اپنی ایک فلم کے پریمئیر کے موقع پر کلکتہ آئے۔ ایک شام وہ دونوں گرانڈ ہوٹل کے سامنے ایک پارک میں بیٹھے ہوئے تھے۔ وہاں کئی مالشئے اور حجام دھندے میں مصروف تھے۔ گرو دت نے ایک خاص بات کی طرف دھیان دیا کہ وہ لوگ کام کرتے وقت اپنے گاہکوں سے گپ شپ ضرور کرتے ہیں۔ ان کی یہ عادت گرو دت کو بڑی دلچسپ لگی۔ اور یہی مشاہدہ گرو دت کی فلم " پیاسا " میں " مالش والا " کے کردار سازی کا سبب بنا۔ جانی واکر پر فلمایا گیا گیت " سر جو ترا چکرائے " جو فلم میں مالشیہ کے کردار نے گایا تھا بار بار زد عام ہو گیا اور اس گانے سے جانی واکر کی پہچان پکی ہوگئی۔

آغا، اوم پرکاش، کنہیا لال، رادھا کرشن، سندر، مقری۔ ایک جھرمٹ تھا مسخروں کا۔ کامیڈی کے سنجیدہ کاروبار میں جانی واکر اپنا اور دوسروں کا کیا درجہ متعین کرتا ہے ؟ یہ اسی کے الفاظ میں سنئے۔

" ہم سب اپنے اپنے الگ اسٹائل میں کام کرتے تھے۔ ہر اداکار اچھا تھا۔ آغا کا انداز بعد میں راجندر ناتھ نے دہرانا شروع کیا۔ کنہیا لال مزاحیہ ویلن یا ولیمی مزاج کے لئے مشہور ہوئے۔ میرا پسندیدہ اداکار محمود چارلی تھا۔ میں ان کے انداز کو پسند کرتا تھا لیکن میری کامیڈی لارمما مکا لماتی طرز کی ہوا کرتی تھی۔"

پرانی فلموں کی کامیڈی سے نئی فلموں کی کامیڈی کا موازنہ کرنے پر جانی واکر کو غصہ آ جاتا ہے " میں نے ۳۰۰ سے زائد فلموں میں کام کیا ہے لیکن کوئی موقع ایسا نہیں آیا جب ایک لفظ بھی سنسر کرنے کی نوبت آئی ہو۔ آج کامیڈی کے نام پر فحاشی کا دور دورہ ہے۔ آج کوئی شریف آدمی اپنی فیملی کے ساتھ فلم یا ٹی وی نہیں دیکھ سکتا۔ یہ واقعی شرمناک بات ہے۔"

" ہمارے زمانے میں فلمی دنیا بہت بدنام تھی۔ شریف گھرانوں کے لوگ فلم نگری سے وابستہ ہونا پسند نہیں کرتے تھے لیکن فلمیں محض تفریح کا ذریعہ تھیں۔

وہ اللہ اور تعلیم یافتہ بہروتی تھی۔ آج انڈسٹری کو اونچی عزت حاصل ہو گئی ہے لیکن ان فلموں کو دیکھئے جو آج بنائی جارہی ہیں۔ کتنی کریہہ معلوم ہوتی ہیں! ہیرو صرف رومانی منظر میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ ایکشن مناظر کے لئے ڈپلی کیٹ لئے جاتے ہیں اور ناچ کے لئے ناچ ماسٹر۔ ان کے پبلسٹی ایجنٹ ان کی شہرت کے لئے رسالوں میں ان کے معاشقے چھپواتے ہیں۔ ہمارے زمانے میں خفیہ معاملات نہیں ہوتے تھے۔ جو ہوتا تھا کھلم کھلا ہوتا تھا۔ لہٰذا پریس کو بھی ایسے سنجیدہ تعلقات کے بارے میں لکھنے میں دلچسپی نہیں ہوا کرتی تھی۔ آج کے عشقیہ معاملات غیر سنجیدہ، بے ادب اور تیزی سے گزر جانے والے ہوتے ہیں۔ یعنی اللہ اللہ خیر صلیٰ اور بس !"

لفظاً "نور" نے جانی واکر کی زندگی میں ایک بڑا رول انجام دیا ہے۔ اسے اداکاری کی تحریک نور محمد چارلی سے ملی۔ لیکن اس کی نجی زندگی میں بھی ایک نور نامی عورت وارد ہوئی۔ گرودت کی فلم "آرپار" میں گرودت، شیاما اور شکیلہ نے کام کیا تھا۔ اس فلم میں جانی واکر کے مقابل شکیلہ کی بہن نور نے اداکاری کی تھی۔ دونوں میں محبت ہو گئی اور چند فلموں کے بعد دونوں نے شادی کرلی۔ عشق اور شادی چالیس برس پرانے ہو چکے۔ اس وقت سے جانی واکر کا پتہ "نور ولا" ہے۔ ایک وقت تھا جب فلمی ہستیاں اپنے بنگلے بنانے کے لئے باندرہ کو لعنتی جگہ تصور کرتی تھیں۔ لیکن کوئی تیس برس سے یہ علاقہ پرتعیش بن چکا ہے اور اب جانی واکر کی نور ولا لاکھوں کی مالیت کی جائداد بن چکی ہے۔

پہلے ایک دو منزلہ بنگلہ تھا جس میں جانی واکر کی تین بیٹیوں اور تین بیٹوں پر مشتمل خاندان کو رہنا مشکل تھا۔ بچوں کے اسکول جانے کے وقت مسئلہ کھڑا ہو جاتا۔ سبب یہ تھا کہ غسل خانہ ایک تھا اور صبح سب کو نمبر لگانا پڑتا تھا۔ جانی واکر نے ایک دانشمندانہ فیصلہ کیا۔ اس نے بنگلہ بہت اونچے داموں پر فروخت کر دیا اور نصف درجن چھوٹے فلیٹ خرید لئے اور خود بیوی سمیت بمبئی کے ماؤنٹ میری علاقے کے ایک وسیع اپارٹمنٹ میں منتقل ہو گیا۔ لیکن وہاں نور تنہائی اور گھٹن محسوس کرنے لگی تو جانی واکر نے فلیٹ بیچ دیا اور اپنے لئے پھر ایک بنگلہ تعمیر کر لیا۔ گھر کے دیگر افراد نے بھی یہی کیا اور پورا کنبہ پھر ایک جگہ رہنے لگا۔ جانی واکر نے اپنے باپ کے مشورے پر عمل کیا ہے۔ وہ یہ کہ کسی کو اپنے بیٹوں کے لئے بینک بیلنس رکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ چونکہ اگر بیٹے لائق ہوں گے تو وہ خود دولت کما لیں گے اور اگر نالائق ہوں گے تو باپ کی محنت سے چھوڑی ہوئی پونجی کو آگ لگا ڈالیں گے۔ چنانچہ باپ کا فرض صرف اتنا ہے کہ وہ اپنے بیٹوں کو پیسے کمانے کا گر سکھا دے۔ آگے ہر ایک کی اپنی کوشش اور اپنی منزل ہوتی ہے۔

واقعی کتنی اچھی بات کہی ہے ا۔ خاص طور پر اس باپ نے جس کے بس کنڈکٹر بیٹے نے اپنی جدوجہد سے اپنا ایک جہان بنا ڈالا۔ یہ کہنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ جانی واکر نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ اتنا بڑا بن جائے گا۔

دوسرا اصول جو جانی واکر نے اپنایا وہ یہ تھا کہ جب خاندان کے کسی فرد یا دوست کو مالی ضرورت درپیش ہو تو وہ اس کی مدد کر دیتا تھا۔ یہ ایک سچی مدد ہوتی تھی جبکہ اسے روپے کی واپسی کی امید نہیں ہوتی تھی۔

۷۲ سال کی عمر میں بھی یہ مضبوط عزم و ارادے کا آدمی بالکل ہٹا کٹا اور چست دکھائی دیتا ہے۔ وہ نور کے ساتھ ایک با اصول اور بے تناؤ زندگی گزار رہا ہے۔ اپنے طرز زندگی پر شاکر و قانع، عمر کی ہر منزل پر اپنے خاندان اور اپنے دوستوں کی صحبت سے لطف اندوز ہونے والا جانی واکر ا۔

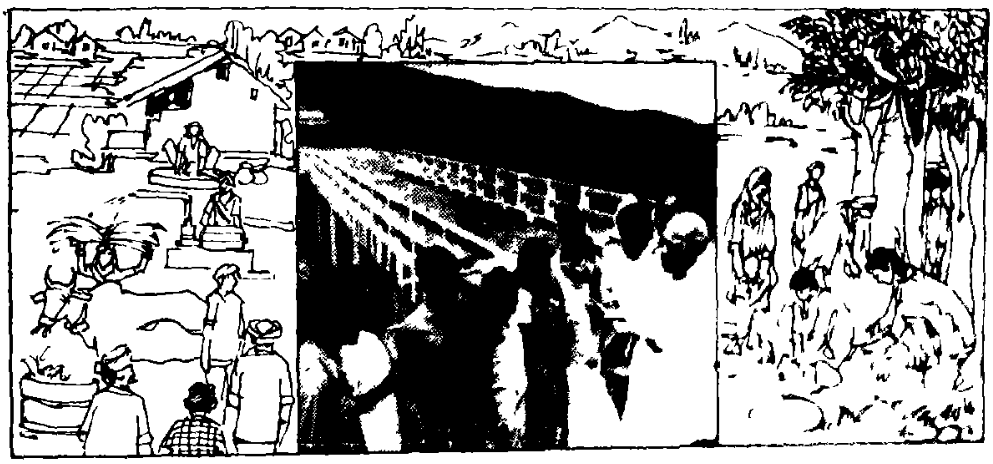
مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکاڈمی کی تشکیل نو

حکومت مہاراشٹر نے اپنے حکم نامے ای ایس ٹی/۹۲-۱۱/اسی/۹۲/ سسکرتک کاریہ، مورخہ ۱۹ر جنوری ۱۹۹۶ء کے ذریعہ مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکاڈمی کی تشکیل نو کی ہے، جس کے عہدیداران و ممبران حسب ذیل ہیں۔

۱۔ وزیر سماجی بہبود و ثقافتی امور		صدر
۲۔ ریاستی وزیر سماجی بہبود و ثقافتی امور		نائب صدر
۳۔ پروفیسر عبدالستار دلوی	(ممبئی)	کارگزار صدر
۴۔ سکریٹری برائے ثقافتی امور	(ممبئی)	ممبر
۵۔ جناب ندا فاضلی	(ممبئی)	〃
۶۔ ڈاکٹر رام پنڈت	(ممبئی)	〃
۷۔ مشتاق اترے	(ممبئی)	〃
۸۔ ڈاکٹر منشاالرحمٰن خاں منشا	(ناگپور)	〃
۹۔ قاضی مشتاق احمد	(جلگاؤں)	〃
۱۰۔ ڈاکٹر یونس اگاسکر	(ممبئی)	〃
۱۱۔ محمد عثمان خان عرفان پربھنوی	(پربھنی)	〃
۱۲۔ شیخ محمد یوسف محبوب	(اورنگ آباد)	〃
۱۳۔ قاسم امام	(ممبئی)	〃
۱۴۔ اظہر حیات	(ناگپور)	〃
۱۵۔ ہارون خاں مصطفےٰ خاں	(وردھا)	〃
۱۶۔ محمد قاسم باولا	(جالنہ)	〃
۱۷۔ سلیم انصاری	(دھولیہ)	〃
۱۸ شیخ کریم شیخ رحیم	(ناگپور)	〃
۱۹۔ نجمہ قاضی	(ممبئی)	〃
۲۰۔ یامین اختر فاروقی	(جامنیر)	〃
۲۱۔ افسر سکریٹری اردو اکاڈمی		ممبر سکریٹری

(پریس ریلیز)

گاؤں کے غریب لوگوں کے کنبوں کی آمدنی میں اضافہ کے لئے یقینی روزگار کی اسکیم



(یقینی روزگار کی اسکیم سے مستفید ہونے والے لوگوں نے وزیر اعظم شری پی۔وی۔ نرسمہا راؤ کو اپنے تجربے سے آگاہ کیا، جنہیں اڑیسہ کے کوراپٹ ضلع میں ایک نہر کی تعمیر کے کام پر لگایا گیا تھا۔)

- اس اسکیم کے تحت غیر زراعتی موسم میں کام کے متلاشی ہر ایک دیہی خاندان کے دو ارکین کو ۱۰۰ دنوں کا یقینی روزگار فراہم کیا جائے گا۔
- یہ اسکیم مرد اور خاتون کارکنوں کے لئے کم سے کم اور مساوی اجرتوں کو یقینی بناتی ہے۔
- یہ اسکیم ملک کے ریگستانی، قبائلی، پہاڑی علاقوں نیز خشک سالی اور سیلاب سے متاثر ہونے والے علاقوں کے ۲۴۷۰ بلاکوں میں جاری ہے۔ اس کے تحت کام کے لئے گاؤں کے تقریباً ۱.۸۰ کروڑ لوگوں نے اپنا نام درج کرایا ہے۔ اکتوبر ۱۹۹۳ء میں اس کی شروعات سے لیکر اب تک اس اسکیم کے تحت ۲۵ کروڑ سے زیادہ افرادی دنوں کے روزگار کے مواقع پیدا کئے جا چکے ہیں۔

* روزگار کی یقین دہانی کی اسکیم گاؤں کے غریب لوگوں کے فائدے کے لئے مرکزی حکومت کی ایک اسکیم ہے۔

اس اسکیم کے بارے میں مزید تفصیلات دیہی پنچایت یا بلاک ڈیولپمنٹ دفتر سے حاصل کی جا سکتی ہیں۔

جاری کردہ :۔ دیہی علاقوں اور روزگار کی وزارت حکومت ہند۔

dAvp 95/531

دوبئی میں سلیم جعفری کے اعزاز میں جشن سپاس

بہ صدارت ڈاکٹر گوپی چند نارنگ

رپورتاژ ف۔ س۔ اعجاز

"مجلس فروغ اردو ادب" (دوحہ قطر) کی جانب سے "دی یونیکیرنیز" کے بانی و روح رواں جناب سلیم جعفری کے مشاعروں کے ذریعہ عالمی اردو یکجہتی کی شاندار اور پاہم خدمات کے اعتراف میں ۱۱/ جنوری ۹۶ء کو دبئی کے پانچ ستاروں والے "رائل ابھار ہوٹل" کے وسیع و کشادہ ہال میں ایک خاص مشاعرے کا انعقاد ہوا جس میں برصغیر ہند و پاک اور متحدہ عرب امارات کے منتخب شعراء نے شرکت کی۔

سلیم جعفری اپنے ادارے "یونیکیرنیز" کے ذریعہ پچھلے ۱۱ سال سے مشاعرہ کلچر کو انوکھے اور منفرد انداز سے فروغ دیتے آرہے ہیں۔ ان کے منچ پر مسلمان، ہندو، سکھ شعراء و ادباء بلاامتیاز و تفریق نمایاں ہوتے رہے ہیں۔ اور اب تک وہ فیض کا جشن (بیاد فیض)، جشن خمار، جشن احمد فراز، جشن سحر، جشن جون ایلیا، جشن مجروح، جشن غزل و غزال، جشن قتیل، جشن آزاد، جشن محشر بدایونی، جشن کیفی اعظمی مناکر ایک حوصلہ افزاء اور قابل تقلید روایت کی بنیاد ڈال چکے ہیں۔ چنانچہ امسال سبھوں کا جشن منانے والے کا جشن مناکر "مجلس فروغ ادب" (دوحہ قطر) نے سلیم جعفری کی پذیرائی کی، سلیم جعفری کو ان کے سیکڑوں پرستاروں نے اپنی نیک خواہشات کا مستحق سمجھا اور وہ "جشن سپاس" میں شریک ہوئے۔

دبئی کے مرکز میں واقع "رائل ابھار" ہوٹل میں داخل ہوتے ہی ان لوگوں کی نگاہیں بھی خیرہ ہوجاتی ہیں جن کے لئے اس شہر کے سامان آرائش و آسائش ایک عام سی بات ہیں۔ نرم و دبیز قالین پر بچھی ہوئی آرام دہ کرسیاں، خواص کے لئے نام بہ نام لکھی ہوئی۔ مرصع در و بام، نفیس بلوریں فانوس، اسٹیج قدرے اونچائی پر، اس پر مکھنی رنگ کی چادریں بچھی ہوئی، شعراء کی ٹیک کے لئے مکھنی رنگ کے غلاف دار تکئے، سبھی تکئے مخصوص ترتیب اور نرم ادا سے رکھے گئے، مقررین اور کلام پڑھنے والوں کے لئے اسٹیج پر ایک چبوترہ سا ابھرا ہوا، جہاں دو مائک نصب تھے۔ یہ سب اس لئے کہ ہر مقرر یا شاعر لفظاً نہیں بلکہ معناً جلوہ افروز ہوسکے۔ سلیم جعفری کو مشاعروں کا مغل منارک قرار دیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ نہ صرف اسٹیج کی سجاوٹ، تہذیبی اور پیشہ ورانہ مہارت کے لئے بلکہ "سلیم کی انار کلی اردو" سے محبت کے لئے بھی صاحب جشن سپاس کو لوگ فراموش نہیں کرپائیں گے۔

رات ۱۰ بجکر ۴۵ منٹ پر جشن سپاس کا آغاز ہوا۔ سب سے پہلے نقیب ملک اسلم صاحب نے صدر محفل پدم شری ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کو اسٹیج پر آنے کی دعوت دی۔ ابھی حال میں ساہتیہ اکاڈمی نے نارنگ صاحب کی کتاب "ساختیات اور پس ساختیات" کو اعلیٰ ترین انعام کا مستحق قرار دیا ہے لہذا نارنگ صاحب کو تقریب کی صدارت سونپے جانے پر مجلس فروغ اردو ادب کے اراکین اور حاضرین نے اپنی مسرت اور اطمینان کا اظہار زبردست تالیوں کے ذریعہ کیا۔ مہمان خصوصی کے طور پر شام بہار ٹرسٹ کے جناب راجندر لال ملہوترہ مدعو تھے جو شہر امبالا میں آئی ٹی سی کی جانب سے تاریخی حیثیت کے مشاعرے کرواتے آئے ہیں۔ اور فن شناس واقع ہوئے ہیں۔ ملہوترہ صاحب کا بھرپور استقبال کیا گیا۔ بعد ازاں ملک اسلم صاحب نے شعراء کو نام بہ نام اسٹیج پر مدعو کیا۔ شعراء کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں

دبئی (مقامی) سعدیہ روشن۔ تسنیم عابدی



(دائیں سے) ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، کفایت دہلوی، سلیم جعفری، انیس دہلوی، عبدالحفیظ باحلیم

دوحہ قطر — حیدر اعظمی۔ خوشنود سحاری

پاکستان — عباس تابش۔ عارف شفیق۔ عرم بہزاد

اقتیار ساغر۔ خالد عرفاں۔

خواجہ رضی حیدر۔ افتخار یوسف۔

نورین طلعت عروبہ۔ تبسم اخلاق

ہندوستان — عقیل نعمانی۔ اظہر عنایتی۔ چرن سنگھ بشر

ملک زادہ منظور احمد۔ ف۔ س۔ اعجاز

منصور عثمانی۔ منظر بھوپالی۔ ظفر صہبائی

معیب الرحمن صاحب نے مجلس فروغ اردو ادب کے نگراں کی حیثیت سے سلیم جعفری صاحب کا پرتپاک استقبال کیا اور ان کی خدمات بیاں کرتے ہوئے ریئس کمار شاد مرحوم کا ایک قطعہ برمحل پڑھا۔ پی آئی اے کے میجر جناب ممتاز احمد خاں اور محترمہ ڈاکٹر اختر خاں ملک نے سلیم جعفری کی گلپوشی کی۔ دیگر پرستاروں نے بھی صاحب جشن کو پھولوں کے نذرانے پیش کئے۔ اس کے بعد مجلس کی جانب سے اس کے چیئرمین عتیق احمد صاحب نے پچاس ہزار درہم کا نذرانہ سلیم جعفری کو پیش کیا۔ محترم عتیق احمد نے سلیم جعفری کو صاحب اعزاز بننے کی مبارکباد پیش کی۔ اور کہا کہ لوگ عام طور پر مردہ پرست واقع ہوتے ہیں لیکن سلیم جعفری نے زندہ ادبی شخصیتوں کے جشن مناکر قابل تحسین رسم شروع کی ہے۔ ان کی کوششوں سے ہند و پاک اور خلیج کے شعراء مل جل کر ایک ثقافت کے فروغ میں لگ گئے ہیں۔ ان کی جدوجہد کو میں سلام کرتا ہوں اور دوحہ کے پرستاران اردو کی جانب سے بھی نذرانہ محبت پیش کرتا ہوں"۔ عتیق احمد صاحب نے "یونیکیرنیز" کے رابطہ افسران حاجی انیس دہلوی (مدیر فلمی ستارے، دہلی) اور عبدالحفیظ باحلیم (پاکستان) کو بھی تقریب کی کامیابی اور ان کی اب تک کی خدمات پر مبارکباد پیش کی۔ عتیق احمد صاحب نے عالمی پیمانے پر فروغ اردو کے لئے ۷۵-۷۵ ہزار روپیے کے دو نقد ایوارڈز کا اعلان کیا۔ ایک ایوارڈ پاکستان کے ادیب کو اور دوسرا ہندوستان کے ادیب کو دیا جائے گا۔ یہ ایوارڈ مستقل ہوں گے۔ اس

سلسلے میں تفصیل ایک دو ماہ میں فراہم کی جائے گی ۔ اختتامی سلسلے میں سلیم جعفری کو چیف کوآرڈی نیٹر مقرر کیا گیا ۔ عتیق احمد صاحب نے جشن پیرزادہ قاسم کا بھی اعلان کیا ۔

جناب مصیب الرحمن نگران اعلیٰ مجلس فروغ اردو ادب نے رابطہ آفیسران عبدالحفیظ باحلیم اور حاجی انیس دہلوی کی خدمات کی ستائش کی ۔ حسن کی محنت پروگرام کے انعقاد سے لے کر ضخیم و رنگین خصوصی مجلہ جشن سپاس تک میں شامل ہے ۔ مجلہ کے مرتب جناب وسیم الحق چشتی نے صاحب جشن کو مجلہ اپنے ہاتھوں پیش کیا ۔ اس کے بعد مشاعرے کی نظامت کی ذمہ داری ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد کو سونپی گئی ۔

نقیب مشاعرہ ملک زادہ منظور احمد نے کہا کہ خدا جانے کونسے چراغ کا جن ہے جس نے سلیم جعفری کے ہاتھ سے ہاتھ ملایا کہ یہ حضرت دس سال میں دس زندہ شعراء کا جشن منا چکے ہیں ۔ سلیم جعفری کی ان کاوشوں کے پیچھے یقیناً بیگم سلیم جعفری کا تعاون اور قربانی بھی ہے ۔ نقیب مشاعرہ نے بیگم سلیم جعفری کو اسٹیج پر آنے کی زحمت دی اور ان کے لئے تشکر کے الفاظ ادا کئے ۔ "فلمی ستارے" کے ایڈیٹر اور "باجی" کے سرپرست حاجی انیس دہلوی نے اپنی اور پرستاران و فدائیان اردوئے ہند کی جانب سے سلیم جعفری کو نشان یادگار کے طور پر ایک ٹرافی اور ایک شال پیش کی جنہیں وہ دلی سے اپنے دل سے لگاکر اور لعل میں احتیاط سے دباکر لائے تھے ۔ انہوں نے سلیم جعفری کو موتیوں اور کلابتو کی ایک مالا اور شال پہنائی جب کہ محترم گوپی چند نارنگ نے ان کی جانب سے صاحب جشن کو ٹرافی پیش کی ۔ حاجی انیس کے پاکستانی ہم پلہ حفیظ باحلیم نے اپنی بے بضاعتی اور خالی ہاتھ چلنے آنے پر ندامت کا اظہار کیا اور فرمایا کہ وہ پاکستان سے سلیم جعفری کے لئے صرف چلغوزے لائے ہیں جب کہ حاجی انیس دہلی سے سوونیر اور نذرانے لائے ہیں ۔ اس کے بعد وہ مبارکباد اور معذرت کے ملے جلے انداز میں سلیم جعفری سے بغلگیر ہوگئے ۔

ملک زادہ منظور احمد نے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ، صدر محفل کی بابت کلمات تحسین ادا کئے اور فرمایا کہ نارنگ صاحب نے تنقید کی تاریخ میں ایک سنگ میل قائم کیا ہے ۔ نارنگ صاحب کو خطبہ صدارت کی زحمت دی گئی ۔ نارنگ صاحب نے اپنی تقریر سے سامعین کو باغ و بہار کردیا ۔ انہوں نے کہا سلیم جعفری جو دوسروں کو دولھا بناتے تھے اور اب تک دس جید شعراء کو دولھا بنا چکے ہیں آج ان ہی کو لوگوں نے پکڑ کر مانوں بٹھادیا ہے ۔ دیکھئے آج کیسے شرما لجا رہے ہیں ۔ (یہ سن کر واقعی سلیم جعفری کے چہرے کا رنگ گلابی سا ہو گیا) ۔

پروفیسر نارنگ نے یک بہ یک سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا کہ اردو کا سواد اعظم ہر لحظہ بدل رہا ہے ۔ خلیج میں سلیم جعفری نے جو منظر نامہ تحریر کیا ہے اسے دیکھا جائے تو یہ سوال اٹھ کھڑا ہوتا ہے کہ کیا ابو ظہبی ، دوحہ قطر ، العین ، دبئی وغیرہ سے ترقی کرتے ہوئے آج اردو دنیا کی ایک عظیم رابطے کی زبان نہیں بن گئی ہے " پروفیسر نارنگ نے کہا میں آج بھی پاکستان کو اپنا وطن مانتا ہوں ۔ اگر سلیم جعفری پیدا ہوئے راجستھان میں اور چلے بڑھے پاکستان میں تو میں پیدا ہوا پاکستان میں اور میری پرداخت ہوئی ہندوستان میں ۔ کیا آج پورے کرۂ ارض پر کوئی دوسرا سلیم جعفری ہے جس نے ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں کے تخلیقی ذہنوں کو ایک جگہ جمع کردیا ہو " صدر بزم نے تقریر کے آخر میں اردو سے لوگوں کی الفت اور سلیم جعفری کی محبت کے اعتراف میں میر تقی میر کا یہ شعر پڑھا ۔

ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے
اس کی زلفوں کے سب اسیر ہوئے

نارنگ صاحب کی تقریر کے بعد سلیم جعفری نے " مجلس فروغ اردو ادب " کے اراکین ، سامعین اور مدعوئین کا شکریہ ادا کیا ۔ اس کے بعد مشاعرے کا آغاز ہوا ۔ شعراء کے منتخب اشعار جو ضبط تحریر میں لائے جاسکے منقول ہیں

(محترمہ) تسنیم عابدی (مقامی)

زباں کھولو نہیں حرف مدعا کے لئے
ہوا دئے نہ بجھایا کرو ہوا کے لئے
حسین خواب کے بدلے صلیب دار و رسن
مرا قبیلہ بنا ہے فقط سزا کے لئے

عقیل نعمانی (انڈیا)

ذہن میں رکھتے ہیں پہچان سمجھ لیتے ہیں
کشتیاں کس کی ہیں طوفان سمجھ لیتے ہیں
ظلم اردو پہ بھی ہوتا ہے اور اس نسبت سے
لوگ اردو کو مسلمان سمجھ لیتے ہیں

افتخار یوسف (پاکستان)

ہم نے دل لگایا تھا بارشوں کے موسم میں
اک دیا جلایا تھا بارشوں کے موسم میں
اس کو بھول جانے کی کوششیں بہت کی تھیں
خود کو آزمایا تھا بارشوں کے موسم میں

منصور عثمانی (انڈیا)

کچھ اس طرح سے وفا کی مثال دیتا ہوں
سوال کرتا ہے کوئی تو مال دیتا ہوں
اسی سے کھاتا ہوں اکثر فریب منزل کا
میں جس کے پاؤں کا کانٹا نکال دیتا ہوں

محترمہ تبسم اخلاق (پاکستان)
(حضرت جوش کی پوتی اور جوش اکیڈیمی کی موسس و صدر)

اس گھر کے حالات تو حد سے بدتر ہوتے جائیں گے
لوگ بڑھے اور انساں کم سے کم تر ہوتے جائیں گے
الجھے ہوئے حالات کی گتھی کون بھلا سلجھائے گا
انساں ہی جب ساکت جامد پتھر ہوتے جائیں گے

ف۔ س۔ اعجاز (انڈیا)

جتنا بازار کی دلبس سی دکانوں کے قریب
چپ سا ہوجاتا ہوں میں اونچے مکانوں کے قریب

ہر کسی عہد کا رومان الگ ہوتا ہے
کسی نسبت سے تو انسان الگ ہوتا ہے
زندہ بچنے کے تو اسباب سوا ہوتے ہیں
حضرت نوح کا طوفان الگ ہوتا ہے
اک نہ چیز تو پہچان کا بنتی ہے سبب
معجزے سی ہی سلیمان الگ ہوتا ہے

اعادہ نظم "جب وہ آدمی سوجاتی ہے"

حیدر اعظمی (دوحہ قطر)

حسن کی باتیں پیار کی باتیں
باقی سب بے کار کی باتیں
پیٹ کی پوجا سب سے بہتر
چھوڑو یہ دوچار کی باتیں

چرن سنگھ بشر (انڈیا)

لاکھ روشن ہو اندھیروں سے گزرنا بھی تو ہے
چڑھتے سورج کو سمندر میں اترنا بھی تو ہے
تم جو خوش ہو مری راہوں میں بچھاکر کانٹے
انہی راہوں سے کبھی تم کو گزرنا بھی ہے
ہم کسی اور کے ہوجائیں تو حیرت کیسی
تم نے جو زخم دیے ہیں انہیں بھرنا بھی تو ہے

نورین طلعت عروبہ (پاکستان)

کئی رتوں سے بند ہمارے دل کا ہر دروازہ ہے
اس کے نام کا پھول ابھی تک پہلے جیسا تازہ ہے
خود سے بھی جو بات چھپائی شہر میں کیسے پھیل گئی
یا دیواریں بول پڑیں یا لوگوں کا اندازہ ہے

خوشنود بخاری (دوحہ قطر)

پہلے انسان کے اوہام بنے
بعد میں معبد و اصنام بنے

جب حاشیوں کے زیر نگیں ہوکے رہ گیا
مضمون پھر کہیں کا کہیں ہوکے رہ گیا

خالد عرفان (پاکستان)

کیپٹل میں حضرت انسان کی تقلید میں
جانور اک قابل غور آگیا تو کیا ہوا
بوجھ ہیں قومی خزانے پر جہاں اتنے گدھے
اک گدھا اس شہر میں اور آگیا تو کیا ہوا

پکڑ کر ایک ڈاکو کو پولیس والے نے یہ پوچھا
مرے حصے کے بارے میں بتا تیری رضا کیا ہے

ظفر صہبائیؔ (انڈیا)

زخم کھاتے ہوئے مقتل کی امامت کرنا
کتنا دشوار ہے اک سچ کی حفاظت کرنا

سعدیہ روشن (دبئی)

ساحلوں پہ چراغاں رہا رات بھر
قمقمے دور تک جگمگاتے ہوئے
کیا سے کیا ہوگیا شعر جوں ہی سنا
حیرتوں سے وہیں آئینہ بن گیا
سعدیہ ایسا تم نے بھلا کیا کیا
مسکراتے ہوئے ہچکچاتے ہوئے
نظم "دانشوری"

عزم بہزاد (پاکستان)

کراچی کے حوالے سے ایک نظم

کبھی اے سپاہ شکستگاں کوئی اہتمام ملال کر
کسی بزم رقص کو سرد کر کسی باطرب کو نڈھال کر
کئی دن سے پھر وہی چشم و لب مری گفتگو میں درآئے ہیں
مرے عہد رفتہ کے فیصلے، مرا اعتماد بحال کر

یہ دیار اہل نفاق ہے یہاں احتیاط سے کام لے
نہ کسی کو کوئی جواب دے نہ کسی سے کوئی سوال کر
جنہیں ایک موسم سرد میں مری ہمرہی میں دیا گیا
وہی لوگ آج ہیں مطمئن مجھے قافلے سے نکال کر

اظہر عنایتی (انڈیا)

ہٹ کر محاذ جنگ سے وہ ڈر لگا اسے
پتہ کہیں جو کھڑکا تو لشکر لگا اسے
مجھ سے بھی جب نہ اس کے مسائل کا حل ہوا
پھر یہ ہوا کہ میں بھی ستمگر لگا اسے
کہتا تھا جو کہ ساتھ جئیں گے مریں گے ہم
میں مرگیا تو مجھ سے بڑا ڈر لگا اسے

ملک زادہ منظور احمد (انڈیا)

صبح کی تیز دھوپ میں اس کے سوا بہت ہوا
دل کی کلی نہ کھل سکی رقص صبا بہت ہوا
ہوگی دعا قبول پھر قبلہ بدل کے دیکھو لو
کعبۂ شہر یار میں سجدہ ادا بہت ہوا
اس کے بدن کی چاندنی فکر میں میرے ڈھل گئی
شعر و سخن کے واسطے رنگ صبا بہت ہوا

خالد معین (پاکستان)

رات آنکھوں میں کاٹنے والو شاد رہو آباد رہو
بار ہجر اٹھانے والو شاد رہو آباد رہو
کچی عمر میں کل کے دکھوں سے آج الجھنا ٹھیک نہیں
پہلا ساون بھیگنے والو شاد رہو آباد رہو

منظر بھوپالی (انڈیا)

وفا، خلوص، طرفداریاں نہیں چلتیں
ہمارے ساتھ یہ مکاریاں نہیں چلتیں

یہی سنا تھا بڑوں سے یہی سمجھتے تھے
عدالتوں میں طرفداریاں نہیں چلتیں
یہ آئینہ ہے سدا سچ بیان کرتا ہے
کہ اس کے آگے اداکاریاں نہیں چلتیں

عباس تابش (پاکستان)

پانی آنکھ میں بھرکر لایا جاسکتا ہے
اب بھی جلتا شہر بچایا جاسکتا ہے
ایک محبت اور وہ بھی ناکام محبت
لیکن اس سے کام چلایا جاسکتا ہے

اعتبار ساغر (پاکستان)

حکم ہے رات کو اب صبح سے تعبیر کرو
دوستو پیروی، اسوۂ شبیر کرو
قتل گاہوں میں مجھے روز سجانے والو
مری آواز کی خوشبو کو بھی زنجیر کرو

عارف شفیق (پاکستان)

غیرت ہے اگر تجھ میں تو تلوار اٹھالے
یا جھک کے میرے قدموں سے دستار اٹھالے
عزت کوئی محفوظ وہاں رہ نہیں سکتی
خود گاؤں کی بیٹی کو جو سردار اٹھالے

خواجہ رضی حیدر (پاکستان)

حاکم مرے خلاف، سپاہی مرے خلاف
ملتی نہیں ہے پھر بھی گواہی مرے خلاف
کیوں کردیا ہے تنگ مرے سر پہ سائباں
کیوں ہورہے ہیں ظل الٰہی مرے خلاف

پھر شب کے دربام پہ کچھ رزم ہوا ہے
پھر دل سے کسی نام سے رزم ہوا ہے
پھر خاک پہ تصنیف ہوا نامہ کسی کا
پھر خاک پہ کچھ پھول کھلے نرم ہوا ہے

مشاعرے کے بعد سلیم جعفری صاحب کے گھر پر ڈنر کا اہتمام تھا۔

ooooo

ڈاکٹر اختر جہاں ملک کی جانب سے فلوٹنگ ہوٹل میں پرتکلف عشائیہ

جمعہ ۱۲/ جنوری کی شب ۹ بجے تھے۔ ساحل دبئی (بردبئی) پر ایک دو منزلہ تیرتا ہوا ہوٹل "البوم" جشن سپاس کے مدعوین شعراء کے اعزاز و استقبال کے لئے منتظر تھا۔ استقبالی عشائیہ کا اہتمام دبئی کی معزز خاتون ڈاکٹر اختر جہاں ملک صاحبہ فرما رہی تھیں۔ جو گزشتہ شب مشاعرے میں اہم شخصیت کے طور پر حاضر تھیں۔ اور اپنی ادب نوازی کا ثبوت پیش کر چکی تھیں۔ آج وہ فراخدل مہمان نواز کے فرائض انجام دے رہی تھیں۔ دعوت میں دبئی اور مضافات کی چنندہ ہستیوں نے شرکت فرمائی۔ کونسلر جنرل پاکستان جناب جمشید افتخار خاص طور پر تشریف لائے۔ ڈیرہ دبئی اور بردبئی کے درمیان بہتے ہوئے سمندر کو ٹھہر ٹھہر کر ہونے والی بارش کی بوچھاریں گدگدا رہی تھیں۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے فرحاں و شاداں حاضرین کی کنپٹیوں میں آگ سی لگا رہے تھے خوبصورت دلہن سنا "شکارا" سطح آب پر چلبلی ادا سے عظیم الشان عمارتوں کی روشنیوں کی متلاطم جھمک کے بوسے لے رہا تھا۔ پرانے اور رسیلے ہندی فلمی نغمات اس چھوٹی سی کائنات میں ایک رومانی بازگشت پیدا کر رہے تھے۔

بجرے کی بالائی منزل کی انتہائی آخری میز پر میں، گوپی چند نارنگ، ملک زادہ منظور احمد، عبدالحفیظ باحلیم، سلیم جعفری اور بہجت کمال نجمی خوش گپیوں میں مشغول تھے۔ نجمی صاحب نے بتایا کہ جسے ڈیرہ یا ڈہرہ دبئی کہتے ہیں وہ لفظ دیرہ (دی رہ) کی مسخ شدہ شکل ہے۔ "دیرہ" کہتے ہیں اس سیال کو جو سیپ کے اندر موتی بننے سے پہلے وضع ہوتا ہے۔

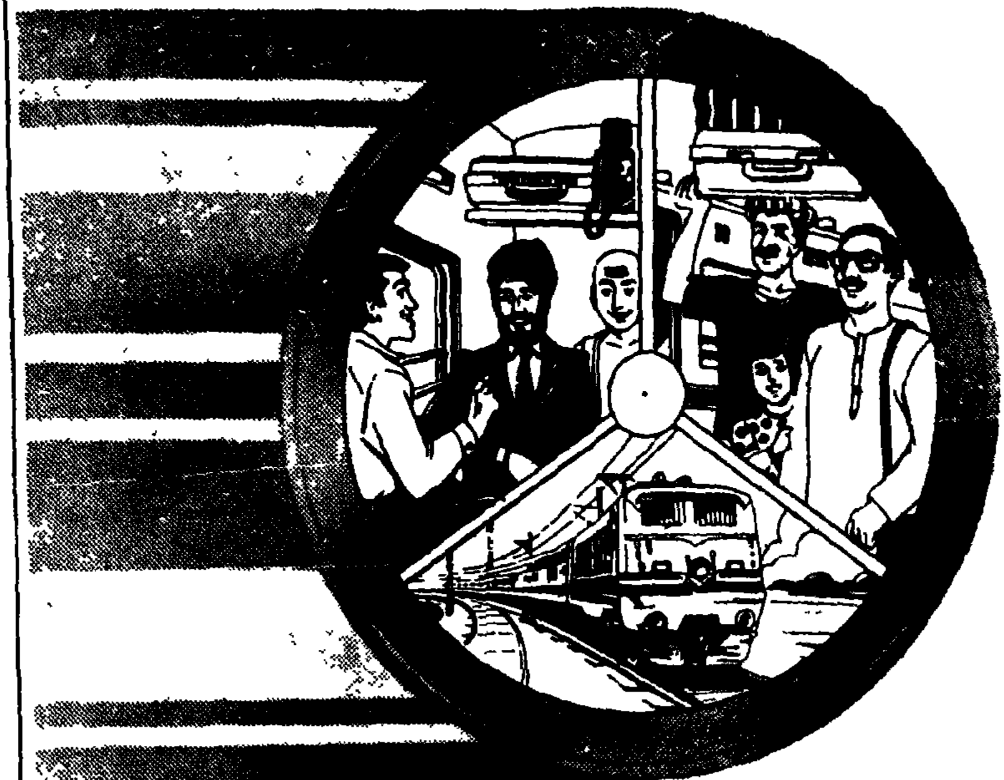
نجی صاحب علم ہیں اور ادب سے انہیں گہرا سروکار ہے۔ "مجلس فروغ اردو ادب" کے فعال رکن تو ہیں ہی، اس کے علاوہ ٹی۔ وی اور دیگر ذرائع کے لئے کئی موضوعاتی ڈاکومنٹری اور تحقیقی کام انجام دے چکے ہیں۔ لپنے دفتری معاملات کے علاوہ ان ہی امور میں مصروف رہتے ہیں۔ انہوں نے مجھے ایک خوبصورت "پارکر" قلم تحفے میں دیا اور وعدہ کیا کہ وہ جلد ہی "انشاء" کے لئے دبئی کی تاریخ قلمبند کریں گے۔

جس جگہ ہم کشتی سے سیر کر رہے تھے سچ تو یہ ہے کہ میں دن میں اس مقام کی سیر کر چکا تھا، میرے ایک دوست شبیر اختر جو کلکتہ سے دبئی میں تازہ وارد ہوئے ہیں اور ایک تعمیراتی فرم میں فورمین کے عہدے پر مامور ہیں مجھے لپنے ایک رفیق کار نریندر کمار کے ساتھ دن ہی میں ہوٹل "کاز بلانکا" سے (جہاں ہم سبھوں کا قیام تھا) سیر کے لئے لے نکلے تھے۔ اور صرف نصف درہم فی کس (ہندوستانی پانچ روپئے، دبئی کے آٹھ آنے) کرایہ پر مجھے برہ کی سیر کرا لائے تھے۔ لیکن چونکہ وہ دونوں خود دبئی میں نووارد ہیں اس لئے مقامات کی تفصیلات مجھے نہیں بتا پائے تھے۔ یہ کام اب سلیم جعفری صاحب نے انجام دے دیا۔ اور یہاں دن اور رات کے نظارے کا فرق بھی اب میرے لئے کشش انگیز بنا ہوا تھا۔ سلیم جعفری نے بہت سی باتیں بتائیں۔

بردبئی، سمندر میں ایستادہ متحدہ عرب امارات کے حکمرانوں کا ایمپائر۔ اس میں واقع مسجد، پھر سٹی سینٹر، دوسری جانب یعنی ساحل دبئی پر کھڑی بی سی سی آئی، بنک بارودہ (بنک آف بارودہ، انڈیا)، ٹیلی مواصلات کی بلند و بالا عمارت جس پر بتیوں کا ایک ہالہ سا یوں روشن تھا جیسے ریڈیم کی ایک بڑی سی گیند آسمان سے گر کر چھت پر آن ٹکی ہو اور دیگر سرکاری دنیم سرکاری یا پرائیوٹ کثیر منزلہ عمارات کا تعارف سلیم جعفری نے بیان کیا۔ انہوں نے ایک ادارے کا مفصل ذکر کیا جو انسانی بنیاد پر ایک انتہائی نیک مقصد کے لئے وقف ہے۔ یہ ایک ایسا مرکز ہے جو سزا یافتہ یا سزا معاف مجرموں کو بوقت رہائی آبرومندانہ طریقے پر ان کے گھر تک پہنچنے کا سامان اور اخراجات فراہم کرتا ہے۔ سلیم جعفری ایک باخبر انسان ہیں اور میڈیا ورلڈ کی زنجیر کی ایک اہم کڑی ہیں۔ مصیب الرحمن صاحب بھی ہمیں تفریحی مقامات کا علم فراہم کر رہے تھے۔ وہ ویڈیو اور کیمرہ عکاسی کے علاوہ صدا بندی میں ماہر ہیں۔ اور ان کا نام ان کے کیسٹس کی کامیابی کی ضمانت ہے۔

اس پرتکلف عشائیہ کی یادیں شعراء کے ذہن سے محو نہیں ہو سکتیں۔ جس میزبان ذی وقار و خوش گفتار نے اس ضیافت شبنیہ کو مرتب کیا اس نے حاضرین سے لپنے ذوق، شوق، خوش سلیقگی اور حسن انتظام کی بھرپور داد بھی پائی۔ مدعوئین متشکر ہوئے ڈاکٹر اختر جہاں ملک صاحبہ کے۔ اختر جہاں صاحبہ کا تعلق لکھنو سے ہے۔ حضرت کیف عظیم آبادی مرحوم کی عقیدتمند اور عزیزہ ہیں۔ اختر جہاں صاحبہ کی بیٹیاں بھی ڈاکٹری پڑھ رہی ہیں بلکہ ایک بیٹی تو ڈاکٹر بن بھی چکی ہے۔

رات کے دو بجے محفل برخاست ہوئی تو شاہراہوں کے بیچوں بیچ کھڑے کھجور کے پیڑوں کی پور پور نیند میں جھوم رہی تھی اور فضا میں ہنوز پرانے ہندی فلمی نغموں کی مٹھاس بھرتی چلی جا رہی تھی۔



یہ ہے سپنوں کا ایک متحرک بھارت

مسافر ریل کے ڈبے میں سوار ہیں۔ اسٹیشنوں پر مسافروں کا چڑھنا اُترنا جاری ہے۔ یہاں پر مختلف زبانوں اور خیالات و عقائد کا ملاپ ہو رہا ہے۔ تھوڑی دیر کیلئے اس متحرک ڈبے میں ہر دھرم اور زبان ہمخیال بن جاتے ہیں۔ اور ایک متحد ہندوستان کی تصویر پیش کرتے ہیں۔ نت نئے اور مختلف الخیال اور مختلف اللسان لوگوں کے اس میل جول سے ریل کے ہر ڈبے میں ایک نئی زندگی کروٹ لینے لگتی ہے۔

پوربی ریلوے

دوستی سے بھرپور ذریعہ سفر

تبصرۂ کتب

تبصرے کے لیے ہر کتاب کی ۲ جلدیں آنا ضروری ہیں

نام کتاب	ڈاکٹر ذاکر حسین
	اصل کتاب ، انگریزی میں مصنفہ پروفیسر مجیب
	اردو ترجمہ محمد طیب جامعی
شائع کردہ	نیشنل بک ٹرسٹ
	گرین پارک - نئی دہلی - ۱۱۰۰۱۶
اشاعت	دوسری
صفحات	۲۶۴
قیمت	۵۲ روپے
مبصر	رئیس الدین فریدی

ڈاکٹر ذاکر حسین سے کون واقف نہیں - مفکر، مدبر، منتظم، ماہر تعلیم، گاندھی جی اور مولانا آزاد کے تعلیمی مشیر، ہمہ صفت موصوف، ملک و قوم کے مخلص بہی خواہ، مسلمانوں کی تعلیم کے معاملے میں حسب حالات - دوسرے سید احمد خان - گورنر، نائب صدر اور آخری صدر جمہوریہ - ان کے انتقال کے بعد حکومت ہند کی وزارت تعلیم نے ان کے حالات زندگی کی ترتیب و اشاعت کے لیے جو ذاکر حسین میموریل کمیٹی قائم کی تھی اس کی ایماء پر یہ کتاب ان کے رفیق خاص پروفیسر محمد مجیب نے مرتب کی جو پہلی مرتبہ سنہ ۱۹۷۲ء میں شائع ہوئی تھی اور اب اس کی دوسری اشاعت عمل میں آئی ہے - اس کا آغاز مصنف کے ایک مختصر دیباچے سے ہوتا ہے - پھر مختلف ابواب میں ذاکر صاحب کے افغان آباو اجداد کے حالات اور افغانان ہند کی مختصر تاریخ ان کے عادات و خصائل اور رسم و رواج اور خود ذاکر صاحب کی زندگی کا بحر زخار مع گوہر ہائے آبدار - طالب علمی کا زمانہ - علی گڑھ کالج کو برطانوی اثرات سے آزاد کرانے کی کوشش کے بعد گاندھی جی، ڈاکٹر مختار احمد انصاری اور حکیم محمد اجمل خاں کی سرپرستی میں جامعہ ملیہ کا قیام اور دوسری تعلیمی اصلاحات، تقسیم ملک کے وقت جامعہ ملیہ اور ذاکر صاحب سمیت اس کے خادموں کو پیش آنے والی مصیبت اور اس کا مردانہ وار مقابلہ اور پھر آخری زندگی کے حالات و واقعات -

اس کتاب پر مفصل تبصرہ کرنا کارے دارد ہے - مختصر یہ ہے کہ ہر باشعور ہندوستانی خصوصاً اردو خواں اصحاب اور نوجوانوں کو اس کا مطالعہ ہی نہیں کرنا چاہیے بلکہ اس کی باریکیوں کو ذہن میں اتار کر اپنے اور ملک کے شاندار مستقبل کی تعمیر میں رہنما دستاویز بھی بنانا چاہیے - اس قسم کی کتابیں ہی اولین مطالعے کی مستحق ہوتی ہیں -

ooooo

نام کتاب	سخنوران شاہجہانپور
مصنف	مبارک شمیم
صفحات	۴۰۰
قیمت	۱۵۰ روپے
ملنے کے پتے	اہلو والیہ بک ڈپو - نیو رہتک روڈ
	نئی دہلی ۱۱۰۰۰۵، مکتبہ جامعہ، اردو بازار
	جامع مسجد - دہلی ۱۱۰۰۰۶ اور دوسرے
مبصر	رئیس الدین فریدی

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہ مغربی یوپی کے مشہور شہر شاہجہاں پور کی مردم خیز خاک سے اٹھنے والے یا باہر سے آکر وہاں کی خاک میں مل جانے والے مسلمان - ہندو شعرا اور شاعرات کا مفصل تذکرہ ہے - مبارک شمیم صاحب جو خود بھی شاعر ہیں اور عمر کے آٹھویں دہے میں ہیں مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے ایک شہر کے متعلق اتنی بسوط کتاب قلم بند کرکے اسے شائع کرنے میں کامیابی حاصل کرلی -

کتاب میں مجموعی طور پر ۲۲۸ شعراء اور شاعرات کا ذکر مع نمونۂ کلام موجود ہے - جن میں سے ۷۷ قدیم ہیں - ان میں بانی شہر نواب بہادر خان چغتا اور ان کے پوتے نواب زین الدین خان زین کے علاوہ لالہ سب سکھ رائے بھی شامل ہیں - ظاہر ہے کہ یہ سب فارسی کے شاعر تھے - اردو تو دہلی کے بعد ہی شاہ جہاں پور پہونچی - لالہ جی کے متعلق لکھا ہے کہ فارسی زبان کے علاوہ دوسرے علم و فنون میں بھی ماہر تھے اور ہندی بحروں میں بھی فارسی شاعری کرتے تھے - نواب زین خان کے ذکر میں ان کا حسب ذیل شعر بھی نقل کیا گیا ہے -

سیہ چوڑی* بدست آں نگار نازنیں دیدم
بشاخ صندلی پیچیدہ مار عنبریں دیدم

* چوڑی

یہ شعر تو بچپن سے حافظے میں محفوظ ہے مگر اس کے ساتھ برسوں پہلے پڑھا ہوا یہ واقعہ بھی ذہن میں تازہ ہے کہ یہ شعر شیخ علی حزین کو بنارس کے

کسی شاعر نے فخریہ سنایا تھا تو انہوں نے کہا تھا کہ تشبیہہ تو خوب مگر اسراف لفظی سے خالی نہیں ورنہ یوں بہتر رہتا۔

سب چوری بدست آن نگارے
بلاغ صندلیں پیچیدہ مارے

تیرھویں صدی ہجری میں شاہ جہان پور بھی دہلی۔ لکھنو اور رام پور کی طرح شعر و ادب کا مرکز بن گیا تھا اور اس زمانے کے اردو شعراء میں نواب غلام حسین خان حسین کا ذکر نہایت معنی آفرین ہے جن کے ملیح آباد اور لکھنؤ کے نواب نظیر محمد خان گویا سے بھی گہرے مراسم تھے۔ مولوی قطب الدین طالب اور شیخ رفعت علی رفعت کے حالات بھی بصیرت افروز ہیں۔

۷۷ قدیم شعراء کے بعد استاد کامل حکیم مولوی ضمیر حسن خان دل سے بیسویں صدی کے شعراء کا ذکر شروع ہوتا ہے جو تمام تر اردو کے شاعر ہیں۔ ان میں شہید اشفاق اللہ خان وارثی، پروفیسر عبدالسمیع خاں نکہت، علامہ اختر علی طہری اور پروفیسر قمر رئیس، سیدہ شفق آرا شان معراج تک ۱۵۰ شعراء اور شاعرات کو نوازا گیا ہے۔

کتاب عام پڑھنے والوں کے لیے دلچسپ اور معلومات افزا ہے تو محققین اور نقادوں کے لیے کام کی چیز ہے۔ اس کے ذریعے اردو اور فارسی کے شعراء اور شاعرات میں بہت کچھ اضافہ ہو سکتا ہے۔ تاریخ شاہجہاں پور پر بھی مقدمہ بھی بہت کارآمد ثابت ہو سکتا ہے۔ کتاب خرید کر پڑھنے کے لائق ہے۔

ooooo

نام کتاب "دست چنار" از بلبل کشمیری
مبصر رئیس الدین فریدی

شیخ غلام علی بلبل کشمیری یوں تو پیدائشی شاعر ہیں مگر ان کی صحیح تعریف اس مصرع میں پنہاں ہے کہ

غربت میں جا کے چمکا گمنام تھا وطن میں

وہ کوئی تیس سال سے لندن میں مقیم ہیں اور وہاں دوسرے مشاغل کے ساتھ اور اس کے ادب کی ضرورت کے شائق اور وفادار بھی چلے آ رہے ہیں اور طنزیہ اور مزاحیہ شاعری کے ذریعے اپنے اور دنیا کے اوپر ہنستے اور دوسروں کو ہنساتے رہتے ہیں۔ ان کا پہلا مجموعہ کلام "خندۂ گل" کے نام سے کئی سال پہلے شائع ہوا تھا جس میں نئے وطن کے طرز معاشرت پر بھرپور طنز کے ساتھ نئے ماحول میں اپنی بے کسی اور بے بسی سے بھی نوشیروانی انصاف کیا تھا۔ اب ان کا دوسرا مجموعہ کلام نام "دست چنار" اشاعت پذیر ہوا ہے جو صرف اپنے اصلی وطن کشمیر سے اظہار عقیدت و محبت اور اس کے گلزاروں اور مرغزاروں، حسینوں اور طرحداروں کی دل میں بسی ہوئی یاد کے خوبصورت مرقعوں اور تصویر کشی پر مشتمل ہے۔ کتاب کا انتساب "کشمیر کے افسردہ چناروں کے نام" ہے۔ کشمیر کا شاید ہی کوئی حسین مقام ہو جس کا اس میں جذبات سے مملو ذکر نہ ہو اور جس سے حب الوطن من الایمان کی خوشبو نہ آتی ہو۔ ساتھ ہی ساتھ اس کی موجودہ حالت پر تاسف کا اظہار نہ ہوتا ہو۔

ایک مسدس بعنوان "خلد بریں" کے دو بند ملاحظہ فرمایئے۔

زمین پردی اور زمینی بہتریں ہے
کہ اس خاک کا ذرہ ذرہ حسیں ہے
ہوا عنبریں و فضا دل نشیں ہے
چمکتے ستاروں کی روشن جبیں ہے

یہ دنیا یہ مہتاب پاروں کی دنیا
کھلکتے ہوئے آبشاروں کی دنیا
سفیدوں - چناروں - اناروں کی دنیا
چمن در چمن نو بہاروں کی دنیا
وہ دنیا کہ جس سے یہ دنیا حسیں ہے
زمیں ہے مگر رشک خلد بریں ہے

اور موجودہ منظر

فطرت کا یہ روشن گہوارہ
پہلے کی طرح شاداب نہیں
گلمرگ کے لالہ و گل غمگیں
لولاب میں وہ کمخواب نہیں
باغوں میں نظر کے دیپ نہیں
جھیلوں میں وہ آب و تاب نہیں
سیاح یہاں اب کیا آئیں
تاراج ہے وہ چمنستان وطن

اختر شیرانی مرحوم کی کئی نظموں کی پیروڈیاں حضرت بلبل کاشمیری نے شامل کتاب کی ہیں جو اسلوب کے اعتبار سے دلکش اور دلچسپ ہیں تو بجا تاثر وطن سے دوری کے درد اور سوگ میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ کتاب کا سرا سر قابل مطالعہ ہے مگر افسوس کہ ہندوستان میں اس کا حصول ممکن نہیں چھاپنے والوں نے خود شاعر کو بھی چند پھولوں پر ہی قناعت کرا دی ہے۔

نام کتاب	خودرو
مصنف	سید بشارت علی
صفحات	۱۹۲
ناشر	مکتبۂ شعر و حکمت - حیدرآباد
مبصر	ڈاکٹر محمد ظفر قدوائی

خودرو سید بشارت علی کا شعری مجموعہ ہے - جس میں میر کے ۲۷ نشتروں کی چبھن موجود ہے - اصناف سخن کے اعتبار سے اسے اس طرح بانٹا جاسکتا ہے - نظمیں ۷۰، ۱۰۷، غزلیں ۹ مطلع سے عاری ۳ غزلیں جن کو انہوں نے اشعار عنوان کے تحت تحریر کیا ہے اور تین عدد مرثیے -

سید بشارت علی کا سارا کلام ان کی تمام عمر کی نامرادیوں کا اعلان ہے چونکہ ان کے سنہرے خواب ان کے حسب خواہ تعبیر نہ پیش کرسکے اور ان کو ہمیشہ اپنی خیالی منزلوں کی تلاش اور زندگی کے نئے افق کی فکر دامن گیر رہی - اس فکر نے انہیں سوائے سرگرانی کے اور کچھ نہ دیا بلکہ ہر طرف سے ناکام و نامراد پھرے - اسی شکست و ریخت نے انہیں قنوطی بنادیا - حالانکہ وہ غم پرست نہیں بلکہ ہر اعتبار سے غم رسیدہ ہیں ورنہ شاید وہ یہ نہ کہتے

خوشیاں تو خیر آنی و جانی ہی تھیں مگر
دکھ تو یہ ہے کہ دکھ بھی بہت مختصر ہوئے

لیکن بایں ہمہ وہ ناموافق حالات کے آگے سپر انداز ہوگئے چنانچہ یہی کسک ان کے قلب و ذہن کو ہمیشہ خاکستر بنائے رہی - بشارت علی کی شاعری اسی مایوسی کا اظہار ہے - مثلاً

پہونچ نہ پایا میں اپنی بلندیوں پہ کبھی
میری زمین ہی اب آسماں ہے میرے لیے

ooo

تمام عمر بشارت رہائی پا نہ سکا
کہ صید دام طلسم الم کچھ ایسا تھا

ایک موقع پر اپنی نامرادیوں کا ماتم یوں کرتے ہیں -

فلک کی بات تو چھوڑو زمیں بھی نہ ملی
بلندیوں پہ جو تھا حوصلہ کچھ ایسا تھا

احباب کی کرم فرمائیوں کا شکوہ بھی ملاحظہ ہو -

کچھ اور شکلوں میں آشنائی کا روپ ڈھونڈیں
شناسا چہروں کا رنگ باسی لگے ہے اب تو

غرض کہ ہر طرح ناسامد حالات کے بحر بیکراں میں غم و آلام کے تند تھپیڑوں سے لوہا لیتے ہوئے بھی جب انھیں کسی صورت بھی ساحل مراد ہاتھ نہ لگا تو اپنی مایوسی یوں ظاہر کرتے ہیں -

کوئی پائے گا کیا مجھ میں
کہ اک گہرا اندھیرا ہوں

پھر بھی اسی بحر غم ہستی میں انہوں نے اپنے قلب غیر مطمئنہ کی تسکین کی سبیل ڈھونڈھ ہی لی ہے -

اونچائی کا عذاب تو سہنے سے بچ گئے
کیا کم یہ عافیت ہے کہ بے بال و پر ہوئے

غزلوں کی طرح بشارت علی کی نظموں میں بھی اسی مایوسی کی گہری چھاپ ہے - کسی منظر میں انہیں کوئی کشش یا جاذبیت نظر نہیں آتی بلکہ ہر جگہ بے بسی ہی آگے آتی ہے اس مجموعہ میں دو مصرعوں میں ان کی سوانح عمری ہے

موم تھا میں تو رفاقت مجھے سورج کی ملی
اور جب آگ بنا ٹوٹ کر برسا پانی

یہی کرب ہے جو ان نظموں یا غزلوں میں کسی نہ کسی روپ میں دیکھنے کو ملتا ہے -

بشارت انگریزی کے معلم ہیں اس لیے انگریزیت ان کے اندر یوں رچ بس گئی ہے کہ انہوں نے انگریزی کی ڈگر پر اردو شاعری کو بھی چلانے کی کوشش کی ہے - ہوسکتا ہے جدیدیت کے شیدائیوں کو یہ گم صم سی لے بھی معلوم ہو مگر راقم کا خیال ہے ہر زبان کا ادب اپنا الگ مزاج رکھتا ہے - اسی طرح اردو شاعری کا بھی اپنا ایک مزاج ہے اور اس کا لباس ہے عروض - اس لباس کو اتار کر اردو شاعری کی دوشیزہ کو مغربی لباس پہنا کر اس میں حسن و حیا تلاش کی جائے تو شاید تلاش بے سود ہوگی - کاش انہوں نے اپنے خیالات اور موضوعات شاعری اردو کے ملبوس ناز میں سجا کر پیش کیے ہوتے تو بلاشبہ اس کا جادو سر چڑھ کر بولتا - آزاد شاعری کا روپ دے کر بشارت علی نے اپنے خیالات کو حسن نہیں ویرانی عطا کی ہے جو قاری کو بجائے دلچسپی فراہم کرنے کے ایسے گورکھ دھندے میں الجھا دیتی ہے جس کا حل آسان نہیں - حالانکہ اسی کتاب میں چند غیر مردف غزلیں اور دو ایک اسی قبیل کی نظمیں بھی ہیں وہ بلا شبہ مرکز توجہ بنتی ہیں ان کے علاوہ تخئیل کی عظمتوں کے باوصف نظموں میں خاطر خواہ اثر آفرینی نہیں یہی حال ان کے تینوں مرثیوں کا بھی ہے وہ اپنے قاری کو قطعی اپنے غم میں نہیں شریک کرسکے ہیں -

"خود رو" واقعی خود رو ہے جو کسی ماہر باغباں کی رہین منت نہیں۔ پھر بھی چونکہ اس میں غم کی عکاسی ہے اور غم چونکہ فی نفسہ جاذبیت رکھتا ہے بقول شیلے

" Our sweet songs are those that tell us saddest thought "

اس لیے امید کی جاسکتی ہے کہ اس نئی روشنی میں اسے ای روپ میں ضرور پذیرائی نصیب ہوگی۔

00000

نام کتاب	جنگل جنگل شہر (افسانے)
مصنف	ہیرانند سوز
ناشر	سیمانت پرکاشن 922 کوچہ روہیلا ترابہرام - دریا گنج، نئی دہلی 110002
مبصر	شردن کمار ورما

ہیرانند سوز نصف صدی سے ادبی سفر میں ہیں۔ اس سفر میں ان کا ہر قدم آگے ہی بڑھا ہے اور ان کے ہاں تکان یا شکستہ پائی کا قطعی احساس نہیں ہے۔ ادبی سفر میں خوش نصیب وہی ہے جسے منزل نہیں، نئے راستوں پر چلتے رہنے کا شوق ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے سوز کامیاب فن کار ہیں۔ انہوں نے افسانے بھی لکھے ہیں اور شاعری بھی کی ہے اور دونوں راہوں میں نقش کف پا چھوڑے ہیں۔ ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ (کاغذ کی دیوار) 60ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد ایک اور مجموعہ ساحل، سمندر اور سیپ منظر عام پر آکر مقبول ہوا۔ ایک شعری مجموعہ "سورج میرے تعاقب میں" اس میدان میں ان کی کامیابیوں کا غماز ہے۔

یہ کتاب میں قصیر افسانوں پر مشتمل ہے۔ سوز فن افسانہ نگاری کے تمام رموز سے آشنا ہیں۔ نہ تو وہ کہانیوں میں فلسفہ بگھارتے ہیں نہ الفاظ ضائع کرتے ہیں۔ جذباتیت کا شکار ہو کر ادھر ادھر بھی نہیں بھٹکتے چونکہ وہ ایک نیک، شریف اور مخلص انسان ہیں اس لیے ایک سچے فنکار کی طرح یہ تمام خوبیاں ان کے افسانوں سے جھلکتی ہیں۔ ہر افسانہ ایک پیغام لے کر آتا ہے لیکن وہ مقصدیت کو فن پر حاوی نہیں ہوتے دیتے۔ ان کی کہانیاں دلچسپ، فنی لحاظ سے چست، وحدت تاثر لیے ہوئے اور تیز رفتار ہوتی ہیں۔ سوز کے افسانے پڑھ کر کوئی ذہین قاری یہ نہیں کہہ سکتا کہ ایسا نہیں ہو سکتا، ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ نہ تو سوز کسی ازم، یا سیاسی تحریک کے زیر اثر کہانیاں لکھتے ہیں اور نہ ہی کسی خاص رنگ کا جھنڈا لے کر آگے آگے چلنے کی مضحکہ خیز کوشش کرتے ہیں۔ ان کے افسانوں کا خمیر عام انسانی زندگی، چھوٹی چھوٹی بظاہر معمولی باتوں نفسیاتی پیچیدگیوں اور ذہنی الجھنوں سے اٹھتا ہے۔ سماجی افراتفری، اقتصادی بدحالی انسانی رشتوں کی شکست و ریخت ان کہانیوں کا پس منظر ضرور ہیں۔ مجبوریاں، ناکامیاں اور محرومیاں اثرانداز ہوتی ہیں لیکن یہ مایوسی یا بے چارگی کا درس قطعی نہیں دیتیں۔

ایک سو ساٹھ صفحے کی یہ کتاب ہر لحاظ سے خوبصورت ہے۔ بڑھیا کاغذ عمدہ طباعت، سہ رنگا سرورق اور مضبوط جلد، قیمت -/125 روپے ہے۔

آپ کی ڈاک (قارئین کے خطوط)

○ مراسلہ نگار کی رائے سے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے

○ **اگست** ۱۹۹۵ء کا انشاء میرے سامنے ہے آپ کے منظوم اداریے انوکھی جدت ہیں - "کوڑے کا ٹب" اور "متعدد مرڈر کیس" اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ ہماری سیاست کا رخ اب کس جانب ہے - عدم تشدد کا علمبردار ہندوستان اب واقعی تشدد کی راہ پر چل پڑا ہے - رئیس الدین فریدی صاحب کی خودنوشت کتاب کا ایک باب "پہلا یوم آزادی اور اس کے بعد" کے حالات پڑھ کر میں بہت متاثر ہوا۔ تقسیم ہند نے مسلمانوں کو درحقیقت بے حد کمزور کیا ہے اس بات کی عکاسی قدم قدم پر ہو رہی ہے - ان کی مکمل سوانح حیات پڑھنے کا بے حد اشتیاق ہے - جناب جوگندر پال کی تو منی کہانیاں جو کہ "نو" کے عنوان سے چھپی ہیں تمام کہانیوں پر بھاری ہیں اور انہیں حاصل شمارہ کہا جا سکتا ہے - ساجدہ عندلیب رحمن کا افسانہ رہائی آپ نے صرف کے لئے شامل کیا ہے پروفیسر مرزا اکبر علی بیگ صاحب کا مقالہ "مولانا روم کی مثنویوں میں اخلاقی اقدار" یکم اگست اور ۸/ اگست کے "ہماری زبان" دہلی میں بھی دو قسطوں میں چھپا ہے - مرزا صاحب بہت مخلص آدمی ہیں اور خوب لکھتے ہیں -

ابرار احمد صدیقی، مدھوبنی (بہار)

○ "**انشاء**" کا اگست ۹۵ء کا شمارہ دیکھا - ہر شمارے میں ایسی دلچسپیاں آپ کو مدعو دیتے ہیں کہ پڑھنا شروع کرو تو ختم کئے بغیر رسالہ رکھنے کو دل نہیں چاہتا۔

آپ کا اداریہ مختصر تھا پھر بھی جھنجھوڑ کر رکھ دیا - واقعی حادثہ کوئی سا ہو بھیانک ہوتا ہے اس کی آنکھوں کے لئے کیمرہ ضروری ہے -

رئیس الدین فریدی کی تحریر، ریاض عمر کی دعا، متاثر کرتی ہے - رئیس الدین فریدی صاحب نے اپنے خیالات پر مبنی ڈائری میں آزادی کے طلوع سے وابستہ کئی یادیں رقم کر دیں، ریاض عمر نے عفو و درگزر کا سبق دیا مگر مسئلہ کشمیر ہے اور ہم سب فرشتے نہیں انسان ہیں - خطا کے پتلے -

جوگندر پال کی ۹ منی کہانیاں بڑی جاذب ہیں مگر میں افکار، تبصرے مضامین سبھی معیاری ہیں اور دوسری طرف شاعری کی کیاریاں دیر پا مہکار کی حامل ہیں -

سلیمان احمد انشاء، کلکتہ

مجھے انگلستان میں اردو لکھنے والوں سے زیادہ قرب ہے - اس لئے ڈاکٹر مختار الدین احمد کی شعریت، عمران الارشد اور اختر ضیائی کے خطوط کو اولیت اور اہمیت دوں گا - (پھر عمران بھائی نے اس ناچیز کا ذکر بھی بڑے خلوص سے کیا ہے) مجھ پر جانب داری کا الزام لگ سکتا ہے مگر ابھی لوگوں نے احساس نہیں کیا یہاں اردو کو تکیہ بچھونا بنانا کیا معنی رکھتا ہے ؟ احمد سعید انور کے افسانے پر نسبتاً زیادہ توجہ دینی پڑی - خدا ان کے قلم کو مزید بلندی عطا کرے - آمین - ان کا افسانہ پڑھ کر خیال آیا سوہنی پنجاب کی ہو یا روس کی سوہنی - دونوں کی قسمت میں ڈوبنا لکھا تھا سوہنی کا باپ پنجاب کا ہو یا روس کا اس کی قدریں کرختگی پر مشتمل اور تخریبی اور منفی رنگ ہی میں رنگی ملیں گی، باقی رہا مہیوال اس بیچارے کی جگت محرومی کی شدت کسی زمانے میں کم نہیں ہوگی - احمد سعید انور نے اپنے افسانے میں سیاست کی پچی کاری کرنے میں بھی کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی -

ستمبر / اکتوبر کے سرورق پر افسانہ لکھنے لگا تھا - پھر سوچا پہلے آپ ہی سے پوچھ لوں اس کے پیچھے کیا ہے ؟ (گستاخی معاف چولی والی بات مجھے معلوم ہے !)

اداریہ "مغربی بنگال اردو اکیڈیمی" دو بار پڑھا - جہاں اردو کے ادیبوں اور شاعروں کی مشکلات یعنی اپنی مشکلات اور ان کے اسباب سمجھنے میں مدد ملی وہیں یہ جان کر ملال ہوا کہ برصغیر میں بلا استثناء نیم سرکاری اداروں میں ایک ہی نظام اور ذہن کارفرما ہے - کچھ لوگ اسے انگریزوں کا چھوڑا ورثہ کہتے ہیں لیکن وہاں کے اکثر کرتا دھرتا یہاں سے تعلیم یا تربیت لے کے گئے - کیا وہ یہاں کا نظام اور رویے دیکھ کر نہیں گئے یہاں ادارے فرد کی عزت کرتے ہیں، اسے مانتے ہیں -

آپ کے یہاں کی اردو اکیڈیمی تو یقیناً آہستہ خرام بلکہ مخرام کی قائل نظر آتی ہے -

اداریے کے آخری حصہ میں جس خلوص اور درد میں ڈوب کر آپ نے باتیں کی ہیں کاش مغربی بنگال کی ہی نہیں اکثر مقامات پر قائم اردو اکیڈیمیاں انہیں اپنے لئے سرمہ، بصیرت بنالیں -

لیکن کہیں بھی کچھ فرق نہ پڑے گا - کوئی تبدیلی نہ آئے گی خصوصاً مغربی بنگال اردو اکیڈیمی والے اور زمین جنبد نہ جنبد گل محمد کی تصویر بن جائیں گے - آپ نے بھی تو انکشاف کرکے دفتر والوں کو پوری طرح سلگا دیا ہو گا -

میں مغربی بنگال اردو اکیڈیمی کو خط لکھ رہا ہوں - مزے کی بات بتاؤں اردو اکیڈیمی والوں کو میں انگریزی میں خط لکھوں گا - تجربہ کاروں کا مشورہ

ہے کہ اگر وہاں کسی کان پر جوں رینگتی ہے تو وہ انگریزی سے رینگے گی - دوسرے اتنا مقدور نہیں کہ آپ کی طرح اپنی بات سمجھانے کے لیۓ ان کی حدمت میں اردو / انگریزی لغت لے کے جاؤں !!!

مجھے یہ بات بھی بہت ناگوار گزری ہے کہ گھر میں اکیڈیمی کا سلوک جو ہے سو ہے باہر اس سے بھی بدتر - ہرچرن چاولہ جی کے ساتھ جو سلوک روا رکھا گیا وہ شرمناک حد تک شرمناک ہے - میں جل بھن گیا ہوں - اکیڈیمی کو خط کے دریعہ احتجاج کررہا ہوں - اکیڈیمی والوں کو معلوم تو ہونا چاہیے کہ باہر ان کا، ان کی کاہلی اور نااہلی کی بناء پر کیا امیج بن رہا ہے - ہم یہاں ایک جمہوری ملک میں رہتے ہیں جو خود سے کچھ نہیں کہتے - ہم خواہ برطانیہ کو جمہوریت کی ماں کہتے رہیں بھارت کو دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت کہا جاتا ہے - کاش وہاں اس چھوٹی جمہوریت کی کوئی جھلک نظر آجائے - یہاں تو بھائی صاحب براہ راست پارٹی کے ذریعے ایم پی کے ذریعے چھوٹے موٹے احتجاج، مومنٹ یا دستخطوں کے ذریعے قانون بدلوایا جاسکتا ہے - نہ معلوم میری طرح کسی اور نے بھی اکیڈیمی کو خط لکھا ہوگا تو اس کا کیا اثر ہوگا - خدشہ ہے کہ اگر ہوگا تو الٹا اثر ہوگا - آپ کو وہ بلیک لسٹ ہی کردیں گے -

کہتے ہیں شیطان کو بھی اس کا واجب حصہ دینا چاہیے - آپ کے اداریئے میں مجھے اکیڈیمی کی طرف سے جوابی لفافہ طلب کرنے پر اعتراض اور خفگی سمجھ میں نہیں آئی - بعض بڑے ادارے جہاں سے روزانہ ان گنت خطوط کا جواب دیا جاتا ہے اگر وہ بچت یا مستعدی دکھانے کے لیۓ جوابی لفافہ مانگتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں - بھائی صاحب اپنی برادری والوں یعنی اہل قلم سے ہر معاملے میں "مفت خوری" کی عادت چھڑوائیے - جب تک نیت مسلم اور صحیح نہ ہوگی، خود اعتمادی، وقار اور عزت نفس بے جا EGO سے علیحدہ کرکے بات سوچی نہ جائے گی اور عمل نہ ہوگا - تبدیلی مشکل ہے -

مقصود الہی شیخ

مدیر "راوی" براڈفورڈ - یوکے

○ **انشاء** کے اگست کے شمارہ میں جناب رئیس الدین فریدی کا "پہلا یوم آزادی اور اس کے بعد" بہت اچھا اور دلچسپ لگا - کئی بھولی بسری باتیں یاد آگئیں - ہمیں ان کی "سرگزشت" کی اشاعت کا انتظار رہے گا -

اس مضمون میں کچھ کتابت کی غلطیاں ہیں - انہوں نے لکھا ہے "بمبئی شہر میں جو کچھ ہورہا تھا وہ میں ضرور دیکھ رہا تھا" - لیکن بعد میں یہ لکھا ہوا ہے "۱۴/ اگست کی شام کو کلکتے کے میئر نے کارپوریشن کے ممبروں اور معززین شہر جن میں عام اخبار نویس بھی تھے عصرانے پر بلا رکھا تھا" - میرے خیال میں یہاں "بمبئی" کی جگہ "کلکتے" چھپ گیا ہے - اور بعد میں گاندھی جی کے قتل کی تاریخ بھی ۳۰ جنوری ۴۸ کے بجائے ۳۰ جنوری ۳۸ چھپ گئی ہے - آنجہانی کھمبیر صاحب اور شری مرارجی ڈیسائی کے بارے میں بھی ان کے انکشافات نئی نسل کے لیۓ آنکھیں کھولنے والے ہیں کیونکہ آج کے دور میں ایسے سیاسی لیڈر کہاں ملتے ہیں - شری مرارجی ڈیسائی کے نقطہ نظر سے ہم کو بھلے ہی کچھ اختلاف ہو - لیکن ان کی دیانت داری اور بے باکی کے بارے میں کوئی شک نہیں کرسکتا - انہوں نے زندگی بھر کبھی کسی سیاسی مصلحت کے لیۓ اپنے اصولوں کے بارے میں سمجھوتہ نہیں کیا - اور نہ ہی کبھی اپنا نقطہ نظر برملا کہنے میں کوئی جھجک محسوس کی -

آزادی کے دن کے بارے میں اس مضمون میں پڑھتے ہوئے مجھے ایک بات یاد آگئی تھی - ۱۹۴۸ء میں سناتن دھرم کالج انبالہ چھاؤنی میں پڑھتا تھا - ہمارے کالج کا سالانہ جلسہ تھا - اس جلسے میں سناتن دھرم پرتی ندھی سبھا اور کالج مینیجنگ کمیٹی کے صدر جناب گوسوامی گنیش دت جی مہاراج نے اپنے خطبہ میں یہ فرمایا تھا "کچھ لوگ کہتے ہیں کہ میں کمیونل ہوں - اگر میں ان دھارمک وچاروں کی وجہ سے کمیونل ہوں تو جواہر لال نہرو اور وہ دوسرے لوگ جنہوں نے پنڈتوں اور نجومیوں کے مشورہ کے مطابق ملک کی آزادی کے اعلان کا وقت ۱۴/ اگست رات کے بارہ بجے مقرر کیا ہے وہ بھی کمیونل ہیں - میرے قریب بیٹھے ہوئے میرے ایک ہم جماعت نے ہنستے ہوئے کہا - "گوسوامی جی نے یہ ثابت کرنے کے بجائے کہ وہ کمیونل نہیں ہیں - ثابت یہ کردیا ہے کہ جواہر لال نہرو اور کانگریس کے سبھی لیڈر کمیونل ہیں" -

ستمبر / اکتوبر کے شمارے میں مغربی بنگال کی اردو اکیڈیمی کے بارے میں آپ نے جو اداریہ لکھا ہے - باعث فکر ہے لیکن زیادہ باعث فکر یہ ہے کہ ملک کی زیادہ تر اردو اکیڈیمیوں کی حالت تقریباً ایسی ہی ہے - اس سلسلے میں جناب شمس کنول صاحب کے ماہنامہ کتاب نما (جولائی ۱۹۹۲ء) کے بطور مہمان مدیر اشاریہ سے کچھ اقتباس لکھ رہا ہوں -

"حیرت ہے کہ ہمارا اردو دانشور اردو کی جلتی ہوئی اس چتا کو آنکھوں سے دیکھ رہا ہے مگر نہ اس کی پیٹھ پر کن کھجورے رینگتے ہیں اور نہ اس کے پاؤں میں بچھو ڈنک مارتے ہیں - اس کی آنکھوں کا تو پانی ڈھل چکا ہے - اور اس نے اپنی آنکھوں پر ٹھیکری رکھ لی ہے - وہ تو ہر روز ملنے والے اعزازات اور نقد انعامات کے ڈھیر پر "نیرو" بنا بیٹھا ہے - اور چین کی بنسی بجا رہا ہے" -

* **اردو کی سمادھیاں** - یہ اچھا کام بھی ہمارے سیاست دانوں

ہی کے ہاتھوں انجام پایا ہے کہ انہوں نے اردو کی چتا سے پھول چنے ہیں اور ملک کی تقریباً سب ریاستوں میں اردو اکیڈیمی کے نام سے اردو کی ایک سمادھی بنادی ہے"۔

"تقریباً سبھی اردو اکیڈیمیاں بد انتظامی، بد نظمی، تنگ نظری، کوتاہ اندیشی، ہنر ناشناسی، ناانصافی، حق تلفی، چوری اور سینہ زوری، بد باطنی، بدمعاملگی، بد خلقی، بد اطواری، ڈھٹائی، ہٹ دھرمی، دھاندلی، بددیانتی، ناقص کارکردگی اور سو باتوں کی ایک بات ووٹ حاصل کرنے کی سیاسی مصلحت میں مبتلا ہیں۔ ہندوستان کا ہر دانشور اس راز سے واقف ہے کہ کسی بھی اکیڈیمی کے پیش نظر قلم کاروں کے مسودوں کو مالی امداد اور سال کی کتابوں کو انعامات دینے کے لئے نہ کوئی ضابطہ ہے نہ کوئی قاعدہ۔ کوئی جیوری مقرر کی جاتی ہے اور نہ ججوں کا کوئی پینل ہی ہے۔ کسی جانچ پرکھ یا اصول کے بغیر ہی امداد دی جاتی ہے۔ بس ہر اردو اکادمی کے دو بڑے عہدے داروں کے صوابدید پر منحصر ہے کہ وہ کس قلم کار کو کس انعام کا اور کتنی امداد کا مستحق سمجھتے ہیں۔ قلم کار کی علمی صلاحیت یا اس کی تخلیق کے معیار کو ملحوظ نہیں رکھا جاتا ہے۔"

"دراصل ہماری اردو اکادمیاں یہ جھوٹا بھرم سامنے رکھنے کے لئے تو کوشاں ہیں کہ بھارت جیسے سیکولر ملک میں اقلیت کی زبان محفوظ ہے۔ مگر درحقیقت وہ اردو زبان کی بقاء اور اردو کے فروغ کے لیے کچھ بھی نہیں کرتیں"۔

جولائی 1995ء کے ماہنامہ "آج کل" میں بہار اسٹیٹ اردو اکادمی کے مالی تعاون سے چھپی جناب محمد یوسف واقف کی کتاب "میں زندہ ہوں" پر جناب کور سین کا تبصرہ چھپا تھا۔ جس سے آپ اندازہ لگاسکتے ہیں کہ اکیڈیمی کیسی تھرڈ ریٹ کتابوں کے لئے مالی امداد دیتی ہے۔ انہوں نے لکھا تھا "واقف صاحب کی کوتاہ نظری شعر و ادب کے بارے میں خاصی زیادہ ہے۔ انہیں شعر کی سمجھ اور نثر کی پرکھ ذرا کم ہی ہے۔ ورنہ وہ غالب کی شاعری میں مضامین کے تنوع۔ مجروح کی شاعری میں خاص صناعت اور عصمت چغتائی کی مستند تحریر کو ہدف تضحیک نہ بناتے۔ ایسا لگتا ہے کہ واقف صاحب نقد معروض سے نابلد ہیں۔ اس لئے ان کی یہ کتاب سوائے ان کی ذات کی وکالت کے اور کسی چیز کو عیاں نہیں کرتی"۔

اسی طرح دوماہی "گلبن" احمد آباد کے مئی جون کے شمارہ میں گجرات اردو اکادمی کے بارے میں چھپے ایک مکتوب میں لکھا تھا۔ "اکیڈیمی برائے نام "اردو اکیڈیمی" ہے۔ لیکن تمام کام گجراتی زبان و تحریر میں انجام پاتے ہیں۔ اکیڈیمی کے رجسٹرار ڈاکٹر بھسو یاگنک گجراتی داں ہیں۔ اور اردو سے پیدائشی طور پر بے بہرہ ہیں۔ بعض ممبران ایسے ہیں جو اردو سے ناواقف ہیں۔ کئی وہ اراکین ہیں جو نہ اردو لکھ سکتے ہیں نہ املا درست ہے۔ یہ سب کچھ اردو کے نام پر شکم پروری اور اقربا پروری کا ذریعہ ہے۔ اہل اردو اس رویہ سے سخت نالاں ہیں۔ قربان جائیے اس خدمت اردو پر۔ خدا اردو اکیڈیمی کو راہ راست کی توفیق دے"۔ "گلبن" کے چیف ایڈیٹر جناب سید ظفر ہاشمی نے اپنے ایک اداریہ میں بھی گجرات اردو اکادمی کی بدعنوانیوں کو بے نقاب کیا ہے۔

بہار اردو اکیڈیمی کے بارے میں سننے میں آیا ہے کہ "اکیڈیمی کے جریدے "زبان و ادب" کا ایڈیٹر بدل چکا ہے۔ نوجوان، ناتجربہ کار ایڈیٹر مقرر ہوا ہے۔ کیونکہ بہار اردو اکادمی کے صدر کا بھائی ہے۔ سیاسی طور پر ایسا ہوا ہے"۔

ملک کی تمام اردو اکیڈیمیوں کے بارے میں ذاتی علم کا دعویٰ نہیں کرتا۔ اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ جن ادیبوں اور دانشوروں کے تجزیے یا نقاط نظر میں نے لکھے ہیں (Quote کئے ہیں) ان کی دیانت داری، غیر جانب داری، اخلاص اور اردو زبان سے محبت کے بارے میں سو فیصدی یقین ہے۔ اگر انشاء کا کوئی قاری کسی اردو اکیڈیمی کی مثبت کارکردگی کے بارے میں ہمیں لکھے گا تو ہم خیر مقدم کریں گے۔

میں اپنے ذاتی علم کی بناء پر دو اردو اکیڈمیوں کو اس عام تجزیے سے مستثنے سمجھتا ہوں۔ ایک تو دہلی اردو اکیڈیمی ہے جس کے بارے میں آپ نے اپنے اس اداریے میں بھی لکھا ہے۔ اور مجھے خود بھی معلوم ہے کہ اردو کی ترویج و ترقی کے سلسلے میں دوسرے کئی اہم مقامات کے علاوہ کئی سالوں سے دہلی اردو اکادمی کی کئی کوچنگ کلاسز چل رہی ہیں جن سے سینکڑوں ہزاروں لوگ فیض یاب ہوئے ہیں اور ہو رہے ہیں۔

دوسری اکیڈیمی مدھیہ پردیش اردو اکادمی ہے جو جناب پروفیسر آفاق احمد کی سرکردگی میں نہایت فعال ہے۔ ابھی حال ہی میں ماہ جون میں اکیڈیمی کے زیر اہتمام قومی خواندگی مشن (وزارت ترقی انسانی وسائل حکومت ہند) کے تعاون سے "اردو مصنفین کا قومی خواندگی کا سیمنار" منعقد کیا گیا۔ یہ ملک میں اپنی قسم کا پہلا سیمنار تھا۔ جس میں ملک کے سو سے زیادہ جانے مانے ادیبوں، شاعروں، دانشوروں نے حصہ لیا (اسی شمارے میں میرے مکتوب میں اس کی تفصیل دی ہوئی ہے) مدھیہ پردیش اردو اکادمی نے یہ سیمنار منعقد کرکے تمام اردو اکیڈمیوں کی رہنمائی کی ہے۔ پروفیسر آفاق احمد اردو زبان کے نہایت مخلص، محنتی اور بے لوث خادم ہیں۔ اور وہ اکیڈیمی سے صرف ایک روپیہ ٹوکن تنخواہ لیتے ہیں۔ پچھلی کانگریس وزارت کے عہد میں بھوپال میں اردو

اکیڈیمی کے لئے ایک شاندار عمارت تعمیر کی گئی تھی - جسے "اردو بھون" کا نام دیا گیا تھا - لیکن بعد کی بی جے پی کی حکومت نے عمارت کا بیشتر حصہ دوسرے دفاتر کو الاٹ کر دیا اور عمارت کا نام "اردو بھون" سے بدل کر "سنسکرتی بھون" رکھ دیا - اور اردو اکیڈیمی کے استعمال کے لئے صرف دو کمرے رہ گئے اب پھر پروفیسر آفاق احمد کی جدوجہد اور موجودہ حکومت کے اردو کے تئیں صحت مند اور ہمدردانہ رویہ کی وجہ سے عمارت اردو اکیڈیمی کو لوٹا دی گئی ہے - اور اس کا نام "ملار موزی سنسکرتی بھون" رکھا گیا ہے - ہمیں امید ہے کہ جلد ہی یہ عمارت "اردو گھر" یا "اردو بھون" کہلائے گی -

بنگال میں لیفٹ فرنٹ کی حکومت ہے جو اردو کی ترویج و ترقی کے بارے میں سنجیدگی سے قدم اٹھانے کا دعویٰ کرتی ہے ملک کے اور خاص طور پر بنگال کے محبان اردو اور سیکولر دانشوروں کا فرض ہے کہ آپ کے اداریے میں لکھے ہوئے مطالبات کی طرف حکومت بنگال اور خاص طور پر کامریڈ جیوتی باسو کی توجہ دلائیں - ہمیں پوری امید ہے کہ بنگال کی حکومت ضرور اس طرف دھیان دے گی -

رام پرکاش کپور
درگ مدھیہ پردیش

○ **اداریہ** میں آپ نے اردو اکادمی بنگال کا تذکرہ جس انداز میں کیا ہے اس کی بہت ضرورت تھی - ایسے لوگ جو اردو کو برباد کر رہے ہیں ان کا پردہ فاش ہونا ضروری ہے - کیا کہوں کم و بیش ہر اردو اکادمی کا یہی حال ہے - ہر جگہ لوگ یہی کرتے ہیں - بہار اردو اکادمی بھی کم نہیں ہے - جن کا اردو میں کوئی کام آج تک سامنے نہیں آیا ان پر ہماری بہار اردو اکادمی نمبر نکال رہی ہے اور جنہوں نے اردو کی خدمت میں پوری عمر لگا دی ان کا تذکرہ تک نہیں ہوتا ہے -

تازہ شمارے میں آپ نے جناب شہود عالم آفاقی صاحب کی دو غزلیں شائع کی ہیں - پہلی غزل بھی شائع شدہ ہے اور دوسری غزل تو میں نے بیس سال (۲۰) سال پہلے امتیاز بھارتی قوال سے سنی تھی جس کا ہر شعر مجھے یاد ہے - ایسی غزلوں کو آپ الفاظ کے اوراق پر جگہ دے کر کون سا کمال کر رہے ہیں -

تازہ شمارے میں یوگیندر پال طائر کی غزل حاصل شمارہ ہے - ان کی خدمت میں مبارکباد بھیج دیں - دوسری غزل جناب کرامت بخاری صاحب کی بہت پسند آئی -

فیاض رشک ، مونگیر

○ **"اداریہ"** میں آپ نے ایک بار پھر بنگال اردو اکادمی کو آڑے ہاتھوں لیا ہے - یہ اس کا حق بھی بنتا ہے یہ قطعی طور پر فعال نہیں رہی - دلی اردو اکادمی ہر لحاظ سے سرگرم عمل ہے زبیر رضوی کے بعد بھی اس کی سرگرمیوں میں کوئی فرق نہیں آیا بلکہ تیز تر ہوئی ہیں - بنگال اردو اکادمی کا شاید فنڈز کی عدم دستیابی کا مسئلہ ہو - مغربی بنگال سرکار کو اس کی طرف نظر عنایت رکھنی چاہیے -

ہیرانند سور ، فرید آباد

○ **اعجاز** تابش صاحب کے توسط سے "الفاظ" ستمبر / اکتوبر باصرہ نواز ہوا - "گفتنی" کی کڑواہٹ اور کسیلا پن اس حقیقت پر دال ہے کہ سیاسی مصلحتوں اور کاروباری نزاکتوں کے باوجود زبان مرحوم کے خادم اور قلمی اجتہاد کے دیوانے نہ صرف یہ کہ منصۂ شہود پر موجود ہیں بلکہ وسائل قلیل کے باوجود اپنی موجودگی نیز قول و عمل کی یکسانیت کا احساس دلانے کی سکت بھی رکھتے ہیں اللہ اجر عظیم دے آمین - حیدر طباطبائی کی عرق ریزی بھی (حسن اتفاق سے) انہیں محرکات و محاکات کے محاسبہ اور Retreat کا مطالبہ کرتی ہے جو اداریہ کا مقصود مثبت رہا ہے - باوجودیکہ بازگشت یا Parallel track کے اطلاق کے بجائے قند مکرر کی ترکیب زیادہ موزوں ہے - خصوصاً مضمون کا آخری پیراگراف صاحب مضمون کے مخلصانہ رویوں اور بے لوث حمیت کی غمازی کے ساتھ ایک انتہائی لیکن ناگزیر Delicacy کا داعی بھی بن گیا ہے - مولانا نسیم قمر نے ایک بے حد مستقلم اور خطرناک سازش کی نقاب کشائی کا جرأت مندانہ عزم تو کیا ہے لیکن جسارتوں اور حق بیانیوں میں تسلسل شدت اور مجاہدانہ افعال دراصل اساسی سرمایہ کی حیثیت رکھتے ہیں - صرف موضوع کی فیاضی اور پیش کش کافی نہیں ہوگی اسے ایک تحریک کی شکل دینی پڑے گی -

کہانی نما افسانے (یا افسانے نما کہانیاں) سبھی اچھے ہیں خاص طور پر "انجام کی خبر" (از ریکھا جین) نے کافی اپیل کیا - دور حاضر زندگی کی ہر سمت میں بے محابا اور کورانہ تقلید کا اس درجہ متقاضی ہوگیا ہے کہ ادب میں بھی افسانویت ، مقصدیت ، تحریک ، Dedication اور دوسرے تمام صحت مندانہ عوامل پس پشت ڈال کر صرف تجریدی اور مہمل مترشحات ہی کو تشخص اور انفرادیت کی زنبیل تسلیم کیا جائے گا ایسے زمانہ میں سادگی ، پرکاری اور "تمت بالخیر" کے جذبات کی نمائندگی کے لئے ریکھا جین کے عظیم حوصلہ کو بہ نظر تحسین دیکھا جانا چاہیے - شاعری کا حصہ بھی پرچہ کے شایان

شان ہے لیکن ظفر گورکھپوری اور شہناز مزمل خصوصیت کے حامل ہیں - مناسب سمجھیں تو منتخب کلام کے حوالوں اور تنقید و تبصرہ کی معرفت افہام و تفہیم کے نظریہ سے معروف جدید تخلیقی شعراء کے لئے دو صفحات مختص کر دیں چاہیں تو Initiative کے طور پر میری منسلکہ تین غزلیں ہدف اول سمجھ کر قبول فرمائیں -

اظہار یزدانی ، ناگور

○ **ماہ** ستمبر / اکتوبر کے "انشاء" میں اداریہ "مغربی بنگال اردو اکیڈیمی" واقعی اصلاحی ، معلوماتی اور لائق تحسین ہے - خوب لکھا ہے آپ نے مبارک ہو ! محترم حیدر طباطبائی کا مقالہ ہر اعتبار سے معلوماتی ہے - موصوف نے اپنے مطالعے ، مشاہدات و تجربات کا صحیح عکس پیش کیا ہے - مبارک ہو ! - ریکھا جین ، کدار ناتھ شرما اور مہتاب پیکر کے افسانے پسند آئے - نسیم قرعدوی کا مضمون بھی خوب رہا - اقبال متین ، واحد نظری ، اخترضیائی ، یوگیندر پال طائر و شہود عالم آفاقی سب کی غزلیں اچھی لگیں - علی اصغر صاحب کی نظم - مجھے اپنے غم کا شعور ہے " متاثر کر گئی - انشاء کی کتابت و طباعت بہت خوب ہے - ماہ نومبر کا انشاء دیر سے موصول ہوا - لیکن ملتے ہی سارا حصہ کافور ہو گیا - !

اداریہ "احترام کس کا اشوک سنگھل ؟" پڑھا - پڑھ کر متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا - آپ نے "اداریہ" بے حد پر مغز ، جامع ، مکمل اور مدلل لکھا ہے - مبارک ہو - خالد سہیل صاحب کا افسانہ پسند آیا - موسیٰ علی موسیٰ کا پہلا افسانہ "نیا زمانہ" متاثر کر گیا - دیپ سنگھ کا مزاحیہ مضمون پڑھ کر مسکرائے بغیر نہ رہ سکا - محترم مالک طالا کا مضمون "کیا سورو طی صنط ہوئی تھی ؟" ہمیشہ کی طرح اس بار بھی معلوماتی رہا -

غزلوں میں مظفر حنفی ، ستارہ لطیف حاتم اور جمیل نظام آبادی کی غزلیں پسند آئیں - سرورق اچھا رہا -

بدنام نظر ، پاکور شریف ، بہار

○ **نومبر ۹۵ء** کا شمارہ نظر نواز ہوا ، اداریہ "احترام کس کا اشوک سنگھل ؟" بہت پسند آیا - "گفتنی" کا ایک ایک حرف حقیقت پر مبنی ہے "کیا اس بات سے انکار کیا جا سکتا ہے ؟ ------- ! " مصلحت بزدلی کا دوسرا نام ہے " - "قانون کی حاکمیت قائم کرنے میں کبھی چوکے نہیں " - "اسلام نے عورت کو اچھا اور محفوظ مقام دیا " - "زعفرانی نیتا " - "مگر کاش دوسروں کو مورد الزام ٹھہرانے کے بجائے اپنی برائیوں کا تدارک کرتے " ،

ماہنامہ انشاء کلکتہ

- قلمی انداز کے رنگیلے بندھن روز قائم ہوتے رہتے ہیں " - "کامیابی اکثریت کا گھمنڈ نہیں ہے بلکہ اقلیت کا محفوظ اور بے خوف ہونا اور محفوظ اور بے خوف جینا ہے " آپ کے یہ سارے جملے اپنے سیاق سباق میں ترسیل کے لحاظ سے بڑے اہم بامعنی اور برمحل ہیں - ان میں حکمران طبقہ اور اکثریت کا راز فاش کر دیا گیا ہے -

"ترپ کا اکا" (خالد سہیل کا افسانہ) اوسط درجہ کا افسانہ ہے - یہ حقیقت ہے کہ عورت کو (Double Standard) سے کہیں بھی چھٹکارا نہیں - غیرت اور خودداری کا سودا کر کے زندگی بھی حاصل نہیں کرنا چاہیے - جمیل آفتاب نے "دوسرا نام" میں عورت کی فطرت کو دکھایا ہے اور مرد کس طرح عورت کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھانے کی گھات میں لگا رہتا ہے - اور اسے طرح طرح سے ورغلا کر تباہ و برباد کر دینا چاہتا ہے - "نیا زمانہ" میں موسیٰ علی موسیٰ کو گیارہ سال کی بچی کی بات پر حیرت ہوتی ہے - جب کہ "بھولا" کا دور ختم ہو چکا ہے - اب تو تین چار سال کے بچے اور بچیاں ایسی ایسی "سمجھداری" کی باتیں کہتے اور کرتے ہیں کہ اگر عصمت خالہ سن لیں تو شرما کر کہیں "اوئی اللہ تجھے پتہ ہے کہ تو کیا کہہ رہا ہے - اری بیٹی دیکھ بچے کیسی کیسی باتیں کر رہے ہیں - خدا کی پناہ میں نے بھی لونڈوں کے کھیل کھیلے ہیں ، میں بڑی پٹاخہ تھی لیکن غضب خدا کا قیامت قریب آگئی ہے - "غریب کا دل" افسانہ بھی سترھویں صدی کا لگا - دلیپ سنگھ کے "الجھنوں کو یوں بھی سلجھاتے ہیں ہم" میں آپ بیتی کا غلبہ زیادہ ہے اور مزاح کا پہلو کم نکل پایا ہے - اس بار کا شعری حصہ پسند آیا - مالک طالا کا مقالہ تحقیقی نوعیت کا ہے - پڑھ کر بہت ساری باتیں واضح ہوئیں - رام پرکاش کپور کا خط اہم اور معلوماتی ہے یہ حقیقت ہے کہ ہم نسلی لاشعور کے ورغلانے پر ہندو مسلم تہذیب کا رونا روتے ہیں - جب کہ اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ ہم آج اقتصادی تہذیب کے شکنجے میں جکڑے ہوئے ہیں - ہمارا ہر عمل و فعل اپنی معاشی صورت حال کو بہتر بنانے کی خود غرضانہ کوشش ہوا کرتی ہے -

سید احتشام الدین ، دربھنگہ

○ **آپ** کا اداریہ "احترام کس کا اشوک سنگھل ؟" زوردار ہے خوشی ہے کہ آپ قلم کے بارے میں مصالحت و منافقت کے قائل نہیں - فرقہ پرستی یا مساجد و معابد کو مسمار کرنا عام ہندوستانی جنتا کی خصوصیت نہیں ہے - صرف ایک طبقہ اس سلسلے میں بہت سرگرم عمل ہے - مجھے شکایت پڑھے لکھوں سے ہے کہ ان میں سے کوئی اٹھ کر اس فسطائیت کے خلاف کیوں نہیں آواز

بلند کرنا۔ یہ کام بنیادی طور پر ہندوؤں کے کرنے کا ہے۔ مسلمان اگر کچھ کہے تو اس پر فرقہ پرستی کا لیبل لگ سکتا ہے۔ اردو اور ہندی کے ہندو ادیبوں کی ذمہ داری بلکہ فرض ہے کہ ملک کے سیکولر کردار کو مسخ نہ ہونے دیں۔

جب نازی آتش خانوں میں یہودیوں کو زندہ جلایا جارہا تھا تو اس کے بارے میں ایک صاحب نے ڈپٹ کر سوال کیا کہ ان مظالم کے وقت خدا کہاں تھا۔" میں نے برجستہ اٹھ کر سوال کیا کہ جناب والا۔ مجھے خدا سے کوئی شکایت نہیں۔ میں تو یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ انسان کہاں تھا؟"

آج جب ملک کے طول و عرض میں ہندو مذہب کو فسطائیت کا روپ دینے کی کوشش کی جارہی ہے تو پھر ہم کو آپ کو یہ سوال اٹھانا ہے کہ ہندو کہاں ہیں۔ رام کی فرمانبرداری، لچھمن کی محبت و اخوت اور سیتا کی آبرو کے نام لیوا کہاں ہیں۔ کتنے ہندو ادیبوں نے اس پر کہانیاں اور نظمیں لکھیں؟ یہ سوال میں نے دہلی کے پریس کلب میں مارچ میں اٹھایا۔ صرف ایک صاحب ادوے رائن تیواری ایسے تھے جنہوں نے واقعی ندامت کا اظہار کیا اور فسطائیت کے خلاف کچھ کہا۔

قیصر تمکین، برطانیہ

○ **انشاء** جس پابندی سے اردو زبان و ادب اور ثقافت کی خدمت کررہا ہے اس کی ہمسری دوسرے جرائد کو کم ہی نصیب ہے، یہ سب تن تنہا آپ کی محنت اور لگن کی بدولت ہے۔ نومبر ۱۹۹۵ء کے انشاء میں جو اداریہ ہے "احترام کس کا اشوک سنگھل؟" اس کو سنہرے الفاظ میں لکھوا کر فریم کروایا جائے یا اس مضمون نما اداریہ کو نصاب میں شامل کردیا جائے تاکہ ہندوستان کا قانون جو سیکولر روایات پر مبنی ہے اس کا تحفظ ہوسکے۔ آپ نے گندی ذہنیت کے افراد کے وجدان پر کیا جھگو جھگو کر الفاظ کفش بارانی کی ہے۔ زندہ باد خدا حفاظت کند۔ مانک ٹالا صاحب کا مضمون "کیا سوز وطن ضبط ہوئی تھی؟" یادگار ہے اتنی چھان پھٹک کر پریم چند پر تحقیق کی ہے کہ آئندہ پریم چند جی پر کام کرنے والوں کے لیے انشاء کا یہ شمارہ راہنمائی کرتا رہے گا۔ اسی طرح ستمبر / اکتوبر کے شمارے میں عصر حاضر کے میر حضرت مجروح سلطانپوری کا خط ہم ایسے طلبا کے لیے ایک دوسری ضرب المثل ہے۔ مجروح صاحب جو اردو غزل کی آبرو بھی ہیں اور دانشور بھی۔ موصوف نے چند سطریں لکھ کر یہ بھی ثابت کردیا ہے کہ اگر وہ تحقیق و تنقید کے میدان میں آئیں تو۔ ع

بازیچہ اطفال ہے دنیا ان کے آگے

افسوس کہ ڈاکٹر نثار احمد فاروقی کی طویل ترین کاوشوں کو مجروح سلطانپوری صاحب کی ایک جنبش قلم نے رد کردیا اور عشاق میر گمراہی سے بچ گئے۔ آپ سے درخواست ہے کہ مجروح صاحب کا تازہ کلام بھی شائع فرمائیں۔ نسیم فر ندوی صاحب کا مضمون نہایت کارآمد اور معلوماتی ہے۔ پسند آیا۔ چند سال قبل محترم ڈاکٹر وحید اختر صاحب مسلم یونیورسٹی سے رخصت پر تین برس کے لیے تہران آئے تھے۔ التحید انگلش کے چیف اڈیٹر بن کر۔ شب و روز ان کا ساتھ رہتا تھا۔ وہ اقبال متین صاحب کی بہت تعریف کرتے تھے وہ ان کا ایک شعر اکثر پڑھا کرتے تھے۔

رات خواب میں ہم نے اپنی موت دیکھی تھی
کتنے رونے والوں میں تم نظر نہیں آئے

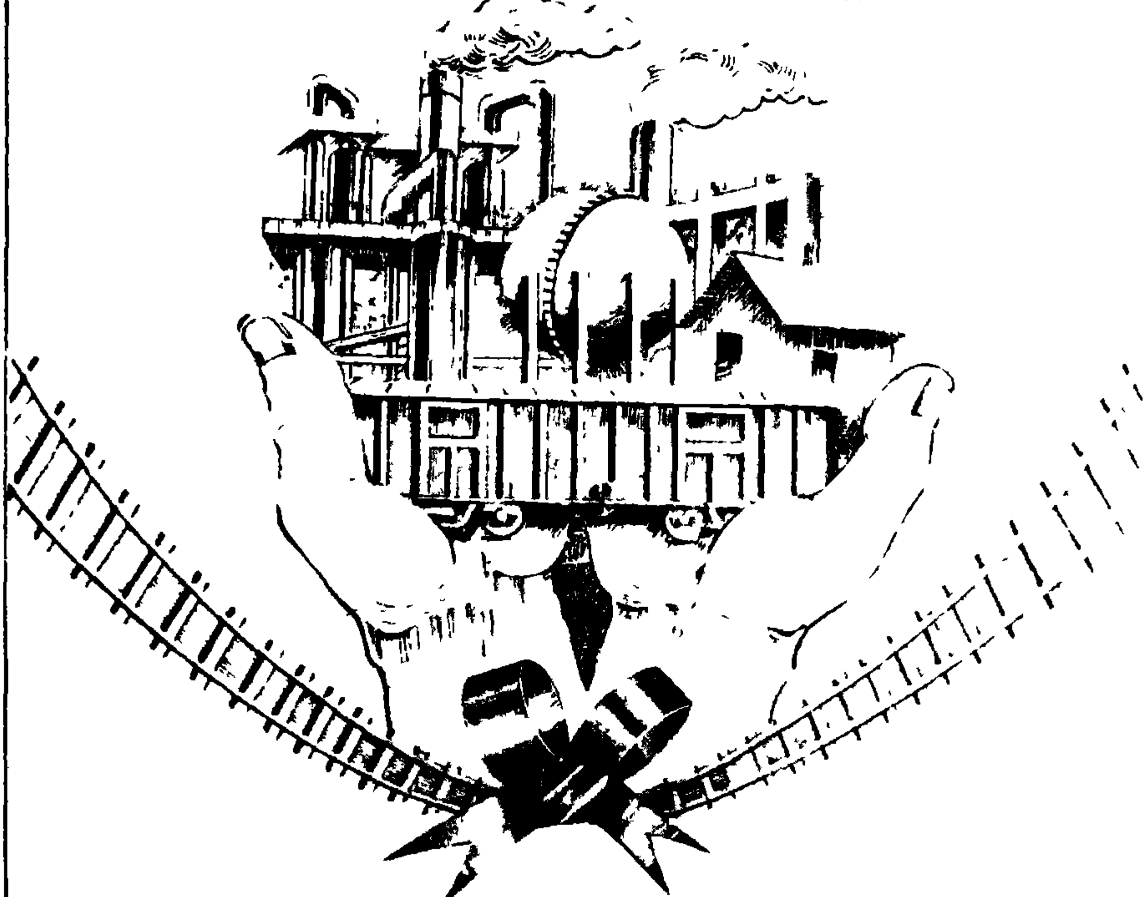
اب کے انشاء میں اقبال متین صاحب کی غزل اور بلند و تابناک ہے کیا قیامت کا [illegible] مطلع ہے۔

آدمی ہوتا ہوا بھی کوئی اوتار لگے
وہ گزر جائے جہاں سے وہیں بازار لگے

اس کے علاوہ ادم پرکاش راحت اختر ضیائی، ظفر گورکھپوری، ساجدہ زیدی وغیرہ کا کلام بھی بہت معیاری اور شگفتہ ہے۔

حیدر طباطبائی، لندن (برطانیہ)

ریل کے فیتوں سے معیشت کو ایک ساتھ تھامنا!



۶ صوبوں میں محیط ۷۱۶۰ روٹ کیلومیٹر کے پھیلاؤ اور یومیہ ۱۸۰۰۰ ویگن بوجھ کے ساتھ ساؤتھ ایسٹرن ریلوے نے علاقائی معیشت کی جیون ریکھا کو سنبھال رکھا ہے۔ پاور ہاؤسوں کو کوئلہ، لوہا کارخانوں کو خام مال پہنچانے کے علاوہ یہ لاتعداد بڑے، درمیانے اور چھوٹے کارخانوں کی ٹرانسپورٹ ضروریات کو بھی پورا کرتی ہے۔

اس کی پٹریوں پر روز و شب اوسطاً ۵۰۰ ریل گاڑیاں مسافروں اور سامانوں سمیت رواں ہوتی ہیں جو سرحدوں اور صوبوں کو پار کرتے ہوئے عوامی اتحاد کو مضبوط کرتی ہیں اور لوگوں اور ثقافتوں کو یکجا کر دیتی ہیں۔
ساؤتھ ایسٹرن ریلوے کی پٹریاں کے فیتے معیشت کو ایک ساتھ تھامے رہتے ہیں جبکہ ثقافتوں کی کثرت کو پروان چڑھنے کا موقع فراہم کرتے ہیں۔

S. E. RAILWAY

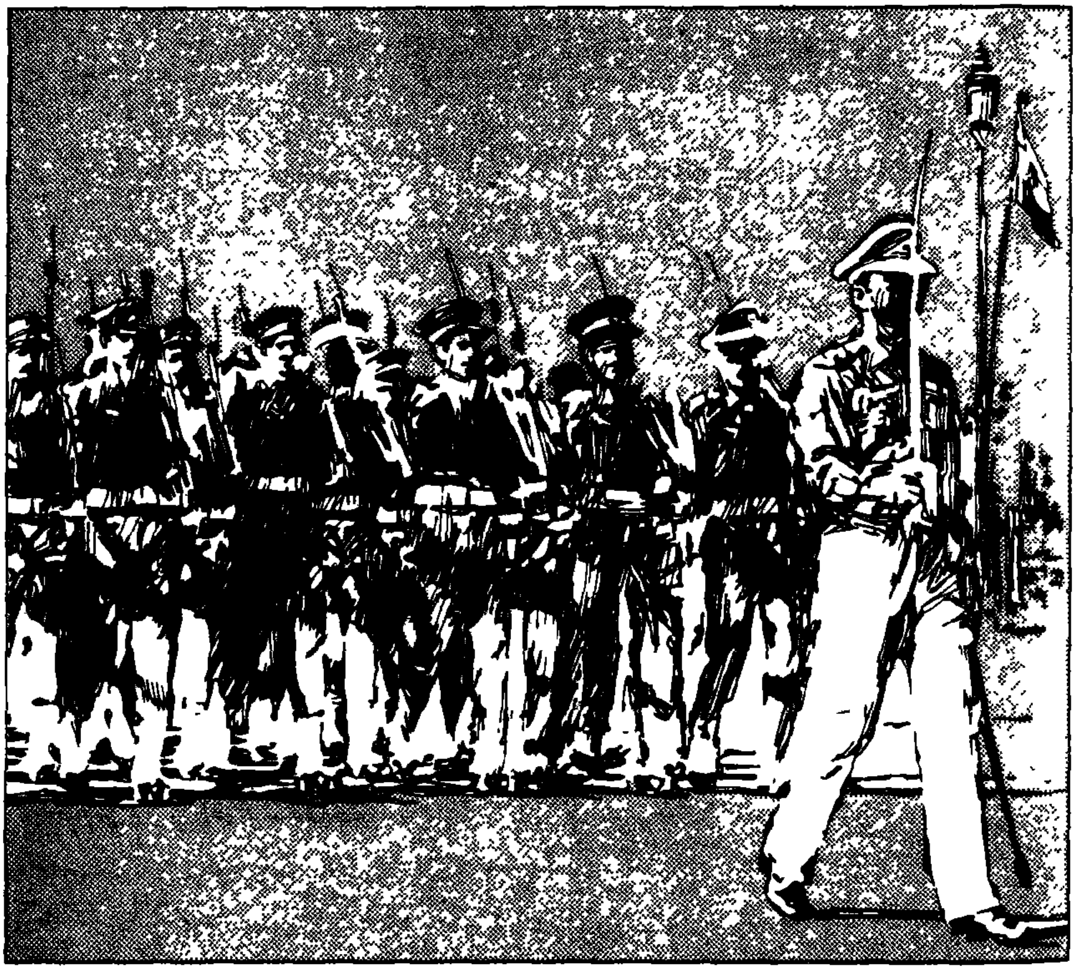
S.E. Railway

LEAS/SER/143-94 95



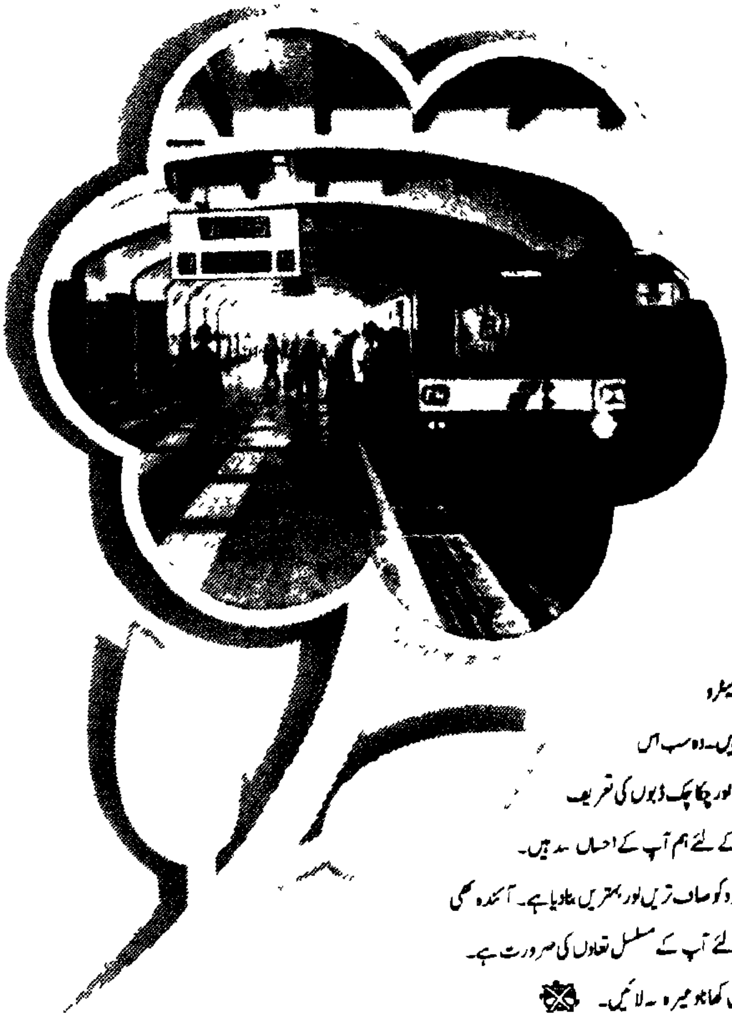
رمضان المبارک ...
موسم اور صحت ...
اِن سب کا تقاضا ہے کہ افطار کے وقت
پانی یا کسی بازاری شربت کے بجائے صرف رُوح افزا لیجیے
روزہ کی حالت میں جسم میں پانی اور شکر کی کمی اور گرمی میں پیاس کی شدت کے
سبب عام طور پر روزہ دار افطار کے وقت یک دم پانی پر ٹوٹ پڑتے ہیں
یا کوئی بازاری شربت پی لیتے ہیں، جو سراسر نقصان دہ ہے۔
رُوح افزا آپ کے جسم میں پانی اور شکر کی کمی کو فوراً پورا کرنے کا ملکہ رکھتا ہے۔ آپ کے بدن کو وہ تمام لازمی بنیادی عناصر اور قدرتی وٹامن بھی وافر مقدار میں بہم پہنچائے گا جو صحت و قوت کے قیام و بقا کے لیے ناگزیر ہیں۔
رُوح افزا بچوں اور بڑوں سب کا پسندیدہ شربت ہے۔ جو دوسرے فائدوں کے ساتھ ساتھ گرمی کی بہت سی تکالیف سے بھی بچاتا ہے۔
افطار کے وقت خاطر خواہ تسکین، تازگی اور توانائی کے لیے صرف رُوح افزا پیجیے۔ دوسرے شربتوں کے مقابلے میں کم خرچ ہوتا ہے اور سستا بھی ہے
افطار کے اہتمام میں
رُوح افزا کے
صحیح مقام کو نہ بھولیے!
شربت رُوح افزا
۸۵ سال سے زیادہ مدت کا
مشروبِ مشرق
ہمدرد شربت رُوح افزا
جڑی بوٹیوں، حیات بخش عناصر اور قدرتی وٹامنز کا نادر مرکب

قدم بہ قدم شانہ بشانہ ترقی کی ایک ہی منزل کی طرف



اب نہ رُکیں یہ قدم

یوم جمہوریہ، 26 جنوری 1996



يوم عيد سعيد پر

قارئين انشاء

كو دلي مباركباد

اور

نيك خواهشات

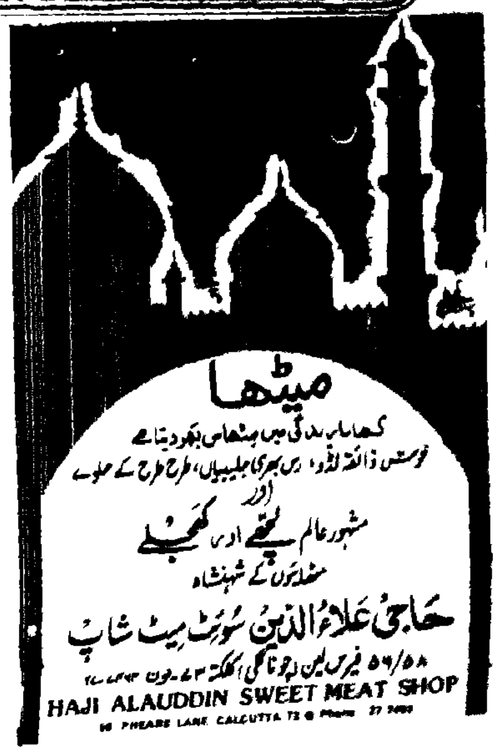
محمد ارشد جمال

۳، گرين پارك

كلكته-۱۹


Titas
FOOTWEAR
جدید فیشن کے
پائیدار جوتے
GLOBAL FOOTWEAR & LEATHER CRAFT INDUSTRIES
25, POLLOCK STREET, CALCUTTA 700 001 PHONE 25 1700, 26-0130


بنگال ٹریڈ ایجنسی
بیگ اور بریف کیس کے سامان کے ڈیلر
Bengal Trade Agency
۶/۲-کولوٹولہ اسٹریٹ، کلکتہ ۷۳۰۰۰

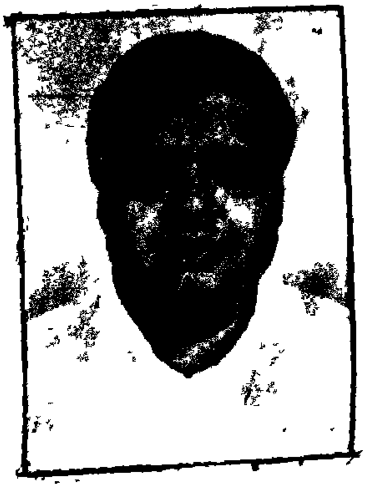

میٹھا
اور
مٹھائیوں کے شہنشاہ
حاجی علاءالدین سوئٹ میٹ شاپ
HAJI ALAUDDIN SWEET MEAT SHOP



ماہنامہ

اِنشاء

کی انتھک محنتوں اور
نتیجہ خیز کوششوں کے اعتراف
کے ساتھ
اہل اردو کو مبارکباد
پیش کرتا ہوں



اردو دوست : **راجیش کھیتان**

ممبر مغربی بنگال اسمبلی
کانگریس (آئی)

مشرقی ہندوستان کا بہترین اور واحد بین الاقوامی اردو رسالہ

ماہنامہ انشاء کلکتہ

جلد : ۱۱ | مارچ اپریل ۱۹۹۶ء | شمارہ : ۳-۴

انشاء پبلیکیشنز

IP

فہرست

منظومات : دویانند ۸-۹ / اعجاز تابش ۹ / خواجہ رضی حیدر / شجاع خاور / اختر ضیائی ۱۶ / ڈاکٹر سجاد سید / اوم کرشن راحت / رحمت امروہوی ۱۷ / عارف شفیق / ضیاء اللہ ضیاء ۲۴ / جمیل الرحمان جمیل / حسرت شاہ / گلشن کھنہ ۲۵ جمیل نظام آبادی / فروغ رودہوی / مہتاب پیکر اعظمی ۳۳

مدیر : ف ۔ س ۔ اعجاز

فی شمارہ : ۸ روپئے

زر سالانہ : ۹۰ روپئے

مغربی ممالک سے : ۱۲ پونڈیا ۲۰ امریکی ڈالر

رقومات بذریعہ منی آرڈر، بینک ڈرافٹ، چیک صرف "انشاء پبلی کیشنز" کے نام میں روانہ فرمائیں ورنہ قابل قبول نہ ہوں گی۔ برطانیہ سے BPO کے ذریعہ رقومات بھیجی جائیں۔

ماہنامہ انشاء انشاء پبلی کیشنز

خط و کتابت، مضامین بھیجے اور ترسیل زر کا پتہ :

۲۵ ۔ بی زکریا اسٹریٹ، کلکتہ ۷۰۰۰۷۳ ۔ فون : ۲۵-۳۶۱۶

کھیل اور وطن کی محبت

۱۳ مارچ ۹۶ء کو کلکتہ میں ولس ورلڈ کپ کرکٹ سیمی فائینل میں ہندوستانی ٹیم سری لنکا کی ٹیم سے ہار گئی۔ پیشتر ۹ مارچ ۹۶ء کو بنگلور میں ہندوستان اور پاکستان کے درمیان کوارٹر فائنل میچ ہوا جس میں ہندوستانی ٹیم کی جیت ہوئی تھی۔ ۱۳ سال کے بعد ہندوستان نے کرکٹ کے میدان میں پاکستان پر فتح پائی تھی۔ ہندوستانیوں نے جیت کا جشن منایا۔ کیونکہ ان کے وطن کا نام اونچا ہوا۔ ہندوستانی ٹیم کا کپتان ایک مسلمان محمد اظہرالدین ہے۔ ایک زمانے میں نواب منصور علی خاں پٹوڈی بھی ہندوستانی ٹیم کے کپتان رہ چکے ہیں۔ یہ ہندوستان کے سیکولرزم کا امتیازی وصف ہے۔ بابری مسجد کا انہدام سیکولرزم کے نام پر ایک بدنما داغ ہی سہی لیکن بعد کے عرصے میں کھیل کے سچے پرستاروں نے بازی اور تفریح کے میدانوں سے مذہبی بغض کو دور رکھنا چاہا۔ آر ایس ایس اور مہاراشٹر کی فرقہ پرست پارٹی شیو سینا کے چیف بال ٹھاکرے نے دھمکیاں دے رکھی تھیں کہ وہ بمبئی میں پاکستانی کرکٹ ٹیم کو کھیلنے نہیں دیں گے (جس طرح وہ کئی مہینوں سے پاکستانی آرٹسٹوں کو بمبئی میں پرفارم کرنے نہیں دے رہے ہیں۔ یہ رویہ قابل مذمت ہے۔ پھر بھی بال ٹھاکرے کی دھمکیاں غیر مہاراشٹریوں کے کانوں پر سے گزر گئیں۔ ہندوستان کے لاکھوں کروڑوں عوام ایسے ہیں جو سیاسی طور پر الگ الگ نظریے کے حامی ہیں اور الگ الگ خانوں میں بٹے ہوئے ہیں لیکن کھیل کی دنیا میں ان میں اختلاف نہیں ہوتا۔ میدان میں کھیل کی اسپرٹ میں لوگ اپنی اپنی پسند کا اظہار کرتے ہیں۔ ٹیموں کی مرحلہ وار پرفارمنس کے رد عمل میں تماشائیوں کے اندازے اور ٹیموں تئیں ان کی پسند اور ستائش کے مدارج بدلتے رہتے ہیں۔ کھلاڑیوں اور پرستاروں کے مابین فتح کا عزم ایک انوکھے جذبے کا جنم داتا ثابت ہوتا ہے جو ان کے دلوں کو جوش و نشاط کی انوکھی کیفیت سے معمور کر دیتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ بال ٹھاکرے جس کا دل حال میں کھلی جراحت کے عمل (Open heart surgery) سے گزر چکا ہے تفرقوں میں بٹی قوم کو لہولہان کر کے بھی کھیل کے رسیاؤں کو ولولہ اور ترنگ کی یک رنگی سے محروم نہ کر سکا۔ کھیل میں دونوں طرف کے کھلاڑیوں اور تماشائیوں کو ہار جیت قبول کرنا ہی پڑتی ہے۔ گرچہ جیت میں حب وطن کی آسودگی کا جذبہ بھی کارفرما ہوتا ہے۔ یوں تو ہاری کے میدان میں رشک و رقابت بھی اپنی ستائش (بلکہ کافی حد تک تائید) چاہتے ہیں اور نئے سیاسی حالات شیدائیوں کی چاہت پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ ہندی مسلمانوں پر ایک دور گزرا ہے جب انہوں نے ستائش پاکستان کے الزامات سے اور بدنامی مول لی۔ لیکن مزید رسوائی مول لینے کے اسباب اب ختم ہو چکے ہیں۔ کھیل سے الگ ایک ہندوستانی ہندوستانی ہے اور پاکستانی پاکستانی۔ کھیل کا میدان الگ ہے اور سیاست کا الگ۔ ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے پاکستان کوئی ارض جنت نشان نہیں ہے جہاں ہندوستان سے جا کر بسے لوگ اب بہت ناخوش ہیں اور کراچی کی زمین جن کے خون سے لال ہو رہی ہے۔ شکر ہے کہ ہندوستان اور پاکستان کے شہریاروں کے مدبرانہ تناؤ اور کشیدگی کے نتیجے میں دونوں جانب کے عوام کا رویہ بدلتا جا رہا ہے۔ جو ایک اپنائیت کا مخصوص بھرم سا تھا وہ دھیرے دھیرے ٹوٹ رہا ہے۔ اگرچہ پورا منظر نامہ نہیں بدل گیا ہے لیکن دونوں طرف کے عوام میں محبت اور خیر خواہی میں محفوظ فاصلہ رکھنے کی حکمت عملی رائج ہونے لگی ہے۔ گو کہ یہ صورتِ حال ابھی پیچیدہ ضرور ہے۔

ہندوستان میں مسلمانوں میں بھی بعض عناصر ایسے ہیں جو بزعم خود بال ٹھاکرے کی ضد ہیں لیکن اسی کے مددگار بنے ہوئے ہیں۔ افسوس کا مقام ہے کہ اخباری دنیا کے سنجیدہ اور متین لوگ بھی کبھی کبھی وقت کی نزاکت کو بھانپے بغیر ایسی باتیں لکھ جاتے ہیں جو بہتوں کی دل آزاری کا سبب بنتی ہیں اور جس سے فساد خلق کا اندیشہ ہوتا ہے۔ ۹ مارچ ۹۶ء بنگلور میں ولس ورلڈ کپ کے کوارٹر فائنل میں ہندوستان اور پاکستان کی ٹیموں میں زور آزمائی کا دن تھا۔ اس دن ایک مشہور اردو روزنامے نے صفحہ اول پر بھڑک دار سرخی کے تحت ایک مواد شائع کیا جسے خبر، رپورٹ اور مکتوب کا ملغوبہ کہنا غلط نہ ہوگا۔ خبر کا ذریعہ کرکٹ کے ایک ہندوستانی شیدائی کو بتایا گیا جسکی پیدائش مئوناتھ بھنجن کے ایک مذہبی گھرانے میں

ہوئی۔ خبر کی سرخی تھی:

میں بہ آواز بلند دعا کرتا ہوں کہ
آج کوارٹر فائنل میں پاکستان جیت جائے اور ہندوستان کو شکست ہو
- خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے پھر بھی پاکستان زندہ باد، ایڈوانی اور ٹھاکرے سن لیں

صاحب یہ تو ہم سے نہیں سنی جاتی تو لال کرشن ایڈوانی اور بال ٹھاکرے کا ضبط کیوں آزماتے ہو۔ ساری تحریر کسی دماغی خلل کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے۔ راقم نے حب الوطنی کو ایمان کا جز قرار دیا ہے اور لکھا ہے "ایڈوانی اور بال ٹھاکرے جیسے سانپ بچھو کرکٹ کے کھیل میں پاکستان کے حوالے سے ہندوستانی مسلمانوں کی حب الوطنی پر انگلیاں اٹھاتے ہیں تو مجھے لگتا ہے کہ کسی نے ہندوستانیت کو گالی دی ہے اور میرا جی چاہتا ہے کہ ان سانپ بچھوؤں کو اذیت پہنچانے کے لئے میں پاکستان زندہ باد کا نعرہ بلند کروں اور بہ آواز بلند یہ دعا کروں کہ آج بنگلور کے کوارٹر فائنل میچ میں پاکستان جیت جائے"۔

بادی النظر میں یہ کسی مظلوم اور پیا آدمی کے دل کی آہ معلوم ہوتی ہے۔ خبر نویس نے ظاہر کیا ہے کہ اس کا خاندان علماء، حفاظ اور حجاج کا خاندان ہے اور حب الوطنی اس خاندان کے تمام افراد کی گھٹی میں پڑی ہے اور یہ خاندان شیخ الاسلام مولانا سید حسین " احمد مدنی "، امام الہند ابوالکلام آزاد اور محدث عصر مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی " کے معتقدین کا خاندان رہا ہے۔ خبر نگار نے اپنی واحد شناخت یہ بیان کی ہے کہ وہ پنڈت جواہر لال نہرو کے قریبی دوست مولانا حبیب الرحمٰن " اعظمی کا انتہائی قریبی رشتہ دار ہے۔

کرکٹ کا ایک ہندوستانی شیدائی اپنا شجرۂ عالی نسب تو بیان کر گیا لیکن اس میں اتنی اخلاقی جرأت نہ ہوئی کہ اپنا نام بھی ظاہر کرتا۔ اگر کھیل کی اسپرٹ میں تبصرہ کرنا مقصود ہوتا تو یہ کوسنے اور جلاپے ان کے منہ سے ادا نہ ہوتے۔ بلکہ وہ کرکٹ کے ایک جوشیلے شیدائی ہوتے تو اپنی رائے کے ساتھ اپنی شناخت بھی بیان کر دیتے۔ اور پھر ایک کھرے دینی اخلاق کے مالک کو کون سی مصلحت اپنا نام چھپانے پر مجبور کر سکتی ہے۔ حب الوطنی، حب الوطنی ؟ کون سی حب الوطنی۔ کیا ایک کافر کے دل میں اس کے وطن کی محبت نہیں ہوتی۔ ایڈوانی اور بال ٹھاکرے جب کچھ کہتے ہیں تو وہ اپنی آواز، اپنے چہرے اور اپنے نام پوشیدہ نہیں رکھتے اس کے برعکس ہم نے شناخت کا یہ اسلوب تیار کیا ہے کہ اپنا نام "کرکٹ کا ایک ہندوستانی شیدائی" بتا کر متوناتھ بھنجن کے ایک کنویں میں بیٹھے کبھی کبھی مینڈک کی آوازیں پیدا کرتے رہتے ہیں اور وہیں سے ایڈوانی اور ٹھاکرے کو اپنا ملاوٹی نظریہ ترنم سے سناتے ہیں کہ خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے، پھر بھی پاکستان زندہ باد۔ یہ نظریۂ حب الوطنی صحت مند نہیں ہے۔ اس سے گراہی اور جگ ہنسائی کے سوا کیا حاصل ہوگا۔ بات دراصل بقول حضرت جوشؔ وہی ہے کہ - "گھٹی میں پڑی اپنی وہی برہمنی ہے"

کوارٹر فائنل میں انڈیا کی جیت ہوئی۔ ہندوستانی ٹیم کا کپتان محمد اظہر الدّین نامی ایک مسلمان ہے۔ "کرکٹ کے ایک ہندوستانی شیدائی" کی طرح اظہر الدّین بھی ایک دیندار گھرانے کا فرزند بتلایا جاتا ہے جو صوم وصلوٰۃ کا پابند ہے۔ لیکن کرکٹ کے اس مسلمان شیدائی کے لئے یہ بات ذرا بھی باعث تسکین نہیں۔ شاید وہ اظہر الدّین کی حب الوطنی کو بناسپتی سمجھتا ہے۔ اسپورٹ کا صحیح نشہ تو اسوقت دیکھنے لائق ہوتا ہے جب میدان میں گھریلو ٹیم نہ ہو۔ گھریلو ٹیم میدان میں اتری ہوئی ہو تو وطن پرستی ایک لازمی فیکٹر بن جاتی ہے۔ پھر بھی حب الوطنی کسی کو سکھائی نہیں جاتی۔ فوجی تربیت بھی حب الوطنی نہیں سکھا سکتی۔ ڈسپلن اور شائستگی ضرور سکھاتی ہے۔ وطن کی محبت تو از خود کسی کے دل میں موج زن ہوتی ہے۔ خبروں کے ذریعہ نفرت کا پرچار کرنا اچھی بات نہیں۔ بھٹکے ہوئے لوگ راہ راست پر آ بھی جاتے ہیں۔ سکھانے کا طریقہ موثر ہونا چاہئے۔ کرکٹ کے جس خاص ہندوستانی شیدائی کو پاکستان کے انڈیا سے ہار جانے کا غم ہے اسے کلکتہ میں سیمی فائنل میں سری لنکا سے انڈیا کے ہار جانے کی بڑی خوشی ہوئی ہوگی؟ خدا ایسوں کو عقل سلیم نہ دے تو دوسروں کو راہِ راست پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

اختر الایمان

اختر الایمان کا انتقال ہو گیا۔ ایک اور بڑا شاعر دنیا سے اٹھ گیا۔ ہم پھر سوگ میں ڈوب گئے۔

نظم گو شعراء میں اختر الایمان ایک منفرد نام تھا۔ ہے اور رہے گا بھی۔ انھیں اپنی شاعری کے لئے کئی انعامات حاصل ہو چکے تھے۔ سب سے بڑا انعام ۱۹۶۲ء میں ساہتیہ اکادمی کی جانب سے ان کے مجموعۂ منظومات "یادیں" پر ملا تھا۔ فلموں میں معیاری مکالموں اور اسکرپٹ نگاری کے لئے بھی کئی انعامات انھیں حاصل ہو چکے تھے۔ بی آر چوپڑا اور یش چوپڑا کی کئی فلموں کی کامیابی میں اختر الایمان کی مکالمہ نگاری کا بھی بڑا حصہ رہا ہے۔ یوں تو انہوں نے اور بھی بہت سے پروڈیوسروں کے لئے کام کیا لیکن بی آر فلمز کے اسٹوری ڈپارٹمنٹ سے انکی وابستگی کئی سال رہی۔ مدراس کی کئی ہندی فلموں میں بھی ان کے مکالمے اور اسکرپٹ کافی جاندار ہے۔ جنوب میں بننے والی فلم "آدمی" کے مکالمے خصوصاً بہت پسند کئے گئے جن میں ایک آدمی (دلیپ کمار) کی پیچیدہ نفسیات کی گرہیں اور تہیں ناظر کے سامنے آتی ہیں۔ "آدمی" کے مرکزی مکالموں پر اختر الایمان کا علامیہ شعری مزاج غالب تھا۔

اختر الایمان بنیادی طور پر شاعر تھے۔ ابتدا میں انہوں کچھ افسانے بھی لکھے، غزلیں بھی کہیں۔ لیکن اپنے افسانوں اور غزلوں سے مطمئن نہیں ہوئے۔ ان کی طبیعت نظم پر آگئی۔ چنانچہ نظم گوئی میں ان کا ایک الگ تھلگ مقام بن گیا۔ انہوں نے محض کچھ کہنے کے لئے کبھی کچھ نہیں کہا۔ ان کی نظموں کے محرکات قابل مطالعہ چیز ہوتے ہیں۔ اسلوب، بحور و اوزان، مصرعوں کا ایک مخصوص توڑ اور جوڑ، رموز و اوقاف کا منفرد استعمال ان کی نظموں کی ہیئت کو غیر رسمی شکل دے دیتا ہے۔ ساختیاتی اعتبار سے ان کی پابند اور آزاد نظمیں مصرعوں اور سطروں پر مشتمل فکری، حسی اور جذباتی نظموں کا ایک ایسا متن (TEXT) پیش کرتی ہیں جو نثر میں یا سیلولائڈ پر زیادہ صراحت کے ساتھ پیش کئے جانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ فلم کا میڈیم ادب کے میڈیم سے الگ ہے لیکن ادب کا میڈیم فلم کے میڈیا سے پرانا ہے اور فلم کے میڈیا کا جنم داتا بھی ہے۔ اگرچہ مکالمے جو فلموں میں دہرائے جاتے ہیں انکی کامیابی اور ہنر کا انحصار کئی دیگر عوامل پر ہوتا ہے جو ادبی نہیں ہوتے۔ شاعری کا بیشتر حصہ اسٹیج پر فنتاسی کے روپ میں پیش کیا جاسکتا ہے لیکن شاعری میں پیش کی گئی زندگی کو اسٹیج فنتاسی میں بلا کم و کاست دہرانا مشکل ہے۔ اس میں پروڈیوسر کا سرمایہ ڈوب جانے کا خطرہ بھی لاحق ہوتا ہے چونکہ شاعری میں زندگی کے محدود رخ اور فضائیں ہی اجاگر ہوتی ہیں۔ سنیل دت نے ایک دن ایکٹ فلم "یادیں" بنائی تھی۔ یہ ایک خطرناک تجربہ تھا۔ پوری فلم میں ایک ہی شخص یا ایک ہی کردار تھا جو اپنی یادوں کی آوازوں اور سرگوشیوں میں گھرا ہوا تھا۔ "یادیں" کا اسکرین پلے اختر الایمان نے تحریر کیا تھا۔ ظاہر ہے اس کے ذریعہ انہوں نے اپنے اندر کے انسان کو بھی پیش ضرور کیا جو فی الاصل ایک شاعر ہے اور شاعر کا سانس و لہجہ رکھتا ہے۔ یہ حوالہ دینا اس لئے ضروری ہوا کہ فلموں سے وابستہ سبھی اردو شاعر فلمی نغمہ نگاری سے پوری نہ سہی تو آدھی ہی تسکین حاصل ضرور کر لیتے ہیں۔ ان میں کلاسیکی اور جدید کے نام اہم ہیں۔ اختر الایمان واحد شاعر تھے جنہوں نے فلموں میں مکالمے اور اسکرپٹ لکھے لیکن گیت نہیں لکھے۔ ظاہر ہے فلمی کام کے ذریعہ ادبی تسکین تو وہ بھی حاصل کرتے ہی تھے۔ ابھی جو ہم نے عرض کیا کہ ساختیاتی اعتبار سے ان کی پابند اور آزاد نظمیں مصرعوں اور سطروں پر مشتمل ایک ایسا متن (TEXT) پیش کرتی ہیں جو نثر یا سیلولائڈ پر زیادہ صراحت کے ساتھ منتقل ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ یہ ذکر اسی سلسلے میں تھا۔ ہم پھر اختر الایمان کی شاعری کی طرف آتے ہیں۔

ان کی شاعری میں سے چند زیادہ اہم نظموں کو چن لیجئے ان کا دو تین بار مطالعہ کیجئے۔ نظم کی ابتدا اور کلائمکس ایک تقلیبین سازی کے عمل کا نمونہ دکھائی دیتے ہیں۔ درمیان میں تفہیم کی پرورش ہوتی ہے اور لفظوں کا انتخاب نظم کے معنیاتی نظام کو ایک خاص صوتی آہنگ سے آشنا کرتا

چلا جاتا ہے۔ اخترالایمان کے تجربات اور ما فی الضمیر نے اردو نظموں میں جس لہجے کی تعمیر کی ہے وہ وقت اور زندگی کے عمومی یا عارضی کے اسار چڑھاؤ سے الگ ہے۔ کیونکہ وہ ان اشکال سے زیادہ متاثر ہوئے ہیں جن کا اثر دوسرے کم لیتے ہیں۔ وقت ایک گزراں چیز ہے، اس کا گریزاں پہلو شعور کے مشاہدے میں رہتا ہے۔ اخترالایمان کی نظموں میں وقت مختلف استعاروں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ جو کچھ واحد متکلم کے منہ سے بیان ہو رہا ہے اس کی دو شکلیں ہیں۔ ایک تو وہ جو بیان کر رہا ہے یعنی "صاحب گفتار" اس شخص کا اپنا موجودہ کردار اس میں شامل ہے۔ دوسرا اسی شخص کی ذات کا دبا یا بھولا ہوا حصہ جسے وہ اپنے ماضی اور یادوں کے ملبے سے نکال کر بیان کر رہا ہے اور لمحات موجودہ کی کھونٹیوں پر اسے شامیانے یا خیمے کی طرح پھیلاتا کستا چلا جا رہا ہے جبکہ بچا ہوا عرصہ فضا میں تحلیل اور معدوم ہو چکا ہے۔ اب نظم کو پر افتاد بیان آن پڑی ہے تو وہ اس "آپ بیتی" میں خود اپنے چہرے سے کہیں کہیں لاتعلق سا ہو جاتا ہے۔ ایک فلیش بیک یا خود کو دہرانے کا عمل شاعری کی سطح پر نمودار ہونے لگتا ہے۔ یہ شاہد و مشہود کے یکجا بلکہ ایک ہونے کی صورت ہے۔ کسی واردات کے پس منظر اور پیش منظر میں انسانی رویوں کے ضمیری احتساب، یادداشت اور فروگزاشت کے فطری اسباب و نتائج کے حوالے سے اخترالایمان کی شاعری کا مطالعہ دلچسپ معلوم ہوتا ہے۔

اخترالایمان کی شاعری کو ان کے بعض ہمعصروں نے جنہیں فلمی نغمہ نگاری راس آگئی، اچھی نظروں سے نہیں دیکھا۔ ابتدائی برسوں میں اخترالایمان کا نام ن۔ م۔ راشد اور میراجی کے کارواں میں شمار کیا جاتا تھا۔ میراجی اور اخترالایمان کا تو کافی ساتھ بھی رہا ہے۔ میراجی کی شاعری کو "داغ دھبوں" کی شاعری کہہ کر بدنام بھی کیا جاتا رہا ہے۔ تنقید تخلیق کی سطح پر نہیں ہوتی تو ایسی برائیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ لیکن ادب کے پارکھ ان باتوں کے پیچھے جو ذہنیت کارفرما ہوتی ہے اسے خوب جانتے اور سمجھتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ ایسے لوگ نام نہاد ترقی پسندی کی قبر کے کتبے سے لپٹ کر رو گزگزا رہے ہیں ورنہ داغ دھبوں کی شاعری تو میر نے بھی کی ہے۔ البتہ مقلدین میر نے میر کی نقل میں بیشتر ٹھوکر کھائی ہے۔ صاف ظاہر ہے انہوں نے شاعری کو سب کچھ سمجھا اخترالایمان کی طرح اپنا مذہب نہیں سمجھا۔ چنانچہ ان کی فکر اور اظہار میں وہ سنجیدہ زاویے نظر نہیں آتے جو اخترالایمان کی منظومات میں دکھائی پڑتے ہیں۔

اخترالایمان کا نام جدیدیت اور ترقی پسندی کی کشمکش کے نکتۂ نظر سے اور اس اعتبار سے کہ انہوں نے اپنی شاعری کو بجا طور پر احساس کی شاعری قرار دیا ہے لوگ مدتوں بھول نہیں پائیں گے۔ تنقید ابہام کے پیچھے لگی رہے یہ اچھا ہے تنقید کا مبہم ہونا اچھا نہیں ہے۔

تجدید ممبری

ملک میں اور بیرون ملک جن ممبروں پر سابقہ عرصہ کی رکنیت فیس باقی ہے ان سے گزارش ہے کہ وہ بلاتاخیر ممبری چندہ بذریعہ منی آرڈر، بینک ڈرافٹ، برطانوی پوسٹل آرڈر بنام " انشاء پبلی کیشنز"، روانہ کردیں۔ اور آئندہ ۱۲ ارعام شماروں کیلئے بھی زرسالانہ بھیج دیں۔ ——— انشاء

حضور اکرم کی کامل زندگی کا بہترین نمونہ

تحریر خورشید احمد

کوئی زندگی خواہ کسی قدر تاریخی ہو جب تک وہ کامل نہ ہو ہمارے لئے نمونہ نہیں بن سکتی۔ کسی زندگی کا کامل اور ہر نقص سے بری ہونا اس وقت تک ثابت نہیں ہو سکتا جب تک اس زندگی کے تمام اجزا ہمارے سامنے نہ آئیں۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا ہر لمحہ پیدائش سے لے کر وفات تک ان کے زمانے کے لوگوں کے سامنے اور ان کی وفات کے بعد تاریخ عالم کے سامنے ہے۔ ان کی زندگی کا کوئی مختصر سے مختصر زمانہ بھی ایسا نہیں گزرا جب وہ اپنے اہل وطن کی آنکھوں سے اوجھل ہو کر آئندہ کی تیاری میں مصروف ہوں۔

پیدائش، شیر خوارگی، بچپن، ہوش و تمیز، جوانی، تجارت، آمد و رفت، شادی، احباب، قبل نبوت، قریش کی لڑائی اور قریش کے معاہدے میں شرکت، امین بننا، خانہ کعبہ میں پتھر نصب کرنا، رفتہ رفتہ تنہائی پسندی، غار حرا کی گوشہ نشینی، وحی، اسلام کا ظہور، دعوت، تبلیغ، مخالفت، سفر طائف معراج، ہجرت، غزوات، حدیبیہ کی صلح، دعوت اسلام کے نامہ و پیام، اسلام کی اشاعت، تکمیل دین، حجۃ الوداع، وفات، ان میں سے کون سا زمانہ ہے جو انسانوں کی نگاہوں کے سامنے نہیں اور آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی کون سی حالت ہے جس سے اہل تاریخ ناواقف ہیں۔ اٹھنا بیٹھنا، سونا جاگنا، شادی بیاہ، بال بچے، دوست احباب، نماز روزہ، دن رات کی عبادت، صلح و جنگ، سفر و حضر، نہانا دھونا، کھانا پینا، ہنسنا رونا، پہننا اوڑھنا، چلنا پھرنا، ہنسی مذاق، بول چال، خلوت جلوت، ملنا جلنا، طور طریق، رنگ و بو، خد و خال، قد و قامت، یہاں تک کہ میاں بیوی کے خانگی تعلقات اور نجی معاملات بھی پوری روشنی میں مذکور، معلوم اور محفوظ ہیں۔

بڑے سے بڑا آدمی بھی اپنے گھر میں معمولی آدمی ہوتا ہے۔ اسی لئے والٹیر نے کہا تھا کہ کوئی شخص اپنے گھر میں ہیرو نہیں بن سکتا۔ لیکن باسورتھ اسمتھ کی رائے میں کم از کم یہ اصول پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق صحیح نہیں۔ گبن نے لکھا ہے کہ "تمام پیغمبروں میں سے کسی نے اپنے پیروؤں کا اس قدر سخت امتحان نہیں لیا جس قدر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے انہوں نے دفعتاً اپنے کو سب سے پہلے ان لوگوں کے سامنے بہ حیثیت پیغمبر کے پیش کیا جو ان کو بہ حیثیت انسان کے بہت اچھی طرح جانتے تھے۔ اپنی بیوی، اپنے غلام، اپنے بھائی، اپنے سب سے واقف کار دوست کے سامنے اور ان سب نے بلا پس و پیش آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے دعوے کی صداقت کو تسلیم کر لیا"۔ بیوی سے بڑھ کر انسان کی اندرونی کمزوریوں کا واقف کار کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا مگر کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت پر سب سے پہلے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) ہی کی بیوی ایمان لائیں جو نبوت سے پہلے پندرہ برس تک آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی رفاقت میں رہ چکی تھیں۔ اور آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ہر حال اور ہر کیفیت کی نسبت ذاتی واقفیت رکھتی تھیں۔ بایں ہمہ جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پیغمبری کا دعویٰ کیا تو سب سے پہلے انہوں نے ان کی سچائی کو تسلیم کیا۔

بڑے سے بڑا انسان جو ایک ہی بیوی کا شوہر ہو وہ بھی ہمت نہیں کر سکتا کہ وہ اس کو یہ اذن عام دے کہ تم میری ہر بات، ہر حالت اور ہر واقعے کو برملا کہہ دو اور جو کچھ چھپا ہے سب پر ظاہر کر دو۔ مگر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام ازواج مطہرات میں سے ہر ایک کو یہ اذن عام تھا کہ خلوت میں آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے جو کچھ دیکھیں وہ جلوت میں سب سے برملا بیان کر دیں، جو رات کی تاریکی میں دیکھیں وہ دن کی روشنی میں ظاہر کر دیں۔ جو بند کوٹھریوں میں دیکھیں اس کو کھلی چھتوں پر پکار کر کہہ دیں۔ اس اخلاق، وثوق و اعتماد کی مثال اور کہاں مل سکتی ہے؟

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جلوت میں ہوں یا خلوت میں، مسجد میں ہوں یا میدان جہاد میں، نماز شبانہ میں مصروف ہوں یا فوجوں کی درستی میں، منبر پر ہوں یا گوشہ تنہائی میں، ہر وقت اور ہر شخص کو حکم تھا کہ جو کچھ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی حالت اور کیفیت ہو وہ سب منظر عام پر لائی

جائے ۔ ایک طرف ازواج مطہرات آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے خلوت خانوں کے حالات سنانے اور بتانے میں معروف رہیں اور دوسری طرف اصحاب صفہ معتقد جاسوسوں کی طرح شب و روز ذوق و شوق کے ساتھ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے حالات دیکھنے اور دوسروں سے ان کو بیان کرنے یں معروف رہتے تھے ۔ مدینے میں رہنے والی آبادی دس برس تک مستقل آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ایک ایک حرکت و سکون اور ایک ایک جنبش کو دیکھتی رہی ۔ غزوات اور لڑائیوں کے موقع پر ہزارہا صحابہ کو شب و روز آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو دیکھنے اور آپ کے حالات مبارکہ سے واقف ہونے کا موقع ملتا تھا ۔ اب آپ سمجھ سکتے ہیں کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زندگی کا کون سا پہلو ہوگا جو زیر پردہ رہا ہوگا اور اس پر بھی ایک شخص تک کو بلکہ بڑے سے بڑے دشمن اور مخالف کو پوری چھان بین اور تلاش و جستجو کے بعد بھی آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) پر حرف گیری کا کوئی موقع نہ مل سکا۔

ایک حیثیت سے اور غور فرمایئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ صرف اپنے معتقدوں ہی کے حلقے میں نہیں رہے بلکہ مکے میں قریش کے مجمع یں رہے ۔ نبوت سے پہلے ۴۰ برس آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زندگی انہیں کے ساتھ گزری اور پھر تاجرانہ زندگی، لین دین کی زندگی، معاملہ اور اروبار کی زندگی جس میں قدم قدم پر بد معاملگی، بدنیتی، خلاف وعدگی اور خیانت کاری کے عمیق غار تھے ۔ مگر آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) اس طرح بے خطر اس راستے سے گزر گئے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ان سے امین کا خطاب حاصل ہوا ۔ نبوت کے بعد بھی لوگوں کو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) پر ۔اعتماد تھا کہ اپنی امانتیں آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) ہی کے پاس رکھواتے تھے ۔ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے دعوائے نبوت پر تمام قریش نے برہمی اہر کی، مقاطعہ کیا، دشمنیاں ظاہر کیں، آپ کو ساحر و مجنون کہا مگر کسی نے یہ جرأت نہ کی کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اخلاق و اعمال کے خلاف یک حرف بھی زبان سے نکال سکے ۔ حالانکہ نبوت اور پیغمبری کے دعوے ہی کے یہ معنی ہیں کہ مدعی اپنی بے گناہی اور معصومیت کا دعویٰ کر رہا ہے ۔ س دعوے کے ابطال کے لئے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اخلاق و اعمال کے متعلق چند مخالفانہ شہادتیں بھی کافی تھیں، تاہم اس دعوے کے توڑنے کے لئے انہوں نے اپنی دولت لگائی، اپنی اولاد کو قربان کیا، اپنی جانیں دیں لیکن یہ ممکن نہ ہوا کہ وہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ذات پر معمولی خردہ یری کر کے بھی اس کو باطل کر سکیں ۔ کیا اس سے نہیں ثابت ہوتا کہ جو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) دوستوں کی نظر میں تھے وہی دشمنوں کی نگاہ میں بھی تھے اور کوئی چیز زیر پردہ اور نامعلوم نہ تھی ۔

پھر ایک بات پر اور غور فرمایئے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر جو لوگ ابتدا میں ایمان لائے وہ ماہی گیر نہ تھے اور وہ مصر کے محکوم اور لام قوم کے افراد نہ تھے بلکہ ایک ایسی آزاد قوم کے افراد تھے جو اپنے جذبہ حریت کے لحاظ سے ممتاز تھی ۔ اور جس نے ابتدائے آفرینش سے آج تک کبھی کی کی اطاعت نہیں کی تھی ۔ جن کے تجارتی کاروبار دور دور تک پھیلے ہوئے تھے اور جو اسلام پر ایمان لانے کے بعد ساری عظمتوں اور رفعتوں کے الک بن گئے ۔ کیا ایک لمحے کے لئے بھی کوئی یہ تصور کر سکتا ہے کہ ایسے پر زور، قوی بازو اور دانایان روزگار سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا ائی گوشہ چھپا رہ سکتا تھا اور وہ دھوکا کھا سکتے تھے ؟ بلکہ یہی وہ لوگ تھے جنہوں نے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ایک ایک جنبش کی نقل کی ہے اور جو پ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ایک ایک نقش قدم پر چلنا اپنی سعادت سمجھتے تھے ۔ یہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی کاملیت کی ناقابل تردید دلیل ہے ۔

اسلام کی نگاہ میں آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی حیات ایک مسلمان کے لئے کامل نمونہ ہے ۔ لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ ۔ لا لئے اس نمونے کے تمام پہلو سب کے سامنے ہونے چاہئیں اور وہ سب کے سب سامنے ہیں ۔ اس سے ثابت ہوگا کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ندگی کے سلسلہ کی کوئی کڑی گم نہیں ہے، کوئی واقعہ زیر پردہ نہیں ہے، جو کچھ ہے وہ تاریخ کے صفحات میں آئینہ ہے اور یہی ایک ذریعہ کسی زندگی کے کامل، معصوم اور بے گناہ یقین کرنے کا ہے ۔ نیز ایسی ہی زندگی، جس کے ہر پہلو اس طرح روشن ہوں، انسان کے لئے نمونے کا کام دے سکتی ہے ۔

محمد ﷺ

وِدیانندجی نے پیغمبر اسلام حضرت محمدؐ کی مکمل سوانح حیات اور قرآن شریف کی تعلیمات کو منظوم کتاب کی شکل میں پیش کیا ہے۔ کتاب "پیغمبر اسلام" لیلدا پرکاش پھلواری، پٹنہ ۸۰۰۰۰۴ نے ۱۹۹۲ء میں شائع کی۔ ایک مختصر اقتباس یہاں پیش کیا جارہا ہے۔

وِدیانندجی محکمہ قانون، حکومت بہار، اولڈ سکریٹریٹ پٹنہ میں سکریٹری کے عہدے پر فائز رہے ہیں۔

ریتیلے راستے پر منقش ہیں دور تک
اک مرد حق پرست کے قدموں کے یہ نشاں
حد نگاہ تک ہیں قطاروں کے سلسلے
اتری ہو جیسے ریت پہ تاروں کی کہکشاں

قدموں کے یہ نشان ہیں اس پاک باز کے
جو دو جہاں کے واسطے رحمت لقب ہوا
کیوں کر نہ ان کی دید سے دل کو سکوں ملے
ہیں کس قدر لطیف و سبک یہ نقوش پا

محبوبِ کردگار کے قدموں کے یہ نشاں
کس درجہ ہیں مبارک و مسعود محترم
نظروں سے دل شوق کی دیکھے اگر کوئی
یہ خطۂ زمین ہے اک گوشۂ ارم

مکے سے تابہ غار حرا یہ نقوش پا
تحریر کر رہے ہیں تواریخ کے ورق
ملتا رہے گا ان سے زمانے کو حشر تک
ایمان و عدل و صبر و مساوات کا سبق

غار حرا میں محو عبادت یہ کون ہے
روئے حسیں پہ جس کے ٹھہرتی نہیں نظر
کھویا ہوا ہے یاد الٰہی میں اس طرح
ہے تن بدن کا ہوش نہ ماحول کی خبر

پانی کا پیالہ غار میں رکھا ہے اک طرف
ستو کی پوٹلی بھی دھری ہے زمین پر
رخ پر چمک رہی ہے پسینے کی بوند یوں
جیسے کنول کے پھول پہ شبنم کے ہوں گہر

تشریف لائے غار میں جبریلؑ ناگہاں
اور بولے آنحضورؐ سے پڑھئے بنام رب
حضرتؐ نے ان کو دیکھ کر گھبرا کے یہ کہا
"میں نے لکھا پڑھا نہیں، یہ جانتے ہیں سب"

"پڑھئے خدا کے نام جو ہے دو جہاں کا رب
انساں کو سایا ہے پھٹکی سے خون کی
جس نے قلم کے ذریعہ سکھائے رموز علم
احسان ہر کی بھی جو دیتا ہے آگہی"

سارے جہاں کی رشد و ہدایت کے واسطے
اللہ نے حضورؐ کو مبعوث ہے کیا
مٹ جائے گا زمیں سے اب ظلمتوں کا دور
پھیلے گی شش جہات میں ایمان کی ضیا

یہ برکتوں کی رات بھی ہے کتنی دل نشیں
اس رات میں ہی اترا ہے قرآن آپؐ پر
ہر لحہ اس میں ہوتی ہیں رحمت کی بارشیں
یہ رات ہے ہزار مہینوں سے خوب تر

اس رات جب مکان پر واپس ہوئے حضورؐ
لرزاں تھا سارا جسم اک انجانے خوف سے
تھا پیرہن تمام پسینے میں تر بہ تر
دہشت عیاں تھی چہرۂ اقدس سے آپؐ کے

دیکھا جو حال بی بی خدیجہؓ نے آپؐ کا
گھبرا کے پوچھا آپؐ سے، "یا سید البشر
ڈرتے نہیں تھے آپؐ کسی چیز سے کبھی
کیا بات ہے کہ آج پریشاں ہیں اس قدر"

"میں تم سے کیا بتاؤں کہ غار حرا میں آج
کیا دیکھا میں نے اور مرے ساتھ کیا ہوا
سردی سے میرا کانپ رہا ہے تمام جسم
جلدی سے اک لحاف اوڑھادو مجھے ذرا"

سن کر تمام حال اور روداد آپؐ سے
حضرت خدیجہؓ بولیں بصد عجز و دلدہی
"مجھ کو یقیں ہے آپؐ کا اللہ آپ کو
ہرگز کوئی گزند نہ پہنچائے گا کبھی"

ہر طرح دی تسلی انہوں نے حضورؐ کو
پھر آپؐ کی مزید تشفی کے واسطے
لے کر گئیں وہ آپؐ کو ورقہ کے پاس جو
جو اک مسیحی عالم و راہب تھے شہر کے

بقیہ صفحہ ۸

"حق نے چنا ہے ان کو رسالت کے واسطے"
سن کر تمام حال یہ ورقہ نے دی خبر
"پھیلائیں گے جہاں میں یہ ایماں کی روشنی
بے شک ہیں یہ خدا کے نبی اور پیامبر"

"مکہ کے لوگ ان کو ستائیں گے اس قدر
ہجرت کریں گے جانب یثرب یہ ایک دن
افسوس میں رہوں گا نہ اس وقت ان کے ساتھ
وہ وقت ان پہ ہوگا یقیناً بہت کٹھن"

"اہل قبیلہ کوئی نہ ساتھی نہ رشتہ دار
مشکل میں ان کا ساتھ نہ دے گا جہاں کوئی
جن پر خدائے پاک کی ہوگی نگاہ خاص
اس وقت ان کا ساتھ نبھا پائیں گے وہی"

سن کر یہ باتیں بی بی خدیجہؓ، خوشی خوشی
واپس ہوئیں حضورؐ کے ہمراہ اپنے گھر
لب پر تھی ان کے حمد و ثنا کردگار کی
دل تھا مئے نشاط سے معمور سر بسر

حمد

یہاں اور وہاں سب فقط تو ہی تو
زمیں آسماں سب فقط تو ہی تو

سوا تیرے مشکل کشا کون ہے؟
بہار و خزاں سب فقط تو ہی تو

میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے میرا
کہ حرف و بیاں سب فقط تو ہی تو

میں کچھ بھی نہیں ہوں، میں کچھ بھی نہیں
کہ یہ جسم و جاں سب فقط تو ہی تو

بصیرت ملے، وہ نظارہ کرے
نہاں اور عیاں سب فقط تو ہی تو

میرا کام تابش عمل ہی عمل
کہ سود و زیاں سب فقط تو ہی تو

مناجات

یا الٰہی آسماں سی وسعتیں دے دے مجھے
جو کسی کو دیں نہیں وہ رفعتیں دے دے مجھے

مجھ کو انسانی تمدن کا بنا دے شاہکار
ہر کس و ناکس کی یارب چاہتیں دے دے مجھے

مجھ سے کھو جائے میرا سب کچھ تو مجھ کو غم نہ ہو
تجھ کو پا جانے کی یارب لذتیں دے دے مجھے

میں تصور کے نہاں خانوں میں گم بیٹھا رہوں
خود کلامی کی سنہری ساعتیں دے دے مجھے

دل سے رنج و غم کے ابھرے سلسلے نابود کر
جو مقدر میں نہیں وہ راحتیں دے دے مجھے

شام تنہائی ہو روشن ہوں تیری یادوں کے دیپ
جن سے جلوت ہو خجل وہ خلوتیں دے دے مجھے

اعجاز تابش
ناگور - ۳۴۱۰۰۱

(دوسری اور آخری قسط)

شہنشاہ ظہیرالدین محمد بابر اور "بابر نامہ"

برصغیر میں مغل ہند جمالیات کے تخلیقی رشتے کا نقطۂ آغاز!

شکیل الرحمٰن
Former Union Minister for Health and Family Welfare
" Madhuban"
A_ 267, South City, Gurgaon_ 122001 (Haryana)

اساتذہ و اتالیق _ صوفیاء و علماء سے قربتیں

شیخ فرید بیگ، قاضی عبداللہ اور بابا قلی علی، بابر کے اساتذہ اور اتالیق تھے جنہوں نے قرآن پاک کے علاوہ شاہنامہ فردوسی گلستان و بوستان ظفر نامہ، خمسہ نظامی، طبقات ناصری، مثنوی مولانا روم اور خمسہ امیر خسرو وغیرہ کے مطالعے میں مدد کی۔ ترکی، عربی اور فارسی کی اچھی تعلیم دی، بابر نے شیخ فرید بیگ اور قاضی عبداللہ دونوں کا ذکر تزک میں کیا ہے، مولانا قاضی عبداللہ کے حوصلوں کی اس نے داد دی ہے اور یہ کہا ہے کہ ان میں خوف اور ڈر نام کی کوئی بات نہ تھی۔ اساتذہ کی شخصیتوں کا بھی اپنے طور مطالعہ کیا تھا اور ظاہر ہے بہت کچھ حاصل کیا تھا، تیمور اور عمر شیخ مرزا کی روایات اقدار اور ایسے عالم اور اتالیق و اساتذہ کا اثر ہی تھا کہ بابر نے اپنا ایک کتب خانہ قائم کر رکھا تھا۔ سفر میں بھی اس کا کتب خانہ کسی نہ کسی صورت ساتھ ہوتا، لاہور کے قریب غازی خاں سے جنگ ہوئی تو اسے اس کا قیمتی کتب خانہ بھی حاصل ہوا، غازی خاں اپنے دور کا ایک عالم حکمراں تھا کہ جس نے اپنے کتب خانے میں ہزاروں مخطوطے جمع کر رکھے تھے، خوش نویسوں کے تیار کئے ہوئے بہت سے ایسے نسخے تھے جو بابر نے محفوظ کر لیے۔

ہرات میں سلطان حسین مرزا کے دربار میں فنون کی بڑی قدر کی جاتی تھی، حسین مرزا شاعری اور مصوری دونوں فنون کا عاشق تھا، بابر دربار کے اس ماحول سے بے حد متاثر ہوا تھا۔ بابر نامہ میں اس دربار کا ذکر خاص طور پر کیا ہے۔ ایک جگہ کہتا ہے کہ ہرات کے مصور اور موسیقار حسن موضوع کو پسند کرتے اسے ہر لحاظ سے تکمیل تک پہنچا دیتے۔ سمرقند کی خوبصورت عمارتوں سے اتنا متاثر تھا کہ یہ عمارتیں اس کے ذہن میں رچ بس گئی تھیں، باغوں کی خوبصورت آرائش اور ان کی تزئین کاری میں بھی بابر کا ذہن تیموری روایات سے وابستہ نظر آتا ہے۔ بابر کے جمالیاتی شعور کی تشکیل میں صوفیانہ اور مذہبی روایات کے ساتھ سمرقند اور ہرات کے فنون نے بھی بڑا حصہ لیا ہے۔

حضرت عبدالرحمن جامی سے اسے بڑی عقیدت تھی، تزک بابری میں جامی کا ذکر بڑے احترام کے ساتھ کرتا ہے اسی عقیدت کی وجہ سے ان کے مزار کی زیارت کی تھی، حضرت مولانا جامی کے علاوہ شیخ الاسلام سیف الدین احمد ملا، شیخ حسین میر جمال الدین محدث اور میر عطاء اللہ مشہدی کی شخصیتوں سے بھی متاثر تھا اور ان کے علوم کی روشنیوں تک پہنچنے کی کوشش کرتا رہا تھا، ان کا بھی ذکر احترام کے ساتھ کرتا ہے اور ان کے علم کی کسی نہ کسی بڑی خصوصیت کی جانب اشارہ کرتا ہے، بابر نے ایک اچھے ناقد کی نظر سے اپنے ہم عصر فنکاروں کا مختصر جائزہ جا بجا پیش کیا ہے، اس کی باریک بینی غیر معمولی ہے۔ چند جملوں میں انتہائی اختصار کے ساتھ بڑی بات کہہ دیتا ہے۔ اختصار کی بلاغت کا حسن توجہ طلب ہے۔ سمرقند، فرغانہ اور ہرات کے فنون اور وہاں کے فنکاروں سے اس نے اپنا ایک ذہنی رشتہ قائم کر رکھا تھا، علی شیر نوائی، آصفی، عبداللہ ہاتفی، میر حسن معمائی، ملا محمد بدخشی، یوسف بدیعی اور شاہ حسین کامی وغیرہ پر اس کی تنقید بہت دلچسپ ہے، مختصر جملوں میں ان کی خوبیوں اور خامیوں کو اجاگر کر دیا ہے، اس دربار میں شیخ زین الدین



□ بابر ——"بابر نامہ" لئے ہوئے۔



□ بابر —— باغ کی تشکیل میں دلچسپی لیتے ہوئے۔

مولانا شہاب الدین، سلطان محمد کوسہ، شیخ عالی، مولانا ہاتفی، شیخ ابو الوحید رفارقی، خواجہ نظام الدین علی، مولانا یوسفی جیسے علماء، شعراء اور اطباء موجود تھے۔ اکثر شعراء کو قریب رکھتا اور ادبی مجلسوں میں ان کے کلام سے لطف اندوز ہوتا، حالانکہ ادبی مجلس میں شیخ زین، ملا علی خاں اور تردی بیگ کی شرکت کی تصدیق ہوتی ہے۔ کابل میں ادبی محفلیں زیادہ منعقد ہوتی رہی ہیں جن میں بابر اپنا کلام بھی سنایا کرتا تھا، تزک بابری کے مطابق کابل میں وہ اکثر اپنے احباب کے ساتھ مرغزار میں بیٹھتا اور شعراء سے ان کے کلام کو سنتا، ایک حوض پر یہ شعر کندہ کرایا تھا۔

نوروز و نور بہارے و دلبرے خوش است ‏ ‏ ‏ بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست!

(تاریخ فرشتہ ص ۲۱۱ جلد اول)

بابر ترکی زبان کا ایک ممتاز شاعر تھا، فرشتہ نے لکھا ہے

"در علم موسیقی و شعر و نظم و انشا نظیر نداشت"

(تاریخ فرشتہ ص ۲۱۱ جلد اول)

اس کا ایک دیوان کتب خانہ رامپور میں اب بھی موجود ہے "والدیہ" کے علاوہ ترکی شاعری کے عروض پر اس کی کتاب "رسائل عروض" کا ذکر بھی ملتا ہے، فارسی اشعار کی تعداد زیادہ نہیں ہے، ان کا بھی ایک عمدہ معیار ہے، مختلف حالات میں کئی اشعار و قطعات کہے تھے، بیانیہ کے قلعے کی فتح اور پانی پت کی جنگ کے وقت اس نے فارسی زبان میں اپنے جذبات کا اظہار کیا، ابوالفضل نے بابر کے جو چند اشعار پیش کئے ہیں وہ بھی معیاری ہیں۔

حضرت عبدالقدوس گنگوہیؒ نے بابر کو چند نصیحتیں کی تھیں جن میں انصاف کرنے اور علماء کو رفیق بنانے کی خاص ہدایتیں تھیں، بابر آپ کی شخصیت سے بے حد متاثر تھا۔ لہذا ان کے آستانے پر حاضری دی تھی، دہلی پہنچ کر حضرت شیخ نظام الدین اولیاؒ کے آستانے کی مٹی کو اپنی آنکھوں پر لگایا تھا، اسی طرح حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے مزار پر بھی حاضری دی، علماء و صوفیہ سے عقیدت غیر معمولی رہی ہے، اپنے والد کی طرح فن موسیقی سے بھی گہری دلچسپی تھی، کابل اور ہندوستان کی محفلوں میں سارندے اور موسیقار اور نغمہ گر بھی موجود رہتے تھے، اس نے خواجہ عبداللہ مروارید، تخم ثانی شاہ قلی غطیر، حسین حودی اور غلام شادی کے فن کی تعریف کی ہے۔ فن خطاطی سے بھی اس کی دلچسپی غیر معمولی تھی۔ بابر کے دربار میں خوشنویسوں نے اس خط کو فروغ دیا، کہا جاتا ہے بابر نے خود "خط بابری" میں کلام پاک کا ایک نسخہ تیار کیا اور اسے مکہ شریف بھجوایا، منتخب التواریخ میں اس واقعے کا ذکر ملتا ہے۔ شہنشاہ ہمایوں نے اس خط کو عزیز رکھا۔ لہذا اس کے دربار میں بھی ایسے کئی خوش نویس موجود تھے جنہوں نے خط بابری میں کئی نسخے تیار کئے۔ بابر نے اس خط کا ذکر کیا ہے لیکن اس کی تفصیل نہیں ملی۔ ہمایوں کے عہد میں یہ خط عروج پر تھا اور جو شخص اس کا ماہر ہو جاتا اسے استاد تسلیم کیا جاتا، یہ بات کسی حد تک واضح ہو جاتی ہے کہ یہ مشکل فن تھا اور اسے سیکھنے میں کافی وقت لگتا تھا، اکبر کے عہد میں اس کا رواج قریب قریب ختم ہو گیا لیکن اس کے باوجود اس دور میں چند فنکار ایسے تھے جو خط بابری کے استاد تصور کئے جاتے تھے، ان میں میر عبدالحئی مشہدی کا نام بہت نمایاں ہے۔

فطری و جلال و جمال کا شیدائی، فنون کا دلدادہ

بابر کی زندگی کا بیشتر حصہ صحرا وردی، جنگ و جدل اور شکست و فتح میں گزرا، اس کی ذات حد درجہ متحرک رہی، بابر بڑا حسن پسند تھا، فطرت کے جلال و جمال کا شیدائی تھا، فرغانہ اور کابل اور سمرقند اور ہرات کے تجربوں نے فطرت کے جلال و جمال اور فنون لطیفہ کی جمالیاتی قدروں کا شعور عطا کر دیا تھا، سمرقند کے بعد کابل پر قبضہ کیا جہاں ہمایوں کی ولادت ہوئی اور جشن ولادت میں فنکاروں کی پذیرائی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، تزک بابری میں باغ وفا کا ذکر کرتا ہے جو کابل میں اپنی نوعیت کا واحد باغ تھا، اس کے ذہن میں سمرقند کا حسن رچا بسا تھا۔ باغ وفا کے علاوہ دوسرے باغوں کی تشکیل کرتے ہوئے سمرقند کے معیار حسن کو ہمیشہ پیش نظر رکھا۔ ۱۵۲۷ء میں دہلی پر قابض ہو کر اپنی بادشاہت کا اعلان کیا، آگرہ میں "آرام باغ" اور

زہرہ باغ" کی تشکیل اور فواروں اور چھوٹی بڑی عمارتوں کی تعمیر میں گہری دلچسپی لی۔ ۱۵۳۰ء میں (۲۶/ دسمبر) انتقال ہوا۔

بابر ہرات میں چالیس دن رہا اور دبستان ہرات کے فنون خصوصاً فن تعمیر اور فن مصوری سے بے حد متاثر ہوا۔ اس وقت ہرات اسلامی تہذیب و تمدن کا ایک بڑا مرکز تھا، چالیس دن تک مسلسل خوبصورت اور خوبصورت ترین عمارتوں کو دیکھتا رہا اور فن مصوری کے عمدہ نمونوں کا اپنے طور پر مطالعہ کرتا رہا، اس کے ایرانی اتالیق نے فنون کے مطالعے میں اس کی رہنمائی کی، ایرانی مصوروں کی بنائی ہوئی تصویروں کے حسن و جمال کا اس پر بڑا گہرا اثر رہا، سلطان تیمور کے لڑکے شاہ رخ نے ایک نگار خانہ قائم کر رکھا تھا کہ جس کا سربراہ بہزاد تھا، منگول ایرانی، آرٹ کی آمیزش سے فن مصوری میں عمدہ تجربے ہو رہے تھے، کوئی وجہ نہیں کہ ہندوستان آکر اس نے مصوری کے فن سے دلچسپی کا اظہار نہ کیا ہو، بابر کے دربار میں مصوری کے فن کو کیا مقام حاصل تھا بتانا مشکل ہے۔ اس لئے کہ اس کے عہد کی تصویریں دستیاب نہیں ہیں، چند تصویریں اس کے عہد سے منسوب ہیں لیکن یقین اور وثوق سے ان کی تاریخوں کا تعین نہیں کیا جاسکتا۔ "اسٹیٹ لائبریری برلن" میں شہنشاہ جہانگیر کے ایک ذاتی البم میں "سمندر کی جنگ" کی جو تصویر ہے اس کے متعلق بعض ماہرین کہتے ہیں کہ یہ بابر کے دربار کی تخلیق ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس پر بخارا کے دبستان اور خصوصاً بہزاد کے منفرد اسلوب کے اثرات ہیں، ہندوستان میں بابر کی آمد کو ایک بڑی تہذیب کی اعلیٰ ترین قدروں اور فنون کی عمدہ ترین روایتوں کی آمد سے تعبیر کرنا مناسب ہوگا، بلاشبہ اس کے ساتھ دوسری بہت سی روایات اور اقدار کے علاوہ بخارا اور بہزاد کی روایات و اقدار نے بھی سفر کیا تھا۔

جمالیات کا لاثانی پرستار

"بابر نامہ" بابر کے فنکارانہ شعور اور پختہ جمالیاتی مزاج کا مظہر ہے، اس سے ایک جانب اس کی فنکارانہ صلاحیتوں اور دوسری جانب اس کے جمالیاتی مزاج کی پختگی کی پہچان ہوتی ہے۔ اسلوب کا نوکیلا پن اور تیز تر احساس حسن متاثر کرتا ہے۔ فطرت کے حسن اور مظاہر فطرت کے جلال و جمال کو بابر اپنے جمالیاتی شعور کے ساتھ ایک فنکار کی طرح اجاگر کرتا ہے، اس کے جمالیاتی شعور کی دو اہم خصوصیات فوراً توجہ کا مرکز بن جاتی ہیں۔

○ حسن کی وضاحت

اور

○ لذت اندوزی اور جمالیاتی انبساط اور آسودگی!

بابر فطرت کی چھوٹی چھوٹی سچائیوں کو پھیلا کر دیکھتا ہے، چھوٹے سے جلوے کو وسیع تر تناظر میں دیکھتا اور محسوس کرتا ہے اور اس عمل میں ایک فنکار کی طرح جمالیاتی انبساط پاتا اور جمالیاتی آسودگی حاصل کرتا ہے، بہار میں باغ کو دیکھتا ہے تو ایک ایک پھول کی صورت اور رنگ پر نظر ٹھہرتی ہے، جانے کتنے رنگوں کا ذکر کرتا ہے، کلی سے پھول تک کے لمحوں کو اپنے احساس میں جذب کرنے کی کوشش کرتا ہے، خزاں میں درختوں کے پتوں کے رنگوں کو جذب کرتا ہے، سبز، سرخ، زرد اور کئی دوسرے رنگوں سے کھیلتا ہے۔ اس کے اسلوب میں بہار اور خزاں کے رنگ جذب نظر آتے ہیں۔

فرغانہ، سمرقند، کابل اور ہندوستان کے حسن و جمال سے بابر کی گہری جذباتی وابستگی رہی ہے، اس نے پھولوں، پھلوں، پرندوں اور جانوروں کے علاوہ مرغزاروں پہاڑی علاقوں کے نشیب و فراز کے حسن کا ذکر کیا ہے۔ "لالہ" کے رنگوں پر نظر پڑتی ہے تو بتیس تینتیس (۳۲ _ ۳۳) رنگوں کی نشاندہی کرتا ہے، خواجہ ریگ"

دوان کی ریت اس کی توجہ کا مرکز بن جاتی ہے ، پہاڑوں کے طویل سلسلے اور برف سے بھری ہوئی چوٹیاں ، پھولوں سے لدے ہوئے درخت ، چشمے ، سبز میدان ، پھولوں سے جھکے ہوئے پودے ، سرخ اور زرد کلیاں ، پرندے سب اسے اپنی جانب کھینچتے ہیں ، کئی پرندوں کا ذکر کرتا ہے ، رحیم داد کے باغ اور کوالیار کے آبشار کی تعریف میں اس کے احساس حسن کی پہچان ہو جاتی ہے ۔ غور طلب بات یہ بھی ہے کہ اس کا اظہار بیان غضب کا ہے ، حسن کی تعریف کرتے ہوئے اس کے جذبوں کا رنگ بھی نمایاں ہوتا رہتا ہے ۔ ایک فنکار کا دردمند دل ہے اس نے مظاہر حسن پر نظر ڈالی ہے ۔ "کیمپ فائر" کے آتشیں نظارے کو دیکھتا ہے تو کہتا ہے ایسا لگ رہا ہے جیسے تاریک سمندر میں جھلملاتے ستاروں کا عکس پڑ رہا ہے ۔ مشکل سے مشکل وقت میں بھی اپنے شاعرانہ ذہن کو متحرک رکھتا اور کسی کھلتے ہوئے پھول کو بھی دیکھ لیتا تو اپنی تمام پریشانیوں کو بھول کر اس کے حسن کو بیان کرنے لگتا ۔

بابر نے جہاں مناظر قدرت سے گہری دلچسپی لی وہاں مختلف علاقوں کے رہنے والوں کی زندگی کا بھی مشاہدہ کیا ۔ بابر نامہ میں جہاں کابل اور بلخ کے درمیان "ہندو کش" کے طویل پہاڑی سلسلے کا ذکر ہے وہاں کابل کے بازار کا بھی ذکر ہے کہ جہاں کاشغر ، فرغانہ ، ترکستان ، سمرقند ، بخارا ، بلخ حصار اور بدخشاں کے تاجر آتے اور اپنی اشیاء فروخت کرتے ، کابل کے کارواں کا ذکر ہے جو ترکی تک پہنچتے ۔ تہذیبی نقطۂ نظر سے بابر نامہ کا یہ حصہ اس لحاظ سے اہم ہے کہ ہندوستان کی سرحد کے قریب مختلف علاقوں کے لوگوں کی آمد و رفت کی وجہ سے تمدنی یا ثقافتی آمیزش کا ایک سلسلہ جاری تھا ، اس نے لکھا ہے کہ ہر سال کم و بیش دس ہزار گھوڑے مختلف علاقوں سے اشیاء لیکر آتے تھے اور تجارتی سطح پر ایک بڑا قیمتی رشتہ قائم تھا ۔

ظہیر الدین محمد بابر مصوری کے فن کے ناقد کی حیثیت سے بھی ملتا ہے جب بہزاد اور شاہ مظفر کی مصوری کو مطالعے کا موضوع بناتا ہے اس کی تنقید سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسے حسن کا کتنا شدید احساس تھا اور مصوری کے فن سے اس کی دلچسپی کتنی گہری تھی ، بہزاد اس کا ہم عصر تھا ، کہتا ہے وہ بڑا فنکار تو ہے لیکن ڈاڑھی کے بغیر صورتیں اچھی نہیں بناتا اور اکثر ہونٹوں کے نیچے چہرے کی تکمیل کرتے ہوئے انتہا پسند ہو جاتا ہے ، ظاہر ہے ایسی صورت میں چہرہ بوجھل ہو جاتا ہے ۔ شاہ مظفر کے متعلق کہتا ہے کہ بادلوں کے حسن پر اس کی گہری نظر ہے ، زلفوں کی آرائش کے معاملے میں اس کا کوئی ثانی نہیں ہے ۔

بابر کی حسن پسندی سے "مغل جمالیات" کی چند اہم قدروں کو سمجھا جا سکتا ہے

- فطرت پسندی
- جزئیات پر نظر
- رنگوں کی انفرادیت

اور

- آرائش و زینت!

وسط ایشیاء اور ایران کی مصوری میں فطرت پسندی ، آرائش و زینت اور خوبصورت تخلیقی سانچوں ، رنگوں کی شوخی ، تیز آہنگ اور بکھرے ہوئے عناصر کی وحدت کی جو اہمیت ہے ہمیں اس کا علم ہے ، وسط ایشیائی اور ایرانی مصوروں نے اپنے طور پر طلسمی دنیا کی تخلیق کی ہے ، مصوروں کے بعض اہم نمونوں کو دیکھتے ہوئے ہم خود کو تخیل اور طلسم کی فضاؤں میں پاتے ہیں جہاں آسمانوں کا رنگ انتہائی گہرا نیلا ہے یا سونے کی مانند چمکتا ہے اور ان پر بادل زیورات کی طرح بکھرے ہوئے ہیں ، چٹانوں کا رنگ ارغوانی اور بنفشی بھی ہے اور گلابی اور نیلا بھی ، مختلف رنگوں کے گھوڑے ملتے ہیں ، تصویر کی مناسبت سے گھوڑے کا رنگ منتخب کیا جاتا ہے ، درخت تو ایسے لگتے ہیں جیسے ہیرے جواہرات کے درخت ہوں ، فرش ، دیوار ، قالین اور

تحت کے جانے کتنے رنگ مختلف انداز سے متاثر کرتے ہیں، پرچھائیوں سے کسی قسم کا کوئی ابہام پیدا نہیں کیا جاتا، کینوس پر پیکروں اور موجود اشیاء و عناصر کے رشتے کی وضاحت ہو جاتی ہے اور اس عمل سے پورے کینوس پر پھیلے ہوئے مختلف مقامات پر ٹھہرے ہوئے، رنگین، چمکتے ہوئے اور روشن اشاروں پر کوئی اثر نہیں ہوتا، چٹانوں پہاڑوں، بادلوں اور اس طرح کے دوسرے پیکروں سے حسن کے مختلف مظاہر کی پیشکش ہوتی ہے، دیواروں، زینوں، دروازوں اور دریچوں سے ایک نئی جہت ابھارنے کی کوشش ملتی ہے، انسان کے پیکر "ماتپ کرداروں" کی صورتوں میں اپنے تاثرات کے ساتھ نظر آتے ہیں، بہزاد اور اس کے ہم عصر مصوروں اور بہزاد کے شاگردوں کے فن میں یہ خصوصیات موجود ہیں، ان کے بعد آنے والے فنکاروں کا بھی انداز کم و بیش یہی ہے، ان میں اکثر خصوصیات شدت سے پیش ہوئی ہیں، آرائش اور زینت کے معاملے میں بہزاد نے ایک روایت کی تشکیل کی ہے۔

ارنست کوہل (Ernst Kuhnel) اور چند دوسرے محققین کا خیال ہے کہ بابر کے ساتھ بخارا اور کابل کے مصور بھی ہندوستان آئے تھے اور اس قافلے کے ساتھ ایران کے معروف مصوروں کی بنائی ہوئی تصویریں بھی تھیں۔ بابر کے دربار میں بخارا اور کابل کے مصوروں نے بہزاد کے اسلوب کی پیروی کی تھی لیکن رنگوں کے استعمال کے معاملے میں ان کا انداز بہزاد سے مختلف تھا، بابر نے باغوں کی تشکیل و آرائش اور بعض عمارتوں کی تعمیر میں اپنے احساسِ جمال کو جس طرح نمایاں کیا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس نے فن مصوری سے بھی یقیناً گہری دلچسپی لی ہوگی، اس کے دربار کی تصویریں حاصل نہیں ہیں اس لئے مغل آرٹ کی ابتدائی صورتوں کا تجزیہ ممکن نہیں ہے باغوں کی تشکیل اور ان کی آرائش میں اس نے جن دو اہم باتوں کی طرف توجہ دی ان کے پیش نظر اس کے آرٹ کے تصور کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے، پہلی بات تو یہ کہ جو پودے لگائے جائیں وہ فطرت کے حسن اور انداز کے عین مطابق ہوں، مظاہر فطرت سے مطابقت ہو، ایسا محسوس ہو جیسے دوسرے درختوں، پودوں اور پھولوں سے اس کا رشتہ فطری ہے۔ یہ حقیقت پسندانہ رجحان توجہ طلب ہے، دوسری بات یہ کہ ایک ہی قسم کے پودوں کو اس طرح لگایا جائے کہ باغ میں ان کے آہستہ آہستہ بڑھنے کا پورا منظر سامنے آجائے، جزئیات پر نظر رکھی جائے اور ہر پودے کی تفصیل میں اس کے حسن کو پیش کیا جائے، حسن کی وضاحت کا یہ رجحان بھی غور طلب ہے، اس سے عمدہ "سیمٹری" پیدا کی گئی ہے، بابر کے دربار میں جو تصویریں بنی ہوں گی ان میں فطرت کے مناظر کو یقیناً زیادہ اہمیت حاصل ہوگی اور فنکاروں نے جزئیات اور حسن کی پیشکش سے تفصیل کو امتیازی حیثیت دی ہوگی۔

بلاشبہ بابر نے ہندوستان کو مغل فنون کی جمالیات سے پہلی بار متعارف کیا، ہندوستانی جمالیات اور مغل جمالیات کا پہلا تخلیقی رشتہ بابر کی وجہ سے قائم ہوا اور برصغیر میں نئی جمالیاتی روایات کا خوبصورت سفر جاری ہوا!!

(ختم شد)

تصحیح

عید نمبر ۹۶ء میں حضرت کنول سیال کوٹی کی نعت کے چوتھے شعر میں کتابت کی غلطی رہ گئی تھی۔ صحیح شعر یوں پڑھا جائے۔

پھیلا ہے اجالا یہ محمدؐ ہی کے دم سے
ہو چشم بصیرت تو حقیقت پہ نظر ہو

خواجہ رضی حیدر

1B 3/1. Nazimabad
Karachi (Pak)

غزل

تمام شہر کا موضوعِ گفتگو ہو جائے
مرے لہو میں نہا کر وہ سرخرو ہو جائے

سوال یہ ہے کہ بے کیف زندگی کیوں ہو
یہ گفتگو بھی کبھی اس سے دو بدو ہو جائے

میں چاہتا ہوں کبھی وہ مری محبت میں
مری مثال بنے مجھ سا ہو بہو ہو جائے

میں چاہتا ہوں کبھی وہ مری محبت میں
انا سے اپنی لڑے اپنے روبرو ہو جائے

کبھی تو آئے میسر گلاب سا لمحہ
کبھی تو ختم یہ خواہش یہ آرزو ہو جائے

ذرا خیال رہے شہر کی سماعت کا
کہیں نہ عشق کی رسوائی چار سو ہو جائے

عداوتوں میں یہ لازم نہیں رضی حیدر
وہ میرے نام پہ ہر بار شعلہ رو ہو جائے

شجاع خاور

1. Park Lane
Talkatora Park
New Delhi - 110001

غزل

چلو یہ تو حادثہ ہو گیا کہ وہ سائبان نہیں رہا
ذرا یہ بھی سوچ لو ایک دن اگر آسمان نہیں رہا

یہ بتا کہ کون سی جنگ میں میں لہولہان نہیں رہا
مگر آج بھی ترے شہر میں کوئی مجھ کو مان نہیں رہا

شب ہجر نے ہوس اور عشق کے سارے فرق مٹا دیے
کوئی چارپائی بچھ گئی تو کسی میں بان نہیں رہا

سبھی زندگی پہ فریفتہ کوئی موت پر نہیں شیفتہ
سبھی سود خور تو ہو گئے ہیں کوئی پٹھان نہیں رہا

نہ لبوں پہ غم کی حکایتیں نہ وہ بے رخی کی شکایتیں
یہ عتاب ہے شب وصل کا کہ میں خوش بیان نہیں رہا

اسی بے رخی میں ہزار رخ ہیں پرانے رشتے کے صاحبو
کوئی کم نہیں ہے کہ جان کر بھی وہ مجھ کو جان نہیں رہا

اختر ضیائی

(لندن)

غزل

ہمنشیں جب ہو گھاس پھولوں کی
اس میں آتی ہے باس پھولوں کی

صبح دم اوس روٹھ کر چل دی
بڑھ گئی اور پیاس پھولوں کی

ننھی منی نحیف سی تتلی
ہے طبیعت شناس پھولوں کی

روز یثاق رنگ و نکہت نے
مل کے رکھی اساس پھولوں کی

چاندنی کی پھوار میں مہکے
کیاری کیاری اداس پھولوں کی

ہم بھلے موسموں کے طالب ہیں
ہم نہ توڑیں گے آس پھولوں کی

خس و خاشاک سے زبوں تر ہے
زندگی بے لباس پھولوں کی

فصل گل محشر نمود اختر
اک ادائے سپاس پھولوں کی!

ڈاکٹر سجاد سید

C-2, Gulmohar Avenue,
Jamia Nagar, Okhla
New Delhi 110 025

غزل

اے بھلانے کا جب بھی کبھی ارادہ کیا
دل تباہ نے تب شور کچھ زیادہ کیا

بڑھے ہیں جو رو ستم جب بھی اس جفا خو کے
تو جذب عشق کا ہم نے بھی پھر اعادہ کیا

کبھی بچھائی ہیں نظریں کسی کی راہوں میں
کبھی نگاہ کو اپنی چراغ جادہ کیا

کچھ اس طرح بھی منایا ہے جشن یاروں نے
لہو کو رنگ کیا خاک کو لبادہ کیا

خوشا تصور جاناں کہ اس کے جادو سے
لب و نگاہ کو ہم نے بھی جام و بادہ کیا

فقط تمہیں نہیں سید مطیع شاہ غزل
جناب میر سے کس نے نہ استفادہ کیا

اوم کرشن راحت

51/162 Faridabad Township-121001

غزل

سب پیار اپنا بانٹ کے دنیا سے ہم اٹھے
اٹھے سبھی جہاں سے بہ ایں شان کم اٹھے

وہ گرد بن کے پاؤں سے آکر لپٹ گئیں
جن منزلوں کی سمت ہمارے قدم اٹھے

یکسر وجود و جسم کے معنی بدل گئے
پہلو سے اپنے رات گئے کل جو ہم اٹھے

کیا کیا نہ مجھ کو لکھنا پڑے گا مرے خدا
اس اپنی زندگی پہ نہ میرا قلم اٹھے

اس شرط پہ اٹھائیں گے دنیا کے سب ستم
سر سے ہمارے اس کا نہ دست کرم اٹھے

کیا حال ہوگا تاروں بھرے آسمان کا
ساغر اٹھا کے ہاتھ میں راحت جو ہم اٹھے

رحمت امروہوی

Mirzapur Morkaswad
Ahmedabad - 380 001
Gujarat

غالب کا قصیدہ

کبھی ملکہ، تو کبھی شبہہ کا قصیدہ لکھا
مصلحت دیکھ کے غالب نے بھی کیا کیا لکھا

کبھی صاحب کے کف دست کو دل کرتا فرض
اور کبھی چکنی سپاری کو سویدا لکھا

کھیل اورنگ سلیماں رہا اس کے نزدیک
اور بازیچہ اطفال کو دنیا لکھا

موجزن اس میں بھی تھا اس کی انا کا پہلو
اس نے شہزادے کی شادی کا جو سہرا لکھا

ذکر رمضان کے روزوں کا جب آیا رحمت
اس نے خس خانہ و برف آب کا مشکوہ لکھا

یوں تو غالب کی طرح تم بھی ہو مجرم رحمت
تم نے شبہہ کا نہیں غالب کا قصیدہ لکھا

چپکے چپکے

کدار ناتھ شرما

899, Sector 4 Urban Estate
Panchkula - 134109 (Haryana)

ایک سہانی شام کو نیلے سوٹ والا خوبرو جوان سال مرد اس گھر میں داخل ہوا تھا۔ سفید قمیض اور نیلے بیش قیمت گرم سوٹ میں ملبوس وہ شخص مین گیٹ سے اندر داخل ہوا تو سب کی نظریں اس پر مرکوز ہو گئیں۔ اس کی نیلی خوبصورت ٹائی پر سنہری کلپ لگا ہوا تھا۔ کالے بوٹوں پر پالش چمک رہی تھی۔ سامنے والی جیب سے سفید رومال کا کنارہ باہر کو آرہا تھا۔ اس کی آنکھوں پر کالا چشمہ تھا جس کا فریم سنہری تھا۔ اس لباس میں اس کی شخصیت بارعب لگ رہی تھی۔ اس کے بالوں کی بناوٹ میں بھی ایک خاص کشش تھی۔ دیکھنے والی سبھی نگاہیں اس بات کی منتظر تھیں کہ یہ شخص کس کا مہمان ہے۔

یہ مکان جس میں یہ شخص وارد ہوا تھا کئی منزلہ تھا۔ مکان میں زیادہ تر لوگ کرایہ دار تھے۔ مکان کی نچلی منزل میں مکان مالک آدھے حصے میں رہتا تھا۔ اس شام کو جب یہ شخص مین گیٹ سے اندر آیا تھا تو اس مکان کی کم و بیش سبھی خواتین اپنے بچوں کے ساتھ اس مکان کے اس آنگن میں بیٹھی کھلی فضا سے لطف اندوز ہو رہی تھیں۔

"مسز کشور ؟"

"جی ہاں۔" ایک درمیانی عمر کی خاتون نے کھڑے ہو کر کہا تھا۔

"میں دہلی سے آیا ہوں۔ میں راج دراج کا"

"سمجھ گئی۔ ہاں سمجھ گئی آجاؤ۔"

پھر وہ خاتون اسے اپنے کمرے میں لے کر چلی گئی تھی۔

اس شخص کی آنکھوں پر کالے چشمے کا پردہ ہونے کے باوجود یہ اندازہ لگانا مشکل نہ تھا کہ نیلے سوٹ والا وہ شخص ایک شوقین طبیعت اور دلبر قسم کا آدمی ہے۔ وہ اس فن میں ماہر ہے کہ خواتین میں مقبولیت کس طرح سے حاصل کی جاسکتی ہے اور انہیں اپنی طرف کیسے ملتفت کیا جاسکتا ہے۔ ضرور یہ شخص عیاش تھا اور حسن کا پرستار نہ ہو کر حسن کا شکاری تھا۔ جب وہ داخل ہوا تھا۔ اس نے طائرانہ نظر سے سبھی خواتین کو دیکھا تھا اور وہاں موجود جوان عمر لڑکیوں کو بھی بھرپور نظروں سے دیکھا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر پھیلی مسکراہٹ اور الفاظ میں مصنوعی شیرینی اس بات کی شہادت دے رہی تھی کہ نیلے سوٹ والے اس شخص کی آنکھوں میں کس قدر شرارت ہے۔

وہاں بیٹھی خواتین اور جوان عمر لڑکیوں نے جس اشتیاق سے اس نووارد شخص کو دیکھا تھا اس سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ اس پرکشش شخصیت کا اثر کم و بیش سب نے لیا ہے۔ مسز کستوری نے شاید اس کا سب سے زیادہ اثر لیا تھا۔ جب سے یہ شخص مسز کشور کے ساتھ کمرے میں بیٹھا مسز کشور سے گفتگو ہوا تھا تب سے ہی مسز کستوری جالی دار دروازے میں سے ان کی نقل و حرکت دیکھنے کے لئے بیتاب ہو گئی تھیں اور ان کے بیچ ہو رہی بات چیت کو سننے اور سمجھنے کے لئے بے چین ہو گئی تھیں۔

شام اور ڈھلنے لگی تھی۔ وہاں بیٹھی سبھی خواتین آہستہ آہستہ اپنے اپنے کمروں میں اس طرح سے لوٹ گئی تھیں جیسے شام ہوتے ہوتے سبھی پرندے اپنے اپنے گھونسلوں میں لوٹ آتے ہیں۔ مسز کستوری اور اس کی لڑکی پریم پراگ دیر شام تک وہاں بیٹھی رہی تھیں۔ اس اثنا میں مسز کستوری کی اپنی لڑکی پریم پراگ سے کوئی بات نہ ہوئی تھی۔ مسز کستوری کے دل میں ایک ہیجان بپا تھا۔ اس کے چہرے سے اس کے دل میں پیدا ہورہے مدوجزر کو بڑی آسانی سے دیکھا جاسکتا تھا۔

مسز کشور کے آجانے پر مسز کستوری کی مصروفیت کا سلسلہ ٹوٹ گیا تھا اور وہ اپنی کرسی کو اٹھائے مایوس اپنے کمرے میں چلی گئی تھیں۔ نیلے سوٹ والے شخص کو ایک بار پھر دیکھنے کی حسرت ان کے دل میں ہی رہ گئی تھی۔

اکیلی رہ گئی پریم پراگ بھی آخر کار اپنی تین سالہ بچی کو اٹھائے، جو اس کے گھٹنوں میں پڑی سو گئی تھی۔ اندر چلی گئی تھی۔ اس نے اپنی بیٹی کو اندر کے کمرے میں پلنگ پر سلا دیا تھا اور ماں کے کام میں اس کا ہاتھ بٹانے کے لئے رسوئی گھر میں چلی گئی تھی۔ پریم پراگ کے والد کہیں کسی کام سے باہر گئے ہوئے تھے اس لئے رسوئی گھر میں زیادہ کام نہ ہونے کی وجہ سے وہ باہر آکر اپنی بیٹی کے پاس لیٹ گئی تھی۔ یہ بیٹی اس کی اپنی نہ تھی بلکہ اس نے اسے جیٹھانی سے گود لیا تھا اس امید میں کہ اس کی اپنی گود ہری ہوجائے۔

پریم پراگ کل ہی مائیکے آئی تھی وہ انتہائی طور پر مایوس تھی۔ وہ اپنے سسرال میں سب سے چھوٹی بہو تھی۔ باپ نے پہلے جن تین بیٹوں کی شادی کی تھی۔ ان سب کے دو دو بچے تھے۔ ان تینوں بھائیوں کے گھر کوئی نرینہ اولاد نہ تھی۔ باپ نے جب اپنے چوتھے اور سب سے چھوٹے بیٹے کا بیاہ رچایا تھا تو اس گھر میں امید کی شعاع کے پھوٹ آنے کا انتظار ہو گیا تھا۔ یکے بعد دیگرے تین بیٹوں کے گھر نرینہ اولاد کے نہ ہونے سے پورے گھر میں مایوسی چھا گئی تھی۔ پریم پراگ بھی مایوس رہنے لگی تھی۔ کچھ دن اور ماحول میں رہنے کے خیال سے وہ مائیکے چلی آئی تھی۔ فیملی پلاننگ کے اس زمانے میں تیسرے بچے کو جنم دینے کے معاملے میں کوئی لڑکا بھی راضی نہ ہوا تھا۔ پریم پراگ کے تو کوئی اولاد ہی نہیں ہوئی تھی۔ اس کے بوڑھے سسر بے امید ہوگئے تھے لیکن اپنے پوتے کا منہ دیکھنے کی خواہش ان کے دل میں جوان تھی۔ اسے بھلا پانا ممکن نہ تھا۔ چاروں میں سے ایک بہو بھی اور بچہ پیدا کرنے کے لئے تیار نہ تھی۔ سسر اس غم میں بیمار پڑگئے تھے۔ علالت کے دوران انہوں نے اپنی خواہش کا اظہار کیا تھا کہ کوئی جھوٹ موٹ ہی میرے کانوں میں آکر کہہ دے "لالہ جی۔ آپ کا پوتا ہوا ہے۔"

پریم پراگ کے دل میں اپنے سسر کے الفاظ اسے مطلاطم کئے جارہے تھے۔ وہ بے بس تھی۔ قدرت کے کاموں میں اس کا کوئی دخل نہ تھا۔ اسے اپنے ان حالات پر رونا آجاتا تھا۔ اپنے لئے بیٹے کے ہونے کی خواہش کو وہ نظر انداز بھی کر سکتی تھی لیکن اپنے سسر کی پوتے کو دیکھنے کی خواہش پورا نہ سکنے پر وہ بے حد رنجیدہ ہوجاتی تھی۔

اپنے خاوند کی بے بسی سے واقف ہوتے ہوئے بھی وہ اس بات کو زبان پر نہ لاسکی تھی۔ وہ یہ راز اپنے سینے میں چھپائے ہوئے تھی۔ جب ڈاکٹر نے رازدارانہ طور پر یہ انکشاف کیا تھا کہ وہ اولاد پیدا کرنے کے قابل نہیں ہے تو بھی اس نے اس راز کو اپنے خاوند پر بھی افشانہ ہونے دیا تھا۔ جھوٹ موٹ وہ اس کے ساتھ یہ سوانگ بھرتی رہی تھی اور اس سے اولاد پانے کی امید رکھتی رہی تھی۔ اندر سے شکست کھائے ہوئے ہونے کے باوجود وہ اوپر اوپر سے سب کا دل رکھ رہی تھی اور اولاد پانے کی امید ظاہر کرتی رہی تھی۔

کھانا کھاچکنے کے بعد وہ اپنی ماں کے ساتھ اس کمرے میں لوٹ آئی تھی اور کچھ دیر تک بات چیت کرنے کے بعد دونوں اپنے اپنے بستر میں لیٹ گئی تھیں۔

نیلے سوٹ والا وہ شخص جو ان کے کرایہ دار کا مہمان تھا، کھانا کھانے کے بعد آنگن میں چہل قدمی کر رہا تھا۔

مسز کشور نے آکر دستک دی تھی۔ جب مسز کستوری نے دروازہ کھولا تو مسز کشور کو سامنے پایا تھا۔ "ہمارے ایک مہمان آگئے ہیں۔ اگر آپ اجازت دیں تو ان کا بستر آپ کی بیٹھک میں لگادیں ؟"

"ہاں۔ہاں۔کوئی بات نہیں۔"

"شکریہ۔"

"دیکھو مسز کشور ! بیٹھک میں دیوان لگا ہے۔ بستر لگانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں اس پر صاف چادر بچھا دیتی ہوں۔ آپ بے شک انہیں بیچ دیجئے۔ بیچارے تھکے ہوئے ہوں گے۔ آرام سے لیٹ جائیں گے۔"

مسز کشور خوشی خوشی لوٹ گئی تھیں۔ بیٹھک کا دروازہ کھول دیا گیا تھا۔ کمرے میں روشنی کردی گئی تھی۔ نیلے سوٹ والا شخص اپنا بریف کیس اٹھائے کمرے میں آگیا تھا۔ مسز کستوری نے اپنے کمرے اور بیٹھک کے بیچ کا دروازہ بند کردیا تھا اور اپنے کمرے کی بتی گل کرنے کے بعد اپنے بستر پر آکر لیٹ گئی تھیں۔

وہ بیچ کے دروازے پر نظریں لگائے درازوں سے نیلے سوٹ والے شخص کی نقل و حرکت کو دیکھ رہی تھیں۔ اس شخص نے کپڑے بدلے تھے۔ ایک سلیپنگ پاجامہ اور کرتے میں بھی وہ بھلا لگ رہا تھا۔ بستر پر لیٹے اور کمبل کو اوڑھے وہ ایک کتاب پڑھ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ کروٹ بدل لیتا۔ کبھی کچھ گنگنانے لگتا تھا کبھی بڑبڑانے لگتا۔ اس نے اس کتاب کے کئی صفحات پڑھ ڈالے تھے۔ جوں جوں رات بیتی جاتی تھی، بیٹھک میں لیٹے ہوئے شخص کی آوازیں سنانے کو چیرتی ہوئی اور زیادہ صاف سنائی دے جاتی تھیں۔ آدھی رات سے بھی زیادہ رات ڈھل چکی تھی مگر بیٹھک کی روشنی گل نہ ہوئی تھی۔ مسز کستوری بار بار کروٹیں بدل رہی تھی۔ اس کی نگاہیں اس پر مرکوز تھیں۔ نیلے سوٹ والے شخص نے فرط جذبات میں سرہانے کو اپنی چھاتی سے لگا کر بھینچ لیا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی تھی اور آنکھوں میں ایک خاص چمک آگئی تھی۔ وہ پھر بے قراری میں کروٹیں بدلنے لگا تھا۔

مسز کستوری ٹکٹکی لگائے اس شخص کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی اپنی نیند حرام ہوگئی تھی۔ اس میں ایک عجیب سا ہیجان بپا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ کسی بھی پل دروازے کو کھول کر اس شخص کے قریب پہنچ جائے گی۔

پریم پراگ بھی جاگ رہی تھی۔ اس کی نظریں اپنی ماں مسز کستوری کی نقل و حرکت کا گہرہ مشاہدہ کر رہی تھیں۔ ماں کے جذبات کو سمجھنے میں اس نے کوئی غلطی نہیں کی تھی۔ اپنی ماں کے چال چلن پر اس کا شک پختگی کے نزدیک پہنچ گیا تھا۔ اسے یہ لگا تھا کہ اس کی ماں اس کے باپ کی وفادار نہیں تھی۔ اس کا غیر مرد کی طرف ملتفت ہونا اسے گراں گزر رہا تھا۔ وہ دل ہی دل میں کڑھ رہی تھی۔ اسے اپنے اور اپنے بھائی کے اپنے باپ کی اولاد ہونے پر بھی شک ہونے لگا تھا۔ اس نے یہ اندازہ لگایا کہ ہو سکتا ہے کہ ہمارا باپ بھی کوئی ایسا ہی شخص ہو۔ وہ اس ادھیڑ بن میں پڑی ماں کی حرکتوں کو برا بھلا کہہ رہی تھی۔ وہ اس بات پر اور بھی نالاں تھی کہ عین شباب میں کئے گئے گناہوں کو تو معاف بھی کیا جاسکتا ہے مگر اس عمر میں جب کہ بچے جوان ہوں اور ماں بدکار ہو تو ایسی حالت معافی کے قابل نہیں۔ اس کے دل میں ایسے خیالات کا ہجوم اس میں طوفان بپا کر رہا تھا اس کے دل میں آیا کہ وہ اٹھ کر ماں کے بال نوچ لے اور اسے اس کی غلطی کا احساس دلائے لیکن نہ جانے کیوں اس نے بستر میں پڑے ہونے میں ہی مصلحت سمجھی۔

پریم پراگ نے اوائل عمر میں سماجی رہبروں اور دانشوروں سے ایک مذہبی سماجی روایت کا "نیوگ" کے بارے میں سنا تھا۔ اس روایت کے مطابق اگر کوئی عورت اپنے خاوند سے اولاد حاصل کرنے میں ناامید ہو جاتی ہے تو اسے یہ حق حاصل ہے کہ وہ کسی بھی مرد سے اولاد حاصل کرنے کے لئے اس کے ساتھ جنسی تعلقات قائم کر سکتی ہے بشرطیکہ وہ مرد ضرورت مند عورت کے ساتھ صرف اتنے ہی وقت کے لئے تعلق رکھے جب تک کہ اس عورت کی ضرورت پوری ہو جائے۔ اس سے زیادہ ایک بھی پل کے لئے اس سے تعلق نہ رکھے اور عمر بھر کے لئے اس سے رشتہ منقطع کرے۔ شاید یہ روایت بعد میں اس لئے متروک ہوگئی کیونکہ اس کا بیجا اور غیر مناسب استعمال ہونے لگا۔

نہ جانے پریم پراگ کو یہ روایت آج کیوں یاد آنے لگی تھی۔ کیا وہ اپنی ماں کو حق بجانب ٹھہرانا چاہتی تھی ؟ اس کے مشتبہ کرتوتوں کے لئے سماجی سند پیش کرنا چاہتی تھی یا اپنے باپ کی بے بسی کے پیش نظر اپنی ماں کی وکالت کر رہی تھی ؟

اصل میں نیلے سوٹ والے شخص کی شخصیت میں اس نے بھی ایک جادوئی کشش محسوس کی تھی۔ اس کی اپنی بے قراری اس کی ماں کی بے

قراری سے کم نہ تھی ۔ وہ جواں سال تھی اور ضرورت مند تھی ۔ماں کے مقابلے میں وہ اپنے آپ کو اس شخص کا قرب حاصل کرنے کے لئے امیدوار سمجھ رہی تھی اور اس کے لئے اپنے آپ کو حق بجانب گردان رہی تھی ۔ یہ کشمکش بڑی عجیب تھی ۔اس کے جذبات بھڑک رہے تھے جسم تپ رہا تھا ۔ اعضاء مضمحل ہو رہے تھے اور ارمان تڑپ رہے تھے ۔

پریم پراگ نے دیکھا کہ بیٹھک کی بتی گل ہو گئی تھی ۔ اس نے موقعہ کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا ۔اس کے دل میں جو خواہش جنم لے چکی تھی اس کا ایک اچھا نتیجہ اس کے سامنے تھا ۔ وہ اپنے سسر کی آخری خواہش کو پورا کر سکے گی ۔ اس کے ضرور اولاد ہوگی ۔ نرینہ اولاد ۔ اسے پورا یقین ہو گیا تھا گھر میں چہل پہل ہوگی ۔ جشن ہوں گے ۔ خوشیاں منائی جائیں گی ۔ مٹھائیاں بانٹی جائیں گی ۔ صحرا میں گلاب کا پھول کھلے گا ۔ فضا معطر ہو اٹھے گی ۔ ہر سو خوشبو ہی خوشبو ہوگی ۔

وہ اپنے بستر سے اٹھی اور چپکے چپکے دروازے کی طرف آگے بڑھ گئی ۔ اس سے پیشتر کہ وہ دروازے کو دھکیلتے ہوئے بیٹھک میں داخل ہو، پیچھے سے ایک فولادی ہاتھ بڑی تیزی سے اس کی طرف بڑھا ۔ اس کے سر کے بالوں کو پکڑ کر اس نے اسے واپس گھسیٹ لیا ۔ پھر چنگھاڑ سے اس نے کہا ۔ "میں تمہاری ماں ہوں ۔ بدذات ۔ میں تمہیں ایسا ہرگز نہ کرنے دوں گی ۔ میری نظروں نے اسی وقت تیری نظروں کی مستی سے سب کچھ بھانپ لیا تھا جب نووارد اس مکان میں داخل ہوا تھا ۔"

۴ مختصر کہانیاں

ڈاکٹر نریش
پروفیسر و صدر
شعبۂ جدید ادب، پنجاب یونیورسٹی
چنڈی گڑھ ۱۶۰۰۱۴

ریندم پر گولہ باری

اخبار پر کم سے کم ملازمیں کی تنخواہ کا بار ڈالنے والے پرنٹر، پبلشر، ایڈیٹر جناب فلاں نے انگریزی ٹیلی پرنٹر پر موصول ہونے والی خبروں ہی سے نمائندوں کا کام لینا شروع کر دیا۔ ایک محنتی جوشیلے ملازم نے انگریزی میں موصول ہوئی خبر کی سرخی پڑھی۔

"جرمنس فائر ایٹ رینڈم۔"

اس نے اس کا ترجمہ کیا۔

"جرمنوں نے ریندم کے مقام پر گولہ باری کی۔"

یہی ترجمہ اگلے روز ان کے اخبار کی اہم ترین سرخی تھا۔

اردو کی آخری کتاب

دلی کے ایک پبلشر نے ابن انشاء کی "اردو کی آخری کتاب" کو دیوناگری رسم خط میں شائع کیا ہے۔ ہندی میں اس کتاب کا شائع ہونا ایک گہری چال ہے۔ اس چال کے ذریعے ہندی ادب کے قارئین یعنی اکثریت کو یہ سمجھایا جارہا ہے کہ اردو زبان کب کی ختم ہو چکی کیونکہ اس کی آخری کتاب لکھی جا چکی ہے۔ اردو سے ناآشنا ہندی کے قارئین اگر آخری کتاب کے بعد بھی اردو کی کوئی نئی کتاب تلاش کریں گے تو ان کی ایمانداری مشکوک سمجھی جائے گی۔

اردو ہندی کے دیرینہ تنازعے کی روشنی میں، اس اشاعت کے ذریعے اردو پر ایک اور گہری چوٹ کی گئی ہے۔ وہ یہ کہ اردو نثر کی تاریخ کو دو نسلوں ہی میں سمیٹ کر رکھ دیا گیا ہے۔ اردو کے پہلے نثرنگار سید انشاء تھے اور اردو کے آخری نثرنگار ان کے بیٹے یعنی ابن انشاء ہوئے۔ ان دونوں نثر نگاروں کے درمیان جو ادوار گزرے ہیں، ان کے بارے میں باخبر ہونا ہندی کے قاری کے لئے ضروری نہیں ہے۔

ماہنامہ انشاء کلکتہ

انگریزی میں جاسوسی

ضلع کے انگریز کلکٹر نے قریبی ریاست کے نواب کی نقل و حرکت کی تفصیلات معلوم کرنے کے لئے انگریزی جاننے کا دعویٰ کرنے والے ایک شخص کو نواب کی جاسوسی کرنے پر مامور کر دیا۔ حکم تھا کہ وہ شخص ہر روز نواب کی صبح سے شام تک کی تمام سرگرمیوں کی مفصل رپورٹ لکھ کر بھیجے گا۔

جاسوس نے پہلے دن ہی جو رپورٹ صاحب بہادر کو بھیجی، وہ یہ تھی۔

"دی نائین واٹرس سر (نوآب صاحب۔ فارسی میں نوآب یعنی 9 پانی) واز سٹنگ ان ہنزون اینڈ اے بانی (ڈیوڑھی) دیٹ اے ماسکیٹو اینٹر ہنزپی کوکی (موہری۔ پائنچہ۔ مور کا مؤنث موری)

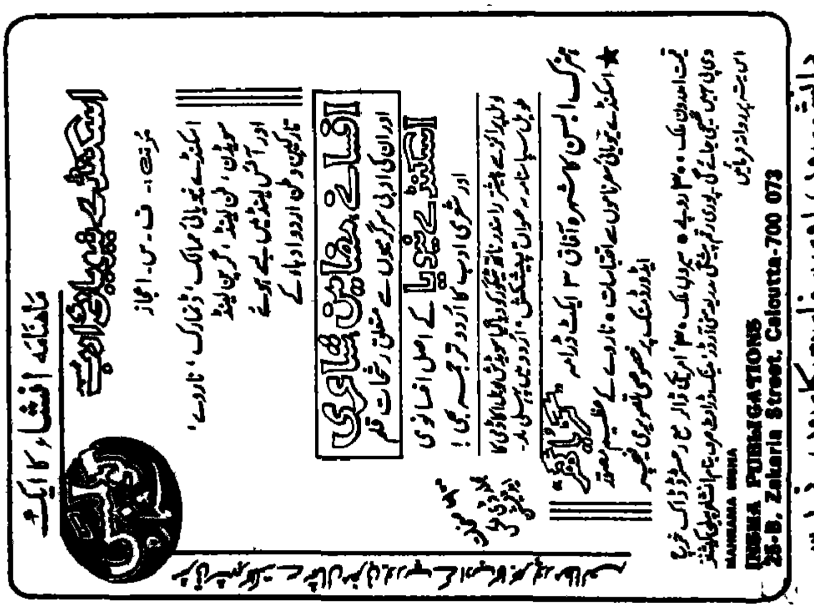
مذہبی نقطۂ نظر

سلیکشن کمیٹی کے ایک ممبر نے ہندی کے استاد کی اسامی کے لئے انٹرویو پر آئے ہوئے ایک امیدوار سے پوچھا۔

"ہندی ادب میں ملک محمد جائسی کے پدماوت کا مقام کیا ہے؟"

"معاف کیجئے شریمان جی، میں براہمن ہوں۔ ودھرمیوں (غیر ہندو) کی رچنائیں (تخلیقات) میں نے نہیں پڑھی ہیں کیونکہ اس سے من او بدھی (دل و ذہن) دونوں کے بھرشٹ ہونے کا خطرہ ہوتا ہے۔"

انٹرویو ختم ہوا تو ممبران تبادلہ خیال کرنے لگے۔ مندرجہ بالا سوال کرنے والے ممبر مذکورہ امیدوار کے سب سے بڑے حمایتی تھے۔



اردو دل اور سفارت کاروں نے اسے
ہندوستان اور اسکے نیوپال کے مابین
ادب و ثقافت کا اولین پل قرار دیا ہے۔
لہٰذا اگر آپکی لائبریری میں یہ
نہیں ہے تو وہ ادھوری ہے!

شفیق
B-1 گراؤنڈ فلور بلاک ۱
سکوائر کراچی

غزلیں

○

ی بات کیا نکل گئی میری زبان سے
ے تمام لوگ ہوئے بدگمان سے

رائیوں میں اس کی بلندی چھپی ملی
نی عظیم ہے یہ زمین آسمان سے

مانے میں میرگی کے پجاری کو کیا خبر
چھو تمازتوں کی چھپن سائبان سے

کبھی نہ میری کتابوں سے کھیلتے
میں خرید لاتا کھلونے دوکان سے

پنی زمین چھوڑ کے جانے لگا تھا میں
نے لگیں ہوائیں مگر بادبان سے

قتل گواہی دیتے ہیں ہر سو زمین پر
را نہیں عذاب کوئی آسمان سے

ڑکوں پہ پھر رہی ہے اجل ڈھونڈتی ہوئی
لے نہ کوئی شخص بھی عارف مکان سے

○

آندھیوں میں اک دیا جلتا ہوا رہ جائے گا
میں گزر جاؤں گا میرا نقش پا رہ جائے گا

خواہشوں کے سب پرندے شور سے اڑ جائیں گے
تو کھڑا خاموش یوں ہی دیکھتا رہ جائے گا

وار کر سکتا تو ہوں میں اپنے دشمن پر مگر
سوچتا ہوں درمیاں پھر فرق کیا رہ جائے گا

میں کسی پرچھائیں کے پیچھے نکل جاؤں گا جب
تو گلی کوچوں میں مجھ کو ڈھونڈتا رہ جائے گا

حرف جب مٹنے لگیں تم دیکھنا اوراق پر
خون دل سے جو لکھا ہوگا لکھا رہ جائے گا

بدگماں ہو کر بچھڑ جانے کا اس کے غم نہ کر
اب تو مل کر بھی دلوں میں فاصلہ رہ جائے گا

ڈوب کر ابھروں گا دریا پار میں عارف شفیق
مجمع احباب ساحل پر کھڑا رہ جائے گا

ضیاء اللہ ضیاء (معتمد اعزازی)
ماڈرن ٹکنیکل ایجوکیشن سوسائٹی پاکستان
25-D, Block " N"
North Nazimbad
Karach - 33

غزل

میرے مرنے پر وہ کہنا کیا ہوا
جاں چھٹی اس شخص سے اچھا ہوا

ہیں حسیں یوں تو محفل میں بہت
لو قسم جو کوئی بھی تم سا ہوا

بھول جاتے ہیں سبھی مرنے کے بعد
اب بھلادو گر مجھے تو کیا ہوا

دل کی بستی کو اجاڑا پھر کہا
یہ تماشہ دیکھنا کیسا ہوا

ہم نے سمجھا دوست ہے دشمن وہ تھا
کرکے حاصل راز دل چلتا ہوا

یہ ملائک کرتے ہیں سجدہ کسے
کوئی آدم آج پھر پیدا ہوا

جو ہوا پیدا مقدر موت ہے
اک ضیا گر مرگیا تو کیا ہوا

جمیل الرحمان جمیل
Kormelinkweg - 44
1104 NS Amsterdam
Holland

غزل

(نذر مجاز)

۔ منزل سامنے آئی نہ رستے کو حجاب آیا
رہے گردش میں پاؤں عمر بھر ایسا عذاب آیا

رواں آمادہ لمحوں میں یوں شام وصل بھی آئی
افق سے آفتاب اترا فلک پر ماہتاب آیا

وہ سیل عشق تھا آخر کہاں روکے سے رکتا تھا
مکیں بھی زیر آب آئے مکاں بھی زیر آب آیا

مقام وصل سے گزرے تو اس کے جسم کی خوشبو
رگ جاں میں اترتے ہی مقام احتساب آیا

جمیل اس کی محبت کا یقیں کرتے تو کیا کرتے
۔ باطن سے صدا آئی نہ ظاہر سے جواب آیا

حضرت شاہ
19, Park Way
West Bowling
Bradford BD 5 8 Q D
England

غزل

کس کام کا ہے دل جو محبت نہیں ملتی
جینے کا مزہ کیا جو یہ دولت نہیں ملتی

کیا جاکے سنائیں اسے رودادِ غم دل
کرنے کی جسے بات بھی فرصت نہیں ملتی

سرمایہ پرستوں کا یہی دور ہے جس میں
مزدور کو محنت کی بھی اجرت نہیں ملتی

اس دور میں سرمایہ ہے عزت کی ضمانت
مفلس ہو جو انسان تو عزت نہیں ملتی

حق بات کہے ، اور سر دار پہنچ جائے
ایسی کسی انسان میں جرأت نہیں ملتی

گلشن کھنہ
92, Grove Road,
Hounslow,
Middx TW 3 3 PT (UK)

غزل

یارب یہ کیسا آج کا انسان ہوگیا
تخلیق کرکے تو بھی پشیمان ہوگیا

موسم بہار کا تھا خزاں جلد آگئی
ہنستا ہوا چمن مرا ویران ہوگیا

لوٹا ہے جس نے شہر کے صبر و قرار کو
وہ شخص میرے شہر کا سلطان ہوگیا

ایسے نئے چلن کی چلیں آندھیاں یہاں
انسان اپنی ذات میں حیوان ہوگیا

مشکل میں گھر گئی ہے مری زندگی کی ناؤ
مرنا کسی کے عشق میں آسان ہوگیا

چاہا تھا میں نے دل سے کبھی تجھ کو ٹوٹ کر
وہ حادثہ حیات کا عنوان ہوگیا

اتنا حسین ہے مرے گلشن کا بانکپن
ہر گل مری نگاہ میں ذیشان ہوگیا

نجات دہندہ کی تلاش

ہندی : وجے
729 لکشمی بائی نگر
نئی دہلی-110023

اردو ترجمہ : حیدر جعفری سید
79/112 بانس منڈی
کان پور-208001

چیمبر کے باہر لگی چمکتی ہوئی براس نیم پلیٹ پر لکھا ہے "کرن کمار کمشنر آف پولیس"۔ دروازہ کے اوپر سرخ اور سفید گوب لگے ہیں۔ اچانک گوب میں روشن بلب بجھتا ہے۔ کرن کمار باہر آتے ہیں۔ چپراسی بریف کیس پکڑے پیچھے پیچھے نکلتا ہے۔ باہر بڑے سے ہال میں وزیٹرس ویٹنگ روم ہے۔ کرن کمار والے کمرے کے بغل میں ان کے سکریٹریوں کا کمرہ ہے جس میں ایک مرد اور ایک لڑکی بیٹھتی ہے۔

ہال میں داخل ہوتے ہی کرن کمار کی نگاہ اچانک سر جھکائے بیٹھے پروفیسر کرنال پر پڑتی ہے۔ پہچان لینے کے باوجود لگتا ہے کہ یہ وہ شخص نہیں ہے۔ کرن کمار نے محسوس کیا کہ یہ شخص صرف زندہ ہے۔ اس کے اندر کی تمام حرارت ختم ہو چکی ہے۔ سوائے ایک امید کے سب کچھ ختم ہو چکا ہے اور اس امید سے کترانے ہی کے لئے نام کی سلپ دیکھنے کے بعد پیپر ویٹ کے نیچے دبا دی تھی۔ انہیں بلایا نہیں تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ ایکسکیوزیز EXCUSES کی بھی اپنی ایک حقیقت ہے۔ کوئی نقاب نہ اوڑھے تو اس کا وجود پاش پاش ہو جائے۔ ندامت چہرے کے بجائے دل کو بلیڈ کی طرح سلائسوں میں کاٹ ڈالے۔

کرن کمار پروفیسر کرنال کی طرف لپکے۔ پروفیسر کرنال نے انہیں دیکھ لیا۔ ترئی کی سوکھی بیل جیسے جھولتے چہرے پر زندگی کی رمق دوڑ گئی،
چرن چھونے کے بعد کرن کمار نے "ارے آپ!"

"تم سے ملنے آیا تھا لیکن بلاوا نہیں آیا" الفاظ سے ناراضگی جھلک رہی تھی۔

"شاید وہ لوگ سلپ بھجوانا بھول گئے ہوں گے" کرن کمار نے پی۔ اے کے کمرے کی طرف اشارہ کیا۔ بات کا سلسلہ دوبارہ شروع کرتے ہوئے بولے "چلئے اچھا ہی ہوا۔ یہاں بھیڑ اور جلد بازی میں بھلا کیا بات ہوتی۔ اب گھر پر لنچ لیتے ہوئے بات کریں گے"۔ اندر ہی اندر شہر کے تمام اندیشوں کو برداشت کر لینے والے کرن کمار نے مسئلہ کو ایک طرف دھکیلتے ہوئے سوچا کہ اس طرح زیادتی کا کچھ تدارک بھی ہو جائے گا۔ پھر انہیں احساس ہوا کہ پروفیسر سے کوئی بھی ملاقات اعتماد کی سطح پر ممکن نہیں ہے۔ صرف ایک ظاہری مروت ہوگی جیسے ایک دوسرے سے نفرت کرنے والی دو ہستیاں اپنے اختلافات کے باوجود آپس میں گلے ملتی ہیں۔ اس دور میں سیاسی ٹوپی یا سفارش کے بغیر بھلا کیسے انصاف مل سکتا ہے۔ پھر وہ کہاں سے پروفیسر کرنال کو انصاف دلوا دے۔

پروفیسر کرنال پیچھے پیچھے چل دیتے ہیں۔ کمرے سے جھانکتی سکریٹریوں کی جوڑی کو تعجب ہوتا ہے کہ جسے اندر بلایا بھی نہیں اسی کو اپنے ہمراہ لئے جا رہے ہیں ان کے چرن بھی چھوئے۔ انہیں کیا معلوم کہ کچھ چہرے اتنے نازک ہوتے ہیں جنہیں آئینے سے دیکھنے پر بھی چوٹ لگ جاتی ہے ان کے سامنے آنا تو ایک مجبوری ہے۔

کرن کمار کار میں پروفیسر کرنال کو اپنے پہلو میں بٹھاتے ہیں۔ خود ادھر بیٹھتے ہیں جدھر سایہ ہے تاکہ پروفیسر کرنال پر گنگنی دھوپ کی حرارت قائم رہے۔ وہ سر جھکائے اپنے آپ میں گم پروفیسر کرنال کا بنظر غائر جائزہ لیتے ہیں۔ کبھی لمحہ بھر کے لئے بھی سست نہ ہونے والا شخص وقت کی

گلی میں ایک بھدے پوسٹر کی طرح لٹک کر رہ گیا ہے۔ پہچان کا قطرہ قطرہ ..... سوکھ گیا ہے۔ وقت نے امنگ کے نخلستان کو کیکٹس کے جنگل میں بدل دیا ہے۔

کار میں اپنی سہولت کے لئے راہگیروں کے ہجوم کو دھول کے بگولوں میں چھوڑنا پروفیسر کو کچھ عجیب سا لگتا ہے۔ جیسے سکھ، دکھ کو ٹھینگا دکھا رہا ہو۔ انہیں محسوس ہوتا ہے کہ پیدل چلنے والے اور کار یا ہوائی جہاز میں سفر کرنے والے آدمی کی معاشیات میں نمایاں فرق ہے جب کہ وہ خود صرف ایک ہی معاشیات پڑھاتے رہے ہیں۔

"ماتا جی خیریت سے ہیں؟" کرن کمار نے پوچھا

پروفیسر امیر اور غریب کی معاشیات سے باہر نکل کر جواب دیتے ہیں "ہاں ٹھیک ہی ہیں"۔ اندر ایک خلش بے چین کرتی ہے کہ بات کیسے کی جائے؟ کہاں سے شروع کی جائے؟ کیا کرن کمار کو کچھ بھی معلوم نہیں ہے؟

پروفیسر کرنال، کرن کمار کی مجبوری سے واقف نہیں ہیں۔ انہیں کیا معلوم کہ خط ملتے ہی کرن کمار نے اس شہر کے پولیس محکمہ کو فون کیا تھا۔ ڈی۔ ایس۔ پی سے بات ہوئی تھی لیکن تفصیل ملتے ہی کرن کمار نے خاموشی کا لبادہ اوڑھ لیا تھا۔ جواب نہ دے سکے۔ اتفاق ہے کہ تین برس بعد اسی شہر میں وہ پروموشن ٹرانسفر پر آنا پڑا۔ جانتے ہوئے بھی نہ جاننے کی اداکاری کرنی پڑ رہی ہے۔ اندر ہی اندر ندامت کریدتی ہے لیکن وہ کیا کر سکتے ہیں کمشنر کی کرسی کا ہر پایہ سیاست کی ریت پر ٹکا ہوا ہے اور پروفیسر کی گرود کشنا کا مطلب ہے ابھی ضیو بننا، چکر دھیو توڑنے میں مرجانا، مٹ جانا۔

کوٹھی دور نہیں تھی کل ۷۔ ۸ منٹ لگے پہنچنے میں۔ شاندار گیٹ پر پہنچتے ہی ٹھنڈی ہوا نے استقبال کیا۔ چاروں طرف اشوک، گل مہر، آم اور جامن کے چھتنار درخت۔ بیچ میں اچھا باغ، فوارہ، پروفیسر کو لگا کہ گرمی کے باوجود تمام شہر کی ہریالی کمشنر کی کوٹھی پہ پہرہ دیتی ہے اور جمہوریت کی نسبت بنانے والی بستیوں کا نل بھی تشنہ لبی کا شکار رہتا ہے۔ جمہوریت کی معاشیات نہ جانے کیسے غریبوں کے ہاتھ میں ریت کا ڈھیر اور امیروں کے ہاتھ میں شربت کی بوتل بن جاتی ہے۔

اندر ڈرائنگ روم میں بری ٹیک کا نفشین فرنیچر، بالزک کے تخیل کو عملی جامہ پہنا رہا تھا۔ چمچماتے فریموں میں غیر ملکی مناظر اپنی رنگینیاں بکھیر رہے تھے۔ کھڑکیوں پر پیل میٹ راڈ کے ساتھ کیکٹس لٹک رہے تھے۔ پیروں کے نیچے ایرانی قالین۔ پورے ڈرائنگ روم میں پروفیسر کرنال کو ہندوستان نظر نہیں آیا۔

اندر سے واکل کی سفید ساڑی اور سلیولیس بلاؤز میں سینا آتی ہے۔ پروفیسر چھت پر گھومتے پنکھے پر نظر جمائے ہوئے ہیں۔ سینا ہنستی ہے "نمستے سر"۔ پروفیسر کرنال چونک جاتے ہیں۔

"آپ نہیں پہچان پائیں گے۔ بیس سال بیت گئے ہیں" سینا دوبارہ ہنستی ہے نوکر ٹرے پر رکھے گلاس میں پانی لاتا ہے۔ سینا کہتی ہے "میں سیما ہوں، بی۔ اے میں آپ ہی سے اکنامکس پڑھی تھی۔ ایک بار اپنی سونے کی چوڑیاں پڑوس میں بیٹھی لڑکی کو دکھا رہی تھی تو آپ نے پکڑ لیا تھا اور چوڑیاں اپنے پاس رکھ لی تھیں۔ پیریڈ ختم ہونے ہی پر واپس کی تھیں۔ میں پورے پیریڈ میں روتی رہی تھی مجھے اندیشہ تھا کہ آپ نہیں دیں گے"۔

پروفیسر کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ ابھرتی ہے۔ جانے کتنے چہرے سامنے سے گزرے ہیں اور وہ آئینہ کی طرح دیوار پر ٹنگے رہے ہیں۔ وہ تو کرن کمار سے خاص تعلق تھا۔ لہذا یاد رہا۔ پھر شادی پر کرن کمار نے کارڈ بھیجا تھا۔ تب فرصت کہاں تھی ان کے پاس۔ جگہ جگہ سیمنار، سمپوزیم میں economics of socialist countries کے موضوع پر بولنے سے فرصت ہی نہیں ملتی تھی۔ لگتا تھا ملک کے اقتدار پر قبضہ جمانے والے نوجوانوں کو آدرش گھٹی پلا رہے ہیں۔ آج محسوس کرتے ہیں کہ زندہ وہ ہے جو لگاتار زندہ رہتا ہے۔ جیسے لاکھوں کروڑوں لوگوں کے ذریعہ جی جانے والی غریبی اور چند افراد کے ذریعہ لطف اندوز کی جانے والی امیری۔ باقی جو کچھ ہے وہ ہے کاغذوں پر اکنامکس کے روپ میں پھیلایا ہوا غلط نمبروں کا جال۔

کوئی جواب نہ ملنے پر سینتا اندر کی طرف چلی جاتی ہے۔ وردی اتار کر اندر سے آنے والے شوہر سے کہتی ہے "کہاں سے لے آئے بوڑھے کھوسٹ کو؟ بور کر دیا"۔

کرن کمار کچھ نہیں کہتے۔ آکر سامنے بیٹھ جاتے ہیں الفاظ تلاش کرتے ہوئے پروفیسر کرنال پوچھتے ہیں "بچے؟"

"ایک ہے" "اجمیر کے میو کالج میں   اس صوبے میں تو   "کہتے کہتے رک جاتے ہیں کہنا چاہتے تھے کہ اس صوبے میں اس ڈھنگ کا کوئی کالج نہیں ہے لیکن اپنا ماضی اور پروفیسر کرنال کی موجودگی الفاظ کی ڈور کاٹ دیتی ہے۔ کرن کمار سب کچھ جانتے ہوئے بھی، جاننے کا اشتیاق ظاہر کرتا ہے۔ پروفیسر کرنال کے اندر شک پھر انگڑائی لیتا ہے۔ کیا کرن کمار تجاہل عارفانہ سے کام لے رہا ہے یا پھر اسے واقعی پتہ نہیں ہے۔ لیکن یہ بات تو اخبارات میں بھی شائع ہوئی تھی۔

پولیس کمشنر سے بات کرنے کے بعد کرن کمار نے اپنے خسر ریٹائرڈ جج نرمل کمار سے بھی مشورہ کیا تھا۔ انہیں مکمل تفصیلات فراہم کی تھیں۔ خسر نے سمجھایا تھا کہ "تم کیا کر سکتے ہو؟ پولیس، اسمبلی اور خود جنتا جس کی مخالفت کر رہی ہو اس میں بھلا تم کیا کر سکتے ہو؟ تمہاری کوشش تمہارا کیریر برباد کر سکتی ہے لیکن انہیں انصاف نہیں دلا سکتی۔ پھر اس سے کیا فائدہ ہوگا؟ ہم جس دور سے گزر رہے ہیں وہ ست یگ ہے نہ ترتا اور نہ دواپر۔ آج ہر چیز پر اور انصاف پر بھی اسی کا اختیار ہے جس کے پاس طاقت ہے مظلوم کا مفہوم اب کسی بھی ڈکشنری میں نہیں ہے جو گواہ خرید کر مقدمہ نہ جیت سکے وہی مظلوم ہے"

"لیکن ان کے احساسات؟" کرن کمار اپنی آتما کی آواز سن کر اوپر اٹھتے ہیں۔

"روپیہ پیسہ دے کر چھٹی کرو" ریٹائرڈ جج نے فیصلہ سنا دیا تھا۔

کرن کمار نے محسوس کیا تھا کہ جس پولیس پر عوام کے تحفظ کا دارومدار ہے وہ پالیٹکس کے ہاتھ میں مداری کا بندر بن کر رہ گئی ہے۔ گاندھی جی کا رام راج اندر دیوتا کی طرح منہ چھپا کر آنکھ سے اوجھل ہو گیا ہے اس کی وہ آواز فنا ہو گئی ہے کہ ہجوم کے جھوٹ کے سامنے جس دن اکلوتے سچ کی جیت ہوگی اسی دن رام راج ہوگا آج سچائی گندی نالیوں میں دیسی شراب کی بوتلوں کی طرح چھپی پڑی رہتی ہے وردی کے اندر کرن کمار نے اپنے جسم میں چھپی آتما کو بہت مجبور پایا تھا راحت اور عہدے نے ہمت کے طوطے کی گردن دبوچ لی تھی   "اگر تو نے بولنے کی جرأت کی تو تجھے ہلاک کر کے سڑک پر چھوڑ دیں گے"۔

پروفیسر کرنال کہہ رہے تھے "کرن! دکھ اس بات کا نہیں ہے کہ سریتا کی زندہ لاش بتدریج عمر سے پیچھے جارہی ہے اس کے دانت ٹوٹ چکے ہیں اور ملی سے، دودھ پلانا پڑتا ہے۔ بال جھڑ چکے ہیں اور کنگھی چوٹی یا کو آرائش حسن سے کوئی واسطہ نہیں ہے جب وہ ۲-۳ برس کی تھی تب تم نے دیکھا تھا جب ۲۰ برس کی تھی تب دیکھتے سراپا حسن تھی

پروفیسر کرنال بولتے رہتے ہیں اور کرن کمار ماضی میں ڈوبتے جاتے ہیں۔ پرائیوٹ ملازمت کے ساتھ ایم۔ اے کلاسز میں پوری حاضری ممکن نہ تھی فارم بھرنے کا وقت آیا تو حاضری دو فی صد کم تھی پروفیسر کرنال نے وائس چانسلر کو بتایا تھا کہ لڑکا محنتی اور ذہین ہے۔

"قانون قانون ہے پروفیسر" وائس چانسلر نے جواب دیا تھا۔

"سر میں گارنٹی دیتا ہوں پوزیشن کی۔ اسے امتحان دینے دیجئے ورنہ میں ریزائن کر دوں گا" پروفیسر کرنال کے لہجے میں پختگی تھی۔

طلباء پروفیسر کرنال کو بہت چاہتے تھے اس لئے انہوں نے خاص رعایت دے دی۔ امتحان کے بعد وہ اسے سول سروس کے لئے جی جان سے پڑھانے لگے تھے۔ گھر میں ۲-۳ برس کی سریتا اور ۴ برس کا اچل تھا۔ پروفیسر نے لیٹ میرج کی تھی چالیس کے بعد۔ بیوی ناپتی ناراض ہوتی "کچھ مستقبل کی بھی سوچئے"۔

پروفیسر کرنال نے ہنس کر کرن کمار کے سامنے ہی کہا تھا "کتنے کھیتوں میں بیج اور کھاد ڈال رہا ہوں۔ ناپتی کیا ایک بھی کھیت نہیں لہلہائے

ہوئی فیصل نہ دے گا ؟ " پھر کرن کمار کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا تھا "کیا تم سیریتا اور اچل کا خیال نہ رکھو گے ؟ اگر ضرورت پڑی تو سر اجان دے کر بھی " کرن کمار نے اعتماد کے ساتھ کہا تھا لیکن آج سیریتا ایک زندہ لاش ہے اور اچل قاتلوں کی رسی پر جھول کر، خودکشی کی سند بٹور کر نہ جانے کہاں چلا گیا۔ اس عہد کو یاد دلانے کے لئے سامنے بیٹھے تھے فقط پروفیسر کرنال۔

وہ کہہ رہے تھے " دکھ اس کا نہیں ہے اچل کا قتل ہوا اور میں ٹوٹ کر بوڑھا ہو گیا۔ دکھ ہے عقائد کے ٹوٹنے کا۔ ایک لڑکی بے عزت ہوئی۔ اس کی عزت کا مول تو کیا ملتا زانیوں کو حکومت نے ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ اچل کا قتل ہوا تو اسے پولیس نے خودکشی قرار دے دیا۔ کیا یہ رام، کرشن اور گوتم بدھ کا ملک ہے ؟ کیا یہ جمہوریت ہے ؟ کیا یہاں قاتلوں اور زانیوں کو سزا ملتی ہے ؟ بھوکے کی آنتوں سے روٹی کھینچ کر اس سے جانوروں کی طرح کام لیا جاتا ہے ؟ کیا اسے سوراج کہیں گے ؟ پروفیسر کرنال ہانپنے لگے تھے " مجھے صرف انصاف چاہیے تاکہ امید کے ایک چراغ کو روشنی دیتے ہوئے دیکھ کر آخری سانس لوں نہ کہ اس یقین کے ساتھ کہ ملک میں انسانیت کی حکومت نہیں ہے " ۔

کرن کمار کو کھانے کے دوران پروفیسر کرنال کے خط کا ایک ایک لفظ یاد آ گیا " تم نرمدہ سنگھ کو جانتے ہو جس کا باپ نائب وزیر ہے۔ میں تو ریٹائر ہو گیا ہوں۔ اچل نے بھاگ دوڑ کر ایک کالج میں لیکچرر شپ حاصل کر لی تھی۔ سیریتا ایم۔ اے فائینل میں تھی۔ نرمدہ اس کا ہم جماعت تھا۔ اس نے ایک آدھ بار سیریتا کو چھیڑا۔ اچل نے گھر جا کر ڈانٹ ڈپٹ دیا۔ گزشتہ ماہ نو تاریخ کو ہیڈلے پارک میں ملی سیریتا گرایا گیا تھا۔ زانی کون تھے پتہ نہیں۔ ڈاکٹر بھی اندازہ نہیں لگا سکے۔ وہ آج بھی بے ہوش ہے۔ ڈاکٹر کہتے ہیں کہ دماغ کے اندر چوٹ ہے۔ صحت یاب ہو جائے گی تو ٹھیک ہو جائے گی۔ دس تاریخ کو اچل نرمدہ کی کوٹھی پر پہنچا۔ لیکن اسے اندر داخل ہونے نہیں دیا گیا۔ اسے بتایا گیا کہ نرمدہ تو چار دن سے دلی گیا ہوا ہے۔ وہاں سے واپس آکر اچل چیختا چلاتا رہا تھا۔ اندر چھپا ہوا آتش فشاں پھٹ پڑا تھا۔ ہمیں کیوں لکھایا پڑھایا ؟ کیوں انسانیت کا درس دیا جب کہ دنیا میں انسان بستے ہی نہیں۔ اگر پولیس میں سپاہی لگوا دیا ہوتا تو ہاتھ میں ایک ڈنڈا تو ہوتا۔ نرمدہ جیسے غنڈے کا سر تو پھوڑ سکتا تھا۔ آپ نے ہاتھ میں قلم پکڑا کر کیا دیا ہمیں ؟

کرن اا اچل ہمیں رو رہا تھا انسانیت روئی تھی۔ میں وی۔ سی کے پاس گیا لوٹا دیا گیا۔ " ہم سے کیا مطلب ؟ دس برس ہو گئے ریٹائر ہوئے۔ پھر اچل نے خودکشی کی ہے بہن کے غم میں " ۔

اخبارات کے دفاتر میں گیا۔ وہاں نرمدہ کی طرف سے دھمکی اور رشوت پہلے ہی پہنچ چکی تھی۔ اچل رات میں ماں کو کھانا دینے ہسپتال جا رہا تھا۔ تاپتی انتظار کرتی رہی۔ لیکن بیٹا وہاں نہیں پہنچا۔ جس پارک میں بہن کی عصمت کو مٹی میں ملایا گیا وہیں ایک درخت پر اسے رسی سے لٹکا دیا گیا۔ بارہ تاریخ کی صبح کو اس کی لاش ملی۔

سیریتا کے ساتھ زنا بالجبر کی رپورٹ درج ہو گئی لیکن پیپرویٹ کے نیچے دب گئی۔ سیریتا خود بیان دے گی جب پولیس کارروائی کرے گی۔ اچل کے قتل کو خودکشی کا روپ دے دیا گیا۔

" کیا کروں کرن ؟ آج تک تعمیری عقائد تقسیم کرتا رہا تھا اور اب تمہارے سامنے انصاف کا طلب گار ہوں اگر آدمی کو انصاف نہیں ملا تو وہ حیوان بن جائے گا . اس ملک کا کیا ہو گا ؟ یہ کالج، یہ اسکول آخر کس لئے ؟ یہ عبادت گاہیں اور کچہریاں کس لئے ؟ "

کھانا ختم ہو گیا۔ کرن کمار نے بجھی ہوئی آواز میں کہا " سر میں فائل دیکھوں گا اس کے بعد ہی کچھ کہہ سکتا ہوں " ۔

ڈرائیور پروفیسر کرنال کو کار سے چھوڑ آیا۔ سینا نے آفس جاتے ہوئے شوہر سے کہا تھا " آج کی اسپریچوئل کلاسز کی باتیں بتانا چاہ رہی تھی کیسی شاندار باتیں بتائی تھیں سوامی پرمانند نے۔ لیکن اس بوڑھے نے موڈ چوپٹ کر دیا " ۔

کرن کمار سر جھکائے دفتر کے لئے گاڑی میں جا بیٹھے تھے۔ لگتا تھا کہ ان کا یہ عشر آدھا جھوٹ بول گیا تھا۔ دفتر پہنچ کر کرن کمار سب کچھ بھول گئے۔ لوگوں کی شکایتوں سے زیادہ فون وزیروں اور اسمبلی کے ممبروں کے تھے۔ احکامات۔ کل پولیس فورس ان کے جلوس اور سیکیورٹی پر تعینات رہتی اور

باقی شہر۔ بھگوان کے حوالے۔ کرن کمار کو لگا کہ تمام شہر شیطانوں سے آباد ہو گیا ہے جو اقتدار کے نشے میں اندھے ہو کر انسان کو چیر کر اس کا خون بطور شراب کے پی رہے ہیں۔ ان حالات میں پروفیسر کرنال جیسے اکا دکا بر گزیدہ ہستیوں کو تو پاگل کا لیبل بننا ہو گا۔ تبھی (اندر دیوتا کی بیوی) کو تو برداشت کرنا ہی ہو گا۔ دنیا بابھر۔

رات بے چینی سے کٹی۔ بار بار شیجی کا مخنی جسم درد سے چلاتا ہوا دکھائی دیا۔ دو مردہ ہاتھ انسانی آواز میں روتے نظر آئے۔ چاروں طرف گدھ، چیل اور کوے اڑتے ہوئے دکھائی دیئے۔ احساس ہوتا رہا کہ انسان محض موت کا شکار ہے یا موت کا مسیحا۔ اسمگلر، غنڈے، چور بازاریئے، اچکے، ڈاکوؤں کے قہقہے کانوں میں سیسہ پگھلاتے رہے۔ بار بار خیال آتا رہا کہ غنڈہ گردی کے چکر کو توڑنے کے لئے ایک بھی ابھی منیو نظر نہیں آتا ہے۔

کرن کمار نے صبح اٹھتے ہی ایک اور فیصلہ کیا خسر کے الفاظ یاد آئے "تم کیا کر سکتے ہو بس پیسے سے مدد کرو" ایک ہلکا سا سکون رگ رگ کو سہلانے لگا۔ بریف کیس میں دس ہزار کے نوٹ ڈال کر کار کی طرف بڑھے۔ سینتا نے راستہ روکا "جلدی آنا۔ میں تمہیں ناشتہ کرانے کے بعد اسپریچول کلاس جاؤں گی۔ سنڈے کو تمہیں بھی لے چلوں گی ایک بہانہ بھی نہیں سنوں گی۔ کہتے ہیں کہ سوامی جی نے کتنے ہی لوگوں کا کایا کلپ کر دیا ہے۔ سوامی جی بے حساب روحانی قوت کے مالک ہیں"۔

کرن کمار باہر برآمدہ میں رام کرشن پرم ہنس، ویویکانند، گوتم بدھ، سوامی دیانند کی نئی لگی تصویروں پر نظر ڈالتا ہے روحانیت کا بھوت سوار ہے سینتا پر۔ لیکن یہ روحانیت ہے یا فیشن "روحانیت تو بیراگ ہے، رحم ہے، خدمت ہے اور عبادت ہے۔ کیا کرم یوگ، دھرم یوگ، گیان یوگ اب ایئر کنڈیشنڈ کمروں کے محتاج ہو گئے ہیں؟" اس کے لبوں پر ایک طنزیہ مسکراہٹ ابھرتی ہے۔ خیال آتا ہے کہ گھر ہو یا دفتر اس کا وجود کٹھ پتلی کا وجود ہے۔

وہ گاڑی ایک عرصہ بعد اسی سڑک پر دوڑا دیتا ہے جس پر کبھی روز پیدل گزرتا تھا۔ ونڈ اسکرین پر بار بار موسم سرما کی صبح کا کہرا قلعی کر جاتا ہے، لگتا ہے ہوا جیسے سیٹی مار رہی ہو۔ وہ گینڈا سنگھ چوک پر اسپیڈ ہلکی کرتا ہے، یادداشت پر زور دے کر داہنے مڑ جاتا ہے۔ بغیر سمنٹ کی چھوٹی سی کوٹھی کی تصویر ابھرتی ہے۔ پروفیسر نے کوٹھی تو بنوالی تھی لیکن وہ سمنٹ کا بندوبست نہیں کر سکے۔ اب تو اینٹیں بھی اکھڑ گئی ہوں گی۔ وہ گاڑی گلی کے نکڑ پر چھوڑ کر آگے بڑھتا ہے گلی میدان میں جاکر نکلتی ہے۔ پاؤں ٹھٹھک جاتے ہیں۔ ایک منزلہ کوٹھی پوری کی پوری جلی پڑی ہے۔ ہجوم میں سے کوئی بتاتا ہے "کل میں چھ بجے تھے۔ اب تو جل بھن چکے ہوں گے۔ چھ بجے فون کیا تھا فائر بریگیڈ کو" کرن کمار گھڑی دیکھتا ہے۔ پونے سات بجے ہیں۔ وہ آگے بڑھتا ہے۔ دو سپاہی بھیڑ کو کنٹرول کرنے میں لگے ہوئے ہیں کرن کمار بھیڑ میں سے آگے بڑھتا ہے تو ایک سپاہی دھکا دے کر جھڑکتا ہے "ہٹ پیچھے"۔

کرن کمار دھکا برداشت کر جاتا ہے۔ بھیڑ اس پر ہنستی ہے وہ سپاہی کی کلائی دبوچ لیتا ہے "میں کرن کمار سی۔ پی ہوں"۔ سپاہی کی گھگی بندھ جاتی ہے فوراً قدم بوسی کے لئے جھک جاتا ہے دوسرا سپاہی دوڑتا ہوا آتا ہے۔ جذبات پر قابو پانے کے بعد کرن کمار حکم دیتا ہے۔ دوسرا سپاہی ایس۔ ایچ۔ او اور فائر بریگیڈ کو فون کرنے بھاگتا ہے۔ پندرہ منٹ میں پوری فورس آجاتی ہے کرن کمار سوچتا ہے کہ پولیس اور دیگر پبلک سروسز عوام کے نہیں ہیں بلکہ فرد کے لئے ہیں۔ پیسہ اور عہدہ کے لئے ہیں۔ وہ خود اپنے سے شرم محسوس کرتا ہے تمام ملک وحشیوں کے شکنجہ میں گرفتار ہے۔

فائر بریگیڈ بجھی ہوئی آگ سے تین جلی ہوئی لاشیں نکالتا ہے۔ کرن کمار پہچاننے کی کوشش کرتا ہے۔ احساس ہوتا ہے کہ پہچان کا ایک ایک ذرہ جل چکا ہے وہ ایس۔ ایچ۔ او پر بگڑتا ہے "یہی ہے تمہاری ڈیوٹی" مکان جل گیا اور تمہیں خبر بھی نہیں ملی"۔

ہجوم میں سے کوئی کہتا ہے کہ "جو چیخ پکار ہوتی تو سب کچھ معلوم ہو جاتا یہاں تو سب اندر رضائی میں دبک کر سوتے ہیں" کرن کمار کو یاد آتا ہے کتنے ارمان سے کالونی میں مکان بنوایا تھا پروفیسر نے "دل میں ایک سوال ابھرتا ہے "آگ لگی یا لگوائی گئی؟"

کرن کمار، ایس۔ ایچ۔ او کو سخت احکامات دینے کے بعد کار کا دروازہ کھولتا ہے تو سامنے بریف کیس نظر آتا ہے۔ خیال آتا ہے کہ وہ پروفیسر

کر مال کا قرض ادا نہیں کر سکا۔ آنسو پلکوں تک آتے آتے رک جاتے ہیں۔
کار چوراہے سے چوڑی سڑک پر دوڑتی ہے۔ سر ہلکا ہو جاتا ہے لگتا ہے ہر ثبوت ختم ہو گیا۔ تمام شکایتیں رفع ہو گئیں۔ اب کون انہیں قصوروار ٹھہرائے گا؟ زمین کی بات کون جانتا ہے؟ دعویدار نہیں تو معاوضہ کیسا؟ وہ ادائیگی فرض سے نجات پا چکا ہے۔
اچانک اسے محسوس ہوتا ہے کہ یقیناً اس آگ کے پیچھے بھی نرمدہ کا ہاتھ ہے۔ وہ پروفیسر کو ختم کرنے کے بعد اب اس پر ہاتھ ڈالے گا۔ سڑکوں کے غنڈوں سے نمٹا جا سکتا ہے لیکن ان نیتاؤں کی غنڈہ گردی کا کوئی علاج نہیں۔ ہر گلی کوچے میں ان کے غنڈوں اور ڈنڈوں کا راج ہے۔ وہ اندر ہی اندر کانپ جاتا ہے ارے پولیس کمشنر پر بھلا کون ہاتھ ڈالے گا لیکن یہ خیال بھی ان کی ڈھارس بندھانے سے قاصر رہتا ہے۔
گاڑی سے اتر کر یونی فارم پہننے اندر جاتے ہیں ہوم منسٹر اور چیف منسٹر سے ملنا ہوگا۔ ہر بات بتانی ہوگی ورنہ ٹرانسفر ہو جائے گا۔ نرمدہ سے بچاؤ کرنا ہے۔ آئینہ کے سامنے کنگھا کرتے ہوئے لگتا ہے کہ گوریلا نظر آنے والا ایک نیتا اس کی گردن دبوچنے آگے بڑھ رہا ہے وہ پھرتی سے مڑتے ہیں۔ پیچھے سینا تھی۔
سینا ہنستی ہے "چونک گئے؟"
"ہاں!"
"جلدی تیار ہو گئے۔ ابھی تو ناشتہ بھی نہیں بنا؟"
"میں آفس میں منگوا لوں گا" پھر کچھ سوچ کر کہتے ہیں "آج سوامی جی کے ہاں نہ جانا"
"کیوں؟" سینا اٹھلاتی ہے۔
"کچھ ایسی ہی بات ہے" کہتے ہوئے وہ باہر نکل جاتا ہے۔
وہ ڈرائیور کو کار ہوم منسٹر کے بنگلے کی طرف ڈرائیو کرنے کا آرڈر دیتا ہے سڑک پر خاصی دھوپ تھی گاڑی بھیڑ والی سڑک چھوڑ کر صاف ستھری اور خالی سڑک پر آجاتی ہے اچانک ایک ادھیڑ عمر آدمی کے پیچھے سات آٹھ آدمی دوڑتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ڈرائیور کار روک دیتا ہے اور قریب سے گزرتے ہوئے ادھیڑ عمر آدمی کو بانہوں میں جکڑ لیتا ہے تعاقب کرنے والے اسے مارنا چاہتے ہیں لیکن کرن کمار روک دیتا ہے ان لوگوں میں سے کوئی ایک اسے پہچان لیتا ہے، ادھیڑ بھاگنے کی کوشش نہیں کرتا۔
جذبات میں ڈوبے ہوئے لوگ کہتے ہیں "اس نے نرمدہ سنگھ کا قتل کیا ہے، ہم اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے"۔
کرن کمار جھنجھنا جاتے ہیں۔ کیا یہ ممکن ہے؟ کہاں سے آگئے ابھی منیو؟
وہ ادھیڑ سے پوچھتا ہے "تم نے قتل کیا ہے؟"
"ہاں کیا ہے۔ مجھے تھانے لے چلو" ادھیڑ سر جھکائے بغیر کہتا ہے یہی کوئی ۴۵ - ۵۰ کا ہوگا۔ اس کی آنکھوں میں نفرت کی آگ ہے۔
کرن کمار ملزم کو لیے ہوئے سب سے بڑے بنگلے میں داخل ہوتا ہے۔ "ضرور کوئی دہشت پسند ہوگا یا نکسلائیٹ" کرن کمار سوچتا ہے۔
ملزم کو رسی سے باندھ کر برآمدہ میں بٹھا دیا جاتا ہے کرن کمار لاش ٹٹولتا ہے۔
نرمدہ باغ میں بیٹھا ہوا چاء نوشی کر رہا تھا ملزم نے پیچھے سے آکر گنڈاسا چلا دیا۔ کرن کمار دیکھتا ہے اس سر کو جو جسم سے ایک ڈوری کی مانند مسلک ہے۔ جیسے دھڑ سے کوئی سروکار نہ ہو۔ کبھی یہ سر اس دھڑ کی ضرورتوں کے لئے سازشیں کیا کرتا ہوگا۔ اور آج۔
کرن کمار نائب وزیر کو تسلی دیتا ہے تو نائب وزیر بھبھک اٹھتا ہے "نرمدہ نے کسی کا کیا بگاڑا تھا؟" دوسروں کو اپنی ضرورتوں کے لئے سامان کی طرح استعمال کرنے والے نائب وزیر نے آج زندگی میں پہلی بار اپنے خون کو بہتا ہوا دیکھا تھا۔
کرن کمار عالیشان بنگلے پر ایک نظر ڈالتا ہے تو اسے یاد آتا ہے کہ نائب وزیر آج اشوک نگر کالونی کا مالک ہے کبھی معمولی سا ماسٹر تھا۔ دس

سال میں کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ پولیس کی گاڑیاں دھڑ دھڑاتی ہوئی آجاتی ہیں۔

ڈی ایس پی پوچھتا ہے "تیرا نام؟"

"رتوری!"

"تونے قتل کس لئے کیا؟"

"انہوں نے بہت سے لوگوں کو مارا تھا" رتوری کسی گھبراہٹ کے بغیر جواب دیتا ہے۔

"انہوں نے کسے مارا تھا؟" داروغہ پوچھتا ہے

"پریتی بیٹی کی عزت لوٹی، اچل بھیا کو پھانسی پر لٹکایا اور کل بابو پولیس دفتر گئے تھے تو گھر جلا کر راکھ کر دیا"۔

کرن کمار چونکتا ہے بیس سال پہلے پروفیسر کرمال کے گھر کے اکلوتے نوکر کا نوجوان چہرہ یاد آجاتا ہے "اوہ" وہ دل میں سوچتا ہے کہ ان کا قرض اس غریب آدمی نے اتارا ہے۔ رتوری نہیں بلکہ اس کی اپنی تکمیل کرنے والا ہے یہ۔ یہ ابھی میرا ہے"

ڈی ایس پی رتوری کے چہرہ پر چانٹا مارتا ہے "کس کی بات کرتا ہے سالے؟"

رتوری گردن نہیں جھکاتا "اپنے کرمال صاحب کی اور کس کی؟" اس کی آواز میں بے خوفی ہے ڈی ایس پی دوبارہ ہاتھ اٹھاتا ہے تو کرن کمار روک دیتا ہے "اقبال جرم کر رہا ہے تو حوالات میں بند کر دو"۔

کوٹھی پر ہجوم بڑھتا جاتا ہے کرن کمار ڈی ایس پی کو سیکیورٹی کے لئے آرڈر دیتا ہے پولیس اپنی کارروائی میں مصروف ہے۔ فوٹو لیے جا رہے ہیں پریس رپورٹر رتوری اور نائب وریر سے بے شمار سوالات کرتے ہیں۔ ایک پریس رپورٹر پوچھتا ہے "کیسے آئے تھے؟"

"پیڑ سے پیڑ سے" رتوری آسمان کی طرف دیکھتا ہے

"تمہیں قتل کرنے سے کیا ملا؟"

"پاپی کو مارنے سے کیا ملتا ہے" رتوری پوچھتا ہے پریس رپورٹر مسہ دیکھتا رہ جاتا ہے آج وہ پہلی دفعہ بے لوث عمل کو جیتا جاگتا دیکھ رہا تھا۔

کرن کمار اپنے اندر بجلی کی سی چمک محسوس کرتا ہے اسے لگتا ہے کہ رتوری دھرم راج کا مکمل اوتار ہے جسے کسی چھل کپٹ یا جھوٹ کی ضرورت نہیں ہے کیسا بے مثل بہترین ویدانتی سچ بول گیا ہے کہ "پاپی کو مارنے سے کیا ملتا ہے"۔

ہجوم منتشر ہوگئے تھے۔ پریس والوں کو ایک طرف لے گئے "پاگل لگتا ہے سوچ سمجھ کر خبر چھاپئے گا۔ الیکشن دور نہیں ہے" پھر پی۔آر۔او سے کہتے ہیں "انہیں پریس نوٹ جاری کر دو"۔

کرن کمار اتم سنسکار کے بعد رات میں گھر پہنچتا ہے۔ ادا اس سیما پوچھتی ہے "اسی پاگل کی وجہ سے باہر جانے سے منع کیا تھا؟"

"کون پاگل؟" کرن کمار چونک کر پوچھتا ہے وہ سوچتا ہے کہ اوتار اپنا کام پورا کر کے چلے جاتے ہیں لیکن لوگوں کو معلوم ہی نہیں ہوتا۔ کیونکہ لوگ اب بھگوان کی شبیہ بھی نیتاؤں کے چہروں میں تلاش کرتے ہیں۔

جمیل نظام آبادی ایم اے
4-1-35/2
Azam Road.
Nizamabad - 503001

غزل

ٹالتی ہیں جو بلائیں اب کہاں سے لاؤگے
صدق دل کی وہ دعائیں اب کہاں سے لاؤگے

اب کہاں سے لاؤگے آوارگی کے حوصلے
سر پھری پاگل ہوائیں اب کہاں سے لاؤگے

چاہے کوئی بھی ہو موسم دھوپ برسے گی یہاں
رحمتوں والی گھٹائیں اب کہاں سے لاؤگے

دن بدن بڑھتی ہی جاتی ہے گھٹن ماحول کی
نور و نکہت کی فضائیں اب کہاں سے لاؤگے

چل پڑا ہے مغربی تہذیب کا ایسا فسوں
دعوت حق کی صدائیں اب کہاں سے لاؤگے

اس وفا ناآشنا ظالم زمانے میں جمیل
وہ محبت وہ وفائیں اب کہاں سے لاؤگے

فراغ روہوی
۶۷ - مولانا شوکت علی اسٹریٹ
کلکتہ - ۷۰۰۰۰۳

غزل

میں دل میں کبھی موت کا کھٹکا نہیں رکھتا
سائل ہوں ، کوئی خواہش دنیا نہیں رکھتا

مجھ میں ہے یہی عیب کہ اوروں کی طرح میں
چہرے پہ کبھی دوسرا چہرا نہیں رکھتا

احباب تو احباب ہیں دشمن کے تئیں بھی
بھولے سے بھی میں سخت رویہ نہیں رکھتا

کیوں مجھ کو لہو دینے پہ تم لوگ بضد ہو
میں سر پہ کسی شخص کا قرضہ نہیں رکھتا

کیوں قتل مجھے کرکے ڈبوتے ہو ندی میں
دو دن بھی کسی لاش کو دریا نہیں رکھتا

یہ سچ ہے کہ میں غالب ثانی نہیں ، لیکن
ہم عصروں سے ملتا ہوا لہجہ نہیں رکھتا

بادل تو فراغ اصل میں ہوتا ہے وہ بادل
جو گھرے سمندر کو بھی پیاسا نہیں رکھتا

مہتاب پیکر اعظمی
قیام محل
اسٹیشن روڈ - پوسٹ آفس ، براکر
ضلع بردوان (ویسٹ بنگال)

غزل

کچھ حادثات بیٹھے ہیں کہرام اوڑھ کر
میں بھی سپرد راہ ہوں انہام اوڑھ کر

اب وہ نئی کتابوں کے حرفوں کی روح ہیں
صدیوں سے جو خموش تھے ابہام اوڑھ کر

کچھ مصلحت پسندوں کا یہ مشورہ کہ میں
اپنا ہی شہر چھوڑدوں دشنام اوڑھ کر

اب فاصلوں کو وقت کی دستک سنائی دے
رفتار تیزگام ہے اجسام اوڑھ کر

دل کو سکوں نہ ذہن کو آسودگی ملی
حالاں کہ مدتوں رہا آرام اوڑھ کر

پیکر قبول ہئیت و اسلوب سب مگر
مفہوم بھی تو زندہ ہو الہام اوڑھ کر

خاکوں کا مسیحا

نارنگ ساقی، نئی دہلی

مجتبیٰ حسین سے میری ملاقات غالباً ۱۹۸۴ء میں مرحوم کنور مہندر سنگھ بیدی کے دولت خانہ پر ہوئی۔ ان دنوں میں بیدی صاحب کا جشن منانے کی تیاریاں کر رہا تھا اور اس موقع پر ان کی سوانح عمری یادوں کا جشن شائع کرکے صدر ہند عزت مآب گیانی ذیل سنگھ صاحب سے راشٹرپتی بھون میں ریلیز کرانے کا پروگرام بنا رہا تھا۔ اس سلسلے میں مجھے ہر روز بیدی صاحب کے ہاں حاضری دینا پڑتی۔ ایک دن حاضر ہوا تو ان کے پاس ایک صاحب بیٹھے تھے جو دیکھنے میں کسی دم توڑتے جریدے کے مدیر نظر آتے تھے۔ میں ان کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ بیدی صاحب نے مجھے مزید تکلیف سے بچانے کے لیے ان سے تعارف کرواتے ہوئے کہا۔ "ساقی صاحب یہ مشہور مزاح نگار مجتبیٰ حسین ہیں۔ نام سمجھ میں نہ آنے کی وجہ سے میں نے وضاحت چاہی تو بیدی صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا "یقیناً آپ نے بھی انہیں مجتبیٰ کی بجائے مشتبہ خیال کیا ہے اس میں آپ کا قصور نہیں کہ جو بھی پہلی دفعہ ان سے ملتا ہے یہی تاثر لیتا ہے حالانکہ یہ نہایت شریف آدمی ہیں"۔

اس ملاقات کے بعد تو ان سے ملاقاتوں کا ایسا سلسلہ شروع ہوا جو ہنوز جاری ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ مجتبیٰ سے ایک دفعہ ملنے کے بعد آدمی ان کے سحر میں اس طرح گرفتار ہوتا ہے کہ اس کا نکلنے کو جی نہیں چاہتا۔ بقول شاعر

صیاد تیرے دام سے آساں تھا چھوٹنا
مشکل یہ ہے کہ تم سے مرا دل اٹک گیا

مجتبیٰ حسین کے دوستوں کا حلقہ بہت وسیع ہے، بڑے مخلص اور دوست نواز ہیں۔ ان کا کوئی دوست مشکل میں ہو تو نہ صرف اس کی مدد کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں بلکہ ضرورت پڑے، مشکل میں گرفتار ہونے کا راستہ بھی بتا دیتے ہیں۔ ریندر لوتھر لکھتے ہیں

"ایک سچے حیدرآبادی کی طرح لحاظ و مروت اس کا خاصہ ہے۔ وہ کسی کو نا نہیں کہہ سکتا۔ کسی کو کوئی ضرورت ہو کسی کا کوئی کام اٹکا ہو مجتبیٰ مدد کے لیے فوراً تیار ہو جاتا ہے۔ کئی بار میں نے دیکھا ہے وہ ان لوگوں کے منع کرنے کے باوجود ان کی مدد کئے جاتا ہے۔ نوکری کے لیے، پاسپورٹ کے لیے، ازدواجی تعلقات کے لیے، ہوٹل میں کام کے لیے، جلسے منعقد کرانے کے لیے۔ کسی بھی قسم کا کوئی کام ہو وہ سفارش کرنے کے لیے تیار رہتا ہے"۔

شہریار اس سلسلے میں بیان کرتے ہیں

"ان کا کام دوسروں کے لیے روزی ڈھونڈھنا، مکان تلاش کرنا، دوستیاں کرانا، ضرورت مندوں کو منسٹروں سے ملوانا، الیکشن کے ٹکٹ دلوانا، اخباروں میں لوگوں کے فوٹو اور ان کے کارناموں کی خبریں چھپوانا، کتابوں کی رسم اجرا پر لوگوں کے خاکے ہی نہیں لکھنا بلکہ پیسوں کی فراہمی کا انتظام کرنا، پاسپورٹ اور ویزا بنوانا۔ وہ اور ان کا اسکوٹر اس وقت تک دم نہیں لیتا جب تک کام مکمل نہ ہو جائے"۔

مزید لکھتے ہیں کہ اس کے معمولات کا اندازہ اس کے اس قول سے کیا جا سکتا ہے کہ دن اور رات کہیں بھی گزارو صبح کو اپنے بستر سے اٹھو۔ اس کی

بیوی یعنی میری بھابی ان کی اسی ادا پر جان دیتی ہیں کہتی ہیں

۔ "کہ انہوں نے یہ بات شادی کی پہلی رات کو مجھ سے کہی تھی زبان کے بڑے پکے ہیں آج تک اس پر قائم ہیں" ۔

مجتبیٰ حسین نے عثمانیہ یونیورسٹی سے گریجویشن کیا، محکمہ مال میں ملازمت کی اور اس کے بعد روزنامہ "سیاست" حیدرآباد سے وابستہ ہوگئے ۳ / جولائی ۱۹۶۲ء کو سیاست کے مشہور کالم نویس شاہد صدیقی کا اچانک انتقال ہوگیا تو محبوب حسین جگر اور عابد علی خاں صاحب نے مزاحیہ کالم لکھنے کی ذمہ داری ان پر ڈال دی ۔ یوں تو مزاح نگاری کا آغاز ۱۲ / اگست ۱۹۶۲ء کو پہلا مزاحیہ کالم لکھنے سے ہوگیا تھا لیکن ۱۹۶۳ء میں پہلا مضمون "ہم طرفدار ہیں غالب کے سخن فہم نہیں" لکھنے سے باقاعدہ ادبی دنیا سے تعارف ہوا ۔ مجتبیٰ حسین اپنی مزاح نگاری کے بارے میں فرماتے ہیں

"مجھ جیسے سنجیدہ آدمی کو خواہ مخواہ مزاح نگار بنانے کی ذمہ داری میرے بڑے بھائی محبوب حسین جگر اور عابد علی خاں پر عائد ہوتی ہے ۔ ان ہی بزرگوں اور سرپرستوں کے حکم کی تعمیل میں ۱۲ / اگست ۱۹۶۲ء کو دن کے ساڑھے دس بجے سے مزاح نگاری کا آغاز کیا اور نان سٹاپ یہ سلسلہ تادم تحریر جاری ہے" ۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ انہیں پہلا اعزاز کسی اردو تنظیم نے نہیں بلکہ اڑیا زبانوں کی ایک تنظیم "سرس ساہتیہ سمتی" نے دیا ۔ یقیناً یا تو وہ لوگ ان کے مضامین سے متاثر ہوئے ہوں گے یا شاید پھر اس قصے کی طرح ان کی سمجھ میں کچھ نہ آیا ہو ۔ "ایک دن ٹی وی دیکھ رہا تھا ۔ میرا چھوٹا بچہ میرے ساتھ بیٹھا تھا ۔ کسی آرٹ فلم پر ایوارڈ کا اعلان ہو رہا تھا جو غالباً میرے بیٹے نے دیکھی تھی اسے یہ فلم قطعی سمجھ میں نہیں آئی تھی ۔ اس نے اپنا خیال ظاہر کرتے ہوئے کہا ۔ ڈیڈی میرے خیال میں جیوری کے ممبران کو جو فلم سمجھ میں نہیں آتی اسے ایوارڈ دے کر اپنی جان چھڑا لیتے ہیں تاکہ اسے رد کرنے کے لیے وضاحت نہ دینی پڑے ۔

گزشتہ چند برسوں سے ادب میں مزاح نگاری کی طرف زیادہ ہی توجہ دی جانے لگی ہے ۔ بہت سے نئے مزاح لکھنے والے سامنے آئے ہیں لیکن مجتبیٰ حسین کی بات ہی کچھ اور ہے ۔ وہ اپنے مزاحیوں میں ایسی دلکش فضا پیدا کر دیتے ہیں جس سے قاری اپنی ذات کو مانوس اور ہم آہنگ محسوس کرتا ہے ان کے مضامین میں جو ظریفانہ منظر آفرینی ہے وہ قاری کو تبسم سے ہمکنار کرتی ہے ۔ مزاح کو کامیاب بنانے میں ان کی شگفتہ بیانی کو بہت دخل ہے ۔

مجتبیٰ حسین بات کرنے کا ہنر خوب جانتے ہیں اکثر محاوروں اور لطیفوں کا برجستہ استعمال مضامین میں کرتے رہتے ہیں جو قاری کی دلچسپی ایک پل کے لیے کم نہیں ہونے دیتا ۔ مزاح کا ایک خاص حربہ مبالغہ ہے اس لئے ہنسانے کے لیے اکثر مبالغے سے بھی کام لیتے ہیں ۔ کئی دفعہ مجتبیٰ ہنساتے ہنساتے کوئی ایسی بات کہہ جاتے ہیں کہ قاری کے آنسو نکل آتے ہیں مثال کے طور پر مندرجہ ذیل اقتباس دیکھئے

"سچ تو یہ ہے کہ میں بھی کیلنڈر جمع کرنے کا شوقین ہوں ۔ مگر میں کیلنڈر میں صرف ایک ہی تاریخ دیکھتا ہوں اور وہ ہے پہلی تاریخ ---- اس تاریخ کو میں نہیں میری بیوی بھی دیکھتی ہے ، میں اس لیے دیکھتا ہوں کہ اس دن مجھے تنخواہ ملتی ہے اور میری بیوی اس لیے دیکھتی ہے کہ اس دن وہ میری تنخواہ چھین لیتی ہے ۔ مگر صاحب کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ صرف ایک ہی تاریخ دیکھنے کے لیے سالم کیلنڈر کو دیوار پر لٹکانے کی کیا ضرورت ہے" ۔

اسی طرح اکثر اوقات لطائف موزوں سے کچھ اس طرح چسپاں کر دیتے ہیں کہ لطائف شخص کا عکس بن جاتے ہیں ۔ اعجاز صدیقی کے بارے میں لکھتے ہیں

"کبھی ایسا نہیں ہوا کہ انہوں نے کسی خط میں اپنی بیماری کا "دوسرا ایڈیشن" نہ نکالا ہو ۔ یوں کہا جائے تو بے جا

نہ ہو گا کہ ان کی ہر بیماری نہ صرف یہ کہ "غیر مطبوعہ" ہوا کرتی ہے بلکہ قابلِ اشاعت بھی ہوا کرتی ہے۔ (اعجاز صدیقی۔ اردو کالونی)

مزاح نگاری سے زیادہ مجتبیٰ حسین کو بطور خاکہ نگار شہرت ملی ہے وہ ہندوستان کے ہی نہیں برصغیر کے ان چند چنے گئے خاکہ نگاروں میں سے ہیں جن کی شہرت کے ڈنکے بج رہے ہیں بقول خامہ بگوش یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ ڈنکہ یہ خود بجا رہے ہیں یا خود بخود بج رہا ہے۔ خاکہ نگاری مشکل فن ہے خاکہ نویسی کا تقاضہ ہے کہ ممدوح کے مکمل تعارف میں کمی نہ رہ جائے۔ مجتبیٰ حسین نے اپنے خاکوں میں ان اشخاص کی ہر خوبی و خامی کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے کہ ان کے خاکوں میں ادھورے پن کا احساس نہیں ہوتا۔ ان شخصیات کی مفصل سہی مگر ایک جامع تصویر ابھرتی ہے جو پڑھنے والے کو متاثر کرتی ہے۔ مثال کے طور پر مخدوم محی الدین پر ان کا خاکہ دیکھیے

"مخدوم کے بارے میں اب سوچتا ہوں تو احساس ہوتا ہے کہ مخدوم ایک انسان نہیں تھے ایک جیتا جاگتا سانس لیتا ہوا شہر تھے۔ اس شہر کی ہم نے برسوں سیر کی، ہم سب اسی شہر میں آباد تھے۔ مخدوم کے انتقال کے بعد پہلی دفعہ احساس ہوا کہ "غریب الوطنی" کس کو کہتے ہیں، اسی شہر میں کتنی سڑکیں تھیں، کتنی گلیاں تھیں، کتنے موڑ تھے اور یہ سب راستے انسانیت اور سچائی کی طرف جاتے تھے"۔ (یادوں میں بسا آدمی)

راقم الحروف پر لکھے ہوئے خاکے میں کہتے ہیں

"ان کی یہ سیاحتیں صرف ملکی ادیبوں تک محدود نہیں ہوتیں۔ مشہور ہے کہ پاکستان سے جو بھی شاعر یا ادیب آتا ہے تو اس کے لیے دو کام نہایت ضروری ہوتے ہیں، ایک تو پولیس میں رپٹ درج کروانا اور دوسرے ساقی کے گھر پر حاضری لگوانا، اکثر شاعر تو ایسے بھی دیکھے ہیں جو پہلے ساقی کے گھر پر اپنی آمد کی رپورٹ درج کرواتے ہیں اور بعد میں اپنی حاضری لگوانے تھانہ جاتے ہیں۔ ہندوستان یا پاکستان کا شاید ہی کوئی بڑا ادیب اور شاعر ہو جو ان کی مہمان نوازی کے ردمیں نہ آیا ہو۔ قتیل شفائی، احمد فراز، میر سپاری، حبیب جالب، کشور ناہید، حسن رضوی اور بیسیوں پاکستانی ادیبوں و شاعروں سے ساقی کے گھر ملاقات ہوئی"۔ (اچھا ساقی سچا مارنگ)

مجتبیٰ حسین کی خاکہ نگاری کا کمال یہ ہے کہ وہ ممدوح ہی کے بارے میں لکھتے ہیں اپنے بارے میں نہیں۔ یہ بات ہمیں اس لیے کہنی پڑی کہ آج کل یہ چلن عام ہو رہا ہے۔ اپنی طرف سے تو ہم کچھ نہیں کہیں گے لیکن اس سلسلے میں خامہ بگوش کے ایک کالم کا سہارا لیا چاہیں گے۔ مظہر امام صاحب کی خاکوں کی ایک کتاب کے بارے میں وہ رقمطراز ہیں

"کتاب پڑھنے کے بعد یہ محسوس ہوتا ہے کہ مظہر امام نے ان لوگوں کے خاکے نہیں لکھے بلکہ ان لوگوں نے مظہر امام کے خاکے لکھے ہیں"۔

ہماری دعا ہے کہ مجتبیٰ حسین اردو ادب میں اسی طرح گل کاریاں کرتے رہیں۔

"بادبان" کراچی

نقش اول کا ایک جائزہ

انیس رفیع، کلکتہ

ناصر بغدادی کے کوارٹرلی "بادبان" کراچی کا پہلا شمارہ زیر نظر ہے۔ مدیر انشاء کی فرمائش ہے کہ میں پرچے سے متعلق اظہار خیال کروں۔ یوں تو ہمارے ملک کی اردو اشاعتوں سے لکھنے لکھانے کی کوئی قیمت نہیں ملتی مگر کبھی کبھی قیمت ضرور چکانی پڑتی ہے۔ اس لاحق خطرے کے باوجود میں ناصر بغدادی کی "مشاہدہ، حق کی گفتگو" سے اختلاف کرتا ہوں۔ ان کی یہ گفتگو یا دوسرے لفظوں میں اداریہ گڑے مردے اکھاڑنے کی ایک سعی بے معنی ہے۔ ماضی کی دہائیوں میں ترقی پسندوں کے تحفظات اور نظریاتی کٹرپن کی دنیائے ادب میں دھجیاں اڑائی جاچکی ہیں۔ ناصر بغدادی ان دھجیوں سے سفوف سنانے کا کارخانہ کھولنا چاہتے ہوں تو یہ الگ بات ہے۔ ترقی پسندوں کے قحط حسن جیسے پیش پا افتادہ Subject کی بجائے عالمی ادب کے تناظر میں ناصر بغدادی خود "بادبان" کے اس افتتاحی شمارے میں شامل ادب پاروں کی اہمیت کو اجاگر کرتے تو اڈیٹوریل کا حق ادا ہو جاتا۔

"بادبان" میں بھی حسب روایت مضامین، افسانے، غزلیں، نظمیں، انٹرویو اور تراجم شامل ہیں۔ فنون لطیفہ کے دیگر Disciplines جو تخلیقی ادب کے Supportive کے طور پر دنیا کی مختلف زبانوں کے ادبی جرائد کی ضرورت بن چکے ہیں، کی عدم موجودگی بری طرح کھٹکتی ہے۔ مشمولات کے اعتبار سے رسالے میں کوئی Departure نہیں ہے۔

افسانوں کے ذیل میں ہرچرن چاولہ، رشید امجد، نجم الحسن رضوی، تقی حسین خسرو، مظہر الزماں خان، مشرف عالم ذوقی اور یوسف عارفی نئی پرانی نسل کے یہ سارے افسانہ نگار معتبر اور معروف نام ہیں۔ اپنے اپنے افسانوں کے ساتھ ان سب کا برتاؤ منصفانہ ہے۔ جس سے افسانوں کا حصہ لائق مطالعہ ہو گیا ہے۔ ہرچرن چاولہ میرے پسندیدہ افسانہ نگار رہے ہیں وہ ایک ایسے فنکار ہیں جو تحریک سے وابستہ ہونے کے باوجود Regimentation کے شکار نہیں ہوئے۔ اور اب بھی "کنفیشن" جیسا افسانہ خلق کرنے کے قابل ہیں۔

افسانہ "کنفیشن" میں نرملا کا کردار خلوص و صداقت کا وہی پیکر ہے جس کی طرف میں نے فنکاروں کے حوالے سے اشارہ کیا۔ عشق کی معراج نرملا کی منزل تھی خواہ عشق کا مرکز خاوند ہی کیوں نہ رہا ہو۔ نرملا نے اس منزل کو پالیا جب کہ شوہر کو تاسف کے سوا کچھ بھی ہاتھ نہ لگا۔ نرملا جنیوئین تھی صدق دلی اور خلوص اس کا شیوہ تھا۔ اسے شوہر پر قابض ہونے کی بھوک نہیں تھی (اقتدار کی بھوک نہیں تھی) خاوند سے محبت اس کے لئے عشق مجازی بھی تھی اور عشق حقیقی بھی۔ اپنی ہستی کو مٹا کر اس نے اس منزل کو پالیا۔ وہ شوہر کو تبدیل کر دیتی ہے ایک نئے انسان میں جس کا ظاہر و باطن اعتراف کرتے وقت ایک ہو جاتا ہے۔ ہماری سیاسی تحریکوں میں سگ طینت زیادہ اور نرملا صفت خال خال ہی رہے ہیں۔ ترقی پسند تحریک میں بھی نرملا صفت فنکاروں کی کمی تھی جس کی پاداش میں لوگ اب بھی ان کی قبروں پر لات مارنے سے نہیں چوکتے۔ (میرا اشارہ ایک بار پھر ناصر بغدادی کے اداریہ کی طرف ہے)۔ "کنفیشن" کے علاوہ شامل افسانے بھی بے میل نہیں لگتے۔ البتہ ہندوستانی قارئین کے لئے مشرف عالم ذوقی کا افسانہ نیا نہیں ہے

"مصلوب" نہ جانے ناصر بغدادی نے اپنے اس افسانے کی پیش کش میں تخصیص سے کیوں کام لیا ہے کہ اسے طویل افسانہ کہہ کر بقیہ افسانوں سے الگ کر لیا ہے۔ حالانکہ مختصر افسانوں کی طوالت اس سے بھی سوا ہوتی ہے۔ اس افسانے کو اگر وہ طویل مختصر افسانہ بھی کہتے تو ٹھیک تھا۔ اور اگر

دیکھا جائے تو کچھ بھی کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس بحث سے الگ افسانے سے متعلق یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس کے پس پشت ایک دانشور تخلیق کار ہے جسے یہ احساس ہو چلا ہے کہ یہ کارگہہ حیات نیک خوؤں کے قبضے سے نکل کر بدخوؤں کی مٹھیوں میں آن پھنسی ہے۔ لہذا نہ اب کوئی راہ نجات ہے نہ جائے اماں۔ نجات کی ایک ہی صورت ہے مسیحی صورت یعنی مصلوب ہونا۔ مصنف کا یہ احساس دراصل اس خطے کی دین ہے جہاں وہ بود و باش اختیار کئے ہوئے ہے۔ افسانہ نگار اپنے اس احساس کے پروجیکشن میں بہت حد تک کامیاب ہے۔

شعری حصے میں ظفر اقبال اور عباس رضوی کی غزلیں اپنی تازگی اور فکر آفرینی سے چونکاتی ہیں۔ ظفر اقبال نے "طریقے سے" کی ردیف کے ساتھ ۵۱ اشعار کہے ہیں۔ حالیہ برسوں میں اتنی طویل غزل کم از کم میں نے نہیں پڑھی۔ کمال یہ ہے کہ ہر شعر مفہوم و معنی کے اعتبار سے مختلف اور یگانہ ہے کہیں کوئی تکرار نہیں۔ اگر ہے بھی تو "طریقے سے"۔ پکی بات یہ ہے کہ ظفر اقبال نے صنف غزل کو معاصر ذہانت سے ممیز کرکے نئی زمینوں پر کھڑا کیا ہے "چل پڑی ہے گڈی" سے تجربہ کرتا ہوا ظفر اقبال اب شعری صداقتوں تک پہنچا ہے۔

میری نگاہ میں ہے ساری واردات ہوا
میں سو رہا ہوں مگر جاگتے طریقے سے

عباس رضوی کی غزلیں روایتی وصف کے ساتھ معاصر سچائیوں کا پتہ بھی دیتی ہیں ان کی تینوں غزلوں میں قدیم و جدید ہم پیراہن نظر آتے ہیں۔ کہا جاسکتا ہے کہ ان کی غزلوں کو پڑھ کر غزل کا مواد ملتا ہے۔

مظفر حنفی کی غزلوں میں ناراضگی ہے اور کہیں کہیں غصہ بھی۔ نتیجے میں سلام و دعا سد کر دی گئی۔ کیا حنفی صاحب یہ نہیں جانتے کہ غزل میں ناراضگی نہیں خفگی کی گنجائش ہے وہ بھی معشوق کی۔ بقیہ غزلیں بھی متاثر کرتی ہیں۔

قمر جمیل، زبیر رضوی اور محمد علوی کی نظمیں سادگی میں پرکاری کی مثالیں ہیں۔ زبیر رضوی کو احساس زیاں سے زیادہ احساس خزاں لاحق ہے۔ وہ گزرتی عمر کے بھیاور چہرے سے خوفزدہ ہیں جب کہ محمد علوی اس حقیقت سے متزلزل نہیں ہیں۔

ساختیات کے ضمن میں ناصر بغدادی نے حسن عسکری کا وہ خط شائع کیا ہے جو ساختیات کی رد میں فرانس کے مشہور اسلامی مفکر محمد ارکون کو ۱۹۷۵ء میں لکھا تھا۔ اپنی تمہید میں ناصر بغدادی نے یہ اطلاع دی ہے کہ حسن عسکری نے ساتویں دہائی کے ابتدائی برسوں میں ہی ساختیات اور اس کے اطلاقات کا نتیجہ خیز مطالعہ کر لیا تھا۔ اپنے گہرے مطالعے کی روشنی میں اسے رد بھی کر دیا تھا جو لوگ آج ساختیات کے نام پر ادبی پونجی بٹور رہے ہیں ان دنوں اس اصطلاح سے متعارف بھی نہ تھے۔ مذکورہ خط ساختیات کے باب میں ایک دلچسپ مطالعہ ہے اور رد ساختیات کی تاویلیں بھی پیش کرتا ہے۔

"آپ نے تجویز پیش کی ہے کہ قرآن مجید کی قرأت اب لسانیات، ساختیات، ثقافتی بشریات اور دیگر علوم کے حوالے سے کرنی چاہیے اس ضمن میں ایک خطرے، ایک اندیشے کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا جہاں تک مغرب کا تعلق ہے (ان کے) دانشورانہ جہتوں کا یقین بے حد مشکل ہے، یہ ہر وقت بدلتی رہتی ہیں۔ ایسے تغیراتی حالات میں جب آپ مندرجہ بالا نقطہ نظر سے قرآن مجید کا مطالعہ مکمل کر لیں گے اور آپ معاصر ذہانت کو قرآن تعلیم سے متاثر کر سکیں تو کیا یہ ممکن نہیں کہ دانش مند اور صاحبان فراست آپ سے دوسری چیزوں کی توقعات وابستہ رکھیں۔ جہاں ہر چیز اپنے مرکز سے ہٹ چکی ہو وہاں ایسی باتیں غیر متوقع نہیں" میں آپ سے سوال کرتا ہوں یہ بات کہاں تک جائز ہے کہ قرآن مجید جو مسلمانوں کے لئے ابدیت کا حامل ہے، اسے یوں تغیراتی رجحانات اور بدلتے ہوئے رسوم و رواج کے زیر نگیں کر دیا جائے جہاں تک لسانیات کا تعلق ہے ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ اس کی جڑیں برٹش منطقی اثباتیت اور ویانا اسکول آف فلاسفی میں بڑی دور تک پیوستہ ہیں۔ ان دونوں کی تحریک انگیزی کا منبع ذہنی افسردگی یا اختلال ہے میں یہ بات کہنے سے قاصر ہوں کہ ایک کتاب مقدس کو، اس پس منظر میں، کس طرح منطقی جانچ پڑتال کے لئے لسانیات کے رحم و کرم پر چھوڑا جاسکتا ہے" خط کے ان اقتباسات سے پتہ چلتا ہے کہ حسن عسکری مشرق کے مذہبی صحیفوں اور ادبی متنوں کے مغربی لسانیاتی اور ساختیاتی اصولوں پر مطالعہ کے قائل نہ تھے۔ لہذا اردو ادب کے مختلف اصناف پر بھی ساختیات کے انطباق کو غیر

ضروری قرار دیا ۔ رولاں بارت ساختیات کا سب سے بڑا ماہر تصور کیا جاتا ہے ۔ اس نے ساختیاتی منہاجات کو بروئے کار لاتے ہوئے مختلف تہذیب و ثقافت پر کتابیں تحریر کی ہیں ۔ ان کتابوں کو حسن عسکری نے غیر منطقی تخیلات اور خیالی اڑانوں کا مجموعہ کہا ہے ۔ "ساختیات کے لوازمات اور ساز و سامان کی آخر کیا ضرورت ہے ؟ اگر کوئی زمین پر بکھرے ہوئے مٹر کے دانوں میں سے ایک کو چننا چاہتا ہے تو کیا اس کے لئے اسپ دریائی کی مدد کی ضرورت ہوگی ؟"

پروفیسر گیان چند جین نے محمد نسیم الدین فریس کی تحقیقات پر اظہار خیال کرتے ہوئے اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اب دکنیات کے محقق عنقا ہوتے جا رہے ہیں ۔ یہ صورتحال تشویشناک ہے ۔ ایسے میں فریس کی حیثیت اندھیرے میں روشن چراغ کی سی ہے ۔ میں سمجھتا ہوں گیان چند صاحب خود اس صورتحال کو بدلنے میں معاون ثابت ہو سکتے ہیں ۔ اندیشے تو ہزار ہیں ۔ فریس کے علاوہ جو طالب علم تحقیق میں دلچسپی رکھتے ہیں انہیں دکنیات کے مطالعے کی ترغیب دی جا سکتی ہے ۔ گیان چند جین جیسے محقق یقیناً ایسا ہی کریں گے ۔

رسالے میں احمد ہمیش کا انٹرویو چیزے دیگر است ۔ انٹرویو میں احمد ہمیش نے ایسی کلے بازی کی ہے کہ ان کے بہت سارے ہم عصر افسانہ نگار اور ناقد رنگ میں چاروں شانے چت گرے نظر آتے ہیں ۔ مگر لحاظ یہ رکھا ہے کہ رنگ سے باہر نہیں کیا ۔ آخر ان میں اور محمد علی کلے میں فرق ہے نا ۔ بہرحال اس انٹرویو سے احمد ہمیش کے نجی حالات دکو الف سے آگاہی حاصل ہوتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ ان کے ادبی موقف اور نظریات کا بھی پتہ چلتا ہے مثلاً وہ بلراج مین را، سریندر پرکاش، انور سجاد پر سوالیہ نشان لگاتے ہیں ۔ کون ہیں یہ لوگ، کیسا جدید افسانہ، کون ہے جدید افسانے کا بانی ۔ سوال یہ ہے کہ آخر چوہے دان کا بھی تو کوئی بانی ہوگا" اگر مذکورہ تینوں افسانہ نگاروں کو یہ رد کرتے ہیں تو کم از کم احمد ہمیش کو کئی ایک نام اور یاد آنا چاہیے تھے یا کم از کم ریحان صدیقی، ظفر اگانوی اور کمل چودھری کی طرف اشارہ کرنا چاہیے تھا ۔ احمد ہمیش کے نزدیک اب جدیدیت کی تحریک، جس کے بانیان اور مبلغین میں سے وہ خود ایک ہیں، چوہے دان کی تحریک ہے ۔ راقم الحروف کو حیرت اس بات پر ہو رہی ہے کہ اب موسیرے بھائی بھی ایک دوسرے سے کنی کاٹ رہے ہیں ۔ کیا جدیدیت پر ایسی پتا آن پڑی ہے ۔ مصیبت میں بھائیوں کا ساتھ نہ دینا کہاں کا انصاف ہے ۔

اس انٹرویو میں احمد ہمیش نے اپنے تئیں ایک دلچسپ انکشاف کیا ہے ۔ وہ کہتے ہیں "میں نے کبھی حرافاؤں کے آگے خود کو سپرد نہیں کیا مگر اس کا شکار ضرور ہوا ۔ جن کا ذکر آپ کو میری داستان (پش و پل) میں ملتا ہے ۔ یہ عرض کردوں کہ بڑی کہانی لکھنے کی تمنا میں میں نے ہمیشہ خود کو کہانی کے آگے مکمل سپردگی کے عمل سے گزارا ہے ۔ اس عمل کے دوران میری نظر "شاعر" بمبئی کے ایک صفحے پر عذرا پروین کی معرکہ آرا غزل مع تصویر پر پڑی عذرا پروین مجھے گیسیل گوتم بدھ لگی ۔ ایک طرح سے یہ میری بازیافت تھی ۔ میں نے اس کی انتہائی خوبصورت تخلیقی تحریریں "تشکیل" کے گزشتہ شماروں میں شائع کی ہیں ۔ اس طرح مجھے بالآخر حرافاؤں سے نجات مل گئی اور بقول آپ کے (مراد ریحان صدیقی) نیک پروین نے میری تحریروں میں اب جگہ بنالی ہے ۔ گیسیل گوتم بدھ کا تصور ہندوستانی میتھ سے مستعار ہے ۔ قصہ یوں ہے   ایک روپاوتی تھی بڑی نیک اور دیالو ۔ روپاوتی نے ایک دن دیکھا کہ ایک بھکارن بھوک کی شدت سے تڑپ رہی ہے اور قریب تھا کہ وہ اپنے نوزائیدہ بچے کو پھاڑ کھاتی ۔ روپاوتی نے اس کے تناول کے لئے اپنے جسم کا خوبصورت ترین حصہ یعنی اپنے پستان پیش کر دیئے ۔ جب روپاوتی کے شوہر کو اس کا پتہ چلا کہ تو اس نے آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر پرارتھنا کی کہ اے آسمان و زمین کے مالک تجھے یہ علم ہے کہ آج تک اس دھرتی پر کسی عورت نے ایسی شجاعت اور تیاگ کا مظاہرہ نہیں کیا ۔ اس کی اس نیکی اور شجاعت کے عوض اس کے پستان اسے واپس کر دے ۔ پھر کیا تھا لوگوں نے دیکھا کہ جسم کا وہ خوبصورت حصہ اسے واپس مل گیا ۔ اندر لوک میں بیٹھے اندر دیوتا کو یہ بات نہ بھائی ۔ وہ دھرتی پر اتر آئے اور روپاوتی سے گویا ہوئے ۔ کیا تم اپنی دریادلی اور شجاعت کا مظاہرہ کر کے دیوتاؤں کا امتحان لینا چاہتی ہو یا پھر سورگ میں اپنی جگہ بنانا چاہتی ہو ؟" ۔ روپاوتی نے دست بستہ عرض کیا کہ "اے اندر دیوتا اگر میرے اس عمل میں ذرہ برابر بھی خودغرضی شامل ہو تو مجھے ایک پورش میں تبدیل کر دیں" دوسرے لمحے ہی روپاوتی مرد میں تبدیل ہو گئی ۔ اور روپاوتا کہلائی ۔ پھر چندر پربھا بن کر کئی جنموں کے پھیر کے بعد یہ چندر اپربھا اپنی قربانیوں اور ایثار کی بدولت گوتم بدھ میں اوترت ہوا ۔ ممکن ہے کئی جنموں کے پھیر کے بعد اور عذرا پروین

گوتم بن کر اس دھرتی پر پرکٹ ہوں مگر اس وقت نہ احمد ہمیش ہوں گے نہ یہ اردو افسانہ۔ کیوں کہ عذرا کے گوتم ہونے تک یہ اردو زبان بھی غائب ہوجائے گی جس طرح صدیوں بعد گوتم کی زبان پالی غائب ہوگئی۔ احمد ہمیش کے ان مبالغہ آمیز بیانات سے قاری یہ نہیں سمجھ پاتا کہ وہ اردو ادب کو کیا دینا چاہتے ہیں یا اس سے کیا لینا چاہتے ہیں۔ عورت کی تقدیس و عظمت کا تصور مختلف معاشروں، مختلف مذاہب، مختلف خطوں اور مختلف زمانوں میں ایک ہی نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر تصور عصمت جو ہمارے معاشرے میں ہے وہ یورپ کے معاشرے میں نہیں ہے۔ جو ہمارے یہاں حرافائیں ہیں وہ وہاں مہذب اور Enlightened ہیں۔ مثلاً پرنس چارلس کی بیوی ڈی آنا نے کھلم کھلا اپنے ناجائز جنسی تعلقات کا اعتراف کیا ہے۔ مگر یوروپین تہذیب کے ماتھے پر کوئی خفیف سی شکن بھی نہیں۔ اس کمپیوٹر ورلڈ میں روپادتی کا احیا کسی مجذوب کی بڑ سے کم نہیں۔ گرچہ اس انٹرویو میں احمد ہمیش نے افسانے کی تخلیق و نوعیت سے متعلق بڑی کارآمد اور مفید باتیں بتائی ہیں مگر فوٹو دیکھ کر فیمیل گوتم بدھ کی طرف مراجعت ہمارے لئے باعث استعجاب ہے۔ ویسے اس انٹرویو کا عنوان Excellent ہے۔ "بک شیلف میں محفوظ زمین" وہ کہتے ہیں "میں جب ہندوستان گیا تو اپنے جنم جات علاقہ میں اپنی ماں، بہن باپ کی دقت گریدہ قبروں سے، آم کے باغ اور گھاگرا ندی کے کنارے بیلے اور گلاب کی کیاریوں سے جمع کرکے تھوڑی سی مٹی اپنے ساتھ پاکستان لایا۔ گویا علامتی طور پر میں پورے ہندوستان کی زمین کو اپنے ساتھ لایا۔ یہ زمین میرے بک شیلف میں محفوظ ہے۔ میں نے اپنے بال بچوں کو یہ وصیت کر دی ہے کہ جب میں مرجاؤں تو یہ زمین میرے ساتھ میری قبر میں دفن کر دی جائے" احمد ہمیش کا یہ ناسٹلجیا فطری ہے۔ یہی ان کا اثاثہ ہے۔ یہی وہ صادق جذبہ ہے جو احمد ہمیش جیسے فنکار کو فن کی اصل تک پہنچا سکا ہے۔

انٹرویو میں انتظار حسین، محمد عمر میمن، وزیر آغا اور گوپی چند نارنگ سے متعلق ان کے خیالات سے اتفاق کیا جاسکتا ہے مگر ہندوستان کے ایرپورٹ، حرم پتھ ہوٹل، علی گڑھ یونیورسٹی کے قصے غیر ضروری اور Cheap لگے۔ بے تکلف دوستوں میں ایسی ڈینگیں مارنا جائز ہے مگر سنجیدہ انٹرویو میں نہیں۔

ریحان صدیقی اپنے Pointed سوالات کے لئے قابل ستائش ہیں مگر کہیں کہیں ان کے سوالات بہت طویل اور وضاحتی ہوگئے ہیں جس کے نتیجے میں ایک جگہ احمد ہمیش کو کہنا پڑا کہ آپ کے سوال میں ہی میرا جواب موجود ہے۔ سوال میں جواب کا موجود ہونا انٹرویو کرنے والے کا عیب ہے ہنر نہیں۔ اچھے انٹرویور کی صفت یہ ہے کہ وہ کم بول کر زیادہ میٹر نکلوالے۔ مجموعی طور پر انٹرویو دلچسپ، معلوماتی اور قابل مطالعہ ہے۔ ریحان صدیقی کو مبارکباد۔

پرچے میں شامل رحمٰن حسین انتخاب کی داد چاہتے ہیں کرشن بلدیو کی ہندی کہانی، گورڈیمر کی جنوبی افریقی کہانی کے ترجموں پر طبع زاد کہانیوں کا گمان ہوتا ہے

"جواب ماقی ہیں" پر اسلوب احمد انصاری کا تبصرہ پڑھ کر اپنے بزرگوں کے بلکے پن کا پتہ چلتا ہے۔ آل احمد سرور جیسی قد آور ادبی ہستی پر اسلوب احمد انصاری جیسا بلند قامت ہی دو ٹوک رائے دے سکتا ہے۔ امید ہے کہ ہمارے دیگر بزرگان ادب اپنی سوانح عمری لکھتے وقت اسلوب احمد انصاری کے اس تبصرے کو مدنظر رکھیں گے

سارتر اور کافکا پر مضامین شامل کرکے ناصر بغدادی نے پرچے کو مزید وقیع بنادیا ہے۔

بادبان کا سرورق جدید مصوری کا نمونہ ہوتے ہوئے بھی مبہم نہیں ہے۔ آصف جمیل نے بادبان بھی، مستول بھی، سمندر بھی، ہچکولے بھی، رفتار بھی اور ست تشیں معنی بھی سب ہی کچھ ابھارا ہے اس بادر مرقعے میں۔ مبارکباد۔

پاکستانی افسانہ نگاروں نے ایک بار پھر خوبصورت رسائل شائع کرکے اپنی مدیرانہ خوش سلیقگی کا ثبوت دیا ہے۔ تشکیل اور بادبان جاری و ساری رہیں یہی ہماری تمنا ہے۔ بس ایک احتیاط کے ساتھ کہ یہ Self Projection کے ذرائع نہ بن جائیں۔

تبصرۂ کتب

○ تبصرے کے لئے ہر کتاب کی ۲ جلدیں آنا ضروری ہیں

نام کتاب اردو رسائل ۱۹۹۲ء میں
مرتبہ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری - پٹنہ
صفحات ۴۰۰
قیمت ۱۰۰ روپئے
ملنے کے پتے . مکتبہ جامعہ - جامعہ نگر، نئی دہلی - ۱۱۰۰۲۵
اور مکتبہ جامعہ کی اردو بازار دہلی، بمبئی
اور علی گڑھ کی شاخیں
تبصرہ نگار رئیس الدین فریدی

پٹنہ کی مشہور عالم خدا بخش لائبریری بذات خود ہی کتابوں کا نادر ذخیرہ نہیں بلکہ علم و ادب کی دوسری صورتوں میں بھی شاندار خدمات دے رہی ہے جن میں نشر و اشاعت بھی شامل ہے - لائبریری کے بانی مولوی خدا بخش مرحوم کی ولادت کی صدی منانے کے سلسلے میں بھی یہ کام بڑے پیمانے پر ہوا اور زیر نظر کتاب بھی اسی کوشش کا حصہ ہے - اس میں ۱۹۹۲ء میں نکلنے والے اردو کے دو سو رسالوں اور جریدوں کے سرورق، مضامین اور لکھنے والوں کے نام ہی نہیں بلکہ ضمیمے ہیں ان میں سے بعض کے منتخب مضامین، کلام منظوم بھی جمع کر دیئے گئے ہیں جن میں ہندوستان کے علاوہ پاکستان کے رسالے بھی ہیں مگر غیر ملکوں سے شائع ہونے والے شامل نہیں - اگر وہ بھی شامل ہوتے تو تصویر اور زیادہ واضح ہو جاتی - اسی طرح رسالوں کے اجراء کے سنین بھی شامل ہوتے تو معلومات میں قیمتی اضافے کے موجب ہوتے - تاہم یہ کام بڑے پیمانے پر جاری ہونے اور بتدریج اردو کے رسالوں کا ایک قلزم مرتب کر کے شائع کرنے کا کام شروع ہو جانے کا مژدہ سنایا گیا ہے۔

زیر نظر کتاب میں جو بات کھٹکتی ہے وہ یہ ہے کہ تمام رسالوں کے ساتھ یکساں سلوک نہیں ہوا ہے - بعض کے لئے صرف ایک دو صفحے ہی دیئے گئے ہیں تو بعض کی غیر ضروری تفصیل سے بھی درگزر نہیں کیا گیا ہے - بعض مضامین محض بھرتی کے لئے ہیں جن کی اب کوئی اہمیت نہیں ہے - مثلاً قومی زبان سے منقول نیر مسعود صاحب کا قدیم اودھ اور لکھنو کے متعلق طویل مضمون - اس قسم کے مضامین بالکل فرسودہ اور صرف عجائب خانوں میں رکھنے کے قابل ہو گئے ہیں - علی گڑھ کے رسالے تہذیب اور اخلاق اور اس کے مستقل قلمی معاونین بشمول سید حامد صاحب کا احترام اپنی جگہ مگر ان کے مضامین کی بھرمار سے جانبداری کی بو آتی ہے - بہر حال مجموعی طور پر یہ کوشش قابل داد و تحسین ہے اور امید ہے کہ اگلا کام مزید نظم و ضبط کے ساتھ ہوگا اور اردو کے رسائل کے صحیح خد و خال کو نمایاں کرنے میں مکمل افادیت کا مظہر ہوئے بغیر نہ رہے گا - اور بہتر ہے کہ وہ رسالوں سے فارغ ہو کر اردو کے اخباروں کی مکمل اور صحیح تاریخ کی تدوین کی طرف بھی توجہ کرے - جو بعض کوششوں کے باوجود محتاج تکمیل ہے۔

ooooo

نام کتاب . کوچۂ قاتل
مصنف : رام لعل
ناشر . نصرت پبلشرز - لکھنو
تبصرہ . ڈاکٹر ظفر عمر قدوائی

کوچۂ قاتل ۲۳۱ صفحات پر محیط رام لعل کی خود نوشت سوانح حیات کا حصہ اول ہے - اس میں انہوں نے اپنے حالات زندگی قلمبند کرنے کے ساتھ ساتھ ان مسموم فضاؤں کا جو تقسیم ملک کے ساتھ نمودار ہوئی تھیں اور جن میں ان کی تشکیل فکر و فن ہوئی تھی یا جن مسلمان یا ہندو کرم فرماؤں سے ان کو فیض پہونچا تھا اس کا بیان انہوں نے بہت کھل کر کیا ہے - کتاب کی وہ سطور کچھ زیادہ ہی پر لطف ہیں جب ان کے چچا کو "قسم قرآن کی ہم ہندو ہیں" کہنے کی پاداش میں برہنہ ہو کر اپنے ہندو ہونے کا ثبوت فراہم کرنا پڑا تھا - کتاب کی زبان صاف سادہ اور رواں دواں ہے - اور ہر واقعہ کا تفصیلی جائزہ اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے -

ویسے حکایت ہستی لکھنے کا فن نہایت وقت طلب کام ہے اور یہ مشکل اس وقت اور بڑھ جاتی ہے جب کوئی اپنے بارے میں لکھ رہا ہو - اس لیے کہ اپنی کوتاہیوں کا اظہار یا اقرار بڑی جرأت کا کام ہے کوئی نہیں چاہتا کہ اس کے ماضی کو کرید کر اس کے راز ہائے سربستہ طشت از بام ہوں - ایسی صورت میں حالات و حقائق کا اظہار نوک قلم تک آتے آتے مصلحت کا شکار ہو جاتا ہے اور واقعات توڑ مروڑ کر بیان کیے جاتے ہیں - لیکن کھل کر اور نہایت بے باکی سے لکھنے والوں سے ادب خالی بھی نہیں ہے - اسی قبیل کے ایک فرد رام لعل ہیں - ان کی سوانح "کوچۂ قاتل" کے مطالعہ سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ کہاں پر ان سے دامن حق گوئی چھوٹ گیا ہے یا ان کے بیان میں قطع و

بربریت کی علمبرداری ہے۔

رام لعل کی ساری زندگی چند مسلسل اور کرب سے معمور ہے۔ ان کی زندگی کا ابتدائی دور نہایت انتشار اور افراتفری کا دور تھا۔ تقسیم ملک کا زخم ہر ایک کے دل میں تھا۔ لیکن اس کی جلن ان لوگوں کے دلوں میں اور زیادہ شدید تھی جو ترک مکان پر مجبور تھے۔ رام لعل نے نہایت تفصیل سے ان حالات کا تجزیہ کیا ہے جب انسان جامہ انسانیت سے عاری ہو کر درندگی اختیار کر چکا تھا۔ ایک دوسرے کو پھاڑ کھانا ایک عام بات تھی اور طبقہ اناث کی عصمتوں کو تار تار کر ڈالنا انتقام کی معراج سمجھا جانے لگا تھا۔

رام لعل نے ان روح فرسا حالات کا بے لاگ ذکر ایسے پیرائے میں کیا ہے جس سے ان کے اضطراب و اندوہ کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

کوچہ قاتل میں ایسے حالات بھی دیکھنے کو ملتے ہیں جب اس انسانیت سوز زمانے میں عیسیٰ خیل کے رئیس محمد حبیب اللہ اپنی جان کی بازی لگا کر سامیں دوہ پٹواری کی بیوی کو انتقام کی آگ میں جھلستے ہوئے مسلمانوں کے نرغے سے نکالتے ہوئے یہ کہہ رہے تھے "یہ مظلوم میری پناہ میں ہے۔ اس کے ایک بال کو بھی نقصان نہیں پہونچنے دوں گا۔"

اسی طرح کا ایک اور واقعہ سنگل پورہ میں اکٹھا ہوئے بپھرے مسلمانوں کے درمیان گھس کر سر پر قرآن رکھ کر ایک مسلمان سے لوگوں کو ان کے عزائم سے باز رکھا تھا "اس شہر کے سارے ہندو اب میری پناہ میں ہیں۔ ابھیں تم نے ذرا بھی گزند پہونچائی تو میری ناک کٹ جائے گی۔ تمہیں خدا کی اس کتاب اور رسول کا واسطہ واپس چلے جاؤ"۔

یہاں تک کہ افضل اور بہاری جیسے غنڈے بھی محبت اور رواداری کا پیکر تھے۔ جو یہ کہہ رہے تھے "بھائی بہاری تم ہجرت نہ کرنا جو کام ہم مل جل کر کرتے تھے اب اکیلے ہم کیسے کریں گے"۔

ایسے ایثار اور بھائی چارگی۔ انسان دوستی کی بہت سی مثالیں اس کتاب میں موجود ہیں جو قاری کی دلچسپی بڑھانے کے ساتھ انہیں عالم حیرت میں ڈالتی ہیں۔ لیکن بایں اوصاف بعض مقامات پر یہ بات کھٹکتی ہے کہ رام لعل نے بعض جگہ موضوع کو بے ضرورت طول دے دیا ہے۔ مثلاً تلوک چند محروم کے ذکر کو اس قدر بڑھا کر بیان کرنے کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ یا تقسیم ملک اور ہجرت کے زمانے کی بربریت اور سفاکی کی خونچکاں داستان بار بار دہرانے سے کیا حاصل۔ اگر یہ پس منظر کے طور پر بیان ہوتے اور رام لعل کی زندگی کے حالات تفصیل سے قلمبند ہوتے تو بات ہی اور ہوتی۔ پھر بھی ان حالات میں رام لعل یا ان کے اہل خانہ انسانی روایات کے پوری طرح امین رہے اور اپنی سابقہ رواداریوں پر ہر طرح قائم رہے۔ یہ بات حیرت انگیز ہے۔ وقت کا تقاضا تو یہ تھا کہ وہ بھی اسی سانچے میں ڈھل جاتے۔

مختصراً یہ کہ رام لعل عصری حیات اور اس سے پیدا شدہ کرب کو ہمیشہ جھیلتے رہے اور یہ کہ اپنے مضامین کے اذکار کے سلسلے میں وہ اپنی ذات کی وکالت کرتے محسوس ہوتے ہیں۔ مجموعی طور پر "کوچہ قاتل" رام لعل کے حالات زندگی کی اگر ایک جھلک پیش کرتی ہے تو دوسری طرف ۱۹۴۷ تا ۱۹۵۰ کی تاریخ کا ایک خونچکاں باب ہے جس کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ان فضاؤں اور ماحول سے گزرتے ہوئے رام لعل نے ادب میں اپنا مقام تسلیم کرالیا۔ حد درجہ لائق ستائش ہے۔ یقین ہے یہ کتاب شرف قبولیت حاصل کرے گی لیکن انتساب کا شعر تصحیح طلب ہے۔

ooooo

نام کتاب	ہندوستانی سماج
مرتبہ	شیلا چرن دوبے
ناشر	نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا۔ نئی دہلی
مبصر	ڈاکٹر ظفر عمر قدوائی

زیر نظر کتاب ہندوستانی معاشرت اور سماج کے ماضی اور حال کا جائزہ ہے۔ کتاب آٹھ ابواب پر مشتمل ہے اور اس کے ۱۹۸ صفحات ہیں۔

ہندوستانی سماج کی تشکیل اور اس کی پیچیدہ ساخت پر روشنی ڈالتے ہوئے مرتب نے ورن، ذات پات، جدی رشتے اور قدیم نظام حیات کا، کر دیہی اور شہری تناظر میں کیا ہے۔ اس موقع پر ان عوامل کی نشاندہی بھی کی ہے جن کی بناء پر جین، بودھ اور سکھ قدیم آریائی ہندو مذہب سے الگ ہو کر ایک نئے مذہب کے روپ میں ابھرے عیسائیوں اور مسلمانوں کے ہندوستان میں آنے کے زمانے کے سماجی حالات کی ابتری اور ہندو مت کی فرسودہ روایات اور انتہا پسندی کے سبب پورا سماج جس گھٹن کا شکار ہو کر نئے افق کی تلاش میں تھا اس کا تفصیلی جائزہ لیتے ہوئے مرتب نے ظاہر کیا ہے کہ ان ہی حقایق کی بناء پر ان نوواردان کو اپنے مذہب کی تبلیغ ترویج و ترقی میں چنداں دقت نہیں ہوئی۔ ساتھ ہی اس مفروضہ کا بھی بطلان کیا ہے کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا۔ انہوں نے مسلم مبلغین کی تعلیمات صوفی اور سنت شعرا کے کلام اور گیتوں کو پیش کرتے ہوئے مسلم حکمرانوں کے طرز حکومت اور نظام کارکردگی کو بھی سراہا ہے جس سے پر عافیت زندگی بسر کرسکنے کی فضاؤں اور اتحاد باہمی کو فروغ ملا۔ مرتب کے طرز تحریر سے ان کی اصلاح معاشرے کی فکر

کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ مختلف مذاہب کے افراد کو قریب لانے اور باہم متحد ہو کر آگے بڑھنے کے جذبات کو ابھارنے کے لیے مرتب نے ایک دوسرے کے لباس، خوراک، رہن سہن، رسم و رواج، طرز تعمیر و طب ان کے اوصاف وغیرہ کی روشنی میں ان کے مشترکہ اقدار و روایات اور زندگی کے ایسے مسائل کی نشاندہی کی ہے جن میں بڑی حد تک یکسانیت ہے۔ ایسی تحریکوں یا مسئلوں کو جو سماج کے لیے چیلنج یا بنائے متنازعہ ہیں ان کو بدلنے کی ترغیب دیتے ہوئے اس کو عیب گردانا ہے اور اس عیب کا سبب ان کے نزدیک قانون میں ڈھیل یا اس کا غیر موثر نفاذ ہے شادی یا غمی کے موقعوں پر برتی جانے والی غیر ضروری رسمیں یا پرتکلف ضیافتیں ملک کے موجود حالات میں سماج پر زبردست بوجھ سے وہ تعبیر کرتے ہیں اور اس سے اجتناب کو ضروری سمجھتے ہیں۔ مرتب یکساں سول کوڈ کے حامی ہیں لہذا اس کے مخالفین کو تنگ نظر اور انتہا پسند گردانتے ہیں۔ راقم کے خیال سے یہ مسٹر دوبے کی مزاج شریعت اسلامی پر کماحقہ آگاہ نہ ہونے کی دلیل ہے۔ اس کتاب میں ہندوؤں کی قدیم رسم ستی اور نیوگ کا بھی ذکر اور مذمت کی گئی ہے۔ اس لیے کہ اس سے مرد اور عورت کے درمیان حائل نابرابری کی خلیج اور بڑھی ہے۔ لہذا اس رسم کا ختم ہونا ضروری سمجھتے ہیں ساتھ ہی اس خدشہ کا بھی اظہار کرتے ہیں کہ ہندو انتہا پسندی اس راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ شرح کثرت ازدواج کے سلسلے میں کتاب میں تین دہائیوں کے ایسے اعداد و شمار بھی ہیں جن کے جائزے سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ شرح برابر گھٹ رہی ہے نیز یہ کہ اس کا تناسب مسلمانوں سے زیادہ ہندوؤں میں ہے۔ شہری اور دیہی حالات کے تناظر میں مرتب نے شہر کے مقابلے میں دیہات کو پس ماندہ گردانا ہے اور اس پس ماندگی کا سبب دیہاتوں میں تعلیمی سہولتوں کا فقدان بتاتے ہوئے دیہاتوں میں تعلیمی ضرورت اور اس کے لیے ہر ممکن سہولت کی بھی سفارش کی ہے تاکہ دیہات کے رہنے والے بھی ترقی اور خوشحالی کے مواقع حاصل کر سکیں۔

آخری صفحات میں ہندوستانی سماج کے بارے میں مزید معلومات کے شائقین کے لیے چند مفید کتابوں کی فہرست بھی دی ہے۔ انگریزی اصطلاحات کی وضاحت کے لیے ایک فرہنگ بھی شامل کتاب ہے جس سے اس کے مطالعہ میں سہولت ہوتی ہے۔ غرض کہ ہندوستانی سماج اور تمدنی حالات پر مبنی شیاما چرن دوبے کی یہ کتاب ایک مفید اور گراں قدر اساس ہے جس سے سماج کے بارے میں مفید معلومات فراہم ہوتی ہیں۔ ہندوستانی جیسے کثیرالاقوام و مذاہب ملک اور ان میں مروجہ رسوم و روایات میں ایسی قدر مشترک کی تلاش جو اتحاد باہمی اور میل ملاپ کی فضاؤں کو قائم کرنے میں معاون ہو اس کتاب کا مرکزی خیال اور مرتب کی کثرت میں وحدت کی تلاش کہی جاسکتی ہے۔ کتاب کی طباعت صاف ستھری، زبان سادہ اور عام فہم اور اس کا سرورق دیدہ زیب ہے۔ اکتیس روپیہ اس کی قیمت مواد کو دیکھتے ہوئے زیادہ نہیں بلکہ کم ہی ہے۔

ooooo

نام کتاب	.	قرۃ العین حیدر کی منتخب کہانیاں
سنہ اشاعت	:	پہلا ایڈیشن، ۱۹۹۵ء
صفحات		۵۶۵
قیمت	:	۵۰ روپے
ناشر	:	ڈائرکٹر نیشنل بک ٹرسٹ اے-5 گرین پارک نئی دہلی-110016
تبصرہ نگار	:	ڈاکٹر خالدہ حسینی

زیر نظر کتاب "قرۃ العین حیدر کی منتخب کہانیاں" نیشنل بک ٹرسٹ (انڈیا) نے شائع کی ہے۔ اس میں قرۃ العین کی کہانیوں میں سے صرف بارہ منتخب کہانیاں شامل کی گئی ہیں۔ کتاب کا حجم ۵۶۵ صفحات پر مشتمل ہے۔ کتابت و طباعت بہت عمدہ اور نفیس ہے۔ اس کے ساتھ ہی ٹائٹل پیج بہت دلکش اور معنی خیز ہے۔

گیان پیٹھ انعام یافتہ مصنفہ قرۃ العین حیدر اردو ادب کی لاثانی ادیبہ ہیں۔ انگریزی ادب کی اعلیٰ تعلیم یافتہ، روشن خیال اور مختلف اعلیٰ عہدوں پر فائز رہ کر اپنی بے پناہ صلاحیتوں سے متاثر کرنے والی ادیبہ قرۃ العین حیدر نے اردو افسانے کو ایک نئی جہت ہی نہیں دی ہے بلکہ افسانے کے فن کو نئے ابعاد سے آشنا کیا ہے۔ چنانچہ اردو کے افسانوی ادب میں ان کا کوئی حریف نہیں ہے۔ ان کی نگاہوں میں بڑی وسعت اور گہرائی ہے۔ وہ اپنی ان عمیق نگاہوں سے ایشیا اور یورپ کی زندگی کو پرکھتی اور اسے اپنی تحریروں میں پیش کرتی ہیں۔ چنانچہ ان کے افسانوں اور ناولوں کا کینوس بہت وسیع ہے۔ اور ان کا طرز فکر اور طرز نگارش دونوں جدت و ندرت کے حامل ہیں۔ ان کے اسلوب کی سلاست و روانی، شگفتگی و شائستگی اور بے ساختگی قاری کو متاثر کیے بغیر نہیں رہتی۔ انہوں نے آزادی نسواں کو اپنی بیشتر تحریروں کا خاص موضوع بنایا ہے۔ ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ "ستاروں سے آگے"

۱۹۸۸ء میں شائع ہوا تھا۔اس کو جدید افسانوں کا نقطہ آغاز تصور کیا جاتا ہے۔ "میرے بھی صنم خانے" ۔ "سفینۂ غم دل" ۔ "آگ کا دریا" ۔ "کار جہاں دراز ہے" ۔ "آخر شب کے ہمسفر" ۔ "گردش رنگ چمن" اور "چاندنی بیگم" ان کے مشہور ناول ہیں، جن میں "آگ کا دریا" کو اپنے وسیع ترین کینوس، بے مثال کردار نگاری، انوکھی تکنیک، صحت مند نظریہ حیات اور دلکش طرز بیان کے لیے جدید کلاسک کا درجہ حاصل ہے۔

اس کے علاوہ انہوں نے بچوں کے ادب پر بھی توجہ فرمائی ہے۔ ان کا بچوں کے لیے "حسن عبدالرحمن" نام کا ناول ہے جو سائنس فکشن میں اہمیت کا حامل ہے۔ یہ بچوں کے لیے ان کا یادگار شاہکار ہے۔ انہوں نے بچوں کے لیے دوسری زبانوں کی بے شمار کتابوں کو رواں دواں، عام فہم اردو میں منتقل بھی کیا ہے۔ حقیقت ہے کہ وہ ایک اعلیٰ پائے کی مترجم بھی ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب میں ان کی حسب ذیل بارہ منتخب کہانیاں پیش کی گئی ہیں

(۱) قلندر (۲) کارمن (۳) فوٹوگرافر (۴) جگنوؤں کی دنیا (۵) ملفوظات حاجی گل بابا بیکتاشی (۶) کہرے کے پیچھے (۷) حسب نسب (۸) سینٹ فلورا آف جارجیا کے اعترافات (۹) روشنی کی رفتار (۱۰) ڈالن والا (۱۱) کلوکجے کی ہنسی (۱۲) اگلے جنم موہے بٹیا نہ کیجو

ان کہانیوں سے بہت بڑی حد تک ان کے فکر و فن کی نمائندگی ہوتی ہے۔ ان کہانیوں میں قرۃ العین حیدر نے انسان، زندگی اور کائنات پر سے جس انداز میں پردے اٹھائے ہیں اور تاریخ و تہذیب و ثقافت کی قوتوں پر جس طرح روشنی ڈالی ہے، وہ ان ہی کا حصہ ہے۔

(xxxx)

نام کتاب	عصری ہندی کہانیاں
مرتب	ڈاکٹر دھننجے ورما
مترجم	سلام بن رزاق
سنہ اشاعت	پہلا اردو ایڈیشن ۱۹۹۵ء
صفحات	۳۲۹
قیمت	۶۸ روپئے
ملنے کا پتہ	ڈائرکٹر نیشنل بک ٹرسٹ (انڈیا) A - 5 گرین پارک نئی دہلی - 110016

تبصرہ نگار ڈاکٹر خالدہ حسینی

نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا نے ہندی کہانیوں کا ایک انتخاب (ہندی کہانی) کے نام سے بہت پہلے شائع کیا تھا، جس میں ابتداء سے لے کر عصر حاضر تک کے پندرہ مشہور کہانی کاروں کی کہانیاں شامل تھیں۔ اس کتاب کے مرتب تھے مشہور ادیب ڈاکٹر نامور سنگھ۔ ڈاکٹر نامور سنگھ کا نام اس انتخاب کے معیاری ہونے کی ضمانت ہے، لیکن ان کے ساتھ کتاب کی ضخامت ایک ایسی مجبوری بن گئی تھی، جس کی وجہ سے وہ بہت سے قابل ذکر کہانی کاروں کو اپنے انتخاب میں شامل نہیں کرسکے تھے۔ چنانچہ ہندی کہانی کا پورا منظر نامہ سامنے آنے سے رہ گیا تھا۔

اس کی تلافی زیر تبصرہ انتخاب (عصری ہندی کہانیاں) نے کردی ہے۔ ڈاکٹر دھننجے ورما کا ترتیب دیا ہوا یہ انتخاب نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا نے ۱۹۸۸ء میں پہلی بار شائع کیا تھا۔ اسی کتاب کا اردو ایڈیشن ۱۹۹۵ء میں شائع کیا گیا ہے۔ اطمینان کی بات یہ ہے کہ پوری کتاب کا ترجمہ اردو کے مشہور افسانہ نگار سلام بن رزاق نے کیا ہے۔

ڈاکٹر نامور سنگھ کے انتخاب میں چندردھر شرما گلیری، پریم چند، جے شنکر پرساد، جینندر کمار، یشپال، رانگے راگھو، رینو، نرمل ورما، امر کانت، گیان رنجن، کاشی ناتھ سنگھ، راجندر یادو، کملیشور، موہن راکیش، شری کانت ورما شامل تھے، جب کہ ڈاکٹر دھننجے ورما کے انتخاب میں مکتی بودھ، ہری شنکر پرسائی، دھرم ویر بھارتی، امرت رائے، بھیشم ساہنی، رام کمار، کرشن بلدیو وید، میپ سنگھ، شانی، کامتا ناتھ، راجی سیٹھ، رمیش بخشی، گری راج کشور، رام نرائن شکل، اوم پرکاش مہرہ، گووند مشر، رماکانت شریواستو، ستین کمار، سویم پرکاش اور منظور احتشام شامل ہیں، جن کا تعارف بھی کتاب کے آخر میں پیش کردیا گیا ہے۔

ان دونوں انتخابات کو پہلو بہ پہلو رکھ کر یہی نہیں کہ ہندی کہانی کے ارتقاء کا اندازہ لگانا آسان ہوگیا ہے بلکہ ہندی میں اس صنف کی مختلف جہتوں کو سمجھنے کی سہولت بھی فراہم ہوگئی ہے۔

آزادی کے بعد ہندی کہانی میں کئی تحریکیں چلیں، جیسے نئی کہانی، اکہانی، وایو کہانی، سچیتن کہانی، سمانتر کہانی وغیرہ ان تمام تحریکوں نے ہندی کہانی کو تازہ رجحانات اور نئے رویوں سے آشنا کیا ہے۔ اس کی پوری جھلک ان منتخب کہانیوں میں ملتی ہے۔

ڈاکٹر دھننجے ورما کے نزدیک عصری کہانی احتجاج اور مزاحمت کی کہانی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ "عصری کہانی میں جو تبدیلی آئی ہے، اس کی

اساس ہی یہ ہے کہ اس میں کہانی کار محض حالات کا چشم دید گواہ ہی نہیں ہے بلکہ اس میں خود بھی شامل ہے۔ اور اس سے پیدا ہونے والے تضادات اور صدمات کو وہ خود بھی برداشت کر رہا ہے"۔

ڈاکٹر ورما نے یہ فیصلہ بھی سنایا ہے کہ "آج کے حوالے سے معتبر کہانی وہی ہو سکتی ہے، جو عصری آدمی ہی کی طرح آج کے حالات میں شریک ہوتی ہے اور اس کشاکش کے دوران حاصل ہونے والے تجربے کو تخلیق کا اعتبار بخشتی ہے"۔

انہوں نے مکتی بودھ کی یہ رائے بھی پیش کی ہے کہ "جو لوگ خالص ادب یا ادب میں فرد کی آزادی کی بات کرتے ہیں وہ تخلیق کو اس کی سماجی اور تخلیقی دولت سے کاٹ دینا چاہتے ہیں"۔

اسی نقطہ نظر کی وجہ سے زیر نظر انتخاب میں عصری وابستگی کی کہانیوں کو زیادہ جگہ دی گئی ہے، لیکن ان کہانی کاروں پر اس کا دروازہ بند نہیں کیا گیا ہے، جو کسی بھی وابستگی کو تسلیم نہیں کرتے۔ ان میں سے بعض کہانی کاروں کی کہانیاں بھی شامل کرلی گئی ہیں تاکہ ہندی کہانی کا منظر نامہ نامکمل نہ رہے۔

زیر نظر کتاب کو اردو قالب میں منتقل کرکے نیشنل بک ٹرسٹ نے اردو ادب کی دنیا کو ہندی ادب کا ایک بیش قیمت تحفہ پیش کیا ہے۔ بعض حلقوں میں یہ بات کہی جاتی ہے کہ ہندی شاعری اردو شاعری سے آگے ہو یا نہ ہو، لیکن ہندی کہانی اردو کہانی سے بلاشبہ آگے ہے۔ اس بات میں کہاں تک صداقت ہے، قارئین "عصری ہندی کہانیاں" پڑھ کر بہ آسانی فیصلہ کر سکتے ہیں۔

۳۲۹ صفحات کی یہ کتاب طباعت، کتابت اور کاغذ کے اعتبار سے بھی نفیس ہے اور ارسٹھ روپے میں مہنگی نہیں ہے۔

ooooo

نام کتاب	رفیع احمد قدوائی
مصنف	ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی
ناشر	پبلیکیشنز ڈویژن، نئی دہلی
مبصر	ڈاکٹر ظفر عمر قدوائی

ہر سرزمین یا ملک میں وقتاً فوقتاً ایسے سپوت جنم لیتے رہے ہیں جو ملک اور قوم کی خدمت اپنا فریضہ حیات سمجھتے رہے۔ اسی فکر اور جدوجہد میں انہوں نے زندگی وقف کی اور آخر اسی دھن سے سرشار رہتے ہوئے اپنی جان جان آفریں کے سپرد کردی۔ ایسے ہونہار سپوتوں کی یاد تازہ رکھنے کے خیال سے پبلیکیشنز ڈویژن نے ان کی قربانیوں اور زبردست کارناموں کو اجاگر کرکے کتابی شکل میں پیش کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے اس سلسلے کی ایک اہم کڑی زیر نظر کتاب بھی ہے۔ جو رفیع احمد قدوائی کے حالات زندگی اور ان کی عدیم المثال ملکی اور قومی جذبات کا ایک جامع مرقع ہے۔

مصنف نے رفیع صاحب سے اپنے گہرے روابط اور سترہ سالہ رفاقت کے آئینہ میں ان کو جیسا پایا یا سمجھا اس کا ذکر اور موضوع سے متعلق گرانقدر کتب مجالس قانون ساز کی کارروائیوں کی رپورٹ، اخبارات اور میگزینز کی روشنی میں بڑی دقیقہ رسی سے ہر ماخذ کو کھنگال کر کتابی شکل دی ہے کتاب انیس ابواب پر مشتمل ہے اور مع اشاریہ کے اس کے صفحات کی تعداد دو سو پچاس ہے۔

ویسے تو بحیثیت طالب علم، رکن تحریک ترک موالات، بحیثیت ممبر لجسلیٹو اسمبلی۔ ہندوستان چھوڑو اور سول نافرمانی تحریک۔ نیپال اور کشمیر کے معاملات اور ہندوستان کی مسلم سیاست یہ سبھی عنوانات رفیع صاحب کے جذبہ حب الوطنی، قومی اتحاد، معجزانہ صفات اور آہنی عزائم کا پتہ دیتے ہیں ساتھ ہی برادران ملک کے لیے اور رہبران قوم کے لیے ایک باب درس بھی کھلتا ہے اور اس سے سبق لے کر کچھ کرنے اور کارآمد شہری بننے کا حوصلہ بھی ملتا ہے۔ لیکن رفیع صاحب بحیثیت وزیر دفاع، وزیر مواصلات، مرکزی وزیر خوراک اور کانگریس سے ان کی علیحدگی کے تحت کی گئی بحثیں ان کی عظیم قربانیوں، معاملہ شناسی اور دور اندیشی، وقت کی ہر نبض کی شناخت، بے لوث خدمت قوم اور ہر عقدہ دشوار کو حل کرلینے کی عظیم صلاحیتوں کا پتہ دیتی ہیں۔ ہندوستان کے غذائی بحران سے نپٹنے کے لیے جو انہوں نے کوشش کی اس کا اعتراف خود حکومت نے بھی کیا تھا۔

غرض کہ اس قسم کے واقعات اور ہر وقت رفیع صاحب کی سوجھ بوجھ اور مجتہدانہ کاوش فکر، ان کی غیر متزلزل خود اعتمادی جیسے اذکار سے اس کتاب کا کوئی باب یا صفحہ خالی نہیں ہے۔ مصنف نے رفیع صاحب کے حالات زندگی اور زبردست کارناموں کو مستند حوالوں کی بنیاد پر بے کم و کاست تحریر کیا ہے۔ قابل ذکر امر یہ ہے کہ کسی مقام پر مصنف کی طرف سے رفیع صاحب کی ذات کی وکالت کا شائبہ نہیں محسوس ہوتا۔ طرز تحریر میں قلم کی پختگی اور تحقیق عرق ریزیوں کی جھلک نمایاں ہے۔ زبان صاف سادہ اور عام فہم ہے۔

قوی امید ہے کہ اس کی کماحقہ پذیرائی ہوگی اور ہمارے نونہالان

دلوں اس سے کچھ سیکھنے کی تحریک حاصل کریں گے اور کارپردازان مملکت اس روشنی میں اپنا محاسبہ کریں گے۔

ooooo

نام کتاب : سید احمد خاں
مرتب : خلیق احمد نظامی
ناشر : پبلیکیشن ڈویژن - دہلی
مبصر : ڈاکٹر ظفر عمر قدوائی

زیر نظر کتاب سرسید کے حالات زندگی پر مبنی ہے - جس کے دیباچہ کے علاوہ گیارہ ابواب ہیں - آخر میں ضمیمہ کے طور پر سرسید کے حالات کا تنقیدی جائزہ ہے اور ان کتابوں کی فہرست بھی درج ہے جو اس کی ترتیب میں کام آئیں۔

ابتدا میں مولف نے اس پس منظر کا جائزہ لیا ہے جس میں سرسید کی شخصیت اور فکر کی تشکیل ہوئی تھی - اس لیے انہوں نے ملک کے سیاسی معاشی معاشرتی اور قومی حالات کا بھرپور تجزیہ کرتے ہوئے اس پورے دور پر روشنی ڈالی ہے - جب مغلیہ حکومت روبہ زوال تھی اور بادشاہ کی حیثیت شاہ شطرنج سے زیادہ نہیں رہ گئی تھی - ہندوستان کے افق سیاست پر ادبار کے گہرے بادلوں کا سایہ تھا اور پوری قوم ایک احساس کمتری میں مبتلا تھی - ان ہی حالات میں ۱۸۵۷ء کا انقلاب بھی رونما ہوا جس نے ہندوستانیوں اور خاص کر مسلمانوں کی رہی سہی ساکھ بھی ختم کردی۔

مولف نے پنڈت نہرو کے حوالے سے مسلمانوں پر انگریزوں کے عتاب کا سبب یہ بیان کیا ہے کہ وہ مقابلتاً زیادہ لڑاکو اور جنگجو کہے جاتے تھے اسی لیے حکومت بھی ان کو زیادہ خطرناک سمجھتی تھی - اس کے علاوہ ایک سبب یہ بھی تھا کہ انگریزوں نے اقتدار چونکہ مسلمانوں سے چھینا تھا اس لیے وہ ان کو اپنا سب سے بڑا حریف سمجھتے تھے یہی وجہ تھی کہ مسلمان سب سے زیادہ انگریزی عتاب کا شکار ہوئے۔

ان حالات کا سرسید نے بڑے غور سے مطالعہ کیا اور ایک ماہر نبض شناس کی طرح مسلمانوں کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھا اور ان کے مرض کا سبب ان کی جہالت کہیں کی - لہذا سب سے پہلے ان کی جہالت دور کرنے کی طرف توجہ کی - اور اپنے اس مقصد میں تمام عمر صرف کردی۔

مولف نے اس ساری صورت حال کا ذکر معتبر وسائل اور حوالوں کی مدد سے حاصل کر کے اس کتاب میں جمع کیا ہے - سرسید پر ایک یہ الزام کہ وہ انگریزی ملازمت میں ہونے کی بناء پر ہندوستان سے زیادہ انگریز کے وفادار تھے - اس لیے انہوں نے کانگریس سے علیحدگی اختیار کی اور مسلمانوں کو عملی سیاست میں دخیل ہونے سے باز رکھا - نیز یہ کہ تھیوڈور بک کے افکار و نظریات سرسید کے اعصاب پر پوری طرح چھائے ہوئے تھے - مولف اس مفروضہ کو کالعدم ٹھہراتے ہوئے لکھتے ہیں -

" کہ بک پر سرسالار رہنما نے اعتماد کیا تھا - اس بات کا مسٹر بک نے غلط فائدہ اٹھانا چاہا - انہوں نے اپنی مرضی سے جو رنگ و رخ دیا یقیناً اسے سرسید کبھی پسند نہ کرتے تھے " اسی طرح سیاسی امور سے سرسید کی غیر دلچسپی کے اسباب کے بارے میں مولف کا خیال ہے کہ سرسید کا یہ یقین راسخ تھا کہ چونکہ مسلمان تعلیمی میدان میں بہت پیچھے ہیں اس لیے ان کا سیاسی امور میں دخل مناسب یا مفید نہ ہوگا - اس بنا پر سرسید نے سیاسی میدان چھوڑ کر تعلیمی میدان میں اپنی ساری توجہ صرف کرنے کا جو فیصلہ کیا تھا وہ حالات کے گہرے مطالعہ کا نتیجہ تھا اس موقع پر مولف نے پنڈت جواہر لعل نہرو کے خیالات بھی قلمبند کیے ہیں اور سرسید کے خلاف پیدا ہونے والی غلط فہمیوں اور شکوک کا ازالہ بھی کیا ہے - اسی کے ساتھ ساتھ سرسید کی ہندو مسلم اتحاد اور میل ملاپ کی کوششوں کے فروغ کو سراہا اور اجاگر کیا ہے - اس میں شک نہیں کہ سرسید کا پیغام آفاقی تھا اور اس میں مذہب و ملت کی کوئی تفریق نہیں تھی - بلکہ عمومی طور پر وہ سارے ملک کی بہبود کے لیے ساری عمر جدوجہد کرتے رہے۔

غرض کہ زیر نظر کتاب سرسید کے ہر گوشہ حیات کا تفصیلی مطالعہ ہے جو مولف نے مستند حوالوں اور روایتوں کی بنیاد پر پیش کیا ہے - انہوں نے سرسید کے خلاف اٹھنے والی آوازوں اور تحریکوں کو کچھ اہمیت نہ دیتے ہوئے ان کی قومی، ملکی، ملی اور معاشرتی سرگرمیوں پر بھرپور مفید بحث کی ہے یہ کتاب سرسید شناسی کے لیے ایک گرانقدر ماخذ ہے - امید ہے اسے پذیرائی حاصل ہوگی۔

○ احوال و اخبار

بہار قانون ساز کاؤنسل کے شعبہ اردو کی جانب سے

دو صد سالہ تقریبات غالب کا اعلان

عظیم شاعر غالب (۲۷/۱۲/۱۷۹۷ تا ۱۵/۲/۱۸۶۹) کی پیدائش کے دو سو برس مکمل ہونے پر بہار قانون ساز کاؤنسل کے اردو شعبہ نے دو صد سالہ تقریبات غالب کے انعقاد کا فیصلہ کیا ہے۔

مختلف پروگراموں کی تفصیلات حسب ذیل ہیں

Ghalib Miscellany

منتخب نگارشات غالب

اس موقعہ سے ایک ایسی کتاب شائع کی جائے گی جس میں غالب کی تقریباً تمام اہم تحریریں شامل ہوں - غزلیں، قطعات، قصائد، فارسی کلام مع ترجمہ، خطوط، روزنامچہ اور دیگر اقسام کی نگارشات کا ایک ایسا نمائندہ انتخاب جس سے غالب کی شخصیت، عہد اور ادبی مرتبے کا تعین ہوسکے۔ اس کتاب کا ہندی ترجمہ بھی شائع ہوگا۔ اس کی طباعت میں خاص اہتمام روا رکھا جائے گا اور رنگوں، تصاویر، مصوری کے نمونوں سے اسے سجایا جائے گا۔

یادگاری لکچر

غالب کے اس دو سویں برس میں ملک کے نامور اصحاب قلم کی تقاریر کا ایک سلسلہ قائم کیا جائے گا۔ اس ایک سال کے دوران پانچ لکچر غالب کے عہد، شخصیت اور کارناموں پر دلائے جائیں گے جن میں کم از کم ایک غیر اردو داں عالم کا ہوگا۔ ان یادگاری لکچرز کو مطبوعہ شکل میں بھی پیش کیا جائے گا۔

غالب کی حیات اور خدمات پر تعارفی کتاب

غالب کی حیات، شخصیت اور کارناموں پر ایک تعارفی مونوگراف بہار قانون ساز کاؤنسل کی طرف سے تیار کرایا جائے گا۔ سوا سو صفحات پر مشتمل اس کتاب میں غالب کے ادب کی سماجیات کا جائزہ لینے کی کوشش کی جائے گی اور ان کے ادب کے عوامی کردار پر روشنی ڈالی جائے گی۔

اس کتاب کا بنیادی مقصد غیر اردو عوام میں غالب کو متعارف کرانا بھی ہے۔ اس لئے اسے ہندی میں ضرور شائع کیا جائے گا۔

غالب دو سو برس

یادگاری شبیہہ

ممتاز مصوروں سے غالب کی قد آدم رنگین تصویریں بنوائی جائیں گی، جن میں سے سب سے اچھی تصویر کو غالب کے جشن دو صد سالہ کے موقع سے بہار قانون ساز کاؤنسل کی انیکسی عمارت میں نصب کیا جائے گا۔

غالب البم

مصوری کا مقابلہ

غالب کے اشعار کی تصویر سازی، غالب کی شبیہہ سازی اور غالب کے عہد کو نگاہ میں رکھ کر تیار کئے گئے مصوری کے (سفید سیاہ) نمونوں کا (1) اسکول کالج اور یونیورسٹی سطح پر (2) قومی سطح پر ایک انعامی مقابلہ منعقد کیا جائے گا۔ ان مقابلوں سے منتخب ایک سو تصاویر کو "غالب البم" کے بہ طور زیور طباعت سے آراستہ کیا جائے گا۔

غالب پر ایک دستاویزی فلم

یہ عجب اتفاق ہے کہ غالب پر ابھی تک جو بھی فلمیں یا سیریل سامنے آتے ان میں ان کی وقیع سماجی حیثیت اور ان کے عوامی کردار کو روشن کرنے کے بجائے انہیں ایک اوباش، قرض خور اور نہ جانے کتنی بگڑی صورتوں میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ غالب جیسے عظیم شاعر کے ساتھ شدید بے انصافی ہے۔

اس لئے اس دو سویں برس میں غالب کے عہد اور کارناموں کو مرکز میں رکھ کر ایک دستاویزی فلم بنوائی جائے گی اور کوشش کی جائے گی کہ غالب کا بالکل نیا چہرا ہمارے سامنے ابھر کر آئے اور ان کی شاعرانہ اور ادبی عظمت کے عناصر روشن ہوسکیں۔

غالب ایوارڈ

دو صد سالہ تقریبات غالب کے موقعہ سے ایک لاکھ روپے کا ایک ایوارڈ دینے کا ارادہ ہے۔ دو سویں برس میں غالب کے تعلق سے کسی وقیع تخلیقی، تنقیدی، تقریری یا فلمی کارنامے پر یہ ایوارڈ دیا جائے گا۔

اختتامی تقریب

غالب کی پیدائش کے دو سو برس مکمل ہونے پر 27/ دسمبر 1996ء کو ایک مہتم بالشان اختتامی تقریب منعقد ہوگی جس میں ایک لاکھ روپے کا

ب ایوارڈ دیا جائے گا۔اس موقعہ سے غالب کی مختلف طرحوں پر ایک کل
ہ مشاعرہ منعقد کیا جائے گا۔

جابر حسین، کارگزار چیرمین
بہار قانون ساز کاؤنسل، پٹنہ

ooooo

ہجرت کا اثر دونوں ملکوں کی شاعری پر ہے

"دبستاں" کے علمی جلسے میں ادیبوں کا اظہار خیال

نئی دہلی کے ممتاز ادیبوں کی تنظیم "دبستاں" کا ایک جلسہ اور مذاکرہ اکیڈیمک اسٹاف کالج جامعہ میں منعقد ہوا۔ صدارت پروفیسر عبدالرحمان ہاشمی اور نظامت ڈاکٹر شہپر رسول نے کی۔ افتتاح کرتے ہوئے پروفیسر عنوان چشتی نے کہا ہند و پاک میں جدید شاعری اگرچہ اپنے مزاج کی بدولت الگ ہے۔مگر اس کو ترقی پسندی کی توسیع قرار دینا یا "مکمل انحراف قرار دینا" درست نہیں ہے۔وہ بھی اپنے فطری نشو و نما کی وجہ سے "روایت کی توسیع" ہے۔انہوں نے یہ بات خاص طور پر کہی کہ اب تک جدید شاعری کے سماجیاتی مسائل پر کوئی مسبوط تحقیقی کام نہیں ہوا ہے۔البتہ "جدیدیت" کے اظہاری پہلو اور فکری پہلو پر بعض اہم کتابیں دستیاب ہیں۔ پروفیسر ہاشمی نے کہا کہ پاکستان کی شاعری میں "ہجرت" پر خاصا زور اس لیے ہے کہ وہاں کے اکثر بڑے لکھنے والے ہندوستان سے ترک وطن کرکے پاکستان گئے ہیں۔ ڈاکٹر رضوان اللہ نے اپنے مقالے "ہند و پاک میں اردو شاعری کا تقابلی مطالعہ "آزادی کے بعد" میں ہجرت کے مسائل پر خامہ فرسائی کی۔ان کا خیال تھا کہ ہجرت کے مسائل پاکستانی شاعری میں زیادہ ابھر کر سامنے آئے ہیں۔ اس ضمن میں ذیل کے دو شعروں پر بحث آئے جو ہندوستانی شاعروں کے ہیں۔

مجھے بھی لمحہ ہجرت نے کردیا تقسیم
نگاہ گھر کی طرف ہے، قدم سفر کی طرف

شہپر رسول

ہمارا شہر مدینہ نہیں مگر پھر بھی
ہر ایک گھر میں مہاجر قیام کرتے ہیں

عنوان چشتی

بحث میں حصہ لیتے ہوئے ریٹائرڈ پروفیسر معین الدین نے کہا کہ علوم میں ایک جگہ سے دوسری جگہ، ایک شہر، قصبے یا گاؤں سے دوسرے بڑے شہر، ایک ملک سے دوسرے ملک کے سفر کو ان کے مقاصد کے تحت الگ الگ نام دیئے گئے ہیں۔سب کو "ہجرت" نہیں کہنا چاہیے۔بحث میں ڈاکٹر خالد محمود، کوثر مظہری، منظور ہاشمی (علی گڈھ) پروفیسر ظفر احمد نظامی اور شہپر رسول وغیرہ نے حصہ لیا۔اس کے بعد شعری حصے میں پروفیسر عنوان چشتی، منظور ہاشمی، پروفیسر ظفر نظامی، ڈاکٹر خالد محمود، ڈاکٹر شہپر رسول، عمران عظیم اعجاز انصاری، امتیاز سالک (پٹنہ) عراق رضا زیدی، دانش ایوبی، سکندر عاقل، وجدی برہان پوری، کوثر مظہری اور عادل حیات نے اپنا کلام سنایا۔ قمر جہاں (ناگپور) نے اپنا افسانہ پیش کرکے سامعین سے خراج تحسین حاصل کیا۔اس نشست کو ڈاکٹر محمد مسلم خاں نے اپنے حسن تدبر سے خوب سنوارا۔

ooooo

جلال آباد میں کل ہند مشاعرہ اور کوی سمیلن

۲۳/ دسمبر ۱۹۹۵ء کو معروف قصبہ جلال آباد (شاہجہاں پور) میں گزشتہ سالوں کی طرح امسال بھی ہائیڈل بجلی گھر کے وسیع لان میں "کل ہند مشاعرہ اور کوی سمیلن" کا رنگا رنگ پروگرام منعقد ہوا۔نگر پالیکا جلال آباد کے نو منتخب چیرمین شری سنجے پاٹھک نے شمع روشن کرکے پروگرام کا آغاز کیا۔ صدارت کے فرائض ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ شاہجہاں پور انوار الحق صاحب نے انجام دیئے۔اپنی صدارتی تقریر میں جناب انوار الحق نے فرمایا کہ اردو اور ہندی بہنیں ہیں ان دونوں زبانوں نے گھسی پٹی روایتوں کو بھلا کر جس لاجواب ادب کی تخلیق کی ہے اس پر ہمیں ناز ہے۔ انہوں نے موجودہ شاعروں کے ساتھ ساتھ ان ادیبوں کے نام بھی گنائے جو نہ صرف ہندی بلکہ اردو، عربی اور فارسی زبانوں پر عبور رکھتے ہیں۔انہوں نے کہا جب بھی اردو پر برا وقت پڑا ان شعراء کی شاعری نے اس کے جسم میں نئی روح پھونکی۔ انہوں نے وکرمادت جی کی شخصیت اور کارناموں پر روشنی ڈال کر اپنی قابلیت و صلاحیت کا اعلیٰ مظاہرہ فرمایا۔ پروگرام کے اناؤنسرس شری ڈاکٹر دنیش رستوگی اور جناب ساحل سحری نے ہندی اور اردو کے کویوں اور شاعروں کو یکے بعد دیگرے اپنا کلام سنانے کے لیے نہایت خوبصورت انداز اور پرکشش الفاظ میں دعوت دی۔جن شعراء نے اپنا کلام سنایا ان میں حق کان پوری، رفیق بلگرامی، طاہر ظہری، وسیم بیتابی، شکیل سحر، شاد چلی بھیلتی، خالد جلال میرٹھی، رنگین حیدری مراد آباد، شکیل عارفی، ظفر جلیل سلفی، تابش مہدی، انور سلیم آگرہ، شفق طاہری، مختار طاہری، رونق منصور ترنم نشاط، رعنا زیبا، چاندنی سلیمی آگرہ، زاہد بیگ زاہد، ساحل سحری وغیرہ،

دیوں میں راج بہادر وکل، گرجانندن آکل، شوکمار شرما شوالشو، دنیش ستوگی، نریندر گرل، رام دین کمل، سوشیل ڈکشٹ وچتر، شیلیندر رانا وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ کنوینر جناب ایم۔ آئی خاں کی پرخلوص کوششوں کے باعث جلال آباد میں کل ہند کوی سمیلن اور مشاعرہ امسال بھی بے حد کامیاب رہا۔ آخر میں کنوینر نے شعراء اور سامعین نیز پروگرام کا ہر طرح سے تعاون کرنے والوں کا شکریہ ادا کیا۔

ooooo

انجمن ادب فرید آباد کی طرف سے دو افسانوی مجموعوں کا اجراء

۱۷/ دسمبر کو انجمن ادب فرید آباد نے ایک خصوصی تقریب میں ماروے سے تشریف لائے افسانہ نگار جناب ہرچرن چاولہ کے افسانوی مجموعے "گریباں جھوٹ بولتا ہے" اور مسٹر ہیرانند سوز کے افسانوی مجموعے "جنگل جنگل شہر" کے اجراء کا اہتمام کیا۔ "گریباں جھوٹ بولتا ہے" کی رسم اجراء جناب مار نگ ساقی کے دست مبارک سے انجام پائی اور "جنگل جنگل شہر" کی رونمائی صدر انجمن جناب واسدیو ساہنی طالب نے کی۔ حاجی انیس دہلوی مدیر فلمی ستارے بطور مہمان خصوصی محفل میں شریک ہوئے۔ اس کے بعد شعری نشست منعقد کی گئی جس میں جناب شہباز ندیم، جناب سیماب سلطان پوری جناب ماشاد اورنگ آبادی، جناب ساحر سرحدی، محترمہ نرگس خموش، ارشاد محمد خان شاد، آصف کمال، مہر بھنڈاری اور دیگر شعراء حضرات نے اپنے کلام سے سامعین کو نوازا۔

مرسلہ ہیرانند سوز

ooooo

ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی کی وفات پر شاہ جہاں پور میں تعزیتی جلسہ

۲/ جنوری ۹۶ء کو آزاد مانیٹری اسکول محلہ تارین تکلی شاہ جہاں پور میں زیر سرپرستی قاضی شہر عالی جناب سید مسعود حسن صاحب، زیر صدارت شاعر حضرت نسیم شاہ جہاں پوری و زیر نظامت جناب وسیم بینائی ملک کے نامور محقق، بے مثال ادیب و نقاد ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی کی ناگہانی وفات پر شہر کے شاعروں، ادیبوں، افسانہ نگاروں اور عمائدین وحکام کی موجودگی میں ایک جلسہ تعزیت کا انعقاد عمل میں آیا۔ جس میں تعزیتی وتوصیفی تقاریر ہوئیں مرحوم خواجہ احمد فاروقی کی انسانی صفات اور ادبی خدمات کا اعتراف کیا گیا۔ آخر میں مندرجہ ذیل شعراء وشاعرات نے مرحوم کو منظوم خراج عقیدت پیش کیا نسیم شاہ جہاں پوری، وسیم بینائی، جام نسیمی، محترمہ شبنم نگوہوی، محترمہ قمر جہاں انجم، محترمہ ترنم ضیاء، خضر شاہ جہاں پوری، محترمہ مہر النساء مہر نسیمی شاہجہاں پوری۔

مرسلہ مس شبنم
ہیڈ مسٹریس آزاد مانیٹر اسکول، شاہ جہاں پور

ooooo

اجین میں یوم اردو

انجمن اساتذہ اردو جامعات ہند کی تحریک پر مدھیہ پردیش اردو رائٹرس اسوسی ایشن اجین کی جانب سے 11/ نومبر 1995ء کو مولانا ابوالکلام آزاد کی یوم ولادت پر "یوم اردو" منایا گیا۔ جس کے تحت ضیاء منزل میں ایک شعری نشست اور جلسے کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت شہر میونسپل کارپوریشن کے "پارشد" اور آل انڈیا مشاعرہ کمیٹی کے صدر جناب وشنو یادو نے کی۔ اور مہمان خصوصی کے طور پر اجین میونسپل کارپوریشن کے سابق ڈپٹی میئر جناب پرکاش چوبے نے شرکت کی۔ پارشد اور اردو ٹیچرس سلیکشن بورڈ کے صدر جناب خلیل بیگ صاحب نے بھی خصوصی شرکت فرمائی۔

جلسے کے آغاز میں مہمان خصوصی اور صدر نے ابوالکلام آزاد اور اردو پر اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔ بعد ازاں پروفیسر واجد قریشی نے ابوالکلام آزاد کی علمی و ادبی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے شہر کی ادبی و علمی سرگرمیوں کا جائزہ لیا۔ احمد کمال پروازی نے مولانا کی ہمہ جہت شخصیت پر اظہار خیال کیا۔ صدر محترم نے مولانا کی قومی اتحاد کی کوششوں کو دوبارہ بروئے کار لانے کی ضرورت پر زور دیا۔ اس اجلاس نے اردو زبان کے فروغ اور تعلیمی مسائل کے سدباب کے لئے چند اہم قرار دادیں منظور کرتے ہوئے حکومت سے پرزور مطالبات کئے جن کا مقصد مدھیہ پردیش میں اردو کی ترویج، اسکولوں، کالجوں میں اردو تعلیم اور مدھیہ پردیش اردو اکاڈمی کی علمی و ادبی سرگرمیوں وانعامات کی تقسیم کے لئے منصفانہ لائحہ عمل مرتب کرنا ہے۔

جلسے کا دوسرا حصہ شعری نشست پر مشتمل تھا جس میں شہر کے معتبر اور مخصوص شعراء کرام مثلاً رشید امکان، احمد کمال پروازی، پروفیسر واجد قریشی

یہ احمد ضیاء، ندیم گویائی، آرزو اجینی، محمود حسن، رمیش سوز، حمید گوہر، اکر وارثی، زبیر بہادر جوش وغیرہ نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔ نظامت کے فرائض ضیاء احمد ضیاء نے انجام دیئے۔

مرسلہ احمد کمال پرواتری، اجین

ooooo

فراق گورکھپوری کی یاد میں سمینار اور مشاعرہ
بلراج کومل کو ایوارڈ
ڈاکٹر نارنگ اور ڈاکٹر صادق کی خصوصی شرکت

گزشتہ دنوں نئی دلی کے منڈی ہاؤس کے ایل۔ٹی۔جی آڈیٹوریم میں فراق گورکھپوری فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام فراق صدی تقریبات کے سلسلے کا پہلا سمینار منعقد کیا گیا۔ جس کی صدارت ساہتیہ اکیڈمی انعام یافتہ معروف نقاد، محقق اور ماہر لسانیات پروفیسر گوپی چند نارنگ نے کی اور نظامت کے فرائض ممتاز افسانہ نگار اقبال اثر نے انجام دیئے۔

دلی اردو اکیڈمی کے سکریٹری ڈاکٹر صادق نے اپنے مقالہ میں فراق کی گوناگوں خوبیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ فراق صاحب صرف ایک شاعر، ادیب، نقاد، مفکر اور شعلہ بیان خطیب ہی نہیں، بلکہ اردو کی آفاقی عظمتوں اور وسعتوں کی بہت ہی نمایاں علامت بھی تھے۔ انہوں نے ایک باشعور ادب و تہذیب جو انسانی علم و آگہی کا پتہ دیتی ہے کو زندہ کیا اور کاروان سخن کو نئی سمت و رفتار دی۔ انہیں ہمیشہ شاعری کے نئے افق کی تلاش رہی اور اس تلاش و جستجو میں جن راہوں سے کوئی نہ گزر سکا ان راہوں پر وہ اپنے انمٹ نقش پا چھوڑ گئے۔ وہ اردو زبان سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ انہوں نے اردو زبان و ادب کو خوب مالا مال کیا، ان کا ایک کارنامہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے اردو ادب کی تاریخ ہندی میں لکھی، جس کی ہندی دنیا میں بڑی پذیرائی ہوئی۔ موصوف نے فاؤنڈیشن کے اس کارنامہ کو تعمیری قدم قرار دیتے ہوئے اراکین فاؤنڈیشن کو مبارکباد دی اور اس سلسلے میں مزید پروگرام منعقد کرنے اور فراق صاحب کی مذکورہ بالا کتاب کو اردو میں منتقل کئے جانے کی سفارش کی۔ ممتاز ادیب اور افسانہ نگار کنور سین نے سیمینار کے انعقاد پر اظہار مسرت کرتے ہوئے فراق گورکھپوری اور اردو شاعری کے موضوع پر اپنا سیر حاصل مقالہ پڑھا اور فراق کو اس صدی کا سب سے اہم غزل گو قرار دیا۔ معروف و ممتاز طنز و مزاح نگار دلیپ سنگھ نے بڑے پر لطف انداز میں فراق صاحب سے اپنی قربت کے چند دلچسپ واقعات سنائے اور پروگرام کے انعقاد پر اراکین فاؤنڈیشن کو مبارکباد دی۔ صدر سمینار پروفیسر گوپی چند نارنگ نے فراق کی شاعری کے جمالیاتی پہلو پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ فراق کی شاعری بنیادی طور پر محبت کے رس کی شاعری ہے۔ جس میں جمالیات کا رنگ نمایاں ہے۔ انہوں نے تقریب کے انعقاد پر اظہار مسرت کرتے ہوئے فاؤنڈیشن کو اپنے ہر ممکن تعاون کا یقین دلایا۔ تقریب کے آخر میں مہمان خصوصی سابق مرکزی وزیر اطلاعات و نشریات ڈاکٹر گرجا ویاس نے تقریب کے انعقاد پر اظہار خوشی کرتے ہوئے اپنی عقیدت کا خراج پیش کیا اور اراکین فاؤنڈیشن کو ایسے سنجیدہ پروگرام کے اہتمام پر مبارکباد دیتے ہوئے اس سلسلے کو برقرار رکھنے کی اپیل کی اور فراق فاؤنڈیشن کی طرف سے پہلا فراق ایوارڈ برائے شاعری ممتاز و معتبر شاعر جناب بلراج کومل کو پیش کیا جس میں توصیفی سند اور شال کے علاوہ ایک انتہائی دیدہ زیب بڑا سا تمغہ شامل ہے۔ اس سمینار کے بعد ایک کل ہند مشاعرے کا انعقاد بھی عمل میں آیا جس کی صدارت سابق مرکزی وزیر ڈاکٹر گرجا ویاس نے اور نظامت کے فرائض اردو اکیڈمی دلی کے سکریٹری ڈاکٹر صادق نے انجام دیئے۔ اس مشاعرے میں ممتاز و معتبر شعراء نے اپنے کلام بلاغت نظام سے سامعین کو مسحور کردیا۔ آخر میں فاؤنڈیشن کے بانی آرگنائزنگ سکریٹری کاوش پرتاپگڈھی نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

مرسلہ ظفر انور، پریس سکریٹری

ooooo

آئندہ الیکشن عقل و شعور کا امتحان ہے
آل انڈیا ملی کونسل کا اہم سیاسی جلسہ

آل انڈیا ملی کونسل کی میٹنگ میں، جس میں کئی صوبوں کے نمائندے شریک ہوئے، ملک کی سیاسی صورتحال پر غور ہوا۔ اور ایک بیان اخبارات کے لئے جاری کیا گیا ہے جو درج ذیل ہے۔

آنے والا الیکشن آزاد ہندوستان کی تاریخ میں شاید سب سے زیادہ آزمائشوں سے بھرپور اور دوررس اثرات و نتائج پیدا کرنے والا ثابت ہو۔ اس سے زیادہ سخت امتحان آزاد ہندوستان کے شہریوں کا شاید کبھی اور نہیں ہوا ہوگا۔ خاص طور پر یہ مسلمانان ہند کے لئے اور زیادہ ہوش و خرد اور

عقل و شعور کے تحت امتحان کا مرحلہ ہے - جس پر ابھی سے سیاسی جماعتوں، طبع آزما لیڈروں اور مادی مفادات کے طلب گاروں کی چاروں طرف سے یلغار ہے بظاہر ایسا نظر آتا ہے کہ سب ان کے خیر خواہ اور سب اس ملک میں ان کو عزت و وقار کا مقام دلانے کے لئے بیتاب ہیں - لیکن ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ اس طرح نہایت ہوشیاری کے ساتھ مسلمانوں کی پراگندہ خیالی میں اضافہ کرنے اور ان کے ووٹوں کے وزن کو بے اثر بنانے کی درپردہ کوششیں کی جارہی ہیں - اس نازک مرحلہ میں ملی کونسل مسلمانوں کو خبردار کرنا ضروری سمجھ رہی ہے کہ وہ ہر طرح کے دام ہائے ہم رنگ زمین سے ہوشیار رہیں اور انہیں جو لوگ بھی نہایت خوبصورت اور پر کشش انداز سے منتشر اور کنفیوزڈ کرنے اور طرح طرح کے خانوں میں انہیں تقسیم کرکے ان کے سیاسی وزن کو ختم کرنے بریلوی، دیوبندی، شیعہ و سنی، مسالک و برادریوں کی بنیاد پر اور معاشی آسودگی اور رقمی منفعت کا لالچ دے کر خلفشار پیدا کرنے اور اس طرح ان کے اور ملک کے خطرناک دشمنوں کو فائدہ پہنچانے کے خواہاں ہیں - ان کے طلسم میں گرفتار نہ ہوں - صاف ظاہر ہے کہ اس وقت ہندوستانی سیاست کے خوفناک مجرموں کو ہندوستانی عوام کے عزم محکم کی وجہ سے اپنے دن گنے ہوئے محسوس ہو رہے ہیں اور وہ ملک کی شریانوں سے نچوڑے ہوئے خون اور بے اندازہ دولت کے بل پر لوگوں کے ضمیر اور ایمان کی کھلے عام خرید و فروخت میں مصروف ہیں - ان کی سیاسی چال یہ ہے کہ مسلمانوں کے ووٹوں کا اس قدر بٹوارہ کردیا جائے کہ وہ اس ملک میں ایک صاف ستھری حکومت کے قیام میں کوئی فیصلہ کن رول ادا نہ کرسکیں - اس موقعہ پر ملی کونسل چاہتی ہے کہ مسلمان اپنے ووٹوں کی قدر و قیمت کو پوری طرح محسوس کریں - انتشار کا شکار نہ ہوں اور جو لوگ ان کے اندر دراڑ پیدا کر رہے ہیں - ان سے باخبر اور ہوشیار رہیں - اس ملک میں جمہوری قدروں کی بقاء اس بات میں مضمر ہے کہ مسلمانوں کا ووٹ زیادہ سے زیادہ متحد طور پر استعمال ہو - وہ ہر طرح کی اشتعال انگیزیوں، نعرہ بازیوں اور جذبات سے کھیلنے والے تماشوں سے ہوشیار رہیں - الیکشن کا یہ مرحلہ جوش و اشتعال کے ساتھ فیصلے کرنے اور شور و ہنگامہ مچانے کا مرحلہ نہیں ہے ملی کونسل اس مرحلہ میں اپنی ذمہ داری سمجھتی ہے کہ ملت کو متحد، متوازن، باخبر اور ٹھوس و تعمیری انداز سے کام کرنے کی روش پر قائم رکھا جائے اور الیکشن کے ان مراحل میں انہیں حالات سے باخبر رکھا جائے - انشاء اللہ اس فریضہ کو ملت کے سنجیدہ مخلص اور ہوشمند افراد ادا کریں گے - ملی کونسل تمام ہی مسلمانوں، علماء، مجاہدین، دانشوروں اور ملت کے لئے فکرمند لوگوں سے اپیل کرتی ہے کہ وہ اس نازک موقعہ پر فراست ایمانی کا ثبوت دیں اور ہر طرح کی سازشوں کو ناکام بنادیں جو ملت کو بکھیرنے اور ملک کو برباد کرنے کے لئے کی جارہی ہیں -

محمد اسرار الحق قاسمی

اسسٹنٹ سکریٹری جنرل

161/32 Joyabai, Jamia Nagar,

Okla, New Delhi - 25 .

فاروق شفق انتقال کر گئے

کلکتہ کے معتبر شاعر فاروق شفق ۱۷ جنوری ۹۶ء کو تقریباً ۵۱ سال کی عمر میں انتقال کر گئے۔ ادارۂ انشاء ان کے پسماندگان سے اپنے گہرے دکھ کا اظہار کرتا ہے۔

ملکیت ماہنامہ "انشاء" سے متعلق ضروری تفصیلات بمطابق فارم نمبر ۴

۱ - مقام اشاعت ــــ کلکتہ
۲ - وقفہ ــــ ماہنامہ
۳ - پرنٹر، پبلشر، ایڈیٹر ــــ ف - س - اعجاز
۴ - قومیت ــــ ہندستانی
۵ - پتہ ــــ ۱۰ اے کنائی بیل اسٹریٹ، کلکتہ ۱۶

میں ف - س - اعجاز اعلان کرتا ہوں کہ درج بالا تفصیلات میرے علم و یقین کے مطابق درست ہیں -

دستخط ف - س - اعجاز

آپ کی ڈاک

قارئین کے خطوط

○ (مراسلہ نگار کی رائے سے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے)

○ ستمبر / اکتوبر ۱۹۹۵ء کا مشترکہ شمارہ ملا - ممنون ہوں کہ آپ برابر یاد رکھتے ہیں اس سے قبل کا شمارہ شاید مجھے نہیں ملا جس کے بارے میں محترم جناب مجروح سلطان پوری نے اپنے خط (ص ۳۹) میں اشارہ کیا ہے کہ اس کا ایک گوشہ میری کتاب "تلاش میر" کے بارے میں ہے یہ شمارہ تو مجھے ملنا چاہیے تھا۔

مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ انہوں نے میری کتاب کا نام بھی صحیح لکھا ہے پہلی طباعت کا سنہ بھی درست بتایا ہے مگر جن غلطیوں کی نشان دہی کی ہے ان کا میری کتاب میں دور دور تک پتا نہیں - کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ کسی اور کتاب پر تبصرہ کر رہے ہوں اور سہواً نام میرا قلم سے نکل گیا ہو - انہوں نے ایک جگہ کتاب کے ص ۲۳۴ کا، دوسری جگہ ۲۳۶ کا تیسری جگہ ص ۳۲۶ کا حوالہ دیا ہے جب کہ میری کتاب کے دوسرے ایڈیشن میں صرف ۲۰۴ صفحات ہیں مجروح صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ "اس پر ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ بھی مل چکا ہے" - خدا کرے (بہ نصیب دشمناں) یہ ایوارڈ کبھی مجھے نصیب ہو - مگر ان باتوں سے شبہ یہ ہوتا ہے کہ وہ "میر تقی میر حیات اور شاعری" از خواجہ احمد فاروقی کے کسی تازہ ایڈیشن پر تبصرہ کر رہے ہیں ، اس کتاب پر قاضی عبدالودود صاحب مفصل تبصرہ کر چکے ہیں جو ان کے مجموعہ مضامین "عیار ستان" میں شامل ہے -

نہایت افسوس کی بات یہ ہے کہ ۴ ۵ سال کی مسلسل علالت کے بعد پروفیسر خواجہ احمد فاروقی نے کل ۳۱/ دسمبر ۹۵ کی شام کو دہلی میں وفات پائی اور آج ہی علی گڑھ میں دفن ہوئے ہیں - رمیں کہاں گئی آسماں کیسے کیسے!

میں بھی آدم زادہ ہوں ، غلطیاں مجھ سے بھی ہو جاتی ہیں اپنی کوتاہیوں کا ہی جواب دینا مشکل ہے ، کم از کم دوسروں کی غلطیاں تو مجھ سے منسوب نہ کی جائیں -

نثار احمد فاروقی ، دہلی

(××××)

○ تین شماروں پر ایک ساتھ رائے حاضر ہے - شمارہ ۱۰ - ۹ میں گفتگی میں مغربی بنگال اردو اکیڈمی کا جو احوال آپ نے سامنے رکھا ہے پڑھ کر بہت افسوس ہوا - ایک بڑا ادارہ اگر اردو کے ساتھ اور اردو قارئین کے ساتھ ایسا سلوک کر سکتا ہے تو اندازہ کیجئے کہ اردو کا حال کیا ہوگا مگر جب تک انشاء جیسے رسالے اردو دنیا میں ہیں اردو انشاء اللہ پھلتی پھولتی رہے گی -

شمارہ ۱۱ میں "احترام کس کا اشوک سنگھل" ایک انقلابی آواز ہے معلوم نہیں پڑ رہا کہ بال ٹھاکرے جیسے لوگوں کا ذہن کیا چیز ہے اور یہ لوگ کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں - آپ نے لکھا ہے کہ "مصلحت بزدلی کا دوسرا نام ہے" کاش مسلمان دو ٹر اس بات کو ذہن میں اتارے اور غور کرے ہم کس دنیا میں کون سے پلڑے میں ہیں - آپ کی بات صحیح ہے کہ بڑے بڑے عہدوں پر غیر مسلم فائز ہیں اور وہی لوگ دیش کا استحصال کر رہے ہیں اور الزام مسلمانوں پر ہے کہ مسلمان دیش دروہی ہیں - اچھا مذاق ہے - آپ نے اسلام اور مسلمانوں کا جو مختصر سا نقشہ کھینچا ہے کوشش بہت اچھی ہے - میرا دعویٰ ہے کہ مسلمانوں پر الزام لگانے والے لوگوں کے پاس اگر دماغ ہے اور انسانیت ہے تو وہ چلو بھر پانی میں ڈوب جائیں گے مگر افسوس کہ الٹا چور کوتوال کو ڈانٹ رہا ہے - انشاء میں تمام مضامین خواہ وہ افسانے کہانیاں ہوں یا شعری تخلیقات یا تہذیبی و ثقافتی مضامین سبھی بہت خوب ہوتے ہیں - زیر نظر انشاء میں سبھی افسانے اچھے ہیں خاص کر "ماضی کی موت" - "قرب کا اکا" - "عمیق احساس کا سفر" بہت ہی پسند آئے -

منظومات میں ظفر گورکھپوری ، اقبال متین ، ساجدہ زیدی ، اختر صبائی ، یوگندر پال (شمارہ ۱۰ - ۹) اور مظفر حنفی ، ستارہ لطیف حاتم ، نجیب راحت ، اطہر نیر ، قاضی حسن رضا ، ساحل احمد ، بلبل کاشمیری ، نوشاد علی ، اعجاز تابش ، ملک زادہ جاوید (شمارہ ۱۱) خاص کر بہت پسند آئے -

اس وقت میرے سامنے "انشاء" جلد ۱۰ شمارہ ۱۲ ہے - خوبصورت اور دلچسپ گفتگی "خود کو مت گراسنا" بہت اچھا لگا - آپ کا نڈر پن اور اسے ہے باکی قابل تعریف ہیں - اداریہ ہمیشہ دل کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتا ہے - آئینہ دکھانے کے لئے شکریہ -

مظہر امام صاحب کا مضمون "نگار خانوں کی یادیں" اچھا نہیں لگا سمجھ میں نہیں آرہا کہ اس مضمون کا مقصد کیا ہے اور یہ کس چیز کی تخلیق ہے؟ افسانے "لی ریتوں" (ساجدہ عندلیب رحمان) اور "گناہ" (شمشاد ندیم) زیادہ متاثر نہ کر سکے لیکن "سوالات" پسند آیا - "گلزار پکھراج کی چاندنی میں" پسند آیا -

منظور چند سومی ، بارہ مولہ ، کشمیر

○ میں آپ کا احسان مند ہوں کہ آپ میرے مکتوبات باقاعدگی سے شائع کر رہے ہیں - اس سے میری بہت حوصلہ افزائی ہوتی ہے - اور مجھے اور لکھنے کی تحریک ملتی ہے - نومبر کا اداریہ "احترام کس کا اشوک سنگھل ؟" میں نے نہایت غور سے پڑھا - اس طرح کی تقریریں اور نعرے میں بھی اکثر سنتا ہوں اور اخباروں میں بھی پڑھتا ہوں - اور مجھے ان سے سخت ذہنی کوفت ہوتی ہے - ہر محب وطن اور سوچنے والے ہندوستانی کے لئے یہ باعث فکر و تشویش ہے ہم سب کو ایسی ذہنیت کے خلاف جدو جہد کرنی چاہیے - اگر ہم ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہے تو آنے والی نسلیں ہمیں کبھی معاف نہیں کریں گی - اور اس ملک کا کیا ہو گا اللہ ہی بہتر جانتا ہے -

رام پرکاش کپور ، درگ

ooooo

○ میں پرچے پر تاثرات ضرور لکھتا مگر میں نے فرصت اور خالی نظروں سے ورق گردانی کی - ستارہ لطیف خانم اور بلبل کاشمیری ، بخش لائلپوری کے نام دیکھ کر خوشی ہوئی - خبروں کا سلسلہ دلچسپ ہے - ادبی خبروں کا دامن تھوڑی سی اور وسعت چاہتا ہے میرا خیال ہے ادیب اور شاعر اداکاروں سے زیادہ اہم ہوتے ہیں - ان کے سے سکنڈل تو نہیں کارکردگی و تخلیقی سرگرمیوں پر مشتمل آگاہی پھیلانا ضروری ہے - ابھی ابھی دوبارہ ورق الٹتے ہوئے صفحہ ۳۹ پر اپنے نام پر نظر پڑ گئی - شری شرون کمار ورما کا خط پڑھا مجھ سے بڑی فاش غلطی اور جاہلانہ سہو ہو گیا - افسانے میں تصحیح کر رہا ہوں - آسکر وائلڈ کی بجائے لارنس کا نام کیوں لکھ دیا - غائب دماغی کا نتیجہ ہو گا - ورما صاحب سے کہنے میں مرعوب ہو گیا - مجھے معاف کر دیں - جس کتاب کا پہلا ایڈیشن وہ 1897ء میں شائع ہونے کا کہہ رہے ہیں - اس کی پابندی اٹھنے کے بعد جو ایڈیشن چھپا وہ دیکھا تھا یا اب حال ہی میں اس پر Ken Russll کی فلم دیکھی -

مقصود الٰہی شیخ ، براڈفورڈ ، برطانیہ

ooooo

○ "انشاء" کا تازہ شمارہ ملا - شکریہ - آپ کی دونوں غزلیں پڑھ کر محظوظ ہوا - آپ کے فن نے اور ساتھ میں "انشاء" نے جو ترقی کی ہے بے شک قابل داد ہے - انشاء نے دنیا کے اہم ادبی اردو رسائل میں نمایاں مقام حاصل کر لیا ہے -

اس پرچے میں دو فلمی شخصیتوں کو بھرپور اجاگر کیا گیا ہے قیصر عثمانی اور گلزار - ان کی کتابوں کے حوالے سے آپ نے بھرپور صفحات چھاپے ہیں - شاید یہ بات پرچہ کی فروخت بڑھانے میں معاون ثابت ہوتی ہو - مظہر امام جو بہت منتخب موضوعات پر اپنا تنقیدی قلم اٹھاتے ہیں ، انہوں نے قیصر عثمانی پر خاصا لکھا ہے - ادھر ۱۵/ دسمبر کو پروفیسر گوپی چند اور مجھے ساہتیہ اکاڈمی کے ۹۵ء کے ایوارڈ کا اعلان ہوا ہے - مجھے اردو ترجمے کے لئے ایوارڈ دیا گیا ہے اور نارنگ کو ان کی کتاب "ساختیات اور پس ساختیات" پر اس کی متوازن خبر "ہماری زبان" کے یکم جنوری کے شمارے میں شائع ہوئی ہے ، آپ چاہیں تو وہ خبر تازہ شمارے میں شامل کر لیں -

رفعت سروش ، نوئیڈا

oo آپ کو ساہتیہ اکاڈمی کی جانب سے ترجمے کا ایوارڈ ملنے پر مبارکباد ! میری بدنصیبی کہ میں اس خبر سے محروم رہا -

ف - س - اعجاز

ooooo

○ "گفتنی" میں آپ نے مسلم لیڈر شپ کی ذہنی پس ماندگی کو طنز کا نشتر نہیں دل کا زخم بنا کر پیش کیا ہے لیکن یہ زخم کتنے سینوں میں ہرے ہو سکتے ہیں - مسلم قیادت مسلمان کو پیچھے چھوڑ کر اتنا آگے جا چکی ہے کہ اسی کے اٹھائے ہوئے گرد و غبار میں اس کو اپنے ہی چہرے کی شناخت نہیں رہی ہے -

کیول سوری نے گلزار پر کیا اچھا مضمون لکھا ہے - وہ گلزار کے شعر میں لفظیات کے آہنگ کا جس گیرائی سے محاکمہ کرتے ہیں وہ گلزار کی شاعری کے حسن کو نکھارنے کا جواز فراہم کرتی ہے اور لطف دوبالا ہو جاتا ہے - میرا پیار ان تک پہنچا دیجئے - میں نے ان کا پتہ نوٹ کر لیا ہے -

مظہر امام کا مضمون نگارخانوں کی یادیں بھی ہم جیسے لوگوں کے لیے جو نگارخانوں سے قطعی واقف نہیں ہیں انکشافات کے ایسے نرم گوشے سامنے لاتا اور یادوں کے ایسے کومل دریچے کھولتا ہے کہ قیصر عثمانی کے ساتھ ساتھ ہم ان سے دوبارہ ملتے ہیں جنہیں صرف پردے پر دیکھتے رہے -

پروفیسر حبیب ضیا کی جدہ میں پذیرائی پڑھ کر خوشی ہوئی کیوں کہ وہ ہر طرح اس کی مستحق ہیں - مجھے ان سے پیار حاصل ہے اور آپ کو یہ جان کر خوشی ہو گی کہ انشاء کے خاص نمبر وہ بڑی قدر و منزلت سے رکھتی ہیں - میں نے "ادیبوں کی حیات معاشقہ" اور "اسکنڈے نیویائی ادب نمبر" انہیں پہنچایا تو وہ بہت مسرور ہوئیں -

اقبال متین ، نظام آباد (اے - پی)

○ **انشاء** کا تازہ شمارہ (دسمبر ۹۵ء) ملا۔ اداریہ میں آپ کا انتباہ دیکھ کر ایک گونہ خوشی ہوئی۔ آپ نے ٹھیک وقت پر بات اٹھائی ہے خصوصی مضمون کی حیثیت سے مظہر امام صاحب کا قیصر عثمانی کی کتاب "یادوں کے سائے" پر تبصرہ بہت ہی سطحی قسم کا ہے۔ آپ نے شاید صرف ایک بڑے نام کے چکر میں اسے شائع کردیا۔ ایسا لگتا ہے کہ اب مظہر صاحب کے پاس لکھنے یا کہنے کو کچھ رہ نہیں گیا ہے اس لئے کبھی حامدی کاشمیری کو اکتشافی تنقید کا موجد بناکر حق دوستی نبھاتے ہیں تو کبھی قیصر عثمانی کی کتاب پر تبصرے کے ضمن میں اپنے سستے ذوق کا پتہ بھی دے جاتے ہیں۔ ایسے مضامین کی اشاعت سے سنجیدہ ادب سے تعلق رکھنے والا رسالہ مجروح ہوتا ہے اس لئے پرہیز لازم ہے۔ شمارے میں سب سے کامیاب مشمولہ گلزار کے شعری مجموعہ "چاند پکھراج کا" پر کیول سوری کا خوبصورت تبصرہ ہے۔ کچھ افسانے بھی اچھے ہیں مگر زبان و بیان کا نقص کہیں کہیں بدمزگی پیدا کردیتا ہے۔

قیصر اقبال، مونگیر

ooooo

○ **بڑی** پابندی سے انشاء میرے مطالعہ میں ہے یہ رسالہ واقعی معیار، سیٹ اپ گیٹ اپ اور مواد کے اعتبار سے اردو کے دیگر رسائل کے مقابلہ میں فوقیت کا حامل ہے ظاہری اعتبار سے قسمر صفحات میں کمپیوٹر کمپوزنگ نے زیادہ سے زیادہ مواد کا احاطہ کرلیا ہے۔ یہ رسالہ اس لئے بھی بین الاقوامی حیثیت اختیار کرگیا ہے کہ اسے دنیا بھر کے مشہور ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کا قلمی تعاون حاصل ہے۔

میرے پیش نظر اس وقت نومبر ۹۵ء کا شمارہ ہے جس کا اداریہ ہمیشہ کی طرح بیباک اور اپنے دینی تحفظات کا ترجمان ہے۔ مختصر افسانوں میں ترپ کا اکا (عابد سہیل) عمیق احساس کا سفر (سلیم ہمراز) دو مرا نام سہیل آفتاب پسند آئے۔ "الجھنوں کو یوں بھی سلجھاتے ہیں ہم" اس مراحیہ میں ملک کے معروف ادیب دیپ سنگھ اپنی پوری انفرادیت کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔

منظومات میں ڈاکٹر مظفر حنفی، جمیل نظام آبادی، اطہر پیر، تشنہ لاہلپوری کا کلام خاص طور سے پسند آیا۔ امید ہے کہ آئندہ بھی بہترین اور نادرہ کلام سے نوازیں گے۔ بی۔ کے ملک ملا کا گیا سوزوطن سپرد ہوئی تھی خاصہ تحقیقی اور معلوماتی مضمون ہے۔

عبدالرحیم ارمان، جالنہ

○ **انشاء** کا تازہ شمارہ (دسمبر) ملا۔ یہ شمارہ بھی بہت خوب ہے۔ آپ کا حسن انتخاب اور حسن ترتیب لاجواب ہے۔

جمیل نظام آبادی، ایڈیٹر گونج، نظام آباد

ooooo

○ **انشاء** کا دسمبر 1995ء کا شمارہ ملا۔ پہلے کی طرح آپ نے اسے بھی ہر لحاظ سے خوبصورت اور دلچسپ بنانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی سبھی افسانے، مضامین، نظمیں اور غزلیں خوب ہیں۔ ساجدہ عندلیب رحمان کا افسانہ "بی زیتون" بہت اچھا ہے۔ یہ ان کا دوسرا افسانہ ہے جو میری نظر سے گزرا ہے۔ وہ بہت اچھا لکھتی ہیں اور اس افسانے میں انہوں نے موضوع کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا ہے۔ زبان بھی وہی استعمال کی ہے جس کی اس افسانے میں ضرورت تھی۔ اگر وہ برا نہ مانیں تو مجھے ایک بات کھٹکی ہے ممکن ہے اس میں میرا قصور ہو کہ میں نے ان کے زیادہ افسانے نہیں پڑھے۔ جو دو افسانے پڑھے ہیں ان میں موضوع کچھ مشترک سا لگتا ہے۔ زمانہ بہت تیزی سے بدل رہا ہے اگر وہ نئے نئے موضوعات پر قلم اٹھائیں تو ان کے افسانوں کا حسن اور بھی نکھر آئے گا۔

شمشاد ندیم کے افسانے "گناہ" کی اٹھان بڑی اچھی تھی لیکن لگتا ہے آخر پر ان کی افسانے پر گرفت نہیں رہی اور انہوں نے جلدی سے آنٹی نارا سے ایک رنگین ٹی۔ وی خرید کروا کے افسانہ ختم کردیا۔ آج کے دور میں یہ تو کوئی گناہ نہیں چاہے وہ آنٹی نازا ہی کیوں نہ کرے!

مظہر امام کا مضمون "نگارخانوں کی یادیں، یادوں کے نگارخانے" اچھا ہے۔ حال ہی میں اسی قسم کا شریف قادر کا لکھا ہوا مضمون "راوی" ۔ بریڈفورڈ میں بھی پڑھ چکا ہوں جو نرگس، مدھوبالا، دلیپ اور راجکپور کے گرد گھومتا ہے۔

ایک چیز جو کم از کم مجھے انشاء جیسے معیاری ادبی پرچے میں اچھی نہیں لگتی وہ اس شمارے میں حامد علی خاں کا مضمون ہے ممکن ہے بعض قارئین ایسے مضامین چٹخارے لے لے کر پڑھتے ہوں۔ آپ کہتے ہیں کہ آپ نے اس مضمون کے کچھ حصے حذف کردیئے ہیں، کیا ہی اچھا ہوتا اگر سارا مضمون ہی حذف کردیتے۔ اگر کسی نے گندے پوتڑے دھونے ہیں تو خدارا انشاء جیسے مہذب پرچے کو تو استعمال نہ کریں۔ اگر کوئی لفظ غلط لکھا گیا ہو تو معذرت چاہوں گا۔

احمد سعید انور، بریڈفورڈ، برطانیہ

○ دسمبر کا انشاء ملا - سبحان اللہ آپ کا اداریہ - سبحان اللہ سبحان اللہ ! "خودی کو مت گرا اتنا" مسلمان کانگریسی لیڈروں کو ضرور پڑھنا چاہیے اور عبرت حاصل کرنا چاہیے - آپ نے ان نام نہاد اور ضمیر فروش مسلمان کانگریسی لیڈروں کے بارے میں کس قدر حقائق پر مبنی یہ سطریں تحریر فرمائی ہیں - "مسلمان کانگریسی لیڈر سہمے ہوئے ہیں کہ اب کے الکشن میں ان کا اور ان کی پارٹی کا کیا ہوگا - نہ وہ گھر کے رہیں گے نہ گھاٹ کے - اس لئے پارٹی کے ماضی کے اعمال پر ندامت ظاہر کرنے کے لئے ملت کے رفیق بنے شہر شہر جگھے لگائے پھر رہے ہیں - دراصل ان دنوں وہ بیچارے خود لائق ہمدردی ہیں - ان کا حال یہ ہے کہ بقول میر

پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھا نہیں

آپ کے جاندار اور بیباک اداریوں پر مجھے تو بخدا محترم بزرگ صحافی قبلہ احمد سعید ملیح آبادی صاحب ایڈیٹر روزنامہ "آزاد ہند" کلکتہ کے اداریوں کا گمان ہوتا ہے - نوجوان صحافیوں میں خاص طور پر کلکتہ میں آپ کا نام نامی سرفہرست ہے - انشاء کے ذریعہ آپ کی ادبی و صحافتی خدمات بین الاقوامی سطح پر ناقابل فراموش ہیں - آپ کی دو غزلیں بھی شمارہ کی جان ہیں آپ کا شعر آپ ہی کی نذر کر رہا ہوں -

تیرتا ہے مری آنکھوں میں یہ چہرہ کس کا
ہے کوئی چاند رواں جھیل کی موجوں میں ابھی

محترم مظہر امام صاحب کی شخصیت نہایت جامع اور وسیع ہے - تازہ شمارہ میں موصوف کا مضمون نگارخانوں کی یادیں ، یادوں کے نگارخانے " نہایت معلوماتی ، دلچسپ اور قابل تعریف ہے خان نثار غازی پوری صاحب میرے کرم فرماؤں میں سے ہیں - موصوف کی ہزل کو آپ نے غزل کا عنوان دیا ہے یہ عنوان بھی ہزل کے لئے ہزلیہ ہے - خان صاحب کے ہزلیہ اشعار بے حد جاندار اور لائق تحسین ہیں دیگر مضامین ، افسانے ، غزلیں اور نظمیں بھی معیاری اور دلکش ہیں - محترم رئیس الدین فریدی صاحب ، پرویز شہریار صاحب ، ناصر شہنواز شبلی صاحب ، ڈاکٹر خالدہ حسینی صاحبہ کے تبصرے بھی بہت پسند ئے - یہ جان کر دلی مسرت ہوئی کہ محترم ڈاکٹر قمر رئیس صاحب کے "نیا سفر ارہ کی جانب سے ابھرتے ہوئے نوجوان ادیب و شاعر ڈاکٹر شہیر رسول ساحب کو جوش ملیح آبادی ایوارڈ (چار ہزار روپیہ نقد ، ایک شال اور توصیفی سند) سے نوازا گیا - اس خصوصی ایوارڈ کے حصول پر میں جناب ڈاکٹر شہیر رسول کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں ساتھ ہی یہ مصرع بھی

کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

نہ صرف میرے غائبانہ مخلص و کرم فرما جناب جمشید مسرور کے لئے بلکہ ساری اردو برادری کے لئے بھی یہ ایک بہت بڑا اعزاز ہے کہ جمشید مسرور صاحب کی ادبی نگارشات کو نارویجین کالموں کے لئے احباب میں شامل کیا جا چکا ہے - نگارشات کے اس مجموعہ کا نام KOLON ہے - آپ نے انشاء کے "شاہکار" اسکنڈے نیویائی ادب نمبر " میں جمشید مسرور صاحب کی شاعری ، افسانوں ، تراجم اور دیگر تحریروں کے لئے ایک الگ گوشہ قائم فرما کر صحافتی دیانتداری اور اعلیٰ ظرفی کا ثبوت دیا ہے - آپ کی جانب سے اور انشاء کی جانب سے عطا کردہ یہ اعزاز بھی جمشید مسرور صاحب کو بہت بہت مبارک ہو -

نسیم شاہجہاں پوری ، شاہجہاں پور



مشرقی ہندوستان کا بہترین اور واحد بین الاقوامی اردو رسالہ

ماہنامہ انشاء کلکتہ

ISSN . 0971 - 6009

شمارہ ۵	مئی ۱۹۹۶ء	جلد ۱۱

فہرست

انشاء پبلیکیشنز

مدیر ف۔ س۔ اعجاز

فی شمارہ ۸ روپے

زرسالانہ ۹۰ روپے

مغربی ممالک سے £ 12.
or
US $ 20

رقومات بذریعہ منی آرڈر، بینک ڈرافٹ، چیک صرف "انشاء پبلی کیشنز" کے نام میں روانہ فرمائیں ورنہ قابل قبول نہ ہوں گی۔ برطانیہ سے BPO کے ذریعہ رقومات بھیجی جائیں۔

ماہنامہ انشاء۔ انشاء پبلی کیشنز

خط و کتابت، مضامین بھیجنے اور ترسیل زر کا پتہ

۲۵۔ بی زکریا اسٹریٹ، کلکتہ ۷۰۰۰۷۳۔ فون ۲۵_۴۶۱۶



کس بات کی جلدی ہے؟

زندگی قیمتی ہے۔ ایسی شۓ نہیں ہے جسے اتنے بڑے خطروں کے حوالے کر دیا جاۓ۔ کھلے لیول کراسنگ پار کرتے ہوۓ ہمیشہ ہوشیار رہیں۔ تھوڑی سی عقل اور ذمہ داری سے اپنی زندگی بچ سکتی ہے۔ اس لۓ خطروں سے نہ کھیلیں اور اپنی زندگی کے لۓ جلد بازی میں کوئی فیصلہ نہ کریں۔

ساؤتھ ایسٹرن ریلوے

ہوشیار رہیں۔ ہمیشہ حادثات سے بچیں۔

کیا ادب مر رہا ہے؟

ادبی کتابیں جس تعداد میں تیس برس پہلے چھاپی جاتی تھیں اب نہیں چھپتیں۔ پہلے کسی کتاب کا ۱۱۰۰ کا ایڈیشن شائع ہوتا تھا تو اب ۵۰۰ کا نکالنا مشکل ہے۔ آبادی اور اضافہ کی بنا پر اگر ادب کی مانگ دیگر اشیاء کی مانگ کی طرح زمانے کے ساتھ بڑھتی تو معاملہ اس کے برعکس ہوتا۔ زیادہ تعداد میں چھپنے کے سبب کتاب کی لاگت میں جو کمی واقع ہوتی ہے اس سے مصنف اور خریدار دونوں کو فائدہ ہونا چاہئے لیکن صورت حال یہ کہ تعداد اشاعت میں روز بہ روز کمی آتی جارہی ہے جس سے مصنف اور خریدار دونوں گھاٹے میں ہیں۔ کمرشیل پبلشر یا کتب فروش تو بہرحال ناک پکڑ کر لانا پونچھ پکڑ کر نکالنا کے مصداق اپنا دھندا کرلیتے ہیں۔ اردو مصنفوں کو ان کی ہر نئی کتاب شائع ہونے کی خوشی تو ہوتی ہے لیکن عموماً اس سے انہیں مالی فائدہ نہیں ہوتا۔ اردو میں ایک ایک سونے کا جملہ بھی مٹی کے بھاؤ فروخت ہوتا ہے۔ اس لئے ۹۵ فی صد اردو مصنف اپنی ناقدری کا رونا روتے ہیں۔ پھر بھی نجی تسکین کی خاطر یا کسی شعوری ذمہ داری کے تحت بار بار کتابیں چھاپنے کا جرم ان سے سرزد ہوتا رہتا ہے۔ اس کے لئے ان کی ہمت کی داد دینا چاہئے۔

انہیں اپنا وجود برقرار رکھنا مشکل نظر آتا ہے۔ خاص ادبی رسائل کا حاصل بھی ابتر ہے۔ ان کا حال بوڑھی طوائفوں جیسا ہوتا جارہا ہے جنہیں کوئی منہ لگانا پسند نہیں کرتا۔ جی چاہتا ہے دس سال تک ادبی کتب و رسائل کے اشاعت روک دی جائے۔ ایک کتاب ایک رسالہ نہ چھپے تاکہ ادب برائے زندگی کی معنویت روشن ہوجائے اور لوگوں کا مرجھایا ہوا شوق پھر سے تازہ دم ہوجائے۔

یہ سوال کہ کیا ادب دم توڑ رہا ہے انتہائی سنجیدہ سوال ہے۔ آج یہ اکیلے اردو ادب کا سوال نہیں ہے بلکہ اشاعتی پیمانے پر ہر ادب انحطاط اور زوال کے صدمے سے دوچار ہے۔ البتہ اردو کی دال زیادہ پتلی ہے۔ دیگر زبانوں کا حال اب بھی خطرے کے نشان سے نیچے ہے۔ ۲۴ گھنٹے چلنے والا ٹیلی میڈیا لوگوں کی زیادہ سے زیادہ توجہ اور وقت چھین لینے میں کامیاب ہوگیا ہے۔ حالاں کہ وہ ناظرین کی بینائی اور دماغ کو کمزور کرتا جارہا ہے۔ اس سے صحت مند لٹریچر کی جڑیں کھوکھلی ہونے لگیں ہیں۔ آدمی مطالعے کی مشقت سے بچ کر بہت ساری خوبیاں کھو بیٹھا ہے۔ اسے اب سوجھ بوجھ عطا کرنے والا ہدایت نامہ بھی پڑھنے کی فرصت اور ضرورت نہیں ہے۔ نبیؐ کے لئے ارشاد الٰہی تھا کہ "پڑھو" لیکن "اقراء" کا علاقہ اب ہم سے چھوٹتا جارہا ہے۔ خارجی چکاچوند باطنی کشش کو مدھم اور بے اثر کرتی جارہی ہے۔ طالب علموں کو تحصیل علم پر مائل کرنے والے اساتذہ اب کم ملتے ہیں۔ گھروں میں علمی ماحول اب کتنا رہ گیا ہے۔ "ذکر" اور "فکر" میں دلچسپی کم لی جاتی ہے۔ بہرحال کتابیں اور رسالے نکالے جارہے ہیں۔ کیا نیک جرم کررہے ہیں لوگ!۔

یہ سچ ہے کہ ادب سکڑ رہا ہے لیکن اگر ذکر اردو ادب تک محدود رکھا جائے تو کیا اب سے تیس برس بعد کتاب کا ایڈیشن ۲۰۰ کی تعداد میں شائع ہوا کرے گا اور اس کے کاپی رائٹ صفحہ پر یہ آگاہی بھی شامل کی جانے لگے گی کہ یہ کتاب زندگی بچانے کی دوا ہے، کسی رجسٹرڈ ڈاکٹر کے نسخے کے بغیر دستیاب نہیں ہوسکتی۔ اسے محفوظ رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ ریفریجریٹر میں ۵ ڈگری سینٹی گریڈ درجہ حرارت پر رکھا جائے؟

اپنی نوعیت کی پہلی اردو کتاب

خوابوں کے اسرار

انگریزی سے ترجمہ کردہ نفسیاتی مصامین

مترجم : ف۔ س۔ اعجاز

آپ کس الجھن میں ہیں ؟

اپنے خوابوں سے ڈر جاتے ہیں ؟ اپنے خوابوں کو پڑھنا چاہتے ہیں ؟ خواب کیوں ہوتے ہیں ؟ آپ کی زندگی کا خواب اور نیند سے کیا تعلق ہے ؟ خواب کے بارے میں قدیم اور جدید فلاسفروں کے کیا نظریات ہیں ؟ خوابوں کا نفسیاتی اور سائنسی تجزیہ کرنا چاہتے ہیں ؟ خوابوں سے ہمارے تمدن کا کیا رشتہ ہے ؟

آپ ماہر ایلوپیتھ، ہومیوپیتھ یا کچھ بھی ہوں لیکن اپنے مریض کی ذہنی اور موروثی کیفیت کو سمجھنے میں دشواری محسوس کر رہے ہیں جبکہ مریض نیند اور خواب کے نا قابل فہم مسائل کی بھول بھلیوں میں گم ہے۔

آپ ادب کے ماہر نباض یا نقاد ہیں اور خواب سے متعلق شعری و افسانوی ادب کا از سر نو مطالعہ کر کے کسی نئے نتیجے پر پہنچنا چاہتے ہیں۔ خواب کے علامات و رموز، تشبیہات و کابوس کے اسرار سے آپ واقف ہو سکتے ہیں۔

[illegible] یہ کتاب خرید لیجئے۔ آپ کی کلینک یا لائبریری میں اس کا ہونا اشد ضروری ہے۔

اشاعت جون ۱۹۹۶ء میں

ضخامت تقریباً ۲۰۰ صفحات

قیمت ۱۵۰ روپئے / اندرون ملک /

US $ 10 / £ 7 / بیرون ملک /

Insha Publications
25-B, Zakaria Street, Calcutta-700073
Ph: 25-4616

بمبئی سے ایک مہربان ظفر علی ایچ شیرازی کے ۲ خطوط

Flat No 18, Sunbeam, 2nd Floor,
3-A, Pedder Road, Bombay - 400026

(۱)

17th October 1995

مکرمی اعجاز صاحب

امید ہے مزاج گرامی خیریت سے ہوں گے۔

آج آپ کا ۱۲/ اکتوبر کا پوسٹ کارڈ ملا۔ آپ نے جس خط کا ذکر کیا ہے وہ آج تک ملا نہیں ہے۔

آپ جو بھی چاہیں روانہ کر سکتے ہیں۔ ملنے پر آپ کو یقینی طور پر رقم مل جائے گی۔

آپ کا زکریہ اسٹریٹ کا پتہ دیکھ کر کلکتہ کی بہت سے پرانی یادیں تازہ ہو گئیں۔

آج سے ۴۰ سال پہلے میں زکریا اسٹریٹ ہی میں ملازمت کرتا تھا۔ اور وہیں رہتا تھا۔ شاید آج بھی نوابلڈنگ موجود ہو جس میں کریم جی علی بھائی اینڈ کمپنی کی آفس اور رہائش تھی۔ یہ لوگ پوری بلڈنگ کے مالک تھے۔ کلکتہ میں ہر سنیچر کو چائے کا نیلا ہوتا ہے۔ وہاں سے Tea Chests خرید کر خضر پور ڈاک (Dock) سے امریکہ، انگلینڈ اور دوسرے ممالک کو چائے ایکسپورٹ کرتا تھا۔ زکریا اسٹریٹ سے نکل کر چورنگی جاتے ہوئے گول کوٹھی میں امام باڑہ تھا وہاں محرم میں وعظ میں جاتا تھا۔ عاشورہ کے روز یہاں سے علم نکال کر کربلا لے جاتے تھے جہاں زنجیروں سے ماتم ہوتا تھا۔

ایک سال بعد ملازمت چھوڑ کر ہمیشہ کے لئے بمبئی آگیا۔ یہاں اچھی ملازمت مل گئی۔ بعد میں کئی بار کلکتہ آنا ہوا۔ لیکن اب رٹمز یا گرانڈ ہوٹل میں ٹھہرتا تھا۔ کبھی جگہ نہ ملنے پر پارک ہوٹل یا ہندوستان انٹرنیشنل میں بھی قیام رہا۔

ادبی رسالوں کا ہمیشہ خریدار رہا ہوں۔ "آج کل" کا اس وقت سے خریدار ہوں جب وقار عظیم کی ادارت میں نکلتا تھا۔ اس کے بعد جوش ملسیانی، جوش ملیح آبادی بھی مدیر رہے۔

اس وقت شبخون، شاعر، ہماری زبان، کتاب نما ایوان اردو اور نیا دور کا خریدار ہوں۔ نیا دور پابندی سے نہیں ملتا۔ یہی حال شاعر کا ہے۔ شاعر نے جب قومی یکجہتی نمبر نکالا تھا تو مرحوم اعجاز صدیقی گھر پر تشریف لائے تھے اور میرے دستخط لے گئے تھے جس کا عکس اس نمبر میں شائع ہوا تھا۔ سنگور سے سوغات بھی منگواتا تھا۔ بند ہو گیا تھا اب محمود ایاز نے پھر شروع کیا ہے۔

میری مادری زبان گجراتی ہے اور آج بھی ہم لوگ گھر میں گجراتی بولتے ہیں۔ لیکن بچپن ہی سے اردو اسکول میں داخلہ لیا تھا اس لئے اسی زبان سے زیادہ لگاؤ رہا۔

میرے استاد سید محفوظ علی لکھنؤ کے تھے اور عربی، اردو اور فارسی میں ادیب کامل، منشی فاضل اور مولوی کامل تھے۔ رسالوں کا ان کو بھی

بہت شوق تھا۔

لاہور کے نیرنگ خیال، قندیل، لکھنؤ کے نیرنگ نظر، نگار، کراچی کے ادب لطیف، ماہ نو وغیرہ پڑھنے کو دیتے تھے۔ یہ سب رسالے میری میراث ہو گئے۔ سورت میں اپنی خود ایک چھوٹی لائبریری بنا رکھی تھی۔ جب بمبئی آنا ہوا تو یہ سب ایک پترے کی ٹرنک میں پیک کر کے رکھ دیئے تھے۔ گھر میں چوری ہوئی تو چور یہ سمجھ کر کہ ٹرنک بھاری ہے اور چاندی پیتل کے برتن ہوں گے لے گئے۔ آج تک اس کا افسوس ہے کہ یہ قیمتی سرمایہ میرے ہاتھ سے نکل گیا۔

اب صرف نقوش اور سویرا کے شمارے رہ گئے ہیں۔ تحریک کا بھی آخر وقت تک خریدار رہا۔ جب تحریک بند ہو گیا تو مخمور سعیدی کا خط آیا کہ وہ خود نیا رسالہ شگوفہ یا غنچہ نکال رہے ہیں۔ فوراً قیمت روانہ کر دی۔ صرف دو شمارے نکلے اور رسالہ بند ہو گیا۔

جب اعجاز صدیقی مرحوم آئے تھے تو انہوں نے کچھ رسالوں کے پتے دیئے۔ کامٹی سے "جواز" - دربھنگہ سے "نئی کرن" - آہنگ - شہر کا نام یاد نہیں۔ ان سب کو منی آرڈر سے رقم روانہ کی تھی۔ رسیدیں مل گئیں لیکن کسی ایک شمارے کی صورت تک نہ دیکھی۔ یہی شاید ایک وجہ ہے کہ بہت سے ادبی رسالے اپنی موت مر گئے۔ آج بھی دنیا میں ایسے لوگ زندہ ہیں کہ اگر دیانت داری سے کام لیا جائے تو دامے درمے سخنے قدمے مدد کرنے کو تیار ہیں۔ ورنہ پھر

یہی معیار دیانت ہے تو کل کا تاجر
برف کے باٹ لئے دھوپ میں بیٹھا ہوگا

خط طویل ہو گیا۔ سمع خراشی کے لئے معذرت خواہ ہوں اور کوئی خدمت ہو تو یاد فرمائیں۔

خلوص آگیں

ظفر علی شیرازی

اب ریٹائر ہو گیا ہوں اس لئے زیادہ وقت پڑھنے میں جاتا ہے۔ رب العزت سے دعا گو ہوں کہ وہ انشاء کو عمر خضر عطا فرمائے اور ساتھ ساتھ آپ کو بھی۔ آمین

*****

(۲)

6th November 1995

مکرمی اعجاز صاحب

امید ہے مزاج گرامی خیریت سے ہوں گے۔

آپ کا ۲۶/اکتوبر کا محبت نامہ ملا۔ یاد آوری کے لئے مشکور ہوں۔ دو پارسل بھی مل گئے ہیں۔

ایک ہزار روپئے کا ڈرافٹ ماہنامہ کی طرف سے ملفوف ہے۔

آپ نے میری زندگی کے بارے میں لکھا ہے کہ بہت متحرک رہی ہے۔ شاید یہ چیز ہمیں بزرگوں کے ورثہ میں ملی ہیں۔

میرے دادا کے دادا سیدی صادق علی صاحب شاعر تھے۔ شاعری کی زبان گجراتی لیکن رسم الخط اردو عربی ہوا کرتا تھا۔ آپ کا مزار بیگم پور،

سورت میں ہے اور دنیا کے قریب بارہ لاکھ بوہرے آپ کی زیارت سے مشرف ہونے کے لئے سورت جاتے ہیں۔ آپ کی نصیحت کی ۴ جلدیں ہیں۔
آج جیسے اپنے یہاں برساتی شاعروں کی کمی نہیں اسی طرح اس زمانے میں اور آج بھی برساتی مولوی اور ملاؤں کی کمی نہیں ہے۔ آپ نے فرمایا

چھے پیر نص و گرنا گویا بتو برابر
مت تو نماؤ سر نے پتھر نا دیوتا پر
جھوتی کرامتوں پر ناداں مت لبھاجے
بازیگر و چلے چھے ایک پاؤں تھی رسا پر

اسی خیال کو ہمارے کسی اردو شاعر نے اس طرح ادا کیا ہے۔

شعبدہ گر بھی پہنتے ہیں خطیبوں کا لباس
بولتا جہل ہے ، بدنام خرد ہوتی ہے

آپ کے زمانے میں بھی کچھ شرپسندوں نے آپ کی شاعری پر اعتراضات کیے تھے۔ اور کہتے تھے کہ بکواس کی ہے۔ لیکن آپ نے ہر وقت کتابوں اور قرآن شریف کی آیتوں سے اپنے قول کی سچائی ثابت کی۔

قبرو ما جیوتا چھے وہ باری نا اولیا
دے چھے جواب اونے کہ جہ کوئی ندا کرے

اس شعر پر کافی اعتراضات ہوئے کہ قبر کا مردہ کیسے بول سکتا ہے یا جواب دے سکتا ہے۔ اولیا سے مراد اللہ والے اور اللہ کی راہ میں قربان ہونے والے۔ آپ نے قرآن کریم کی تیسری سورۃ۔ آل عمران۔ آیت نمبر ۱۶۹ پیش کی۔ **ولا تحسبن الذین قتلوا فی سبیل اللہ امواتاً ربھم یرزقون۔**
صادق علی صاحب کا سلسلہ نسب کئی پشتوں سے سید نا حجتہ اللہ الموئید فی الدین شیرازی سے جاملتا ہے۔ موئید شیرازی ایران کے شہر شیراز میں ۴۰۰ھ میں پیدا ہوئے۔ عربی زبان پر آپ کو بہت عبور تھا۔ اسی طرح تقریر بھی بہت موثر انداز میں کرتے تھے۔ آپ نے ۸۰۰ مجلسیں پڑھیں جو مجالس موئیدہ کے نام سے مشہور ہیں۔ آپ کی وفات کے بعد علماء نے ان کو دو حصوں میں تقسیم کر کے "جامع الحقائق" کے نام سے شائع کیا۔ کہتے ہیں جب مولانا شبلی نعمانی نے سیرۃ النبی لکھی تو اس سے افادہ کیا تھا۔
شیراز کا حاکم دہریہ تھا۔ اس لئے اس نے موئید شیرازی کو قتل کرنے کی بہت کوشش کی۔ موئید شیرازی موقع پاکر اور بھیس بدل کر حاکم کے دربار میں حاضر ہوئے اور اس کو قرآن کے رموز، اسلام کے اصول اور سیرۃ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے آگاہ کیا۔ بادشاہ بہت خوش ہوا اور ان کا مرید بن گیا۔ تب شیرازی نے اپنا لبادہ اتار کر اصلیت ظاہری کر دی۔ لیکن جب بادشاہ کے حواریوں کو خبر ہوئی تو وہ موئید شیرازی کے قتل پر آمادہ ہوگئے۔
آپ کے مداح بھی بہت تھے۔ انہوں نے آپ کو شیراز چھوڑنے کی صلاح دی۔ اس لئے آپ بھیس بدل کر راتوں رات شیراز سے پیدل ہی روانہ ہوئے۔ کئی ماہ کی سفر کی تکلیفیں برداشت کر کے قاہرہ مصر پہنچے۔ یہاں امام مستنصر باللہ کے دربار میں حاضر ہوئے۔
اسی زمانے میں ابو العلا معری ایک دانشور قاہرہ میں رہتا تھا۔ خود گوشت نہیں کھاتا تھا اور اس نے ایک رسالہ لکھا تھا جو بہت مشہور ہوا۔ "رسالتہ الغفران"۔ اس نے بہت سے مسلمانوں کو قائل کر لیا تھا کہ گوشت کھانا حرام ہے۔ اسے چڑانے کے لئے ایک دوست نے بھونا ہوا تیتر بھیجا تھا۔
جب امام کو یہ خبر ہوئی تو آپ نے موئید شیرازی کو بلا کر کہا کہ آپ کے قلم اور زبان میں طاقت ہے اس لئے معری کے فتوے کی تردید کی جائے

بلکہ اگر مسلمان معری کی بات مان گئے تو حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسمٰعیلؑ کی جو قربانی کی تھی وہ مکروہ ہوجائے گی اور رضائے الہیٰ کی نفی ہوگی۔ اس لئے موئید شیرازی نے بہت ہی عالمانہ اور موثر مضامین لکھے جو اس وقت قاہرہ کے روزنامہ "النہار" میں چھپے۔ اس کے علاوہ آپ نے دن کے لکڑ پر کھڑے ہوکر تقاریر کیں۔ اس طرح آپ نے گوشت خوری کو حرام قرار دینے کے موضوع پر جو تاریخی مناظرہ کیا تھا اس میں ابوالعلا معری شکست فاش ہوئی اور آپ کے علمی فضل و کمال کا آخر معری نے اعتراف کرلیا۔ ہم نے اپنی Surname اسی لئے شیرازی رکھی ہے۔ موئید شیرازی ۴۷۰ھ میں اپنے خالق حقیقی سے جاملے اور امام کے ہاتھوں آپ کی قاہرہ میں تجہیز و تکفین ہوئی۔ علامہ اقبال نے بھی بال جبرئیل میں کہا ہے۔

کہتے ہیں کبھی گوشت نہ کھاتا تھا معریؒ
پھل پھول پہ کرتا تھا ہمیشہ گزر اوقات
ایک دوست نے بھونا ہوا تیتر اسے بھیجا
شاید کہ وہ شاطر اسی ترکیب سے ہو مات

میری سب سے بڑی بہن قاہرہ میں تھی اور بہنوئی الازہر یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر تھے۔ بانی پاکستان محمد علی جناح کے خاص دوست تھے آپ قاہرہ کیسے پہنچے۔ یہ سب کبھی بعد میں لکھوں گا۔ خط کی طوالت کے لئے معافی چاہتا ہوں۔

باقی خیریت۔

نیاز آگیں

ظفر علی شیرازی

بقیہ:۔ سلمان رشدی ......

لیے ہم کو یہ طویل فہرست بارہ مسالوں کی چاٹ کی طرح برداشت کرنا پڑتی ہے۔ مگر جس بات پر بال ٹھاکرے، شیوسینا اور ملک کے فرقہ پرست اداروں کے لوگ رشدی کی جان کے درپے ہوسکتے ہیں وہ بمبئی کی "مافیا" اور دادا لوگوں کے ذکر کے ساتھ بابری مسجد کے انہدام کے حوالے ہیں۔ یہ حوالے سرراہے ہونے کے باوجود ایسے بھرپور ہیں کہ خود کانگریس پارٹی کے ایک مخصوص حلقے کے باوا لوگ بھی ایک ہی حمام میں نظر آنے لگتے ہیں۔

ہمارے ذہن میں ناول پڑھنے کے بعد دو سوال ابھرے۔ دنیا کے مسلمانوں کو برافروختہ کرنے کے بعد اب ہندوستان کے جمہوری و سیکولر فسطائی دونوں طرح کے عناصر کا سہ چڑاکر رشدی حاصل کیا کرنا چاہتا ہے؟ فی الحال اس کے سامنے کوئی مقصد نہیں بلکہ محض شرارت انگیزی ہے جسے کوئی فاترالعقل چھوکرہ سڑکوں پر نشانہ لگاکر بجلی کے بلب توڑنے میں مزہ لے۔

دوسرا اہم سوال یہ ہے کہ آلو ٹک، بھاجی، مسالے، سانپ، رسوائی اور بہار شیوں کی چالوں میں مزہ لینے والے مغربی احباب (خاص طور پر ادیب کی آزادی کے انتہاپسند مبلغ) کب تک اس دیوالی باندی یا بارہ مسالوں کی چاٹ سے نہ اوبیں گے؟

اگر رشدی اپنی صلاحیت کو واقعی ادب وفن کے لیے استعمال کرسکے تو یہ ایک بہتر کام ہوگا۔ فی الحال تو ناول پڑھنے والوں کو یہ شکایت کرنا چاہیے کہ سرورق پر حکم حفظان صحت کا انتباہ نہیں ہے کہ "زیادہ مسالے آپ کی صحت کو برباد کرسکتے ہیں"۔

کارنیوال

مرزا حامد بیگ
گورنمنٹ کالج۔ ایٹک (پاکستان)

اب وہ شہر کی بھیڑ بھاڑ سے باہر نکل آیا تھا اور اپنے آپ کو خاصا ہلکا پھلکا اور آزاد محسوس کر رہا تھا۔ دفتر سے گھر تک کے راستے میں تانگوں، ٹیکسیوں اور رکشاؤں کی بے ترتیب قطاروں کے شور میں پیدل چلنے والوں اور دو طرفہ دکانوں پر مول تول کرنے والوں کی ہماہمی پیچھے رہ گئی تھی اور وہ اپنے دائیں کندھے پر ذرا سا دباؤ ڈالے، تیز تیز قدم اٹھاتا بس چلا جا رہا تھا۔

آبادی سے دور، کھلے میں نکل جانے والی، ہموار پختہ سڑک پر اسے صرف اپنے اٹھتے ہوئے قدموں کی آہٹ سنائی دے رہی تھی۔ سامنے دور تک کوئی نہیں تھا اور سڑک کے دونوں جانب سائے گہرے ہوتے چلے جا رہے تھے۔

وہ اپنی دھن میں تھا اور ابھی کچھ دیر پہلے اس نے ایک مانوس سی لے میں گنگنانے کی کوشش بھی کی تھی، لیکن پھر جلد ہی بے زار ہو کر اپنے ہی قدموں کی چاپ کو سننے میں محو ہو گیا تھا۔

اس کا انہماک اس وقت ٹوٹا، جب ایک اڑن کھٹولہ سی کار اس کے قریب سے ہو کر، ہموار سڑک پر تیرتی ہوئی آگے نکل گئی۔ اس وقت سامنے کھلے میں زردی کھنڈی ہوئی تھی۔ وہ ٹھٹھک سا گیا۔

وہ سوچ رہا تھا، کیا ہی اچھا ہوتا جو وہ ہاتھ اٹھا کر اس اڑن کھٹولے کو رکنے کا اشارہ کر دیتا۔ کیا پتا، روک ہی لیتا۔ سب ایک سے تو نہیں ہوتے، پانچوں انگلیاں کب برابر ہوئی ہیں۔ پھر یکایک اسے خیال آیا کہ اس نے بھی تو دیکھا ہوگا، پھر کیوں نہیں رکا۔ لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے، اس نے سوچا ہو راہگیر نے ہاتھ ہی نہیں اٹھایا، تو کیا رکنا۔ سو تیرتا ہوا نکل گیا۔

اس نے انسانی مقدر کے بارے میں سوچا، اور یہ کہ سیدھی، ہموار سڑک ختم ہونے میں نہیں آتی تھی اور وہ چلا جا رہا تھا۔ وہ اس بات پر حیران تھا کہ اتنے بھرے پرے شہر میں سے کسی نے کارنیوال کا رخ ہی نہیں کیا۔ لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ الجھتا چلا گیا۔

وہ جب آبادی سے نکلا تھا تو اسی سڑک پر تانگے، ٹیکسیوں کی بھیڑ کی بھیڑ تھی، جو اس طرف رواں تھی۔ تب اس نے سوچا تھا کہ ابھی بہت وقت ہے، شام کے سائے ذرا گہرے ہو جائیں تو کارنیوال میں پہنچنے کا مزا آئے گا، سو وہ پیدل ہی نکل آیا۔

پر اب تک تو اسے وہاں تک پہنچ جانا چاہیے تھا۔ اس نے یہ سب سوچا تھا اور سامنے نگاہ کی تھی، جہاں سیدھی، ہموار سڑک کے دونوں اطراف میں چھتری ہی درختوں کی دو رویہ قطاریں گہری تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ وہ اپنے قدموں کی چاپ سنتا اور تیز تیز قدم اٹھاتا اب خاصا فکر مند دکھائی دے رہا تھا، اور مسافت تھی کہ کسی طور ختم ہونے میں نہیں آتی تھی۔

آخر ماجرا کیا ہے۔ کوئی اور راستہ تو ادھر کو نہیں جاتا۔ جہاں شک کی کونپل پھوٹی، لیکن وہ اسی شہر میں پلا بڑھا تھا اور اسے تمام راستوں کی خوب پہچان تھی۔ یہی نہیں، بلکہ وہ تو تانگوں اور ٹیکسیوں کی بھیڑ کی بھیڑ کو اسی رخ پر آتے دیکھ کر چلا تھا۔ پھر آخر ہوا کیا؟ اسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اس نے پلٹ کر نگاہ کی۔ کوئی بھی تو نہیں تھا۔ بس درختوں کی دو رویہ خاموش قطاریں تھیں، جو گہری تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھیں اور وہ اپنے

ہی قدموں کی چاپ سن رہا تھا۔

اب آگے بڑھنے کا وہ جوش و خروش نہیں رہ گیا تھا، جو اسے یہاں تک لے آیا تھا۔ اپنی دانست میں وہ کارنیوال تک کا سفر طے کر آیا تھا، لیکن سڑک تھی کہ کپڑے کے لپٹے ہوئے تھان کی مانند اس کے سامنے کھلتی ہی چلی جارہی تھی۔

کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ کسی زیر تعمیر سڑک پر نکل آیا ہو۔ لیکن یہ ایک مضحکہ خیز خیال تھا، پر اس دنیا کے میلے میں یہ انسانی تماشا کچھ کم مضحکہ خیز ہے، اس نے سوچا ۔

یہ دنیا کا میلہ بھی عجیب ہے، یوں لگتا ہے جیسے کوئی نہ ختم ہونے والا متحرک تصویری فیتہ مسلسل حرکت میں ہے۔ یا شاید، یہ سب ہونے اور نہ ہونے کا سلسلہ کٹا پھٹا اور ساکت ہے اور یہ جینے کا جتن کرنے والے محض اس تصویری فیتے کے ٹکڑے جوڑنے میں جٹے ہوئے ہیں۔ جوڑتے چلے جارہے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ تصویری فیتہ حرکت میں ہے۔

وہ کوئی فیصلہ نہ کرپایا۔ اب اسے یہ فکر مارے ڈال رہی تھی کہ وہ چل بھی رہا ہے یا نہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ درختوں کی یہ بظاہر ساکت قطاریں خاموشی سے شہر کی جانب رواں ہوں اور وہ ویران راستے کے بیچ ساکت کھڑا ہو۔ اس نے گھبرا کو اوپر نگاہ کی۔

آسمان کا طشت روشن ستاروں سے پٹا پڑا تھا۔

ان لامتناہی وسعتوں میں یہ ستاروں کی مارات بھی خوب ہے۔ اس ے حیال کیا

ماضی میں ہزاروں سال پہلے جو ستارے جل بجھ کر نیست و نابود ہو چکے، وہ انہیں اپنی نظروں میں سمیٹ نہیں پارہا تھا۔ اب ان حالوں، اس کے لئے واپسی کا سفر ناممکن ہو گیا تھا اور وہ گہری فکر میں غلطاں خاصے تھکے تھکے قدم اٹھا رہا تھا۔

پھر یکایک اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کے قدموں کی چاپ میں نہایت آہستگی کے ساتھ کسی اور راہگیر کے قدموں کی آواز بھی شامل ہو گئی ہے۔

یہ کون ہو سکتا ہے؟

اس تاریکی میں ڈوبی ہوئی سنسان سڑک پر یہ خیال اسے کیا آیا، سنسنی کی ایک سرد لہر اس کی ہڈیوں کے گودے تک اتر گئی۔

اب اس نے اپنے آپ کو کوسنا شروع کر دیا تھا۔

کاش وہ ادھر کا رخ ہی نہ کرتا۔ معمول کی زندگی کیسی ہموار تھی۔ چار بجے دفتر سے نکل کر ساجھے کے تانگے میں دیگر سواریوں کے ساتھ گپ شپ کرتا، محض چند منٹوں میں وہ اپنی گلی والی نکڑ پر اتر جایا کرتا تھا، گھڑی دو گھڑی میں گھر کے سودا سلف کا بندوبست، اور ہر طرح کا اطمینان۔ جیتے جاگتے لوگوں کی ہماہمی اور بازار کا ہنگامہ۔ اسے یہ سب شدت سے یاد آرہا تھا اور اس کے نہایت بے دلی سے اٹھتے ہوئے قدم، نامحسوس طور پر جیسے ٹھہرتے چلے جارہے تھے۔

دوسرے قدموں کی چاپ، اب اس کے بہت قریب پہنچ گئی تھی۔ وہ رک کر چوکنا ہو گیا۔ پھر اس نے سامنے ساکت تاریکی میں تحرک محسوس کیا۔

وہ، کوئی راہگیر ہی تھا، اور اپنی ذات میں مست تھا۔ اس نے اس کی طرف دیکھا تک نہیں۔ یہ رکا رہا اور وہ مزے مزے سے جھومتا جھامتا گزرتا چلا گیا۔ ایسے میں اس نے اطمینان کا سانس لیا تھا، اور چل پڑا تھا لیکن چند ہی قدم چل کر اب اس راہگیر کا ڈولتا سنبھلتا وجود ٹھہر گیا تھا اور اس نے راہنمائی چاہی تھی

"بھائی صاحب۔ شہر کو یہی راستہ جاتا ہے نا؟ ادھر کارنیوال میں ہنگامہ بہت ہے"۔

"جی، جی ہاں۔ یہ راستہ۔ سیدھے چلتے جائیے"۔

اب اس بات کی تصدیق ہو گئی تھی کہ راستہ کارنیوال کو ہی جاتا ہے۔

کارنیوال میں ہنگامہ بہت ہے تو یہ یہاں کرنے کیا آیا تھا؟

ایک نئے فرحت کے ساتھ، اس نے تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے سوچا۔

وہ شام بھی عجیب تھی اور وہ شخص بھی، جو کارنیوال میں آیا اور ہنگامے سے بھاگتا تھا۔

یہ راستہ کارنیوال کو جاتا ہے؟

وہ ایک بار پھر شک و شبہ کا شکار ہو چلا تھا۔ پر اس نے تانگوں اور ٹیکسیوں کی بھیڑ کی بھیڑ کو اسی رخ پر آتے ہوئے بھی دیکھا تھا۔ پھر سب کے سب ٹھہر گئے کہاں؟ حیرت ہے۔ ان ہی تفکرات میں ڈوبا، وہ تیز تیز چلا جا رہا تھا۔

اس اپنے آپ میں مست راہگیر نے، جہاں اسے اٹھا کر رکھ دیا تھا، وہیں اسے آگے بڑھنے کا حوصلہ بھی دیا تھا، اور وہ سوچ رہا تھا کہ چلو اچھا ہوا وہ لبرٹی جانب لوٹ نہیں گیا۔ وہاں بھی کیا ہو گا۔

گلی کی نکڑ پر ہمیشہ کا اونگھتا ہوا گھڑی ساز اپنی دکان پر ابھی جاگ رہا ہو گا، اور جھکا ہوا ہو گا گئے زمانوں پر۔ یا شاید دکان بڑھا چکا ہو اور گھری چلند سو بھی چکا ہو اور ایک تسلسل میں اس کی کربہ الصوت چنگھاڑ۔ جب وہ ساٹھ منٹ گزر جانے کا اعلان کرتا ہے۔ اب تک تو انتظار کرتے کرتے چھوٹا منو بھی سو چکا ہو گا۔

اسے اپنے گھر کا خیال آیا۔

چلو اچھا ہی ہوا، لیکن اگر وہ ساتھ بھی ہوتا تو اس اکتا دینے والے سفر میں سو ہی جاتا۔

حد نگاہ تک درختوں کی دو رویہ قطاریں گہری تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھیں، اور وہ ان ہی خیالوں میں غلطاں، چلتا گیا۔ حتیٰ کہ تاریکی میں ٹھہری ہوئی تاریکی سے جا ٹکرایا۔

"آؤ بھئی۔ کتنی دیر سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں، کہاں رہ گئے تھے؟ کارنیوال تک جاؤ گے کیا؟"

یہ وہی اڑن کھٹولہ کار والا تھا۔ اس نے اسے پہچان لیا۔

"جی۔ جانا تو تھا"۔

"تو آیئے، چلتے ہیں۔ ایک سے دو اچھے۔ دراصل راستہ بہت خطرناک ہے اور یہ درختوں کی قطاریں، جھنڈ کا جھنڈ ہے، ختم ہونے میں نہیں آتا

اچک کر اسٹیئرنگ سنبھالتے ہوئے اس نے بات جاری رکھی

"یہ یکایک کار کی ہیڈ لائٹس کو جانے کیا ہو گیا۔ تم تو جانتے ہی ہو، میلوں ٹھیلوں کا سفر اکیلے آدمی کا کام نہیں۔ سنگی ساتھیوں کے ساتھ آنا چاہیے"۔

جواب میں وہ کچھ نہیں بولا، بس اپنی سیٹ میں اندر ہی اندر دھنستا چلا گیا۔

وہ اڑن کھٹولہ، اس ہموار سڑک پر ایک آدھ بار ہی جھٹکے کے ساتھ اوپر تلے ہوا ہو گا، کہ اس کی ادھ کھلی آنکھیں یکایک تیز روشنیوں سے خیرہ ہو گئیں۔ لاؤڈ اسپیکر کی آوازیں آپس میں گتھی ہوئی تھیں، کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ ٹھہرے ہوئے تانگوں اور ٹیکسیوں کی قطاروں میں ہنسی ٹھٹھا کرتے لوگوں کی بھیڑ تھی، جس میں وہ دونوں بھی اتر گئے۔

حد نظر تک ڈھول سی میں اٹے ہوئے لوگوں کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر تھا، کندھوں پر جھکتے ہوئے اور انگلی تھامے، ضد کرتے ہوئے بچے اس ہنگامے میں اپنے آپ کو کھوئے ہوئے تھے۔

الٰہی یہ ماجرا کیا ہے۔ یہ لوگ یہاں تک کس راستے سے پہنچے۔

اس نے اپنے ساتھی، اڑن کھٹولہ کار والے سے پوچھنا چاہا۔ لیکن وہ خود اپنی جگہ حیران دکھائی دے رہا تھا اور اس نے اپنے کندھے سے کندھا جوڑے ایک دیہاتی نوجوان سے پوچھ بھی لیا تھا

"بھائی صاحب۔ کوئی اور راستہ بھی ہے، اس طرف آنے کا؟"

جواب میں اس نوجوان نے حیران ہو کر ان دونوں کی جانب نظر بھر کر دیکھا تھا اور سامنے کے اٹھتے گرتے انسانی سروں کے سمندر میں غوطہ لگا گیا تھا اور عین وہی لمحہ تھا جب یہ دونوں اس بڑے ہجوم میں تنکے کی مانند ڈولتے اوپر کو اٹھی ہوئی لکڑی کی سیڑھیوں سے جا ٹکراتے تھے۔ ان سیڑھیوں سے اوپر کو نکل جانے والے انسانی ریلے کا رخ موت کے کنوئیں کی منڈیر تک تھا۔ کنوئیں کے تختے لرز رہے تھے اور اس کے اندر دائرہ در دائرہ چنگھاڑتی ہوئی موت کی ایک تھپک جاری تھی۔

اس کے ساتھی نے اس کے کان میں چلا کر کچھ کہا، اور اس کا بازو تھامے ایک طرف نکل گیا۔ پھر اس اٹھتے گرتے ہجوم کے کہیں درمیان میں ہی، ڈولتے ہوئے تختے کی بنچ پر دونوں پھسکڑا مار کر بیٹھ گئے۔

"اے لڑکے!"

اڑن کھٹولہ کار والے نے دکاندار کی توجہ چاہی۔

"دو بوتلیں۔ ذرا ٹھنڈی ہوں"۔

پلک جھپکتے میں ایک مدقوق سا سولہ سترہ برس کا لڑکا ان کے سامنے بوتلیں رکھ کر یہ جا وہ جا۔ ابھی اس نے بوتل سے مونہہ نہیں لگایا تھا کہ اس کے ساتھی نے ارادہ بدل دیا

"کیوں نہ چائے پی جائے؟"

"جیسے تمہاری مرضی"۔ اس نے جواب میں کہا۔

"اے لڑکے۔ یہ بوتلیں اٹھالو۔ ہمیں چائے دے دو"۔

دکاندار نے خشمگیں نظروں سے دونوں کو تاکا، اور ہاتھ کے اشارے سے اس مدقوق سے لڑکے کو ادھر متوجہ کر دیا۔

اب ان کے سامنے گرم چائے کی دو پیالیاں دھری تھیں۔

"ٹکٹ کھل گئے۔ قدرت کا کرشمہ دیکھو، عورت ذات گلنار بیگم کا آدھا دھڑ لومڑی کا دیکھو۔ ٹکٹ کھل گئے جی"۔

دونوں کی نظریں بیک وقت ایک چھوٹی سی چھولداری کی جانب اٹھ گئیں، جہاں سے لاؤڈ اسپیکر پر ٹکٹ جاری ہو جانے کی اطلاع دی جا رہی تھی۔

"کیا خیال ہے، دیکھیں؟"

اڑن کھٹولہ کار والے نے ایک ہی سانس میں چائے کی پیالی ختم کرتے ہوئے مشورہ چاہا۔

"ہو گا کیا؟ سب نظروں کا دھوکا ہے، پر تم کہتے ہو تو چلو"۔

دونوں اٹھ کھڑے ہوئے اور آواز کے رخ پر چل پڑے۔

"اے باؤجی۔ چائے کے پیسے کون دے گا؟" اس مدقوق سے لڑکے نے لپک کر دونوں کے کندھوں کو تھپتھپایا۔

وہ کچھ بھی نہ سمجھتے ہوئے ابھی ٹھٹک کر رکا ہی تھا کہ اڑن کھٹولے والے نے ایک جھٹکے کے ساتھ اس لڑکے کو پیچھے کی طرف دھکیل دیا۔

"کون سے پیسے؟"

"باؤجی، چائے کے۔ اور کون سے۔" لڑکا منمنایا۔

"ارے بیوقوف، چائے تو ہم نے بوتلوں کے بدلے منگوائی تھی"۔

"لیکن باجی۔ پھر بوتلوں کے پیسے؟"

"ارے پاگل۔ گھبراتے کیوں نہیں۔ کیا بوتلیں واپس نہیں کر دی تھیں؟"

اسے اپنے ساتھی کی منطق سمجھ میں نہیں آئی۔ دوکاندار او پر تھڑے پر بیٹھے بیٹھے کب تک سر کھپاتا، آخر چپ ہو رہا۔ دونوں وہاں سے نکل آئے ابھوتے ہوتے رہ گیا تھا۔

اڑن کھٹولہ کار والے نے اس کے کان میں چیخ کر کہا

"میلہ ٹھیلہ ہے"۔

دور کوئی کہہ رہا تھا

"پاگل ہیں سالے، جانے کہاں سے آٹپکے ہیں"۔

کون پاگل ہیں؟

جانے کے کھوکھے کے گرد اگرد، لوگوں کے نئے ٹھٹ کے ٹھٹ نے اپنے اپنے طور پر سوچا۔

"ٹکٹ کھل گئے جی۔ آدھا دھڑ لومڑی کا دیکھو"۔

بظاہر وہ دونوں آواز کے رخ پر کشاں کشاں چلے جا رہے تھے، لیکن وہ صلح جو قسم کا آدمی تھا اور سدا کا بھلا مانس۔ وہ کسی اور الجھیڑے میں نہیں پھنسنا چاہتا تھا۔ اس گرد و غبار کے طوفان میں اور بے محابہ ہجوم میں اس نے اپنا سانس گھٹتا ہوا محسوس کیا اور لوگوں کے ایک بڑے ریلے میں سے گزرتے ہوئے وہ اپنا بازو چھڑا کر ایک طرف سٹک گیا۔ اس کے ساتھی، اڑن کھٹولہ کار والے نے لازماً اسے آوازیں بھی دی ہوں گی لیکن شور بہت تھا اور اب اس کا رخ باہر کی جانب تھا۔

یکایک اسے یوں محسوس ہوا جیسے کار نیوال کا ہنگامہ بڑھتے بڑھتے ہر طرف بھر گیا ہے۔

یہ دنیا کا میلہ بھی عجب ہے۔ اس نے سوچا اور اوپر نگاہ کی۔

آسمان کی لامتناہی وسعتوں میں ہزاروں سال فاصلے کے جل بجھے ستاروں کی بارات چڑھی آتی تھی۔

بڑے پنڈال کے باہر تختوں پر گراموفون کی آواز سے آواز ملاتے اور فحش حرکات کرتے خواجہ سرا اس کی توجہ کو ملتفت نہ کر سکے۔ اس نے آسام کے بکرے، آسٹریلیا کے بندر اور مختصر سے پنجرے میں بند زندگی کی سانسیں گنتے ہوئے ببر شیر کو بچپن میں دیکھا ہوا تھا۔ سٹہ بازی سے اسے کوئی رغبت نہیں تھی۔ توبہ توبہ وہ کہاں آگیا ہے۔ اس کا دل اوبھ گیا۔

ورائٹی پروگرام والوں کا شور کارا اسے پکارتا رہ گیا اور میجک شو شروع ہونے سے پہلے ناچنے والی لڑکیوں کے تھرکتے ہوئے اجسام اسے آوازیں دیتے رہ گئے

کارنیوال کے احاطے سے باہر نکلنے سے پہلے جب اس نے ایک نظر پیچھے مڑ کر دیکھا تھا تو اس وقت جہاں بہادر سرکس کے اونچے شامیانے کے چاروں اطراف میں سے لوگ تنی ہوئی قناتیں اٹھا اٹھا کر بغیر ٹکٹ اندر گھس رہے تھے اور اس ہڑبونگ میں بڑے اور بچے سب شامل تھے۔ کندھوں پر روشنیوں کی جانب ہمکتے ہوئے بچوں کو تھامے ہوئے بڑے اور انگلیوں کو چھوڑ کر قناتیں الٹتے ہوئے بچے۔

"قدرت کا کرشمہ دیکھو۔ عورت ذات گلنار بیگم کا آدھا دھڑ لومڑی کا دیکھو"۔

ٹکٹ دوبارہ کھل گئے تھے۔ لیکن اس نے سب آوازوں کو سنا ان سنا کر دیا اور اس ہنگام سے دور نکل آیا۔

سب نظروں کا دھوکہ ہے۔ وہ بڑبڑایا۔

جانے کیسے، وہ نشتم پشتم ایک تیار تانگے تک چل کر آگیا تھا۔ اور جانے کب تانگہ اسی ہموار سڑک پر شہر کی جانب چل نکلا تھا۔ وہ ہنسی ٹھٹھا

کرتی دیگر سواریوں سے خائف، دم سادھے خاموش بیٹھا رہا تھا۔

شہر پہنچ کر جب وہ اسٹینڈ پر اترا ہے تو تانگوں اور ٹیکسیوں کی ویسی ہی بھیڑ کی بھیڑ تھی جو کارنیوال کی طرف جانے کو تیار کھڑی تھی۔

وہ اپنے گھر کو جانے والی سڑک پر مڑا تو جیسے اس کی جان میں جان آئی۔ کتنا پر سکون تھا یہ علاقہ۔ گلی کی نکڑ پر گھڑی ساز کی دکان ابھی تک روشن تھی۔ بوڑھا گھڑی ساز اسے آج تک سخت ناپسند رہا تھا اور اسے آج گھر پہنچتے دیر بھی بہت ہو گئی تھی، لیکن پھر بھی وہ دکان کے سامنے جاکر ٹھہر گیا۔ بوڑھ گھڑی ساز بیتے زمانوں پر جھکا ہوا تھا، لیکن اس سے بے خبر بھی نہیں تھا۔ اس نے فوراً نظر کر دیکھا۔

"چاچا۔ کام میں برکت ہو۔ آپ ابھی تک جاگ رہے ہیں"۔

"بسم اللہ۔ آج بڑی دیر سے واپسی ہوئی۔ میں بس آپ ہی کے آنے کا منتظر تھا۔ بابو جی، خیر تو ہے؟"

"بس چاچا۔ ذرا کارنیوال کی طرف نکل گیا تھا۔ لیکن ادھر ہنگامہ بہت ہے"۔

"بابو جی۔ کارنیوال ہے، ہنگامہ تو ہوگا۔ اپنے ساتھ منو کو لے جاتے"۔

"ہاں، واقعی"۔

اس نے جواب میں کہا اور تیزی سے گھر کی جانب مڑتے ہوئے سوچا

یہ سب جانتا ہے، میں کب گھر لوٹتا ہوں۔ منو سے بھی واقف ہے، پھر تو اسے یہ بھی پتا ہوگا کہ میں اس سے شدید نفرت کرتا رہا ہوں اور اس کی پرانی ویسٹ اینڈ واچ کی آواز مجھے بری لگتی ہے۔

اس نے یہ سب سوچتے ہوئے دروازے پر دستک دی۔

جب اس کی بیوی نے دروازہ کھولا ہے تو وہ خاصی پریشان دکھائی دے رہی تھی۔

"آج کہاں رہ گئے تھے؟ منو آپ کا انتظار کرتے کرتے ابھی ابھی سویا ہے"۔

اس نے جواب میں گہرا سانس لیا اور سوئے ہوئے منو پر جھک گیا۔ پھر بولا

"دفتر سے چھٹی ہوئی ہے تو بس کچھ نہ پوچھو۔ ذرا کارنیوال کی طرف نکل گیا تھا۔ لیکن یقین جانو یہ اکیلے آدمی کا کام نہیں۔ میری تو سانس اکھڑنے لگی تھی۔ ایسے میں بچوں کا ساتھ بہت ضروری ہے"۔

وہ جب کمر سیدھی کرنے کو بستر پر لیٹا ہے تو گلی کی نکڑ پر ویسٹ اینڈ واچ نے رات کے گیارہ بجائے تھے۔ اس کی بیوی کچن میں کھانا گرم کر رہی تھی اور وہ اپنے سوئے ہوئے بیٹے کے برابر میں بستر پر اونگھ گیا تھا۔

نسیم سحر (جدہ، سعودی عربیہ)



غزل

جو یوں محسوس کرتا ہوں گھٹن میں — تو کیا اب چھوڑ جاؤں تن بدن میں؟
اسے کوئی بتائے ۔ ڈھونڈتا ہوں — اسی کو انجمن در انجمن میں
بس اتنا ہے مجھے رکھے نظر میں — طلب کرتا ہوں کب اس کا ملن میں!
سماعت کی رہی فرصت ہی کس کو؟ — تو کیا ہو جاؤں اب سے بے سخن میں؟
تصور میں ہے شادابی اسی کی — ابھی تک ہوں چمن اندر چمن میں
جو یوں تنہائی راس آنے لگی ہے — تو شاید ہوگیا ہوں انجمن میں؟
نظر میں لاکھ گلشن کھل رہے ہوں — بھلا سکتا ہوں کب وہ گلبدن میں؟
تخیل میں اگر ہوتا نہ کوئی — نہ رکھتا قدرت شعر و سخن میں
اندھیرے میں بھی کب ہے یہ گوارا — کہ سورج سے طلب کرلوں کرن میں؟
مجھے تہذیب فن سے کب ہے فرصت؟ — کہاں کرسکتا ہوں تشہیر فن میں؟
میں آنکھیں دفن کر آیا ہوں اپنی — سو اب دیکھوں گا خوشبو کا بدن میں
مرے چاروں طرف اہل خرد ہیں — کہاں لے جاؤں یہ دیوانہ پن میں
نسیم اس سے کہوں گا حال دل کیا! — بھلا چھوڑوں گا اپنا بانکپن میں؟

غزل

اگر ہوسکے دو بدو عکس سے
رہے گی ذرا گفتگو عکس سے
یہاں جب نہیں ہے کوئی آئینہ
تو پھر کیا ہیں یہ چار سو عکس سے؟
بدن سے ہے جب آبرو عکس کی
بدن کی بھی ہو آبرو عکس سے
وہ چہرہ ابھی تک تو دیکھا نہیں
جو ملتا بھی ہو موبمو عکس سے
بدن میرا زخموں سے چھلنی ہوا
مگر بہہ رہا ہے لہو عکس سے
یہ ٹوٹا ہوا ایک چہرہ ادھر
وہ بکھرے ہوئے چار سو عکس سے
تجھے قتل ہرگز نہ کر پائے گا
نسیم سحر ڈر نہ تو عکس سے

شاہد فروغی

107/2,
Munshi Noor Mohammed Lane
Howrah _ 711101

غزل

ہمارے شہر کی گلیوں سے ہار جائے گا
ہما پتے کے اسے تو نہ ڈھونڈ پائے گا

مدل کے چہرہ وہ دے گا فریب لوگوں کو
مگر ضمیر سے اپنے وہ بچ نہ پائے گا

تمار ہوگا اسی کا ادب کی دنیا میں
جو اپنے فن کو لہو روز و شب پلائے گا

جو ہوسکے تو بلندی کو بڑھ کے خود چھولو
تمہارا حوصلہ کوئی نہیں بڑھائے گا

ہر ایک پل یہاں ہوتے ہی حادثے شاہد
جو لمحہ آتا ہے وہ داستاں بنائے گا

عمران ابن عرشی

16 Jola Para Masjid Lane
Howrah _ 711101
W Bengal

غزل

وقت کا انقلاب ختم ہوا
سر سے گویا عذاب ختم ہوا

کتنے طوفاں گزر گئے لیکن
عمر کا ایک باب ختم ہوا

پینے والوں نے کرلیا پردہ
میکدے کا شباب ختم ہوا

موسم گل کا اب یہ عالم ہے
ہر شجر سے گلاب ختم ہوا

کیسے جینے کی ہو کلک عمران
اپنی آنکھوں سے خواب ختم ہوا

ڈاکٹر شباب للت
(شملہ)

منافق

ہم نے دیکھا یہ ہمیشہ کہ وہی لوگ شباب
جن کی ہوتی ہیں وفاداریاں اپنی مشکوک
اپنے باطن کی خباثت کو چھپانے کے لئے
انگلیاں اپنی اٹھاتے ہیں وفاداروں پر
اہل اخلاص و وفا سے
یہی ہوتا ہے سلوک

اندر سے ٹوٹنے کا منظر

سلیم خان ہمراز
J-6 (فرسٹ فلور) رام نگر لین
گارڈن ریچ، کلکتہ 700024

برآمدے میں پروین کی لاش ایک سفید چادر میں لپٹی ہوئی رکھی تھی۔ اس کے ارد گرد ہالہ ڈالے نوجوان لڑکیاں زار و قطار رو رہی تھیں۔ زار و قطار روتی ہوئی لڑکیوں میں پروین کی بہنیں شیلا اور شبلا، اس کی نندیں مہ جبیں و مہ پارہ سبھی شامل تھیں۔ سارے گھر میں کہرام مچا ہوا تھا۔ گھر میں اندر ہر طرف عورتیں اور باہر مرد بھرے پڑے تھے۔ کچھ لوگ زار و قطار رو رہے تھے۔ کچھ صبر کئے چپ چاپ بیٹھے تھے اور کچھ ایسے موقعوں پر الٹی سیدھی باتیں کرکے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے عادی اپنے کام میں معروف تھے۔

اندر گھر میں پروین کی لاش سے تھوڑی ہی دور ڈاکٹر صاحب کی بیوی بیٹھی تھیں۔ شادی اور غمی کی تقریبات میں شرکت کرنا ان کا معمول تھا۔ شہر میں کہیں پر کوئی بھی مرے وہ ضرور جاتی تھیں۔ گویا یہی ان کی تفریح کا واحد ذریعہ تھا۔ ان کو اس سلسلے میں اتنی شہرت نصیب ہوئی تھی کہ اگر کسی کو وہ اپنے محلے میں کسی طرف جاتی دکھائی دیتیں تو وہ شخص ان کی صورت دیکھ کر پریشان ہو جاتا کہ ہو نہ ہو کہیں کچھ ہوا ضرور ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی بیوی چاہے کسی غمی میں ہوں یا خوشی کی تقریب میں سڑک پر چل رہی ہوں یا عورتوں کی کسی کانفرنس میں رضاکارانہ خدمات انجام دے رہی ہوں، ہر جگہ ان کی انفرادیت نمایاں رہتی۔ ان کی چال ڈھال، ڈیل ڈول اور بات چیت کا انداز ہی کچھ ایسا تھا جو ان کو سیکڑوں کیا، ہزاروں کے مجمع میں بھی نمایاں رکھتا تھا۔ وہ بات چیت کچھ ایسے انداز سے کرتی تھیں کہ لاکھ بے تعلق ہونے کی کوشش کرنے پر بھی عورتیں دھیرے دھیرے ان کے پاس کھسکتی چلی آتی تھیں اور تھوڑی ہی دیر میں ان کے گرد اچھا خاصا جمگھٹا ہو جاتا تھا۔ باتیں کرتے وقت وہ کبھی بھی اس بات کی پروا نہیں کرتی تھیں کہ وہ کیسی محفل میں ہیں۔ اس وقت بھی وہ پروین کی لاش سے تھوڑی دور بیٹھی برابر بولے جا رہی تھیں۔

"ارے بی بی کیسی جواں موت مری بے چاری۔ خدا دشمن کو بھی اس موت سے بچائے۔ ابھی بے چاری کی شادی ہوئے کتنے دن ہوئے تھے۔ جمعہ جمعہ آٹھ دن بھی تو نہیں۔ بابا۔ بچاری کے ارمان بھی پورے نہ ہو سکے۔"

عورتیں دھیرے دھیرے کھسک کر ان کے قریب آنے لگیں اس لئے وہ برابر بولے گئیں۔

وہ تو مر گئی خیر۔ کوئی اس کے دولہا شاکر کے دل سے پوچھے۔ اس بے چارے پر کیا گزری ہوگی۔ ہائے بے چارے کی زندگی کیسی برباد ہو گئی۔"

"ہاں واقعی وہ قابل رحم ہے۔" کسی عورت نے ان کی ہاں میں ہاں ملائی۔ اس پر وہ خاموش ہو گئیں اور تھوڑی دیر تک خاموش رہیں۔ مگر زیادہ دیر تک ان سے خاموش نہ رہا گیا۔ اس لیے ایک عورت کے کان کے پاس اپنا منہ لے جا کر بولیں۔ "اے شاکر کیا کرتا ہے؟"

"ارے انجینیر ہے انجینیر کوئی ایسا ویسا ہے" کسی دوسری عورت نے ان کی بات سن کر جواب دیا۔ جواب پا کر وہ تھوڑی دیر کے لئے خاموش رہیں۔ پھر ایک دوسری عورت سے بشدت راز داری سے بولیں۔ "اندازاً شاکر کتنی تنخواہ پاتا ہوگا؟"

"ارے چھ، سات ہزار سے کم کیا پاتا ہوگا۔ انجینیر ہونا کوئی معمولی بات تھوڑی ہے۔"

"ہاں ہاں اور کیا، آج کل انجینیروں ہی کا تو زمانہ ہے۔"

ڈاکٹر صاحب کی بیوی نے عورت کی بات کو اہمیت دی۔ پھر ایک تیسری عورت کے کان کے قریب منہ لے جاکر بولیں۔

"سنتی ہوں شاکر صورت شکل کا تو اچھا ہے اور ابھی عمر بھی کچھ نہیں ہے۔"

"ہاں آں ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے۔ ارے پڑھ گیا، جلدی نوکری مل گئی، اس لئے شادی کر دی گئی۔ اے خدا کا کرنا ایسا کہ سب کام جلدی ہوا تو بیوی بھی جلد ہی مر گئی۔ ایک ہی بیٹھنے میں چٹ پٹ ہو گئی۔ نہ بیماری نہ دکھ۔ بیچاری رات کو اچھی خاصی سوئی صبح کو معلوم ہوا غائب۔" عورت نے ڈاکٹر کی بیوی کی بات سنتے ہی جواب دیا۔

"ارے خدا کی مرضی میں کس کو دخل۔ کیا معلوم اس میں خدا کی کیا مصلحت پوشیدہ ہے۔" ڈاکٹر کی بیوی نے ٹکڑا لگایا۔

"ہاں بس یہی ٹھیک ہے۔ انسان ہر حال میں خدا کا شکر ادا کرے۔" اسی عورت نے کہا۔ اسی اثنا میں آہ و زاری بڑھ گئی، کیونکہ پروین کی لاش غسل کے لئے لے جائی جارہی تھی۔ یہ دیکھ کر ڈاکٹر صاحب کی بیوی برمنہ پاٹھ کھڑی ہوئیں اور پاس ہی کھڑی ہوئی ایک عورت سے مخاطب ہوئیں۔

"اسے کون غسل دے گا؟؟"

"ارے وہی احترام میاں کی لڑکی غسل دے گی۔ وہی بے چاری تو یہ سب کام کرتی ہے۔" عورت نے بے رخی سے جواب دیا۔

"ہاں بے چاری بڑا کام کرتی ہے۔ بڑے ثواب کا کام ہے یہ بھی۔ ورنہ آج کل کون مرنے کے بعد کسی کو پوچھتا ہے اور کون جانتا ہے یہ سب کام۔ وہ تو خیر سے احترام میاں اللہ والے ہیں۔ اس لئے ان کے گھر والے بھی دین و مذہب سے واقف ہیں۔" ڈاکٹر صاحب کی بیوی کہتی ہوئی لاش کے پاس پہونچ گئیں۔

لاش جب غسل دینے کے لئے غسل خانے لے جائی گئی تو ڈاکٹر صاحب کی بیوی پھر اپنی جگہ پر آکر بیٹھ گئیں۔ "بہت دیر ہو گئی ہے۔ اب جلدی سے غسل دے کر دفنانے کا انتظام کرنا چاہیے۔ لاش کو زیادہ دیر گھر میں رکھنا مناسب نہیں۔"

جلد ہی پروین کی لاش کو غسل دے دیا گیا اور کفن پہنایا جانے لگا۔ ڈاکٹر صاحب کی بیوی پھر زیادہ دیر خاموش نہ رہ سکیں۔ وہ بول ہی پڑیں۔

"آخری لباس پہنایا جارہا ہے۔ ہا کیسی عبرت کی بات ہے، ابھی کل اس کو عروسی لباس پہنایا جارہا تھا، آج کفن پہنایا جارہا ہے۔"

"دنیا کی بے ثباتی کا کہاں تک رونا رویا جائے۔" ان کے پاس بیٹھی ہوئی ایک بزرگ خاتون نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

پروین کی لاش کو کفن بھی پہنا دیا گیا۔ عورتیں پردے میں ہو گئیں اور مردوں کو بلا لیا گیا۔ جنازہ گھر سے نکلتے ہی آہ و بکا سے آسمان پھٹنے لگا۔ یہ رونے پیٹنے کا آخری موقع تھا۔ ڈاکٹر صاحب کی بیوی کو رونا کیا آتا۔ ان کو رنج ہی کاہے کا تھا۔ لیکن چونکہ سب رو رہے تھے لہٰذا ان کو بھی رونا تھا۔ انہوں نے ایک ایسی چنگھاڑ ماری کہ سبھی عورتیں اپنا رونا پیٹنا چھوڑ کر ان کو دیکھنے لگیں۔ پھر انہوں نے دو ایک چنگھاڑیں ماریں اور بے ہوش ہو گئیں۔ گھر میں ایک دوسری آفت آگئی کوئی پانی لینے دوڑا تو کوئی ڈاکٹر کو بلانے۔

جلدی ہی ڈاکٹر اور پانی آگیا اس لئے ڈاکٹر صاحب کی بیوی کو ہوش بھی آگیا۔ انہوں نے ہوش میں آتے ہی منہ دھویا مگر منہ دھونے سے پہلے حمام میں آویزاں بڑے سے آئینے میں اپنی صورت دیکھ کر اطمینان کر لیا کہ وہ چہرے سے غم کی ماری معلوم ہو رہی ہیں۔

منہ دھونے کے بعد وہ پھر اپنی جگہ پہ پہلے ہی کی طرح جاکر اطمینان سے بیٹھ گئیں۔ حالاں کہ جنازہ گھر سے گئے دیر ہو رہی تھی۔ اس لئے دھیرے دھیرے سبھی عورتیں واپس جانے لگی تھیں مگر وہ اطمینان سے خاموش بیٹھی رہیں اور عورتوں کو جاتے دیکھتی رہیں۔

دھیرے دھیرے جب سبھی خواتین اپنے اپنے گھروں کو واپس ہو گئیں اور گھر والے ڈاکٹر صاحب کی بیوی کے علاوہ اکیلے رہ گئے تو وہ اپنی جگہ سے اٹھیں اور پروین کی غمگین ساس کے پاس جاکر بیٹھ گئیں۔ تھوڑی دیر تک وہ رنج و غم کا مجموعہ بنی رہیں۔ پھر انہوں نے دھیرے دھیرے بولنا شروع کیا۔

"نئی نویلی بہو کی موت واقعی بڑی دردناک بات ہے۔ بے چاری چار دن بھی تو سہاگ کے مزے نہ لوٹ سکی۔ میں تو کہتی ہوں شاکر کے دل

پر کیا گزری ہوگی۔ نوجوان لڑکا اور کیسا بھاری غم۔ بابا۔ مگر شاکر کی ماں، تم صبر کرو۔ خدا صبر کرنے والوں کو عزیز رکھتا ہے۔ اور پھر یہ بھی سوچو موت برحق ہے ایک دن سبھی کو مٹی میں ملنا ہے۔ کوئی آج مرا تو کوئی کل، بس فرق اتنا ہی ہے۔"

شاکر کی ماں ڈاکٹر صاحب کی بیوی کی باتیں سنتی رہیں۔ وہ غم کے مارے کچھ بھی نہ بول سکیں۔ اس لئے ڈاکٹر صاحب کی بیوی تھوڑی دیر کے لئے خاموش ہوگئیں، پہلو بدلا اور پھر شاکر کی ماں کے سر پر شفقت کا ہاتھ پھیرتی ہوئی بولیں۔

"اے شاکر کی ماں میرا کہنا مانو تو غم وغم کرنے سے کچھ نہیں ہوتا جو کچھ ہونا تھا سو ہوگیا۔ تم ذرا شاکر کی فکر کرو۔ نئی نویلی بیوی کی موت نوجوان آدمی کے لئے کوئی معمولی حادثہ تھوڑی ہوتا ہے۔ تم تو خیر پھر بھی ساس ہو۔ وہ تو پروین کا شوہر ہے شوہر ذرا سوچو اس کے دل پر کیا کیا گزر رہی ہوگی۔"

وہ ذرا سا رکیں، چاروں طرف دیکھا اور پھر بولنا شروع کیا۔

"نوجوان آدمی کی بیوی مرجائے تو اس کے غم کو صرف اسی طرح ہلکا کیا جاسکتا ہے کہ اس کو اس کی بیوی سے زیادہ خوبصورت اور خوش سلیقہ بیوی دے دی جائے۔ شاکر کی ماں تم میری بات پر عمل کرو اور لڑکی کی فکر بالکل نہ کرو۔ میری کشور تمہاری ہی بیٹی ہے۔ صورت شکل میں تم خود ہی جانتی ہو کہ ہزاروں میں ایک ہے۔ اے یہ تو ہندوستان ہے انگلستان تو ہے نہیں کہ لڑکی کے بال اور آنکھوں کا رنگ دیکھا جائے۔ یہاں تو جس لڑکی کی چمڑی سفید اور جسم گٹھا ہے وہی خوبصورت ہے۔ میری کشور میں سو ایسی کوئی کمی نہیں خدا کے شکر سے وہ گوری اتنی ہے کہ فرنگی بھی رشک کریں اور ڈیل ڈول یا جسم کا کہنا ہی کیا ہے۔ بی۔ اے سیکنڈ ڈویژن پاس ہے۔ اس کے دو سر کسی موئے نے جلن میں کم کر دیئے۔ ورنہ فرسٹ تھی۔ شاکر کے لئے بالکل مناسب رہے گی۔ یوں تو اس کے پیغام خدا کے شکر سے ہزاروں آچکے ہیں۔ ابھی کل ہی ڈپٹی صاحب کے لڑکے کا پیغام آیا ہے۔ مگر میں نے ابھی کچھ جواب نہیں دیا ہے۔ تم کہو تو انکار کر دوں اور جب تمہاری مرضی ہو دو بول پڑھا کر اپنے گھر لے آؤ۔"

شاکر کی ماں ڈاکٹر صاحب کی بیوی کی ایسی باتیں سن کر حیرت میں رہ گئیں۔ اس لئے ڈاکٹر صاحب کی بیوی ان کے پاس سے اٹھتی ہوئی بولیں۔

"تم بہت غمگین تھیں۔ میں نے کہا تمہارا دھیان اسی طرح دوسری طرف کر کے رنج ہلکا کر دوں۔ کچھ خیال نہ کرنا۔ اور ہاں جو باتیں میں نے کہی ہیں بھولنا نہیں۔ ویسے جلدی نہیں ہے۔ اطمینان سے سوچ سمجھ لینا۔ اب میں جاتی ہوں۔"

ڈاکٹر صاحب کی بیوی نے اتنا کہا۔ دونوں پائنچوں کو اٹھایا، زور سے جھاڑا، نوکرانی کو لیا اور سلام کرتی ہوئی اپنے گھر کی طرف چل دیں۔ !!

تجدید ممبری

محمد شاہد پٹھان
جونیئر ریسرچ فیلو
شعبہ اردو و فارسی
راجستھان یونیورسٹی (جے پور)

غزل

زخم کے بعد پھر اک زخم نیا دیتا ہے
وقت کس جرم کی یہ ہم کو سزا دیتا ہے

کون کرتا ہے دلوں میں یہ تعصب پیدا
کون اس آگ کو خاموش ہوا دیتا ہے

چشم نم درد جگر یہ ہے مقدر میرا
اشک تھمتے ہیں کہ پھر کوئی رلا دیتا ہے

عشق کے سامنے یہ وقت کے شعلے کیا ہیں
عشق تو آتش نمرود بجھا دیتا ہے

کتنا کم ظرف ہے وہ شخص جو احساں کرکے
اپنے احسان کا احساس دلا دیتا ہے

اس مسیحا سے تو بہتر ہے ستمگر شاہد
جو مرے زخم پہ نشتر تو لگا دیتا ہے

دیوانہ روہتگی
RZ/H-164, Gali No 6
Raj Nagar
Palam Colony
New Delhi – 110045

غزل

حال فرقت کا کبھی مجھ سے سنایا نہ گیا
دل کا دل ہی میں رہا ہونٹوں پہ لایا نہ گیا

بھول کر بھی نہ کیا یاد مجھے اس بت نے
بھول کر بھی اسے مجھ سے تو بھلایا نہ گیا

تاب دیدار جمال آج کسی میں بھی نہیں
کیا گلہ ان سے اگر پردہ اٹھایا نہ گیا

کاش وہ زہر کا ساغر ہی پلا دیتے مجھے
ان سے تو زہر کا ساغر بھی پلایا نہ گیا

لاکھ کوشش سے بھی یہ کھل ہی گیا نظروں سے
راز [illegible] کا کبھی دل میں چھپایا نہ گیا

اک دنیا مجھے دیوانہ کہے گی یک سر
[illegible] کا بار اگر مجھ سے اٹھایا نہ گیا

قاسم ندیم
9/505 Lotus Colony
Govandi, Bombay – 43

ہالۂ نور

کئی بار میں نے بھی سوچا
کہ یہ راز مجھ پہ بھی ہو عیاں
مشترکہ سانسیں
اٹھتی ہوں جہاں
ثبت ہو جائے کہیں
قدموں کی آہٹ
دل پہ دستک دے
چپکے سے دھم دھماہٹ
ہونٹ یوں ہی کچھ
گنگنانے لگیں
لہو میں شرارے
جگمگانے لگیں
موسم، بے موسم
سارے مناظر سہانے لگیں
بادلوں کی اوٹ میں
سورج سر چھپانے لگے
مگر کچھ کرنیں
نظریں بچا کر
قطرے قطرے سے
آہستگی سے گزر کر
دھنک رنگ بکھرانے لگیں
تب دل کی کیفیت
کیا ہوتی ہے؟
تب روح کی حیثیت
کیا ہوتی ہے؟

سیم بھائی
...ین جلال نگر
...جہاں پور (یو-پی)

غزل

اگر مرنے سے ہم ڈرتے رہیں گے
تو پھر حق بات کیسے کہہ سکیں گے

جنہیں موسم کا اندازہ نہیں ہے
فضا میں وہ پرندے کیا اڑیں گے

لب ساحل وہ سب سے پوچھتا ہے
جو ڈوبے ہیں وہ کب اوپر اٹھیں گے

تمنائیں سدا دل میں رہیں گی
یہ جگنو مستقل چمکا کریں گے

اگر ہم بھی چلیں بیساکھیوں پر
تو سب ہم کو بھی قدآور کہیں گے

گرجتے ہیں جو بادل آسماں پر
وہ کب صحرا میں ہریالی کریں گے

اشاروں سے ان کے
پرائے پیڑ کب تک ساتھ دیں گے

وسیم آئے نہ آئے کوئی پھر بھی
دیئے دہلیز پر جلتے رہیں گے

شاداب بے دھڑک مدراسی
بزم طنز و مزاح 8-4-383/2 ، پریم نگر
ایر گڈہ - حیدرآباد - ۱۸

نظم

(آندھرا پردیش میں نشہ بندی کے قانون کے نفاذ پر)

پڑ گیا جب سے نشہ بندی کا تالا ساقی
دھول پیالوں میں ہے میخانوں میں جالا ساقی

نشہ بندی کا خسارہ یوں نکالا ساقی
ٹیکس و چالان کا مارا ہمیں بھالا ساقی

مچھلی والوں کی پریشانی پہ مچھلی تڑپی
چھن گیا منہ سے کبابی کے نوالا ساقی

اب کیا اسہال منائیں گے دوالی میخوار ؟
پٹ گیا حسن کی دوالی کا دوالا ساقی

دے کے دو روپئے کا چاول ہے کھلاتی سرکار
دو سو روپئے فی کلو گرم مسالہ ساقی

بنت انگور ہے آغوش میں لنگوروں کی
کالے دھن والوں کا ہے راج گھٹالا ساقی

نشہ طاقت کا کھلا سر ہو کیسے اس کا ؟
یہ دھڑک پیتے ہیں جو جوں کا پیالا ساقی

شرر غازی پوری
ایم-ایس- پراترا پور
پورٹ بلیر - 744103

چوبولے

○

بیتا موسم پیار کا ، بکھرا میرا ناز
چپ چپ سارے راگ ہیں ، چپ ہے دل کا ساز

چپ ہے دل کا ساز اب ، بدل گئی ہر رسمت
آنکھ ہے نم احساس کی ، گم صم ہے سنگیت

سناٹے کے شور میں ، روٹھے ہونٹ سے گیت
کیسے گاؤں گیت میں ، اے میرے من میت

○

رگ رگ میں شعلے بھرے ، سناٹا پر ہول
روندے ذہن و روح کو ، بارودی ماحول

بارودی ماحول میں ، متلی کرتی باس
زخمی زخمی چیتنا ، اکھڑی اکھڑی سانس

ہر بستی بازار میں ، تانڈو کرتا ناس
ہمی سہمی زندگی ، بنی گلے کی پھانس

۲ منی افسانے

از ڈاکٹر ایم۔ آئی۔ ساجد
پیاول (جلگاؤں)

کوکھ

وہ رات ایک جشن کی رات تھی، خوشیوں اور مسرتوں کے چراغوں سے روشن رات۔ کالی چرن کے گھر بارہ برس بعد ایک خوبصورت سی بچی نے جنم لیا تھا گھور اندھیرے میں روشنی کی ایک کرن نمودار ہوئی تھی۔ کالی چرن کی بیوی کی بانجھ کہی جانے والی کوکھ سے ایک ننھی سی کونپل پھوٹی تھی۔ لہٰذا پیسہ آنے پر پندرھویں دن کھانے اور گانے بجانے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ لیکن کسے پتہ تھا کہ یہ خوشیاں عارضی ہیں، چند لمحوں کی مہمان ہیں۔ خوشیاں منا کر کالی چرن کے اہل خانہ اور مہمان ابھی لیٹے بھی نہ تھے کہ وہ قیامت صغریٰ بپا ہوئی اور چند لمحوں کے زلزلے نے وہ تباہی مچائی کہ پورا گاؤں زمیں بوس ہو گیا۔ لاشوں کے وہ انبار لگے کہ موت کے آنچل میں کہیں جگہ باقی نہ رہی۔ کالی چرن کا پورا خاندان موت کے دامن میں سما گیا۔ اگر کوئی بچا تو کالی چرن کی وہ بچی جو بارہ برس بعد عالم وجود میں آئی تھی۔ جس نے اپنی ماں کی کوکھ کو بانجھ ہونے سے بچالیا تھا۔ لیکن یہ کیسا انصاف تھا کہ ایک بچی کو جنم دینے والی سوکھی کوکھ خود زمین کی کوکھ میں سما گئی تھی؟

لذت آشنا

میں روز صبح چاء کی میز پر بلاناغہ اخبار کا مطالعہ کرتا ہوں اور روز بروز اخبار نسلِ آدم کے خون کے چھینٹوں سے تر بتر نظر آتا ہے۔ کوئی دن ایسا نہیں آیا کہ پاک و صاف اور مسرت زا خبروں سے مزین اخبار پڑھنے کو ملا ہو! یہ کیسا جہان ہے جس کے کسی بھی حصے میں کہیں امن و سکون نہیں، اجتماعی خوشیوں کا میلہ نہیں، آدمیت کی مہک نہیں؟

خوف، دہشت، آگ، قتل، خون خرابہ، شدید نفرتیں، اقتدار و طاقت کی جنگ، بموں کی بارشیں! اور اب ان سب کے پس منظر میں سزا کی صورت میں زلزلے کی شدید لہروں کا سیلاب، ان گنت لاشوں کے ڈھیر، ارزانیٔ حیات کا تماشہ! کیا نسل آدم اس قہر سے کوئی سبق سیکھ سکے گی!؟ یہ کیسی زندگی ہے؟ اور یہ کیسے اخبارات ہیں جن میں یہی سب کچھ جلی سرخیوں میں شائع ہوتا ہے؟ روز صبح اخبار پڑھتے پڑھتے میری چاء ٹھنڈی ہو جاتی ہے اور ہر روز میں ایک نئے کرب کی لذت سے آشنا ہوتا ہوں! لیکن کب تک؟!

عقیل شاداب
برج راج پورہ
کوٹا۔ ۳۲۴۰۰۶

غزل

اک سخن درمیان میں آیا
ذائقہ سا زبان میں آیا

ایک سناٹے نے دبوچ لیا
میں جو تھک کر مکان میں آیا

دفعتاً دل سے ایک ہوک اٹھی
یا پرندہ اڑان میں آیا

میری جانب اٹھی نظر اس کی
تیر کھنچ کر کمان میں آیا

اڑ گئی میرے سر سے چھت میری
فرق کیا آسمان میں آیا

ساری محفل حواس کھو بیٹھی
وہ کچھ اس آن بان میں آیا

ایک لڑکی کی مہربانی سے
تفرقہ خاندان میں آیا

بال بیکا نہ ہوسکا اس کا
جو بھی تیری امان میں آیا

جیسے چودہ طبق ہوئے روشن
اس کا چہرہ جو دھیان میں آیا

بوئے گل سے چمن مہک اٹھا
جب وہ کمرے سے لان میں آیا

سر عقیدت سے جھک گیا شاداب
کون وہم و گماں میں آیا

سردار الہام
22-3-370 مغلی میر عالم
حیدرآباد

"زہر خند"

زندگی ہے ابھی مست کش اندوہ نہاں
کتنی صدیوں کا یہ کچلا ہوا احساس زیاں

میری آنکھوں نے وہ بے جاں مناظر دیکھے
نہ تصور کی لطافت ہے نہ وہ حسن خیال

جیسے اک طفل کا لکھا ہوا بے ربط سا خواب
جیسے کھلایا ہوا سا کسی غنچے کا جمال

زندگی حس سے گریزاں ہے گریزاں ہی رہی
روح مردہ ، دل صد چاک ، تمنا پامال

دل کو نہیں لرزتا ہے ، زمیں کانپتی ہے
جھانکتا ہے ابھی آنکھوں سے جو صدیوں کا جلال

سوچتا ہوں غم ہستی کا مداوا کیا ہے
وہی مایوس نگاہی ، وہی دیرینہ سوال

دل مخمور کی آہوں میں جو تاثیر نہیں
شکوے بے سود ہیں ، فریاد اثر گیر نہیں

رائیگاں ہے اگر سعی مسلسل کا مآل
میں کہ خمیازہ کش شومی تقدیر نہیں

میری پلکوں پہ دمکتے ہوئے تارے ٹوٹے
یک بیک جیسے مسرت کے وہ دھارے پھوٹے

میرے ہونٹوں پہ ہنسی بن کے ابھر آیا ہے
ایک لمحہ کو مرے دل نے سکوں پایا ہے

عقیل شاداب
برج راج پورہ
کوٹا۔ ۳۲۴۰۰۶

ایٹم بم

سورج
اپنے ٹھکانے پر ہے
پھر بھی جیسے
لاکھوں سورج
شہر پہ میرے
ٹوٹ پڑے ہیں
انسانوں نے
انسانوں پر
ایک جہنم کھول دیا ہے
پانی اور ہواؤں جس نے
زہر ہلاہل
گھول دیا ہے

غزلیں

ف۔ س۔ اعجاز

کچھ دنیا کے دکھ درد بھلا، کچھ خوابوں کی نگرانی کر
اے نیند کسی شب میری بھی تو آنکھوں میں تو مہمانی کر

آ پھر سے دکھا دے تو مجھ کو نابود زمانے کا جلوہ
اقلیم تمنا کے اوپر تو کوئی دن سلطانی کر

ان رنگ برنگے شیشوں میں مت سپنوں کی قندیل جلا
مت نیلے نیلے ہونٹ بنا، مت موسم کو برفانی کر

صدیاں بیتیں کہ میرا من صحرا کی طرح سے تپتا ہے
کچھ ابر مری دھرتی پہ بہا، کچھ اپنی آنکھ کو پانی کر

کیا اودے بادل چھائے ہیں، کیا نرم ہوائیں چلتی ہیں
اے برق مری خرمن پر گر، اور موسم کو طوفانی کر

دل فتنہ ہے، شب ہنگامہ، کب سر کی گرانی جائے گی
یا صحرا میں دیوار اٹھا، یا ذروں میں طغیانی کر

اے درد کسی سینے سے ابھر، اے آنکھ کسی کا غم لے لے
اک روز تو میرے نغموں کو تو آیات سبحانی کر

اس شہر جنوں کی گلیوں کو راحت کا کوئی ساماں دیدے
ہمت ہے نہ دم، دیوانہ در کچھ تھوڑی تو آسانی کر

جس پچھلے پہر وہ موج صبا کلیوں کو جگانے آجائے
تم خوشبو سے یہ کہہ دینا "جا اس کی نوحہ خوانی کر"

اک سوا رنج کے راحت کا خدا کیا دے گا
یہ زمانہ ہمیں چاہت کا صلا کیا دے گا

اپنے زخموں کو تعلق ہے مسیحا سے فقط
غیر کوئی ہمیں زخموں کی دوا کیا دے گا

سوچتے ہیں تجھے دل اپنا دکھائیں کہ نہیں
تو خریدار ہے قیمت کے سوا کیا دے گا

رات آئے گی تو سو جائیں گے وہ بھی گھر میں
دل کے صحرا میں کوئی تم کو صدا کیا دے گا

آخری وقت میں کیا اس سے امیدیں رکھئے
لب وہ جینے کی دعاؤں کے سوا کیا دے گا

اہل دنیا کب پائیں گے اس دل کی گہرائی کو
کس محفل میں لے کر جائیں ہم اپنی تنہائی کو

چلتے چلتے راہوں میں کچھ بھولے غم مل جاتے ہیں
ہر چہرے کی اوٹ میں ہم نے اس ہرجائی کو

اک جانب میں کٹتے دیکھا ایک کنارا دریا کا
دوسری جانب دیکھ رہے تھے موجوں کی پسپائی کو

دونوں کو مل کر چلنا تھا، دونوں کی اک منزل تھی
کانٹوں سے کچھ بغض نہیں تھا اپنی آبلہ پائی کو

کل تک میری ذات کا سورج اک ذرہ کہلاتا تھا
صحرا صحرا چھان رہے ہو آج مری پہنائی کو

کتنی موجیں، کتنے طوفاں، کتنے ساحل تھے اس میں
اک آنسو میں ہم نے دیکھا دریا کی گہرائی کو

حسان العجم خاقانی

حیدر طباطبائی

لندن (برطانیہ)

افضل الدین ابراہیم بدیل بن علی خاقانی حقایقی شیروانی، فارسی زبان کا سب سے بڑا قصیدہ گو شاعر تھا۔ جس کو مثنوی، ہجوگوئی اور دیگر علوم پر بھی کامل دستگاہ حاصل تھی۔ خاقانی کی زندگی میں ہی اس کی عظمت اور رتبہ اتنا بلند تھا کہ اس کو حسان العجم کا لقب شہنشاہ منوچہر فریدون شیروان نے عطا کیا تھا۔ اس کو خاقانی کا خطاب بھی شاہ فریدون شیروان کے دربار سے ہی ملا تھا اس سے قبل وہ تخلص کے طور پر افضل جو اس کا نام ہے استعمال کرتا تھا۔

خاقانی کے ایک شاگرد عماد الدین الولوحب اربی نے اس کی شان میں جو قصیدہ کہا ہے اس میں اس کو افضل کے نام سے ہی یاد کیا ہے۔

تاآخر دم ز روز اول　　　　بودی ز ماش افضل افضل

خاقانی کے استاد اور خسر، ابوالعلا گنجوی جس سے تمام عمر اس کی نوک جھوک چلتی رہی، نے یک ہجو میں کہا ہے کہ

تو اے افضل الدین اگر راست پرسی　　　　بجانِ عزیرت کہ از تو نہ شادم

لیکن دولت شاہ سمرقندی نے افضل کے نام سے اختلاف کیا ہے اور ذیل کا صرف ایک شعر بطور دلیل پیش کیا ہے۔

بخواں معنی براھیم چہ بد آمد　　　　ز پشت آور صنعت علی نجار شیروانی

لیکن اغلب محققین افضل نام پر ہی متفق ہیں۔ خاقانی کا باپ نجیب علی مردی نجاری (بڑھئی) کا کام کرتا اور اس کا دادا جولاہا تھا۔ اس بابت ایک مثنوی میں خود خاقانی نے اشارہ کیا ہے۔

ع۔ جولاہہ نژادم از سوے جد　　　　در صنعت من کمال ابجد

اس کی ماں بلاد کے شہر روم کی رہنے والی تھی، جس کے ماں باپ طباخ تھے۔ ماں کا نام "جاریہ بی" تھا۔ جس نے علی نجار سے شادی کے بعد اسلام قبول کر لیا تھا۔ خاقانی نے ایک قصیدے میں ان باتوں کا ذکر نہایت صاف اور سادے انداز میں کیا ہے۔

صبیتم زپی غذائی جانور　　　　طباخ نسب ز سوے مادر
نسطوری موری نژادوش　　　　اسلامی و ایزدی نہادوش
گر بختہ از عتاب نسطور　　　　آویختہ در کتاب مسطور

لباب الالباب ج ۲ ص ۲۲ امام مجد الدین نے اسی نام سے یاد کیا ہے۔
افضل الدین امام خاقانی　　　　تاجدار ممالک سخن اوست

تذکرۃ الشعراے ایران جلد اول ص ۱۱۰

کہ بانو بودہ چون زلیخا   بردہ شدہ باز یوسف آسا
از روم ضلالت آوریدہ   نخاس عدیش پروریدہ
دل بردہ چو بردہ در ہدایت   بردور دہ بپردہ عدایت
تامصحف ولا الہ دیدہ   رانجیل و صلیب درمیدہ

خاقانی کا چچا کافی الدین عمر بن عثمان، بہت بڑا فلسفی اور شاعر و طبیب بھی تھا، جس نے خاقانی کو پال پوس کر بڑا کیا۔ کل پچیس سال تک وہ خاقانی کی نگہداشت کرتا رہا۔ اس نے علم ریاضی، حکمت و فلسفہ، صرف و نحو اور شاعری میں خاقانی کو یکتائے روزگار بنادیا۔ کافی الدین کے انتقال کے بعد اس زمانے کے ایک اور عالم و شاعر ابو العلائی گنجوی سے بھی خاقانی نے عرصہ دراز تک درس حاصل کیا۔ لیکن چچا کی محبت شفقت اور احسان وہ کبھی فراموش نہیں کرپایا۔ اس نے ایک قصیدہ میں کہا ہے کہ۔

گریختہ ام زد بوخذلان   درسایہ عمر بن عثمان
ہم صدرم وہم امام وہم عم   صدر اجل وامام اکرم
سربانی وھندئی مقالش   افلاطن وارسطو حیالش
زین عم بمن آن شرف رسیدست   کز قرص خود آب و خاک دیدست
مسکن پدرم زجور ایام   زفگند مراچو زالراسام
او سیمرغی نمود درحال   در زیر پرم گرفت چوزال
آورد بکوہ قاف دانش   پرورد مرا باشمیانش
بامن بہ یتیم داری آن مرد   آن کرد کہ عم بہ مصطفیٰ کرد
حافظ بدہ از پئے کمالم   از آتش و آب ہفت سالم

چچا کی وفات کے وقت ہر چند کہ خاقانی جوان تھا، لیکن شعر و ادب اور سیاسی حکمت عملی میں طاق ہوچکا تھا، لیکن جستجوئے علم کے سوتے ابھی رواں نہیں تھے یا ان میں ابھی وہ طغیانی نہیں آئی تھی جس کی اسے تلاش تھی۔ اس لئے اس عہد کے ایک اور بہت بڑے استاد ابو العلاء گنجوی کے مکتب میں جانا شروع کردیا۔ جب ابو العلاء پر خاقانی کی غیر معمولی ذہانت افشا ہوئی تو وہ اس کا گرویدہ ہوگیا اور بہت خاص توجہ دی۔ چند ہی دنوں میں ابو العلاء سمجھ گیا کہ خاقانی ایک گوہر یکتا ہے۔ ابو العلاء جس کی رسائی دربار تک تھی اس نے خاقانی کا تعارف شہنشاہ وقت منوچہر فریدون شیروان سے ایک جشن میں کیا، پہلی ہی ملاقات میں شاہ نے اس کو پسند کیا اور بطور مشیر سیاسی استخدام کرلیا۔ کچھ عرصہ بعد ابو العلاء نے اپنی بیٹی کی شادی خاقانی سے کردی۔ اس نے شاعری میں بھی ابو العلاء سے بہت کسب فیض کیا۔ دربار میں خاقانی کو جو بھی عزت و آبرو نصیب ہوئی اس میں ابو العلاء کی بہت کاوشیں تھیں۔ یہاں تک کہ خاقانی کا خطاب بھی ابو العلاء کی سفارش پر ملا۔ جس کا اعتراف خاقانی نے ایک قصیدے میں کیا ہے۔

چون شاعر شدی بردمت چشش خاقان   نہاقانیت من لقب برنہادم ابو العلاء گنجوی

خاقانی میں شاعرانہ صلاحیتوں کے علاوہ سیاسی سوجھ بوجھ بہت زیادہ تھی۔ وہ چند سال میں فریدون شاہ کا معتمد خاص بن گیا۔ شاہ نے اس کو نئی معاموریت یہ عطا کی کہ مختلف ایالتوں میں جاکر وہاں کا حال شاہ کو بتائے اور ہر صوبے کے حاکم پر کڑی نظر رکھے۔ یہ ذمہ داری اس کو پسند نہیں آئی اور وہ ایران کی قلمرو عبور کرکے عراق چلا گیا۔ جہاں اہل علم کے حلقوں میں جاکر کسب کمال کیا۔ عراق میں ہی خاقانی کو غزنی کے حملے کی اطلاع ملی اور وہ فوراً

بغداد سے شیروان پہنچا جہاں اس کو سلطان سنجر کی گرفتاری کی خبر ملی۔ ابھی خاقانی شیروان میں ہی تھا کہ شہر میں اس عہد کے بہت بڑے عالم دین امام محمد بن یحییٰ کے قتل کئے جانے کی بھی اطلاع آئی۔ ان واقعات نے اس کو بہت ملول کیا، جس کا ذکر اس نے نہایت عمیق پیرائے میں کیا ہے۔

آن مصر مملکت کہ تودیدی خراب شد — وآن نیل مکرمت کہ شنیدی سراب شد
گردون سر محمد یحییٰ بباد داد — محنت رقیب سنجر مالک رقاب شد
آن کعبہ وفا کہ خراسانش نام بود — اکنون بپای پیل حوادث خراب شد
حوت کہ زی جناب خراسان درست بود — برہم شکن کہ بوئے اماں زآں جناب شد
برطاق نہ حدیث سفر زانکہ روزگار — چوں طالع تو نامزد انقلاب شد
درجنگاہ شیروان با درد دل بساز — کاں در راہ گوشۂ یوم الحساب شد

اب سیاسی حالات اس قدر خراب ہو چکے تھے کہ ایران میں اس کے لئے قیام کرنا دشوار تھا اس لئے باعزم سفر خانہ، خدا رخت سفر باندھا اور حج کے لئے چلا گیا، مدینہ سورہ میں اس نے قصیدہ مرا کہا جو فارسی زبان کا بہت ہی مشہور و معروف قصیدہ ہے۔ حج سے واپسی پر وہ پھر عراق آیا اور خلیفہ بغداد المستقفی بامر اللہ عباسی کے دربار میں گیا اور اپنی معروفی اور خود کرائی و عرض مدعا کیا کہ آپ کی مملکت میں کوئی کام مل جائے تو بہتر ہوگا۔ خلیفہ کو خاقانی کی عوت کا پہلے سے علم تھا۔ لیکن وہ اس کے علم دبات اور ایرانی ہونے سے واقف تھا۔ خاقانی کو کامل یقین تھا کہ وہ اس کو وزارت کی پیش کش کرے گا، لیکن خلیفہ نے کہا کہ چونکہ آپ گوناں گوں علوم سے واقف ہیں اس لئے آپ عباسی شہزادگان کو درس دیا کریں۔ خاقانی کو یہ عہدہ قبول نہیں ہوا۔

خلیفہ گوید خاقانیا دبیری کن — کہ پایگاہ ترا برفلک گزارم سر

اب خلیفہ اور بدظن ہو گیا، ادھر خاقانی اپنی مشہور اور طویل ترین مثنوی "تحفۃ العراقین" لکھنے میں مصروف ہو گیا۔ اس لئے یہ مثنوی کچھ عراق میں لکھی گئی باقی اصفہان آکر تکمیل ہوئی۔ اس مثنوی میں خاقانی نے پیشن گوئی کی ہے کہ تیس سال بعد نہایت شدید سورج گرہن پڑے گا، جس کے بعد عباسی خلیفہ کا تخت و تاج غرق فرات ہو جائے گا۔ یہ بات ۵۵۲ھ کی ہے اور ۵۸۲ھ میں سلسلۂ خاقانی کے بادشاہ نے عراق پر حملہ کیا شدید کشت و خون کے بعد خاقانیوں نے سلطنت عباسی کو ختم کر کے عراق پر قبضہ جمالیا۔ اس طرح خاقانی کے لئے یہ بات بھی ثابت ہے کہ وہ علوم نجوم سے بخوبی واقف تھا۔ اس نے پیشن گوئی کی تھی۔

درگوش مقلدان اقوال — دادند خبرکہ بعد نی سال
در برج اختران بسیر سربست — خسفی است سہ بیست و یک قران در

خاقان اعظم کے وزیر دربار ابو منصور اصفہانی کے لئے اس نے ایک قصیدے میں کہا تھا کہ

درسنہ شانون الف حضرت موصل — راندم شانون الف سرائے صفاہان

یعنی سال ۵۵۵ ہجری میں وزیر موصوف کو عروج ملے گا اور وہ عراق کا حاکم اسی سال مقرر ہوا۔ اصفہان میں کچھ قیام کے بعد خاقانی پھر شیروان آ گیا۔ اب خاقانیوں کا پائے تخت شیروان کے بجائے شیراز ہو گیا تھا اور شیروان میں ایک حاکم موجود تھا جو اس بات سے خائف ہوا کہ کہیں خاقانی اس سے اقتدار نہ حاصل کر لے۔ خاقانی کو اس بات سے بہت رنج ہوا۔

کیست کہ پیغام من بسوئے شیروان برد   یک سخن ازمن بران مرد سخندان برد
گوید خاقانیا اینہمہ ناموس چیست   نہ ہرکہ دوبیت گفت لقب زخاقان برد

اس ایک رباعی نے خاقانی ایسے پر عظمت اور زیرک سیاست داں کو زنداں بھجوادیا۔ حاکم شیروان نے تابد زندان کا حکم صادر کیا تھا لیکن جب یہ خبر کرمان پہنچی تو حاکم کرمان عزالدولہ جو خود شاعر بھی تھا اور خاقانی کے مرتبہ سے واقف تھا از خود شیروان آیا اور اس کو رہائی دلوائی۔ لیکن ایک سال زنداں میں بیت گیا اور چند قصائد بھی لکھے جو دیوان میں ملتے ہیں۔ اب طبیعت اس قدر مکدر ہو چکی تھی کہ کہیں جانے یا رہنے سے دل اچاٹ تھا اس لئے پھر حجاز کا رخ کیا اور ۵۷۱ھ میں جب واپس شیروان لوٹا تو جوان فرزند رشید الدین مختصر علالت کے بعد فوت ہو گیا بیٹے کی موت نے اس کو نڈھال کر دیا اور خاقانی گوشہ عزلت میں چلا گیا۔ اور تبریز چلا گیا، جہاں تادم مرگ خاموش زندگی بسر کی۔ لیکن پھر بھی گھر پر شاگردوں کا ہجوم لگا رہتا تھا اور خاقانی ہر باز پرس کرنے والے کو جواب دیتا اور ایک طرح کا مکتب قائم کر لیا تھا۔ بتریز میں ہی سال ۵۹۵ھ میں اس کا انتقال ہو گیا۔ حاکم تبریز نے اس کا مقبرہ نہایت عالیشان بنوایا۔ جو آج بھی اس شہر کے محلہ سرخاب میں موجود ہے اس پر مندرجہ ذیل عبارت ایک سنگ مرمر پر کنداں ہے۔
"مقبرۃ الشعرا پارسی زبان حسان العجم افضل الدین بدیل (ابراہیم) بن علی خاقانی حقائقی شیروانی"۔ اس لوح مزار پر نہ حاکم تبریز کا نام اور نہ ہی تاریخ وفات کندہ ہے۔

خاقانی کی شاعری

وہ شاعری و مخصوصاً قصیدہ خوانی میں ید طولیٰ رکھتا تھا۔ ہر چند کہ اس کے چچا کافی الدین عمر بن عثمان اور ابو العلاء گنجوی نے اس کو درس دیئے۔ لیکن وہ سنائی کو اپنا استاد معنوی سمجھتا تھا۔ اس ضمن میں وہ کہتا ہے۔

چون فلک دور سنائی درنوشت   آسمان چون من سخن گستر بزاد

اس کے دیوان میں قصاید کے علاوہ نظمیں، غزلیں، قطعات، ترجیعات اور رباعیات نہایت معیاری انداز میں ملتے ہیں۔ تحفتہ العراقین میں خاقانی نے اپنی شاعری میں جو جدید شاعری، جدید استعارات و کنایات کا استعمال کیا ہے اس کے ضمن میں کہا ہے۔

این یکی اکسیر نفس ناطقہ   برسر صدر زماں خواہم فشاند
این سہ گنج نفس از قصر دماغ   برامام انس و جاں خواہم فشاند
این دو طفل ھندو اندر مہد چشم   بر بزرگ خردہ داں خواہم فشاند

گفتگو کرنے کے لئے "اکسیر نفس ناطقہ" یہ اس عہد کی جدید اصطلاح ہے۔ جو اس سے پہلے کسی نے نہیں سنی تھی یا پھر دو خوبصورت آنکھوں کے لئے "دو طفل ھندو" اور گنج نفس یعنی قویٰ سہ گانہ۔ خاقانی کو گوناگوں علوم سے آشنائی تھی علم کلام، تفسیر، حدیث، فقہ، علم جغرافیہ پھر نجوم اور ستارہ شناسی میں وہ ماہر تھا۔ دور، دراز سے لوگ صرف اس کی زیارت کرنے کو آتے تھے۔ اسی لئے اس کے اشعار میں بھی نہایت دقیق علمی مضامین ملتے ہیں۔

قطرۂ کوثر و قطرۂ قند   از شکرہائے لفظ او اثر است
زحل زندقہ جہان بگرفت   اے کسان گوش بر زحل منہید

اس کی طبیعت میں مشکل پسندی بھی بہت تھی۔ مضامین تازہ کا اختراع، ترکیبات خاص اور لفظ و معنی میں جنگ کروانا اس کے لئے ایک مشغلہ تھا۔

دریا کشان کوہ جگر بادہ‌ی بکف — کز تف بکوہ لرزہ دریا برافگند
گلشر دانہ جام زخون سیا و شان — گنج فراسیاب بسیار برافگند
از جام دجلہ دجلہ کشد پس بروے خاک — از جرعہ بجہ بجہ ہویدا برافگند
جمشید شیب مقرعۂ پر صبحدم کندن — ترسم کہ نقرہ خنگ ببلا برافگند
یک گوش ماہی از ہمہ کس جیش اہرا — تاکر سینہ جیبہ سودا برافگند
چون بلبلہ دہان بدہان قدح برد — گویی کہ عروہ بال بعفرا برافگند
چنگی بدہ بلورین ماہی آبدار — چون آب لرزہ وقت محاکا برافگند
حلق رہلب بستہ طناہست اسیروار — کز درد حلق نالہ براعضا برافگند

مندرجہ بالا اشعار میں نقرہ خنگ سفید گھوڑے کو کہا ہے۔ ماہی آبدار سے مراد دونوں ہاتھوں کی دس انگلیاں ہیں۔ عروہ و عفرا عاشقوں کے نام ہیں اور محاکا، باہم گفتگو کرنے کے لئے استعمال ہوا ہے۔ اردو میں سودا نے بھی اس نہج میں گل کھلائے ہیں، جیسے مرغ قبلہ نما وغیرہ۔ ہرچند کہ خاقانی کی غزل نہایت مشکل ہے، لیکن اس عہد اور سیاسی ہرج و مرج دہنگامہ رستخیز میں وہ استاد ادب دکھائی دیتا ہے۔ خاقانی نے اپنے عہد کے ہیبت ناک حالات دیکھے ہیں۔ اس نے جنگ قتل و غارت گری و درباری فتنہ پرور و کینہ ساز افراد کو دیکھا، اس کے یہاں خطابت کا انداز نہیں ہے اکثر ایسا لگتا ہے کہ وہ خود سے مخاطب ہے اور جب تک وہ ان حوادث میں رہا کبھی افسردہ نہیں رہا غزلوں میں وہ روایتی عاشق بھی ہے اور کبھی ایک بانکا سجیلا سپاہی بھی۔

مجلسِ غم ساختہ است ومن چو بید سوختہ
تا من رواق کند شرگاں ے پالائے من
میر باران گردارم سپہرچون لفگند
این گرگ حشن بارانی ار موغائے من
علوی و روحانی و عیسیٰ و قدسی زادہ ام
کس بودہ درندہ اسطقیات استقصائے من
گر ہفت اقلیم کس دانم کہ گوید زین دوبیت
کاترم دارالقمامہ مسجد اقصائے من
ار مصاف بولہب فعلان پنچام عنان
چون رکاب مصطفیٰ شد طجا خائے من

خاقانی کے کلام میں مختلف علوم کو سمویا گیا ہے اور کیف و نشاط یا وصل کا ذکر ملتا ہے۔ اس نے اپنے جوان فرزند کی وفات تک کبھی اپنے کو افسردہ خیال نہیں کیا، لیکن آخر میں ایک تو اس کے عہد کے لوگوں نے اس کی قدر نہیں کی پھر پیری کا سہارا اور تنہا اولاد دنیا سے اٹھ گئی۔ اب اس کے کلام میں افسردگی حزن و ملال بہت ہے۔

برسر شہ رہ مجزہم کمر بر بندیم — رخت ہمت زر صدگاہ خطر بربندیم
لاشہ تن کہ بمضمار غم افتادہ رواست — رخش جاندار بدلش نعل سفر بربندیم
چون قلم سرزدہ گر یم نجونباب سیاہ — زیورے چوقلم از دود جگر بربندیم
این سہ جامۂ عروسان رادر پردۂ چشم — حالی از اشک ملیہاے گہر بربندیم
بلم گردون بتوا ینم شکست از توف آہ — راہ غم راتنو انیم کہ در بربندیم
چون جہاں را نظری سوے دلا نیست زاشک — دیدہ راسوے جہان راہ نظر بربندیم
نہ نہ مارا ہنری نیست کہ گردون شکنیم — خویشتن چند بلفتراک ہنر بربندیم
بگزا ریم زر چہرۂ خاقانی مرا — حلی آر یم و بتابوت لپسر بربندیم
چون سکندر پس ظلمات چہ ماندیم کندن — سدخون پیش دویا جوج بصر بربندیم
گوہر دانش و گنجور ہنر بودرشیہ — قبلۂ مادر و دستور پدر بودرشید

اس طرح سے آخر عمر میں تقریباً ہر نظم میں بیٹے کے لئے اس نے خون کے آنسو روئے ہیں۔ مطالعہ ادب میں اخلاق، ادیب کی شخصیت کے خارجی اور داخلی پہلو اس کے عہد و معاشرے کا پورا پورا اندازہ لگانا بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ خاقانی کی پوری شاعری کو دیکھنے اور اس میں ڈوبنے اور اس کی بلند آہنگ رجز خوانی کی جھنکار میں اپنے کو جذب کرنے کے بعد آہستگی سے اس کی تہ در تہ گہرائیوں تک پہنچا جاسکتا ہے۔ اس کی غزلوں میں حکمت اور دانش کے اعلی نمونے ملتے ہیں۔

مشکل حال چنان نیست کہ سرباز کنم — عمردر سرشدہ بینم چونظر باز کنم
برجہان می نکنم باز بہ کبار دو چشم — چشم ورد عدمم باد اگر بازکنم
ازسر غیرت چشمی بجزد بردوزم — وزپی عبرت چشمی بخطر بازکنم
ہفت دربستمٔ برخلق و اگر آہ زنم — ہفت پردہ کہ فلک راست زبر بازکنم
مردم چشم مرا چشم بدمردم کشت — پس بمردم بچہ دل چشم وگر بازکنم
زآهنین جان کہ درین غم دل خاقانی است — خانہ آتش زدہ بنیند چودر بازکنم
بروم برسر خاک پسر خاک پسر — کفن خونین ازروی پسر بازکنم

اے مہ نور شبستان پدر چون شدائی — وی عطارد زبستان پدر چون شدائی

خاقانی کے کلام سے ایسا لگتا ہے کہ وہ کسی عظیم انقلابی کی لے اور الہامی ہے۔ اس نے اپنے دور کے مظالم اور تشدادت کے سامنے کبھی سرخم نہیں کیا۔ اس نے اپنے اندر سطحیت اور فرومائیگی نہ آنے دی۔ اس نے تمام زندگی سنجیدگی توازن اور شائستگی قائم رکھی ایسا ہی انعکاس اس کی شاعری میں عیاں ہے۔ فارسی کے متقدین شعرا میں خاقانی کا ایسا جدید میلان اور نیا انداز و نیالب و لہجہ دوسرے بڑے شعرا میں نہیں ملتا ہے۔ اس لئے وہ تاحشر زندہ و پایندہ رہے گا۔

خاقانی کے ادبی معرکے اور ہجو گوئی

خاقانی کے متعلق براؤن نے تاریخ ادبیات فارسی میں لکھا ہے کہ "اس کے سامنے جو بھی آیا اس پر اس کا قلم ایک شمشیر براں کی مانند چلا اور

صفایا کر دیا" ۔ لیکن خاقانی کی ادبی نوک جھوک خود اس کے استاد ابو العلا اور رشید وطواط سے بہت چلی ۔ ہجو در ہجو لکھی گئی اور زبان درازی کا جو سلسلہ چلا اس کے آگے دوسری تمام ہجویات ہیچ ہو کر رہ جاتی ہیں ۔ خاقانی چونکہ سنائی کا عقیدت مند تھا اور وطواط سنائی کا نقاد تھا وہ سنائی کے کلام میں ہزاروں نقص نکالتا تھا اور بر عکس اس کے وطواط مسعود سعد سلمان کے کلام سے متاثر تھا اور خاقانی اس کو شاعری تسلیم نہیں کرتا تھا ۔ چونکہ وطواط کے معنی ہیں (چڑیا) اس لئے خاقانی نے جب بھی وطواط کی ہجو کی ہے اس کو موذی جانوروں کے ہمسر قرار دیا ہے ۔ اس نے وطواط کی تذلیل کے لئے ایک طویل قطعہ میں کاف تصغیر سے کام لیا ہے تاکہ وطواط کے لئے جواب لکھنا دشوار ہو جائے اس لئے یہ قطعہ اپنی قسم کا پہلا ہجو یہ قطعہ ہے اور رشید وطواط پہلا شاعر ہے جو مہجو (جس کو ہجو میں ہدف ملامت بنایا جائے) ہوا اور وہ بہت ذلیل ہوا وہ خاقانی کو کبھی جواب نہیں دے پایا ۔

این گربہ چشمک این سگک عوری عرک ۔۔۔ سگسارک تختنک وزشت کافرک
باشن پلنگ سارک و روباہ صبعک است ۔۔۔ این خوک گردنگ سگک رمنہ گوہرک ا
بودہ سگ رمندہ رکنون ۔ تحت مس ۔۔۔ شیرک شد است و گرگک و از ہر دو بد ترک
خرگوشک است جنس زن و مرد در دو وقت ۔۔۔ ہم حیض و ہم زناش گہی مادہ گہ نرک
چون یوزک قی جہد ار دم آہواں ۔۔۔ مادوستان رود گفتار در برک
گرد غزالکان و گوران بزم شاہ ۔۔۔ محلی کند چو گور خرک کرد مادرک
خاقانیا گہ مکس او ارسگان کیت ۔۔۔ خود صید کی کند سگک استخوان خورک
سگ عقعقک کند چو برد مالکی دہی ۔۔۔ دم لالکک کند بنشیند پس درک
میزاں حکمتی وترا ردلست رحم ۔۔۔ زین شولہ فعل عقربک شوم نشترک

اس قطعہ میں وطواط کو گربہ چشم، سگ مامرد، چہتار و ماطمع، سور کی گردن والا، گیدڑ، بھیڑیا، مندر، ریچھ، خرگوش، ہرن اور گور خر وغیرہ سے تشبیہ دی ہے اور حسن بیان یہ ہے کہ مثلاً وطواط الو کی طرح سے بجائے حامدائی سے عاری ہے ۔ وہ کوے کی طرح سے نحس خور ہے اور حاسد ہے ۔ مرغ کی مانند گھٹیا اور رائی ہے ۔ قمری کی طرح شوخ و مسخرہ اور بے شرم ہے طوطے کی طرح چغل خور ہے ۔ آخر میں کہتا ہے کہ جب تک خاقانی مانند طبل سخن سنج ہے رشید قرتی (مار کاپچہ) کی طرح سے ہے اور حب سے یہ ماز کاپچہ خاقانی ایسے سفید شاہیں کا حریف بنا اس کا منہ سیاہ ہو چکا ہے اور اب وہ دن دور نہیں ہے کہ جب شہنشاہ کی تلوار اس کا سر کسی چھگاوڑ کی دم کی طرح سے دو نیم کر دے اور ذیل کے اشعار میں وطواط کو گربہ چشم (بلی کی آنکھ والا) چوہا بتایا ہے وغیرہ ۔

این عر غر چہ دمی است ۔۔۔ میست اور راچو ہمائے اصل کریم
چوں کلاعست کس حوار و حسود ۔۔۔ چوں عروس است زنا کار و لئیم
نیست طرۂ شرف و عنقا مام ۔۔۔ ہست ہدہد لقب و کرگس خیم
گر چو دبہک ار شلاح شاح ۔۔۔ گاہ چوں شب پرک از تیم بہ تیم
حواجہ موشی است ریزر بکمیں ۔۔۔ گربہ چشم و پلنگ خشم ازکین
گربہ موش حور لیے دیدی ۔۔۔ ایم یکی موش گربہ چشم ببین

خواجہ یعنی رشید وطواط گھات میں بیٹھا ہوا ایک چوہا ہے ۔ وہ بغض و عناد کی وجہ سے بلی جیسی آنکھوں والا اور چیتے جیسے غصہ والا نظر آرہا ہے ۔ ویسے تو چوہے کھانے والی بلیاں بہت دیکھی ہوں گی اب ذرا بلی کی آنکھوں والا چوہا بھی دیکھ لے ۔

خاقانی کو بادشاہِ وقت خاقانِ اعظم منوچہر سے تعارف خود اس کے استاد اور خسر ابو لعلا نے کروایا تھا، لیکن اپنی قابلیت کی وجہ سے وہ استاد سے کہیں زیادہ آگے بڑھ جاتا ہے۔ اور اسی بنا پر تمام زندگی استاد اور شاگردوں کے درمیان شعری جدال رہی۔ براؤن کے بقول اس لڑائی کا آغاز ابو لعلا نے کیا۔ لیکن پھر خاقانی نے جوابی ہجو کا یلغار نہایت تیز کیا۔ خانیکوف کے مطابق شاگرد نے استاد پر ساڑھے پانچ سو ہجووں کے وار کئے ہیں۔ آغاز کے لئے کہا جاتا ہے کہ خاقانی کے استاد اور خسر ابو لعلا گنجوی نے ذیل کی رباعی کہہ کر خاقانی کے روبرو طبل جنگ بجایا تھا اور اس سرخ جھنڈی کے لہراتے ہی یورش شروع ہو گئی۔ لیکن ابو العلا کی یہ رباعی ادب اور عفت کلام کی حامل ہے۔

خاقانیا اگرچہ سخن نیک دانیا — یک نکتہ گویمت بشنو رایگانیا
ہجو کسی مکن کہ زتو مہ بود بہ سن — شاید کہ او پدر بود و تو نہ دانیا

(اے خاقانی اگرچہ تو شعر اچھے کہہ لیتا ہے، تاہم میں تجھے مفت میں ایک پتے کی بات بتاتا ہوں۔ وہ یہ کہ اپنے بڑوں کی کبھی ہجو نہ کرنا، کیونکہ ممکن ہے وہ رشتہ میں تیرا باپ ہو اور تجھے اس بات کا علم نہ ہو۔) اس ادبی نوک جھوک میں خاقانی نے بعض بڑی ابلہی انداز کی اور ناشائستہ باتیں ابو العلا سے منسوب کی ہیں جو کسی کے لئے بھی زیب نہیں دیتا۔ خاقانی نے علمائے شہر کو بھی ابو العلا کے خلاف ورغلانے کی کوشش کی ہے اور الزام عائد کیا ہے کہ وہ نعود باللہ پیغمبرؐ اسلام کے بھی خلاف بکواس کیا کرتا ہے۔ لیکن اس کا اثر ابو العلا پر نہیں پڑا کیونکہ الزام تراشی شاید زیب شاعری کے لئے ہو

بینی سگ گنجہ را درین کوی — ہم سرخ قفا وہم سیہ روی
آں ملحد ابوالعلای سافل — چون وحشی وبہیمہ غفل وغافل
غرچہ و غرچہ ای زلوری — غوری سگ و غول واصل غوری
چون آن سگ غوری از جہان زاد — بمشیرۂ شیخ نجدی افتاد
سگزی و چوسگزیان محتال — پروردۂ شیر سگ علی الحال

اپنے ایک مدحیہ قصیدے میں خاقانی نے اپنے آلام و مصائب کا ذکر کر کے ان سب صعوبتوں کا ذمہ دار ابو العلا کو ٹھہرایا ہے۔ اس کے علاوہ گنجہ جہاں کا وہ رہنے والا تھا (گنجہ روسی آزاد ریاست آذربیجان کا ایک مشہور شہر ہے جہاں آج بھی فارسی زبان بولی جاتی ہے اور فارسی کے شعرا و ادبا آج بھی اس زباں کو فروغ دے رہے ہیں۔ اس کے علاوہ گنجہ سے فارسی زبان کے رسالے بھی نکلتے ہیں۔ نظامی گنجوی بھی اسی شہر کا مشہور دانشور اور شاعر تھا۔) اس کو سگ گنجہ اور اپنے ایک دوسرے حریف مجیر بیلقانی کو خیر روستا (دیہاتی گدھا) کہا ہے۔ خاقانی نے کہا ہے کہ اگر کتا دریا سے پانی پی لے تو دریا کا پانی آب رواں ہے وہ کثیف نہیں ہوتا اور اگر گدھے کو جنت میں داخل کر دیا جائے تو خلد بریں کی عظمت میں کمی نہیں آتی۔ یہ دونوں شاعر مکھی کی طرح خوانِ شاعری کو متعفن کر رہے ہیں اور ٹڈی کی مانند دین کی فصل کی رطوبت و نمو کو ختم کر رہے ہیں۔

رنج و الم راسبب گردش ایام نیست — فعل سگ گنجہ است قدح خر روستا
خود بولوغ سگی بحر نگردد نجس — خود بوجود خری خلدنیا بدوبا
این چون مگس میکند خوان سخن راعفن — دان چون ملخ می بردکشتۂ دین رانفا

خاقانی کی ہجو گوئی سے اگر فحش کلامی کو جدا کر لیا جائے تو اس نے زبان و بیان کی بڑی خدمت کی ہے۔ جدید خیالات کو طنزیہ اشعار کے پیکر میں ڈھالا ہے۔ انوکھی اور دلچسپ ترکیبیں تراشی گئی ہیں۔ خاقانی قصیدے اور غزل گوئی میں نہایت بانکپن اور شاعرانہ تیور رکھتا ہے وہ دانشورانہ مزاج کا رچا ہوا شعور رکھتا ہے۔ اس نے اپنے بعد آنے والے ہر شاعر کو کلاسیکی روایات، سیاسی افکار اور ان کی معنویت سے پوری طرح سے آگاہ کیا۔ اس کے کلام سے اس عہد تہذیب اور روایات کا پس منظر سامنے آتا ہے۔ وہ اپنے عہد کا نقیب تھا۔ وہ الفاظ و بندشوں کو نہایت غور و فکر سے تجویز کرتا ہے اور کاریگر کی طرح ان کو اشعار میں جڑ دیتا ہے۔ الفاظ میں شوکت و رفعت، بندوں میں جدت و ندرت ہوتی ہے۔ اس کی ہجو گوئی میں دی جانے والی تشبیہات فطرت کے مشاہدے کا نتیجہ معلوم ہوتی ہیں۔ وہ اپنے افکار کی عجب شان و زور و شور سے اور نہایت تزک و احتشام سے ترجمانی کرتا ہے جس سے قاری یا سامع مرعوب ہو جاتا ہے۔ یہ ہنگامہ خیزی یہ ولولہ یہ طنطنہ فارسی کے کسی دوسرے شاعر کو نصیب نہیں ہے۔

پروفیسر جمیل ملک

ایک کرمک شب تاب۔ بخش لائلپوری

بخش لائلپوری اپنے وطن پاکستان کے رہنے والوں اور لکھنے والوں کے لئے تو شاید ایسا نام نہ ہو جو بار بار نظروں کے سامنے آتا ہو اور از بر ہو جاتا ہو مگر وہ اس لحاظ سے ضرور منفرد اور ممتاز ہے کہ برسوں وطن سے دوری کا عذاب سہنے کے باوجود چمن زار وطن کی پرورش پر تازہ گلاب کھلانے کا آرزومند ہے۔ اس کی یہ آرزومندی ہی اس کے فکر و فن کا سب سے بڑا محرک بھی ہے اور فصیل شہر سے دور ہونے کے باوصف اُسے ہر دم وطن کی بے پناہ محبت سے سرشار بھی رکھتی ہے مگر یہ ایسی سرشاری ہے جو دل فگاری کے راستے سے ہو کر گزرتی ہے۔ اسے کھلتی ہوئی شفق صبح کے پیش منظر میں قتل گاہوں میں بہتے ہوئے لہو کی سرخی اتنی نمایاں اور جاں سوز نظر آتی ہے کہ اس سیل شفق کے لہو میں ڈوب کر ابھرنے کا انداز ہی اس کے لئے گل افروزی اور جہاں تابی کا پیش خیمہ بن جاتا ہے۔ جن قتل گاہوں میں بخش لائلپوری کے پیش رووں نے علم گرانے کے تمام اسباب پیدا کر دیئے گئے تھے انہیں شہادت گاہوں میں بخش لائلپوری جیسے جواں شاعروں اور فن کاروں نے بڑے والہانہ انداز سے آگے بڑھ کر یہ علم سنبھال لئے ہیں اور اب ایک مدت سے ان پرچموں پر شہیدوں کے منور چہروں کے نقوش اتار کر اس کھلتی ہوئی شفق فردا کے لہو لہو سیندور سے سنوار اور نکھار رہے ہیں۔ بخش لائلپوری اپنے نظریہ۔ فن اور منصب فن کے سلسلے میں اس قدر واضح نقطہ۔ نظر کا حامل فن کار ہے کہ اس نے بغیر کسی فکری الجھاؤ کے اپنی غزل کی اساس خود ہی استوار کر دی ہے

مہکا ہوا لہو میں ہے دامن خیال کا
خونساری، غزل مرے فن کی اساس ہے

بخش لائلپوری کی شاعری میں ایک نقطہ مستنیر کی طرح ابھر کر طلوع فردا کی صورت میں ڈھلتا چلا جا رہا ہے اس کا یہ نقطہ۔ نظر اس کے وطن کی مٹی ہی سے تیار ہوا ہے اور اس کی پہلی اڑان بھی وطن ہی کی فضاؤں کی رہین منت ہے۔ غالب نے جس گلشن ناآفریدہ کا خواب دیکھا تھا اقبال نے جس سلطانی۔ جمہور کے زمانے کا افق روشن کیا تھا اور اس روشن افق سے ابھرنے والے آفتاب کی کرنوں کو جس طرح مسلسل زنجیر کرنے کی کوشش کی جاتی رہی ہے اور ان کرنوں کو بار بار زنجیروں سے رہائی حاصل کرنے کے لئے فیض اور اس کے ہم قدم فنکاروں اور شاعروں نے متاع لوح و قلم چھن جانے کے باوجود جس طرح ہر حلقہ۔ زنجیر میں اپنی زبان رکھ دی ہے وہی زبان ایک تابناک درخشے کی روشنیوں اور رنگوں کو سمیٹتی ہوئی ایک فکر۔ حق کے ساتھ آنے والی نسلوں کی شاعری میں گونج بن کر پھیل رہی ہے۔ بخش لائلپوری کی غزل اس گونج کو اور زیادہ دلگیر اور آفاق گیر بنانے والی ایک صدا ہی نہیں بلکہ ایک صدائے بازگشت بھی ہے جو ایک آفاق گیر احتجاج میں ڈھل کر اس کی غزل کو لہو لہان کرتی ہوئی روداد شہر کے ساتھ ساتھ اس کی روداد حیات کا اشاریہ بھی بن جاتی ہے

فصیل شہر پہ روداد شہر کندہ تھی
حدود شہر میں اے دوست! میں گیا ہی نہیں

وطن سے دور رہ کر بھی سرزمین وطن کی ایک ایک دھڑکن اور ایک ایک زخم کا حساب رکھنے کا یہ تخلیقی عمل ایسا دلپذیر اور جانگداز ہے کہ ہمیں بخش لائلپوری کی بہت دور سے ابھرتی ہوئی آواز بھی بہت قریب سے آتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ اس رویے سے شاعر کی اپنے نظریہ۔ فن ہی سے نہیں بلکہ اپنے وطن سے شدید وابستگی کا اندازہ بھی لگایا جاسکتا ہے مگر یہ وابستگی صرف وطن سے اظہار محبت کرنے پر ہی ختم نہیں ہو جاتی بلکہ اظہار

محبت تو اس کی شاعری میں اس وابستگی کا نکتہ آغاز ہے۔ ارض وطن اور جمہور وطن سے گہری اور حقیقی وابستگی کا اصل پیمانہ تو وہ تمام دار و رسن کی آزمائشیں ہیں جن کے ایک ایک جاں گسل مرحلے سے شاعر کو گزرنا پڑتا ہے آزمائش دار و رسن کے ان سارے مراحل سے گزرتے ہوئے اگرچہ اسے بار بار تلخی کام و دہن کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے جس سے اس کی غزل کا لب و لہجہ بھی متاثر ہوتا ہے مگر چونکہ اس کی یہ ساری جدو جہد اس کے بے پناہ خلوص پر مبنی ہے اس لئے وہ جب آزمائش دار و رسن سے گزرنے کے عمل کو تلخی کام و دہن سے ہم آمیز و ہم آہنگ کرتا ہے تو اس کی آواز کا تخلیقی زہر سقراط کے پیالے میں گھل مل کر ایثار و صداقت کے ایک ایسے امرت کی صورت اختیار کر لیتا ہے جو اس کی غزل کے ایک ایک لفظ سے ٹپکتا ہوا صداقت شعاروں کی زبانوں پر تو رس گھول دیتا ہے مگر حسن و خیر اور سچائی کے قاتلوں کے رگ و پے میں زہر بن کر اتر جاتا ہے۔ بخش لائلپوری کی غزل کا یہی کٹیلا مگر نجیلا رویہ اور لب و لہجہ جہاں اس کی نظریاتی انفرادیت کے لئے ایک ڈھال کا کام دیتا ہے وہاں اس کے نظریاتی حریفوں کے لئے ایک شمشیر برہنہ کا درجہ بھی رکھتا ہے۔

انا کے تاج محل کا وہ پاسباں ٹھہرا – ضمیر جس نے سجا کے دکاں پہ رکھا ہے
زکوۃ رزق پہ قائم حیات ہے جن کی – انا کے کیف سے وہ شخص آشنا ہی نہیں
فراز دار پہ لائے تو ہیں رفیق مجھے – مرے نصیب میں یارب! کفن لہو کا بھی ہو
آنکھیں یزید وقت کی پرنم نہ ہوسکیں – ہر کربلا کا سانحہ مجھ پر گزر گیا
جس گلی میں پتھروں کا ڈھیر ہے – اس گلی میں ہم برہنہ سر چلے
ہمیں تھے وہ جو لہو کے دیئے جلا کے چلے – ہمارے سر پہ تھا جوش جنوں سوار بہت
سگان شہر کو پابستہ رسن کردو – غریب شہر کا ناحق لہو بہانہ کرے
کچ قفس سے ہوگئے مانوس اس طرح – طوقِ گلو بھی جسم کا حصہ دکھائی دے
مرے بدن پہ گو نہیں اک تار بھی مگر – ہر جسم زر نگار پہ میرا لباس ہے

بخش لائلپوری کی غزل کا یہ انداز تخاطب ایک گہری، گمبھیر رات میں بشارتوں کی گواہی دینے والے ان اہل فکر و نظر پر ایک کاٹ دار طنز کے مترادف نہیں جو نئی نسل کو خواب گراں سے جگا کر خود گہری نیند سو رہے ہیں بلکہ حال کے اس آزمائشی لمحے میں ستم کی دار پر اذان دینے، سوئے ہوئے اذہاں کو جگانے، ایک نئے قافلہ سحر کو ترتیب دینے اور انہیں منزل سحر کی طرف آمادہ سفر کرنے کا اعلامیہ بھی ہے جس کی آواز پر سرگرم سفر ہوئے بغیر نہ تو آئین خانہ زاد کے تیور بدلے جاسکتے ہیں اور نہ ہی خلق خدا کو چہار سمت زنداں کی مسلسل ابھرتی ہوئی دیواروں سے رہائی دلائی جاسکتی ہے جس کے اندر برسوں سے جمہور کو یرغمال کی صورت نظر بند کر دیا گیا ہے۔ بخش لائلپوری کی غزل میں ایک ایسے معاشرے کے خد و خال بنتے اور بکھرتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں جو باہر سے سجا سجایا ہوا معاشرہ ہے مگر اندر سے ایک ایسے زنداں کی صورت اختیار کر چکا ہے جس میں حبس دوام کا عالم طاری ہے جہاں باد صبا کا انتظار کرتے کرتے جوش جنوں سے سرافراز دیوانوں کی بصارتیں بھی اجڑ گئی ہیں۔ جہاں ایک طرف صنعت گروں نے اپنی اپنی دکانوں کے آہنی حانوں میں بکاؤ مال کی طرح اپنے ضمیر بھی سجا رکھے ہیں تو دوسری طرف موسیٰ صفت لوگ فرعون زمانہ کو غرقاب کرنے کی دھن میں آج بھی قلزم خوں سے گزر جانے کے لئے جان کی بازی لگائے ہوئے ہیں۔ اور اس ایمان و یقین کی دولت سے سرشار ہیں کہ یہ بصارتوں کو اجاڑنے والے کبھی بصیرتوں کے افق سے ابھرنے والے آفتاب فردا کی شعاعوں کو روک نہیں سکتے کہ سورج کی شعاعوں کا راستہ روکنے والوں کو سورج خود اندھا کر دیتا ہے۔

کاٹ کر وہ روشنی کا سر چلے – وقت کے سورج کو اندھا کر چلے
اجڑ گئی ہے بصارت ہماری آنکھوں کی – کیا ہے ہم نے اجالوں کا انتظار بہت

ہمارے باب میں کیا کیا لکھا مورخ نے — کسی کتاب کو ہم نے کبھی پڑھا ہی نہیں
خوں سے ہے تربتر مرے افکار کا لباس — دارالقفس میں دل کا پرندہ دکھائی دے
مجھ کو صلیب سنگ میں گاڑا ہوا بدن — خوں رنگ انقلاب کا جھنڈا دکھائی دے
تعریف ہورہی ہے وہ جس کے لباس کی — وہ شخص مجھ کو شہر میں ننگا دکھائی دے
نیاز مند ستم کو ستم شعار بہت — جھکا ہے سر تو اٹھے ہیں صلیب و دار بہت
زبان مجھو کبھی ہے زبان حرفوں کی — فصیل شہر پہ چسپاں ہیں اشتہار بہت

بخش لائلپوری کی غزل بیسویں صدی کی آخری دہائی میں بھی اس ترقی پسند غزل کی یاد تازہ کر رہی ہے جس کا آغاز ۱۹۳۶ء میں ترقی پسند تحریک کے جلو میں ہوا تھا۔ اسی دور میں اقبال کی مفکرانہ غزل کے لب و لہجے سے مس ہو کر ترقی پسند غزل نے زمانے بھر کے جدید اور مستقبل کی سمت بڑھتے ہوئے تمام زندہ اور جاندار رویوں کو اپنے قالب میں جذب کر کے ثابت کر دیا تھا کہ وہ جدید اور ترقی پسند نظم کے ہمرکاب بھی اسی شان دلآویزی سے چل سکتی ہے بلکہ اپنا ایک منفرد تشخص پیدا کر کے اور اسے مستحکم میعادوں پر کھڑا کر کے آنے والی نسلوں کے حوالے بھی کر سکتی ہے۔ مگر اس حقیقت سے کون انکار کرے گا کہ حق بات کہنے کا بھی اپنا ایک کھرا، نوک اور نکھا ہوا انداز ہوتا ہے جس کی دھار صداقت کے جذبے سے تیز ہو کر زباں سے نکلتی ہے اور دل میں اترتی چلی جاتی ہے۔ یہ تلوار کسی مصلحت کی پابند نہیں ہوتی۔ اس کا رشتہ براہ راست اپنے نظریہ، فن کے حوالے سے اپنے عوام سے ہوتا ہے۔ اس زاویے سے دیکھیں تو بخش لائلپوری کی شاعری عوامی روپ ہی کا ایک ناگزیر حصہ ہے اور نظیر اکبرآبادی سے لے کر بخش لائلپوری تک ایسی تمام شاعری جس کا مخاطب عوام سے ہو، شاعری کے دوسرے اوصاف کے ساتھ خطابیہ لب و لہجہ کی ایک لہر اپنے اندر ضرور موج زن رکھتی ہے کہ اسی لہر کا نام زندگی ہے

بخش لائلپوری کی غزل میں نمو کا ایک چراغ روشن ہے اور اگر وہ اس اندھیری رات میں اپنے آپ کو کرمک شب تاب کہتا ہے تو وہ اس لئے کہ اس بے انت رات میں اسی کی طرح چند سرپھرے مگر اکیلے فنکاروں کی روشنی ان شب تاب کرمکوں ہی کے مماثل ہے جو بڑی بے خوفی سے اپنا یہ مختصر اثاثہ، جان لے کر اندھیروں کی بساط الٹنے کی جدوجہد میں ہمہ تن سرگرم عمل ہیں۔

تم روشنی میں رات کے اسباب کی طرح
ہم تیرگی میں کرمک شب تاب کی طرح
(بخش)

سلمان رشدی کا ایک ناول یا بارہ مسالوں کی چاٹ

قیصر تمکین (برطانیہ)

سلمان رشدی کا نیا ناول THE MOOR.S LAST SIGH اگست میں شائع ہوا۔ اس پر تبصرہ بھی میں نے یہاں کے ایک اخبار میں کیا جس نے مجھ کو تبصرے کے لیے یہ کتاب باقاعدہ بازار میں آنے سے قبل دی تھی۔ چونکہ یہ کتاب اردو والوں کے لیے بھی دلچسپی کا باعث ہو سکتی ہے اس لیے میں نے ایک جگہ اردو میں بھی اس پر کچھ باتیں لکھ کر دیں مگر ان لوگوں کو ڈر ہوا کہ رشدی کے نام سے ہی لوگ بھڑک اٹھیں گے۔

بات یہ ہے کہ بعض بدیہی وجوہ سے سلمان رشدی کا نام بجائے خود ایک خبریا "وقوعے" کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ اس کو ایک طرح سے بد قسمتی کی بات بھی کہا جا سکتا ہے کیونکہ اب وہ جو کچھ بھی لکھے گا اس کے ساتھ رسوائیوں کا ہالہ بھی چلے گا۔ چنانچہ ایک بڑی مشکل یہ ہے کہ اب رشدی کی تحریروں یا اس کے طرز نگارش اور فن کے بارے میں کچھ بھی کہنا اختلافات کو دعوت دینے کے برابر ہے۔ پھر بھی اردو دنیا کے سمجھداروں اور ادب شناسوں کے سامنے بعض باتیں کہی ہی جا سکتی ہیں۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ **سلمان رشدی نے انگریزی طرز تحریر میں اپنا ایک خاص انداز ایجاد کر لیا ہے۔ یہ ایسی بڑی بات ہے کہ خود پیدائشی انگریزی ادیبوں کو بھی برسوں کی ریاضت کے باوجود نہیں نصیب ہوتی ہے۔ وہ** ایک اچھا اور صاحب طرز کہانی کار ہے دوسرے انگریزی لکھنے والے۔ خاص طور پر غیر ملکی حضرات۔ ہمیشہ صاحب سے مرعوب رہتے اور ان کی لے میں اپنی بات کہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بات خواہ روتھ جھاب والا کی کیجئے یا آر کے نرائن۔ ڈام موریس اور وید مہتہ کی۔ یہ سب انگریزی سے مرعوب اور انگریزوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے تملق اور خوشامد کے دلدل میں پھنسے رہتے ہیں۔ یہ برائی صرف ہندوستان کے انگریزی لکھنے والوں کی ہی نہیں بلکہ دولت مشترکہ کے تمام انگریزی ادیبوں کی ہے۔ امریکا تک میں صاحب کی دھونس ہے اور انگریزی کا رعب پایا جاتا ہے **صرف دو اچھے ادیبوں نے انگریزی سے مرعوب ہوئے بغیر اس زبان پر خندہ زنی کی ہے اور وہ دونوں آئرستانی ہیں۔ یعنی برنارڈ شا اور آسکر وائلڈ رشدی اس معاملے میں شا اور آسکر وائلڈ کے برابر ہے۔**

رشدی کے یہاں کھلنڈرہ پن ہے، سنجیدگی کا فقدان ہے۔ ہندوستان کی علمی و تہذیبی روایات اور خاص طور پر علاقائی زبانوں اور تہذیبی ورثے سے عدم واقفیت کا احساس نمایاں ہے۔ لیکن ان سب خامیوں کے باوجود وہ بنیادی طور پر انگریزی زبان سے بخوبی واقف اور انگریزی کا صاحب طرز ناول نگار ہے۔ وہ شا اور آسکر وائلڈ کی طرح زبان کو اپنے طور پر استعمال کرتا ہے۔ اپنی ترکیبیں اور فقرے تراشتا ہے۔ اپنی بات کہتے ہوئے وہ انگریزی روزمرہ کے محاورے میں اضافہ کرتا ہے۔ اس معاملے میں وہ کانرڈ CONRAD سے بہتر ہے۔ بہتر آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، جنوبی افریقا اور کناڈا کے لکھنے والوں سے میلوں آگے اور انگریزوں کے احساس برتری یا مشفقانہ سرپرستی سے بالکل بے نیاز اور عصری ادبیات میں ایک نمایاں انفرادیت کا ادیب ہے۔

زبان کے بے تکلف استعمال کے علاوہ رشدی حیرت انگیز قوت تخیل کا بھی مالک ہے۔ اس کے پاس عربی اور سنسکرت کی روایات کا بیش بہا سرمایہ موجود ہے وہ ہندوستان ہی نہیں بلکہ ہمارے مشرق کے تمام تاریخی وعصری رجحانات سے واقف ہے۔ مگر سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ یہ ساری واقفیت انگریزی تراجم کے ذریعے ہے۔ اگر میر و غالب کے علاوہ اردو کے داستانی ادب سے اس کو براہ راست واقفیت ہوتی تو اس کے ادب میں جو ملغوبہ گاڑھا اور کثیف نظر آتا ہے وہ انتاب دھڑ، مجذوب کی بڑ، یا دیوانے کا خواب نہ لگتا۔ اس نے اسلام کے بارے میں مسیحی مبلغین کی چیزیں پڑھی

ہیں۔ اگر اس کو اردو تہذیب سے واقفیت ہوتی تو وہ اسلام کے بارے میں مغرب کے عام مفروضات جو "مسلمات" سمجھے جاتے ہیں ان سے سوتیلا رشتہ نہ رکھتا۔ وہ اردو سے بہرحال مرعوب ہے اور لکھنو والاز "Lucknow - Wallas" کے بارے میں حسرت آمیز استہزائیہ جملے لکھنے سے باز نہیں رہتا۔ پھر بھی قابل لحاظ بات یہ ہے کہ ایسے دور میں جب عام اور نیم تعلیم یافتہ اردو ادیب اپنی زبان میں زبردستی فقرے اور جملے ٹھونسنے میں مبتلا رہتے ہیں وہ انگریزی میں اردو کی ترکیبیں استعمال کرتا ہے۔

برصغیر کا ہر ادیب اردو تہذیب و روایت سے رسمی ہی سہی مگر براہ راست واقفیت رکھتا ہے۔ جو ہمہ گیری جواہر لال نہرو، ابو الکلام آزاد یا خود ٹیگور کی تخلیقات میں پائی جاتی ہے وہ اردو کی گنگا جمنی تہذیب کا احسان ہے۔ اسی تہذیب سے براہ راست ناواقفیت نے دیدھ بھتہ یا نراد چودھری کو یکرخہ بناکر رکھ دیا۔ سلمان رشدی کے یہاں اک ہمہ گیری ضرور ہے مگر اس میں ہمہ گیر اصل نہیں بلکہ سنی سنائی کا واضح تاثر ملتا ہے۔ خود اسی ناول میں منٹو کے افسانے "ٹوبہ ٹیک سنگھ" کا ذکر انگریزی ترجمے ہی کا مرہون منت ہے۔ یہ فرض کرنا کہ خود رشدی کو منٹو کی عظمت کا احساس ہو گا یا اس نے منٹو کے افسانے اردو میں پڑھے ہوں گے کسی طرح بھی درست نہیں ہو سکتا ہے۔

اردو کے ادیب شروع سے آج تک قدیم ہندوستانی تہذیب و ادب سے اچھی طرح واقف رہے ہیں خسرو سے لے کر محسن کاکوروی تک اور خاص طور پر جدوجہد آزادی کے زمانے میں تو اور بھی ہم کو ایک وقیع علمی و ادبی تہذیب کا احساس رہا۔ اردو محض عرب و عجم کی داستانوں کا نام نہیں بلکہ بھرت کی اخوت، رام چندر جی کی فرمانبرداری اور سیتا و ساوتری کی پاکیزگی و عصمت کی داستانوں اور مثالوں کا بھی نام ہے۔ ہندو تہذیب و مذہب وہ نہیں ہے جس کا ایک خفی احساس ہم کو بعض مغربی مصنفین کی تحریروں ملتا ہے۔ رشدی نے ظاہر ہے اسلام کی طرح ہندو تہذیب کے "منفی" پہلوؤں کا عرفان بھی انگریزی تحریروں کے ذریعے حاصل کیا ہے۔ اگر خود رشدی اپنے طرز تحریر کے ساتھ اس ملی جلی تہذیب کا بھی امین ہو تو وہ ایک ادبی تاج محل تخلیق کر سکتا ہے۔ پھر بھی ترجموں کے ذریعے ہی رشدی نے ہندوستانی فضاؤں اور تخیلات کے بارے میں جو کچھ پایا ہے اس کی انگریزی تحریر نے ان سب کو ایسی عالمی اہمیت اور ادبی ملاحت بخشی ہے جو فی زمانہ کسی کے پاس نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ بعض حضرات ہم سے اتفاق نہ کریں مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ اسرائیلی ادیب جو براہ راست انگریزی میں لکھ رہے ہیں (مثلاً مورد خانی رشلر) وہ بھی رشدی کی جامعیت کے سامنے طفل مکتب نظر آتے ہیں۔

زیر تبصرہ ناول The Moor's Last Sigh کی کہانی کی کئی تہیں ہیں مگر واضح اور نمایاں اثر بمبئی کے سیاسی و سماجی حلقوں اور اہمیت حاصل کرنے والی غنڈہ گردی اور بنیاد پرست فرقہ واریت ہے۔ ویسے تو کہانی قدیم ہسپانیہ سے نکالے ہوئے یہودیوں کے مسلمان اور مسیحی ہوئے اور پرتگال، مراد کوچین اور بمبئی کی مخصوص زمین دور تحریکوں اور افراد و طبقات کی بدقماشی کی پیچ در پیچ تنگ و تار سے منسلک ہے مگر ایک خاص بنیاد پرست تحریک کے جانے پہچانے اور زہر آلود لیڈروں کے بارے میں چست اور بے لاگ فقرے، جملے اور تبصرے ایک ایسی کڑوی گولی کی حیثیت رکھتے ہیں جو عام فرقہ پرستوں کی حلق سے کبھی نہ اتر پائے گی

ناول میں کمانڈر سارستی یا او شاسر سوتی کا ذکر ایسا نہیں ہے جس کو رسمی کردار نگاری سمجھا جائے۔ اس کے علاوہ پورے ناول میں شروع سے آخر تک مرچ مسالوں کی دھاک ہے مرکزی کردار کے ماں باپ کا پہلا جنسی اختلاط بھی ...م مسالوں کے بوروں پر ہوتا ہے ہندوستان میں پائے جانے والے تمام ممکنہ مسالوں کا ذکر ہے۔ دھنیا، جوز، جاوتری، تیزپتی، سیاہ مرچ، لونگ، بڑی الائچی، لہسن، ادرک، میتھی کالا نمک، املی، کھٹائی، شماقل، دارچینی۔ غرض یہ کہ ہر مسالے کا ذکر موجود ہے۔ ناول کے کئی صفحات ان مسالوں کی کثرت سے بھرے ہوئے ہیں۔ کسی ہوٹل کے باورچی خانے کی طرح پورے ناول پر مسالوں کی بو چھائی ہوئی ہے۔ چونکہ غیر ملکی اور خاص طور پر پرتگالی ان مسالوں کی تلاش میں ہندوستان آئے تھے اس

بقیہ صہ پر

سینۂ شمشیر اور جذبۂ بے اختیار شوق

پروفیسر گوپی چند نارنگ، نئی دہلی

شمشیر سنگھ شیر کے نام میں شمشیری کیا کم تھا کہ "شیر" کا اضافہ شاعری کی رو سے ہو گیا۔ وہ پنجابی کی راہ سے اردو میں آئے ہیں۔ شیر اور وہ بھی شمشیر بدست، اور شمشیر بھی شمشیروں یا تیغ دو دم، جو چلتی ہے تو کشتوں کے پشتے لگا دیتی ہے۔ لیکن شمشیر سنگھ شیر اس لحاظ سے اسم با مسمیٰ ہیں۔ یعنی سبھاؤ، برتاؤ اور اخلاق و اخلاص میں عین اپنے نام کے برعکس۔ نہایت نرم خو، صلح جو خدمت گزار، ملنسار، غم گسار، یاروں کے یار، لطف و کرم اور دردمندی اور دل آسائی کا پیکر جمیل۔ لیکن جب شعر پڑھنے اور لیک کہنے کا موقع ہو تو منظر نامہ پلٹ جاتا ہے آندھی، طوفان کی کیا حیثیت جو ان کے مقابل آئے۔ جس نے شمشیر کو پڑھتے ہوئے سنا ہو، وہ بجلی کی چمک، کڑک کو بھول سکتا ہے، لیکن شمشیر کی آواز کو نہیں بھول سکتا۔ شمشیر یہ بھی جانتے ہیں کہ مشاعروں کی داد و دہش کا شاعری سے وہی رشتہ ہے جو شاعری کا تفریح تماشے سے۔ شمشیر سنگھ شیر دہلی گوردوارہ پربندھک کمیٹی کے سرو پا یافتہ شاعر ہیں پنجابی میں انہوں نے کئی معرکے سر کیے ہیں۔ اب پنجابی سے اردو میں آئے ہیں تو اردو میں ان کو محبت کو جگہ ملنا ضروری ہے۔ اردو میں طاؤس و رباب آخر یا شمشیر و سناں اول کی گنجائش بہر حال ہے اور رہے گی۔

زیر نظر مجموعے میں شمشیر سنگھ شیر نے اپنی رباعیات اور قطعات یکجا کر دیے ہیں۔ ان کی خصوصیت یا خاصہ یہ ہے کہ ان میں موضوعی وحدت ہے، یعنی رباعیات ہوں یا قطعات، سب کے سب خمریات کی ذیل میں آتے ہیں۔ گویا شیر نے جام کے جام لنڈھائے ہیں اور یاران طریقت کو دعوت عام دی ہے۔

مشرقی شاعری میں خمریات کی روایت صدیوں سے چلی آتی ہے شعراء نے کیا کیا نکتے پیدا کیے ہیں اور کیا کیا مضمون آفرینی کی ہے۔ حالی کے لفظوں میں گویا یہ بھی نہایت چچوڑا ہوا موضوع ہے۔ کسی نئے شاعر کا اس میں گنجائش نکالنا آسان نہیں، مگر شیر کی ہمت کی داد دینا پڑتی ہے کہ ان کے زور طبع نے کیا کیا مواقع پیدا کیے ہیں اور کیا کیا جوہر نکالا ہے باتیں تو وہی ہوا کرتی ہیں، البتہ شاعر کا کام یہ ہے کہ وہ نیا رنگ آہنگ دے کر نئی کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔ شیر کی شاعری میں البتہ مرکزیت "میخانہ" کے تصور سے پیدا ہوتی ہے۔ ان کا سب سے زیادہ زور اس بات پر ہے کہ "میخانہ" وہ جگہ ہے، جہاں فرقے، برادری، ذات پات، اونچ نیچ کا فرق مٹ جاتا ہے۔ مفلس، مفلس نہیں رہتا۔ ایک دو جام میں شاہ جہاں بن جاتا ہے۔ ایک معمولی انساں کے قلب و نظر میں بھی اتنی وسعت پیدا ہو جاتی ہے کہ خود پیر مغاں منہ دیکھتا رہ جاتا ہے۔ ایک جگہ کہا ہے کہ عبادت کا اجر میخانہ ہی تو ہے۔ چنانچہ ایک دو جام سے نیت کیوں بھر جائے۔ میخانے کی اصل پہچان ہی یہی ہے کہ یہاں ہر چیز کچھ سے کچھ ہو جاتی ہے اور معمولی سا پیمانہ بھی بحر عدن کا درجہ حاصل کر لیتا ہے۔ جام شراب کو شبنم سے بھرا گلاب دیکھنا، میخانہ کا اعجاز ہے۔ اسی میں آفتاب بھی اترتا ہے وہ بھی عین رات کے وقت۔

ہوتا نہیں مفلس پہ بھی مفلس کا گماں
دو جام میں بن جاتا ہے وہ شاہ جہاں
میخانہ میں کرتا ہے سخاوت اتنی
منہ دیکھتا رہ جاتا ہے خود پیر مغاں

اک بحر عدن ہے کہ یہ پیمانہ ہے
سمجھے وہی اس کو کہ جو دیوانہ ہے
ہر چیز ہمیں نظر آتی ہے اور سے اور
یہ معجزہ بادہ و میخانہ ہے

منظور خدا ہوئی عبادت میری
لے آئی ہے میخانہ میں قسمت میری
اے ساقی میخانہ! پلا جام پہ جام
اک جام سے بھرتی نہیں نیت میری

ہوتی ہے برسات تو رک جاتے ہیں کام
بیکار سے بیٹھے نظر آتے ہیں عوام
میخانہ میں ہوتی ہے مگر بات الگ
میخوار نظر آتے ہیں باشیشہ و جام

اک جام شراب ناب دیکھا ہم نے
شبنم سے بھرا گلاب دیکھا ہم نے
میخانہ میں ہر سمت بھی جگ مگ جگ مگ
شب میں بھی اک آفتاب دیکھا ہم نے

میخوار اور میخانہ مثلث کی دو طرفین ہیں تو تیسرا نقطہ شیخ و واعظ کا تصور ہے جو طرفین کا رابطہ بھی ہے اور ان میں فصل کا باعث بھی۔ طرفین میں کشش کی معنویت اسی تیسرے عنصر سے ہے جو مرکزیت کا حامل ہے اس کو یوں بھی دیکھ سکتے ہیں کہ ایک قطب "مے و میخوار و میخانہ" تو دوسرا قطب "شیخ و محتسب" یہ روایتی منصب صدیوں سے چلا آتا ہے اور تقریباً کلیہ بن چکا ہے۔ لیکن بیالعنب و [illegible] پیدا کرے کی راہیں بھی کھلی ہیں۔ شیر نے بھی اپنے طور پر اس مضموں کو برتا ہے اور خوب خوب چہلیں کی ہیں شاعری کی حد تک یہ ایک خیالی کشاکش ہے جس کے تصور سے مضمون پیمائی کی راہیں کھل جاتی ہیں۔

جب تک کہ نہ کی شیخ نے اس حور کی بات
سنتے رہے آرام سے سب طور کی بات
مسجد سے نکل کر سوئے میخانہ چلے
جب شیخ نے کی دختر انگور کی بات

اے شیخ! تو استاد ہے مانتا ہوں
جو تیرا طریقہ ہے وہ سب جانتا ہوں
اک شخص ملا تھا کل میخانے میں
وہ کون تھا، خوب اسے پہچانتا ہوں

اس سے تو میرا برسوں کا یارانہ ہے
ہوشیار ہے، چالاک ہے فرزانہ ہے
جو راہ میں رکھا ہے وضو کا لوٹا
واللہ یہی شیخ کا پیمانہ ہے

گلچیں ہے یہ کلیوں کا تو پھولوں کا شباب
کچھ لوگ اسے کہتے ہیں کیوں خانہ خراب
اے شیر! خرابی کوئی ہوتی اس میں
پی جاتا نہ زاہد میرے حصے کی شراب

(ق)

پیری میں بھی حسیں ہیں راتیں، کمال ہے
ساقی سے حسن و عشق کی گھاتیں، کمال ہے
شب بھر تو شیر پیتے ہو میخانے میں شراب
کرتے ہو صبح وعظ کی باتیں، کمال ہے

عبادت جان کر یوں بادہ گلفام پیتا ہوں
کہ پوجا کرکے اور لے کے خدا کا نام پیتا ہوں
بس اتنا فرق ہے مجھ رند میں اور شیخ صاحب میں
وہ شب کو چھپ کے پیتے ہیں میں صبح و شام پیتا ہوں

جیسا کہ ابھی اوپر اشارہ کیا گیا ہے کہ "میخوار، مے و میخانہ ایک موضوعی واحدہ ہیں۔ یعنی وہی چیز میخانہ ہے وہی میخوار بھی ہے اور اگر مے کو مرکزی نقطہ خیال کریں تو مے ہی سے میخانہ ہے اور مے ہی سے میخوار ہے۔ مے نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ "شیشہ جو بغل میں ہے، اسی میں

تو پری ہے " ۔ اصلاً یہ پری عین ذات یا نفس کا تصور بھی ہے یا پھر قدروں کی قدر یعنی ہستی مطلق یا شعور کلی ۔ لیکن اس کا دوسرا پہلو مجازی اور زمینی بھی ہے ، یعنی ساقی پری پیکر یا معشوق گل اندام ۔ روایتی طور پر دلیل لانے کو انگور کی بیٹی بطور مظہر ہے یعنی دخت رز ۔ اس جہت نگاہ کی بھی جو جو جلوہ کشائی کی گئی ہے ، روایت اس پر گواہ ہے پھر بھی حسن ، حسن ہے ۔ اس کی جمال افروزی کا سلسلہ ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا ۔ بقول شمیر دخت انگور وہ حور ہے جو سراپا نور ہے

بوتل میں یہ کون رقص کرتی آئی
نظروں میں ادائیں اپنی بھرتی آئی
اے شمیر ! وہ انگور کی بیٹی تو نہیں
سو طرح سے جو سج سنورتی آئی

جب ڈھل کے پیالوں میں شراب آتی ہے
ہر لمحہ نئے طور سے اہراتی ہے
کرتی ہے اداؤں سے ہر ایک کو بے خود
سو بار سے ہر ایک پہ چھا جاتی ہے

الفت مجھے جنت کی حسیں حور سے ہے
محبوبہ ، خوش رنگ سے ، خوش نور سے ہے
میخانہ کی کہتے ہیں جسے لال پری
یارانہ اسی دختر انگور سے ہے

دنیا دیکھی ہے ، رندگانی دیکھی
ہر چیز حسیں اور سہانی دیکھی
پیری میں جواں شمیر ہوئے ہیں جب سے
انگور کی بیٹی کی جوانی دیکھی

مدت ہوئی دیکھے ہوئے برسات کی رات
کہ آؤگی جاں بن کے مری رات کی رات

اے دخت رز ! آکہ منائیں مل کر
بدلے ہوئے ماحول کے حالات کی رات

نام لے لے کر ہے جیتا کل جہاں اس حور کا
مے کے اندر جو ہے جلوہ ، وہ ہے کوہ طور کا
شمیر میخانے کے باہر ایک دیوانے ہوس
عشق سچا ہے اگر تو دختر انگور کا

اس مضموں کی ایک جہت یہ بھی ہے کہ شراب کو اگرچہ "شر" اور "آب" سے نسبت دی گئی ہے ، لیکن یہ صافی قلب و نظر ہے ۔ یہ باطن کو ہر آلائش سے دھو دیتی ہے اور اسے پاکیزہ و منزہ کر دیتی ہے ۔ یہ وہ آگ ہے جو ہر شر اور بدی کو جلا دیتی ہے ۔ شمیر نے اس پہلو کو بطور خاص ابھارا ہے کہ ریاکاری اور منافقت کا یہاں گزر نہیں ۔ قلقل مینا کی صدا در اصل حق حق ، کہنے پر اکساتی ہے ۔ جام دینا سے ساہ وہی شخص کر سکتا ہے جو خوش مذاق ہو اور سینہ بے کینہ رکھتا ہو ۔ فقط اتنا ہی نہیں ، دنیا جو بدی کا گھر ہے ، ظلمات کا درجہ رکھتی ہے ، اس میں مے گویا نوید سحر ہے ، اور تو اور ، زاہد بھی جو بیمار رہتا ہے ، جام آتے ہی اس کی نظروں میں بھی سویرا آجاتا ہے ۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ رند خراباتی کبھی ہمت سے کام نہیں لیتا ۔ میخانے میں بھلے ہی کچھ ملے نہ ملے ، مخلص اور غم خوار تو مل جاتے ہیں ۔ یہاں شر اور کینے کی گنجائش مطلق نہیں ۔ خلوص و محبت ، صدق و صفا ، الطاف و اکرام اور ہر خوبی اور ہر بھلائی کی توجہ اسی راہ سے کی جا سکتی ہے ۔ غور فرمائیے صفائے قلب ، دردمندی فراغت ، سخاوت ، فیاضی کیا ہے جو یہاں نہیں ۔

تم ساغر مے کو نہ کہو جام شراب
شر اس میں نہیں ہے یہ نہیں خانہ خراب
اس میں تو سمائی ہوئی ہے حسن کی روح
واجب ہے تم اس کو کہو جام شباب

دلدادہ و سرمست گلابی ہونا
گرویدہ ، ساغر خرابی ہونا

اوروں کے لیے ہزار نعمت تھی یہاں
تھا میرے مقدر میں شرابی ہونا

جب قلقل و مینا کی صدا آتی ہے
حق حق مجھے کہنے کو وہ اکساتی ہے
کانوں سے میرے دل میں اتر کر اے شمیر
ٹھٹھرے ہوئے جذبات کو گرماتی ہے

(ق)

ساقی سے کہو ساغر و مینا لائے
خوش منظر جام و آبگینہ لائے
آئے ہیں خوش مذاق پینے والے
دل میں نہ کسی سے بھی وہ کینہ لائے

ساقی جسے دو گھونٹ پلادیتا ہے
دنیا کا اسے شاہ بنادیتا ہے
سرمستی میں رند خرابات ، مگر
پائی ہوئی دولت کو لٹادیتا ہے

پینے سے ہمیں یار تو مل جاتے ہیں
ہمدرد و مددگار تو مل جاتے ہیں
میخانہ میں کچھ اور ملے یا نہ ملے
کچھ مخلص و غم خوار تو مل جاتے ہیں

آخری بات یہ ہے کہ جب مے اور میخانہ مضمون ہی ٹھہرا تو مضمون آفرینی کے لیے ہر تعبیر و توجیہ رحق گویا دلیل آخر دلیل ہے تو اس نوع کی شاعری میں گنجائش پیدا کرنا ممکن ہو سکتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ تہمت مدہوشی کی لگائی جاتی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ پینے سے تو ہوش آتا ہے۔ اسی طرح انسان کو یہ توفیق کہاں کہ ساغر اٹھائے اور پی سکے۔ یہ تو جب خدا مہربان ہوتا ہے، تب نصیب کھلتا ہے۔ ایک جگہ کہا ہے کہ لوگ کہتے ہیں کہ پینا چھوڑ دو دل کے مریض ہو۔ شاعر کہتا ہے کہ اگر لوگوں کی بات ماننے لگیں تو ایک دن لوگ یہ بھی کہیں گے کہ دل کے مریض ہو، جینا چھوڑ دو۔

دنیا میں پسند آئی گلابی مجھ کو
راس آیا ہے یہ آب شبابی مجھ کو
پیتا ہوں تو ہوش میں آجاتا ہوں
کہتے ہیں مگر لوگ شرابی مجھ کو

کب اٹھاتا ہوں میں ساغر اور کب پیتا ہوں میں
جب وہ ساقی جام چھلکاتا ہے تب پیتا ہوں میں
مجھ کو تو بے خود بناتا ہے جہان بے خودی
ہوش آتا ہے مجھے اے شمیر جب پیتا ہوں میں

کہتے ہیں پینا چھوڑدو دل کے مریض ہو
یعنی قرینہ چھوڑدو دل کے مریض ہو
ہر بات شمیر ان کی اگر مانتا گیا
کہہ دیں گے جینا چھوڑدو دل کے مریض ہو

بہرحال شمیر نے جو موضوع منتخب کیا ہے، اس کے دائرے میں رہتے ہوئے خوب خوب جوہر دکھائے ہیں اور اپنے زور تخیل اور رنگینی طبع کا بھرپور مظاہرہ کیا ہے۔ ان کی رباعیوں اور قطعوں سے اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ اردو شاعری کے رشتے کہاں کہاں، کس کس زبان سے مل جاتے ہیں۔ اردو کی کشادگی قلب و نظر کا ایک اسلوب یہ بھی ہے کہ "ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیے"۔ گلشن اردو کی بہار اس کی بوقلمونی سے ہے۔ اس میں جہاں نسرین و نسترن ہے وہاں چمپا، چمیلی جوہی و موگرا بھی ہے۔ گلشن اردو میں شمیر شمشیر بکف نہیں، جام بدست اور گل بداماں آئے ہیں۔ اسے آمدنت باعث آبادی ما۔

بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

محمد اعظم

یونائٹڈ نیوز آف انڈیا، نئی دہلی

میر صاحب نے کہا ہے

میں مست ہو بھی دیکھا ، آخر مزا نہیں ہے
ہشیاری کے برابر کوئی نشہ نہیں ہے

اس شعر میں ہوش مندی اور بیخودی کے مابین جو مساوات قائم کی گئی ہے، وہ میر صاحب کا ہی حصہ ہے ۔ لیکن حیرت اس بات پر ہے کہ معروض و موضوع، جنوں و خرد کو سیاہ و سفید میں دیکھنے کی روایت ہمارا پیچھا نہیں چھوڑتی ۔ لہذا جس طرح بگڑے ہوئے معاشروں کو درست کرنے کے لیے اوتار، پیمبروں کا آنا ضروری ہوتا ہے، اسی طرح مذکورہ مساوات کو استوار کرنے کے لیے **شمشیر سنگھ شیر** جیسے شاعروں کی ضرورت بھی برقرار ہی رہتی ہے جو بقول ندا فاضلی "سوچ سمجھ والوں کو تھوڑی سی نادانی دے کر" ان کی سوچ سمجھ کر معتبر بنا سکیں ۔

شیر صاحب محض خمریات کے شاعر نہیں ہیں ۔ ان کا کینوس خاصا وسیع ہے ۔ زیر نظر کتاب کو وقف مے و جام کرتے ہوئے انہوں نے شاعری کے اک توانا استعارے کے معنوی امکانات کو جس طرح کھنگالا ہے ، اس سے بہتوں کو سبق مل سکتا ہے ۔

سچ تو یہ ہے کہ شراب اپنے تلازمات کے ساتھ اردو شاعری کا اتنا وسیع استعارہ ہے کہ کبھی کبھی حسن و عشق کی وسیع کائنات بھی اس کے اندر سمٹی نظر آتی ہے ۔ فقر ہو کہ عبادت ، مشقت ہو کہ محبت ، انکساری ہو کہ کج کلاہی ، سیاست ہو کہ حکومت ۔ جینے کا کوئی بھی اسلوب ہو ، جو بھی خود میں ہے ، وہ بیخود ہے ' ایسے میں اگر کوئی شاعر اپنی کتاب وقف مے و جام کرے تو اسے ہوشیار ہی کہیں گے ۔

شیر صاحب ایک حساس اور دردمند دل کے مالک ہیں، زندگی کے تلخ حقائق ان کے اندر تلخی یا جارحیت نہیں پیدا کرتے ، نہ ہی وہ کوئی جھنڈا اٹھا کر نعرے لگاتے ہوئے "نظام کہنہ" کو بدلنے کے لیے میدان کارزار میں اترتے ہیں ۔ کیونکہ وہ خود اک نئی کائنات خلق کرنے پر قادر ہیں ۔

اک بحر عدن ہے کہ یہ پیمانہ ہے
سمجھے وہی اس کو کہ جو دیوانہ ہے
ہر چیز ہمیں نظر آتی ہے اور سے اور
یہ معجزۂ بادہ و میخانہ ہے !

شمشیر سنگھ شیر کے لئے شراب، زندگی سے فرار کا ذریعہ نہیں ۔ ان کی رندی و سرشاری، تصادم سے بچنے اور صلح کل پر عمل کرنے کا ایک وسیلہ ہے ۔

جیسی بھی ملے پیتے ہیں پینے والے
چین اور سکون کے ساتھ جینے والے
رہتے ہیں تصادم سے پرے وہ جیسے
طوفاں سے بچتے ہیں سفینے والے

شیر صاحب کے یہاں شراب اور اثرات شراب کے نہایت دلچسپ اور بامعنی پہلو جگہ جگہ بکھرے نظر آتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ قبل از اسلام عربوں میں شراب کو "اخلاقی" اعتبار سے بھی اس لیے قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا کہ وہ سخاوت میں اضافہ کر دیتی ہے۔ اسی لیے اس دور کے عرب شراب کو "کرم" بھی کہتے ہیں۔ اب شیر صاحب کی "کرم فرمائی" دیکھیے۔

برا کہتا ہے مے کو جو نہ اس نے بات جانی
بجھا دیتا ہے ہر اک آگ کو یہ آگ کا پانی
بہا کنجوس بھی گر شیر اس کو منہ لگالے تو
مے قیاس پل بھر میں ہے داتا مہادانی

لیکن کسی کو یہ گمان نہیں ہونا چاہیے کہ شراب کے مذکورہ اثرات عقل کے تعطل کا نتیجہ ہیں۔ شیر صاحب نے جابجا اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ بادہ نوشی کے لیے ظرف ضروری ہے۔

وہ بادہ ہو کہ سم، جو بھی ملا وہ پی لیا میں نے
جو لمحہ جس طرح آیا ہے، ویسا جی لیا میں نے
اگل دیتی ہے پی کر شیر ہر اک بات یہ دنیا
مگر میں نے تو جب بھی پی، زباں کو سی لیا میں نے

بات یہ ہے کہ شیر صاحب رند ہیں، شرابی نہیں ہیں اور ان کے آداب رندی، عبادت سے کم نہیں

میں بھولے سے کبھی مے کے جو اک دو جام پیتا ہوں
تو پوجا کر کے اور لے کے خدا کا نام پیتا ہوں
بس اتنا فرق ہے مجھ رند میں اور شیخ مسجد میں
وہ شب کو چھپ کے پیتا ہے، میں صبح و شام پیتا ہوں

اردو شاعری میں بڑی دلچسپ بات یہ رہی کہ ریاض خیرآبادی خمریات کے امام ٹھہرے، جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انہوں نے زندگی ایک بوند بھی شراب حلق کے نیچے نہیں اتاری۔ ستم بالائے ستم یہ کہ ان کی اس محرومی کو ان کی شاعری کی صفت قرار دیا جاتا ہے، لیکن سچ یہ ہے ریاض صاحب زندگی بھر شراب کے مضامین باندھا کیے۔ اچھے شعر گنتی کے ہی کہہ پائے۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ وہ

جام ہے توبہ شکن توبہ مری جام شکن ۔۔۔ سامنے ڈھیر ہیں ٹوٹے ہوئے پیمانوں کے

کہنے کے بعد اس توڑ پھوڑ سے توبہ کر کے دوسری طرف متوجہ ہو جاتے۔

میرا مقصد ریاض خیرآبادی کا شمشیر سنگھ شیر سے مقابلہ کرنا یا بلاوجہ ریاض کی شاعری میں نقص تلاش کرنا نہیں ہیں۔ صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ خمریات میں سرفہرست قرار دیے جانے والا شاعر جب اتنا تہی دامن ہو تو شاعری کا یہ توانا موضوع کس قدر تشنہ ہو گا۔

کہا جا سکتا ہے کہ ریاض کو یہ خطاب اس موضوع کے اشعار کی کثرت کی وجہ سے دیا گیا، کیونکہ دوسرے شعراء نے ان گنت اعلیٰ درجہ کے شعر کہنے کے باوجود اس استعارہ کو اس تواتر سے نہیں برتا تھا جتنا کہ ریاض نے برتا۔ تو اگر تخصیص کا معیار یہی ٹھہراؤ تو شمشیر سنگھ شیر کو کیا کہا جائے گا جن کی پوری کتاب ہی خمریات کے موضوع پر ہے؟

شاعر اور قاری کے درمیان زیادہ دیر تک نہ رہتے ہوئے مقدمہ نویس کے لیے یہی بہتر ہے کہ وہ متعلقہ کتاب سے بہتر طور پر لطیف اندوز ہونے کے لیے ایک ذہنی فضا تیار کرنے کی کوشش کرے۔ تو آئیے یہ کوشش خود شیر صاحب کے ذریعہ کی جائے

مجھ پر مرے ساقی نے ستم توڑا ہے
سر پر مرے اک کوہ الم توڑا ہے
کہنے کو توڑا ہے پیالہ اس نے
دراصل مرے ظرف کا دم توڑا ہے

پلا ساقی مجھے تو جام پر یہ جام پردے میں
کہ اچھا ہے وہی ہو جائے جو بھی کام پردے میں
خدا کے نام سے اور جام سے بس شیر واقف ہوں
مگر آتے ہیں لب پر یہ بھی دونوں نام پردے میں

یہ قطعات، خمریات کی رسمی شاعری سے جداگانہ اپنی علیحدہ فضاء رکھتے ہیں۔ مضامیں میں ندرت تازگی کے ساتھ جذبہ کی صداقت ایسی چیز ہے جو محسوس کی جا سکتی ہے۔ مثلاً

دنیا میں شیر دیکھئے دکھ بے حساب ہے
افکار و غم کا ایک فقط یہ جواب ہے
پی کر شراب تم انہیں گرنے سے روک لو
آنسو بہت ہیں قیمتی، سستی شراب ہے

خم خانہ شمشیر سنگھ شیر

خمریات کے طومار میں ایک اور اضافہ

از رئیس الدین فریدی

عام سے تو بڑے تیس مار خاں معلوم ہوتے ہیں اور تخلص سے بڑے دیدہ دلیر مگر یہ سب ظاہری چیزیں ہیں۔ وہ اصلاً شاعر ہیں اور شمشیر سے ان کا اتنا ہی تعلق ہے کہ دھاردار شعر لکھتے ہیں اور شیر کی دھاڑنے کی صفت شعر پڑھتے وقت حاصل ہو جاتی ہے۔ نسلی اور لسانی پہلو سے وہ پنجابی ہیں اس لیے سب سے پہلے پنجابی میں طبع آزمائی کی۔ اس کے بعد ہندی کا نمبر آیا اور جب جولانی طبع کے لیے یہ میداں کوتاہ نظر آئے تو اردو کو بھی فکر سخن کے دائرے میں لے لیا پہلا مجموعہ کلام صدائے دل کے نام سے شائع کیا اور اب خم خانہ کی صورت میں اس میں مزید اضافہ کر لیا۔ اور کلام کے معیار اور جوش کو دیکھ کر یہ کہنا مشکل نہیں کہ وہ آئندہ بھی اردو میں طبع آزمائی کرنے کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں اور چاہیں تو صدائے دل اور خم خانہ کے بعد فیض روحانی کی طرف بھی مائل ہو سکتے ہیں۔

اے فصل کرتے نہیں لگتی مار
نہ ہو اس سے مایوس امیدوار

اپنے نام کے عین مطابق خم خانہ تمامتر ایسے قطعات اور رباعیات پر مشتمل ہے جن میں شراب کی مدح و ثنا اور شراب نوشی کے فوائد کو اجاگر کیا گیا ہے اور چونکہ شیر صاحب جوش صاحب کی طرح گھڑی رکھ کر شراب پینے کے عادی بھی ہیں اس لیے شعری کیفیات اور سرخوشی کے عالم کو ان کے کلام میں رنگ ترنگ کا نام بھی دیا جا سکتا ہے چاہے ان کا مقصد نیک ہی ہو مگر نتیجہ دوسروں کو بگاڑنے کی صورت میں ہی ظاہر ہوگا جو تمام بزرگان دین بشمول گرونانک جی کی تعلیمات سے روگردانی ہی قرار پائے گا۔ یہ الزام یا اعتراض صرف سردار شیر پر ہی وارد نہیں ہوتا ہے بلکہ اس میں سیکڑوں برس میں ہزاروں نام شامل ہو چکے ہیں اور اس بدعت کی جڑیں بڑی گہری ہیں۔ جن کو اکثر شعرائے کرام کے علم و اطلاع کے لیے اختصار کے ساتھ بتا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

اسلام سے پہلے ساری دنیا گمراہی، عیاشی، فحاشی اور بدکرداری میں مبتلا تھی۔ اسلام نے اس کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا تو شراب اور بت پرستی کو حرام قرار دے دیا کیونکہ یہ دونوں خرابیوں کی جڑ تھیں۔ جب اسلام پھیلنا شروع ہوا اور ایرانی، اسرائیلی اور عیسائی بھی مسلمان ہوئے تو ان کے شرپسند عناصر نے اسلام کو روکنے اور زک پہونچانے کے لیے طرح طرح کی بدعتیں پیدا کیں تاکہ اسلام میں پھوٹ پڑے۔ بدقسمتی سے اس زمانے کے برائے نام مسلماں، بادشاہ، امیر، وزیر اور جاگیردار ان بدعتوں سے سب سے زیادہ متاثر ہوئے اور ان کے دربار عیاشی اور فحاشی کا اڈا بن گئے تو درباردار شاعروں نے بھی ان کی ہاں میں ہاں ملانا اور تہذیب و شائستگی کے گلے پر کند چھری چلانی شروع کر دی۔ شراب نوشی اور حسن پرستی سب سے پہلے فارسی شاعری میں گھسی۔ حد تو یہ ہے کہ حضرت حافظ شیرازی نے بھی جو شرابی نہ تھے اپنا دیوان جس غزل سے شروع کیا اس کے مطلع ہی میں ساقی سے جام شراب طلب کیا گیا ہے۔ پھر دوسرے فارسی شاعروں نے جو کچھ کیا اس کا گندا دفتر دنیا کے سامنے ہے۔ عمر خیام نے تو خمریات پر مشتمل رباعیوں کا پورا مجموعہ ہی مرتب کر ڈالا اور یوروپ کے اوباشوں نے جن کے لیے شراب غذا بھی ہے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا اور ساری دنیا میں پھیلا دیا۔ اس نے اسلامی تعلیمات سے جو ساری دنیا کی بھلائی کے لیے تھیں پیٹ بھر کے روگردانی کرتے ہوئے یہاں تک کہہ ڈالا

ابریق مئے مرا شکستی ربی
شاید کہ تو نیز بحث مستی ربی

(استغفراللہ ثم استغفراللہ)

کسی فارسی شاعری نے یہ جسارت کی کہ

ساقی بیار بادہ کہ ماہ صیام رفت

اور یہ روایت بھی گھڑی گئی کہ آگرے کے لال قلعے کی چھت پر چڑھ کر ہلال عید دیکھتے ہوئے نور جہاں نے کہا۔

ہلال عید بر اوج فلک ہویدا شد

اور اس میں جہانگیر کے نام سے یہ گرہ لگائی گئی کہ

کلید میکدہ گم گشتہ بود و پیدا شد

اردو شاعری چونکہ فارسی کی کوکھ سے نکلی ہے اور یہاں بھی اکثر حکمرانوں کی اخلاقی عادتیں ایران کے تابع رہی ہیں اس لیے یہاں کے شاعروں نے بھی عقل کی آنکھیں بند کر کے فارسی ہی کی نقل راچہ عقل شروع کر دی۔ غالب، داغ، جوش، فراق، جگر وغیرہ نے جو واقعی شراب نوش تھے اس نقل کم عقلی کو انتہا تک پہونچایا مگر جگر جنہوں نے جوانی میں کہا تھا۔

اے محتسب نہ پھینک مرے محتسب نہ پھینک
ظالم شراب ہے ارے ظالم شراب ہے

آخر عمر میں شراب نوشی سے تائب ہو کر علوئے اخلاق کے قائل ہو گئے تھے۔ چونکہ مغلیہ دور کے آخری دنوں میں ہندوستان خصوصاً دہلی اور ریاستوں میں اخلاقی زوال مکمل ہو چکا تھا اس لیے یہاں کے دربار بھی ایرانی رنگ میں رنگ گئے تھے۔ بعد میں امیروں، وزیروں اور جاگیرداروں نے شراب نوشی اور حسن پرستی کا شغل کثیف جاری رکھا اور ان کی دیکھا دیکھی عوام بھی اسی رنگ میں رنگتے چلے گئے اس لیے داد اور انعام کی لالچ میں اکثر شاعر بھی شراب اور بت پرستی کے ہمدرد ہی بنے رہے اور یہاں تک کہا گیا کہ

جی چاہتا ہے صنعت صانع پہ ہوں نثار
بت کو بٹھا کے سامنے یاد خدا کروں

ایک بڑے شاعر حضرت ریاض خیرآبادی تک جو بڑے پاکباز اور دیندار مشہور تھے خمریات کے شاعر اعظم کہے گئے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ کئی شاعروں نے شراب کا ذکر دوسرے معنوں میں بھی کیا مگر طوفان میں ایک دو پھولوں کو کون دیکھتا ؟ چنانچہ ذوق کے اس شعر کو

پیر مغاں کے پاس وہ دارو ہے جس سے ذوق
نامرد مرد پیر جواں مرد ہو گئے

نادانی کے طفیل شراب نوشی کی حمایت قرار دے رکھا ہے حالانکہ یہ شاہ ولی اللہؒ اور ان کے انگریزوں کے مخالف جانشینوں کی جہادی تبلیغ کو اجاگر کرتا ہے۔

اقبال شراب تو پیتے تھے مگر اپنی شاعری کو انہوں نے شراب نوشی اور بت پرستی کے بجائے روحانی اور اخلاقی اصلاح کا سرچشمہ بنائے رکھا۔ ان کا حسب ذیل شعر ان کے مزاج کا گواہ ہے۔

واعظ دلیل لائے جو مے کے جواز میں
اقبال کو یہ ضد ہے کہ پینا بھی چھوڑ دے

وہ وعظ کہہ کر لوگوں کو گمراہ کرنے والوں کے کتنے مخالف تھے۔

یہ تفصیل طلب اجمال میں نے فرض سمجھ کر سپرد قلم کر دیا ہے کسی کا دل دکھانے کے لیے نہیں اب اصل موضوع کے سلسلے میں یہ عرض ہے کہ شمشیر سنگھ شیر کی خمریاتی رباعیات اور قطعے فنی اعتبار سے کافی پسندیدہ ہیں۔ شراب نوشی کو انہوں نے اخلاقی پہلو نکالنے کے لیے استعمال کیا ہے جیسے اس قطعے میں

ہر ایک لمحہ کو اک سوغات سمجھا جی لیا میں نے
ملا جب زہر غم وہ بھی خوشی سے پی لیا میں نے
اگل دیتی ہے پی کر شیر ہر اک بات یہ دنیا
مگر میں نے تو جب بھی پی زباں کو سی لیا میں نے

(جی لیا میں نے۔ پنجابی زباں کے زیر اثر ضرور آگیا ہے مگر بات پتے کی کہی ہے واقعی دنیا کی حالت بیان کرنا ناممکن ہو چکا ہے)

یہ قطعہ بھی قابل غور ضرور ہے اگرچہ زندگی سے گریز کے جذبے پر مبنی ہے۔

زمانہ جانتا ہے یہ کہ میں پیتا پلاتا ہوں
گلہ جو اس کا کرتے ہیں انہیں میں خود ستاتا ہوں
کسی کا ڈوبنا اے شیر اب دیکھا نہیں جاتا
میں سورج ڈوبنے سے پہلے خود ہی ڈوب جاتا ہوں

کتاب میں سینکڑوں رباعیاں اور قطعات ہیں جن میں کافی شراب نوشی کی تلقین کے ساتھ احوال دنیا کی بھی غماز ہیں اور صرف شرابی کی شوریدہ سری سے دور نہیں۔ یہ بات ضرور ہے کہ ان کو علیحدہ علیحدہ ابواب میں تقسیم کر دیا جاتا تو بہتر ہوتا۔

بعض شعر قابل اعتراض ہو سکتے ہیں۔ مثلاً

منظور خدا نے کی عبادت میری
لے آ کوئی ہے سے خانے میں قسمت میری

مست آنکھیں ہیں تری یا کوثر و تسنیم ہیں
دیکھتے ہی دیکھتے زاہد شرابی ہوگیا

اللہ کے نام دیدے مولا کے نام دیدے
واعظ تو اپنے ہاتھوں سے ایک جام دیدے

توارد کی کچھ مثالیں بھی تلاش کی جاسکتی ہیں۔ مثلاً

جیسی بھی ملے پیتے ہیں پینے والے

اسی مضمون کا کسی بڑے شاعر کا یہ شعر پہلے سے موجود تھا۔

اچھی پی لی خراب پی لی
جیسی پائی شراب پی لی

خیام کی ایک رباعی کے دو مصرے جو پہلے تحریر کیے جاچکے ہیں

ابریق مئے مرا شکستی ربی
شاید کہ تو بیر ہمت مستی ربی

اس رباعی سے استفادے کی مثال

مجھ پر مرے ساقی نے ستم توڑا ہے
سر پر مرے اک کوہ الم توڑا ہے
کہنے کو تو توڑا ہے پیالہ اس نے
دراصل مرے ظرف کا دم توڑا ہے

ابتدائے کتاب میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، کمال احمد صدیقی محمد اعظم اور ڈاکٹر خورشید عالم کے تعارف اور مقدمے ہیں۔ جن میں سے ابتدائی تین مسوط ہیں پھر خود مصنف کا مختصر عرض حال ہے تعارف اور مقدمہ نگاروں نے تعریف میں مبالغے سے کام لیا ہے۔ مگر خود مصنف نے انکسار سے کام لیتے ہوئے لکھا ہے۔ زندگی بھر کے رندانہ تجربات کی بناء پر حقیقت کو شعروں میں ڈھال کر پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔ کس حد تک کامیاب ہوا ہوں یہ مجھ سے بہتر خم خانہ کا مطالعہ کرنے والے ہی بتاسکیں گے۔

مشرقی ہندوستان کا بہترین اور واحد بین الاقوامی اردو رسالہ

ماہنامہ انشاء کلکتہ

ISSN 0971 - 6009

جلد ۔ ۱۱ | جون ۱۹۹۶ء | شمارہ ٦

انشاء پبلی کیشنز

مدیر ف۔س۔اعجاز

فی شمارہ : ۸ روپئے

زر سالانہ : ۹۰ روپئے

مغربی ممالک سے : £ 12
or
US $ 20

رقومات بذریعہ منی آرڈر، بینک ڈرافٹ، چیک صرف "انشاء پبلی کیشنز" کے نام میں روانہ فرمائیں ورنہ قابل قبول نہ ہوں گی۔ برطانیہ سے BPO کے ذریعہ رقومات بھیجی جائیں۔

فہرست

ماہنامہ انشاء۔ انشاء پبلی کیشنز

خط و کتابت، مضامین بھیجنے اور ترسیل زر کا پتہ

۲۵۔ بی زکریا اسٹریٹ، کلکتہ ۷۰۰۰۷۳۔ فون ۲۵۔۴۶۱۶

خوابوں کے اسرار

نفسیاتی مضامین

مترجم: ف۔ س۔ اعجاز

گزشتہ شمارے میں اعلان کیا گیا تھا کہ کتاب جون ۹۶ء میں شائع ہوگی لیکن کتاب میں چند نئے اضافوں کے سبب اسکی اشاعت اب ستمبر میں ہوگی۔ کتاب میں ایک بہت اہم طبعزاد مضمون "ادب میں خواب کے اجزاء" بھی شامل کیا جارہا ہے۔ جس سے کتاب کی وقعت اور افادیت میں اضافہ ہو جائے گا۔ کتاب کی اشاعت سے پہلے یہ خصوصی مقالہ "کتاب نما" (نئی دہلی) میں پڑھا جاسکتا ہے۔ کتاب کی قیمت اندرون ملک ۵۰ اروپے ہوگی۔

کثیر جماعتی نظام

ہندوستان دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت ہے جس کا اپنا ایک آئین ہے اور اس آئین کے مطابق یہاں جمہوری نظام کام کرتا ہے۔ لیکن ملک کی سیاسی مشینری میں ۴۰ فیصد شہریوں کو کسی قسم کی دلچسپی نہیں ہے۔ یوں تو عام سیاسی شعور میں بہت اضافہ ہوا ہے۔ خواندگی کی شرح بھی پہلے سے کافی بڑھ گئی ہے، انتخابی اصلاحات میں بھی پیش رفت ہوئی ہے۔ ۱۸ سال کا ہو کر ایک شہری ووٹ دینے کا حقدار بن جاتا ہے۔ اس کے باوجود پارلیمنٹ کے ۱۱ویں الیکشن میں ۸۵ تا ۶۰ فی صد ووٹروں نے ہی حق رائے دہی استعمال کیا۔ اور اقتدار میں بٹوارہ اتنے ہی ووٹروں کی اکثریت کی بنیاد پر ہوا ہے۔ جمہوریت میں عددی نظام اس وقت فیصلہ کی صلاحیت کھو بیٹھتا ہے جب ووٹروں کی اکثریت اپنی رائے میں یک جہت نہیں رہ پاتی۔ اور اس کا دماغ کئی کئی خانوں میں بٹ جاتا ہے۔ موجودہ لوک سبھا کو ۴۰-۴۵ فی صد لوگوں کی تائید حاصل نہیں ہے۔ ان کا ووٹ نہ ڈالنا اس رجحان کا پتہ دیتا ہے کہ وہ ایسے سسٹم سے عملاً لاتعلق ہیں جو اب تک ان کا مسیحا ثابت نہیں ہوا۔ بلکہ اپنے مقاصد کی قربان گاہ پر ووٹروں کے مفادات کی بھینٹ چڑھاتا آیا ہے اور ہر معاملے میں ان سے فراڈ کرتا رہا ہے۔

جو ۵۵ تا ۶۰ فی صد لوگ ووٹ ڈالتے ہیں انہیں بہر حال ویش کے نظام میں عملی دلچسپی ہے، ان میں سے اکثریت کی رائے ہی جمہور کی تقدیر کا فیصلہ کرتی ہے۔ ان ہی کے فیصلے ان پر بھی لاگو ہوتے ہیں جو ووٹ نہیں ڈالتے۔ ۵۵ تا ۶۰ فی صد پولنگ کا تناسب برا نہیں ہے لیکن ۷۵ تا ۸۰ فی صد پولنگ سے اس بات کا ثبوت فراہم ہوگا کہ ملک میں جمہوریت کی جڑیں کتنی گہری اور مضبوط ہیں۔ زیادہ مستحکم اور پائدار حکومت کے لئے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو الیکشن میں حصہ لینا چاہئے۔ نیز اپنے اور ملک کے بہتر مستقبل کے لئے اپنی قیمتی رائے کا استعمال کرنا چاہئے۔

حالیہ پارلیمانی الیکشن کے نتائج سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوستان کا ژولیدہ جماعتی نظام جمہوری عمل میں لوگوں کی عدم دلچسپی کا سبب بنا ہوا ہے۔ سیاست ایک ہوم انڈسٹری بن کر رہ گئی ہے۔ جو چاہے ایک پارٹی بنالے اور عوام میں پھیلے ہوئے انتشار کو بڑھاوا دیتا رہے۔ ملٹی پارٹی سسٹم عوام کو الجھاتا اور کنفیوژ کرتا جارہا ہے۔ کسی حلقۂ انتخاب میں جماعتی اور آزاد امیدواروں کی تعداد ۵۰-۱۰۰-۲۰۰ کچھ بھی ہو سکتی ہے۔ یہاں تک کہ ایک خبر کے مطابق ایک حلقہ سے ایک ہزار سے بھی زائد امیدوار الیکشن میں کھڑے ہوئے ہیں۔ کوئی جمہوریت اتنے کثیر جماعتی نظام کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ اس سے عارضی اور کمزور حکومت ہی جنم لی سکتی ہے۔ جس طرح بھارتیہ جنتا پارٹی نے نام چار کی حکومت بنائے رکھی اور تیرھویں دن اس کے لیڈر اٹل بہاری واجپئی کو استعفیٰ دینا پڑا۔ اور اب ۱۳ پارٹیوں کا متحدہ محاذ بر اقتدار آیا ہے۔ امکان ہے کہ یہ انتخابی مدت پوری نہیں کر سکے گا۔ ایسی حکومتوں سے افراتفری، دھندے بازی، عدم استحکام، انتشار اور علاقائی تعصبات کے سوا اور کیا حاصل ہو سکتا ہے۔

نظریہ اور وابستگی کے بغیر آئین کو اثر پذیری نہیں مل سکتی اور نہ سیاسی نظام روایات واقدار کا قابل فخر سرمایہ تعمیر کر سکتا ہے۔ مستحکم اور پائدار حکومت کے قیام کی خاطر اور زیادہ سے زیادہ عوام کو ملک کی سیاسی واقتصادی بہبود کی راہ پر لگانے کے لئے سیاسی جماعتوں کے لئے منصوبہ بندی کو اسی طرح لازم قرار دیا جانا چاہئے جس طرح شہریوں کے لئے خاندانی منصوبہ بندی کو ضروری قرار دیا جاتا رہا ہے۔ لیکن یہ کام بھی فلاحی اسٹیٹ میں ووٹروں کو ہی انجام دینا پڑتا ہے۔ وہ مستقل پارٹیوں کے امیدواروں کو ان کے تعمیری اور مضبوط قومی پروگراموں کی بنیاد پر ووٹ دیتے رہیں اور نام نہاد اور ابن الوقت جماعتوں کی حوصلہ شکنی کرتے ہیں۔ انہیں بار بار شکست دیتے رہیں تاکہ بیماری کے یہ کیڑے پیدا ہونا بند ہو جائیں۔

زبان خلق کا نقارۂ خدا بن جانا بہت سیدھی بات نہیں ہے۔

بی جے پی کی حکومت آئین اور جمہوریت کا مذاق؟

بھارتیہ جنتا پارٹی کی اقلیتی حکومت کا جو حشر ۲۸/ مئی ۱۹۹۶ء کو ہوا اسے کسی بھی طرح حیرت انگیز قرار نہیں دیا جا سکتا۔ ۱۵/ مئی کو ہی یہ بات کھل کر سامنے آگئی تھی کہ شری اٹل بہاری واجپائی کے زیر قیادت قائم ہونے والی حکومت کو نئی منتخب شدہ لوک سبھا کے اراکین کی غالب اکثریت کی حمایت نہ تو اس وقت حاصل تھی اور نہ ہی ایوان میں تحریک اعتماد کے دوران اسے ثابت کیا جا سکے گا۔ ثبوت اس بات کا دیا جاتا ہے جو حقیقت ہو اور جس بات کی کوئی حقیقت ہی نہ ہو اسے ثابت کس طرح کیا جاسکتا ہے۔ ہاں کسی غیر حقیقی بات کو ثابت کرنے کے لئے زمین آسمان کے قلابے ملانے کی کوشش کی جاسکتی ہے اور ایسی کوشش اگر کامیاب بھی ہو جائے تو شک کا دائرہ اسے گھیرے رہتا ہے۔ آئینی تقاضوں اور جمہوری اقدار کی کسوٹی پر پرکھنے کے بعد یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ اس حکومت کا قیام اور ۱۳/ روزہ دور حکومت غیر آئینی اور غیر جمہوری تھا۔ اس دوران جو بھی فیصلے کئے گئے ان کی آئینی حیثیت بھی مشکوک ہوگئی۔

بھارت کے آئینی اور پارلیمانی جمہوریت کی روایات کی روشنی میں انتخابات کے نتائج کے ذریعہ جو لوک سبھا تشکیل ہوتی ہے اور اس کے اراکین کی غالب اکثریت جسے اپنا لیڈر منتخب کرتی ہے اس شخص کو حکومت بنانے کی دعوت دی جاتی ہے۔ دوسرے طریقے سے اسے اس



رفیق ہارون
17 Syed Amir Ali Avenue
3rd Fr Cal-17

طرح سمجھا جاسکتا ہے کہ جس سیاسی جماعت یا گروپ کے لیڈر کو اراکین کی غالب اکثریت کی حمایت حکومت سازی سے قبل حاصل ہو اور جسے وہ ایوان میں ثابت کر سکتے ہوں اسی کو راشٹرپتی حکومت سازی کی دعوت دیتے ہیں۔ کیونکہ حکومت بنانے سے پہلے صدر کو یہ اطمینان کر لینا لازمی ہوگا کہ جس شخص کو وزیر اعظم نامزد کیا جارہا ہے اسے غالب اکثریت کی حمایت حاصل ہے اور اس حمایت کو وہ ایوان میں ثابت کرنے کی پوزیشن میں ہے۔

بھارتیہ جنتا پارٹی کی حکومت کا قیام ان دونوں کسوٹیوں پر پورا نہیں اترتا ہے۔

۱۵ مئی ۱۹۹۶ء کو بھارت کے ہر شہری کو یہ بات معلوم تھی کہ ۵۳۷ اراکین پر مشتمل ایوان میں بی جے پی کو صرف ۱۹۵ اراکین کی حمایت حاصل ہے اور ۳۰۰ سے زاید اراکین اس کی حمایت نہ کرنے کا واضح اعلان کر چکے ہیں اور اگر بی جے پی کی حکومت بنتی ہے تو ایوان میں اسے غالب اکثریت کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ یہ بات بھی عقل تسلیم نہیں کر سکتی کہ اس حقیقت اور ابتدائی اعداد و شمار کے اصولوں سے صدر مملکت ہند ناواقف تھے اس طرح یہ کہا جاسکتا ہے کہ صدر نے جان بوجھ کر ہندوستانی عوام پر ایک ایسی اقلیتی حکومت مسلط کی جسے اراکین کی غالب اکثریت کی حمایت نہ تو ۱۵ مئی ۱۹۹۶ء کو حاصل تھی اور نہ وہ اسے ۲۸ مئی ۱۹۹۶ء کو ثابت کر سکتی تھی۔ اب ایسی حکومت کا قیام اور اس کا دور اقتدار غیر آئینی اور غیر جمہوری نہیں ہے تو اور کیا ہے۔

"KING CAN DO NO WRONG" انگریزی کی ایک بہت پرانی کہاوت ہے "بادشاہ کوئی غلطی نہیں کر سکتا"۔ یہ کہاوت دور شہنشاہیت کے لئے صحیح تھی جو شخصی حکومت کا دور تھا۔ لیکن جمہوری دور حکومت میں کیا راشٹرپتی اپنے آئینی فرائض کی مناسب ادائیگی کے لئے ذمہ دار اور جوابدہ نہیں ہیں؟ کیا ہندوستانی جمہوریت کے آئینی سربراہ کی حیثیت سے ان کے فیصلے آئینی تقاضوں اور جمہوری روایات کی کسوٹی پر کھرے نہیں اترنے چاہئیں؟ اب جب بی جے پی کی اقلیتی حکومت تاریخ کا حصہ بن چکی ہے۔ ان پریشان کن سوالوں کے جواب مورخ تلاش کرتے رہیں گے۔

بہر حال بھارتیہ جنتا پارٹی کی اقلیتی حکومت قائم کرانے کے بعد فرقہ پرست قوتوں کو یہ موقع ضرور دیدیا گیا کہ اقتدار کے ذریعہ سیکولر طاقتوں کو ہراساں کیا جائے اور سیاسی جوڑ توڑ اور خرید و فروخت کے ذریعہ غیر آئینی اور غیر جمہوری حکومت آئینی قرار پا جائے۔ ہندوستانی جمہوریت کا یہ ایک نہایت ہی خطرناک موڑ تھا۔ بی جے پی سنگھ پریوار کا ایک حصہ ہے اور نظریاتی طور پر راشٹریہ سوئم سیوک سنگھ (آر ایس ایس) سے پوری طرح متاثر ہے۔ اس کی پالیسی طاقت کے ذریعہ اپنی بات منوانے کی ہے۔ بابری مسجد کا انہدام اس پالیسی کا واضح ثبوت ہے۔ اس کا علاج ہے کہ خاموشی سے اپنی بات مان لو ورنہ طاقت کا ننگا استعمال کرنے سے نہ تو قانون روک سکتا ہے اور نہ اخلاقی رواداری۔ ۲۸ مئی ۱۹۹۶ء تک شری اٹل بہاری واجپائی کو یہ امید تھی کہ چند نام نہاد سیکولر اراکین ان کی حکومت کو بچانے میں مدد کریں گے۔ لیکن حالات نے ایک ایسی کروٹ لے لی تھی جہاں بی جے پی کی مدد وہ لوگ بھی نہ کر سکے جو دل سے تو ان کے ساتھ تھے لیکن رہائی

بقیہ صفحہ نمبر ۵ پر

طور پر سیکولرزم کے علمبردار بنے ہوئے تھے۔ ان نام نہاد سیکولر عناصر پر حالات کے دباؤ نے اس مہان بھارت دیش کو فرقہ پرستوں کی گرفت سے آزاد تو کرالیا ہے لیکن حالات کا یہ دباؤ کتنا پائیدار ہوگا یہ آنے والا وقت ہی بتائے گا۔

★ ★ ★ ★ ★ ★ ★ ★ ★ ★ ★

★

نعت احمدؐ

مامون ایمنؔ، نیویارک

باغ مکہ چھوڑ کر، بوئے مدینہ چھوڑ کر
کیا کوئی جنت پہنچ سکتا ہے زینہ چھوڑ کر
آپؐ کے ہاتھوں کو جب تھاما ید بیضا بنا
ہر سہارا، ہر انگوٹھی، ہر نگینہ چھوڑ کر
زندگی ہے موت، آنحضرتؐ کی طاعت کے بغیر
کوئی جی سکتا ہے جینے کا قرینہ چھوڑ کر
اے ربیع الاول اتجھ میں کاش ہو جاؤں شہید
کیوں جیوں حضرتؐ کی آمد کا مہینہ چھوڑ کر
آپ کو پایا ہے میں نے، شکر ہے اللہ کا
ہر تمنا، ہر خزینہ، ہر دفینہ چھوڑ کر
چاہئے منزل تو چل نقش قدم آپؐ کے
خلد مل سکتی نہیں سنت کا زینہ چھوڑ کر
آپؐ کا دروازۂ دل ہے کھلا سب کے لئے
جو بھی چاہے آئے لیکن بغض و کینہ چھوڑ کر
عاشق سنت ہمیشہ سے ہوں، بیڑا پار ہے
ڈوبنا اچھا نہیں، ایمنؔ سفینہ چھوڑ کر

نقطہء نظر

رتن چند آشر
کوٹھی نمبر ۱۲۴ ایچ بلاک
سری گنگانگر (راجستھان)

ڈسکو کلب میں جا کے روز دنیا نئی بسایئے
عمر نہ کھویئے عبث بندگی و نماز میں
فردا و دوش کا خیال اور تفکر معاش
کیجئے غرق یار کی چشم فسوں طراز میں
زیست کے تین مشغلے۔ میکشی۔ رقص اور جوا
باقی تمام الجھنیں دہر کی زلف راز میں
زاہد کور ذوق کا ڈھونگ ہے، خیر و شر کی بحث
مذہب اضافی چیز ہے رکھئے اسے دراز میں
حسن و جمال اسی کی دین، جس نے دئے دل و نظر
اتنا عقیدہ ہے بہت صنعت کار ساز میں
بیوی گھریلو چیز ہے اس میں معاشقہ کہاں
لطف نہیں، نشہ تو ہے بادۂ خانہ ساز میں
لذت ناز اور ہے لطف نیاز اور ہے
عشوۂ جانستاں کہاں دلبر پاکباز میں
پھرئے چمن چمن آشر سونگھئے پھول پھول کو
مجنوں صفت نہ گھومئے دشت جنوں نواز میں

انسان کا مستقبل

[تاریخ انسانیت کی روشنی میں ایک مطالعہ]

سید قاسم محمود
شاہکار بک فاؤنڈیشن
حاجی بلڈنگ، حسن علی آفندی روڈ
کراچی - 74200

نوٹ اس مضمون کے فاضل مصنف سید قاسم محمود صاحب اعلیٰ پائے کے عالم اور محقق ہیں۔ مذہب اور سائنس ان کے لئے لازم و ملزوم ہیں۔ وہ "تاریخ انسانیت" پر برسوں سے کام کر رہے ہیں۔ کراچی سے "سائنس میگزین" کے ذریعہ وہ اس خدمت کو انجام دے رہے ہیں۔

زیر نظر مضمون کی غرض و غایت کے بارے میں وہ رقمطراز ہیں

"تاریخ انسانیت" پر کام کرنے کا عزم کیا ہے تو یہ تین نکات بیک وقت بطور رہنما اصول میرے سامنے رہیں گے

(1) یہ تاریخ برائے تاریخ یا ماضی برائے ماضی نہیں۔ بلکہ انسان کے مستقبل کے مفاد کی خاطر قلم بند کی جائے گی۔

(2) انسان کا صحیح مستقبل صرف اور صرف قرآنی پیغام میں پنہاں ہے کہ وہ کرہ ارض پر واحد کتاب ہے جس کا مخاطب انسان ہے۔ میں غیر مسلم ہوتا مگر متعصب نہ ہوتا، تب بھی میری یہی رائے ہوتی۔

(3) تمام بنی نوع انسان تک قرآنی پیغام کی ترسیل و تبلیغ اس کے سوا ممکن نہیں کہ علوم شرعی اور علوم عقلی کی ایک ہزار سالہ مصنوعی تقسیم کو جلد از جلد اور مکمل طور پر ختم کر کے ان میں کلیت، وحدت اور یکجائی پیدا کی جائے۔

پس یہ محض بادشاہوں اور حکمرانوں کے سیاسی اقتدار کے لئے ہوئے والی جنگوں، محلاتی سازشوں اور ان کی شخصی کردار کی وقائع نگاری نہیں، بلکہ یہ انسان کی عقلیت پسندی، خرد افروزی، اور علم دوستی کی بھی تاریخ ہے۔ واقعات و حقائق کے وقت میری آنکھوں پر عقلیت پسندی ہی کی عینک چڑھی رہے گی۔ یہ میری مجبوری ہے، جسے وقت کا تقاضا بھی کہا جاسکتا ہے اور بعض احباب کی نظر میں تعصب بھی"۔

امید ہے الشاء کے قارئین قاسم محمود صاحب کی تحریروں سے استفادہ کریں گے۔ آئندہ بھی ان کے چند مضامین الشاء میں شائع ہوں گے۔

(مدیر)

انسان کا مستقبل کیا ہے؟ یہ آج کے ہر انسان کا سب سے بڑا سوال ہے، ہر سوچنے والے دماغ کا سب سے بڑا مسئلہ، اور لکھنے والے کا سب سے بڑا موضوع!

انسان نے اپنی ہزارہا سال کی طویل تاریخ میں، کبھی، کسی صدی میں بھی کرۂ ارض پر اپنے مستقبل کے بارے میں اتنی شدت سے نہ سوچا ہوگا جتنی شدت سے وہ گزشتہ پچاس سال سے، جب سے کہ ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم گرائے گئے ہیں، یعنی جب سے کہ جوہری توانائی منکشف ہوئی ہے،

سوچ رہا ہے۔ یہاں تک کہ اس کی سوچ نے ایک بالکل نئی سائنس مستقبلیات "فیوچرولوجی" کو جنم دے ڈالا ہے جس کی نشوونما بڑی تیزی سے ہوئی ہے اور اس سے کئی نئے مکتب فکر پیدا ہو گئے ہیں، جو اپنے اپنے زاویہ نظر سے مستقبلیات کے مختلف موضوعات پر غور و تحقیق کرتے رہتے ہیں۔

مستقبلیات پر اب تک جتنی معیاری کتب سامنے آئی ہیں اور جو مقالات مختلف رسائل میں شائع ہوتے رہتے ہیں، ان کے مطالعے سے محسوس ہوتا ہے کہ انسان اپنے مستقبل کے بارے میں پر عزم اور پر جوش نہیں ہے، بلکہ مایوس اور فکر مند ہے اور اپنی بقاء کے لئے کسی گہری تشویش میں مبتلا ہے۔ یہاں تک مستقبلیات کے علماء فلکی طبیعیات کے ماہرین کے ساتھ مل کر یوں بھی سوچنے لگے ہیں کہ اگر زمین کے گرد اوزون کی تہہ میں زیادہ بڑا سوراخ ہو گیا یا بعض اقوام عالم نے جوہری یا حیاتی اسلحے سے کمپیوٹری جنگ لڑ کر نسل انسانی کو نیست و نابود کرنے پر کمر باندھ لی تو انسان دوسرے سیاروں پر اپنا بوریا بستر لے جانا چاہے تو کیا اس کے لئے ابھی سے کوئی مناسب بندوبست نہیں ہو سکتا؟

مستقبل کے بارے میں انسان کی گہری تشویش پانچ ارب انسانوں کی مشترک، اجتماعی نفسیاتی بیماری بن چکی ہے، جسے ماہر عمرانیات پروفیسر ٹوفلر نے "فیوچر شاک" کا نام دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں "فیوچر شاک" ایک ایسی عجیب بیماری ہے جو آپ کو کسی طبی فارمو کوپیا یا فہرست امراض میں نہیں ملے گی آپ اسے نفسیاتی امراض میں بھی نہیں ڈھونڈ سکیں گے۔ اس بیماری کا اصل سبب وقت ہے اور بہت ممکن ہے کہ جب مستقبل کا مستقبل آن پہنچے تو کسی تاریخی کتاب میں ہمیں اس طرح کے الفاظ ملیں "فیوچر شاک کی بیماری نے گزشتہ چند صدیوں میں بڑی خوفناک صورت اختیار کر لی تھی"۔ اس کا شکار چند لاکھ یا چند کروڑ افراد نہیں، بلکہ پوری نسل انسانی ہوگی۔ یہ کوئی وبائی مرض نہیں، مگر کسی بھی وبائی مرض سے کہیں زیادہ خطرناک ہے۔ اگر ابھی سے دانشمندانہ اقدام نہیں کئے گئے تو اربوں انسان خود کو ہر لمحے بڑھتی ہوئی بدنظمی اور ماحول سے مطابقت پیدا کرنے کی روز افزوں ناقابلیت میں گھرا ہوا پائیں گے۔ بے چینی، اضطراب، زبردست ذہنی تناؤ، غیر معقولیت اور کھلی بربریت اور تشدد پہلے ہی موجودہ دور میں ہر طرف نظر آ رہے ہیں یہ فیوچر شاک کی بیماری کے معمولی آثار ہیں اس مستقبل کے لئے جو اب بہت قریب ہے۔

وہ مستقبل جس کی آمد میں صرف پانچ سال باقی رہ گئے ہیں۔ ایک عرصے سے دانشوروں کے عالمی حلقے میں اکیسویں صدی کی آمد آمد کا غلغلہ ہے۔ ہمارے پاکستان میں بھی ایک سنجیدہ کوشش کی گئی ہے اور جناب حکیم محمد سعید کی تحریک پر ۱۹۹۲ء میں "شام ہمدرد" کا موضوع قرار پایا تھا "اکیسویں صدی کے لئے تیاریاں، صاحبان علم و حکومت کی رہنمائیاں" چنانچہ لاہور، کراچی، راولپنڈی اور پشاور میں شام ہائے ہمدرد میں ارباب علم و حکمت نے اپنے اپنے شعبے سے متعلق موگراں قدر مقالات پیش کئے وہ "اکیسویں صدی کی جانب سے" کے عنوان سے دو جلدوں میں کتابی صورت میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان مقالات میں بیشتر کا تعلق اکیسویں صدی میں اسلام کے احیا اور پاکستان کے مستقبل سے ہے، اور انسانیت کے مستقبل سے متعلق شاذ ہی کچھ اشارے ملتے ہیں ڈاکٹر جمیل جالبی نے اپنے مقالے کا آغاز حسن حقیقت پسندانہ خیال سے کیا ہے، اس سے میں بھی متفق ہوں۔ ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں "جدھر جائیے، اخبارات اٹھائیے، مضامین پڑھئے، گفتگو کیجئے ہر طرف اور ہر محفل و مجلس میں اکیسویں صدی کا ذکر ضرور آتا ہے ہر شخص یوں انتظار کر رہا ہے کہ جیسے اکیسویں صدی من و سلویٰ کی صدی ہوگی، ہر طرف خوشیوں کا بازار گرم ہوگا، امن و آشتی کا دور دورہ ہوگا اور وہ سب کچھ ہوگا جس کی اس ارض خاکی پر حیوان ناطق کو ضرورت ہوگی۔ اگر ایسا ہے تو میں بھی اس صدی میں مسرتوں سے لبالب بھری زندگی کی خواہش مند ہوں گا۔ ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ خیال آیا کہ کیوں نہ تاریخ انسانی کی ورق گردانی سے اکیسویں صدی کی فائل نکالی جائے تاکہ آنے والی صدی کی ایک تصویر نظروں کے سامنے آ جائے"

تاریخ انسانی کی ورق گردانی سے اکیسویں صدی کے فال نکالنے کے لئے ڈاکٹر صاحب فوراً ہی پندرھویں صدی ہجری کی طرف نکل گئے اور اسلام پاکستان کا اعادہ جاری تھا کہ ان کا مضمون ختم ہو گیا اور تاریخ انسان کی ورق گردانی کی سرسراہٹ محسوس تک نہ ہونے پائی۔ تاریخ انسانی اور اکیسویں صدی کی رعایت لفظی سے ذہن پہلے موجودہ بیسویں صدی کی طرف منتقل ہوتا ہے (تقویم، ہجری، صرف ہم مسلمانوں میں رائج ہے) بیسویں صدی ایسی چونچال صدی ہے کہ انسان نے اپنے "علم و حکمت" کا جو مظاہرہ کیا ہے وہ اس سے پہلے کی تمام چالیس پچاس صدیوں (تحریری تاریخ) کے کل

تجربے سے بھی زیادہ معلوم ہوتا ہے۔ مشہور ماہر حیاتیات جولین ہکسلے بڑے بلند آہنگ دعویٰ کے ساتھ لکھتا ہے "انسانی ارتقاء کی رفتار معلوم شدہ تاریخ کے دوران میں قبل تاریخی زمانے کے ارتقاء کے مقابلے میں (جب انسان ابھی رونما نہیں ہوا تھا) ایک لاکھ گنا زیادہ ہے۔ زمانہ قدیم میں جو ایجادات ہوئیں، ان کو اپنی تکمیل تک پہنچنے میں پچاس ہزار سال لگے، اور جب پتھر کا زمانہ ختم ہوا اور کانسی کا زمانہ شروع ہوا تو پچاس ہزار سال صرف ایک ہزاری میں سمٹ گئے اور جب باقاعدہ انسانی تہذیب کا جم جماؤ شروع ہوا تو ایک ہزاری سمٹ کر ایک صدی بن گئی۔ گزشتہ پانچ ہزار سال کے دوران میں تبدیلی کی جو رفتار تھی وہ آخری دو تین صدیوں میں کہیں کی کہیں پہنچ گئی ہے۔

دو تین صدیوں کی بات چھوڑیئے، آپ صرف بیسویں صدی کی رفتار ترقی کا جائزہ لیجئے (جس کا راست اثر اکیسویں صدی پر پڑنے والا ہے۔ ناول نگار اور سائنس داں سی پی سنو بیسویں صدی کی غیر معمولی تیز رفتار پر رائے زنی کرتے ہوئے لکھتا ہے "بیسویں صدی تک معاشرتی تبدیلی کی رفتار اس قدر سست تھی کہ ایک شخص کی پوری زندگی کے دوران میں محسوس تک نہ ہوتی تھی، دو تین نسلوں کے بعد محسوس ہوتی تھی، لیکن اب معاملہ کچھ کا کچھ ہو گیا ہے۔ اب تو تبدیلی کی رفتار تیز ہو گئی ہے اور مزید ہوتی جاتی ہے۔ آج کل ہم دنیا میں نئے نئے شہر اور بستیاں بسانے کا ایسا وسیع رجحان دیکھ رہے ہیں کہ اس سے پہلے چشم فلک نے کبھی نہ دیکھا تھا۔ ۱۸۵۰ء میں کرۂ ارض پر دس لاکھ آبادی والے شہر فقط چار تھے۔ ۱۹۰۰ء میں ایسے شہروں کی تعداد ۱۹ ہو گئی۔ ۱۹۶۰ء میں ۱۴۱ شہر ایسے تھے اور اب تو دس لاکھ آبادی والے شہر بے شمار ہیں۔

توانائی کے شعبے میں تیزی طبع کا حال دیدنی ہے، انڈیا کے ایٹمی سائنس داں ڈاکٹر ہومی بھابھا نے کوئلے کے استعمال پر ایک سائنسی مقالہ مرتب کیا، جس میں یہ نتیجہ اخذ کیا "گزشتہ دو ہزار سال میں جتنا کوئلہ انسان نے بطور ایندھن جلایا تھا، اس سے تقریباً نصف کوئلہ بیسویں صدی کے ستر سال میں جلایا جاچکا ہے اور بیسویں صدی کے اختتام میں ابھی تیس سال باقی ہیں"۔

موجودہ ترقی یافتہ صنعتی اقوام میں معاشی ترقی کی رفتار ڈرامائی ہو چکی ہے۔ مثال کے طور پر فرانس میں ۱۹۱۰ء سے آغاز جنگ ۱۹۳۹ء تک صنعتی پیداوار کی شرح افزائش صرف پانچ فیصد تھی، لیکن ۱۹۴۸ء سے ۱۹۶۵ء تک صرف سترہ برسوں میں یہ شرح ۲۲۰ فیصد سے بھی بڑھ گئی۔

نقل و حمل کے شعبے پر نظر ڈالئے۔ ۶۰۰۰ ق م میں نقل و حمل کا سب سے تیز رفتار وسیلہ اونٹوں کا کارواں تھا جس کی عام رفتار آٹھ میل فی گھنٹہ تھی۔ ۱۵۰۰ ق م کے قریب رتھ بنائی گئی جس کی زیادہ سے زیادہ رفتار بیس میل فی گھنٹہ تھی۔ ۱۷۸۴ء میں انگلستان میں پہلی ڈاک گاڑی چلنے لگی تو اس کی رفتار صرف دس میل فی گھنٹہ تھی۔ پہلی بھاپ گاڑی ۱۸۲۵ء میں ایجاد ہوئی اس کی رفتار تیرہ میل فی گھنٹہ تھی۔ اس وقت کے بڑے بڑے بادبانی جہازوں کی رفتار اس سے بھی کم تھی۔ ۱۸۸۰ء کے لگ بھگ انسان نے بھاپ سے چلنے والی ایک اور اچھی گاڑی ایجاد کی جس کی رفتار ایک سو میل فی گھنٹہ تھی۔

خلاصہ یہ ہوا کہ سو میل فی گھنٹہ کی رفتار کا ریکارڈ قائم کرنے والی نسل انسانی کو لاکھوں سال لگے۔ جب کہ بیسویں صدی کے ابتدائی چالیس برسوں میں انسان نے ہوا میں اڑ کر یہ رفتار چار گنا کر لی یعنی چار سو میل فی گھنٹہ، اس رفتار کو دوگنا یعنی آٹھ سو میل فی گھنٹہ کرنے میں صرف چوبیس سال لگے۔ ۱۹۶۰ء تک راکٹ جہاز کی رفتار چالیس ہزار میل فی گھنٹہ تک پہنچ گئی اور اس کے پانچ سال کے اندر اندر انسان خلائی جہاز میں بیٹھ کر زمین کے گرد اٹھارہ ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چکر لگا رہا تھا۔

فاصلوں کے پیمائش کو لیجئے، بلندیوں کا تخمینہ لگالیجئے زمین کی گہرائیوں سے نکالی جانے والی معدنیات کو دیکھ لیجئے جتنا خوفناک اسلحہ اور گولہ بارود بنایا گیا ہے اس کے ذخائر شمار کر لیجئے۔ ہر جگہ اور ہر شعبے میں آپ کو تیز رفتاری کا یہی رجحان نظر آئے گا۔ ہر شعبۂ حیات کے محتاط اندازے اور اعداد و شمار بتاتے ہیں کہ ہر جگہ تبدیلی کا سانچا ایک ہی ہے۔ صدیوں تک صدہا صدیوں تک زندگی کی گاڑی چرخ چوں، چرخ چوں، آہستہ آہستہ چلتی رہی اور پھر ہماری جاری بیسویں صدی میں داخل ہو کر اچانک آتش فشاں کی طرح پھٹ پڑی اور معاشرے کے ہر شعبے میں طوفان کی سی تیزی یکایک آگئی۔

کیا انسان اس زبردست تبدیلی اور رفتار ترقی سے مطمئن ہے؟ اس کا ایک ہی جواب ہے، نہیں۔

سورہ حم سجدہ کی ایک آیت یاد آرہی ہے "عنقریب ہم ان کو اپنی نشانیاں آفاق میں بھی دکھائیں گے اور ان کے اپنے نفس میں بھی، یہاں تک کہ ان پر یہ بات کھل جائے گی کہ یہ قرآن واقعی برحق ہے"۔

ہاں بے شک، انسان نے موجودہ صدی میں تسخیر آفاق کی صورت میں تو کئی گہرائیاں اور نشانیاں ظاہر کر دی ہیں، لیکن شاید اپنی کامیابی کی مستی میں اس کا نفس متکبر اور کثیف ہو گیا ہے۔ مادی ترقی اور ظاہری خوشحالی نے اسے غیر منصف مزاج اور ہوس کار بنا دیا ہے۔ کرۂ ارض پر ہر ملک میں، ہر قوم کا انسان پریشان اور خوف زدہ نظر آرہا ہے۔ عدم مساوات اور عدم استحکام نے اسے بربریت اور تشدد کی طرف مائل کر دیا ہے۔ آپا دھاپی، نفسا نفسی اور طوائف الملوکی کا عالم ہے۔ تمام اخلاقی اقدار کو زوال آچکا ہے۔ بے حیائی اور عریانی نے انسان کو پھر حیوانیت کے درجے میں پہنچا دیا ہے۔ آج ایسے امیر بھی ہیں جو خود کو غریب ظاہر کرتے ہیں اور ایسے غریب بھی ہیں جو اپنی جھوٹی امارت کا اظہار کرتے ہیں، خواہ اس کے لئے انہیں کتنا ہی سنگین نقصان کیوں نہ اٹھانا پڑے۔ ایسے شرپسند بھی ہیں جو کھدر کے کپڑے پہن کر شرمناک واعظ اور مبلغ بنے پھرتے ہیں۔ ایسے مبلغ ہیں جو اپنی شاندار کاروں اور اعلیٰ بنگلوں کے اندر شرپسند دہشت گرد ہیں۔ ٹیلیویژن اور رنگین فلمیں ہیں جو رات دن برہنگی اور جنسی آزادی کی ترغیب دیتی ہیں رہبر کے بھیس میں رہزن اور رہزن کے بھیس میں رہبر عام نظر آتے ہیں۔ ملکوں کے صدور، وزراء، سپہ سالار اور ارکان اسمبلی بنی نوع انسان کی دولت دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہے ہیں۔ ہر طرح کی روحانی، ذہنی، نفسیاتی اور جسمانی بدعنوانیاں ایسے عروج پر ہیں کہ جیسے اب قیامت آنے ہی والی ہو۔ انسانیت کی ترازو کے دونوں پلڑے بے توازن ہو گئے ہیں۔

ان عالمی امراض کے علاج کے لئے ایک نسخہ امریکا نے "نیا عالمی نظام" کی صورت میں تجویز کیا ہے، جس کو روبہ عمل دیکھنے کے لئے وہ چالاک سوداگر اور بے اخلاق سپر پاور کی طرح پوری دنیا میں ٹھونس رہا ہے۔ یہ ان عوامل (سائنس و ٹیکنالوجی) کی ترقی کا قدرتی نتیجہ ہے جن کا سبب بیسویں صدی میں رفتار ترقی میں زبردست اضافہ ہوا ہے۔ اس کے برعکس دوسرا نسخہ وہ ہے جو عالم اسلام کے حکماء کی طرف سے تجویز کیا جارہا ہے کہ اشتراکیت کا خاتمہ ہوا، سرمایہ داری ناکام ہوئی، اب اسلام کی باری ہے۔

لیکن اسلام کی باری نہیں آسکتی تاوقتیکہ اس کے پیروکار اپنی گزشتہ ہزار ڈیڑھ ہزار سالہ تاریخ میں ہونے والی اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں کی اصلاح نہ کر لیں۔ مسلمانوں کی دو بڑی غلطیاں اس قدر سنگین و شدید ہیں کہ جب تک ان کی اصلاح نہ ہو جائے وہ عالمی نظام کے حکمران تو کیا ہیں گے، خود اپنے علاقے میں اپنی خود مختاری بھی برقرار نہیں رکھ سکتے۔

پہلی غلطی یہ ہے کہ مسلمانوں نے یا ان کے دانشوروں نے اس کتاب کو جو تمام بنی نوع انسان کے مفاد کے لئے اتاری گئی تھی صرف اپنی ذات کی حد تک مختص کر لیا۔ اللہ تعالیٰ نے سورہ انعام میں صاف صاف کہا ہے "میں تم سے اس قرآن کا صلہ نہیں مانگتا، کیونکہ یہ تو ایک نصیحت ہے جو تمام اقوام عالم کے لئے ہے" جگہ جگہ قرآن کو "ذکر اللعالمین" کہا گیا یعنی تمام انسانوں کے لئے ایک نصیحت۔ اللہ کو تمام جہانوں کا پروردگار کہا گیا۔ قرآن مجید کا افتتاحی جملہ "الحمد للہ رب العالمین" ہے۔ جس رسولؐ کے ذریعے کتاب نازل کی گئی، اس کے بارے میں کہا گیا "رحمت اللعالمین"۔

ذکر اللعالمین کے بارے میں مسلمانوں نے کہا، یہ تو ہم مسلمانوں کی کتاب ہے۔

رب اللعالمین کے بارے میں مسلمانوں نے کہا، پروردگار تو فقط ہم مسلمانوں کا ہے۔

رحمت اللعالمین کے بارے میں مسلمانوں نے کہا، رسول تو فقط مسلمانوں کا ہے۔

عالمگیر معنویت و مفہوم کی حامل ان آیات کو ذکر المسلمین، رب المسلمین اور رحمت المسلمین بنالینا حد سے بڑھی ہوئی محبت کا نتیجہ بھی ہو سکتا ہے جس سے رقابت پیدا ہوتی ہے اور بے عملی اور غلط تعبیر و تفسیر کا بھی، جس سے تغافل، لاپرواہی اور گمراہی پیدا ہوتی ہیں۔

لفظ "عالمین" کے مفہوم میں ملت ابراہیمی بھی شامل ہے اور بنی اسرائیل بھی، مسلمانوں کے ساتھ عیسائی بھی، یہود کے ساتھ ہنود بھی، عربوں کے ساتھ عجمی بھی، ترکوں کے ساتھ تاجک بھی، یورپیوں کے ساتھ ایشیائی بھی، گوروں کے ساتھ کالے بھی، امریکا کے ساتھ افریقہ بھی۔ قرآن۔ محمدؐ اور

خدائے واحد صرف مسلمانوں کے نہیں، تمام امتوں، قوموں اور نسلوں کے لئے ہیں۔

قرآن دنیا بھر میں واحد کتاب ہے جس کی اپیل آفاقی، عالمگیر اور تمام انسانوں کے لئے ہے۔ قرآن کو انسانیت کے بڑے دائرے سے نکال کر صرف مسلمان ملکوں تک محصور اور مسلم قوموں تک محدود کرلینے کی غلطی کی اصلاح کون کرے گا، کب کرے گا؟ کیا مسلمانوں کی اس غلطی کی اصلاح کے لئے ہنود اور یہود آئیں گے یا نئے فرشتے نازل ہوں گے جو ان کھلی آیات کی بھی تفسیر کھول کھول کر بیان کریں گے۔ شاید ایسا ہی ہوگا، کیونکہ مسلمانوں کو تو قرآن شادیوں میں بطور جہیز دینے کا بڑا شوق ہے یا مرگ پر سوم اور چہلم کی رسم پر کھولنے اور جلدی جلدی پڑھنے کا۔ اب بعض اسلامی ممالک قرآن مجید کے لاکھوں کروڑوں نسخے غریب غرباء اور مستحق لوگوں کو بلا ہدیہ تقسیم کرنے لگے ہیں (بائبل کی تقلید میں) اس کا فائدہ محدود و مشکوک ہے۔ قرآن خوانی کی محفل، دس منٹ کے نوٹس پر برپا ہو جاتی ہے۔ رشوت سے ملازمت ملے گی تو قرآن خوانی، حرام کی کمائی سے مکان بنایا جائے گا تو قرآن خوانی، عدالت سے قاتل کو رہائی مل جائے تو قرآنی خوانی۔ ماضی میں اگر صحیح خطوط پر قرآن فہمی ہوتی تو یہ پچی، آفاقی اور عالمگیر کتاب صرف ایک ہی ملت تک محدود ہو کر کیوں رہ جاتی؟ تب رقبے کی فتح مندانہ توسیع اور آبادی میں بڑھوتری ہی کو سب کچھ نہ سمجھ لیا جاتا، بلکہ قرآنی پیغام و ہدایت کی عالمگیر اشاعت اور ایک ایک فرد و بشر کے قلب و ذہن تک اسے پہنچانے کی کوشش کی جاتی تو صورتحال مختلف ہوتی۔

کیا مستقبل میں قرآن فہمی اور قرآن کی آفاقیت اور عالمگیریت کو تمام بنی نوع انسان تک پہنچانے کا ایسا امکان ہے کہ غیر مسلمین جو پوری انسانی آبادی کا تین چوتھائی ہیں، قرآن کی طرف عملاً راغب ہو سکیں؟ ہاں یقیناً ہے، بشرطیکہ پہلی غلطی کا ازالہ کرنے کے ساتھ ساتھ دوسری غلطی کا بھی کفارہ ادا کیا جائے کہ جس سے درحقیقت پہلی غلطی نے جنم لیا تھا، وہ ہے قرآنی علوم اور عقلی علوم کی تقسیم۔ علم کی تقسیم ارسطو نے بھی کی تھی۔ فارابی نے بھی کی تھی، اور آج تک ہوتی آئی ہے، لیکن یہ تقسیم کار کی خاطر ہوتی ہے کہ آدمی اپنی بہترین صلاحیت کے مطابق کسی ایک شعبہ علمی میں مہارت تامہ حاصل کرسکے۔ لیکن امام غزالی نے "احیائے علوم الدین" میں عقل اور وجدان کی اساس پر علم کو قرآنی علوم، اور عقلی علوم کے دو خانوں میں تقسیم کیا۔ جس کا ازالہ ایک ہزار برسوں میں آج تک نہیں ہوسکا، بلکہ مرض بڑھتا گیا، جوں جوں دوا کی۔ امام غزالی کے وقتوں میں صورتحال یہ تھی کہ مسلم مفکرین فلسفہ یونان کے زیر اثر آگئے تھے اور آیات قرآنی اور الہیات کی تاویل بھی ارسطوئی فلسفے کی رو سے کی جاتی تھی۔ عقلیت پسندی کی تحریک نے اس قدر غلو اختیار کرلیا تھا کہ بعض فکری مسائل مثلاً خدا کی ذات و صفات، کائنات کے قدیم یا حادث ہونے کا مسئلہ، وحی کا مسئلہ اور عقل اور وجدان کا مسئلہ، انسان کا مجبور محض یا بااختیار ہونے کا مسئلہ، ان پر لاطائل مناظرے ہوتے تھے، جن سے مسلم معاشرے میں جمود اور انتشار کی کیفیت پیدا ہوگئی تھی۔ امام غزالی خود بھی بہت بڑے فلسفی اور مفکر تھے۔ انہوں نے عمر کا ایک طویل عرصہ عقلی علوم کی تحصیل میں صرف کیا اور فلسفے میں ایسی جدتیں کیں جس کی مثال تاریخ فلسفہ میں کم ملتی ہے۔ انہوں نے عقل کے مقابلے میں وجدان کو آفاقی حقیقتوں کے علم کا سرچشمہ قرار دیا ہے میں انہوں نے بتایا کہ عقل کی کارفرمائی مادی حقائق تک محدود ہے۔

آفاقی حقائق خدا، آخرت، تخلیق، کائنات وغیرہ ایسے مسائل ہیں جو وجدان اور عقیدے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان مسائل پر عقلی مباحث لاحاصل ہیں۔ یہ ایک نہایت معقول اور صحیح انداز فکر تھا۔ انہوں نے فلسفیوں کے ان دلائل کا رد لکھا جو وہ آفاقی اور مذہبی مسائل کے طور پر پیش کرتے تھے اور اس کتاب کا نام "تہافت الفلاسفہ" رکھا۔ امام غزالی نے عقل کو بالکل رد نہیں کیا، بلکہ اس کا مقام متعین کیا تھا۔ وہ خود اپنے ذاتی حالات اور خاندانی تربیت کے زیر اثر تصوف کی آغوش میں چلے گئے تھے۔ اپنے اعترافات میں لکھتے ہیں "میں نے صداقت کو پالیا ہے، کسی باضابطہ منطقی استدلال اور ثبوت و شواہد کی روشنی میں نہیں، بلکہ نور باطن کے ذریعے جو اللہ تعالیٰ نے میری روح میں بھر دیا ہے"۔

امام غزالی خود بہت عظیم صوفی تھے اور اسلامی تصوف کے بانیوں میں سے تھے لیکن مسلمانوں کی بدقسمتی کہ ان کے بعد جو صوفی آئے وہ علماء سو کی طرح دوسرے تیسرے درجے کے ثابت ہوئے۔ چنانچہ امام غزالی کے افکار کا غلط مطلب لیا گیا۔ کہا گیا کہ دنیائے دنی دوروزہ ہے۔ آخرت ہی اصل چیز دوسری دنیا ہے۔ چنانچہ ترک دنیا اور رہبانیت عامۃ المسلمین میں بھی رائج ہوئی۔ سمجھا یہ گیا کہ چونکہ آفاقی مسائل کا حل وجدان ہے، عقل

میں نہیں لہذا وجدان کی طرف توجہ کرنی چاہیئے اور عقل کو نظر انداز کر دینا چاہیئے یعنی مسلمانوں کو تصوف، چلہ کشی، مراقبہ، نفس کشی اور وجدانی ریاضت کی ضرورت ہے عقلی علوم کی نہیں۔ صرف اتناہی نہیں، مزید یہ بھی فرض کر لیا گیا کہ چونکہ عقل فلسفہ اور سائنس کی طرف لے جاتی ہے، اس لئے انسان صحیح راستے سے بھٹک کر وجدانی تربیت سے محروم ہو جاتا ہے۔ لہذا عقل اور عقلی علوم کی تحصیل اسلام کے منافی ہے۔ چنانچہ اس کا نتیجہ یہی نکل سکتا تھا کہ جو لوگ فلسفہ اور سائنس سے متعلق مشاغل اختیار کرتے ہیں وہ کافر ہیں۔ اپنی عظیم تصنیف "احیائے علوم الدین" کے حصہ سوم میں یہ تنبیہہ کر دی تھی "جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ علوم عقلی علوم شرعی کے خلاف ہیں اور دونوں کا جامع ہونا ممکن نہیں، تو یہ بات ان کی لاعلمی کی وجہ سے ہے۔ یہ لوگ نور بصیرت سے عاری ہیں بلکہ ایسے لوگوں کے نزدیک بعض علوم شرعی بھی ایک دوسرے کے مخالف معلوم ہونے لگتے ہیں" لیکن یہ تنبیہہ اتنی کمزور اور نحیف ثابت ہوئی کہ انہوں نے کتاب کے حصہ اول میں انتہائی پرزور اور پرجوش انداز میں علم کی جو تقسیم عقل اور وجدان کی اساس پر دو خانوں میں کر دی تھی، اسے آج تک کوئی بڑا سے بڑا مسلمان فلسفی یا سائنس داں مفسر یا مفکر پیچھے نہ پلٹا سکا، اور یوں علم کے دو بڑے خاکے گویا مستقل قرار پائے۔

(۱) علوم شرعی یا قرآنی یا دینی۔ اس میں قرآن، تفسیر، حدیث، قرآت، رجال، فقہ، کلام، تصوف، لعت، صرف، نحو اور بیان وغیرہ شامل ہیں۔ نکتہ آفرینی بھی ہوئی لیکن ساتھ ساتھ گنتی بھی ہوئی کہ قرآن میں زبر کی علامت کتنی مرتبہ آئی ہے اور ا کتنی مرتبہ آیا ہے۔

(۲) علوم عقلی یا دنیاوی۔ ان میں فلسفہ، طبیعیات، طب، ریاضی، فلکیات وغیرہ شامل ہیں۔

اس تقسیم کے نتیجے میں دونوں قسم کے علوم میں ایک طرح کی عداوت و منافرت پیدا ہوتی چلی گئی، حتیٰ کہ جہاں لفظ "علم" آیا، مفسرین نے فوراً ہی اس کے آگے لفظ "دین" کا لاحقہ لگا کر اسے "علم دین" بنا دیا۔ صرف ایک آیت اور دو احادیث ایسی ہیں جو ان کی دست برد سے بچ گئیں۔ سورہ طٰہٰ کی یہ دعائیہ آیت "رب زدنی علماء" اے پروردگار مجھے مزید علم عطا کر۔

آنحضورؐ کی یہ حدیث "علم حاصل کرو، خواہ اس کے لئے تمہیں چین جانا پڑے" اور دوسری یہ حدیث "علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد و زن پر فرض ہے" ان تینوں میں لفظ "علم" کے ساتھ لفظ "دین" کا لاحقہ لگانا دشوار ہو گیا، اس لئے یہ دینی مدرسوں کے مقابلے میں دنیاوی اسکولوں اور کالجوں میں زیادہ مقبول ہوئیں۔

امام غزالی نے فکر اسلام میں غیر اسلامی افکار و خیالات کی تخم کاری کو خوش نیتی سے روکنے کا جو عظیم کام سرانجام دیا تھا، وہ بعد میں آنے والوں کی نااہلی سے ملت اسلامیہ کی مجموعی فلاح و ترقی کے لئے رکاوٹ ثابت ہوا، بقول ڈاکٹر آغا افتخار حسین "امام غزالی کے افکار کو اگر عقلیت پسندی کے خلاف بھی تصور کر لیا جائے تب بھی اگر مسلمانوں میں عام فکری جمود نہ ہوتا تو ان بزرگوں کے افکار سے فائدہ ہی ہوتا نقصان نہ ہوتا، مطلب یہ کہ فکری ارتقا اور ترقی کے لئے عمل اور رد عمل ضروری ہے۔ یورپ میں کوبر نیکس، گلیلیو، دیکارت اور سپائی نوزا وغیرہ سے عقلیت پسندی کی تحریک شروع ہوئی لیکن اس کے بعد اس تحریک کے خلاف رد عمل ہوا اور لاک، برکلے اور ہیوم نے عقلیت پسندی کی مخالفت کی اور تجربیت کی تحریک رونما ہوئی کانٹ نے بھی امام غزالی کی طرح ایک حد تک عقلیت پسندی کی مخالفت کی اور عقل کے حدود متعین کئے لیکن اس کے بعد ہیگل نے اس طرز فکر کی مخالفت کی اور مزید رد عمل کے طور پر عقلیت پسندی کے موافقت کی۔ اس انداز فکر کے خلاف پھر رد عمل ہوا اور نطشے اور شوپنہار نے عقلیت کی مخالفت کی۔ پھر مزید رد عمل ہوا اور کارل مارکس اور ڈارون نے دوبارہ عقلیت کی موافقت کی اور علوم کی بنیاد عقل پر رکھی۔ بیسویں صدی میں بھی ہمیں عقلیت کی موافقت اور مخالفت دونوں کی تائید میں عمل اور رد عمل نظر آتے ہیں۔ بریڈلے عقلیت پسند تھا، لیکن برگساں عقلیت پسندی کا مخالف تھا برٹرینڈ رسل عقلیت پسند تھا اور سارتر عقلیت کا مخالف، اس طرح عمل اور رد عمل کی وجہ سے قوموں کی فکر میں توازن برقرار رہتا ہے قوم کا ذہن صرف ایک طرف جھک کر انتہا پسند ہو جاتا ہے، بلکہ دونوں فکری رجحانات سے متاثر ہو کر قوم کا مزاج معتدل ہو جاتا افسوس ہے کہ مسلمانوں میں ایسا نہیں ہوا اور عمل کا رد عمل اور اس کا بھی رد عمل نہیں ہوا۔

مسلمانوں میں رد عمل ہوا، اب رشد نے امام غزالی کے وجدانی افکار کی سخت مزاحمت کی، ۔ "تہافت الفلاسفہ" کی مخالفت میں اور عقلیت کی حمایت میں "تہافت التہافت" لکھی لیکن دین اسلام کی روح یعنی فرد افروزی اور عقلیت پسندی ابن رشد کے اسلام میں تو واپس نہ آسکی ۔ ابن رشد کے وساطت سے مغرب میں چلی گئی جس نے چند صوبوں کے اندر اندر اتنی زبردست ترقی کی کہ گویا بیسویں صدی مغربی سائنس ہی کی ملکیت ہے مسلمانوں میں رد عمل ہوا، مگر انیسویں صدی کے اواخر میں زیادہ ہوا، جب پورا عالم اسلام غیر ملکی سامراج کی زنجیروں میں مکمل طور پر جکڑا جاچکا تھا جب اسلام تمدن، ثقافتی روایات ان کا سیاسی نظام، ان کے معاشی مفادات، ان کی معاشرتی اقدار، سب کچھ سامراجی قوتوں کے زیر تسلط آچکا تھا اور اسلامی مملکتوں کا ایک انچ بھی آزاد و خود مختار نہ رہ گیا تھا مصر، ترکی، ایران اور ہند و پاکستان سے چند مفکرین کی عقلیت پسندانہ آوازیں اٹھیں مگر یہ انفرادی آوازیں تھیں جو کسی فکری تحریک کے بغیر بلند ہو رہی تھیں سید جمال الدین افغانی، مفتی محمد عبدہ، محمد رشید رضا، قاسم امین، توفیق الحکیم، محمد حسین ہیکل، عباس محمود العقاد، ضیا گوکلپ، علی شریعتی، سید امیر علی، عبید اللہ سندھی، علامہ اقبال، علامہ نیاز فتح پوری، خلیفہ عبدالحکیم، باری علیگ اور بالکل جدید زمانے میں، ہمارے یہاں علامہ علی عباس جلال پوری، ڈاکٹر رفیع الدین، سید سبط حسن، ڈاکٹر آغا افتخار حسین، پروفیسر وارث میر، ڈاکٹر حسین نصر، ڈاکٹر اکرایس احمد، ڈاکٹر مبارک علی، مرزا ابن حنیف اور سرکار زینی جارچوی نے عقلیت پسندی اور خرد افروزی کے حق میں اپنے اپنے انداز میں آواز بلند کی ہے ۔یہاں، ہم علامہ اقبال کے چند جملے نقل کرتے ہیں جو ان کے پہلے لیکچر، علم اور "مشاہدات مذہبی" سے اخذ کئے گئے ہیں ۔ یہ جملے جہاں ان سب عقلیت پسندوں کی ترجمانی کرتے ہیں، وہاں ان سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ خود اسلام کا مستقل اس نکتے میں پنہاں ہے کہ علم قرآنی (مذہب) اور علوم دنیاوی (سائنس) میں اب کامل، ہم آہنگی، وحدت و جامعیت پیدا ہونی چاہئے ۔علامہ موصوف لکھتے ہیں ۔

(1) اسلام کی عقلی اساس دریافت کرنے کی جستجو خود پیغمبرؐ اسلام سے شروع ہو چکی تھی کہ ان کی مسلسل دعا تھی کہ "اے اللہ ! مجھے اشیاء کی اصل حقیقت کا علم عطا فرما"۔

(2) "واقعہ یہ ہے کہ عملی حیثیت سے مذہب کو اپنے بنیادی اصولوں کے لئے سائنس سے بھی زیادہ ایک عقلی اساس کی ضرورت ہے" یورپ میں عقلیت پسندوں اور اہل کلیسا کے درمیان تقریباً دو سو سال کی جنگ کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ اہل کلیسا نے مذہب کی بنیاد عقیدے کو قرار دیا تھا، عقل کو نہیں ۔اور فلسفہ اور سائنس نے اپنے عمل کے لئے زیادہ تر عقل پر انحصار کیا تھا، عقیدے پر نہیں ۔گویا عقل کا تعلق فلسفے اور سائنس سے رہ گیا تھا، مذہب اس کے دائرہ عمل سے خارج تھا ۔علامہ اقبال نے مذہب کو بھی عقل کی حدود میں شامل کر لیا ۔یہ واقعی ایک انقلابی تصور تھا جو بیسویں صدی میں اقبال نے پیش کیا ۔

(3) "قرآن کی زبان میں فطرت کو اللہ کی عادت قرار دیا جاسکتا ہے ۔پس فطرت کا علم (سائنس) در اصل خدا کے فعل کا علم ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ تمام علمی جستجو ایک قسم کی عبادت ہے ۔ فطرت کا سائنسی مشاہدہ کرنے والا شخص ایک قسم کا صوفی ہے جو عبادت میں مصروف ہے" فلسفہ و سائنس کو "عبادت" قرار دینا در اصل ایک انقلابی رد عمل ہے صوفیا کی تحریک کا ۔

(4) امام غزالی نے کہا تھا کہ یونانی فلسفے نے اسلام کو مسخ کیا، کیونکہ یونانی فلسفے نے عقل کی اہمیت پر زور دیا تھا، عقیدے پر نہیں ۔ اقبال کو بھی یونانی فلسفیوں سے شکایت ہے، لیکن شکایت یہ نہیں کہ انہوں نے عقل کی اہمیت پر کیوں زور دیا، بلکہ اس لئے کہ عقل کی اہمیت پر جتنا زور دینا چاہئے تھا، یونانی فلسفیوں نے نہیں دیا، مثلاً سقراط نے محض انسان کا مطالعہ کیا ۔جانوروں، پودوں وغیرہ کی طرف توجہ نہ دی ۔ عقلی علوم کا تقاضا تھا کہ حیوانات اور نباتات وغیرہ کا بھی مطالعہ کیا جاتا ۔چنانچہ قرآن حکیم میں شہد کی مکھی کا ذکر بھی ہے جو القائے ربانی سے فیضیاب ہوتی ہے، اس لئے اسلام نے یونانی فلسفہ کے مقابلے میں عقل کی اہمیت پر زور دیا ہے" ۔

افسانہ

یعقوب مرزا
برمنگھم (برطانیہ)



ولائیت پاس

انگلستان کے ایک ہسپتال میں ایک ڈاکٹر صاحب حیران تھے کہ رضیہ بیگم کو کیا ہو گیا ہے۔ اس نے پاگلوں کی طرح " ولائیت پاس " کی رٹ لگا رکھی ہے۔ اکثر دفعہ صحیح تشخیص کے لئے بیمار کا پس منظر ڈاکٹر کو جاننا ضروری ہوتا ہے۔

رضیہ بیگم کے ہاں جو پہلا بچہ پیدا ہوا تو وہ خوشی سے پھولے نہ سمائی۔ ماں بن جانے کا غرور، پہلا بچہ اور وہ بھی لڑکا! اس کا خاوند شادی کے چند ماہ بعد انگلینڈ واپس چلا گیا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ اپنے شوہر کو بچے کی ولادت کی خبر بقلم خود لکھے۔ اس کے جذبات کی ترجمانی دوسرا کون کر سکتا تھا مگر بےچاری ان پڑھ تھی۔ بزرگوں نے بچے کا نام غلام رسول طے کیا۔

انھیں دنوں رضیہ کی ایک پڑوسن ربیدہ خانم انگلینڈ سے اپنے سسرال کے مسلسل اصرار پر اس کو اپنا بیٹا دکھانے لائی تھی۔ یہ لڑکا انگریزی فر فر بولتا تھا۔ اس کے ہم عمر لڑکے حسد کرتے۔ کاش وہ بھی انگریزی سوال کا انگریزی میں جواب دے سکتے۔ بزرگوار اسے "گورا" کے نام سے پکارتے اور تعریف بھی کرتے کہ لونڈا انگریزی خوب بولتا ہے۔ وہ کیا کہہ رہا ہے یہ کوئی نہ سمجھتا البتہ اس کے لب و لہجہ کے اتار چڑھاؤ سے اس کا ردعمل سمجھنے میں کوئی دقت پیش نہ آتی لیکن بڑے افسوس کی بات یہ ہے کہ وہ اپنی قومی زبان سے بے بہرہ ہے۔ اس کی ماں دوسروں کے آگے شیخی بگھارتی کہ اس کا بیٹا " ولائیت پاس " ہے۔ رضیہ اس لڑکے سے اتنی متاثر ہوئی کہ اس نے یہ عہد کر لیا کہ ایک دن وہ بھی اپنے بیٹے کو " ولائیت پاس " کرائے گی۔ کچھ بھی ہو

غلام رسول کی آمد کی خبر سنتے ہی اسے دیکھنے، بیوی کا شکریہ ادا کرنے اس کو شاباش کہنے کو اس کا شوہر اچانک انگلستان سے اپنے گھر آپہنچا۔ مبارک باد۔ مبارک باد کا شور پڑا۔ مٹھائی بٹی۔ مسکراہٹوں اور قہقہوں کا سلسلہ شام تک جاری رہا لیکن رات گئے تک میاں بیوی کے درمیان ایک سنجیدہ سوال زیر بحث رہا۔ اولاد اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت ہوتی ہے۔ انسان کی سب سے قیمتی دولت۔ آیا بچے کی پرورش اسی مٹی کے خمیر سے ہو جہاں اس نے آنکھ کھولی ہے۔ بیٹے کا باپ اس کو انگلینڈ ساتھ لے جانے کے لئے ہرگز راضی نہ تھا۔ وہ کہتا نہیں۔ نہیں کبھی نہیں۔ جو میں جانتا ہوں وہ تم نہیں جانتی ہو۔ اس کے برعکس رضیہ نے اپنے بیٹے کو " ولائیت پاس " کرانے کا تہیہ کر رکھا تھا۔ وہ کسی قیمت پر دستبردار ہونے کو تیار نہ تھی۔ رضیہ اپنی ضد پر اڑی رہی کہ وہ اس کے ساتھ انگلینڈ جائے گی اور ضرور جائے گی خاوند نے آخر کار مجبور ہو کر کہا " اچھا چلو پھر کبھی۔ ابھی بچے کو بسم اللہ تو پڑھ لینے دو۔ رضیہ نے کہا بسم اللہ پڑھنے والوں کو وہ جانتی ہے۔ خدا اس سے بچائے۔ اس کا بیٹا " ولائیت پاس " ہو۔ میرا غلام رسول بھلا کسی سے کم کیوں رہے گا۔ میں نہیں چاہتی کہ میرا لاڈلا بڑا ہو کر ہم پر یہ الزام لگائے کہ ہم نے اسے ولایت پاس ہونے کا موقعہ ہی مہیا نہیں کیا۔ انشاء اللہ وہ ضرور ولائیت پاس کرے گا۔ ربیدہ خانم کے بیٹے سے بڑھ کر۔

آخرش یہ مختصر سا کنبہ پاکستان کے ایک دور افتادہ قصبے سے اٹھ کر کشاں کشاں انگلینڈ آ گیا۔ رضیہ نے یہاں کا باوا آدم ہی نرالا پایا۔ سبھی انگریزی بولتے۔ اس کا خاوند ساتوں دن سات سے سات بجے تک فیکٹری میں کام کرتا۔ جوں جوں غلام رسول بڑا ہوتا گیا اس نے انگریزی زبان اندر باہر بولنا شروع کر دی۔ ماں بڑی خوش کہ اب اس کے خواب کی تعبیر پوری ہونے کا دن قریب آ رہا ہے۔ اڑوس پڑوس میں غلام رسول " رسل " کے نام

سے پکارا جاتا ۔ یوں تو انگریز واقفیت پیدا کرنے میں بڑا توقف اور تکلف برتتے ہیں لیکن رضیہ کی پڑوسن مارگریٹ زیادہ ملنسار تھی کہ وہ رضیہ کا خیال رکھتی ۔ ضرورت پڑنے پر مدد بھی کرتی ۔ اس کے باوجود معاملہ یہ رہا کہ رضیہ انگریزی سیکھ سکی نہ ہی مارگریٹ پنجابی ۔ ان کے درمیاں ایک دوسرے سے اجنبیت بہرحال جاتی رہی ۔ مارگریٹ رضیہ کو روزی کے نام سے پکارتی اور رضیہ اس کو میگی کہہ کر مخاطب کرتی ۔ ان کی مشترکہ ہمدردیاں آخر رنگ لائیں اور پر خلوص دوستی قائم ہو گئی ۔

کرسمس کا دن قریب آرہا تھا ۔ بس چند دنوں کی بات تھی ۔ میگی گھر کو سجانے اور رنگ روغن کرنے میں مصروف تھی ۔ روزی اس کا ہاتھ بٹاتی ۔ دونوں بہت خوش ، بے حد خوش ، میگی کو یہ پتہ تھا کہ روزی ایک مسلمان عورت ہے اور وہ تراب سے نفرت کرتی ہے ۔ اس نے روزی کے لئے خاص طور پر علیحدہ کیک اپنے ہاتھوں سے خود تیار کیا اور کرسمس کی صبح اس نے کیک تحفتاً پیش کرنے کے لئے گھنٹی بجائی ۔ روزی تحفہ دیکھ کر شکر گزار تو ہوئی لیکن اسے یہ معلوم نہ تھا کہ ایسے موقعہ پر کیا کہنا چاہیے ۔ اس نے اپنے ذہن پر زور ڈالا اور بے ساختہ ایک چار حرفی لفظ کہہ دیا ۔ میگی کے لئے نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن ۔ حیران پریشاں سر لٹکائے چپ چاپ اپنے گھر چلی گئی ۔ میگی کے خاوند نے پوچھا کیا بات ہے ۔ منہ کیوں لٹکا لیا ۔ آج کرسمس ہے ۔ خوش ہو ۔ "کچھ نہیں " میگی نے بے دلی سے جواب دیا ۔ "بس یونہی ! " آخر کار میگی کو بتانا پڑا کہ روزی نے اسے ایف   آف کہا ہے ۔

میگی کے خاوند نے روزی کے خاوند کو ٹیلی فون پر گلہ کرتے ہوئے صورت حال سے آگاہ کیا ۔ اس نے روزی سے باز پرس کی کہ اس نے میگی سے کیک لے لیا اور گالی بھی دے ڈالی !! روزی یہ سن کر سکتے میں آگئی ۔ وہ کب ؟ " میں میگی کی عزت کرتی ہوں ۔ وہ تو میری دلی دوست ہے ۔ میں بھلا کیوں اسے گالی دیتی ؟ " ۔ اب شوہر نے وہی لفظ دہرایا اور پوچھا تم نے یہ لفظ کیوں استعمال کیا ؟ یہ لفظ تم نے سیکھا کہاں سے ؟ روزی نے آنسو خشک کئے اور کسی قدر فخر سے کہا " اللہ رکھے جب میں اپنے رسل کو کھانا دیتی ہوں اور پوچھتی ہوں کوئی اور چیز تو نہیں چاہیے ؟ تو وہ ہمیشہ یہی کہتا ہے ۔ خاوند نے رضیہ کو مطلب سمجھانے کی کوشش کی تو وہ ایک دم چپ ہو گئی ۔ بار بار پوچھا " تم بولتی کیوں نہیں ؟ بولتی کیوں نہیں ؟ " پھر کسی قدر ناخوشی اور ناراضی سے کہا " اب تو خوش ہو ہمارا لاڈلا ولائیت پاس تو ہو گیا !! "

روزی نے ایک دو ہتڑ اپنے سینے پر مارا اور روتی جاتی اور چیختی جاتی " ولائیت پاس ۔ ولائیت پاس " ۔

ڈاکٹر صاحب اپنے دیسی بھائی تھے ۔ انہوں نے پوری داستاں غور سے سنی تھی ۔ رسل کے ڈیڈی سے کہا " فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں ۔ فی الحال اس کو ایک معمولی سانفسیاتی جھٹکا لگا ہے ۔ دیکھتے ہیں آگے چل کر کیا ہو گا ؟

بہرحال رضیہ کو چند دن ہسپتال میں علاج کے بعد پہلے صدمہ سے کچھ افاقہ ہوا تو وہ اپنے گھر واپس آگئی ۔ لیکن کچھ اکھڑی اکھڑی سی ۔ یونہی ایک مدت گزر گئی ۔ ایک دن اس کا خاوند جب کام سے گھر آیا تو کیا دیکھتا ہے کہ رضیہ فرش پر نیم بے ہوش ، نیم برہنہ پڑی ہوئی ہے ۔ اس کی قمیص پھٹی ہوئی ، اس کا چہرہ سوجھا ہوا ۔ خدا خیر کرے ۔ اس کو کیا ہو گیا ؟ کسی آوارہ بدمعاش کی کارستانی تو نہیں ؟ کچھ بتاتی بھی تو نہیں کہ کیا ہوا ہے ؟ اس بے وقوف کو میں نے خواہ مخواہ پاس بلایا تھا ورنہ اچھے دن گزر رہے تھے ۔ خاوند نے ہسپتال والوں کو ٹیلی فون پر اطلاع کی ، ایمبولینس آئی اور رضیہ کو اٹھا کر ہسپتال لے گئی ۔ کمپیوٹر پر اس کا پرانا ریکارڈ دیکھ کر استقبالیہ نے اسی ڈاکٹر کو بلایا جس نے رضیہ کا پہلی مرتبہ علاج کیا تھا ۔ دیکھتے ہی دونوں نے ایک دوسرے کو پہچان لیا

ڈاکٹر   رضیہ تم نے کیا حالت بنا رکھی ہے ؟

رضیہ   ایک پھانس چبھ گئی ہے !

ڈاکٹر پھانس چبھ گئی ہے تو میں اسے ابھی نکالے دیتا ہوں ۔

رضیہ   نہیں ۔ ایسا نہیں ہے ۔ یہ پھانس بہت گہری ہے ۔ میرے کلیجے کے اندر جا گڑی ہے ۔

ڈاکٹر   لیکن وہ کلیجے کے اندر کیسے چلی گئی ؟

رضیہ ۔ ڈاکٹر ! سنئے تو !! ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے ۔ تم کیا جانو دنیا میں کیا کچھ نہیں ہوتا ۔ پہلے تمہارے علاج سے مجھے آرام آگیا تھا ۔ اس مرتبہ بھی شاید تمہیں میرے لئے مسیحا ثابت ہو ۔

بات یہ ہوئی کہ میرا بیٹا غلام رسول المعروف رسل گھر سے اکثر غیر حاضر رہنے لگا ۔ اس کے انتظار میں مجھے شب بھر نیند ہی نہیں آتی ۔ ایک رات گئے کیا ہوا کہ رسل شراب کے نشے میں جھومتا ہوا آیا ۔ قمیض پھٹی ہوئی ۔ ناک پچکی ہوئی ۔ ہونٹ اور گال سوجے ہوئے ۔ گویا باکسنگ رنگ سے ہو کر آیا ہے ۔ میں نے اسے بہتیرا پوچھا کیا ہوا لیکن وہ انگریزی میں بڑبڑاتا رہا ۔ روتے ، گاہے مسکراتے ہوئے وہ سو گیا ۔ بے وقوف نے کھانا بھی نہ کھایا ۔ حسب معمول میں نے صبح سویرے چائے بنائی ۔ رسل کو جگایا ۔ لو بیٹا اٹھو جلدی سے گرم گرم چائے پی لو ورنہ ٹھنڈی ہو جائے گی ۔

ڈاکٹر رضیہ تم نے تو رام کہانی چھیڑ دی ۔ دوسرے مریض بھی انتظار کر رہے ہیں ۔

رضیہ تو میں چلی جاتی ہوں ۔ پھر سہی ۔ جب آپ کو فرصت ہوگی ۔

ڈاکٹر اچھا رضیہ تو اس کے بعد کیا ہوا ؟

رضیہ ہوا یہ کہ رسل نے چائے پی ۔ اس کے بعد اچانک اس نے مجھے گلے لگا لیا ۔ مجھے سخت حیرت ہوئی کہ یہ کیا ڈرامہ کر رہا ہے ۔ کہنے لگا ، غور سے سنو امی جان ! میں نے تمہیں کئی بار آزمایا ہے کہ تم بہت اچھی ماں ہو ۔ آج مجھے تم سے دل کی بات کہنی ہے اور وہ بات یہ ہے کہ میں ایک گوری لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہوں ۔ تم اس سے مل کر خوش ہوگی ۔ یقیناً ایسا ایک خوبصورت لڑکی ہے میں تو یہ سن کر حیران اور شرمسار ہو کر رہ گئی رسل کا باپ نیک آدمی ہے ۔ میں نے بھی کبھی حتی الامکان صاف ستھری زندگی گزاری ہے اور یہ میرے پیٹ کا جنا مجھے کہہ رہا ہے کہ گوری سے شادی کرے گا !! نہیں رسل بیٹے نہیں ۔ ایسا کبھی نہیں ہوگا ۔ تم انگریزوں میں پھنس جاؤ گے

ہم لوگ صاحب وطن ہیں ۔ ہمارا اپنا ایک منفرد تمدن ہے ۔ یہاں ہم وطن بھی ہیں اور رشتہ دار بھی ۔ وہ کیا کہیں گے ؟ انسان کو اتنا بھی تو خود غرض نہیں ہونا چاہیے ۔ بوڑھوں کے سر پر وطن اور قوم کا کچھ قرض ہوتا ہے ۔ ایک دن مرنا بھی ہے ۔ خدا کے آگے حساب بھی دینا ہے ۔ اس معاملہ کی سنگینی کا کچھ تو خیال کرو ۔ نہیں بیٹا نہیں ۔ ایسا کبھی نہیں ہوگا ۔ میری سنو گے تو ایسا نہیں کرو گے ۔ لیکن رسل کچھ نہ بولا ۔ شاید ماں کے احترام کی وجہ سے کچھ کہنا تو چاہتا تھا لیکن کہہ نہ سکتا تھا ۔ آخر کار وہ میرے قدموں میں گر پڑا اور کہنے لگا " دیکھو امی جان ! میری پیاری امی ! میں مصیبت میں پھنس گیا ہوں ۔ اینا امید سے ہے ۔ میرا بچہ اس کی کوکھ میں پل رہا ہے ۔ اب میں مجبور ہوں ۔ کچھ کر بھی تو نہیں سکتا ۔ امی جان جس طرح تم مجھ سے پیار کرتی ہو تو کیا مجھے اپنا بچہ پیارا نہیں ہوگا ؟ لیکن تمہارا والد ایک غیرت مند انسان ہے ۔ گاؤں میں مشہور تھا کہ وہ لڑکا نہیں ایک لڑکی ہے شرمیلی سی ۔ اگرچہ وہ اپنے گن کا پکا تھا لیکن تھا پابند صوم و صلوٰۃ ۔ باوضو رہا کرتا تھا ۔ اس سے یہ بات منوانا آسان نہیں ہوگا ۔ رسل نے جواب دیا ۔ میرے باپ کی تم فکر نہ کرو ۔ وہ سیانا ہے ۔ اسے اس ملک میں رہتے ہوئے چالیس برس ہو گئے ہیں ۔ میں اس کا بیٹا ہوں ۔ وہ میری خواہش پوری کر کے یقیناً خوش ہوگا اس بات کا مجھے یقین ہے ۔ تم دیکھ لینا ۔ میرا ڈیڈی بہت خوش ہوگا ۔ اگر تم کو اتنا بھروسہ ہے تو تمہاری دوست کو میں پہلے دیکھوں گی ۔ اگر وہ مجھے پسند آگئی تو پھر تمہارے باپ سے ذکر کروں گی ۔ بات آگے بڑھاؤں گی ۔

ڈاکٹر سرجری کا وقت ختم ہونے کو ہے ۔ رضیہ ! تمہارا ایکسرے لیا جائے گا ۔ جاؤ اس میز پر لیٹ جاؤ ۔

رضیہ یہ پھانس تم کو ایکسرے کے بغیر ہی نظر آجائے گی تو میں کیا کہہ رہی تھی ۔ ہاں !! ایک شام رسل اینا کو ساتھ لایا ۔ کیا لاجواب تھا وہ شباب ۔ سفید رنگ ، نیلی آنکھیں ، سیاہ زلفیں اوپر اوپر منتشر ، بلاؤز سے نصف سینہ چھپایا ہوا ۔ میرے رسل کا کیا قصور ۔ میں نے اسے دیکھتے ہی ہاں کر دی ۔ زمانہ جو کہے گا ، دیکھا جائے گا ۔ دونوں نے خوش ہو کر سیٹیاں بجائیں اور گتھم گتھا ہو گئے ۔ آج میرا بیٹا خوش ہے ۔ خوشی سے میری باچھیں کھل گئیں ۔ صبح کے وقت جب رسل کا ڈیڈی نائٹ شفٹ کر کے کام سے گھر آیا ، کہنے لگا " آج تم خوش نظر آرہی ہو ۔ کیا بات ہے ؟ " میں نے کہا رسل کے ابو ! اگر غصہ نہ ہو تو ایک بات تم کو بتانا چاہتی ہوں ۔ کیوں ! کیا کوئی ضروری بات ہے ؟ ہاں بہت ضروری ہے ۔ رسل اب جوان ہو گیا ہے ۔ اس کی شادی

کا مسئلہ ہے۔ تو پھر کیا کوئی لڑکی ہے تمہاری نظر میں ؟ جی یہاں ایک لڑکی مجھے پسند آگئی ہے۔ خوبصورت، سفید رنگ، نیلی آنکھیں، سیاہ بال۔ وہ رسل کی دوست ہے۔ اس کا نام اینا ہے۔ لیکن میں اسے دیکھے بغیر تو کچھ نہیں کہہ سکتا۔ کل مجھے تو ویسے ہی چھٹی ہے۔ رسل کو کہو کہ اینا کو میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ شام کا وقت ٹھیک رہے گا۔ میں نے رسل کو بتایا کہ تمہارا ڈیڈی کل شام تم دونوں کو دیکھنا چاہتا ہے۔ اس کا مزاج ٹھیک لگتا ہے۔ انشاء اللہ تم کامیاب ہو جاؤ گے۔

شام سے قبل ہی رسل اور اینا مسکراتے ہوئے ہمارے گھر کی گھنٹی بجائے بغیر اندر داخل ہو گئے۔ میں نے اپنے خاوند کو کہا۔ وہ دونوں آگئے ہیں۔ اینا کو دیکھ کر خوش ہوئے ؟ میں نے سرگوشی کی کہ لڑکی کتنی حسین ہے۔ کتنی پیاری ہے۔ میری ہاں میں ہاں ملا کر کسی سوچ میں ڈوب گیا۔ کون جانے اسے مستقبل نظر آرہا ہو گا۔ موقع پا کر اس نے اپنے ایک پرانے بٹوے سے ایک پرانی تصویر نکالی۔ غور سے دیکھ کر فوٹو کو واپس بٹوے میں محفوظ رکھ دیا۔ میں رسل اور اینا کو ملنے کے بہانے دوسرے کمرے میں چلی گئی تھی۔ کیا کرتی دیواروں سے بات کرتی ؟ رسل کا باپ تو جواب ہی نہیں دیتا تھا۔ صرف ہاں یا نہ پر اکتفا کر رہا تھا...... ادھر سے آنکھ چرا کر جو میں نے دیکھا تو رسل کے ڈیڈی کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا رہے تھے۔ مجھے تجسس ہوا کہ اس فوٹو کے پیچھے ضرور کوئی راز ہے۔ اس نے آج تک مجھ سے کوئی بات چھپائی نہ تھی پھر بھی مرد کا کیا اعتبار ! میں تاڑ میں تھی کہ اسے نیند آجائے جب وہ سو گیا تو میں نے چپکے سے اس کی جیب سے بٹوہ نکالا۔ جب وہ کام پر چلا گیا تو میں نے فوٹو کو اطمینان سے دیکھا۔ اس میں ایک خوبصورت گوری، نیلی آنکھوں والی اور اس کے ساتھ میرا دولہا اپنی جوانی کے سیاہ بال لئے کھڑا ہے، گود میں ایک ننھی منی سی نیلی آنکھوں والی، سیاہ فراک پہنے ایک معصوم بچی کھڑی ہے۔ تینوں مسکرا رہے تھے۔ تصویر کی پشت پر بچی کا نام اردو رسم الخط میں آمنہ لکھا ہوا ہے . .

ڈاکٹر میں یہ سب دیکھ کر برداشت نہ کر سکی۔ میں رونے لگی۔ میں نے اپنا سر پیٹ لیا۔ میں بے ہوش ہو گئی تھی۔ میں تمہارے پاس کیسے پہنچی ؟ مجھے کچھ یاد نہیں۔ ڈاکٹر ! میرے کلیجے کی یہ پھانس بہت گہری ہے یہ ایکسرے میں نہیں آئے گی۔

کہاں جاؤں ؟ کس سے کہوں ؟ کیا کروں ؟؟؟؟؟

منصور عثمانی
ماہ و انجم منزل
نئی بستی، مراد آباد



غزل

کچھ اس طرح سے وفا کی مثال دیتا ہوں
سوال کرتا ہے کوئی تو مال دیتا ہوں

تصورات کی دنیا بھی خوب دنیا ہے
میں اس کے ذہن کو اپنے خیال دیتا ہوں

اسی سے کھاتا ہوں اکثر فریب منزل کا
میں جس کے پاؤں سے کانٹا نکال دیتا ہوں

وہ کائنات کی وسعت بیان کرتا ہے
میں ایک شعر غزل کا اچھال دیتا ہوں

کہیں عذاب نہ بن جائے زندگی منصور
اسے میں روز اک الجھن میں ڈال دیتا ہوں



شرف کمالی

غزل

شام غم دل تھا اداس اپنا بہت
کام آیا درد کا رشتہ بہت

زندگی میں اور بھی تھے مرحلے
آپ کا لیکن خیال آیا بہت

دودھ میں پانی ملاتا ہے وہ شخص
ورنہ ہے پابند مذہب کا بہت !

لے رہا ہے دشمنوں سے انتقام
تو بڑا ہو کر بھی ہے چھوٹا بہت

آج بھی تقدیر میں غم ہے شرف
آج کا سورج بھی ہے پیلا بہت

سلیم انصاری
599, Motinala, Nayapul,
JABALPUR (MP) 482 002

نظمیں

ایک ادھوری نظم

کھلونے۔
یوں تو میری دسترس میں ہیں
مگر۔ میں
آج ان کو چھو نہیں سکتا
کہ میرا بچپنا تو
دور ماضی کی
اندھیری وسعتوں میں کھو گیا ہے

ایک نظم

چلو رخت سفر کھولیں
مبادا
دھوپ جسموں سے گزر کر
آتماؤں کو جلا دے
گھنے پیڑوں کے سائے تک تڑپ لے تیز سورج
لہو میں تشنگی رہ راب بن کر پھیل جائے
اور قدموں سے لپٹ جائے سرابوں کی اداسی
چلو،
رخت سفر کھولیں
کہ ہم کو تازہ دم ہو کر
نئی سمتوں کو جانا ہے

محرومی

میں اکثر سوچتا ہوں
گلی میں کھیلتے بچے سے پوچھوں
تم اپنے باپ کی انگلی پکڑ کر کیوں نہیں چلتے؟
تم اپنی ماں کی چھاتی سے لپٹ کر کیوں نہیں سوتے؟
تمہارے چہرے پر سنجیدگی اچھی نہیں لگتی۔
مگر
میں جانتا ہوں
جب کسی زرخیز دھرتی سے
گرجتے بادلوں کے جھنڈ
بن برسے گزر جائیں
تو سب کچھ ٹوٹ جاتا ہے

کربِ تنہائی

ضیا حسنی
فتحپور (یوپی)

آخر جنوری کی ایک بے حد سرد صبح تھی۔

ایسی صبح جس کے خیال سے آج بھی جھرجھری سی محسوس ہونے لگتی ہے۔ میں نے جیسے ہی لحاف ہٹایا ہوا کا ایک سرد جھونکا تیر سی کر میرے جسم میں پیوست ہوگیا اور مجھے یوں لگا جیسے میرے ارادے اور منصوبے یخ بستہ ہوگئے ہوں۔ پھر میں نے جسم کو اچھی طرح لحاف سے ڈھک لیا۔ آرام ملا تو آنکھیں بند ہونے لگیں۔ عجیب حال ہے اس بدن کا۔ جتنا آرام دو اتنا ہی اور پیر پھیلاتا ہے۔ اگر چھٹی نہ ہوتی تو میں اب تک اسٹیشن پہنچ جاتا۔ ایسا خیال آتے ہی اچانک ایک رسیلی نسوانی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ تنہائی کے مکاں میں اپنے آپ آوازیں گونجا کرتی ہیں۔

"روزانہ چالیس میل دور سولی سے شہر آکر بینک کے کاؤنٹر پر سر کھپانا اور شام کو ہار تھک کر واپس جانا، کیسی تگ و دو کی زندگی ہے آپ کی۔ مانا کہ گاؤں کا پرسکون ماحول آپ کو بے حد پسند ہے تو آپ اس کا دامن پکڑے رہیے۔ میں نہیں چاہتی کہ آپ گاؤں اور کنبے کو چھوڑ دیں لیکن یہ مشورہ ضرور دوں گی کہ کام کے دنوں میں آپ شہر میں رہیں چھٹیاں گاؤں میں گزاریں۔ جہاں تک شہر میں ٹھکانا ڈھونڈنے کا معاملہ ہے، یہ آپ کے بس کا نہیں اس الجھی گتھی کو میں سلجھاؤں گی۔ آئیے کسی دن میرے یہاں"۔

ایسا خیال آتے ہی میرے جسم میں جیسے گرمی کی لہر دوڑ گئی۔ میں نے فوراً ہی بستر چھوڑ دیا۔ جلدی جلدی ضروریات سے فارغ ہوا۔ ناشتہ کیا کپڑے پہنے، چلتے ہوئے سگریٹ سلگائی اور ہولے ہولے سگریٹ کے کش لیتا ہوا اس پگڈنڈی پر چل پڑا جو نہر کی پٹری سے مل جاتی ہے۔ نہر کے دونوں طرف گیہوں، چنے اور سرسوں کے ہرے بھرے پودے سر ابھارے کھڑے تھے۔ ٹیوب ویل گیہوں کے پودوں کو سیراب کر رہا تھا۔ ایک لڑکا کھیت کے مینڈ پر کھڑا ہوا ٹرانسسٹر آن کئے ہوئے تھا اور لتا دل کش لے میں کوئی فلمی نغمہ گا رہی تھی۔ وہ سحر انگیز نغمہ میرے دامنِ دل کو کھینچے لگا لیکن میں آگے بڑھتا ہی گیا۔ اسی دوران میں گنے کے ایک کھیت سے ایک کسان نے مجھے آواز دی اور گنا پیش کیا۔ میں معذرت کر کے آگے بڑھ گیا اور سوچنے لگا۔

"گاؤں کا پرسکون ماحول اور یہاں کے لوگوں کا تصنع سے عاری برتاؤ شہر میں کہاں؟"

میں خیالوں میں ڈوبتا ہوا اسٹیشن آگیا۔ معمول کے مطابق چرمی بیگ کو کھول کر پلاسٹک کیس میں رکھے ہوئے منتھلی ریلوے پاس اور اسی تصویر کو دیکھا۔ پاس نہ صرف مجھے سستے داموں میں گاؤں سے شہر لے جاتا ہے بلکہ وقت بھی بچاتا ہے۔ کبھی قطار میں لگ کر ٹکٹ لیتا تھا تو کافی وقت ضائع ہوتا تھا۔ ٹرین کھڑی تھی۔ میں جلدی سے ایک کمپارٹمنٹ میں داخل ہوگیا اور ابھی میں نے بیٹھ کر سانس کا اتار چڑھاؤ بھی ٹھیک نہیں کیا تھا کہ وہ چل پڑی۔ ایسا لگا جیسے وہ میرا راستہ دیکھ رہی تھی۔

غرض اس نے ایک گھنٹے میں مجھے شہر پہنچا دیا۔ اب میں رکشا پر بیٹھا ہوا اس لمبی مصروف سڑک سے گزر رہا تھا جس کے دونوں طرف فلک بوس عمارتیں کھڑی ہیں جن کے مکینوں کو سورج کی شعاعیں پوری طرح نہیں ملتیں۔ ہوا کے خنک جھونکے میسر نہیں آتے۔ کنوئیں کا پانی نہیں ملتا خالص غذائیں دستیاب نہیں ہوتیں۔ یہ آسانیاں نہیں ہیں تو نہ ہوں۔ انسان کافی آگے بڑھ گیا ہے۔ اس نے اپنے مصنوعات سے اپنی زندگی کو اس قدر پرآسائش بنادیا ہے کہ وہ قدرت کی فیاضیوں سے لطف اندوز ہونے کی بات سوچتا ہی نہیں۔ شاید یہی سبب ہے کہ اس کی طبیعت میں تصنع رچ بس گیا

ہے۔ میں نے احمد منزل پہنچ کر کال بیل بجائی تو ایک نوجوان آیا۔ میں نے اسے اپنا نام بتاتے ہوئے کہا۔ "میں صبیحہ نوری سے ملنا چاہتا ہوں"۔
وہ مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھا کر اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر میں صبیحہ آ گئی۔ اس کے پتلے پتلے نازک ہونٹوں پر ایک خیر مقدمی مسکان کھل رہی تھی۔ اس نے بیش قیمت سبز ساری پہن رکھی تھی اور سلیو لیس بلاؤز سے اس کے جسم کے رنگینی چھلکی پڑتی تھی۔ اس کے کھلے ہوئے معطر بال اس کے شانے پر بکھرے ہوئے تھے۔ اس سے پہلے وہ بنک کے کاؤنٹر پر دو بار مل چکی تھی۔ لیکن وہ آج جیسے زیادہ دل کش لگ رہی تھی۔ اب اس نے میرے بالمقابل صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔
"آپ وعدہ کر کے بھولا نہ کیجئے۔ نہ جانے کتنے دنوں میں آپ کا بے چینی سے انتظار کر رہی تھی؟"
"معاف کیجئے، میں جلدی نہیں آسکا لیکن آج مجھے یہ جان کر خوشی بھی ہوئی کہ اس غرض مند دنیا میں کوئی بے لوث میرے لئے پاگل انتظار ہو رہا تھا"۔
وہ ہنسنے لگی لیکن میری اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اب جو میں نے اس کے چہرے کا جائزہ لیا تو اس کی معنی خیز خاموشی اس بے لوث جذبے کے ترجمانی کرتی ہوئی لگی، جسے انسانی ہمدردی کہتے ہیں۔
اسی اثناء میں عبدو چائے لے آیا۔ ہم دونوں چائے پی رہے تھے کہ ایک سن رسیدہ شخص لیکن تنومند، کلین شیو، سر کے بال ڈائی کئے ہوئے جن میں سے کہیں کہیں چاندی کے تار جھانک رہے تھے۔ کالے ورسٹیڈ کے پتلون پر ٹوئیڈ کا کوٹ پہنے، منہ میں سگار لگائے ہوئے میرے سامنے آکر کھڑا ہو گیا صبیحہ نے تعارف کرایا۔
"پاپا یہی ہیں جمیل صاحب! جنہوں نے بنک میں روپئے محفوظ کرانے میں مجھے بھرپور تعاون دیا تھا"۔
"میں ہر ڈپازیٹر کو اسی طرح تعاون دیتا ہوں۔ نہ جانے کیوں آپ اس خدمت کو اتنی اہمیت دے رہی ہیں؟"
"اب آپ کہیں نہ جائیے۔ شام کو یکسوئی کے ماحول میں باتیں ہوں گی"۔
"پاپا! باتیں کبھی ہوں گی۔ آج تو جمیل صاحب ٹی۔ وی پر "مغل اعظم" دیکھیں گے۔ احمد ہنستا ہوا چلا گیا۔ پھر صبیحہ نے مجھے وہ کمرہ دکھایا جو میرے لئے مخصوص کر دیا گیا تھا اس کے برابر میں ڈرائنگ روم تھا اور اس سے ملا ہوا ریڈنگ روم جہاں شیلفوں میں مختلف موضوعات پر کتابیں سلیقے سے رکھی ہوئی تھیں۔ معیاری ادبی جرائد بھی فائل کی صورت میں محفوظ تھے۔ کہاں میں مجھے کتابوں کا ایسا بیش بہا ذخیرہ میسر آیا۔ ان دونوں کمروں کے آگے لان تھا جس کے کنارے کنارے مہندی کی باڑھ تھی اور کہیں کہیں ہرے بھرے پودے کھڑے تھے جو معطر پھولوں سے لدے تھے ان کی بھینی بھینی خوشبو چاروں اور بکھرا کرتی تھی۔
غرض مجھے میلوں پھیلے ہوئے اس شہر میں ٹھکانا مل گیا تھا۔ میں ۱۰ دن شہر میں رہتا۔ احمد کے ساتھ ناشتہ کرتا کھانا کھاتا رات کی تنہائی میں کتابیں رفاقت کرتیں۔ ٹی۔ وی کے پروگرام دیکھتا اور ساتویں دن جب گاؤں جاتا تو مجھے اپنے کنبے کو دیکھ کر ترس آتا کہ ابھی وہ سہولتیں میسر نہیں، نہ ٹیوب لائٹ نہ ریڈیو نہ ٹی۔ وی اور نہ گیس کا انتظام، چولہا پھونکتے پھونکتے بیوی کی بینائی میں فرق آ گیا۔ اب صبیحہ مجھ سے کھل مل کر باتیں کرتی تھی۔ وہ دو بچوں کی ماں تھی۔ اس کا شوہر منظر کسی فرم کا ٹورنگ منیجر تھا جو تجارتی ضروریات کے تحت کبھی پٹنہ جاتا کبھی کلکتہ اور کٹک۔ جن دنوں میں وہاں پہنچا تھا صبیحہ اپنے دونوں بچوں کے ساتھ دو کمروں کے اس فلیٹ میں رہتی تھی جو ریڈنگ روم سے بالکل ملا ہوا تھا۔ اس کے دونوں بچے انگلش اسکول میں پڑھتے تھے۔ جب صبح کو میں چائے پیتا تو کانوینٹ کی کار انہیں لینے آجاتی اور شام کو جب میں دفتر سے واپس ہوتا تو وہ بچے گلاب کی طرح کھلے ہوئے لان میں کھیلتے ہوئے ملتے۔ دن بھر صبیحہ کوئی کام نہ کرتی، کبھی سہیلیوں سے باتیں کرتی، ناول پڑھتی یا فلمی نغمے سنا کرتی تھی۔ بظاہر اسے کوئی غم نہ تھا۔ روزانہ کئی بار میک اپ کرتی، زیورات پہنے رہتی اور بیش قیمت کپڑے زیب تن کئے رہتی تھی۔ ایک دن دوران گفتگو اس نے اچانک اپنے دل کی بات کہہ دی۔

"تمام خوشیوں کے باوجود تنہائی کا غم سانپ کی طرح پھنکارتا ہوا محسوس ہوتا ہے جمیل صاحب! اگر منظر آجاتے ہیں تو کبھی کبھی ایسی کڑوی کسیلی باتیں کرتے ہیں کہ میرا دل ٹوٹ جاتا ہے۔ میں فطرتاً شگفتہ مزاج ہوں، ہمیشہ پھول کی طرح کھلی رہتی ہوں اور ایک بات یہ بھی ہے کہ ہمیشہ قہقہہ بار ماحول میں زندگی گزری ہے لیکن منظر تو ہنسنا جانتے ہی نہیں۔ وہ اپنی فطرت سے گھر میں ایک مقبرہ کا ماحول بنائے رکھتے ہیں"۔

"افسوس ہوا لیکن آپ منظر کے مزاج میں خوشگوار تبدیلی لائیے! آپ چاہیں تو مردہ رگوں میں تازہ تازہ خون دوڑنے لگے اور منظر کے پہلو میں تو ایک جوان دل دھڑک رہا ہے"۔

"جی نہیں، ان کے پیکر میں صدیوں پرانی روح مقید ہے ان میں زندہ دلی آہی نہیں سکتی"۔

پھر میں نے بات آگے نہیں بڑھائی۔

ادھر صبیحہ جیسے ہی میرے سامنے آتی اس کی ازدواجی زندگی کے تلخ پہلو ابھرنے لگتے جن سے میرے دل کو ٹھیس لگتی اور میں خاموش بیٹھا ہوا خیالوں کی گہرائی میں ڈوبنے لگتا تھا لیکن صبیحہ مجھے خاموش نہیں رہنے دیتی تھی۔ ہنستی قہقہے لگاتی اور شوخ اشارے کرتی کہ میرے جسم میں زندگی کی لہر دوڑ جاتی۔ زندگی کے سفر مسلسل نے مجھے تھکا کر گہری نیند سلا دیا تھا۔ اسے میں نیند ہی کہوں گا کہ میں نے حالات کے جبر سے دنیا کی رنگارنگی سے یکسر آنکھ پھیر لی تھی۔ بس بیوی خواب کی طرح کبھی کبھی میری اجڑی زندگی میں بہار بن کر آجاتی تھی ویسے ہفتے عشرے میں کبھی میری دل داری کا موقع میسر آتا تھا ورنہ وہ شب و روز گھر گرہستی کے کاموں میں الجھی رہتی تھی۔

شوخ و طناز صبیحہ نے مجھے جھنجھوڑ کر جگا دیا۔ کاش! میں اس کی رسیلی بولی نہ سنتا اور اس کا دل کش سراپا نہ دیکھتا۔ صبیحہ سے میرا دل لگ جائے گا ایسا میں نے کبھی نہ سوچا تھا۔ وہ اچانک ملتفت ہوئی اس طرح جیسے کوئی ہولے ہولے راگ چھیڑے پھر اس کی لے کو بڑھا کر اس میں ایسی دل کشی پیدا کر دے کہ اس کی طرف بے اختیار دل کھنچنے لگے۔

اب تو میرا یہ حال ہے کہ میں اس کے اشاروں پر چلتا ہوں اور وہ جو چاہتی ہے اسے کرتا ہوں۔ میں بظاہر مطالعہ میں ڈوبا رہتا ہوں لیکن یہی جی چاہتا ہے کہ وہ دھنکی ہوئی روئی کی طرح نرم اور شہد کی طرح میٹھی میٹھی باتیں کرتی رہے۔ میں اس کی دلچسپ باتیں سنتا رہوں اور اس کے رخِ زیبا کو دیکھتا رہوں۔ میرا اچانک کیا حال ہو گیا ہے؟ ایسا تو میں کبھی نہیں رہا پھر بھی اس وارفتگی کے باوجود مجھے اپنے دل پر قابو ہے۔ کبھی حد سے آگے نہیں بڑھا اور نہ بڑھوں گا خواہ گھٹ کر جان ہی کیوں نہ دینی پڑے۔

وہ اپنے کنبے میں سب سے زیادہ اپنے والد سے متاثر تھی اور یہ تاثر کسی نہ کسی طرح ابھر کر میرے سامنے آجاتا تھا۔ اس نے دورانِ گفتگو مجھے سنایا تھا کہ احمد نے اپنی عملی زندگی ایک تعلقہ دار کے منشی کی حیثیت سے شروع کی تھی اور دھیرے دھیرے اس نے اپنی ان تھک محنت اور بے لوث عمل سے اسے اپنا گرویدہ بنا لیا تھا اور آخر وہ احمد سے اس حد تک خوش ہوا کہ جب وہ پاکستان جانے لگا تو اس نے سو ایکڑ مزروعہ زمین کا پٹہ اس کے نام لکھ دیا۔ احمد نے اس زمین کو چار چاند لگا دیئے۔ اسے جدید ترین طریقوں سے سنوارا اور زراعت کی آمدنی سے گھر بنوایا۔ لڑکوں کو اعلیٰ تعلیم دلائی۔ ایک لڑکا وکیل بنا دوسرا لیکچرار اور تیسرا میڈیکل کالج میں زیرِ تعلیم ہے۔ احمد نے صبیحہ کا ہاتھ منظر کے ہاتھ میں دے کر غلطی کی۔ کوئی غلطی ایسی ہوتی ہے کہ اس کی تلافی ہو نہیں پاتی اور اس کا خمیازہ ساری زندگی اٹھانا پڑتا ہے۔ احمد غریبی سے ابھرا تھا اس لئے اس نے ایک غریب شخص کو ابھارنے کی کوشش کی تھی لیکن منظر نے جلد ہی اپنی حیثیت کو فراموش کر دیا اور احمد کی عنایات کو پس پشت ڈال کر صبیحہ کو ستانے کا کوئی پہلو تشنہ نہیں چھوڑا۔ ایسے بھی افراد دنیا میں رہتے بستے ہیں۔ ایک دن وہ رنج و الم میں ڈوبی ہوئی میرے سامنے بیٹھ گئی اور ہچکیاں لینے لگی۔ میں نے اسے روتا ہوا دیکھا تو عجیب سا کرب محسوس کرنے لگا پھر میں نے اس سے ہمدردانہ لہجے میں پوچھا۔

"کیوں رو رہی ہو، صبیحہ"

"منظر مجھے اٹھتے بیٹھتے، بھینس کہا کرتے ہیں"

"انہیں کہنے دو اور اس طنز کو محسوس نہ کرو"۔

عام طور پر منظر مجھ سے ملتفت نہیں ہوتا تھا لیکن میں اسے صبیحہ کی طرف راغب کرنے کی کوشش کرتا تھا اور محض اس وجہ سے میں اس سے مل کر باتیں کرتا تھا۔ ایک بار میں نے صبیحہ کے بارے میں خواہ مخواہ بات کی۔

"آپ صبیحہ کو چھوڑ کر کبھی کلکتہ اور کبھی کٹک چلے جاتے ہیں۔ وہ یہاں تنہائی محسوس کرتی ہیں اور آپ کو بھی وہاں جدائی کاٹنے کی طرح کھٹکتی ہوگی"۔

"لیکن اب ایسی صورت نہیں ہے۔ آپ جو اس کی دل داری کرتے ہیں"۔ اس نے بھرپور طنز کیا۔

"میں ہمدردی اور دل جوئی تو کر سکتا ہوں لیکن جس محبت اور رفاقت کی انہیں تلاش ہے وہ صرف آپ سے مل سکتی ہے"۔

وہ خاموش ہو گیا اور تھوڑی دیر میں اس نے ریڈیو آن کر دیا۔

ایک بار میں غافل سو رہا تھا کہ منظر اور صبیحہ کے درمیان گرما گرم باتیں چل پڑیں، میں جاگ پڑا۔ یہ کڑی کسیلی باتیں میرے دل کو کھسیں چبھو رہی تھیں۔ کاش ایہ آوازیں میری سماعت سے ٹکراتیں لیکن رات کی خاموشی اور قربت"۔

"تم نے مجھے کیوں جگایا؟"

منظر نے تیز لہجے میں کہا۔

"پو کنارے پہنچ گیا تھا اور آپ بستر میں ڈوبے ہوئے تھے۔ وہ گر جاتا اور آپ کی نیند نہ ٹوٹتی۔ ممتا نے مجھے مجبور کر دیا"۔

"کیوں جھوٹ بولتی ہو؟ راتوں کو میرے ارد گرد منڈلایا کرتی ہو"۔

منظر! یہ کوئی گناہ نہیں ہے۔ تین برس ہوئے کہ تم نے مجھ سے ہنسنا بولنا بالکل ترک کر دیا ہے۔ میں گوشت پوست کی بنی ہوں پتھر کا نہیں ہوں۔ تم سمجھتے کیوں نہیں ہو"۔

بزمی عباسی چریالوئی
معرفت ڈاکٹر تحسین عباسی
پروگرام آفیسر آل انڈیا ریڈیو
گورکھپور ۔(یوپی)

غزل

زخم دل کے شراروں کو نیند آگئی
آتشیں آبشاروں کو نیند آگئی

شمع کی گود میں کتنے آرام سے
کچھ محبت کے ماروں کو نیند آگئی

دیکھ کر غنچہ و گل کے رخ پر تھکن
خود چمن کی بہاروں کو نیند آگئی

اب شب غم اکیلے ہمیں رہ گئے
معتبر چاند تاروں کو نیند آگئی

سب چلے راہ میں زندگی کی مگر
اس سفر میں ہزاروں کو نیند آگئی

کیسے کیسے زمانے میں تھے تاجور
ان سبھی تاجداروں کو نیند آگئی

دے کے بزمی لہو دیش کے نام پر
دیش کے غم گساروں کو نیند آگئی

۔ وجے میرٹھی
لکچرار، سیوکس
گورنمنٹ انٹر کالج
ہستناپور، میرٹھ (یوپی)

غزل

پاس کسی کی بات کا
کیف مری حیات کا

ٹھہرا ہوا یہ کارواں
دشت نظر میں رات کا

عشق بھی ایک مسئلہ
یارو اسی حیات کا

عقل نہ تصفیہ کرے
دل کے معاملات کا

مان گیا یہ حسن بھی
عشق دھنی تھا بات کا

شعر میں جان ڈالنا
کام ہے فکریات کا

زخم وجے شدید تھا
ٹوٹے تعلقات کا

سید احمد سحر
خلیل عزبی
شاہجہانپور ۔(یوپی)

غزل

جاگتی آنکھوں کا ایک اک خواب پتھر بن گیا
رفتہ رفتہ گھر کی ہر دیوار میں در بن گیا

لوٹ کر بستی وہ سمجھا تھا سکندر بن گیا
آئینے کے سامنے آتے ہی پتھر بن گیا

رات دیکھا تھا فلک سے اک ستارہ ٹوٹتے
صبح ہوتے ہوتے وہ میرا مقدر بن گیا

خاک صحرا عمر بھر چھانی مگر دیکھا نہیں
اس دہائی میں جو منظر گھر کے اندر بن گیا

جس نے بازاروں کو لوٹا بن گیا سالار قوم
جس نے معبد ڈھا دیئے دو چار رہبر بن گیا

ناز اس درجہ نہ کر اس کی رفاقت پر سحر
جب بھی رخ بدلا ہے موسم نے ستمگر بن گیا

عبدالمتین جامی
کٹک

غزل

لکھا ہے میں نے بھی تیرہ شبی کا افسانہ
خود اپنے دور کی بے چارگی کا افسانہ

طلسم فکر ہی لمحوں کو آئینہ دے گا
سنائے گا وہ کبھی آدمی کا افسانہ

یگانگی ہے بہت اس کی چشم حیرت میں
سنا ہے اس نے مری آذری کا افسانہ

فراستوں کے چھپتے ستاروں پر آکر
لکھا زمین کی آوارگی کا افسانہ

نقوش فکر ابھرتے ہیں اس کے چہرے پر
وہ سن رہا ہے مری مہوشی کا افسانہ

راحت حسن
پریم نشان، دودھ پور
علی گڑھ 202001

غزل

سراب روحِ عقیدت کی چاہ کا مذہب
ہوس ہے عاشقِ دل کی نگاہ کا مذہب

دوا نے درد سے چاہی ہے بندگی ورنہ
عبث ہی پوچھتی ہر ایک آہ کا مذہب

کسی بھی رنگ تعلق میں کچھ نہیں رکھا
کسے بچائے گا ابر سیاہ کا مذہب

تمام رونق ہستی، لباس کے دم سے
فروغ عظمت سر ہے کلاہ کا مذہب

بڑا نہیں ہے مسافر سے کوئی بھی مومن
وہی ہے دین کی منزل جو راہ کا مذہب

تمہیں تو مل گئے جنت کے سب مزے راحت
تم ہی بتاؤ پھر عالم پناہ کا مذہب

صابر جوہری
بازار کٹرہ، بھدوہی ۲۲۱۴۰۱

غزل

منسلک پاؤں سے ہے چکر کیا
ہجرتیں بن گئیں مقدر کیا

بھوک سے بلبلاتے بچوں کو
پھول سے نرم نرم بستر کیا

حلقۂ زندگی ہے لامحدود
موت ہے زندگی سے باہر کیا

زندگی لاکھ ہو عذاب مگر
زندگی سے ہے موت بہتر کیا

ظالموں کی نگاہ میں صابر
شاخِ سرسبز کیا، کبوتر کیا

بے حساب اور باحساب

سعید انجم

اوسلو (ناروے)

بے حساب

اترنے والے مسافروں نے اپنی سیٹیں چھوڑ دیں لیکن میری بغل میں بیٹھا مسافر اپنی سیٹ پر بیٹھا ہی رہا۔ لندن ایرپورٹ پر اس کے عربی لباس کی وجہ سے میں نے اندازہ لگایا تھا کہ اس کا ساتھ بس دبئی تک رہے گا۔ اب معلوم ہو رہا تھا کہ میرے اور پی آئی اے کے جہاز کی طرح اس کی منزل بھی کراچی ہی تھی۔

پورے سفر میں وہ تسبیح گھماتا رہا تھا۔ منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ کے وہ دانہ پھینکتا اور پھونکیں مارتا۔ پہلے اپنے دائیں اور پھر اپنے بائیں طرف۔ تسبیح کے دانے ختم ہو جانے پر وہ فضائی میزبان کو بلانے والا بٹن دبا دیتا اور سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر اپنی آنکھیں بند کر لیتا۔

"یس پلیز؟" ایر ہوسٹس آ کے کہتی۔

"کولا کولا!" شہادت کی انگلی اٹھا کر وہ بولتا۔

تین راؤنڈ کے بعد مجھے کوفت ہونے لگی۔ اس کی پھونکوں کا ہدف تو شاید اس کے اپنے کندھے تھے لیکن ان کی وجہ سے میرے اعصاب جواب دینے لگے۔

دبئی ابھی بہت دور تھا اس لیے کوئی خالی سیٹ دیکھنے کے لیے میں اٹھ کھڑا ہوا۔

جہاز کی پچھلی سیٹوں پر جگہ موجود تھی۔ میں وہیں بیٹھ گیا۔ جب دبئی پہنچنے کا اعلان ہوا تو اپنی اصلی سیٹ پر میں واپس آ گیا۔ میرا خیال تھا اب کراچی تک کا باقی سفر ہمسائے کی پھونکوں کے بغیر گزرے گا۔

اترنے والے مسافروں نے اپنی سیٹیں چھوڑ دیں لیکن میری بغل میں بیٹھا مسافر اپنی سیٹ پر بیٹھا ہی رہا۔

دبئی سے سوار ہونے والوں کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ سیٹ بدلنے کے بارے میں سوچنا بھی مشکل تھا۔ مجبوراً میں وہیں بیٹھا رہا۔

جہاز نے اڑان بھرلی تو فضائی میزبان نے مسافروں میں وہ فارم / کارڈ تقسیم کر دیے جو ایرپورٹ کے امیگریشن کاؤنٹر پر پاسپورٹ کے ساتھ سبھی لوگوں نے جمع کرانے تھے۔ اکثر مسافر انہیں پر کرنے لگے۔ میں نے بھی قلم نکال لیا۔

نام پتہ اور پاسپورٹ نمبر وغیرہ لکھنے کے بعد فارم کے آخری خانے میں تاریخ لکھ کر میں نے دستخط کیے اور پین بند کر دیا۔ اسی وقت میرے ہمسائے عربی مسافر نے اپنا کارڈ / فارم میرے سامنے رکھ دیا۔

"اسے بھی بھر دیں" وہ اردو میں بولا۔

"ارے؟" میں نے حیرانی سے پوچھا "آپ اردو بول سکتے ہیں؟"

"ہاں!" اس نے سرہلاتے ہوئے جواب دیا۔ "میں پاکستانی ہوں"۔ پھر اس نے اپنا پاسپورٹ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا "بس لکھنا پڑھنا نہیں آتا"۔

مجھے ایک جھٹکا لگا۔ راستے میں کوئی ایئر پاکٹ آگئی تھی۔
"عربی لباس آپ کو پسند ہے؟" فارم پر کرنے کے بعد میں نے پوچھا۔
"پسند ہی سمجھ لیں"۔ میرے ہمسائے نے جواب دیا۔ "سفر کرتے وقت میں اسے پہن لیتا ہوں"۔
"کیوں؟" میں نے پوچھا۔
"اس طرح مجھے فائدہ رہتا ہے"۔
"کیا؟"
"ایئر ہوسٹس ڈانٹنے کی بجائے خدمت کرتی ہے"۔
"خدمت؟۔ واقعی؟؟" مجھے اس کی بات پر کچھ یقین نہیں آیا۔
"ہاں! واقعی خدمت!!" وہ وثوق سے بولا "عربی چولا پہنا ہو تو کوکا کولا بے حساب ملتا ہے"۔ یہ کہتے ہوئے اس نے فضائی میزبان کو بلانے والا بٹن دبایا اور سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔

باحساب

میری طرف دیکھئے!۔ ہاں! اب ذرا مسکرائیے! شکریہ!! چلئے یہ تصویر والا کام تو ہوا۔ اب اپنے بائیو ڈیٹا کی کاپی آپ نے مجھ مہیا کرنی ہے۔ پاکستان میں کسی ذہین طالب علم سے، جس کو افسانے سے لگاؤ ہوگا، ہم آپ پر تھیسس لکھوائیں گے۔ جس کالج میں میں پڑھاتا ہوں وہاں ایم اے کی کلاسیں بھی ہوتی ہیں۔ ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ کے بعد میں ہی سینئر استاد ہوں۔ ہم مل کر ہی اس بات کا فیصلہ کرتے ہیں کہ طلباء کون سے ادیبوں پر کام کریں گے۔ جس زندہ ادیب پر تھیسس لکھا جانا ہو اس کی عمر کا ساٹھ سال سے زیادہ ہونا ضروری ہے۔ یہاں یورپ میں جو دو چار ادیب اس شرط کو پورا کرتے ہیں، آپ ان میں سے ایک ہیں۔ پھر آپ نے محنت بہت کی ہے۔ اب اس کا اعتراف ضروری ہے۔ اس سلسلے میں آپ کو صرف ایک تکلیف کرنا ہوگی۔ اپنی تخلیقات کی ایک فہرست بنانا پڑے گی۔ ان کو اکٹھا کرنے اور پڑھنے پڑھوانے کا کام ہم خود کر والیں گے۔ میں کوشش کروں گا کہ آپ پر کام میری نگرانی میں ہو تا کہ ادب کی حیثیت سے آپ کے صحیح مقام کا تعین کیا جا سکے۔

آپ کو یاد ہی ہو گا کہ جب آپ پاکستان تشریف لائے تھے تو کھانے کے لیے کسی ریستوران میں جانے کی بجائے میں آپ کو اپنے گھر لے گیا تھا۔ وہاں پر آپ سے جو گفتگو رہی تھی اسے انٹرویو کی صورت میں شہر کے معروف اخبار کے ادبی صفحے پر خوب نمایاں کر کے شائع کروا دیا تھا۔ ان دنوں ایک انگریزی اخبار کا ادبی صفحہ میرے پاس ہے۔ آپ کی تازہ ترین تخلیقات اور موجودہ خیالات کو میں اس اخبار میں شائع کراؤں گا۔ ساتھ میں آپ کی یہ تصویر ہوگی جو اس وقت میرے کیمرے میں محفوظ ہے۔

جی چاہتا ہے کسی روز میں آپ کی کتابیں دیکھوں۔ آپ گھر میں جس جگہ بیٹھ کر پڑھنے کا کام کرتے ہیں اس کے بارے میں کوئی رائے قائم کروں۔ میرا مطلب ہے کہ آپ کی شخصیت کے تخلیقی رخ کو میں اپنے ذہن میں اچھی طرح سما سکوں۔ اس طرح وہ مضمون جو میں انگریزی زبان میں لکھوں گا وہ آپ کی شخصیت کا ایک بھرپور تاثر پیدا کرے گا۔ آپ چاہیں تو اس مضمون کو یہاں مغرب کے اپنے دوستوں کو دکھائیں۔ وہاں لاہور میں تو یہ اس طالب علم کے لیے بہت کارآمد ہو گا جو اپنے ایم اے ڈگری کے لیے آپ کی افسانہ نگاری پر تھیسس لکھے گا۔

یہاں آپ کے شہر میں ایک دو دن کے لیے تو میرے موجودہ میزبانوں نے میری کچھ مصروفیات طے کر رکھی ہیں۔ قیام و طعام کا بندوبست چونکہ انہیں کا ہے اس لیے ان کی دی ہوئی ذمہ داریاں تو مجھے نبھانا ہی پڑیں گی لیکن اس کے بعد میں فارغ ہوں۔ آپ کے ہاں میں پرسوں سے آسکوں گا۔ کیا کہتے ہیں؟

غزلیں

ہم کو لبسِ شعر و ادب کے ہم نے دنیا چھانی ہے
ہم سے پوچھو کس دریا میں کتنا گہرا پانی ہے

شام ہوئی تو آگ لگی اس بیچ ستدی ہوٹل میں
آنکھ کھلی تو دیکھا ہم نے سب کچھ پانی پانی ہے

دل تو اس کا پاک محبت کا جل دے کر جیت لیا
اب اس کو کیسے سمجھاؤں پیار میرا جسمانی ہے

میں دیوانہ اپنے وطن کا مجھ کو ہجرت راس نہیں
ساری عمر اسی دھرتی پر مجھ کو خاک اڑانی ہے

جس دن سے دل میں اس کے اقرار کا سورج اتر گیا
جسم ہے اس کا روشن روشن چہرے پر تابانی ہے

نیکی کر کے اچھائی کی آس نہ رکھ ان لوگوں سے
امرت چینا، زہر اگلنا شہر کی ریت پرانی ہے

میں نے جسم کو اپنے ڈسوایا ہے اتنے سانپوں سے
دیکھ کے میری زہر پسندی دنیا کو حیرانی ہے

ہم تو اس ماحول میں بس یہ سوچ کے خوش ہو لیتے ہیں
کچھ بھی ہو انسان کا آخر چہرہ تو انسانی ہے

نجمی میں خورشید ہوں مجھ میں نور بھی ہے اور نار بھی ہے
کچھ لوگوں کو لاگ ہے مجھ سے کچھ لوگوں کو ہانی ہے



حنیف نجمی
گاؤں سودہا
محلہ اپروس
پوسٹ راگول، ضلع
یوپی۔ 210507

خار زار راہیں کیا کرب ناک منظر کیا
ہے اگر نفس تازہ کوہ کیا سمندر کیا

چل پڑو تو اے لوگو ہر قدم پہ منزل ہے
کیسی سمت لا یعنی ظلمتوں کے لشکر کیا

زندگی میں جب اپنی ہجرتوں کے موسم ہیں
ریشمی ردائیں کیا سایۂ صنوبر کیا

ساری عمر رہتا ہے کیا یونہی تھی کشکول
ہم فقیر زادوں کا ہے یہی مقدر کیا

اک سکوت کا عالم ہر طرف ہے دریا میں
بندھ گئے ہیں ساحل سے کشتیوں کے لنگر کیا

سبزہ زار خوابوں کے کیوں نظر نہیں آتے
آج کل زمینِ دل ہو گئی ہے بنجر کیا

ان کے فن سے واقف ہیں ہر طرح مبارکؔ ہم
ضربِ کارتیشہ کیا دھاردار خنجر کیا

ڈاکٹر مبارک انصاری
گورکھپور۔ ۲۷۳۰۰۱

جانے کس کے پیار میں کھوئی ہوئی بیکل ہوا
بن کے جوگن پھر رہی ہے در بدر پاگل ہوا

کل سمندر کے کنارے ہاتھ تھامے ریت پر
ساتھ میرے دیر تک چلتی رہی پیدل ہوا

کس طرح مایوس مجھ سے ہو گئی اے جانِ من
کھیلتی ہے ہاتھ میں لے کر ترا آنچل ہوا

گھر کے آئی تھی برسنے اس زمیں پہ جو گھٹا
لے اڑی اس کو نہ جانے کس طرف پاگل ہوا

جانے کس کی جستجو میں رہتی ہے محوِ سفر
صبح سے لے کر اکیلی شام تک بیکل ہوا

قید کر پایا نہ اس کو آج تک کوئی نثار
مٹھیوں میں آ نہیں پائی کبھی چنچل ہوا

نثار جیراجپوری
Department of Commerce
Shibli National P G College
Azamgarh - 276 001 (U.P)

محسنِ اردو۔ سعادت علی صدیقی مرحوم

(ایسی چنگاری بھی یارب اپنے خاکستر میں تھی)

پروفیسر نثار احمد فاروقی
صدر شعبہ عربی، دہلی یونیورسٹی
دہلی

اپنی شہرہ آفاق تصنیف "گلستاں" میں شیخ سعدی شیرازی نے لکھا ہے

فرشتہ، کہ وکیل است بر خزائن باد
چہ غم کند کہ بمیرد چراغِ پیر زنے

"یعنی جو فرشتہ ہوائیں چلانے پر مامور کیا گیا ہے وہ اس کا غم نہیں کرتا کہ اس کے ہوا چلانے سے کسی غریب بڑھیا کی کٹیا کا چراغ بجھ جائے گا" یہی نظام قدرت ہے، یہی سنت الہیہ ہے۔ کتنی قیمتی، مفید اور تعمیر پسند جانیں اچانک رخصت ہو جاتی ہیں، جن کی موت کو ہم ناوقت یا قبل از وقت کہتے ہیں اور جن کے بارے میں بہت سی امیدیں وابستہ کر لیتے ہیں، اور کتنی ہی پلید روحیں ایسی بھی ہوتی ہیں جن کی ہر سانس تخریب، ایذا رسانی، دوسروں کی حق تلفی اور ظلم میں گزرتی ہے اور ہم یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ موت کا فرشتہ انہیں شاید بھول گیا ہے۔ جو ہمارے دوست یا عزیز ہوں، جن کی زندگی تعمیر و اصلاح، جہد و اجتہاد، خدمت خلق اور معاشرے کی فلاح کے کام کر رہی ہو، ان کی جدائی کا رنج ہونا بشریت کا تقاضا ہے۔ بڑے سے بڑا غم کچھ دن رو دھو کر انسان بھول جاتا ہے۔ میں نے ہی کبھی کہا تھا

ہائے درد مجوری، خود ہی ہو گیا کم بھی
وقت کتنا ظالم ہے، زخم بھی ہے مرہم بھی

مگر کچھ زخم ایسے بھی ہوتے ہیں جو بظاہر مندمل ہو جاتے ہیں مگر ان کی ٹیس رگ و ریشے میں پیوست ہو جاتی ہے۔

ڈاکٹر سعادت علی صدیقی مرحوم کو ہم سے جدا ہوئے ایک سال بیت گیا، اور سال پر سال بیتتے رہیں گے یہاں تک کہ انہیں یاد کرتے ہوئے ہم خود بیت جائیں گے، ان کی جدائی کا زخم آج بھی ہرا ہے، ان کی یاد اچانک ایسے چمک اٹھی ہے جیسے پروائی میں چوٹ میں کسک ہونے لگتی ہے۔ وہ چلے گئے تو یہی احساس ہوتا ہے کہ اردو کی بے کس بڑھیا کے جھونپڑے کا ایک دیا گل ہو گیا۔ وہ ایک درو افتادہ قصبے میں بیٹھ کر نہایت خاموشی، لگن، استغنا اور استقلال سے اردو کی کیسی خدمت کر رہے تھے، ایسا وفادار خادم فی الحال کوئی نظر نہیں آتا۔

سعادت مرحوم سے میری ملاقاتیں کم رہیں، خط و کتابت اکثر ہوئی۔ وہ کسی تصنع یا تکلف کے بغیر ہمیشہ ایسے انکسار، تواضع اور عقیدت سے ملتے تھے کہ میں خود اپنے آپ سے شرمندہ ہونے لگتا تھا۔ سعادت خود عزت، شہرت یا سماجی امتیاز کی بھیک نہیں مانگتے تھے دوسروں کو عزت دے کر، ان کا احترام کر کے اور ان کے حقیر سے کاموں کو بھی نمایاں کر کے جی خوش حاصل کرتے تھے، اسی لیے ان کے دوست، شناسا، شاگرد، رشتہ دار سب ان کی یاد میں سوگوار ہیں۔

اے ہم نفساں محفلِ ما
رفتید ولے نہ از دلِ ما

وہ کچھ عرصے تک دہلی یونیورسٹی میں ایم لٹ کے طالب علم رہے، پھر روسی طلبہ کو اردو، پڑھانے کے لیے ایک عارضی لکچرر کی حیثیت سے بھی کام کیا۔ ان کا تعلق شعبہء اردو سے تھا۔ میں شعبہء عربی میں استاد تھا، ان سے میرا استاد و شاگرد کا رشتہ کبھی ایک دن کے لیے بھی قائم نہیں ہوا، مگر وہ جب بھی ملتے تھے یا خط لکھتے تھے تو مجھے اپنا استاد اور خود شاگرد ہی ظاہر کرتے تھے۔ اس طرح کسی کا احترام کرنے کے لیے بڑا ظرف چاہیے اور اللہ نے انہیں یہ ظرف دیا تھا۔

ان کی شرافت، اخلاق، بے نفسی، اخلاص اور استقامت کے علاوہ مجھے ان کی یہ ادا بھی پسند تھی کہ وہ بہترین تعلیمی رکارڈ رکھتے تھے، ایسی صلاحیت کے نوجوان عموماً یہی چاہتے ہیں کہ کسی بڑے شہر میں، کسی نامور یونیورسٹی میں، کسی ممتاز تعلیمی ادارے میں انہیں ملازمت ملے تاکہ بڑے شہر اور بڑے ادارے میں رہ کر وہ بہت سے دوسرے فائدے بھی حاصل کر سکیں۔ سعادت مرحوم بھی اگر ایک دو سال عارضی طور پر دہلی یونیورسٹی میں کام کرتے رہتے تو انہیں مستقل لکچرر شپ مل ہی جاتی۔ ان کے سامنے مہاتما گاندھی میموریل ڈگری کالج سنبھل ضلع مراد آباد میں اردو کے لکچرر کی پوزیشن پیش کی گئی، انہوں نے اسے قبول کر لیا اور پھر دل و جان سے اپنے کالج کی ایسی خدمت کی کہ وہاں پوسٹ گریجویٹ کلاس بھی شروع کرا دی، مغربی اتر پردیش کے کالجوں میں مہاتما گاندھی کالج کا نام بھی ابھر کر سامنے آنے لگا، یہی نہیں، وہ قصبہ سنبھل جو کبھی "سرکار سنبھل" کہلاتا تھا اور جس کی حیثیت ایک صوبائی راجدھانی کی سی تھی، جہاں پر علم و فن کے علماء، ماہرین، صوفیہ، شعراء ہوا کرتے تھے اور جو اب کئی صدیوں سے تاریخ کے آغوش میں سو رہا تھا اسے سعادت نے جگا دیا اور شمالی ہندوستان کے نقشے میں سنبھل بھی نظر آنے لگا۔ سنبھل کے باشندے اپنی انفرادی اور اجتماعی خوبیوں میں کسی سے کم نہیں، بڑا حوصلہ رکھتے ہیں، محنتی ہوتے ہیں، دل کھول کر خرچ کرنا بھی جانتے ہیں، اللہ نے انہیں خوش حال بھی بنایا ہے مگر ان کی صلاحیتوں کا جگانے والا اور خود ان کی شاندار تاریخ کا آئینہ دکھانے والا کوئی نہ تھا اس لیے وہ خود اپنی قدر و قیمت سے بے خبر ہو گئے تھے۔ اپنی تجارت اور زراعت اور صنعت و حرفت میں مگن تھے۔ انہیں سعادت مرحوم نے آئینہ دکھایا، ان کا ماضی یاد دلایا۔ دیکھتے ہی دیکھتے سنبھل میں علم و ادب کا چرچا ہونے لگا۔ کالج میں اردو پڑھنے والوں کی تعداد بڑھنے لگی۔ نواب عاشق حسین خاں مرحوم کی یاد میں ایک اچھی لائبریری قائم ہو گئی اس کی خوشنما عمارت بن گئی، کانفرنسیں، سیمینار، لکچر وغیرہ ہونے لگے۔ سنبھل کی قدیم تاریخ کو بھی انہوں نے کریدنا شروع کیا۔ ایسی شخصیتوں کو ڈھونڈ نکالا جو گمنامی کے بستہ خانوں میں بند پڑی تھیں۔ انہوں نے سنبھل کے علماء پر ایک کتاب لکھی، سنبھل کے شعراء پر دو جلدوں کے بہ قدر کام کر لیا اور اس میں اضافہ جاری تھا، سنبھل کے جن باشندوں نے جنگ آزادی میں مجاہدانہ کردار ادا کیا تھا اور سرفروشی کے جوہر دکھائے تھے ان پر بھی ایک کتاب لکھ دی۔ یہ اس شہر پر سعادت کا احسان ہے جس نے انہیں روزگار دیا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ سنبھل کے شریف النفس انسان ان کی خدمات کو کبھی فراموش نہیں کریں گے اور اس شہر میں اردو زبان و ادب کی ترقی اور ترویج کے لیے سعادت مرحوم کے نام سے کوئی یادگار ضرور قائم کریں گے۔

لکھنؤ کے قریب قصبہ سندیلہ پرانی بستی ہے اس کے ایک ممتاز و معزز زمیندار گھرانے سے سعادت کا تعلق تھا ان کے والد محترم ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی ۱۹۴۵ء سے ۱۹۶۱ء تک ممتاز کالج لکھنؤ میں لکچرر رہے، نومبر ۱۹۶۱ء میں ان کا تقرر شعبہء اردو لکھنؤ یونیورسٹی میں ہوا، وہیں سے ریٹائر ہوئے اور الحمدللہ ابھی صدر حیات میں ہیں اگر چہ سعادت جیسے سعادت مند فرزند کی ناگہانی موت نے اس زندگی کو **لا یموت فیہا و لا یحییٰ** بنا دیا ہوگا۔ بقول غالب

رگ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا
جسے غم سمجھ رہے ہو، یہ اگر شرار ہوتا

سعادت ۱۵ / مارچ ۱۹۴۵ء کو لکھنؤ ہی میں پیدا ہوئے۔ اپنے والد محترم اور نہایت شفیق چچا جناب شفاعت علی سندیلوی کے سایہء عاطفت میں پرورش پائی۔ ممتاز کالج لکھنؤ میں ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد لکھنؤ یونیورسٹی سے بی۔اے (۱۹۶۳) پھر ایم۔اے (۱۹۶۵) کیا، ایم لٹ کرنے کے لیے دو سال تک دہلی یونیورسٹی میں طالب علم رہے (۱۹۶۶ تا ۱۹۶۸)۔ ایم لٹ میں ایک مقالہ (DISSERTATION) بھی لکھنا ہوتا ہے، سعادت کے مقالے کا موضوع تھا "اودھ میں واجد علی شاہ کے عہد میں اردو ادب کا تہذیبی و سماجی پس منظر"۔ انہوں نے ۱۹۸۲ میں لکھنؤ یونیورسٹی سے پی۔ایچ۔ڈی کی سند حاصل کی، ان کے تھیسس کا موضوع تھا "اردو کا زندانی ادب"۔ یہ ۱۹۹۰ء میں شائع ہو چکا ہے اور ابھی تک اپنے موضوع پر

واحد کتاب ہے۔

سعادت نے طالب علمی کے ابتدائی دور سے ہی لکھنا شروع کر دیا تھا۔ ان کے مضامین جو اردو کے ادبی رسالوں میں شائع ہوئے ۷۰-۸۰ سے کم نہ ہوں گے۔ لکھنؤ، رامپور اور دہلی کے ریڈیو سے درجنوں تقریریں نشر کیں جن میں سے بعض ادبی جائزے (۱۹۷۴) اور ادبی آئینے (۱۹۸۳) جیسے مجموعوں میں شامل بھی ہیں۔

سعادت کا خط بہت پاکیزہ تھا۔ واقعی موتی مانک دیتے تھے۔ ان کا اسلوب سہل اور شگفتہ تھا، زبان نک سکھ سے درست اور اظہار مطالب میں چست ہوتی تھی۔ لکھنوی تہذیب اور شائستگی جیسی ان کے کردار و گفتار میں تھی ویسی ہی تحریروں میں بھی نظر آتی ہے۔ ان کا رجحان تنقید سے زیادہ تحقیق کی جانب تھا۔ اگر زندگی ان سے وفا کرتی تو ان کے مطالعے کی وسعت کے ساتھ تحقیقی مزاج میں بھی اور پختگی آجاتی۔

سعادت کی مطبوعہ کتابوں کی فہرست کچھ یوں ہے

(۱) آئینہ نثر اردو	۱۹۶۵ء
(۲) شرح ادب پارے (برائے طلبہ)	۱۹۶۶ء
(۳) بچوں کی لوک کہانیاں	۱۹۷۰ء
(۴) حسبیہ غالب	۱۹۷۱ء
(۵) ادبی جائزے (مضامین)	۱۹۷۴ء
(۶) وہ جب یاد آئے (خاکے اور تاثراتی مضامین)	۱۹۸۲ء
(۷) حدیث محبت (انتخاب کلام فرخ گیسوی)	۱۹۸۳ء
(۸) تذکرہ شعرائے سنبھل (دو جلدیں)	۱۹۸۳ء
(۹) چند ممتاز شعرائے سنبھل	۱۹۸۳ء
(۱۰) غالب پر چند تحریریں	۱۹۹۰ء
(۱۱) اردو کا رمدائی ادب	۱۹۹۰ء
(۱۲) سنبھل کے چند اکابر علماء و مجاہدین آزادی	۱۹۹۲ء
(۱۳) چاند میں خرگوش (بچوں کے لیے)	۱۹۹۳ء
(۱۴) ادبی تحریریں	۱۹۸۹ء
(۱۵) پریم نامہ	۱۹۹۴ء

ان کے علاوہ "گیسوئے اردو" ادبی تنویریں، انتخاب کلام شوق فریدی وغیرہ بھی ان کی کتابیں ہیں۔ متعدد موضوعات پر وہ بیک وقت کام کرتے رہتے تھے۔ انہوں نے تقریباً پانچ کتابوں کے مسودات بھی غیر مطبوعہ چھوڑے ہیں۔ کاش ان مرحوم کے قدر دانوں میں سے کوئی ان کی اشاعت کا بیڑہ اٹھالے۔

سعادت کی عملی زندگی کا دوسرا پہلو ان کی وہ ان تھک محنت تھی جو وہ اردو زبان کے فروغ اور ترقی کے لیے کرتے رہے۔ انہوں نے صرف مہاتما گاندھی کالج میں بی ایم۔اے اردو کا نصاب شروع نہیں کرایا بلکہ ان کی لگاتار دوڑ دھوپ سے روہیل کھنڈ کے متعدد اسکولوں اور کالجوں میں اردو کی تعلیم و تدریس کا انتظام ہوا۔ انہوں نے گورنمنٹ گرلز ہائی اسکول سنبھل، شنکر کالج، شری امید رائے ہائی اسکول حیات نگر، حکیم رئیس ہائر سکنڈری اسکول، سنبھل میں اردو کی تدریس کا انتظام کرایا اس کے علاوہ آس پاس کے اضلاع میں بھی اردو تعلیم کے لیے برابر کوشش کرتے رہے۔ ہندو پوسٹ گریجویٹ کالج مرادآباد، گوکل داس پوسٹ گریجویٹ کالج، کے جی کے کالج، مہاراجہ ہریش چند کالج اور بریلی کے آریہ کنیا کالج، بجنور کے گلاب سنگھ کالج امروہہ کے ہندو ڈگری کالج میں اردو کلاسیں شروع کرانے کی کوشش میں وہ برابر شریک رہے۔

سنبھل کے خاموش ماحول میں تعلیمی اور ثقافتی چہل پہل بھی سعادت کے دم سے شروع ہوئی۔ انہوں نے ۱۹۷۳ء میں وہاں انجمن ترقی اردو (ہند) کی شاخ قائم کی جس کے اہتمام سے متعدد ادبی اجلاس اور لکچر وغیرہ ہوئے۔ ۱۹۷۴ء میں وہاں اردو کانفرنس منعقد کی جس میں ممتاز شخصیتوں نے شرکت کی ورنہ ادبی دنیا کے لوگ سنبھل کا نام بھی فراموش کر چکے تھے۔ وہ اردو تعلیمی جائزہ کمیٹی اور اردو رابطہ کمیٹی سے بھی وابستہ رہے۔ دو سال تک یوپی اردو اکادمی کے نہایت فعال رکن اور اس کی متعدد اہم سب کمیٹیوں کے ممبر رہے۔

۲۷ - ۲۸ مارچ ۱۹۹۳ء کو میں نے اورینٹل سوسائٹی امروہہ کے زیر اہتمام اور ترقی اردو بیورو حکومت ہند کے مالی تعاون سے ایک سہ روزہ سیمینار امروہہ میں کیا تھا، اس کا موضوع تھا "اردو زبان و ادب کی ترقی میں روہیل کھنڈ کا حصہ"۔ اس کے بارے میں سعادت مرحوم سے خط و کتابت رہی، انہوں نے کئی مندوبین کے نام تجویز کیے اس سیمینار سے اپنی خصوصی دلچسپی کا اظہار کیا، مگر اپنی علالت کی وجہ سے اس میں شرکت سے قاصر رہے۔ اسی موضوع پر دوسرا سیمینار انہوں نے سنبھل میں منعقد کرنے کا پروگرام بنایا تھا، خاصی پیش رفت بھی ہو چکی تھی، مگر ان کی مسلسل گرتی ہوئی صحت اور پھر وفات کی وجہ سے یہ پروگرام نہ ہو سکا۔

آخری زمانے میں انہوں نے ایک اور نہایت قابل قدر کام "یہ بستیاں ہماریاں" کے عنوان سے شروع کیا تھا اور اس کی چند قسطیں "قومی آواز" میں شائع بھی ہوئیں یعنی وہ روہیل کھنڈ کی چھوٹی چھوٹی بستیوں اور قصبوں کی ادبی تہذیبی تاریخ لکھ رہے تھے جیسے سرسی، ادمری، ٹھاکر دوارہ، بھجراؤں وغیرہ۔ مجھے یہ مضامین پڑھ کر بہت خوشی ہوئی تھی کہ سعادت کی بے لوث محنت سے روہیل کھنڈ کے ان گمنام علاقوں کی تاریخ مرتب ہو جائے گی اور ان بستیوں میں جو اہم شخصیات پیدا ہوئی ہیں ان کی خدمات منظر عام پر آئیں گی۔ مگر قضائے الٰہی کچھ اور ہی تھی۔ تاریخ لکھتے لکھتے سعادت خود تاریخ کے اوراق میں گم ہو گئے۔

سعادت کو ان کی کتابوں پر اردو اکادمی لکھنؤ نے کئی بار ایوارڈ بھی دیے۔ ۱۹۷۱ء، ۱۹۷۴ء، ۱۹۸۳ء اور ۱۹۸۹ء کی انعام یافتہ کتابوں میں سعادت کی تصانیف بھی ملتی ہیں۔ آل انڈیا میر اکیڈمی لکھنؤ نے انہیں "میر ایوارڈ" کے لیے منتخب کیا۔ نگینہ ضلع بجنور کے ادب دوستوں نے فرخ میموریل ایوارڈ پیش کیا۔ اردو تحریک سے عملی ہمدردی رکھنے والوں نے انہیں "محسن اردو" کا خطاب دیا جو ان کے نام اور کام پر سجتا ہے اور صادق آتا ہے۔ مگر ایمانداری کی بات یہ ہے کہ سعادت کی شخصیت، درویشانہ سیرت، بے ریا خدمت، ذہانت، ذکاوت، اخلاق، متانت اور اپنے کام میں استقامت کے مقابلے میں یہ سب ایوارڈ بہت فروتر ہیں ان کے اعمال حسنہ کا صحیح ایوارڈ تو انہیں اب مل رہا ہوگا۔

رمضان ۱۴۱۴ھ کی پہلی تاریخ تھی، اتوار کا دن تھا فروری ۱۹۹۴ء کو تیرھویں شب تھی کہ یہ سرمایہ سعادت، ہم سے چھین لیا گیا۔ پلک جھپکتے ایک سال گزر گیا ہے، لیکن آج بھی سعادت کا چہرہ نگاہوں کے سامنے ہے۔ ایک درویش کا، ایک قلندر کا، ایک مجاہد کا چہرہ۔

گزر گئے ماہ و سال لیکن کبھی کبھی میں یہ سوچتا ہوں
جہاں سے دامن چھڑا کے کوئی گیا تھا اب تک وہیں کھڑا ہوں

ظفر اوگانوی کا انتقال

(کلکتہ) ممتاز افسانہ نگار اور محقق و نقاد ڈاکٹر ظفر اوگانوی ۲۱ جون ۹۶ء کو کینسر کے مرض سے جد و جہد کرتے ہوئے انتقال فرما گئے۔

پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ ایک بیٹا اور چار بیٹیاں ہیں۔

مرحوم یکم جنوری ۱۹۳۸ء کو بہار کے ایک علمی اور دیندار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ پٹنہ یونیورسٹی سے اردو میں ایم۔ اے اور وہیں سے پی۔ ایچ۔ ڈی کیا۔ پھر کلکتہ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے وابستہ ہو گئے۔ ریڈر، پروفیسر اور صدر شعبہ رہے۔ مغربی بنگال کالج سروس کے رکن رہے اور وفات کے وقت مغربی بنگال اقلیتی کمیشن کے چیئرمین تھے۔ ۲۲ جون کو گوبرا قبرستان میں سرکاری اعزاز کے ساتھ ان کی تدفین ہوئی۔

وہ چار کتابوں کے مصنف بھی تھے۔ "بیچ کا ورق" بہت مشہور ہوئی۔ بہار میں جب تھے تو ایک رسالہ "اقدار" شائع کیا جو پنپ نہ سکا۔ وہ شاعر بھی تھے۔ بہ حیثیت استاد شفیق رہنما ثابت ہوئے۔ ان کے کئی شاگردوں نے اپنے اپنے فن میں نام کمایا۔

ادارہ انشاء ان کے پسماندگان سے گہرے دکھ کا اظہار کرتا ہے۔

ہرچرن چاولہ : فن اور شخصیت

کسم جین، کلکتہ
ہندی سے ترجمہ . شاہدہ وسیم (اوسلو، ناروے)

ہرچرن چاولہ سے میری پہلی ملاقات ونٹوری، کینیڈا میں پاکستانی ادیب و نفسیاتی معالج خالد سہیل کے فلیٹ میں ہوئی تھی۔ دراصل گنیش جی اور میں کلکتہ سے وہاں جاکر بسے شاعر جاوید دانش کی دعوت پر وہاں گئے تھے۔ جاوید ان دنوں خالد کے ساتھ رہتے تھے۔ اس لئے ہم ایک طرح سے ان دونوں کے مہمان تھے۔

جب خالد نے بتایا کہ آج شام اردو کے ادیب ہرچرن چاولہ تشریف لارہے ہیں تو ہمارا سوال تھا۔ "کیا کسی کام کے سلسلے میں؟"

"جی نہیں۔ اڈا لگانے (گپ شپ کرنے)" خالد کا جواب تھا۔

"ناروے سے محض اڈا لگانے؟ بات کچھ جچی نہیں"۔ بعد میں پتہ چلا کہ پورنیما چاولہ کا عشق انہیں کینیڈا کھینچ لایا تھا جو ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ سے بھیجی گئی ایک کلچرل سیمینار کے سلسلے میں چند روز کے لئے وہاں ٹورنٹو یونیورسٹی میں مقیم تھیں اور ناروے کی نمائندگی کر رہی تھیں۔

کچھ دیر بعد امریکہ سے شاعر ناشاد بھی آگئے۔ ہم نے آہستہ سے خالد سے پوچھا۔ "کیا یہ بھی اڈا لگانے آئے ہیں؟"

"جی ہاں"۔ اور یہ کوئی پہلی بار نہیں ہے۔ ایسے اڈے یہاں اکثر لگتے ہی رہتے ہیں۔ اڈے بازی کا یہ شغل ہماری زندگی کا ایک اہم حصہ ہے۔

اس ایک رات کی اڈے بازی کے بعد ہمیں اس کی بات پر یقین آگیا۔ دراصل اسے دیوانوں کی ایک محفل کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ سرپھروں کی ایک ایسی انجمن جن کے لئے ادب اور ادبی رشتے ہی سب سے اہم ہوتے ہیں۔

رات دس بجے تک کھانا پینا ختم کرنے کے بعد کافی کے پیالوں پر بات چیت کا جو سلسلہ شروع ہوا تو صبح چار بجے تک چلتا رہا۔ ساری رات آسمان کے نیچے سات آسمانوں تک کی گفتگو ہوتی رہی۔ مذہب اور ملک کی سرحدوں سے کہیں پرے۔

بعد میں ہمیں پتہ چلا کہ جمعہ اور ہفتہ کی رات اکثر اس قسم کی محفلیں وہاں جمتی ہیں اور کبھی کبھی تو خالد کا تین کمروں کا اچھا خاصا فلیٹ بھی چھوٹا پڑجاتا ہے۔ اور تب کچھ مستانوں کو ڈرائنگ روم تک میں پاؤں پسارنے پڑتے ہیں۔

چاولہ صاحب سے اس اتفاقی ملاقات سے ہمیں ان کی شخصیت، کردار اور فن افسانہ نگاری کے روبرو ہونے کا موقعہ ملا۔ حالانکہ اس وقت تک ہم ان کے دو چار ہی افسانے پڑھے تھے لیکن اس رات کی محفل کے بعد تو ہم ان کے پکے مرید ہوگئے۔ بعد میں ان سے کلکتہ اور دہلی میں ملاقاتیں ہوئیں۔ پھر ۱۹۹۴ء میں اوسلو (ناروے) میں ہمیں ان کے ہاں سات دن مہماں ہونے کا موقعہ ملا۔

ہرچرن چاولہ افسانہ نگار ہونے کے ساتھ ساتھ ایسے معصوم انسان ہیں جو نیچر کی ہر چیز سے محبت کرتے ہیں۔ جب وہ جانوروں کا کوئی افسانہ لکھتے ہیں تو پڑھ کر ایسا لگتا ہے، جیسے وہ ان کی زماں سے ہی ہیں، احساسات سے بھی پوری واقفیت رکھتے ہیں ایسا انسان کبھی کسی سے حتیٰ کہ اپنے دشمن سے بھی نفرت نہیں کر سکتا۔ یہ میری ذاتی رائے ہے کہ اچھے ادیب کا اچھا انساں ہونا لازمی ہے۔ تبھی وہ پڑھنے والے کے دل کو چھو سکتا ہے۔

چاولہ صاحب سے روحانی ملاقات سالوں پہلے تب ہوئی تھی جب ان کا ناول "درندے" پڑھا تھا۔ چاولہ صاحب اردو میں لکھتے ہیں مگر ان کی تخلیقات ہندی میں بھی خوش قسمتی سے ترجمہ ہوتی رہتی ہیں اس لئے انہیں اردو اور ہندی میں برابر کی شہرت ملتی رہی ہے۔ میرے جیسے بے شمار لوگ ہیں جو ان کی تحریروں کو بڑے شوق سے پڑھتے ہیں۔

ایک ایسے وقت جب الفاظ اپنے معنی کھو رہے ہیں، اور بجلی قندیلوں میں تبدیل ہو رہے ہیں کوئی پہلے جیسی تپش سے انہیں جلاکر اپنے افسانے

تخلیق کرے تو یقیناً وہ افسانے اپنی سرحدیں پھلانگ کر یادداشت میں دائمی طور پر محفوظ ہو جاتے ہیں۔ کچھ افسانے ایسے ہوتے ہیں جو ایک بار پڑھ لینے کے بعد بھی زندگی بھر ذہن میں کھلبلی مچائے رکھتے ہیں اور چپکے چپکے سوچوں کی راہیں بدل دیتے ہیں۔ وہ نہ صرف قاری بلکہ خود افسانہ نگار کی زندگی میں تعبیرات کے نئے در کھولتے چلے جاتے ہیں۔ ایک سوچ کے اندر سے ایک نئی اور نرالی سوچ کو جنم دیتے ہیں اور اس طرح آدمی باہر سے ہی نہیں، باطن میں بھی ایک نئی تبدیلی محسوس کرتا ہے۔ ہرچرن چاولہ کے افسانے کچھ اسی قسم کے افسانے ہوتے ہیں جو انسان میں جدید احساسات کا تجربہ کرواتے ہیں۔

ادب اور اداکاری کے پاس انسان کو انسان سے جوڑنے کا ایک بہت بڑا وسیلہ ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ چاولہ صاحب کو پورنیما کے علاوہ اگر کوئی چیز اور عزیز رہی ہے تو وہ اس کا قلم۔ اور ان دونوں کی خاصیت یہ رہی ہے کہ انہوں نے بھی ہر اس چیز سے پیار کیا ہے جو چاولہ صاحب کی عزیز رہی ہے۔ اسی لئے ان کی گھریلو اور ادبی زندگی دو سیدھی لکیروں کی طرح ایک دوسرے سے الگ الگ نہیں بلکہ ایک دوسرے سے جڑی ہوئی رہی ہیں۔ چاولہ صاحب دنیاوی جدوجہد سے الجھ الجھ کر ٹوٹنے کی بجائے ہر بار ایک بہتر اور مضبوط انسان کی شکل میں نمودار ہوئے ہیں۔

چاولہ صاحب کو اس بات کا بے حد افسوس ہے کہ لوگ زبانوں کو مذہب اور فرقوں سے جوڑتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ انسانی سوچ اور تہذیب کے بالکل خلاف ایک انتہائی گھناؤنا قدم اور ناقابل معافی گناہ ہے۔ وہ کہتے ہیں، زبانیں تو ہمیشہ جوڑنے کا کام کرتی رہی ہیں۔ ان سے توڑنے کا کام لینا کہاں کا انصاف ہے۔ یہ تو ویسے ہی ہوا جیسے کوئی سبزی کاٹنے والی چھری سے لوگوں کی گردنیں کاٹنے کا کام لینے لگے۔

چاولہ صاحب کہتے ہیں۔ اردو تو ہندوستان کی خالص ہندوستانی زبان ہے۔ کسی مذہب یا فرقے سے اس کا کبھی کوئی تعلق نہیں رہا۔ اگر ایسا ہوتا تو پریم چند، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، جگن ناتھ آزاد، فراق گورکھپوری، جوگندر پال اور رام لعل وغیرہ کیوں اردو میں لکھتے اور کیوں اردو اب میں انہیں اتنی شہرت ملتی۔ مجھے فخر ہے کہ میں اردو جیسی میٹھی اور پیاری زبان میں لکھتا رہا۔

ایک کہاوت ہے کہ ہر مرد کی کامیابی کے پیچھے کسی عورت کا ہاتھ ہوتا ہے۔ یہ بات چاولہ صاحب پر سو فی صدی صادق آتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ اگر پورنیما جی ان کی ساتھی نہ ہوتیں تو شاید ہرچرن چاولہ، ہرچرن چاولہ نہ ہوتے۔ وہ خود ہی کہتے ہیں کہ پورنیما میری روح اور جسم کا حصہ رہی ہیں۔ ہم سفر اور ہم خیال، جو نہ صرف میری تحریک تھیں بلکہ دنیاوی الجھنوں، مسئلوں اور پریشانیوں سے بھی مجھے دور رکھتی تھیں۔ انہوں نے مجھ پر ایسی چھتری تانی ہوئی تھی حسن کی چھایا میں میں دنیا و مافیہا کی فکروں سے آزاد، بے خوف و خطر اپنے لکھنے پڑھنے کی دنیا میں غرق رہتا تھا۔ یہاں تک کہ اس نے میرے تمام درد خود اپنا لئے تھے۔ کیا آمدنی ہے اور کیا خرچ، کون آرہا ہے اور کون جارہا ہے۔ کیا لینا اور کیا دینا ہے، میں نے کبھی جانا ہی نہیں تھا۔ سفر میں مجھے کب اور کیا چاہئے، میں نے اس کا بھی کبھی خیال نہیں رکھا تھا۔ رکھتا بھی کیسے؟ اس نے کبھی احساس ہی نہیں ہونے دیا۔ اب جب وہ نہیں ہے تو سب کچھ بکھرا بکھرا، اجڑا اجڑا، بے ترتیب سا لگتا ہے اور میں اپنے آپ کو بے سہارا محسوس کرتا ہوں۔

ان حالات کے ہم خود چشم دید گواہ رہے ہیں۔ پورنیما جی کی موجودگی میں ان کی بے فکری اور من موجی پن کو دیکھا ہے تو آج ان کی غیر حاضری میں گہری اداسی، مایوسی اور فکروں سے بوجھل، ہمیں چاولہ صاحب کے درد کا بھی احساس ہوا ہے۔

میاں، بیوی دونوں کا مہمان نوازی میں تو کوئی جواب ہی نہیں۔ پورنیما جی کے ہوتے تو آئے دن بلائے، بن بلائے اور ہر قسم کے مہمانوں سے گھر بھرا رہتا تھا۔ کبھی کسی مہمان کی کوئی شکایت نہیں ہوئی۔ چاولہ صاحب مہمانوں کی خاطر تواضع کا ہی خیال نہیں رکھتے، ان کے اعزاز میں نشستیں بھی منعقد کرواتے ہیں اور حتی الامکان غیر ملک میں ان کے خرچ پانی کا بھی انتظام کرتے ہیں۔ پورنیما جی کی غیر حاضری میں بھی مہمانوں کا سلسلہ جاری ہے۔ چاولہ جی کہتے ہیں، کوئی اپنا گھر سمجھ کر رہے تو اسے کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ ہاں کوئی مہمان بن کر آئے تو پھر بات دوسری ہو جائے گی۔ کہتے ہیں، اب تو مجھے اپنا خیال رکھنا ہی مشکل ہے تو کسی اور کی کیا خدمت کر پاؤں گا۔

زمانہ حال کے لوگوں کے قول و فعل میں زمین آسمان کا فرق نظر آتا ہے، مگر چاولہ صاحب انگلیوں پر گنے جانے والے ان چند لوگوں میں سے ہیں جو جیسا سوچتے ہیں، ویسا ہی لکھتے اور ویسی ہی زندگی جیتے ہیں۔

"آپ کا مذہب کیا ہے اور کس خدا میں یقین رکھتے ہیں" ۔ کے جواب میں کہتے ہیں ۔ کیا خدا کئی ہیں " میرا مذہب انسانیت ہے جس کا سبق ہر مذہب میں موجود ہے اور انسان ہی میرا خدا ہے کیونکہ خدا نے انسان کو اپنے ہی روپ پر بنایا ہے ۔ انسانی آتما ہی پرماتما کا ایک حصہ ہے ۔ کرتو لیتا ہوں پوجا، بھجن کیرتن میں میرا من بھٹکتا رہتا ہے اور کئی قسم کے سوالات جواب طلب رہ جاتے ہیں ۔ محبت میری دولت ہے ۔ اسے جتنا بانٹتا ہوں یہ اتنی ہی بڑھتی جاتی ہے ۔

وہ جس مذہب میں جنمے ہیں اس میں رہتے ہوئے بھی نہ اس کا ڈھنڈورہ پیٹتے ہیں اور نہ پرچار کرتے ہیں کیونکہ انہیں ہر مذہب اچھا لگتا ہے ۔

ہرچرن چاولہ کی شخصیت اور فن کو کسی خاص مذہب، فرقے یا ملک کی سرحدوں میں قید نہیں کیا جاسکتا ۔ ہندوستانی ہونے پر انہیں ناز ہے مگر وہ پاکستان سے بھی کم محبت نہیں کرتے ۔ یہ بات الگ ہے کہ جس وطن میں ان کی پیدائش ہوئی، ایک دن اچانک وہ پرایا ہو گیا اور اپنا سب کچھ گنوا کر انہیں ہندوستان آنا پڑا ۔ کہتے ہیں، سیاست دانوں نے ملک تو بانٹ دیا مگر دلوں کو نہ بانٹ سکے ۔ ادب سے جڑے لوگوں کا یہ فرض بنتا ہے کہ محبت کے سیلاب کو کبھی کم نہ ہونے دیں ۔ چاولہ صاحب کو ناروے سے بھی کم محبت نہیں ۔

ملک کے بٹوارے کے بعد دہلی کے ایک ریلوے سٹیشن کی سٹیشن ماسٹری کی مشینی زندگی انہیں راس نہیں آئی، لہذا بہتر زندگی کی تلاش میں انہیں یورپ کا رخ کرنا پڑا ۔ کئی سال ملکوں کی خاک چھاننے کے بعد آخر ناروے میں ٹک گئے ۔ انسانی اور قدرتی خوبصورتی اور معصومیت نے اتنا متاثر کیا کہ وہیں کے ہو کر رہ گئے مگر زندگی کا ایک خاصہ حصہ ناروے میں گزارنے کے باوجود ہندوستان کی سرزمین سے ان کا جسمانی اور روحانی رشتہ برقرار ہے ۔ ان کے فن اور شخصیت میں ہندوستان کی مٹی کی سوندھی مہک موجود ہے ۔

ہرچرن چاولہ کی زندگی کا سفر ان کے افسانوں سے کم حیرت انگیز، دلچسپ اور رنگین نہیں ۔ نہ جانے کتنی بار ان کے افسانوں کے روبرو ہونے کا موقعہ ملا ۔ ان کے ناول اور افسانوں کو پڑھ کر کبھی گدگدی ہوئی ہے تو کبھی آنکھیں نم ہو گئی ہیں ۔ ان کے افسانوں کے کردار تھوپے ہوئے نہیں بلکہ بڑے سچے قدرتی، ہمارے آپ کے بیچ کے ہوتے ہیں، جن سے ہمارا واسطہ آئے دن پڑتا رہتا ہے ۔ کیا مجال کہ کوئی افسانہ دل و دماغ کو جھنجھوڑے بنا سر کے اوپر سے گزر جائے، وجہ یہ ہے کہ چاولہ صاحب اپنے احساسات کو ارد گرد کے حالات میں جذب کرتے ہیں اور پھر انہیں صفحۂ قرطاس پر اتارتے ہیں نتیجتاً ان کے افسانوں میں حقیقی زندگی کا عکس ہوتا ہے ۔

چاولہ صاحب کہتے ہیں، میرا کوئی کردار ایسا نہیں جو آسمان سے اترا ہو ۔ جب کوئی پلاٹ میرے ذہن میں جنم لیتا ہے تو اس کے کردار مجھے تب تک چین سے بیٹھنے نہیں دیتے جب تک میں انہیں کاغذ پر اتار نہ لوں ۔

ہرچرن چاولہ کے افسانوں میں مختلف موضوعات کے باوجود ایک مرکزی لہر قائم رہتی ہے جو افسانوں کو آگے اور آگے لے جاتے ہوئے تخیلاتی سمندر کے دہانے تک پہنچا دیتی ہے ۔ جہاں پہنچ کر انسان کی بنائی اونچ نیچ، مذہب، ملک اور زمان کی دیواریں گر جاتی ہیں اور رہ جاتا ہے ایک خالص انسان جو ان سب کے رنگوں کی روشنی سے دور انسان کی بات انسان کے طور پر سوچتا ہے ۔ تبھی تو "گنگا کو واپسی" کا بوڑھا باپ پورے یقین کے ساتھ اپنے بیٹے سے کہتا ہے ۔ "میل ٹوٹا کہاں ہے ۔ وہ تو کئی جگہوں سے جڑ گیا ہے ۔ بیٹا صرف وہی تو نہیں ہوتا جو بیوی کی کوکھ سے جنما ہو ۔ کرداروں اور افسانوں کو کسی بنے بنائے سانچے میں ڈھال کر وہ پیش نہیں کرتے بلکہ انہیں آہستہ آہستہ کھولتے ہوئے اپنی شکل اختیار کرنے دیتے ہیں ۔

غیر ممالک میں بسے ہوئے بیٹے اور بہو اکثر جب اپنے بوڑھے ماں باپ کو رہنے کے لئے اپنے پاس بلاتے ہیں تو اس میں اپنے ماں باپ کے لئے عقیدت اور محبت کی خوشبو کم اور اپنے بچوں کی پرورش کی فکر زیادہ ہوتی ہے ۔ اس کے علاوہ چونکہ ماں باپ پنشن کے بھی حقدار ہو سکتے ہیں ۔ اس لئے وہ بہو، بیٹے اور ان کے بچوں کی ضرورت زیادہ بن جاتے ہیں ۔ بیٹوں کی خود غرض ذہنیت اور خون کے رشتوں کی مجبوری کا تیکھا اور تلخ احساس ان سطور میں بڑی شدت سے ابھرا ہے ۔ "وہاں (وطن میں) اسے (بوڑھے باپ کو) لگتا جیسے وقت ایک خوبصورت رنگ برنگی گیند ہے جسے ٹھوکریں لگاتا، اپنے آگے آگے لڑھکائے پھرتا ہے اور یہاں (غیر ملک میں) اسے ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے وقت ایک مست گھوڑے کی دم سے بندھی رسی ہے "

اس کے ہاتھوں سے بندھی، اسے کھردرے راستوں پر گھسیٹتی پھرتی ہے ۔ وہ سوچتا۔ کب یہ رسی ٹوٹے گی ۔ وہ اٹھے گا، اور کپڑے جھاڑ کر، زخم سہلا کر اپنی راہ چل سکے گا۔ ("گنگا کو واپسی" اب ناروے کے تمام پولی ٹیکنک ہائی سکولوں کے ایڈوانس کورس میں پڑھانے کے لئے منتخب کرلی گئی ہے اور اس سلسلے کی ایک خوبصورت کتاب میں شامل ہو چکی ہے)

"احساس کی زنجیریں" کی بوڑھی ماں کا درد بھی کچھ کم نہیں ۔ گھر میں بوڑھی عمر کے باوجود وہ سب کی مصروفیات میں مصروف ان کے ساتھ بھاگ دوڑ کر رہی ہے ۔ اس کی کوئی ریٹائیرمنٹ نہیں ہے ۔ کوئی آرام نہیں ہے، فرصت نہیں ہے، چھٹی نہیں ہے ۔ مجبوری سے رسنے والے اس درد کی شدت کی انتہا یہ ہے کہ بھگوان کی پوجا تک کرنے کی اسے فرصت نہیں کیونکہ گھر کے سب چھوٹے بڑوں کے اپنے اپنے سکول یا کام پر چلے جانے کے بعد سارا گھر بکھرا پڑا ہے ۔ بڑی کی کتابیں سامنے ڈھیر ہوئی پڑی ہیں ۔ بستروں پر کپڑے گڈمڈ ہو رہے ہیں ۔ وہ بھجن بھی گاتی جاتی ہے اور ہاتھوں سے چیزیں بھی سنبھالتی جا رہی ہے ۔ سوچتی ہے اب فرصت ہی فرصت ہے سب جا چکے مگر باہر جھوٹے برتن، دھونے والے کپڑے، کچن میں بکھرا سامان، گندے فرش اور بیٹے کا کھلا منہ پھاڑے شیونگ سیٹ، کرسی پر بہو کی ساڑھی اور کپڑے، گیلے ڈھیر ہوئے تولیئے، الجھی الجھی چادریں اور بیسیوں دوسرے کام، جیسے کہہ رہے ہوں ۔ فرصت کہاں ؟ کام تو اب شروع ہوا ہے تمہارے لئے اور وہ بھگوان کو "اگر میں تیرے چرنوں میں من چڑھاتی ہوں تو وہ پاپوں سے بھاری ہے، اسی لئے پاؤں نہیں بڑھتے تیرے مندر میں آنے کو" سے بہلا کر اپنے گرہستی کے کاموں میں جٹ جاتی ہے ۔

"سوال" میں گوربانی کے لئے اپنی عقیدت کا اظہار کرتے ہوئے ان کا ایک کردار کہتا ہے ۔ "مٹھاس کا مزہ صرف زبان سے ہی نہیں، کانوں سے بھی محسوس کیا جا سکتا ہے اس کا علم مجھے بھگت ہیرانند کی گوربانی سن کر ہوا تھا   اس کے ساتھ ہی یہ ترک کہ ان کے نظریئے کے تحت گوردوارے میں ہونے والے سیاسی لیکچر کی بابت کم پڑھی لکھی ماں کہتی ہے ۔ "کاکا۔ میں تو وہاں من کی شانتی کے لئے جاتی ہوں مگر آج میں نے وہاں ہری کیرتن کی بجائے سیاست پر لیکچر ہوتے سنا تو میرے من نے کہا، یہاں تو کسی اور قسم کا پودا لگایا جا رہا ہے، جس کی جڑوں میں پانی ڈالنا میری آتما نے گوارا نہیں کیا اور میں اپنا پانی (آٹا، گھی اور گڑ سے بھری کٹوری جو گوردوارے میں ارپن کرنے اکثر عورتیں لے جاتی ہیں) واپس لے آئی ۔

جائے دو، زمیں، ننھے فرشتے، میری بیوی کا خاوند، دوسر، بادشاہ، آخری قدم سے پہلے، وغیرہ کہانیوں کے ساتھ ساتھ جو کہانی ساری دنیا کی اعلیٰ درجے کی کہانیوں میں شمار ہوئی ہے، وہ ہے ۔ "گھوڑے کا کرب" جسے ملعاریہ میں بین الاقوامی کہانی مقابلے میں اول انعام حاصل ہو چکا ہے ۔ رنگ و نسل کے فرق کے پس منظر پر لکھی گئی اس کہانی کا مرکزی کردار ایک گھوڑا ہے ۔ یہ کہانی گھوڑے کی علامت کے ذریعہ رنگ و نسل کے فرق کے حمائیتوں پر ایک زبردست اور بے مثال طنز کرتی ہے ۔ اس کہانی میں اٹھائے گئے سوال ذہن کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتے ہیں ۔ "جج فیصلہ سنا رہے ہیں ۔ جو سیکنڈ آیا ہے اسے فرسٹ کر دیا جائے، جو تھرڈ آیا ہے، اسے سیکنڈ اور اسی طرح آگے ۔ میں ریس جیت کر بھی، سب سے پیچھے دھکیل دیا گیا ہوں ۔ میں سوچ رہا ہوں، میں دوڑایا گیا ہوں اور میں نے دوڑ جیت کر دکھائی ہے اس سے رنگ کا کیا تعلق ہے ؟ نسل کا کیا واسطہ ہے ؟؟"

مرچرن چاولہ پاکستان کے ضلع میانوالی میں پٹھانوں کے بیچ پلے بڑھے ہیں ۔ وہ وقت ایک بڑی خوبصورتی کے ساتھ ان کے افسانوں کا حصہ بن کر قاری کو ایک الگ قسم کے ذائقے سے متعارف کراتا ہے ۔ پٹھانوں کے جینے کے طور طریقوں کی انوکھی اور تیکھی جھلک پیش کرنے والی کہانی "دوسر" کا بانکپن دیکھتے ہی بنتا ہے ۔ "جب دوست محمد خان چوتھی بار جیل سے رہا ہو کر گاؤں آیا تو گاؤں والوں سے ملا ۔ ایک نوجوان یاسین سے ہاتھ ملا کر بولا ۔ ادئے یاسینے، تو تو بہت بڑا جوان ہو گیا ۔ اوئے کوئی قتل وتل بھی کیا، کوئی عورت بھی نکالی (بھگائی) کہ ایسے ہی جوان ہو گیا ؟"

ان کا ایک بڑا ہی قابل ذکر افسانہ ہے ۔ "میری بیوی کا خاوند" ۔ ایک ہندوستانی مرد، ایک نارویجین عورت کا شوہر ہے ۔ ناروے میں رہنے والا یہ ہندوستانی اپنی بیوی کی کسی بھی ناجائز بات پر کسی قسم کی بدسلوکی نہیں کر پاتا ۔ ہاں ہندوستان میں ہوتا تو اسے بیوی کی ساتھ ہی نہیں ہندوستان کے ساتھ بھی من مرضی کی پوری آزادی ہوتی ۔ مشرقی مرد کی ذہنیت کو جس خوبصورتی کے ساتھ اس افسانے میں پیش کیا گیا ہے اسے پڑھ کر کوئی بھی ان کے فن کا قائل ہوئے بنا نہیں رہ سکتا ۔ ہندوستانی خود سے کہتا ہے ۔ "اپنے ملک میں بڑی آزادیاں تھیں ۔ دفتروں کو جلادو، بسوں کو آگ لگادو، بیویوں

کو زندہ پھونک ڈالو۔ کوئی پوچھنے تک نہیں تھا جہاں کسی کی گردن توڑنا تو ایک طرف جھٹکا توڑ کر سڑک پر گراتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے۔ میں نے اس کی گردن چھوڑ دی اور ہانپتا ہوا صوفے پر جا بیٹھا"۔ دو مردوں کے ساتھ عورت کا رہنا مشرقی مرد سے برداشت نہیں ہوتا جب کہ وہ خود دو سے لے کر چار بیویاں رکھ سکتا ہے جیسا کہ ہم اپنی شروع کی کہانیوں میں پڑھتے آئے ہیں کہ ایک راجہ کی سات رانیاں تھیں وغیرہ۔

چاولہ صاحب کے افسانوں کی ایک خاص بات اور بھی ہے۔ کئی مکالمے اور باتیں آپ کے دل میں گھر کر جاتی ہیں اور گاہے بگاہے ایک دوست کی طرح آپ کو سکون اور ہمت عطا کرتی ہیں۔ "میری بیوی کا خاوند" کی یہ سطر۔ "بار بار نے سے نہیں، ملنے سے ہوتی ہے" یا پھر "سوال" کا یہ ٹکڑا۔ "مٹھاس کا مزہ صرف زباں سے ہی نہیں کانوں سے بھی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اس کا علم مجھے بھگت ہیرانند کی گور بانی سن کر ہوا تھا" یا ایسی ہی کئی اور سطریں جو دل کی گہرائیوں تک میں اتر جاتی ہیں۔

چاولہ صاحب کا دائرہ صرف افسانوں یا اردو زبان تک محدود نہیں رہا۔ اردو ان کے اظہار کی زبان ضرور ہے مگر ان کے افسانے ترجمہ ہو کر دیگر ہندوستانی اور غیر ممالک کی زبانوں تک پہنچے ہیں۔ جہاں تک مجھے علم ہے، اب تک ان کے چار ناول، بارہ افسانوی مجموعے، تین ترجمے دو ہندوستانی اور نارویجین زبانوں کی انتھولوجیز اور ایک یادوں کا مجموعہ شائع ہو چکے ہیں۔ ہندوستان کے اردو، ہندی، پنجابی اور انگریزی افسانوں کی نارویجین انتھولوجی بعنوان (INDIA FORTELLER) اکسٹھ کہانیوں کے ساتھ ناروے میں چھپ کر قبول عام کی سند حاصل کر چکی ہے۔ ان کا یہ کام ہندوستانی اور نارویجین ادب میں ایک سنگ میل کی طرح ہے۔ ان کی اس کتاب کی ناروے میں زبردست پذیرائی ہوئی ہے۔

اسی طرح ناروے کی چیدہ کہانیوں اور کنوت ہامسن کے مشہور ناول "وکٹوریہ" کو اردو اور ہندی میں ترجمے کر کے انہوں نے ہندوستانی قاری تک پہنچایا ہے۔ سفر ان کا خاص مشغلہ رہا ہے۔ 1988 میں پورنیما کے ساتھ سات دن کے لئے پاکستان گئے تو دوسرے شہروں کے ساتھ اپنی جنم بھومی داؤد خیل اور آبائی مقام میانوالی کی بھی زیارت کی۔ اس پر لکھا ان کا سفر نامہ "تم کو دیکھیں" کتابی صورت میں شائع ہو کر شہرت حاصل کر چکا ہے۔

چاولہ صاحب کچھ سالوں تک ناروے سے نکلنے والے رسالوں "پرچھائیں" اور "سفیر" کے ایڈیٹر لٹریچر بھی رہے ہیں۔ ان کے افسانوں اور ناولوں نے چاولہ صاحب کو نہ صرف شہرت دی بلکہ کئی نیشنل اور انٹرنیشنل ایوارڈز اور انعامات سے بھی نوازا ہے۔ جن میں اتر پردیش، مغربی بنگال اور بہار کی اردو اکیڈمیز کے انعامات کے علاوہ میرا اکادمی، لکھنؤ کا امتیاز میر اور بھاشا وبھاگ پنجاب، پٹیالہ کا راجندر سنگھ بیدی ایوارڈ قابل ذکر ہیں۔ ان کے افسانہ "گھوڑے کا کرب" پر بلغاریہ سے حاصل شدہ اول انعام ZLATEN KLAS کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔

چاہتے تو چاولہ صاحب بھی ناروے میں بسے دوسرے ہندوستانیوں کی طرح پیسے اور دوسری سہولیات کی دوڑ میں شامل ہو سکتے تھے۔ بہت بڑے افسانہ نگار کی جگہ بہت بڑے دولت مند بن سکتے تھے۔ وہ اس بات سے پوری طرح آگاہ تھے کہ دولت آدمی کو آدمی سے دور لے جاتی ہے جب کہ ادب آدمی کو آدمی سے دور کرنے والی ذہنیت اور سنسکاروں سے انسان کو آزاد کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

مجھے لگ رہا ہے جیسے محنت کو خدا ماننے والے اس شخص نے اپنی زندگی کی بھاگ دوڑ اپنے قلم کو سونپ دی ہے۔ بس دوڑو، دوڑو اور دوڑتے رہو، ایک سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے ورق پر۔ لکھتے لکھتے کب رات آدھی گزر جاتی ہے، اس کا انہیں ہوش نہیں رہتا۔ جو کچھ لکھا ہوتا ہے سٹڈی کی ٹیبل پر سامنے رکھی پورنیما جی کی تصویر کو سب سے پہلے سناتے ہیں۔ پورنیما جی جب زندہ تھیں تب بھی ان کی کہانی سب سے پہلے وہی سنتی تھیں اور آج جب وہ اس دنیا میں نہیں ہیں تب بھی ان کا یہ حق جوں کا توں برقرار ہے۔ پہلے انہیں پورنیما جی سے تعریف ملتی تھی، آج یہ کام ان کی تصویر کرتی ہے۔

اپنے قلم کے ساتھ ان کا یہ سفر زندگی کے آخری لمحوں تک جاری رہے یہ دلی خواہش ہے ہماری بھی اور ان کی سٹڈی میں لگی پورنیما جی کی تصویر کی بھی۔

احوال و اخبار

نارنگ ساقی کی مرتبہ کتاب ادیبوں کے لطیفے کے دوسرے ایڈیشن کی رسم اجراء

حلقہ ارباب ذوق نئی دہلی نے انڈین کلچرل سوسائٹی اور کنور مہندر سنگھ بیدی لٹریری ٹرسٹ کے تعاون سے کنور مہندر سنگھ بیدی کے چھیاسیویں یوم ولادت پر غالب انسٹیٹیوٹ کے وسیع ہال میں آل انڈیا مشاعرے کا اہتمام کیا جس میں ہندوستان کے گوشہ گوشہ سے تشریف لائے ہوئے معتبر شعراء نے شرکت کی اور حاضرین کو اپنے کلام سے محظوظ کیا۔

اس موقع پر نارنگ ساقی کی مرتبہ کتاب "ادیبوں کے لطیفے" کے دوسرے ایڈیشن کا اجراء پروفیسر گوپی چند نارنگ و شری ایچ۔ کے۔ ایل بھگت سابق یونین منسٹر کے دست مبارک سے ہوا۔ کتاب کا اجراء کرتے ہوئے پروفیسر گوپی چند نارنگ نے فرمایا کہ زیر نظر کتاب "ادیبوں کے لطیفے" میں شعراء و ادباء اپنی بذلہ سنجی، حاضر جوابی، ذہانت، فطانت اور طباعی کے سب چھینٹے جاگتے اور زندگی سے چھلکتے نظر آتے ہیں۔ نارنگ ساقی کی اس کتاب کی اشاعت پر مبارکباد دیتے ہوئے فرمایا کہ خوشی کا مقام ہے کہ اس کتاب کا پیش لفظ پاکستان کے مشہور محقق اور مزاح نگار مشفق خواجہ نے لکھا ہے۔ پروفیسر نارنگ نے اپنی تقریر میں آنجہانی کنور مہندر سنگھ بیدی کی اردو سے محبت کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ افسوس کی بات ہے کہ اردو والوں نے بیدی صاحب کی خدمات کو اس قدر جلد نظر انداز کر دیا لیکن خوشی کا مقام ہے۔ نارنگ ساقی کی یاد کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں اور باقاعدہ تقاریب کا اہتمام کرتے رہتے ہیں۔

نامور مزاح نگار مجتبیٰ حسین اور دلیپ سنگھ نے اپنے مخصوص انداز میں نارنگ ساقی اور کنور مہندر سنگھ بیدی پر تاثراتی مضمون پڑھے جنہیں سامعین نے بے حد پسند کیا۔

بیدی صاحب کے دوست اور نامور انڈسٹریلسٹ جی ساگر سوری نے اس موقع پر شائع کئے گئے خصوصی سووینیر کا اجراء کرتے ہوئے فرمایا کہ بیدی [illegible] شخصیت کے نقوش برسوں بھلائے نہ جاسکیں گے۔

حاضرین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے نارنگ ساقی نے کہا کہ کنور صاحب بیدی کی محبت کا ہی فیض ہے کہ وہ اردو ادب کی خدمت کے مبارک فریضے کو مقدور کے مطابق نبھائے جارہے ہیں۔ غالب انسٹیٹیوٹ جیسے کشادہ ہال کا بھرا ہونا اور ادبی شخصیتوں کی شمولیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ نارنگ ساقی سے محبت اور بیدی صاحب سے کس قدر عقیدت رکھتے ہیں۔

مرسلہ مہکش امروہی

(XXXX)

اختر الایمان کو خراج عقیدت

نوری اردو اکاڈمی برہولیا دربھنگا کے زیر اہتمام مشہور و ممتاز شاعر اور مکالمہ نگار اختر الایمان کی یاد میں ایک خصوصی تقریب منعقد کی گئی۔ تقریب کی صدارت جناب ڈاکٹر مطلوب الورے نے کی۔ نظامت کے فرائض آفاق ہاشمی نے انجام دی۔

تقریب میں اختر الایمان کے فن پر اظہار خیال کیا گیا۔ سکریٹری اکاڈمی جناب اظہر نیر نے اختر الایمان کی نظموں کے آہنگ اور تکنیک پر ایک پرمغز تقریر کی اور ان کی اہم نظموں "سبزہ بیگانہ"، "اباچ گاڑی"، "آدمی"، "بازآمد"، "ایک لڑکا" وغیرہ کے حوالہ سے ان کی شاعری اور اس کے لکھنے والوں اور پڑھنے والوں کے درمیان رشتگی کی نوعیت کو اجاگر کیا۔ تقریب کے صدر نے اختر الایمان کی اردو خدمات کا اعتراف کیا۔ ان کی فلمی مکالمہ نگاری نے ہندوستانی فلموں کے ذریعہ اردو کو عوام تک پہنچانے کا ذکر کیا، اراکین اکاڈمی نے اختر الایمان کو خراج عقیدت پیش کیا اور تجویز بھی منظور کی۔

تقریب کے شرکاء جناب رضا الرحمان افگار، شوکت حسین، جواد ہاشمی، سمیع احمد رہبر، پیر اعظم فیاضی، قمر رحمان، محمد عمر، فصیح الزماں، قمر الزماں راہی، تنویر ہاشمی تھے۔

مرسلہ آفاق ہاشمی
جوائنٹ سکریٹری، نوری اردو اکاڈمی، برہولیا دربھنگا

(XXXX)

فراق کی یاد میں سیمنار اور شام غزل

گیان پیٹھ اور پدم وبھوشن انعام یافتہ اردو کے عظیم شاعر رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری کی ۱۴/ ویں برسی پر فراق فاؤنڈیشن کی جانب سے

انہیں خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے ۳/ مارچ ۱۹۹۶ء کو آئی - سی - سی - آر (آزاد بھون) نئی دلی ، میں ایک سیمینار اور شام غزل کا اہتمام کیا گیا - تقریب کی صدارت نامور صحافی جناب کلدیپ نیرنے کی اور مہمان خصوصی کے طور پر مشہور ہندی ادیب کمیلشور صاحب تشریف فرما تھے - اس موقع پر فراق کے فن اور شخصیت پر ملک کے ممتاز و نامور شاعروں ، ادیبوں اور دانشوروں نے اپنے اپنے مقالے پیش کیے - طراج کومل نے فراق کو اس صدی کا نہایت اہم غزل گو قرار دیتے ہوئے اس بات پر زور دیا کہ ابھی فراق صاحب کے فن اور فکر پر مختلف زاویوں سے تحقیق کرنے کی ضرورت ہے - جوگیندر پال نے اپنی تقریر میں فراق کو ایک جینیس شاعر قرار دیا - پروفیسر شمیم حنفی اور کنور سین نے بھی فراق کی شاعری پر اپنے اپنے مقالے پڑھے - کملیشور نے فراق صاحب کے تعلق سے چند دلچسپ واقعات سنائے - اور اردو ہندی کو ایک دوسرے کے قریب لانے پر زور دیا - صدر تقریب کلدیپ نیر نے فراق صاحب کے ساتھ ساتھ اردو زبان و ادب سے بھی اپنی گہری عقیدت کا اظہار کیا - اور اس بات پر افسوس ظاہر کیا کہ آج اردو صرف مسلمانوں کی زبان ہو کر رہ گئی ہے - تقریب کے دوسرے حصہ میں محفل موسیقی کا اہتمام کیا گیا تھا - جس میں نامور گلوکاروں نے اپنی مسحور کن آواز میں کلام فراق پیش کیا -

فراق فاؤنڈیشن کے بانی آرگنائزنگ سکریٹری کاوش پرتاب گڈھی نے آخر میں تمام مہمانوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے بتایا کہ ۲۸/ اگست ۱۹۹۶ء کو فراق صاحب کا سواں یوم ولادت ہے - اس موقع پر فاؤنڈیشن کی جانب سے دلی میں سہ روزہ انٹرنیشنل سیمینار ، مشاعرہ اور محفل موسیقی کا اہتمام کیا جائے گا -

مرسلہ   کاوش پرتاپگڈھی

(xxxxx)

سید فرحان غنی کو پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض ہوئی

پٹنہ یونیورسٹی نے سید فرحان غنی کو فیکلٹی آف ہیومینیٹیز (اردو) میں پی - ایچ - ڈی کی ڈگری تفویض کی ہے - ان کے تحقیقی مقالہ کا موضوع تھا " منشی نول کشور اور قومی یکجہتی " - ان کے ممتحن ڈاکٹر اخلاق اثر (شملہ) اور ڈاکٹر فضل امام رضوی (الہ آباد) تھے اور نگراں ڈاکٹر رضیہ تبسم (پرنسپل ویمنس ٹریننگ کالج پٹنہ) تھیں - سید فرحان غنی نے پٹنہ یونیورسٹی سے ہی اردو ادب میں ایم اے کیا ہے -

مرسلہ   محمد نسیم احمد قریشی
جنرل سکریٹری ، بزم فروغ ادب ، شاہ گنج پٹنہ

ooooo

واشنگٹن میں اسلامی خطاطی کے بیش بہا نمونوں کی نمائش

واشنگٹن اسلامی دور میں قلم اور اس پر مبنی فن کاری و فن آمری کو ایک خاص مرتبہ حاصل رہا ہے - یوں بھی قلم خواہ کسی بھی شئے کا بنا ہوا ہو ، دست فنکار میں اگر محض ایک بے جان وجود سے بدل کر نت نئی خوبیوں اور کرامات کا حامل بن جاتا ہے - انحصار اس کی جولانیوں کا اس پر ہے کہ خود فن کار کی وسعت پرواز کہاں تک ہے - اسلامی خطاطی کے کمالات اس فن کے قدر دانوں کو ہمیشہ ہی مسحور کرتے رہے ہیں -

امریکہ میں اسلامی فن خطاطی کی کافی پذیرائی ہوئی ہے جہاں اس موضوع پر ہونے والی نمائشوں سے بلاتفریق مذہب ہر طبقہ کے شائقین نے گہری دلچسپی کا مظاہرہ کیا ہے - ایسی ہی ایک نمائش کئی ماہ سے امریکہ کی راجدھانی واشنگٹن کی آرتھر ایم ، سیکلر گیلری میں آنے والوں کو اسلامی خطاطوں کے قلمی کمالات سے روشناس کرا رہی ہے - علوم و فنون کی عظیم ذخیرہ گاہ کی حیثیت سے دنیا بھر میں معروف واشنگٹن کے اسمتھسونین ادارہ کے ماتحت سیکلر گیلری میں "قلم کی طاقت   چودھویں صدی میں اسلامی خطاطی " کے عنوان سے جاری اس نمائش میں چودھویں صدی (عیسوی) میں لکھے گئے مخطوطات ، خطاطی کے اسالیب ، حروف و الفاظ کی مینا کاری اور منقش جلد سازی کے بیش بہا نمونے رکھے گئے ہیں - یہ نمونے آج سے پانچ صدی قبل کے دور میں ، جسے اہل تحقیق اسلامی خطاطی کا زریں دور قرار دیتے ہیں ، قلم کے ہنرمندانہ استعمال اور فن تحریر کی قوت و عظمت کو نمایاں کرتے ہیں - یہ نمونے سیکلر گیلری کے اپنے ذخیرہ کے علاوہ لائبریری آف کانگریس اور دوسرے اداروں سے مستعار لیے گئے ہیں - ان میں روشنائی اور قلم کی کار فرمائیوں کے علاوہ طلاکاری ، نقش نگاری اور آبرنگی مرصع کاری قابل دید ہے -

اس نمائش کے ساتھ ناظرین کو اسلامی فن خطاطی کی تاریخ اور اس کی توسیع سے متعلق معلومات بھی فراہم کی گئی ہیں - مثلاً یہ کہ قرآنی آیات اور

احادیث رسولؐ کی کتابت کے لئے ابتدا٘ء سے ہی خط کوفی کو پسند کیا گیا - اگرچہ اگلے دو سو برسوں کے اندر یعنی نویں صدی کے اختتام تک اسلام کا دائرہ وسیع ہونے کے ساتھ ساتھ خطاطی کے دو درجن سے زائد نئے اسالیب رائج ہو چکے تھے لیکن خط کوفی کو حاصل ترجیحی مقام برقرار رہا اور بالخصوص قرآن مجید کی کتابت کے لئے اسی کو استعمال کیا جاتا رہا - عرب نژاد امریکیوں ، امریکی مسلمانوں اور اہل علم کے لئے خصوصی کشش کی حامل اس نمائش میں ایک اہم پینٹنگ "بسملہ" کی ہے ، جس میں بسم اللہ الرحمن الرحیم کو پانچ مشہور خط تحریر محقق ، نسخ ، ریحان ، ثلث اور کوفی میں نہایت دلکش انداز میں پیش کیا گیا ہے -

نمائش سے متعلق گائڈ بک میں مزید بتایا گیا ہے کہ اس دور میں حسن کی عکاسی اس نمائش کے ذریعہ کی گئی ہے ، قرآن مجید اور دوسرے اسلامی مخطوطات و دستاویزات کے لئے نرسل کے قلم استعمال کئے جاتے تھے - خطاطی کے مختلف نمونوں کے لئے ان قلموں کا خط مختلف زاویوں سے تراشا جاتا تھا - نمائش میں مسلم خطاطوں کے زیر استعمال رہنے والے قلمدان اور خطاطی کے دوسرے سامان بھی رکھے گئے ہیں -

سیکلر آرٹ گیلری کے اسلامی اور مشرق قریب کے فنون سے متعلق شعبہ کی ایسوسی ایٹ کیوریٹر ڈاکٹر معصومہ فرہاد نے یو ایس آئی ایس کے ساتھ ایک انٹرویو میں بتایا کہ چودھویں صدی کے عالم اسلام میں دو حریف طاقتیں برسراقتدار تھیں ، جن میں ایک طرف موجودہ عراق ، ایران ، مشرقی ترکی اور شمالی شام پر مشتمل شمال مشرقی علاقوں میں منگولوں کی فرمانروائی تھی تو دوسری طرف مملوک تھے جو اصول سنی مسلک کے محافظ سمجھے جاتے اور مصر و شام اور دیگر علاقوں پر حاوی تھے - ڈاکٹر فرہاد کے مطابق ، باوجودیکہ ان دونوں طاقتوں کے درمیان سیاسی و مسلکی اختلافات اپنی شدید ترین صورت میں جاری رہے - لیکن ان کی آپسی کشمکش کبھی علم و تحقیق اور فنی تخلیقات کے فروغ میں حائل نہیں ہوئی - بلکہ دونوں مسلکوں کے درمیان ایک مشترکہ مقصد کے لئے باہم مفاہمت کا ماحول قائم رکھا گیا - یہ مشترکہ مقصد اسلام کی توسیع و اشاعت کا تھا جس کے لئے آرٹ اور بالخصوص خطاطی کو بھی ایک وسیلہ کے طور پر اختیار کیا گیا تھا -

خطاطی کے جن اسالیب کی نمائندگی اس نمائش میں ہوئی ہے ، ان میں بغداد کے معرکتہ الآرا خطاط محمد بن مقلیٰ (متوفی ۹۴۰ء) الملقب بہ "صاحب الخط المنصوب" کا خط بھی شامل ہے - تین عباسی خلفاء کے دور میں وزیر رہنے والے بن مقلیٰ کو خط شکست سمیت چھ مختلف انداز کے نفیس طریقہ ہائے خطاطی کے لئے شہرت حاصل ہے - ان کے فن کو ان کے جن شاگردوں نے مزید جلا بخشی ان میں علی بن ہلال ابن البواب خاص طور پر قابل ذکر ہیں - ایک اور خطاط جنھیں عربی رسم الخط میں مسلمہ طور پر صاحب کمال شمار کیا جاتا ہے ، یاقوت المستعصمی ہیں جو بغداد کے مدرسہ مستنصریہ کے ناظم کتب خانہ تھے - اگرچہ وہ ایک غیر عرب تھے لیکن خط عربی میں ان کا استغراق بے پناہ تھا - کہا جاتا ہے جس وقت منگولوں نے بغداد پر لشکر کشی کی تھی تو یاقوت المستعصمی کتابت میں محو تھے اور انھیں ایک مینارہ میں چھپ کر جان بچانی پڑی تھی -

کمپیوٹر کے ذریعہ کی جانے والی خطاطی سے متعلق ایک سوال کے جواب میں ڈاکٹر فرہاد نے ، جو ہارورڈ یونیورسٹی سے اسلامک آرٹ میں پی ایچ ڈی ہیں ، کہا کہ کمپیوٹر کے ذریعہ مخطوطات کی تیاری بہت تیز رفتاری سے ہو سکتی ہے لیکن الیکٹرانی ٹکنالوجی وہ روحانی مسرت اور لگن کہاں سے لا سکتی ہے جو ایک خطاط کو قرآنی الفاظ کی کتابت میں محویت سے حاصل ہوتی ہے - انھوں نے مزید بتایا کہ امریکی نوادر جانے عرب اور مسلم ملکوں کے فنی نمونوں کی نمائش کے انعقاد سے گہری دلچسپی رکھتے ہیں اور حال ہی میں نیویارک اور کئی دیگر شہروں میں اس طرح کی نمائشیں ہو چکی ہیں -

مقصود الٰہی شیخ کے نئے ناولٹ "دل ایک بند کلی" کا اجراء
ڈونکاسٹر میں پہلی ادبی نشست بے حد کامیاب رہی

ڈونکاسٹر (برطانیہ)

لٹریری سوسائٹی ڈونکاسٹر کے زیر اہتمام افسانہ نگار مقصود الٰہی شیخ کے ناولٹ "دل ایک بند کلی" کا اجراء ہفتہ ۱۳ اپریل ۹۶ء کو ساکی لیونی ہال، ہارٹلے روڈ پر ہوا۔ اس ناولٹ کے بارے میں اردو کے ممتاز نقاد فتح محمد ملک نے لکھا ہے کہ ناولٹ کی ہیروئین کی کردار نگاری میں مقصود الٰہی شیخ فن کی بلندی اور پختگی کو چھوتے نظر آتے ہیں۔ محمد منشاء یاد نے ناولٹ کی زبان دبیان اور فنی مہارت کا ذکر کیا ہے۔ قائد اعظم اکیڈیمی کے ڈائریکٹر اور معروف نقاد ڈاکٹر محمد علی صدیقی نے لکھا ہے کہ مقصود الٰہی شیخ نظریاتی الجھنوں سے بچ نکلنے میں کامیاب رہے ہیں اور انشاء کلکتہ کے مدیر ف۔ س۔ اعجاز نے اسے پہلا ناولٹ قرار دیا جس میں حسن ایک ہیولا خیال حقیقت بن کر سامنے آتی ہے۔ عبدالوحید نے دیباچہ میں مقصود الٰہی شیخ کی تحریری سادگی میں حسن و کشش کی بات کی ہے۔ ڈونکاسٹر میں اپنی نوعیت کی اس پہلی کامیاب ادبی نشست میں ۱۵۰ سے بھی زائد مہمان شریک تھے۔ اس تقریب میں مقصود الٰہی شیخ کے علاوہ راحت محمود راحت۔ ڈاکٹر صاحت عاصم واسطی۔ انگریزی مصنفہ قیصرہ شہرزاد۔ احمد سعید انور۔ خواجہ طارق محمود کی کتابوں کی نمائش اور فروخت بھی ہوئی۔ اس بات کو سراہا گیا کہ "دل اک بند کلی" کے مصنف نے فراخ دلی دکھاتے ہوئے دوسروں کی کتب کی نمائش پر رضامندی ظاہر کی۔ نقاد غلام قادر آزاد کی صدارت میں اس تقریب کی نظامت ڈاکٹر صاحت عاصم واسطی نے کی اور اظہار خیال۔ ڈاکٹر مشکور الٰہی شیخ، مسز لیئی فرید سپرد۔ ستارہ لطیف حاتم۔ احمد سعید انور۔ ڈاکٹر سکندر سالم۔ راحت محمود راحت اور غلام قادر آزاد نے کیا اور مصنف کی ادبی خدمات کا اعتراف کیا۔

صدر غلام قادر آزاد نے کہا کہ مقصود شیخ سے دوستی اور ادبی رائے کے اظہار اور ادبی دیانت داری برقرار رکھنے میں کوئی تضاد نہیں ابھرتا۔ کوئی شک نہیں وہ اپنے فن کے ماہر ہیں۔ تاہم ناولٹ "دل اک بند کلی" کے بارے میں انہوں نے فتح محمد ملک کی اس رائے سے اختلاف کیا کہ ہیروئن شوکت غلام ابن غلام ابن غلام اور بزدل تھا البتہ انہوں نے ف۔ س۔ اعجاز سے اتفاق کیا کہ یہ ناولٹ کی ہیروئین سدیہ کی کہانی ہے جو وطن سے انگلستان آکر تہذیبی تصادم کا شکار ہو کر بھی زندہ رہنے سے کنارہ کشی اختیار نہیں کرتی۔

اس شام کی دوسری نشست میں ڈاکٹر مختارالدین احمد کی صدارت اور شاعر حضرت شاہ کی نظامت میں مشاعرہ ہوا۔ مشاعرہ میں حصہ لینے والوں میں غلام قادر آزاد۔ ڈاکٹر محمد اعظم۔ ڈاکٹر واسطی۔ راحت محمود راحت۔ احمد سعید انور۔ ڈاکٹر سکندر سالم۔ ضمیر کشیری۔ رضیہ اختر موج اور مسز فوزیہ عقیل کے نام نمایاں ہیں۔

★ ★ ★ ★ ★

ساز فتحپوری نمبر
تیاری کے آخری مراحل میں ہے۔

ڈاکٹر وفا راشدی کی تصنیف
میرے بزرگ میرے ہم عصر
اب دستیاب ہے

مصنف کے پچاس سالہ مطالعہ ومشاہدہ، تجربات اور ملاقاتوں کی روشنی میں بیسویں صدی کی کئی تاریخ ساز ادبی و علمی شخصیات پر تحقیقی مضامین اور خاکے اس کتاب میں شامل ہیں۔ چند شخصیات کے نام یہ ہیں

بابائے اردو، حسرت موہانی، ابوالکلام آزاد، نیاز فتح پوری، سیماب، جوش، حفیظ جالندھری، حفیظ ہوشیار پوری، علامہ احسان دانش، ممتاز حسن، جمیل مظہری، ندیم قاسمی، میرزا ادیب، وحید قریشی، آرزو لکھنوی، ناطق لکھنوی، شورش کاشمیری، شان الحق حقی، عندلیب شادانی، بی۔ اے۔ بلوچ، ماہر القادری، ضیاء اسلام پوری، الطاف علی بریلوی، ڈاکٹر حسرت کاسگنجوی، اقبال حیدری، رضا مظہری اور حکیم محمد سعید وغیرہ۔ کتاب ان شخصیات کی نادر تصاویر / خطوط اور تحریروں کے عکس سے بھی مزین ہے۔

قیمت ۱۸۰ روپے
مکتبۂ اشاعت اردو
B48 Shah Faisal Town
Mahir Halt, Jinnah Avenue,
Karachi-75100

آپ کی ڈاک

مراسلہ نگار کی رائے سے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے

○ "انشاء" کا شمارہ ۱ - ۲ عید نمبر کی شکل میں نور جمالی صاحب کے توسط سے باصرہ نواز ہوا - آپ کے اس موقر جریدے کو پہلی بار دیکھنے کا اتفاق ہو رہا ہے - اگرچہ یہ خاص نمبر ہے اور خاص نمبر کی بات ہی کچھ اور ہوتی ہے تاہم خیال یہی ہے کہ عام شمارہ بھی اسی طرح باوقار اور اونچے ادبی معیار کا حامل ہوتا ہوگا -

پیش نظر شمارے میں آپ نے اپنے مختصر مگر جامع اداریہ میں ہندوستان کے معروف اور مایہ ناز مصور مقبول فدا حسین کے ۸۰ سالہ بوڑھے دل کی جوان امنگوں کے بہکتے قدم کی خوب خبر لی ہے ، گفتنی کے تحت آپ نے کتنی اچھی اور سچی بات کہی ہے کہ "اگر تخلیق کو خالص جذباتیت ، سستی تیزی اور حسی تلذذ پیدا کرنے کی عادت تک محدود کر دیا جائے تو شبیہہ کے ذریعہ اجاگر ہونے والی فکر اپنے معنی کھو بیٹھتی ہے   اس سے آرٹسٹ کی ذہنی و حسی کیفیت اور عامیانہ سرشت کا پتہ چلتا ہے " - یہ باتیں صرف فن مصوری ہی سے متعلق نہیں بلکہ فنون لطیفہ کے تمام شعبوں کے لئے ہیں - رئیس الدین فریدی صاحب کا سوانحی مضمون " دہلی کے مشاہدات و تجربات " بے حد معلوماتی اور زبان و بیان کے لحاظ سے بہت دلچسپ ہے - ڈاکٹر شکیل الرحمن صاحب کا تحقیقی قسط وار مضمون "شہنشاہ ظہیر الدین محمد بابر اور بابر نامہ " نہایت پر مغز ، جامع اور مدلل ہے - بنت الاسلام کا "روزے کی عمدگی " بہت عمدہ ، معلوماتی اور اصلاحی مضمون ہے - مزاحیہ مضمون " تلاش خر " از طیف رشیدی بھی بہت خوب ہے - مسعود مفتی کا افسانہ "محدب شیشہ " بہت متاثر کر گیا - اگر اسے حاصل شمارہ افسانہ کہا جائے تو کوئی مبالغہ نہ ہوگا - نعر امام نظام پوری اور مقصود الہٰی شیخ کے افسانے "محنت اور زمین " اور حیوان " بھی بہت خوب ہیں - جمیل آفتاب کا "ننگا سچ " ٹی وی زدہ والدین کے لئے ایک تازیانہ سے کم نہیں - رپورتاژ بعنوان " دبئی میں سلیم جعفری کے اعزاز میں جشن سپاس " بھی بہت خوبصورت ہے -

منظومات کے تحت مسعطر عظیم آبادی کی نعت بہت اچھی ہے - نور جمالی کی نظم "جشن عید الفطر " نہایت معیاری ہے - حبیب رامش کا "ہلال عید " اور ڈاکٹر اظہار مسرت یزدانی کی نظم "جشن امید " بھی بہت خوب ہیں - قتیل شفائی ، ظفر گورکھپوری ، حنیف نجمی ، نسیم شاہجہاں پوری اور نثار جیراجپوری کی غزلیں خاص طور سے پسند آئیں - نسیم شاہجہاں پوری کی غزل کو بلا مبالغہ حاصل شمارہ غزل تصور کرتا ہوں - اللہ کرے "انشاء " کا وقار اور ادبی معیار روز بروز بلند سے بلند تر ہوتا جائے - آمین !

صابر جوہری ، بھدوہی

ooooo

○ "انشاء " کا عید نمبر موصول ہوا - اس کا سرورق اتنا عمدہ ہے کہ دیر تک دیکھتے رہے پھر بھی طبیعت سیر نہ ہوئی سچ پوچھئے تو انشاء کی نصف قیمت اس کے ٹائیٹل ہی کو دیکھ کر وصول ہو گئی - جناب مسعود مفتی کا افسانہ "محدب شیشہ " اس شمارہ کی سب سے خوبصورت کہانی ہے - کہانی کا تاثر دیر تک دل پر طاری رہا آج کل ماسٹر برکت علی جیسے مخلص لوگ قدم قدم پر سنگسار کئے جاتے ہیں اور مولوی صاحب کا ناشر تو آج کے سماج میں جابجا نظر آتے ہیں اور سماج ایسے ہی افراد کو اپنے سر آنکھوں پر بٹھاتا ہے یہی وجہ ہے کہ آج سماج میں تعمیری ذہن کے لوگ آٹے میں نمک کے برابر ہیں اور جدھر نگاہ اٹھتی ہے داداگیری کرنے والے فریبی مکار قسم کے لوگ ہی دکھائی دیتے ہیں - اس قسم کے افسانے ماہنامہ بیسویں صدی میں ، شمع اور روبی میں پہلے بہت نظر آتے تھے اب تو کبھی کبھار ہی اتنے اچھے افسانے کسی رسالہ میں پڑھنے کو ملتے ہیں - بہت دن کے بعد ماہنامہ انشاء میں اتنی عمدہ کہانی آپ نے چھاپی ہے - اسی طرح کے افسانے کرشن چندر ، غلام عباس ، علی عباس حسینی ، احمد ندیم قاسمی ، ممتاز مفتی وغیرہ لکھتے رہے ہیں - علامتی افسانے یا جدید افسانے کا ایسا سیلاب آیا کہ اچھے قسم کے افسانے رسائل و جرائد کے صفحات سے غائب ہو گئے - تجریدی آرٹ کی دیکھا دیکھی تجریدی افسانے لکھنے والے اصحاب نے افسانہ کی مٹی ہی پلید کر کے رکھ دی - اب تو افسانہ پڑھنے والے رسائل و جرائد سے منہ موڑ کر ڈائجسٹ کے صفحات میں پناہ لینے لگے ہیں - ادبی رسائل و جرائد کے قاری کے کم ہوتے جانے کی شاید یہ بھی ایک وجہ ہے بجائے اس کے کہ مدیران گرامی اپنی کوتاہیوں پر نگاہ ڈالتے الٹے شکوہ کناں ہیں کہ ادبی رسائل کی مانگ کم ہوتی جا رہی ہے - ایسے افسانے جس کا نہ کوئی سر ہو نہ پیر اور جسے خود تحریر کرنے والے بھی مشکل ہی سے سمجھتے ہوں گے - اسے عام قاری بھلا کس طرح سمجھنے کا دعویٰ کر سکتا ہے - افسانہ " محنت اور زمین " بھی اس کی ایک عمدہ مثال ہے - بیرونی ممالک کے بڑے قلم کار بھی ضروری نہیں کہ اچھے افسانے ہی لکھیں - شکیل الرحمن صاحب کا شہنشاہ ظہیر الدین بابر - بابرنامہ کی پہلی قسط خوب ہے اس کی دوسری قسط کا ابھی سے انتظار ہے - رئیس الدین فریدی صاحب کی سوانح حیات ناول سے بھی زیادہ دلچسپ معلوم ہوتی ہے - حاجی واکر کی زندگی کے حالات اور بھی تفصیل کے

مستاعِش نے ممکن ہو تو سعادت حسن منٹو نے اور جہاں ستارہ وغیرہ پر جو دلچسپ خاکے تحریر کئے ہیں الفاظ کے صفحات میں ان کو بھی جگہ دینے کی کوشش کیجئے۔ الفاظ کو "شاعر" اور "شب خون" جیسے رسائل کی صف میں شامل مت کیجئے اسے عوام کا اور عوام کے لئے بنانے کی جدوجہد کیجئے۔

ابرار احمد صدیقی، مدھوبنی

OOOOO

○ "الفاظ" کا عید نمبر غالباً ۲۹/ فروری کو مل گیا تھا۔ اس میں اپنی نظم کی شمولیت پر حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی۔ حیرت اس لئے کہ ہمارے درمیان Verbal Combat کافی کڑوا ہو گیا تھا۔ اور میں نے اپنے پچھلے عریضہ میں لکھ دیا تھا کہ میں "الفاظ" کے عید نمبر سے اپنے نام اور اپنی نظم کے اخراج کا انتظار کروں گا۔ بہ ایں ہمہ آپ نے یہ نظم عید نمبر میں شامل کی۔ اور میرے لئے حیران ہونے کا ایک موقعہ فراہم کیا۔

خوشی اس لئے ہوئی کہ اس "لفظی تنازع" کا اثر میری نظم کی عدم شمولیت پر نہیں پڑا۔ اس سے آپ کی ادارتی غیر جانبداری کا ثبوت ملتا ہے۔ ثبوت ملتا ہے کہ میری اس نظم میں "کچھ" تھا جس نے اسے شامل اشاعت ہونے دیا۔ اور اس "کچھ" کا اعتراف آپ نے غیر جانبداری کے ساتھ کیا۔ اس ادارتی غیر جانبداری کے لئے میں آپ کو مبارکباد دیتا ہوں۔ چاہتا ہوں کہ جو کچھ رہنائے غلط فہمی ہمارے درمیان پیدا ہو گیا تھا اسے آپ Rub Off کر دیں (میں تو کر چکا جب ہی تو آپ کو خط لکھ رہا ہوں) اور مراسلت کے اس رشتہ کو استوار رکھیں۔ کیا میری اس خواہش کو شرف قبولیت ملے گا؟ اس کی امید کروں؟

نجیب رامش، بھوپال

(XXXX)

○ "الفاظ" کا عید نمبر ملا۔ دبئی مشاعرے کی رپورٹ، حاجی انیس صاحب کے رسائل، فلمی ستارے اور باجی میں بھی شائع ہوئی۔ قومی آواز، ایوان اردو، سیاست وغیرہ میں بھی لیکن ان سب سے زیادہ بہتر ڈھنگ سے الفاظ میں چھپی ہے۔ خاص طور سے فلوٹنگ ہوٹل کے ڈنر کا ذکر آپ نے اچھے انداز میں فرمایا ہے۔

الفاظ بہت خوبصورت ہے ٹائٹل کور سے مواد تک سب کچھ اچھا ہے۔

عقیل نعمانی، بریلی

(XXXX)

○ سرورق بے حد خوبصورت و جاذب نظر ہے۔ بالکل انگلش میگزین کی طرح۔ پسند آیا!

اس مرتبہ آپ نے عید پر اچھا خاصا مواد جمع کر لیا ہے۔ افسوس کہ میں نے بھی ایک نظم "وہ چاند اور تم" جو کہ بطور خاص عید نمبر کے لئے بھیجا تھا آپ نے اسے شامل نہیں کیا۔ بہت دکھ ہوا ہے مجھے۔

رزاق افسر، نجیب رامش کی نظمیں خاص طور سے پسند آئیں۔ قتیل شفائی، نسیم شاہجہاں پوری، حنیف نجمی و جیالعل دت رفیق کی غزلیں اچھی رہیں۔ مقصود الہٰی شیخ صاحب کا افسانہ "حیوان" اچھا ہے۔ یہ افسانہ اس دور کا آئینہ ہے۔ ستارہ لطیف خانم کا افسانہ "کامیابی" ایک جذباتی افسانہ ہے جو کہ ایشیائی ماؤں کی محبت و مشقت و ممتا کا تاثر چھوڑ جاتا ہے۔ مسعود مفتی و محترم سید محمد ظفر امام صاحب کے افسانے بھی خوب رہے۔

"سوانح حیات" میں رئیس الدین فریدی صاحب نے حق پرستی کا ثبوت دیا ہے۔ پروفیسر شکیل الرحمن صاحب کی تحقیق بے حد معلوماتی و لائق تحسین ہے۔ خدارا اس تحقیق کو مکمل کر دیں۔ "اداریہ" کو پرچے کی جان ہونا چاہئے اور آپ نے اس اسے بار فدا حسین اور مادھوری کے نام وقف کر دیا۔ تعجب ہے۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں کہ اس بار کا "اداریہ" الفاظ کے معیار کے قابل نہ رہا۔ سید طہارت علی کے شعری مجموعہ "خود رو" پر ڈاکٹر محمد ظفر قدوائی کا تبصرہ خوب رہا۔ باقی سب کچھ ٹھیک ہے آپ کا "عید نمبر" بے حد پسند آیا۔

مدنام لشر، یاکور شریف

OOOOO

○ ادبی صحافت میں کسی متوقع انقلاب کو پس پردہ چھوڑیں گے بھی یا "الفاظ" ہی کو گزرتی صدی کا نمائندہ ثابت کرنا طے کر چکے ہیں؟ جیثم مدور انئے سال کی "گفتنی" گویا نبض عہد حاضر پر حساس انگلیوں کا لمس خلوص ہی نہیں بلکہ لہو کے Arteriel اور Veinous کرداروں کے امتزاج کو غیر متوازن کرنے والے محرکات کی بے باکانہ نشاندہی بھی ہے پھر اداریئے کے رسمی (اور کاروباری) Formate کو موضوعات کے تقدس اور ناگزیریت سے مؤخر کر دینا بھی شاید آپ کی ہی اختراعی جسارت کا کمال ہے۔

افسانوں میں جمیل آفتاب ماضی الضمیر کو اجاگر کرنے میں کامیاب ہیں "عورت شیشہ" جمہوری بد احتیاطی اور غیر ذمہ دارانہ مفروضہ سازی پر مہمیز کاری ہے۔ مقصود الہٰی شیخ کے "حیوان" کا تناظر دراصل اس خود مرکوزیت کو مرتعش کرتا ہے جو آج ہم میں سے ہر کسی کے باطن پر محیط ہے

لیکن جسے بعینہ قبول کرنے کی توفیق شاذ و نادر ہی نظر آتی ہے - نئی زمانہ آفاقی طرز روش کا ڈھنڈورا در اصل اسی خود فریبی کا انعکاس یا انعطاف ہے -

لطیف رشیدی کی علامتی تخلیص کو آپ کی موقلم کاری نے بہت خوب گرفت میں لیا ہے - مجموعی طور پر خاکوں کے ابتدائی تمام تجربے موثر ہیں

فریدی صاحب جیسے اخلاق سراپا بزرگ کی سوانح کو شامل کرنا قابل تحسین فیصلہ ہے - پروفیسر شکیل الرحمن نے تعلیمی نظم و نسق کے بعد اقتدار کی علالت میں بھی بے نیازانہ تمکنت اور درویشانہ فعالیت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا، اب اس تاریخی عوامل کی بازیافت کا بیڑا اٹھایا ہے جس سے صرف نظر کرنا اہل وطن کا مشغلہ بن چکا ہے - اس اہم سلسلے ملکہ منصوبے کے لئے آپ دونوں ہی مبارکباد کے مستحق ہیں -

دبئی کے تعلق سے رپورتاژ تو یقیناً سیر حاصل ہے لیکن یہ آپ نے کیا غضب کیا ؟ کہ وہاں کی "روانگی" کو تسلسل سے منقطع کر ڈالا !

حصۂ نظم میں انفرادیت کے نقطۂ نظر سے ظفر گورکھپوری اور انجم عظیم آبادی نیز (اخلاق میربانی کے تحت) قتیل شعائی ہی خصوصیت کے حامل ہیں - ناگوار خاطر نہ ہوا تو کچھ بھرتی کا مواد اور Review Section آپ کی نگاہ ثانی کا متقاضی ہے !

اور ہاں ! اتنا حسین سرورق ؟ اللہ کی پناہ ! دو راتوں کی مسلسل بے چینی کے بعد آخر ۹۲ء کی پہلی تخلیق نے جنم لے ہی لیا - نظم Tittle Beauty ہمرشتہ ہے -

اظہار مسرت یزدانی، ناگور

OOOOO

○ "انشاء" عید نمبر موصول ہوا تو بے حد خوشی ہوئی کہ آپ نے ایک صفحے پر میری چھ نظمیں شائع کر کے مجھے بے حد شاد کام فرمایا - ایسی نوازش اور ادب نوازی کے لئے سراپا سپاس ہوں - مجھ بینائی سے معذور قلمکار کے لئے آپ کے دل میں خلوص و ہمدردی کا جو نرم گوشہ موجود ہے اللہ تعالیٰ اسے نظر بد سے محفوظ رکھے - عید نمبر انشاء کی روایتی خوبیوں کا حامل ہے - آپ کی لگن اور محنت قابل صد ستائش ہیں -

رزاق افسر، میسور

OOOOO

○ مقصود الہیٰ شیخ صاحب کو مغربی بنگال اردو اکیڈیمی پر جو غصہ یا دہ آیا ہے - اور انہوں نے جو کارروائی کی بات سوچی ہے وہ بھی درست -

ہمیں بھی احتجاج کرنا چاہیئے - قیصر شکین صاحب نے بھی واجب بات کہی - افسانے اچھے ہیں - شمارہ شعری اعتبار سے بھی بہتر ہے -

شہاب اختر شہاب، جھریا

OOOOO

○ "انشاء" کا عید نمبر زیر نظر ہے - میں چکر میں پڑ گیا ہوں کہ انشاء کی کون کون سی خوبیوں کی نشان دہی کروں - اگر ایک خوبی پر نظر ڈالتا ہوں تو دوسری سامنے آجاتی ہے - میں صرف اتنا ہی کہہ سکوں گا کہ اس کا ہر مضمون اور ہر شعری تخلیق ایک ادبی ذخیرہ ہے، جمالیات کا مجموعہ ہے، ادب کا مخزن ہے -

اخلاق سہسوانی، ضلع بدایوں، یوپی

OOOOO

○ "انشاء" کا تازہ شمارہ موصول ہوا، دبئی کی روداد نے سفر کے لمحات کو تازہ کر دیا - دیگر جرائد سے مفصل بھی اور موثر بھی، آپ کے رپورتاژ سے یہ مشاعرہ تا دیر محفوظ رہے گا -

منصور عثمانی، مرادآباد

OOOOO

○ ماہنامہ انشاء کا عید نمبر نظر نواز ہوا - اپنی کتابت، طباعت اور دیدہ زیبی کے ساتھ ہی متفرق موضوعات پر مشتمل مضامین، افسانے اور شعری حصے ایک معیاری جریدہ ہونے پر دلالت کرتے ہیں - مقبول فدا حسین اور مادھوری دکشت کے تعلق سے آپ نے بڑے پر لطف انداز میں تبصرہ کیا ہے - "روزے کی عمدگی" کو سنت الاسلام نے بڑے سائنسی اور مدلل ڈھنگ سے لکھا ہے - "محدب شیشہ" تو حقیقتاً شمارے کا حاصل ہی ہے - مسعود منتق صاحب نے جس چابکدستی سے قصباتی فضا کو اس افسانے میں ابھارا ہے وہ ان کے گہرے مشاہدہ کی گواہی دیتا ہے - ماسٹر برکت علی کا کردار ان کی کردار نگاری کی صلاحیت کی منہ بولتی تصویر ہے - افسانہ اپنے موضوع کے اعتبار سے ہر طرح کامیاب ہے - ایک کامیاب افسانے کا خاصہ یہ ہے کہ اسے پڑھ یا سن کر حقیقت کا گمان ہونے لگے - مذکورہ افسانہ اس کسوٹی پر پوری طرح کھرا اترا ہے - "تلاش خبر" بھی ہنستے ہنساتے معلومات میں اضافہ کرانے کی صلاحیت رکھتا ہے - مقصود الہیٰ کے افسانے "حیوان" کے توسط سے یورپی ملکوں میں مہاجر غیر ملکیوں کی حالت زار کا اندازہ ہوتا ہے حالانکہ اس طرح کی خبریں اکثر ریڈیو اور اخبارات کے ذریعے بھی ہم پڑھتے رہتے ہیں - "دہلی کے مشاہدات و

تجربات " اور " ظہیر الدین بابر اور بابر نامہ " بڑے معلوماتی اور کارآمد مضامین ہیں البتہ دہلی کے مشاہدات و تجربات میں فریدی محترم نے آنجہانی نریش کمار شاد کے متعلق لکھا ہے کہ ان کی لاش ایک نالے میں پائی گئی تھی جب کہ ان کے انتقال کے وقت جو خبریں مختلف اخبار و رسائل میں شائع ہوئی تھیں ان میں ان کے حمام میں دریابرد ہوکر خودکشی کرنے کی بات کہی گئی تھی - آپ کا رپورتاژ دبئی کی اردو ادبی سرگرمیوں اور وہاں اردو کے پھلنے پھولنے پر کارآمد معلومات فراہم کرتا ہے - شعری حصے میں ظفر گورکھپوری اور حنیف نجمی صاحبان کی غزلیں بڑی موثر ہیں - محترم شباب للت صاحب کی نظم "ہائے یہ دور ترقی " اچھی نظم ہے لیکن ان کی یہی نظم نومبر - دسمبر کے دوماہی " گلبن " احمد آباد میں بھی شائع ہو چکی ہے - بہرحال انشاء کا یہ شمارہ ہر قسم کے ادبی ذوق کی تسکین کا سامان فراہم کرتا ہے -

ظہور منصوری نگاہ ، ردوا (یو - پی)

(××××)

○ جس پابندی سے ہر ماہ آپ رسالہ شائع کر رہے ہیں وہ قابل مبارکباد ہے - انشاء پڑھ کر اس لیے بھی خوشی ہوتی ہے کہ مضامین کے انتخاب میں بڑا تنوع ہوتا ہے - اس میں ہر مزاج کے قاری کے لیے بہتر اور معیاری تخلیقات مل جاتی ہیں یہ بہت بڑا کام ہے - نیاز فتحپوری نمبر کا اعلان دیکھا - خدا کرے یہ نمبر بھی آپ کے دوسرے خاص نمبروں کی طرح تاریخی ہو -

Prof SHARIB RUDAULI VI

A-117, Maurice Nagar Delhi - 7

(××××)

○ میرے دیرینہ کرم فرما ظفر گورکھپوری کے یہاں انشاء (جلد ۱۱ شمارہ ۱ ۲) بصیرت افروز ہوا - رسالے کا دیدہ زیب گیٹ اپ ، معیاری چھپائی اور بالخصوص مضامین کا انتخاب کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست کے مصداق ہے - مسعود مفتی کا " محدب شیشہ " بڑا اچھا انشائی تجزیہ ہے - رئیس الدین فریدی کا مضمون " دہلی کے مشاہدات و تجربات " بہت شوق سے پڑھا - دہلی نام ہی میں ایسی جاذبیت ہے کہ اس کے قصے سننا اچھا لگتا ہے - پرانی دلی ہو یا نئی دلی - یہ سر زمین زلیخا کے شباب جیسی ہے آپ کی محنتوں پر مبارکباد -

شرف کمالی ، کولہاپور ۴۱۶۰۰۵

(××××)

مشرقی ہندوستاں کا بہترین اور واحد بین الاقوامی اردو رسالہ

ماہنامہ انشاء کلکتہ

ISSN 0971 - 6009

جلد ۱۱ | جولائی/اگست ۱۹۹۶ء | شمارہ ۷-۸

انشاء پبلیکیشنز

مدیر ف۔س۔اعجاز

فی شمارہ ۸ روپے

زر سالانہ ۹۰ روپے

مغربی ممالک سے £ 12 or US $ 20

رقومات بذریعہ منی آرڈر، بینک ڈرافٹ، چیک صرف "انشاء پبلی کیشنز" کے نام میں روانہ فرمائیں ورنہ قابل قبول نہ ہوں گی۔ برطانیہ سے BPO کے ذریعہ رقومات بھیجی جائیں۔

فہرست

ماہنامہ انشاء۔ انشاء پبلی کیشنز

خط و کتابت، مضامین بھیجنے اور ترسیل زر کا پتہ

۲۵۔بی زکریا اسٹریٹ، کلکتہ ۷۰۰۰۷۳۔ فون ۲۵۔۴۶۱۶

عالمگیریت — نئی مسلمہ حقیقت

یہ زمین ایک عالمی گاؤں میں تبدیل ہو چکی ہے۔ ٹیلی مواصلات اور معلومات عامہ کی جدید ترین ٹیکنالوجی نے وہ انقلاب برپا کیا ہے جو انسان کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ ملکوں کے جغرافیائی و سیاسی حدود اپنی جگہ بر قرار ہیں لیکن اس کے باوجود آج یہ دنیا ایک ایسی تجارتی مرکزیت قائم کرنے میں کامیاب ہو چکی ہے جسے با آسانی انسانی وسائل کی کشادگی اور صارفی سماج کی تشکیل کی بنیاد قرار دیا جا سکتا ہے۔ آج ترقی یافتہ اقوام — چاہے وہ مغربی ہوں یا مشرقی — تصور سے زیادہ ہوش و آگہی کی دیوانی ہیں۔ رات کو روز صبح کرنے اور صبح کو جوں توں شام کرنے کے ست رو ایام بیت چکے اور اب عالم ہست کے سپید و سیاہ میں ان چاق و چوبند اور زیرک قوموں کو پورا پورا دخل ہے جو "خبر کی مستی" کے پیالے لنڈھا رہی ہیں۔ بیداری کی منڈی میں میلوں کے فاصلے اور جغرافیائی تفاوت اب کوئی معنی نہیں رکھتے۔ اس وقت واحد عالمی منڈی واحد مسلمہ حقیقت ہے۔ اعلیٰ سے اعلیٰ معیار اور بہتر سے بہتر ساخت کی مصنوعات کم سے کم قیمت پر مارکیٹ میں لائی جائیں عالمی سطح پر انسانی وسائل کا مقصد بس یہی رہ گیا ہے۔ کمپیٹیشن کا مفہوم صرف قیمتیں گرانے میں بازی مار لے جانا نہیں رہ گیا ہے بلکہ نت نئی دریافت، کھوج اور تحقیق ہر مسابقت کا مقصد خاص بن گئی ہے۔ علم و ہنر عالمی شاہراہوں پر شانہ بشانہ چل رہے ہیں۔ اس عالمگیریت (Globalisation) نے ہر اعلیٰ صنعتی قوم کو ایک خوف اور اندیشے میں مبتلا کر رکھا ہے کہ کہیں وہ انکشاف و دریافت کی دوڑ میں یا مصنوعات و خدمات کے بازار میں کسی دوسری قوم سے پیچھے نہ رہ جائے۔ تیسرے عالمی انقلاب کا ظہور اسی عالمگیریت کی شکل میں ہو رہا ہے۔ دنیا اب اس مقام سے پیچھے تو کیا ہٹے گی۔ مائکرو چپس، سیٹلائٹ مواصلاتی نظام، الکٹرانک میل اور انٹرنیٹ کی مٹھی میں سمائی ہوئی فتوحات انسان کے لئے اب کوئی منزل نہیں رہ گئی ہیں بلکہ وہ ایسا چیلنج اور کرشمہ بن گئی ہیں جن کے بطن سے نئے اور پر قوت امکانات جنم لیں گے۔ سائنس پر خود فریفتگی اور شباب کا عالم ہے اور بیسویں صدی کے آخری برسوں میں دنیا میں خود بخود ایک نیا نظام ترتیب پاتا جا رہا ہے اور یہ عزائم اب تھکنے والے نہیں ہیں۔ محنت کی بین الاقوامی تقسیم اب ممکن اور بامعنی نظر آ رہی ہے۔ صلاحیتوں کو اجاگر ہونے کے پہلے سے زیادہ اور بہتر مواقع فراہم ہیں۔ اقتصادی خوشحالی اور سماجی اور سیاسی استحکام کے حصول کے لئے وہ سبھی قومیں کمربستہ نظر آ رہی ہیں جنہیں دنیا کے نقشے پر بین اقوامی اختلافات کے باوجود اپنے وجود کو برقرار رکھنا ہے۔ ایٹمی خطرات اور اسٹار وار کے اندیشے سر دست ٹل گئے ہیں۔ طاقتور اقوام بقائے باہم کو اپنا شعار بناتی جا رہی ہے۔ ایک عالمگیریت کو مسلمہ ضرورت مان لینے کے بعد وہ کثرت میں وحدت کی پرستار بنتی جا رہی ہیں۔ اس کا سبب وہی نئی حقیقت ہے جو آزاد عالمی تجارت کی شکل میں نمودار ہوئی ہے اور جس کا تقاضا ہے کہ قومیں آپس میں تعاون اور ایک دوسرے پر انحصار کرتے ہوئے تجارت میں شرکت کے نئے علاقے تلاش کریں اور یہ پارٹنرشپ برابری کی سطح پر ہو۔ عینیت پسندی عمل کے دروازے پر کبھی یوں دستک دے پائے گی، کس نے سوچا تھا۔

لیکن کیا قدرتی اور انسانی وسائل کا بہترین استعمال اور تنظیمی صلاحیتوں کی آزمائش ایک مستحکم سیاسی نظام کے بغیر ممکن ہے؟ کیا ہماری معیشت کا اس تجارتی دوڑ میں اعلیٰ صنعتی معیشتوں کا ہم قدم اور ہمسر ہونا اتنا آسان ہے کہ بس کہا اور ہو گیا؟ ہم خود کو اتنا چاق و چوبند نہیں پاتے کہ بشریت کے اس مینار باخبری کی چوٹی کو چھو لیں۔ بعض اقوام پر یہ الزام عائد کرنا کہ وہ امیر سے امیر تر ہوتی جا رہی ہیں دراصل اپنے عیوب پر پردہ ڈالنے والی بات ہے۔ ہاں یہ کہنا زیادہ درست ہے کہ ہم غریب سے غریب تر ہوتے جا رہے ہیں۔ اس کے اسباب ہمارے حمد و آگہی کی ناکامی میں پنہاں ہیں۔ ہم چوکنا اور دراز قد کب ہوں گے؟

Gulzar
91-A, Cozihom Society
251 Pali Hill Bandra
Bombay - 50

مجھے کچھ لوگ ملتے ہیں!
نظر آنکھوں سے اٹھ کر پاس آتی ہے
ذرا سا ہچکچاتا ہاتھ ہلتا ہے
دبی آواز سے جب نام لیتے ہیں
کسی بچھڑی ہوئی پہچان کا احساس ہوتا ہے
"پیڈسٹل" ★ پر مجھے رکھ کر،
وہ میری باتیں کرتے ہیں،
مری کچھ خوبیاں، کمخواب کے کپڑے سے چمکا کر،
دکھاتے ہیں ــــ
مجھے حیران کرتے ہیں!
مجھے اک "فریم" پہنا کر میری تصویر کی تعریف کرتے ہیں!
انہیں میں جانتا ہوں کہ ــــ وہ میرے "فین" لگتے ہیں!!

★ Pedestal

نظم

(بیادِ کشمیر)

دل کے تاروں پر

مری وادی مرے اشعار کا معتراب ہے اب بھی
کہ یہ میری کتابِ زندگی کا باب ہے اب بھی

چناروں کے ستارے ذہن میں ڈوبے نہیں لوگو
مرا بے تاب دل ان کے لئے بے تاب ہے اب بھی

زمیں بدلی۔ فلک بدلا۔ زمانے کی فضا بدلی
مرے دل میں مگر تازہ غمِ احباب ہے اب بھی

مرا سوپور[1] کیا اب بھی حنائے دستِ جہلم ہے
مرا لولاب[2] کیا میرا سہانا خواب ہے اب بھی

وہ جس میں تیرتے تھے ہم بطِ بے تاب کی صورت
وہ میرے گاؤں کا تالاب، کیا شاداب ہے اب بھی

دمِ رخصت ترے دو چار لفظوں سے جو بھیگا تھا
میری آنکھوں میں اشکوں کا وہی سیلاب ہے اب بھی

۱۔ سوپور۔ جھیل ولر کے کنارے پر ایک خوبصورت شہر
۲۔ لولاک۔ ایک سرسبز اور خوبصورت وادی

بلبل کاشمیری (لندن)

غزل



جسم سے روح بھی جدا کیوں ہے
درمیاں اپنے یہ انا کیوں ہے

زندگی نے دیا نہ کچھ لیکن
زندہ رہنے کا حوصلہ کیوں ہے

ربط کوئی نہیں اگر مجھ سے
پیار سے مجھ کو دیکھتا کیوں ہے

تو میری جان روح ہے میری
تو میرے جسم سے جدا کیوں ہے

منزلیں ہیں جدا جدا لیکن
ایک ہی سب کا راستا کیوں ہے

کیوں وطن چھوڑنا پڑا عاصی
ہجرتوں کا یہ راستہ کیوں ہے

عاصی کاشمیر
nish Kadah
8-Wood Brough Road,
ttingham NG3 5 QJ
gland

543, Gali Hakimji, Chooriwalan
Jama Masjid, Delhi – 110 006

عفت زریں کی پانچ غزلیں

رنگ یادوں کا پگھلتے ہوئے موسم جیسا
،ھوپ کی طرح سے ڈھلتے ہوئے موسم جیسا

کتنا شفاف ہے، روشن ہے وہ شعلوں کی طرح
وہ بھی صحراؤں کے جلتے ہوئے موسم جیسا

چاند تو چاند ہے اور ساتھ ہے سب کے پھر بھی
م سفر وہ بھی ہے چلتے ہوئے موسم جیسا

ب یہ پت جھڑ کی صدا ہے کہ بہاروں کا فسوں
رح ہواؤں کا بدلتے ہوئے موسم جیسا

ت میرے گھر کی بدلتی ہی نہیں ہے زریں
م کا سورج ہے نکلتے ہوئے موسم جیسا

○★○

ہم خود کو ڈھونڈتے رہے درپن کے ساتھ ساتھ
سمٹی دلوں کی دھوپ بھی آنگن کے ساتھ ساتھ

معصومیت کے خواب حسیں ولولے بھی تھے
یہ تار ٹوٹتے گئے بچپن کے ساتھ ساتھ

اشکوں کے پھول پلکوں کے سائے میں کھل اٹھے
مٹی تھی بھیگتی رہی دامن کے ساتھ ساتھ

پرچھائیاں اتر گئیں تھہر وجود میں
بادل تھے جو چلے گئے ساون کے ساتھ ساتھ

رشتے تھے ٹوٹتے گئے زریں پیار کے
یادیں سلگتی رہ گئیں چندن کے ساتھ ساتھ

○★○

سر جھکانے کی عادت خودی بن گئی
سر فروشی تھی جو سرکشی بن گئی

اس سے قربت کے رشتوں کا اب ذکر کیا
مصلحت تھی کبھی دوستی بن گئی

وہ نظر جو کبھی محرمِ راز تھی
آشنا ہو کے پھر اجنبی بن گئی

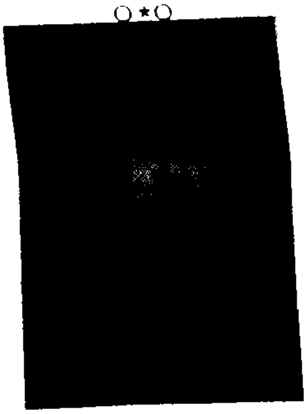
اس کا لہجہ تھا جو یاد آتا گیا
دل کی دھڑکن تھی جو نغمگی بن گئی

دور تک عکس اپنا ہی دیکھا کئے
اس کی پرچھائیں بھی روشنی بن گئی

جتنک پھولوں کے سائے نکھرتے گئے
ان کی خوشبو ہی اب زندگی بن گئی

کیسے کہئے حقیقت ہے زریں کیا؟
حادثہ تھا مگر خودکشی بن گئی

○★○



○★○

نوں کی ہر کہانی جھوٹ تھی
ر بھی اس سے بدگمانی جھوٹ تھی

ں کو چھوتی ہے جو خوشبو کی طرح
ے کہئے وہ نشانی جھوٹ تھی

اسے سمجھا نہ پائے اپنی بات
رسوں کی ہم زبانی جھوٹ تھی

فسانہ تھا یہ وعدوں کا فسوں
ی کی وہ جادو بیانی جھوٹ تھی

زریں کہہ سکیں پھولوں کا خواب
تمہاری شادمانی جھوٹ تھی

○★○

حسیں خواب کی تصویر کھا گئی ہوگی
وہ بے وفا ہے اسے نیند آ گئی ہوگی

جو آشیاں تھا وفاؤں کا وحشت غربت میں
ہوا وہ تنکوں کی تعمیر ڈھا گئی ہوگی

جو بن سکی نہ کبھی آرزو کے لمحوں میں
وہ بات بگڑی تمنا بنا گئی ہوگی

وہ حسن کے عکس میں دھندلا ہر اک وجود لگے
دل و نظر پہ گھٹا ایسی چھا گئی ہوگی

وہ نکھرا بکھرا سا لہجہ بھی پھول تھا زریں
غزل میں شعر کی خوشبو سما گئی ہوگی

فریب تماشہ



مقصود الٰہی شیخ
مدیر راوی
براڈفورڈ (برطانیہ)

اور بستی والوں نے فیصلہ کیا فاحشہ کو زمین میں گاڑ کر سنگسار کر دیا جائے۔ پیغمبرِ وقت نے کہا پہلا پتھر وہ مارے جس نے کبھی کوئی گناہ نہیں کیا ہو!

- - - - - - - - - - -

چڑیا نے ریت پر دھرے کاغذ سے ڈرتے ڈرتے، پیرا کے ٹکڑوں میں سے دانہ دنکا چگا پھر پیپر کا پتلا سا فیتہ چونچ میں پکڑا اور آسماں کی طرف اڑ گئی (وہ فاختہ تھی اور نہ اس کی چونچ میں زیتوں کی شاخ تھی!)

- - - - - - - - - - -

اس کے اندر کی جنگ کا اثر باہر تن پر دھیرے دھیرے، ہولے ہولے پڑتا جا رہا تھا۔ چہرہ کملایا ہوا تھا اور سارا بدن ٹوٹ رہا تھا

- - - -

اسے پچھلے دن اور گئی رات کی طوالت اور بوجھل پن کا ایک غیر شعوری احساس ہوا

- - -

چڑیا کی مترنم پھڑپھڑاہٹ کے بعد منظر ساکت ہو گیا!

- - - - -

اس نے سوچا کاش، وہ جو چڑیا ابابیل ہوتی اور اس کی چونچ میں پتھر ہوتا اور وہ پتھر اس کے سر پر آ پڑتا۔ قصہ تمام ہوتا!

- - - - - - -

مگر ایسا کچھ نہ ہوا۔

وہ اٹھی اور ہٹ کے سامنے والے حصے میں آ گئی۔ کمرے میں اس کا اٹیچی کیس، فاسٹ فوڈ کا ڈبہ اور اس کا ہینڈ تھیلا پڑا تھا جس میں اس کا پاسپورٹ، کچھ نقدی اور لندن سے سکپ ہول کا ایئر ٹکٹ رکھا ہوا تھا (وہ کتراتی نکل گئی!! ابھی ان میں سے کسی چیز کی ضرورت نہ تھی۔ ابھی تو اس مقام تک پہنچنے کے عمل کا ردعمل کا آغاز ہی ہوا تھا!!)

- - - - - - - - - - -

اس طرف ساحل پر دھوپ چمک رہی تھی۔ لہریں اٹھکھیلیاں کرتی دکھائی دے رہی تھیں۔ موسم سرد تھا اور سہانا تھا، باہر نکلنے کا یہ وقت نہیں تھا!! اپنے حال میں، وہ بے مطلب کھڑی نظارہ کرنے لگی۔

اکا دکا سیاح مرد اور عورتیں گزر رہے تھے اور انہوں نے تیراکی کے مختصر لباس پہن رکھے تھے جن کے رنگ [illegible] تھے

پھر یہ ہوا،
اس کے کانوں نے سنا،
اس کے کانوں نے کہا،
سمندر سے اٹھتے جھاگ، لہروں کے ٹکراؤ کا نتیجہ نہیں اور اس کے پیچھے کچھ شور ہے۔
لگا، موسم میں تمازت آئی ہے۔
ہجوم بڑھا ہے۔

اسے وہاں کھڑے رہنے کا اور کچھ کچھ بھوک کا احساس ہوا۔ وہ سمٹ کر اندر گئی۔ کھانے کے ڈبے سے ایک نوالہ اٹھایا، نگلنا چاہا مگر منہ سے ٹھنڈا کھیرا لگتے ہی اس کے اندر اور باہر کے بیچ تناؤ آ گیا۔ اس نے بے دلی سے نوالہ واپس رکھ دیا۔ بھوک تھی مگر کھایا نہ گیا۔ اکتاہٹ آئی تو

رک گئی۔ اس کا اندر باہر سے کچھ لینے پر آمادہ نہ ہوا تھا اور اندر تھا کیا جو باہر آتا؟

خالی پن کی کیفیت پوری طرح اس پر چھا گئی۔

(مایوس، ٹھکرائے ہوؤں اور ہجر کے ماروں میں یہ کیفیت شدید ہوتی)

وہ ابھی ابھی تیزی سے نکل کر سمندر میں جا اترے گی

(خطرہ جاگا)

سمندر سے نکال لائے پر اس کا نچڑا، نچڑا لباس اور کپکپاتا بدن دیکھ کر لوگ ہنسیں گے

(حالانکہ اسے ہمدردی کی ضرورت ہوگی)

(ہم پاکستانی پہلے ہی بدنام ہیں۔ نظروں میں آئے ہوئے ہیں)

وہ دروازے پر رک گئی۔

باہر کا منظر تیزی سے بدلتا جا رہا تھا۔ بہت سے مرد اور عورتیں کرسیاں اٹھائے تولیئے پکڑے آتے جا رہے تھے۔ ریت پر چادریں بچھا کر آفتابی غسل لے رہے تھے۔ کوئی سیاہ چشمہ لگائے پڑا تھا۔ کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔ ٹاپ لیس خواتین اپنے آپ سے بھی بے نیاز تھیں۔ بیچ چولی کے بند کھول کر اوندھی پڑی دھوپ کھا رہی تھیں۔ (اس کے پاس بکنی نہیں تھی)

وہ وہیں کھڑے کھڑے نظارہ کرتی رہی ------

ایک جانب بھورے، سنہرے بالوں اور گورے بدن والے بچے ریت کے قلعے بنا رہے تھے۔ ان کے قہقہوں نے اسے تھوڑی سی حرارت اور جیتی جاگتی سی توانائی دی۔ سوچ کی خفیف سی گدگدی نے یاسیت میں ارتعاش پیدا کیا۔ اس نے ایک پھریری لے کر دل ستانے والی پریشانی کے عقبی در اور دریچے بند کر دیئے اور بچوں کی ننھی گھنٹیوں ایسی میٹھی ہنسی اور بہکتی حرکتوں اور معصوم کھیل میں محو ہونے کی سعی کرنے لگی جیسے وہ ازل سے وہاں کھڑی مسکرا رہی ہے۔

پھر،

اسے پتہ بھی نہ چلا،

وہ چھوٹے چھوٹے قدم لیتی باہر نکلی اور بچوں سے کچھ دور جا کر ریت کھودنے لگی! جیسے وہ بھی کوئی بچی ہے۔

کئی جوڑوں نے اپنا انہماک توڑا، اس کو دیکھا، مسکراہٹوں کا تبادلہ ہوا اور ہر ایک اپنے میں مگن ہو گیا۔

اتنا بڑا گڑھا کھدتے دیکھا تو بچے متوجہ ہوئے، وہ اسی کی طرف آ گئے اور اس کے ساتھ مل کر ریت کھودنے لگے۔

پھر،

وہ بن چاہے، بے سوچے، گھٹنوں کے بل گڑھے میں اتر گئی!

کیا اس کی تمنا اتنا بڑا گڑھا کھودنے کی تھی جس میں وہ کھڑے قد سے اتر سکے؟ شاید اس کے اندر انارکلی بننے کی خواہش چھپی بیٹھی تھی!!

بھرے دل اور خالی ذہن سے وہ مٹھیاں بھر بھر کر گڑھے میں ڈال رہی تھی۔ قریب ہی ایک عورت چت لیٹی تھی جو پہلے نظر نہ آئی تھی۔ ایک مرد اور کئی بچے، جانے ایک ہی گھر کے یا غیر تھے، سب مل کر اس پر ریت ڈال رہے تھے۔ ایک لڑکی کھڑی تصویر کھینچ رہی تھی۔

اس عورت کا لیٹ کر، ریت تلے چھپنا اور اس کا گڑھے میں اتر کر دب جانے کا جتن اپنی اپنی قبروں میں ابدی نیند کا ذائقہ چکھنے کی ریہرسل تھی؟ کیا قبروں سے جڑے دھاروں میں کوئی ہم آہنگی ہوتی ہے؟

تصویر کھینچ کر دبلی پتلی لڑکی ادھر آئی تو بچے بھی لگ گئے۔ گڑھا تیزی سے بھرنے لگا۔ ادھر وہ عورت پلک جھپکنے میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ مرد جس نے اٹھنے میں اسے مدد دی تھی اس کے بدن سے ریت جھاڑ رہا تھا۔

اس کی ریت کون جھاڑے گا؟

اتنے میں یونین جیک کی نیکر پہنے ایک مرد اور تیراکی کے چھوٹے چھوٹے دو کپڑوں میں ملبوس اس کی گرل فرینڈ پاس سے گزری۔

ہیلو ---- اس نے پکارا

وہ رک گئے۔ زبان کا مسئلہ ہے وہ بن بتائے سمجھ گئے تھے!

وہ انگریزی تھے۔ لندن سے ہی آئے تھے۔ لباس ظاہر کرتا تھا۔ اس نے اپنائیت کی قدر گڑھ لی۔ وہ اس کو دلچسپ خوشگواریت سے دیکھ رہے تھے۔ لیکن اس کے ہونٹوں پر کوئی ان سوچی بات آ کر رک گئی۔

"ہیلو!" وہ صرف یہی کہہ پائی۔

دونوں مسکرائے اور "ہیلو" کہہ کر آگے بڑھ گئے۔

\- - - - - -

بچوں کو "کھیل" کی طوالت اور یکسانیت بور کر گئی۔ وہ خود ریت میں دب کر بے بسی سی محسوس کر رہی تھی۔ تصویر اتارنے اور اترنے والا کب کا جا چکا تھا۔ اس کے گرد بچوں کا گروہ چھوٹا ہو گیا تھا۔ ایک چھوٹی عمر کی، بس کی سہری بچی گھیرے سے نکل کر آگے جھکی۔ اس نے ریت میں دبی کالی عورت کے بال بے دردی سے کھینچے اور دور گئی

"

کوا دے ۔ وہ چیخی

غصہ اور خوف اور بے بسی امیر چیخ بلند ہوئے۔ سبھی بچے بھاگ لئے۔ بعض بچوں کو ان کے والدین نے ڈانٹ کر پکار لیا تھا

وہ اکیلی رہ گئی۔ ریت میں دھڑ ساکت اور سینے میں دل دھڑک رہا تھا، صرف چہرہ باہر تھا جس میں آنکھیں متحرک تھیں

صبح دھیرے دھیرے جوم رہا تھا۔ اب تیزی سے چھٹ رہا تھا

کیا ساحل، بہت جلد، تھوڑے سویرے اور صبح ہونے کے بیچ کے لمحوں کی طرح سنسان ہو جائے گا؟ وہ ریت میں دھنسی رہ جائے گی؟

ریت میں بڑھتی ٹھنڈک اسے اپنے ہونے کا جاگا جاگا یقین دلا رہی تھی۔ وہ بغیر مدافعت پیچھے چل گئی

قریب اور بعید مل گئے!

کلی چپ تھی، اس کے قدموں کی چاپ سناٹا توڑ رہی تھی۔ دوسری ملک پر دروازہ کھل گیا

"اندر آ جاؤ" اس نے کہا تھا۔ آواز میں خوشی، تپاک یا جوش کا کوئی جذبہ نہیں تھا

وہ دلیر پھلانگ کر، راہداری سے گزر کر اس کے پیچھے پیچھے کمرے میں آ گئی۔ زمین پر اپنی کیس رکھ دیا اور قریبی صوفے پر بغیر ٹوپی اور ناپ کوٹ اتارے بیٹھ گئی۔ ان حالات میں احتجاج کی یہی صورت ہو سکتی تھی

"چائے پیو گی یا کافی؟" اس نے پوچھا تھا

کچھ بھی یا کچھ بھی نہیں۔ اسے خود بھی نہ سنائی دیا، اس نے کیا جواب دیا تھا

وہ کچن میں چلا گیا۔ دو چار پل گزرے پھر وہ بھی پیچھے چلی آئی۔

اس نے ایک پلیٹ میں انجیر اور پنیر کے چند ٹکڑے رکھ کر اسے بڑھائے

"دل نہیں چاہ رہا" اس نے انکار میں کہا تھا

"میں کافی بناتا ہوں" اس نے دوبارہ پلیٹ اٹھا کر اس کی طرف بڑھائی اور اشارے سے لے لینے کا اصرار کیا۔

بے دلی سے اس نے ایک چھوٹا سا پنیر کا ٹکڑا اٹھا کر منہ میں ڈال لیا

وہ بدستور خاموش تھا۔

وہ کمرے میں پلٹ آئی۔

چند لمحوں بعد وہ کافی کا مگ لے آیا

"خود نہیں پیو گے؟"

"میں اس وقت کچھ نہیں لیتا!!"

وہ ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔

خاصی دیر تک دیکھتے رہے۔

خاموشی نے آنے والی کو بالکل ہی تنہا اور بے بس کر دیا۔ ... کی دھاری تلوار سے مجروح ہو کر وہ پوری طرح پسپا ہو گئی

"یہاں میرے لیے کچھ نہیں دھرا!!"

خلا تھا۔ خاموشی تھی۔

\- - - - - - - -

پھر،

یوں ہوا۔

وہ اٹھا اور اس نے، اس اداس سی لڑکی کو بازوؤں میں بھر لیا

تھوڑی سی مزاحمت کے بعد وہ سپردگی کے سمندر میں اتر گئی۔ چلی گئی!

"یو آر گریٹ۔ یو آر گریٹ!!" وہ سرگوشیوں میں کہہ رہا تھا

وہ اس کا مطلب سمجھتی تھی۔

مگر بے یقینی میں لپٹی وہیں پڑی رہی

\- - - - - - - - - -

کاش،

وہ کہتا "تم مجھے اچھی لگتی ہو۔ تم خوبصورت ہو۔ تم بہت ...

ہو۔

یہ کیوں نہیں کہا؟ شاید چاہت کی یہ پرانی طلب، سدا ہی پیاسی رہتی ہے۔

آکاش سے اترتے بادل تحلیل بھی ہو رہے تھے۔

اس نے بچھتاوا روکا۔ سفری کپڑوں میں رمیں پر یوں چھائے جانے پر احتجاج کی بجائے کڑھا سخت بزدلی ہے۔

لمحہ موجود کا گرج اٹھا۔

وہ اپنے آپ کو سمیٹ کر دوبارہ صوفے پر آبیٹھی۔

آنکھوں کو بھیگنے سے روکا، سوچا، یوں ہوا تو یہ بڑی ہتک کی بات ہوگی۔

میں اس لئے تو نہیں آئی تھی!'

اور کیا کہتی؟

کچھ بھی نہ کہتی!

پھر وہی خاموشی!

جیسے اس نے کچھ کہا نہ اس نے کچھ سنا!!

شاید اسی سکوت میں سو سال گزر جاتے مگر نہیں سو سال گزرنے سے پہلے ہی سکوت ٹوٹ گیا

بہت خاموش ہو۔ کیا بات ہے؟

اس نے دل میں کہا کوئی بات ہی تو بتانے ------ سانے تھی۔ سفر کر کے سن ملانے آگئی تھی'

اچھا اب چلتی ہوں۔' وہ گویا ہوئی۔

جارہی ہو۔ یہ سوال نہ تھا۔ ایک قبولی ہوئی حقیقت کا دوبارہ اظہار تھا۔

''وہاں سے بے اثبات، بے قرار، مایوس اور اداس ہو کر نکل آئی۔

اپنا آپ چھوڑ کر، کھو کر!

تجزیانے کی تلاش میں وہ کس مقام پر آگئی تھی؟

نہ جلنے اور نہ جلنے کے احساس کی انتہا ہے۔ اجالے، ان بوجھے، علم انجام کی ابتدا ہے۔ ظلم اور مظلومیت کی حد فاصل ہے۔

صدیوں برابر دن اور صدیوں لمبی رات گزری، سو گزری۔

آج بھی اس نے پل پل کر کے بتا دیا۔

پھر بھی زندہ تھی۔

اس کی رگوں سے روح نہیں کھچی تھی جیسے اس کے وجود کا بوجھ دھرتی کے سینے میں اترنے سے ملا دھڑ ہی رہ گیا ہو۔

شام ملگجی ہو رہی تھی۔ سائے مدھم پڑنے شروع ہو گئے تھے۔

دور سے آتی پرندوں کا ایک غول اڑتا آرہا تھا وہ ڈر گئی۔

ان پرندوں کی چونچوں میں کنکر ہوئے تو

اس نے ڈر کر آنکھیں بند کر لیں۔

نم ہوا نے اس کی بند پلکوں پر خفیف سی تھپکی دی۔

دور سے ایک ہیولا آتا دکھائی دیا۔

وہ کوئی، اس کی ہم وطن موٹی سی خاتون تھی۔ ڈھلکتی لڑھکتی اس طرف چلی آرہی تھی۔

کسی نودولتیئے کی بیوی ہے جسے شوہر دولت مندوں کی ریس میں زبردستی ساحل پر لے آیا ہے۔ اسے اکیلا چھوڑ کر کوئی بزنس ڈیل طے کر رہا ہے۔ اس نے بیدار ہوتی آنکھوں اور سوتے ذہن سے یہ سب تصور کر لیا۔ ایسے لوگ اپنوں سے کٹ جاتے ہیں اور جس غول میں شریک ہونا چاہتے ہیں، اس میں کھپتے بھی نہیں۔ اس نے سوچا

(وہ بھی اپنے ہوتے ہیں جو چپ چاپ بے وفائی سے فنا کر دیتے ہیں

اس نے بیزار ہو کر، پردیس میں کسی ہم وطن کو پکارنے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔

راہگزر تھی،

کترانا بے سبب تھا

وہ موٹی عورت آگئی۔ ادھر سے گزر رہی تھی، رک گئی۔

' اپنے والی لگتی ہو۔' وہ اپنی پہچان پر مسرور تھی۔

' تمہارا شوہر کہاں ہے؟ بچے کہاں ہیں؟' اس نے پوچھا تھا۔

' شرارت سے کہیں جا چھپے ہیں؟' اسے اپنا قیافہ درست لگ رہا تھا

بقیہ ۲۴ پر

مہدی پرتاپ گڑھی
۲۸ - سکول وارڈ، پرتاپ گڑھ (یوپی)

اندر اور باہر کی دنیا

میرے اندر جو اک دنیا ہے
اس کے ضابطے اور قاعدے
باہر کی دنیا سے نہیں ملتے
یہاں پر راستی کا جو تصور ہے
اسے باہر کی دنیا آگ پر چلنے کے مترادف سمجھتی ہے
یہاں تقویٰ حصول مقصد ہستی کا مظہر ہے
مگر باہر کی دنیا میں یہ سد راہ بن کر ہوتا ہے حائل
مسرت اور نشہ کے درمیاں
یہاں تو نفس امارہ پہ قدغن
زندگی کو روشناس نور کرنے میں معاون ہے
مگر باہر کی دنیا میں حصول لذت ہستی کا ہے آساں ذریعہ
خواہشوں کی راہ پر چلنا
مرے اندر کی دنیا کتنی عاری رنگ و بو سے ہے
مگر باہر کی دنیا خوش نظر بھی لذت آگیں بھی
مرا دل کہتا ہے باہر کی دنیا سے اٹھاؤں حظ
تقاضا ہے یہ دانش کا کہ رہنار

اظہار یزدانی
B M H DISPENSARY
NAGAUR (RAJ)

ٹائیٹل بیوٹی

(انشاء عید نمبر ۹۶ء کا سرورق دیکھ کر)

یہ ادراک تھا ۔۔۔ عکس تو عکس ہے
ہو قلم کا ہو یا کیمرے کا ہو عکس،
تصور بھی ہے عکس ہی کا مرادف،
اسے زندگی سے بظاہر علاقہ نہیں
مگر جب تصور
تعقل میں تحلیل ہو کر
نکھرتے، سنورتے حقائق سے ہوتا ہے گویا
تو پھر
دھڑکنوں اور خوابوں میں تخصیص رہتی نہیں
اسی اجنبی معرفت نے
مرے دل پہ دی آج دستک!
(سرہانے کئی خوبصورت رسالے رکھے تھے)
انہیں میں سے اک سرورق سے
صباحت کا پیکر
ملاحت سراپا
محبت کا حامل، خیالوں کا حاصل
حسیں، شمسی، گلبدن، ماہ رو عکس بیدار ہو کر
نگاہوں میں دیپک جلا کر، لبوں پر پہیلی سجا کر
مرے کان کے پاس، سرگوشیوں کی زباں میں
یہ معصوم خواہش
عیاں کر رہا ہے
مرے نام اک نظم منسوب کر دے
قلم تھام کاغذ کو محجوب کر دے!

جاناں جاناں فائیو سٹار
(سید احمد فراز کی نذر)

بخش لائل پوری
(لندن)

بگڑی ہوئی قسمت کو بنانے کے لئے آ
افسردہ چراغوں کو جلانے کے لئے آ

میں کوچۂ افرنگ میں بے ہوش پڑا ہوں
مجھ خواب گرفتہ کو اٹھانے کے لئے آ

راتوں کو ڈراتے ہیں مجھے "پانچ ستارے"
ان پانچ ستاروں کو ڈرانے کے لئے آ

نادم ہیں، پشیماں ہیں، بڑے قاسمی صاحب
اس داغِ ندامت کو دھلانے کے لئے آ

ہوٹل کی طلب مجھ کو ستاتی ہے شب و روز
ہوٹل کا کبھی کاگ اڑانے کے لئے آ

دو دن ہی تو ہوٹل میں گزارے ہیں زیادہ
اس خفتِ دوروزہ کو مٹانے کے لئے آ

آتی ہے ملاقات محبت کے لئے تو
ہوٹل کا کبھی بل بھی چکانے کے لئے آ

کس کس کو دکھائیں گے ہم اس بل کی عبارت
اس بل کی عبارت کو چھپانے کے لئے آ

ناکردہ گناہوں کی سزا کاٹ رہا ہوں
یہ بات عدالت کو بتانے کے لئے آ

اس شعر بیانی میں گئی عزتِ سادات
مت اور یہاں شعر سنانے کے لئے آ

پولیس مرے پیچھے ہے تو تھانہ مرے آگے
اے جان! مری جان، چھڑانے کے لئے آ

اپریل ۱۹۹۶ء "فاصلے اینٹرٹینمنٹ" لندن نے کوئین الزبتھ ہال میں "عالمی مشاعرہ" کا اہتمام کیا۔ پاکستان سے دس شاعروں کو بحوالہ "راوی" ان کے حقوق و حدود سے آگاہ کر دیا گیا۔ افتخار عارف، ضمیر جعفری اور شہرت بخاری پہلے سے اپنے ٹھکانوں پر پہنچ گئے۔ سات شاعروں کو انتظامیہ نے "فائیو سٹار" ہوٹل میں ٹھہرایا۔ چار شعراء اپنے حقوق و حدود میں رہتے ہوئے مقررہ وقت پر ہوٹل سے چلے گئے۔ تین شعراء احمد فراز، احمد ندیم قاسمی اور ثروت محی الدین ہوٹل میں براجمان رہے۔ "راوی" بریڈ فورڈ، نے اس واقعہ کو لکھا ہے۔ انہوں نے شاید خیال کیا کہ کسی پاکستانی ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہیں، جب چاہیں گے نکل جائیں گے۔۔۔ احمد فراز پٹھان شاعر ہیں، ڈھلتی عمر میں خود کو ٹین ایجر سمجھتے ہیں۔ پاکستان میں افسری بھی کی ہوئی ہے، انگوروں کے رس کے بھی شوقین ہیں (یہ سب Benefits ہوٹل میں "گوری نازنینوں کے علاوہ حاصل رہے)۔۔ چنانچہ جب وہ ہوٹل کے کاؤنٹر سے کھسکنے لگے تو ہوٹل کی انتظامیہ نے زائد قیام کرنے کے لئے ۶۴۰ پونڈ طلب کیے۔۔ ان کے ہاتھوں سے کبوتروں کی بجائے طوطے اڑ گئے۔"

انجام کار، پاکستان ہائی کمیشن کے افسر اعلیٰ نے یہ رقم قومی زکوٰۃ فنڈ سے ادا کر کے ان معزز شعراء کی ہوٹل کی سکیورٹی پولیس سے گلو خلاصی کرائی۔ جنگ لندن نے بھی پاکستانی شاعروں کی اس بے راہ روی کو شائع کیا۔۔ لندن میں مقیم شاعروں کو اپنے طور پر شرمندگی ہوئی۔۔ اس پر ہمارے مقبول شاعر بخش لائلپوری نے شاعر احمد فراز کی زمین میں ہی برجستہ طور پر شعروں میں اس کہانی کو اپنے مخصوص انداز میں بیان کیا۔۔ ہم امید کرتے ہیں کہ پاکستان سے باہر آنے والے شاعر ادیب آئندہ محتاط رہیں گے اور اپنے چار روزہ عیش و آرام سے ملک کا نام بدنام نہیں کریں گے۔

—ادارہ تعمیر ادب۔ لندن۔ مئی ۱۹۹۶ء

محبوبہ بنام بیوی

خورشید ملک
تارین ٹکلی، شاہجہانپور (یو-پی)

مکرمی ف س اگار صاحب
تسلیم

ال ظائمر (AL AHEIMER) کا مرض بیحد درجہ مہلک ہے - اس کا مریض رفتہ رفتہ اپنی یادداشت کھوتا جاتا ہے اور اس کے احساسات بھی یکے بعد دیگرے جواب دیتے جاتے ہیں - آخر کار صرف چند برسوں میں ہی موت کی بانہیں اسے سمیٹ لیتی ہیں - اگر مریض دس بارہ سال تک زندہ رہ جاتا ہے تو اس میں اس کے تیماردار کا بہت زیادہ دخل ہوتا ہے - عام طور پر یہ مرض پچاس سال کے اس پاس کی عمر والوں کو اپنا نشانہ بناتا ہے - ال ظائمر نام کے ایک ڈاکٹر نے اسے دریافت کیا تھا - اسے ایک خاتون پر کسی نئے اور انوکھے مرض کا شبہ ہوا تھا - اس کے انتقال کے بعد ڈاکٹر نے اس کا دماغ کھول کر دیکھا تھا - اسے دماغ کی تمام نسیں سوکھے ہوئے کھوے کی طرح نظر آئی تھیں - ابھی تک اس مرض کی وجہ اور اس کا علاج دریافت نہیں ہو سکا ہے - گزشتہ سدرہ میں برسوں سے یہ مرض بہت تیزی سے پھیل رہا ہے - صرف امریکہ میں ایک لاکھ موتیں ہر سال اسی مرض سے ہوتی ہیں حالانکہ اس مرض پر سالانہ سو بلین (BILLION) ڈالر خرچ کیے جاتے ہیں - ہندوستان میں بھی یہ مرض پایا جاتا ہے - ابتدائی دور میں اس مرض کی تشخیص نہیں ہو پاتی ہے اور جب پتا چلتا ہے تو اس وقت تک مریض موت کے دہانے تک پہنچ چکا ہوتا ہے -
اس افسانے میں اس مرض کی وجہ تک پہنچنے کی کوشش ہے -
امید ہے بعافیت ہوں گے -

خیراندیش
خورشید ملک
۲۰/ مئی ۹۶

یوں تو وہ دس بارہ برسوں سے بیمار چل رہا تھا مگر گزشتہ چند مہینوں سے اس کی حالت بہت خراب تھی ۔ اس وقت شبنم اس کے میلے کچیلے کپڑے دھو رہی تھی ۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کاش وہ شبنم سے شکریے کے چند الفاظ کہہ سکتا یا کم از کم ایک تشکر آمیز مسکراہٹ ہی اس کی طرف اچھال سکتا مگر وہ بالکل ہی مجبور تھا اسی لئے اپنی ان دونوں خواہشوں میں سے ایک کی بھی تکمیل نہ کر پانے کے سبب اس کی آنکھوں میں بے پناہ حسرت ود کر آئی تھی اور وہ ابھی حسرت زدہ نظروں سے شبنم کی طرف دیکھے جا رہا تھا جو بدستور بڑے انہماک سے اپنے کام میں مصروف تھی ۔
وہ انگریزی ادبیات کا مامور پروفیسر رہ چکا تھا ۔ اسے بین الاقوامی شہرت حاصل تھی ۔ وہ دنیا کی کئی مشہور یونیورسٹیوں میں وزیٹنگ پروفیسر

کی حیثیت سے پڑھا چکا تھا اور کانفرنسوں میں شرکت کرنے کی غرض سے ملک سے باہر جاتا رہتا تھا۔ وہ اپنے وقت کا بیڈ منٹن، شطرنج اور برج کا نامور کھلاڑی تھا جس کے ثبوت میں کئی تمغے، ٹرافی اور شیلڈز آج بھی اس کے ڈرائینگ میں موجود تھے۔

اوروں کی طرح اس کے اندر بھی رومانی عناصر تھے مگر ادبیات سے وابستگی ہونے کی بنا پر یہ عناصر کچھ زیادہ ہی اس کے اندر دخول کر گئے تھے۔ اس کی وجیہ اور جاذب شخصیت نے ان عناصر کو شائستگی عطا کر دی تھی۔ مگر اس نے اپنے رومانی مزاج کو صرف صنف نازک تک ہی محدود نہیں کیا تھا بلکہ اس نے ان تمام چیزوں کو سراہا جنہوں نے اسے متاثر کیا مثلاً قدرت کے دلفریب مناظر، تاج محل، امپائر اسٹیٹ بلڈنگ، کناٹ پیلس، ایفل ٹاور، کھجراہو کی مورتیاں، پیسا کا مینار، حضرت گنج، چوپاٹی، گومتی کی سبک خرامی، مونالیزا کی پراسرار مسکراہٹ وغیرہ۔ اس کی شئے لطیف تو خوبصورت، بے ہنگم اور مکروہ اشیاء میں بھی حسن اور دیگر پوشیدہ اوصاف کے جواز تلاش کر لیا کرتی تھی۔ مثلاً اس کے مکان سے سو قدم دور گلی کے موڑ پر رہنے والی دیو جسم والی جوان دھوبن کو دیکھ کر وہ سوچتا تھا کہ اگر کسی طرح سے میڈیکل سائنس اسے دو برابر جسموں میں منقسم کر دے تو یقیناً دونوں جسم خوبصورت اور پرکشش ہوں گے۔ اسی طرح یونیورسٹی گیٹ کے باہر سڑک کے کنارے پڑے ہوئے نحیف ناتواں اور ضعیف فقیر کو دیکھ کر وہ سوچتا تھا کہ بہت ممکن ہے، وہ کبھی ایک ایسے شاندار جسم کا مالک رہا ہو جسے دیکھ کر لوگ عش عش کرتے ہوں اور لڑکیاں اس کے ساتھ اپنے خوابوں کو سجانے میں فخر محسوس کرتی ہوں۔ اگر وہ قسمت کی ستم ظریفی کا مسلسل طور پر شکار نہ ہوا ہوتا تو شاید اس وقت وہ اپنے ایر کنڈیشنڈ ڈرائینگ روم میں احباب کے ساتھ امپورٹیڈ شراب پی رہا ہوتا۔

ان گنت لڑکیوں سے دوستی کرنے کے بعد اس نے چند ایسی لڑکیوں سے تعلقات ضرورت سے کچھ زیادہ ہی بڑھا لئے تھے تاکہ ان میں سے کسی ایک کے ساتھ اپنی زندگی ہم عنوان بنا ڈالے مگر اسے ایک بھی اس کے اہل نظر نہیں آئی تھی۔ بعد میں وہ محبوبہ کو بیوی بنا لینے کے ہی خلاف ہو گیا تھا۔ اس نے دوسروں کی زندگیوں کا مطالعہ کرنے کے بعد نتیجہ اخذ کیا تھا کہ محبوبہ بیوی بن جانے کے بعد اپنے پرانے منصب پر فائز رہنے کی کوشش کرتی ہے، اسی لئے وہ بحیثیت بیوی بہت زیادہ کامیاب نہیں ہوتی ہے لہذا محبوبہ کو محض دلبستگی کا ذریعہ ہی سمجھنا چاہیے بس۔ اس کے خیال کے مطابق بیوی ایسی ہونی چاہیے جو مشترکہ زندگی کی ہر خوشی اور غم میں برابر کی شریک ہو۔ بچوں کے لئے مثالی ماں ہو اور شوہر کی موجودگی اور غیر موجودگی، دونوں میں گھر کے انتظامی امور میں اپنی برتری قائم رکھے۔ البتہ اگر بیوی کو محبوبہ کا درجہ بھی دے دیا جائے تو پھر ازدواجی زندگی میں چار چاند لگنے میں کوئی کسر باقی نہیں رہ سکتی۔ اپنے اس خیال کو اس نے خود اپنے اوپر تجربہ کر کے ثابت بھی کر دیا تھا۔ شادی سے پہلے اس نے شمیم کی شکل تک نہیں دیکھی تھی، شادی کے بعد اس نے اسے محبوبہ بھی بنا لیا تھا۔ چنانچہ شادی کے پچیس تیس برس گزر جانے جانے کے بعد بھی وہ دونوں ایسی ایسی چوہلے بازیاں کرتے تھے کہ نئے جوڑے تک انہیں دیکھ کر بری طرح شرما جاتے تھے۔

دراصل وہ شروع سے ہی ہر بات کی گہرائی تک سوچا کرتا تھا اور پھر خود سے سوالات بھی کیا کرتا تھا مثلاً اپنے بچپنے میں وہ سوچا کرتا تھا کہ والدین اپنی اولادوں میں صرف ایک یا دو کو ہی کیوں زیادہ چاہتے ہیں، سب کو برابر کا پیار کیوں نہیں دے پاتے ہیں؟ ساڑی پر بلاؤز ہی کیوں پہنا جاتا ہے؟ اگر ساڑی کا آنچل کاٹ کر اسے بطور دوپٹہ استعمال کیا جائے تو پھر بلاؤز کی جگہ پر قمیص یا جمپر کیوں نہیں؟ کرتے پائجامے پر فلٹ ہیٹ اور نکٹائی استعمال کرنے سے نہ صرف نیا فیشن جنم لے گا بلکہ مشترکہ تہذیبوں کا نمونہ بھی نظر آئے گا وغیرہ۔ جوانی کی دہلیز پر قدم رکھنے کے بعد اس کی اس عادت میں اضافہ ہوتا گیا تھا اور پھر زندگی کی پگڈنڈی پر سفر کرتے کرتے اس کی سوچ کا کینوس بھی وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا تھا مثلاً انگریزی ادبیات کے مطالعے کے دوران اس نے سوچا تھا کہ ملٹن (MILTON) کو آفاقیت تو اندھا ہو جانے کے بعد کی تخلیقات پیراڈائز لوسٹ (PARADISE LOST) اور پیراڈائز ری گینڈ (PARADISE REGAINED) سے ہی حاصل ہو گئی تھی تو پھر اس نے اندھا ہونے کے فوراً بعد خدا سے شکوہ کرنے کی سعی میں کہی گئی اپنی مختصر نظم آن ہز بلائینڈنس (ON HIS BLINDNESS) کی تشہیر کیوں کی تھی، کیا آنے والی نسلوں سے اپنے ساتھ ہمدردیاں جتانے کے لئے؟ اسے شیریں فرہاد، لیلیٰ مجنوں، سلیم انارکلی وغیرہ کے قصے بھی تضیع اوقات محسوس ہوتے تھے کیونکہ وہ کہتا تھا کہ ان کی

بد قسمتی کی وجہ سے ان کا ملن ممکن نہیں ہو سکا تھا، ورنہ آج انہیں کوئی جانتا بھی نہیں۔ مگر اس کا بد قسمتی کا رونا ہم کیوں روئیں؟ اکثر وہ یہ بھی سوچا کرتا تھا کہ اس نے کسی دوسرے مضمون میں مہارت کیوں نہیں حاصل کی، انگریزی میں ہی کون سے سرخاب کے پر لگے ہوئے تھے؟ اور یہ کہ وہ پروفیسر ہی کیوں بنا، انجینئر یا ڈاکٹر کیوں نہیں؟

اسی طرح وہ سوچا کرتا تھا کہ بیڈ منٹن کا گیم بالعموم مردوں کے لئے 15 پر اور عورتوں کے لئے 11 پر ہی کیوں ختم ہوتا ہے، کم یا زیادہ کیوں نہیں؟ اس کے کورٹ میں خانوں کی تعداد گھٹائی یا بڑھائی کیوں نہیں جا سکتی؟ شطرنج کے مہروں کے ہندوستانی اور انگریزی ناموں میں مماثلت کیوں نہیں ہے؟ بادشاہ کو اتنا کاہل کیوں رکھا گیا ہے کہ وہ ایک خانے سے زیادہ نہیں ہل سکتا ہے جب کہ وزیر پوری بساط پر ناچا پھرتا ہے؟ کیا ان دونوں کی حیثیت کسی جمہوری ملک کے صدر اور وزیر اعظم کے مساوی ہے؟ اس طرح تاش کے پتوں کے انگریزی اور ہندوستانی ناموں میں کوئی مناسبت کیوں نہیں ہے؟ اسپیڈ (SPADE) یعنی بیلچہ مگر اس کو سب سے زیادہ اہمیت کیوں؟ ہندوستانی میں یہ حکم کس طرح ہو گیا؟ ہارٹ (HEART) پان کیونکر ہو گیا؟ دل کیوں نہیں؟ ڈائمنڈ (DIAMOND) کو کس احمق نے اینٹ کا نام دے دیا؟

غرضیکہ اسی طرح کے تک والے اور بے تکے سوالات سے اس کا دماغ ہر وقت بوجھل رہا کرتا تھا لیکن اس نے کبھی بھی ان کے جواب کسی سے نہیں پوچھے تھے کیونکہ اسے یقین تھا کہ کوئی بھی جواب نہیں دے سکے گا بلکہ الٹا اسی کو خبطی، سنکی یا نیم پاگل سمجھ لیا جائے گا۔ ہر بات کو سوچ سوچ کر سوالات پیدا کرنے کا اس کا انداز لاکھ منطقی اور فلسفیانہ سہی مگر کبھی کبھی وہ خود اسے اپنی قنوطیت سمجھ لیا کرتا تھا۔

بہر حال سوالات کا لاوا اس کے دماغ کے اندر ہی پکتا رہتا تھا اور اس کا یہ نتیجہ ہوا تھا کہ اس کے رویوں میں تبدیلیاں آنا شروع ہو گئی تھیں اور ساتھ ہی اس کی یادداشت بھی کم ہونے لگی تھی مگر چونکہ ابتدا میں تبدیلیاں اور یادداشت کی گم شدگی دھیمی رفتار سے ہوئی تھی، اس لئے کسی نے نوٹس بھی نہیں لیا تھا حتیٰ کہ شبنم بھی محسوس نہیں کر سکی تھی مگر جوں ہی اس نے عمر کی نصف صدی پار کی، اس کے رویوں میں تبدیلیاں اور یادداشت میں کمی نے برق رفتاری اختیار کر لی تھی۔ پھر تو وہ اپنے گرد و پیش سے بھی بے خبر رہنے لگا تھا مثلاً نوالہ کھاتے وقت اگر وہ کسی خیال کے تانے بانے میں کھو جاتا تھا تو اس نوالے کو منہ تک پہنچنے کی اس وقت تک نوبت نہیں آپاتی تھی جب تک شبنم یا کوئی دوسرا اسے ٹوک نہ دیتا۔ اسی کیفیت میں اگر شبنم اس کے بہت قریب آکر کچھ کہتی تو وہ بونقوں کی طرح اس کی طرف دیکھتا رہتا تھا کیونکہ اسے محسوس ہوتا تھا کہ شبنم بہت دور سے سرگوشی والے لہجے میں کچھ کہہ رہی ہے، اسی لئے وہ اس کا مفہوم بھی نہیں سمجھ پاتا تھا

وہ یونیورسٹی جاتے وقت پرس، رومال، پورٹ فولیو بیگ اور قلم وغیرہ بھولنے لگا تھا۔ اکثر یہ بھی ہوتا تھا کہ وہ بغیر کنگھائی کے اور بغیر جرابیں پہنے خالی جوتے پیر میں ڈال کر نکل جاتا تھا۔ کلاس میں پہنچ کر اسے یاد ہی نہیں آتا تھا کہ اسے کیا پڑھانا ہے۔ طالب علموں کے یاد دلانے پر وہ محسوس کرتا تھا کہ اس موضوع پر وہ چند جملے بھی نہیں بول سکے گا۔ مجبور ہو کر وہ اپنے چیمبر میں آتا تھا اور جلدی جلدی کتابیں اور نوٹس دیکھ کر دوبارہ کلاس میں جا کر خانہ پری کر دیا کرتا تھا۔ طلباء بھی حیران تھے کہ اسے کیا ہو گیا ہے کیونکہ اس کے بارے میں مشہور تھا کہ اسے اپنے مضمون پر جتنی گرفت حاصل تھی، اس ملک میں شاید ہی کسی کو رہی ہو اس کے بعد تو وہ یہ بھی بھولنے لگا تھا کہ وہ کون سا کام کرنے جا رہا تھا۔ جب ذہن پر بہت زور دینے پر بھی اسے یاد نہیں آتا تھا تو وہ جھنجھلا کر ٹہلنے لگتا تھا اور اکثر ٹہلتے ٹہلتے وہ گھر سے باہر بھی نکل جاتا تھا مگر چونکہ تمام راستے بھی اس کے دماغ کے نہاں خانے میں روپوش ہو چکے تھے، لہٰذا وہ ادھر ادھر بھٹکتا رہتا تھا۔ کسی طالب علم، شناسا یا گھر سے اس کی تلاش میں نکلے افراد کی مدد سے ہی وہ واپس آتا تھا۔ اسی سے گھر کے باہری دروازے ہر وقت مقفل رکھے جانے لگے تھے اور صرف ضرورت پڑنے پر ہی کھولے جاتے تھے۔ رفتہ رفتہ اس کی قوت گویائی بھی کم ہوتے ہوتے تقریباً ختم ہی ہو گئی تھی۔ اگر کوئی اس سے بات کرنے کی کوشش بھی کرتا تھا تو وہ اسے بری طرح جھڑک دیتا تھا خواہ وہ کوئی بھی ہوتا۔ مگر اس کی حالت کو دیکھتے ہوئے کوئی برا نہیں مانتا تھا، بس چپ گھور کر رہ جاتے تھے، دوست احباب بر اسامنہ بنا لیتے تھے اور طلباء اور ملازمین تو اس کے سامنے سے کھسک لینے میں ہی اپنی عافیت سمجھتے تھے، البتہ شبنم ضرور بڑے پیار سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھ لیتی تھی "ڈیئر آپ کو کیا ہو تا جا رہا

ہے " اس استفسار پر وہ اسے مزید جھڑکنے کے بجائے اس کے اوپر ایک اچٹتی نظر ڈالنے کے بعد گردن جھکالیا کرتا تھا۔ وہ جواب بھی کیا دیتا" اسے خود بھی نہیں معلوم تھا کہ اسے کیا ہوتا جارہا تھا"

حد تو اس وقت ہوئی تھی جب وہ اپنا نام بھی بھول گیا تھا، جس کی وجہ سے بینک، پوسٹ آفس، انشورنس، انکم ٹیکس وغیرہ کے حساب کتاب میں دقتیں آنے لگی تھیں کیونکہ وہ دستخط نہیں کر سکتا تھا۔ اگر اسے اس کا نام بتایا جاتا تھا تب بھی وہ اپنا نام نہیں لکھ سکتا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ جتنی زبانیں وہ جانتا تھا، ان سب کے حروف تہجی تک اس کے دماغ سے نکل چکے تھے۔ مطلب یہ کہ اسے سب کچھ یاد ہوتے بھی کچھ بھی یاد نہیں رہ گیا تھا مثلاً تاش کو تاش سمجھنے کے باوجود اس کے پتوں کی شناخت نہیں کر سکتا تھا، ایک زمانہ وہ تھا جب اسے برج پر اتھارٹی مانا جاتا تھا مگر اب وہ اس کی الف بے تک بھول چکا تھا، شطرنج کا ایک ماہر کھلاڑی رہ چکے ہونے کے باوجود اب وہ اس کے مہروں کو بساط پر نہیں سجا سکتا تھا۔ اس سے اگر پوچھا جاتا کہ وہ بے شمار کپ تمغے وغیرہ اس نے کس کھیل میں کب اور کہاں جیتے تھے تو وہ بتانے سے قاصر تھا۔ اس کی اسی کیفیت میں ایک بار شبنم اس کو اس کے آبائی وطن لے کر گئی تھی۔ وہاں پہنچ کر وہ اپنا پرانا گھر تو پہچان گیا تھا مگر اسے یہ نہیں یاد آسکا تھا کہ وہ گھر کس شہر میں اور اس کے کس محلے میں تھا۔

بہر حال گزشتہ چند مہینوں سے اس کی قابل رحم حالت ہو کر رہ گئی تھی۔ اگر اسے نوالے بنا کر کھلادیا جاتا تو کھا لیتا تھا مگر از خود سے اشتہا محسوس نہیں ہوتی تھی اور نہ ہی وہ کھانا طلب کرنے کی حالت میں رہ گیا تھا۔ اس کے تمام کام مثلاً کپڑے تبدیل کرنا، حوائج ضروریہ سے فراغت کرنا حتیٰ کہ لیٹنا بیٹھنا تک دوسروں ہی کی مدد سے ممکن ہو سکتے تھے۔ اگر اسے کسی جگہ بیٹھا دیا جاتا تھا تو وہ وہاں اس وقت تک بیٹھا رہتا تھا جب تک اسے اٹھایا نہیں جاتا تھا۔ گویا اس کے اوپر نیوٹن کے حرکت کے پہلے اصول (NEWTON.S FIRST LAW OF MOTION) کا پوری طرح سے اطلاق ہونے لگا تھا۔ ایک جگہ کئی گھنٹے تک بیٹھے رہنے کے باوجود اسے تکان محسوس نہیں ہوتی تھی بھلے ہی اس دوران اسے کئی بار پیشاب ہو جاتا مگر اسے اس کا بھی پتا نہیں چل پاتا تھا۔

یوں تو اس کے بیمار پڑتے ہی شبنم نے اس کی تیمار داری کی پوری ذمہ داری اپنے اوپر لے لی تھی۔ ایک زمانہ وہ بھی تھا جب فرصت کے لمحات اس کے لئے عنقا تھے کیونکہ وہ ادبی اور سماجی حلقوں میں ہر وقت مصروف رہا کرتی تھی مگر اس کی بیماری کی وجہ سے اس نے سب کچھ ترک کر کے اپنے آپ کو اس کی خدمت پر مامور کر لیا تھا۔ ادھر اس کی مصروفیات میں بے پناہ اضافہ ہو گیا تھا۔ یہ اس کی ضد ہی تھی کہ وہ اس کے تمام کام خود کرتی تھی، ملازمین یا کسی دوسرے کو ہاتھ تک نہیں لگانے دیتی تھی۔ وہ اس کے پاس سے صرف اپنی ضروریات کے لئے ہٹتی، یا پھر گھر میں مہمان آجائے یا گھر کے کسی فرد کے سفر پر نکلتے وقت اس کے پاس کسی کو چھوڑ کر جاتی تھی، بس اس کے علاوہ وہ اس کے قریب ہی رہا کرتی تھیں اور اس کی خدمت کرتی رہتی تھی۔

وہ تو ایک طرح سے معذور ہو کر رہ گیا تھا کیونکہ اس کے تمام احساسات جواب دے چکے تھے، بس اگر کوئی احساس باقی رہ گیا تھا تو وہ شبنم کی انتھک تیمار داری کا احساس تھا۔ اس کی طرف حسرت زدہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے اسے خیال آرہا تھا کہ عام طور پر تیمار دار ایک دو مہینے میں ہی اپنے مریض سے اکتا جاتے ہیں اور دل ہی دل میں دعا مانگنا شروع کر دیتے ہیں کہ اے خدا یا تو مریض کو شفاء عطا کر یا پھر اسے قید حیات سے نجات دے۔ مگر بارہ سال کے طویل عرصے تک اس کی تیمار داری کرتے ہوئے شبنم کے چہرے پر کبھی اکتاہٹ نظر نہیں آئی تھی، شاید اسے اب بھی امید تھی وہ صحتیاب ہو جائے گا۔ اس کی نیند پوری نہیں ہو پاتی تھی۔ مگر اس کے باوجود ہر وقت چاق و چوبند نظر آتی تھی حتیٰ کہ اس کے غلیظ کئے ہوئے کپڑوں کو دھوتے وقت ذرا بھی کراہیت محسوس نہیں کرتی تھی۔ گویا مجموعی طور پر وہ اندر سے بالکل ٹوٹ پھوٹ چکی تھی مگر اس کی پیشانی پر شکن تک نظر نہیں آتی تھی۔

وہ سوچ رہا تھا کہ کاش سارے احساسات کی طرح شبنم کی تیمار داری کا احساس بھی اس کے اندر سے ختم ہو جاتا مگر شاید یہ احساس اس کی سانسوں کی لڑی ٹوٹنے سے پہلے ختم نہیں ہو سکے گا۔ اب اس کے اندر مزید سکت نہیں رہ گئی تھی کہ وہ شبنم کو اپنی تیمار داری پر مامور دیکھے، لہٰذا صدق دل سے دعا مانگنے لگا تھا کہ اسے حیات کی گردش سے جلد از جلد چھٹکارا حاصل ہو جائے تاکہ شبنم کو اس کی طویل تیمار داری سے فرصت حاصل

بقیہ ۲۴ پر

آصف اظہار علی
3/12. United Colony
Diggi Road
Near Amir Nishan Aligarh

نظم

کانچ کی گڑیا

[redacted]

میں اکثر یہی سوچتی ہوں
کہ خود کو مٹا کر
سکھوں کو بھلا کر
نہ کچھ میں نے پایا
جہاں جس نے چاہا مرا دل ہی توڑا
خوشی نے کبھی مجھ سے رشتہ نہ جوڑا
میں اکثر یہی سوچتی ہوں
مری حیثیت کیا ہے میرے مکاں میں
کہ جیسے یہ کمرہ
کہ جیسے یہ صوفہ
کہ جیسے یہ ٹی ۔ وی
کہ جیسے یہ گاڑی
کہ جیسے ہر اک قیمتی شئے یہی ہے
میں ویسے ہی شیشے کی گڑیا سی گھر میں بجی ہوں
میں ہر روز اندر ہی اندر
ان اپنوں کے ہاتھوں بہت ٹوٹتی ہوں
مرا کانچ میرے ہی اندر بکھر کر
میرے ریشے ریشے میں پیوست ہو کر
بہت چبھ رہا ہے
میں بس اک سراپا کسک بن گئی ہوں

تکمیل

ساڑیاں لینے بازار نکلی تھی میں
ہر طرف جگمگاتی دکانوں کے شو کیسوں میں
سج رہی تھیں وہاں
ست رنگی ساڑیاں
ساڑیاں
جھلملاتے ستاروں کی جگ مگ لئے
ساڑیاں گنگناتی بہاروں کی سج دھج لئے
ریشمی، اطلسی، سلک کی ساڑیاں
بے شمار آنکھیں ان پر پھسلتی ہوئی
کچھ خواتین تھیں آہیں بھرتی ہوئی
کچھ مچلتی ہوئی کچھ سنبھلتی ہوئی
بھیڑ چاروں طرف سے ابلتی ہوئی
سوچتی رہ گئی کیا کروں
کیوں نہ واپس چلوں،
سامنے ہی دکانیں کتابوں کی آئیں نظر
میں جو پہنچی ادھر
جا کے گم ہو گئی
ان کتابوں کی دنیا میں یوں کھو گئی
گھر جو لوٹی تو حیران خود ہو گئی
آج لوٹی ہوں میں
بیش قیمت خزانہ دبائے ہوئے
ساڑیوں کی جگہ
چند اچھی کتابوں کے پیکٹ اٹھائے ہوئے

احسن عزیز
6, MILNER CLOSE
Templestone
Victoria 3706
AUSTRALIA



غزل

صورت سے آشنا ، نہ نگاہوں سے آشنا
پھر بھی لگا کہ جیسے ہے برسوں سے آشنا

ہم اجتناب گل بدناں دیکھتے رہے
ہم بھی کبھی رہے تھے بہاروں سے آشنا

محرومی، وفا کا گلہ کیسے کیجئے
ہوکر کرم نواز جفاؤں سے آشنا

آشفتگی نے دل کے پرخچے اڑا دیئے
ہونے لگے ہیں ان دنوں زخموں سے آشنا

بے تابی، حیات ہی احسن کو یاد ہے
اک موج ہوسکی نہ کناروں سے آشنا

مد مام لبشر
نگاں پاڑا، وارڈ ۷، پاکور تریف بہار

جھجک

میرے شاعر سنو !
درد، دکھ، میرا غم آسمانی نہیں ،
ت کی سوغات ہے ،
ن وائی کا طرہ صلہ
یلہ لو کیا ملا !
ے سایہ مرا چھن گیا
ن بے حاماں ، بے نوا ، بے حیا
، در ، کوبہ کو بے محل
ڈھونڈتی ہوں کوئی آستاں !
ے شاعر - میرا کرب و غم بانٹ لے
ے آنسو تو ہی پونچھ دے !"
ات سر دار کی ،
ں وہ گھبرا گیا
اس چھڑا رہ گیا
سیں دیکھ نہ لیں مجھے ،
ے کے وہ وحشی صدا !!
ماہنامہ انشاء کلکتہ

ڈاکٹر سیفی سیرونجی
Saifi Library, SIRONJ (MP)

غزل

سب نے کیا سلام جدھر بھی نظر گئی
تیری یہ دشمنی تو بڑا کام کر گئی

سوچا تھا گھر گیا تو خوشی لیکے جاؤں گا
رستے کی دھول صرف مرے ساتھ گھر گئی

آنکھوں میں خواب سینکڑوں لے کر پھرا کئے
یہ زندگی ہماری سڑک پر گزر گئی

پتھر ہیں اور کانٹے میرے گھر کے آس پاس
تری گلی تو آج بھی پھولوں سے بھر گئی

اس کی چمک دمک کو تو خطرہ نہ تھا مگر
دنیا یہ کس لئے مری شہرت سے ڈر گئی

سیفی کہا نہیں تھا ابھی اس نے الوداع
دیوار و در پہ پھر بھی اداسی بکھر گئی

ڈاکٹر مبارک انصاری
Tiprapur Gorakhpur - 273001

غزل

پھر تیغ آب دار کا منظر ہوا طلوع
اک مہرتاب جسم کے اندر ہوا طلوع

پھر سر ابھارنے لگا اک خوف گم شدہ
لایعنیت کی سمت سے لشکر ہوا طلوع

سورج کا قہر روئے زمیں پر بکھر گیا
آنکھوں میں ریگ زار کا منظر ہوا طلوع

کس کی شکست کون یہاں فتح مند تھا
نوک سناں پہ کس کا بتا سر ہوا طلوع

اک لمحے میں زمانے کو سیراب کر گیا
جب ایڑیوں سے اس کی سمندر ہوا طلوع

لیکن جواب اس کا **مبارک** ملا نہیں
میں کون ہوں سوال یہ اکثر ہوا طلوع

آئندہ نسل کے لئے کثافت سے پاک دنیا تعمیر کیجے

ان دنوں مختلف قسم کی کثافتوں نے ہمارے لئے پیچیدہ مسئلہ کھڑا کر دیا ہے۔ لیکن یہ صورت حال ایک دن میں تیار نہیں ہوئی ہے۔ جدید زندگی کی بتدریج بڑھتی ہوئی ضروریات کو پورا کرنے کی خاطر آدمی فطری نظام سے صرف نظر کرتے ہوئے قدرت کے عمل میں مداخلت کرنے لگا ہے۔ زمین، پانی، جنگل، معدنی وسائل کی بربادی کا خیال نہ کرتے ہوئے اس نے انہیں اپنی ترقی پذیر زندگی کے لئے بے دریغ استعمال کرنا شروع کر دیا ہے۔ نتیجہ یہ کہ آج اس فضا میں ہمارا وجود خطرے میں ہے۔

بے شمار اجاڑے گئے درخت اور کارخانوں سے نکال کر پھینکا گیا کوڑا دریا کے بہاؤ کو روکتا ہے۔ زہر آلود گیس اور دھویں اور مال بردار گاڑیوں اور کل کارخانوں سے آوازوں کے اخراج نے ہمیں آلودگی کا مریض بنا دیا ہے۔

لیکن کیا ہم اس خطرے کے امکان سے واقف ہیں؟ اگر یہ صورت حال برقرار رہی تو عنقریب جنگل اس دنیا سے روپوش ہو جائیں گے۔ دنیا سوکھے اور سیلاب کے عذاب میں مبتلا ہو جائے گی۔ انواع و اقسام کے جانور اور پودے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائیں گے۔ ہمارے اس خوبصورت سیارے کی ہوا سانس لینے کے لائق نہیں رہ جائے گی اور یہ سب ہماری غیر دانشمندانہ چمک دمک کی ہوس اور فطری وسائل کے بڑھتے ہوئے استحصال کا نتیجہ ہے۔

ہم ترقی کا کام کرتے رہیں گے۔ لیکن یہ فطری توازن کو برباد کئے بغیر ہونا چاہئے۔ اس خطرے سے ہم بچ سکتے ہیں بشرطیکہ ضوابط اور جدید ٹیکنالوجی کا صحیح استعمال کیا جائے۔

ہم تمام کو فطرت کے تحفظ میں مصروف ہو جانا چاہئے اور کثافت سے پاک دنیا کے لئے ایک طویل جدوجہد کے لئے تیار ہو جانا چاہئے۔

حکومت مغربی بنگال

(Govenment of West Bengal)

منجمد خون

قمر جہاں
پروفیسر، شعبۂ اردو
سندروتی مہیلا کالج، بھاگلپور

لمبے سفر کے بعد سیڑھیاں چڑھتے ہوئے وہ دونوں میاں بیوی بے حد تکان محسوس کر رہے تھے۔ وقت زیادہ تو نہیں گزرا تھا لیکن جاڑے کی شام ذرا جلد ہی اندھیرے کے خول میں گھس جاتی ہے۔ ابھی تو سات ہی بجے تھے اور چہار طرف سکوت اور تاریکی کی چادر سی تن گئی تھی۔ اوپر کی منزل میں پہنچ کر عورت نے اپنے کندھے میں جھولتے ہوئے پرس سے بند مکان کی چابی ڈھونڈ نکالی اور اسے دروازے میں لگے قفل میں ڈالتے ہوئے اچانک چونک کر مرد کو مخاطب کیا، جو اپنے دونوں ہاتھوں میں اٹیچی، جھولے وغیرہ تھامے ہوا تھا۔

"دیکھتے ہو جی ایہ تالہ ہمارا لگایا ہوا نہیں؟" اس کی پیشانی پر تشویش کی سینکڑوں لکیریں نمودار ہو گئیں۔

"ایں یہ کیا" مرد نے تالے کا بغور معائنہ کرتے ہوئے کہا "واقعی ایہ کیا معاملہ ہے" وہ فوراً نیچے کی منزل میں جاکر اپنے کرایہ دار سے اس معاملہ کی تفتیش کرتا ہے لیکن وہ بھی کچھ بتانے سے قاصر رہ جاتا ہے اور ناخوشگوار لہجہ میں بولتا ہے۔ "بھائی صاحب اس قدر ٹھنڈ میں بھلا کس کی ہمت اوپر جانے کی ہوتی اور پھر آپ تو کیر ٹیکر (Care Taker) کو ٹھیک کر گئے تھے نا۔ وہ تو آتا ہی ہوگا؟" الٹا اسی سے سوال کر رہا تھا۔ اس نے جھنجھلاتے ہوئے کہا۔ "جی ہاں آتا تو ہوگا ضرور آتا ہوگا مگر آج جب کہ اسے ہمارا پروگرام معلوم تھا یہاں موجود ہونا چاہیے تھا تالہ بھی بدل دیا ہے۔ احمق بیوقوف جاہل اس کٹکٹاتی سردی میں ہمیں" وہ آپ ہی آپ بڑبڑا رہا تھا۔ ذرا دیر میں اندر سے اس کی بیوی نے ہنستے ہوئے جواب دیا "بھیا جی اتنا تو گرم نہ ہوئیے کہ ٹھنڈا موسم بھی گرم ہو جائے آخر کو کیر ٹیکر بھی تو آدمی ہے نا بیمار پڑ گیا ہوگا

"ہس جی اگر میں کیا کروں کچھ ہمارے لیے بھی تو سوچئے" اس کی آواز انتہائی ترشی ہو رہی تھی۔

"اب سوچنا کیا ہے بابا۔ تالہ توڑ کر اندر داخل ہو جائیے آخر گھر تو آپ کا ہی ہے نا۔"

"ہاں اور کر بھی کیا سکتا ہوں۔ اس ٹھنڈ میں اسے ڈھونڈنے یا انتظار کرنے سے تو رہا ایک تالہ ہی تو برباد ہوگا" یہ سوچ کر اس نے انہیں لوگوں سے ایک ہتھوڑا طلب کیا اور لے کر فوراً اوپر چلا آیا۔ بیوی کے قریب پہنچ کر اس نے آہستہ سے کہا۔ "عجب بور آدمی ہے یہ ہمارا کرایے دار بھی ذرا بھی تہذیب نہیں اس میں" کرایے دار کی شکایت کرتے ہوئے وہ تالے پر ہتھوڑے برسانے لگا۔ دو تین ضرب کے بعد تالہ ٹوٹ کر فرش پر گر چکا تھا، اس نے جھٹکے کے ساتھ بند دروازے کو دھکا دیا جیسے ہی دروازہ کھلا سرد ہوا کے جھونکے کے ساتھ ایک عجیب طرح کی بدبو کا احساس ان کے نتھنوں کو ہوا۔ دونوں نے اپنی ناک پر ہاتھ دھر لیے۔ "یہ کیسی بدبو ہے؟"

اس لمحہ دونوں کے ذہن میں صرف سوال ہی سوال تھے، جواب کوئی نہ تھا۔ روشنی جلاکر ادھر ادھر معائنہ کرتے ہوئے وہ دونوں اپنی خوابگاہ میں داخل ہوئے۔ وہاں پر جاکر انہیں ابکائی سی آنے لگی۔ منہ پر ہاتھ رکھے ہوئے انہوں نے وہاں پر جو کچھ دیکھا وہ خوف و دہشت سے سہم اٹھے۔ ایک

لاش جو سارے بدن سے پھول کر بدہئیت ہو چکی تھی، ان کے بستر پر لحاف کے اندر موجود تھی، لاش کے اطراف میں جمے ہوئے خون کے دھبے تھے لحاف ہٹاتے ہی پورا مکان سڑی ہوئی لاش کی سڑاند سے ناقابل برداشت ہو رہا تھا۔ لاش کی شناخت کرتے ہی۔ "اوئی اللہ ! یہ کیا" عورت چیخ مار کر مرد سے چمٹ گئی تھی "یہ تو یہ تو ہمارا کیرٹیکر ہے۔" اس کی آواز خوف و دہشت سے اندر ہی اندر گھٹ رہی تھی۔ کچھ لمحوں کے بعد انہوں نے سوچنا شروع کیا۔ آخر اسے قتل کس نے کیا۔ کیوں ہوا یہ سب کب ہوا کیسے ہوا اور اب کیا کیا جائے "آن واحد میں سوالات کا ایک سلسلہ سا بنتا گیا جو اس وقت ان دونوں کے ذہن میں اس طرح چکر کاٹ رہے تھے جیسے کسی ویرانے میں چمگادڑیں پھڑپھڑا رہی ہوں

عورت دہشت کے مارے بیڈروم سے باہر نکل آئی تھی لاش کی پھٹی پھٹی آنکھیں دیکھ کر اسے ایسا لگ رہا تھا کہ اچانک مردہ زندہ ہو جائے گا اور اپنے خون کا بدلہ ان سے لے گا۔ مرد ٹیوب لائٹ کی تیز روشنی میں غور سے کمرے میں رکھی ہر چیز کا معائنہ کر رہا تھا۔ لاش کے قریب ہی کئی عدد ٹوٹے ہوئے بلیڈ پڑے ہوئے تھے جو اس بات کی گواہی دے رہے تھے کہ قتل انہی بلیڈوں کے ذریعہ کیا گیا ہے۔ بلیڈ پر ابھی تک خون کے دھبے موجود تھے۔ گردن اور ہاتھ کی رگیں کٹی ہوئی تھیں۔ "اف رے بے رحمی کس قدر اذیت کے ساتھ اس کی موت ہوئی ہوگی۔ سخت تعجب ہے کہ اطراف میں کسی کو کچھ خبر بھی نہیں ہو سکی۔ اس پتھریگ میں واقعی ہم سب پتھر کے ہو گئے ہیں۔ وہ مسلسل سوچ رہے تھے کم از کم مرتے وقت اس کی چیخ تو کسی نے سنی ہوگی مگر نیچے والا بھی تو کچھ نہیں بتا سکا یا بتانا نہیں چاہتا تھا" اس کے ذہن میں ایک شک سر اٹھانے لگا تھا۔ آواز دے کر اس نے اپنے کرایے دار کو بھی اوپر بلا لیا تھا۔ وہ لوگ بھی مبہوت سے ایک ٹک لاش کو دیکھ رہے تھے۔ ذرا ہی دیر میں اس کا چھوٹا سا فلیٹ آدمیوں سے کھچا کھچ بھر گیا تھا لیکن ہر کوئی اس حادثہ کے سلسلہ میں صریحاً اپنی لاعلمی کا اظہار کر رہا تھا۔ کسی قسم کی گواہی دینے سے صاف انکار۔ پتہ نہیں یہ ان کی اداکاری تھی یا سچ۔ اس نے اپنے دل میں سوچا۔ "عجیب ڈرپوک ہیں آج کے لوگ بھی ہر شخص محض اپنے لیے جیسا جاتا ہے۔ جبھی تو یہ ایسا ہے ہو رہے ہیں اس دنیا میں

دیر تک سب گھر کے کونے کونے کا معائنہ کرتے رہے۔ ہر چیز اپنی جگہ صحیح سالم تھی، حتیٰ کہ بیڈ کے نزدیک تپائی پر رکھا ہوا ٹیپ ریکارڈر اور اسی قسم کی دیگر قیمتی چیزیں بھی جوں کی توں دھری ہوئی تھیں جو اس امر کی گواہی دے رہی تھیں کہ یہاں پر چوری کی نیت سے کوئی نہیں آیا تھا۔ آنے والے کا مقصد صرف اس کا قتل تھا جو وہ صفائی کے ساتھ کر چکا ہے اور کسی کو پتہ تک نہیں چلا، اب صرف قیاس آرائیاں ہو رہی تھیں کہ آنے والے نے چائے کے ساتھ نشہ آور دوا ملا کر پہلے تو اسے بیہوش کیا ہوگا پھر بلیڈ کے سہارے اس کی گردن اور ہاتھ کی اہم رگوں کو کاٹا ہوگا جس سے اس کی موت واقع ہوئی ہوگی۔ مقتول کے سر پر بھی اچھی خاصی چوٹ تھی مانو کسی وزنی شئے سے اس کے سر کو کچل دیا ہو گیا۔

کچھ ہی دیر بعد پولیس میں رپورٹ درج کی گئی تو وہاں پر فوراً پولیس تعینات ہو گئی اور شک کی بنیاد پر کچھ لوگوں کو حراست میں لے لیا گیا مگر اس کی موت کا راز ایک ناقابل فہم معمہ سا رہا۔ "اتنے دنوں تک آخر اس کے گھر والوں نے کوئی خیر خبر کیوں نہ لی؟" ایک موت کئی راز ہائے سربستہ پر سے پردہ ہٹانے کی کوشش کر رہی تھی، جیسا کہ عام طور پر ایسے حادثوں میں ہوا کرتا ہے لیکن عموماً مرنے والے کے ساتھ ہی بہت سارے راز بھی دفن ہو جاتے ہیں

دوسرے دن اخبار میں، محلے میں، چوک اور چائے پان کی دکان میں، ہر طرف اس کی عجیب و غریب موت کا ورد دار اور چٹخارہ لے لے کر چرچا ہو رہا تھا۔ لاش کا پوسٹ مارٹم بھی ہوا مگر اس کی دردناک موت کا راز راز ہی سا رہا۔ سدمکان میں لاش کے قریب تپائی پر رکھی ہوئی چائے کی دو پیالیاں بڑے پراسرار طور پر یہ گواہی دے رہی تھیں کہ کوئی اور بھی آیا تھا جس کی تواضع اس نے چائے سے کی ہوگی، مگر وہ دوست نما دشمن آخر تھا کون "بہت چھان بین کے بعد بھی یہ معمہ حل نہ ہو سکا تھا۔ مکان پولیس والوں نے سیل کر دیا تھا اور ان کا آنا جانا وہاں پر سالوں بھر لگا رہا۔ مگر سب کچھ لاحاصل رہا۔ کچھ گرفتاریاں ضرور ہوئیں لیکن اصل قاتل اور قتل کے وجوہات ہنوز پردہ خفا میں تھے۔ صاحب مکان اپنا گھر چھوڑ کر اسی محلہ میں کرایے کے مکان میں منتقل ہو گئے تھے۔

اس واقعہ کو مدت گزر گئی۔ کچھ دنوں تک وہ دونوں مقتول کی بیوی بچوں کی مالی معاونت بڑے خلوص کے ساتھ کرتے رہے۔ شاید ان کے

باطن میں کہیں یہ احساس جرم پوشیدہ تھا کہ "آخر وہ بیچارہ ان کے کیر ٹیکر کی حیثیت سے، اگر اس رات وہاں نہ سویا ہوتا تو ... تو کیا اس کی موت واقع ہوتی۔؟"

"لیکن موت تو برحق ہے ..." یہ کہہ کر وہ لوگ اپنے دل اور دماغ کو تسلی دینے کی کوشش کرتے رہے لیکن ان کا حساس دل ہمیشہ انہیں کچوکے لگاتا رہا۔ خاص طور سے جب کبھی مقتول کی جوان بیوہ اور معصوم بچوں کو وہ دیکھتے جن کی آنکھوں میں اک حرف شکایت تھا۔ "بابوجی! وہ مارے گئے لیکن موت نے انہیں نہیں مارا ... انہیں آپ جیسے امیروں نے مارا ہے ... آپ کے گھر کی تو خوب کیئر ہو گئی مگر ایک غریب آدمی کی زندگی کی یہاں کوئی کیئر نہیں ... یہ کیسا سماج ہے ...؟؟"شاید اسی لیے اس کی موت کا خوں بہا ادا کرنے کی انہوں نے ہر ممکن کوشش کی مگر وہ کہہ نہیں سکتے کہ حق ادا بھی ہوا یا نہیں ...؟

وقت کی گردش سب کچھ ٹھنڈا کر دیتی ہے۔ اس کی موت کا افسوسناک حادثہ بھی بہت ساری اموات حادثہ کی طرح ذہن کے اوراق پر محض ایک کربیہ یاد بن کر رہ گیا۔

موسم سرما کی ایک نہایت سرد اور اندھیری رات تھی، اس کا گزر اس گلی سے ہو رہا تھا، جہاں کبھی مقتول رہتا تھا۔ اچانک اس کی سماعت سے ایک دلخراش چیخ ٹکرائی، اس کے بڑھتے ہوئے قدم ٹھٹھک گئے۔ وہ دیوار کی اوٹ میں چھپ گیا تھا۔ "یہ چیخ تو کسی نو عمر لڑکی کی ہے ..." اس کے تجسس نے اسے سراپا گوش بنا دیا تھا۔ بند کواڑ کی شگاف سے اس نے ایک درندہ صفت کھیل دیکھا۔ سامنے کی کوٹھری میں ایک ادھیڑ عمر کا مرد، بغل میں تکیہ دبائے چارپائی پر نیم دراز تھا۔ لالٹین کی مدھم روشنی میں پان کی سرخی سے سرخ ہونٹوں کے درمیان، اس کے ہنستے ہوئے دانت اور کڑی کڑی مونچھیں بڑی بھیانک لگ رہی تھیں۔ مانو وہ آدمی نہیں ملک الموت ہو جو کسی کی موت کا پیغام لے کر آیا ہو، مرنے والے کی تقریباً سولہ سترہ سال کی بھرے بھرے جسم والی لڑکی کو اس کی ماں زبردستی اس کوٹھری میں ڈھکیل رہی تھی۔ لڑکی قصاب کی بکری کی طرح اس کی باہوں سے نکل بھاگنے کی کوشش میں چیخ چلا رہی تھی، کچھ دیر کی ہاتھا پائی کے بعد مقتولہ کی بیوی نے ایک زوردار طمانچہ غصہ میں اس لڑکی کے نازک رخسار پر رسید کر دیا اور بے ہنگم سی گالیوں سے اسے نوازنے لگی۔ "حرامجادی ... مردار ... جائے گی نہیں تو کھائے گی کیا ... کل موہی ! باپ کو تو کھا ہی گئی ... اب کیا رہ گیا ہے ... چل دور ہو جا میری نخرے"۔

اس روح فرسا منظر کو دیکھ کر وہ اندر ہی اندر تلملا رہا تھا۔ "یارب! یہ کسی ماں کا کردار ہے۔؟" وہ حیرتی بنا، سانس روکے شگاف سے اندر تاکتا رہا۔ ان لوگوں کے آپسی مکالمے سے اسی رات اس پر یہ راز بھی منکشف ہوا کہ اس کا کیئر ٹیکر یعنی اس مجبور لڑکی کا باپ صرف اسی لیے بے وقت موت مارا گیا کہ اس نے اپنی زندگی میں، اپنی بیٹی کی طرف اٹھتی ہوئی ہر ہوسناک نگاہ سے مقابلے کی ٹھان لی تھی۔ اور ایک دن اس شیطان صفت انسان کی خواہ مخواہ چھیڑ چھاڑ پر اس نے ٹوک دیا تھا "ابھی تو بالکل بچہ ہے حضور ... کیسی باتیں کرتے ہیں ..." اس مختصر سے جملے کی سزا میں ایک ماہ کے اندر ہی اسے اپنی جان سے ہاتھ دھو لینا پڑا۔ اور آج کی رات ایک ماں بھی، شاید کسی مجبوری کے ہاتھوں ہی ..."

کالی چڑیل جیسی رات میں، دیوار کی اوٹ میں خود کو چھپائے ہوئے وہ اب ایک کڑی آزمائش میں گھر چکا تھا۔ "اب کیا کرنا چاہیے ؟ کیا اس آگ کے دریا میں کود کر اس بے پتوار نازک سی ناؤ کو ڈوبنے سے بچا لیا جائے ...؟" ایک بڑا سا سوالیہ نشان اس کے سامنے تھا، فیصلہ کی گھڑی بے حد مختصر تھی، اس کے سارے جسم میں کپکپی سی ہو رہی تھی اور غصہ کی شدت سے دماغ کی نسیں پھٹ رہی تھیں۔ "کیا ہوگا۔ ؟ ... کیا کرنا چاہیے ...؟؟" یہ سوچتے ہوئے اس نے چاہا کہ دروازے کو زور کا دھکا دے کر اس وحشی جانور پر ٹوٹ پڑے ... اس کے بڑھتے ہوئے ہاتھ اچانک اس کی سوچ سے مفلوج ہو گئے اور اس نے خاموشی سے اپنے ارد گرد کا جائزہ لیا۔ اس سنسان رات میں چہار طرف ایک گہری خاموشی تھی۔ گلی ویران اور اندھیری، آس پاس کے مکانوں کے دروازے اور کھڑکیاں بند تھیں۔ اس نے محسوس کیا شاید کسی طرح کی چیخ و پکار کا ان بند دروازے والوں پر کوئی اثر ہونے والا نہیں ہے جبھی تو ... تو کیا وہ تن تنہا اس لڑائی میں کود کر اپنی جان کو خطرے میں ڈال دے ...؟" اس میں ہمت تو ضرور تھی مگر اس قدر بھی نہیں

اپنی طاقت کو بھانپتے ہوئے اس نے سوچا

"یہ عقلمندی نہیں ہوگی، واقعی نہیں ہوگی اس سر پھروں سے بھلا کون دشمنی مول لے" بہت دیر تک عجیب کش مکش میں مبتلا رہنے کے بعد وہ قہراً و جبراً اپنے آپ کو تقریباً گھسیٹتا ہوا اپنے گھر کی طرف چل پڑا تھا لیکن دیر تک سد کرے میں سے اس نو عمر لڑکی کی مزاحمت، سسکیاں اور کراہنے کی آواز اس کی کنپٹیوں کو گرم کرتی رہی تھیں، لیکن اسے حیرت اس بات پر ہو رہی تھی کہ اتنا کچھ ہونے کے باوجود اس کے جسم کا خون تو ابھی بھی ٹھنڈا اور منجمد ہی تھا۔

بقیہ: محبوبہ بنام بیوی

ہو جائے۔

دوسرے ہی دن اس کی دعا قبول بھی ہو گئی تھی۔

لیکن ـ

ابھی ایک سال باقی رہ گیا ہے۔ وہ یہ کہ اگر اس نے اپنی کسی محبوبہ کو بیوی بنالیا ہوتا تو کیا وہ اس کی آخری سانسوں تک اس کی تیمار داری کرتی رہتی یا پھر اس کے بیمار پڑنے کے سال دو سال کے اندر ہی اسے چھوڑ کر چلی جاتی مگر اس صورت میں شاید وہ دس سال پہلے ہی مر گیا ہوتا۔

بقیہ: فریب تماشا

وہ چپ رہی

اس کے گماں میں یہ تھا وہ اس مقام پر آچکی ہے جہاں کوئی شوہر والی بیوی والی اسے اپنے زمرے میں خود بخود شمار کرلے گی۔

(جن کو ماں باپ حفاظتی قلعوں میں بند رکھتے ہیں، ان کی تقدیر!)

اس کے کنگ سے پر عورت مرر ہوکر چلی گئی

- - - - - - - - - -

وہی انگریز جوڑا ادھر سے واپس گزر رہا تھا۔

"پلیز"

وہ رک گئے

"ہیلپ می"

وہ آگے بڑھ بتانے لگے

"نو۔ نو نو

"سٹوپ ٹو ڈیتھ"

وہاں ایک پتھر نہ تھا،

کوئی بستی نہ تھی،

کوئی پیمبر نہ تھا کوئی فیصلہ کرنے والا نہ تھا!!!

بہار حسین آبادی : بازیافت

پروفیسر جابر حسین
چیئرمین، بہار قانون ساز کاؤنسل، پٹنہ

ادب کی باریکیوں پر اپنی رائے ظاہر کرتے وقت میں نے محسوس کیا ہے کہ مختلف ملکی و غیر ملکی زبانوں میں لکھے جانے والے عصری ادب اور اس کی خصوصیات سے عدم واقفیت اکثر میرے راستے میں ایک ذہنی رکاوٹ بن کر کھڑی ہو گئی ہے۔

یونیورسٹی کے دور میں اور اس کے بعد تقریباً ڈیڑھ دہائی تک ادبی مذاکروں، تقریروں اور تخلیق کے دوران عصری ادب سے عدم واقفیت کا احساس اتنی تکلیف کا باعث نہیں بنتا تھا۔ لیکن بعد کی مدت میں خود تخلیقی دور سے گزرتے وقت، عملی زندگی کی دیگر مصروفیات کے سبب عالمی عصری ادب کے تازہ ترین محسوسات سے ہمکنار ہونے کے مواقع لگاتار کم ہوتے گئے۔

دو سال قبل، میرے ایک قریبی قلمکار دوست نے ماریشس سے لوٹ کر ایک فرانسیسی قلمکار خاتون کا نیا ناول بطور تحفہ مجھے عنایت کیا۔ یہ ناول فرانسیسی زبان میں لکھا گیا تھا۔ مجھے اس ناول کو پڑھنے، سمجھنے میں جس ذہنی تشنگی کے لمحات سے گزرنا پڑا وہ اپنے آپ میں ایک تلخ تجربہ ہے۔

ملکی و غیر ملکی مختلف زبانوں میں لکھے گئے اچھے ادب سے زبان اور محسوسات کی سطح پر واقف ہونا ادب کے کسی بھی طالب علم کے لیے ایک بڑی بات ہے۔ احساس کی سطح پر ادب کا بین الزبان تعارف در حقیقت عصری ادب اور فن کے لیے ایک بڑا سرمایہ ہے اسی لیے میرے دل میں ان اداروں کے تئیں احترام کا جذبہ ہے، جو ہمیں ادب کی بین الزبان جہتوں سے روبرو ہونے کا موقع فراہم کرتے ہیں۔

مجھے نہیں معلوم، ادب اور فن کے طویل سفر میں اچھے ادب اور برے ادب کے درمیان چلنے والی سرد جنگ کا آغاز کب ہوا؟ لیکن یہ سچ ہے کہ ہر دور میں اچھے اور برے ادب کو لے کر ایک سنجیدہ بحث چلتی رہی ہے۔ اس بحث کے باوجود اچھے اور برے ادب کے درمیان کوئی مستقل خط تقسیم تاریخ کے کسی دور میں نہیں کھینچا جا سکا۔

دنیا میں اچھا ادب بھی لکھا جاتا رہا ہے اور برا ادب بھی۔ لیکن جو آج کا اچھا ادب ہے، کوئی ضروری نہیں کہ کل بھی اسے اچھے ادب کی شکل میں لیا جائے۔ یا پھر جسے آج برا ادب کہہ کر رد کیا جا رہا ہے، کوئی ضروری نہیں کہ وہ آنے والے دنوں میں بھی برے ادب کے نام سے ہی جانا جائے، ادب کی لمبی مسافرت میں اچھے اور برے جیسے الفاظ اکثر بے معنی ہو جاتے ہیں۔

لیکن یہ بھی سچ ہے کہ ہر دور میں لکھا جانے والا ادب خود اپنے لیے اچھائی اور برائی کی کچھ معیار کسوٹیاں متعین کرتا ہے۔ کسی مخصوص دور میں ادب کی اچھائی یا برائی کی کسوٹیاں دراصل اس بات پر منحصر ہیں کہ وہ ادب ہمیں ماضی، حال اور مستقبل کے جذباتی تسلسل سے وابستہ رکھتا ہے یا نہیں۔

ایک لمبی مدت تک ادب کی دنیا میں روایت اور نئی تخلیقیت کو لے کر بحثیں چلتی رہی ہیں۔ کئی معنوں میں یہ بحثیں غیر فیصلہ کن ثابت ہوئی ہیں۔ ناقدوں کی مسلسل کوششوں کے باوجود یہ طے نہیں پا سکا کہ اچھا ادب کس حد تک روایت اور کس حد تک نئی تخلیقیت کا اظہار ہوتا ہے۔

میں نے اچاریہ شیو پوجن سہائے اور رابندر ناتھ ٹیگور کا مطالعہ کرتے وقت اکثر محسوس کیا ہے کہ ان دونوں فنکاروں کی تحریروں میں روایت اور تخلیقیت ان بلندیوں پر ہے جہاں زبان اپنی معنویت کے حدود سے آگے اپنے آپ میں ایک تخلیقی حیثیت بن جاتی ہے۔ ان منازل کو عبور کرنے

والا ادب ہی اپنے دور کی کسوٹیوں پر پورا اترنے والا ادب کہلائے گا۔

اپنی تخلیق کے تقریباً سو سوا سو سال بعد، اردو کے اب تک کے گمنام شاعر کی تخلیقات سے پہلی بار ادبی دنیا کو روشناس کرانے والی ڈاکٹر ذکی شان فاطمی کی کتاب "بہار سے" جب منظرعام پر آئی تو میرے دل میں دھندلی پرچھائیں کی طرح یہ باتیں ابھر آئیں، جن کا میں نے اوپر ذکر کیا۔

تقریباً 133 سال قبل مونگیر ضلع کی شیخپورہ، حسین آباد بستی میں شاہ محمد ہاشم بہار حسین آبادی کی پیدائش ہوئی، یہ زمانہ تعلیم و تعلم اور حرف شناسی نہ تو اسکولوں کی مرہون منت تھی اور نہ ناعاقبت اندیش اساتذہ کی۔ بہار حسین آبادی نے اردو، فارسی، عربی اور انگریزی زبانوں میں جو بھی مہارت اور پختگی حاصل کی وہ خود ان کی ریاضت کا ثمرہ تھی۔

بہار حسین آبادی نے اردو میں غزلیں کہیں، مراثی لکھے، قصیدے لکھے، رباعیاں لکھیں، فارسی میں غزلیں، مثنوی لکھی اور دو جلدوں میں سوانح حیات بھی لکھی۔ یہ تمام تصنیفات بہار حسین آبادی کو نہ صرف اپنے دور کی کسوٹیوں پر پورا اتارتی ہیں، بلکہ انھیں کسی بھی دور میں متعین ادبی اقدار کی رو سے ایک معتبر فنکار کی شکل میں ابھاگر کرتی ہیں۔

رباعی ہو یا غزل، نوحہ ہو یا مرثیہ، قصیدہ ہو یا مثنوی، بہار حسین آبادی کی تخلیقات روایت اور نئی تخلیقیت کی سب سے اونچی منزل میں جلوہ افروز نظر آتی ہیں

شاد عظیم آبادی کے بعد بہار میں اردو کے دوسرے بڑے شاعر علامہ جمیل مظہری نے مرثیہ نگاری کے میدان میں بہار حسین آبادی کی خدمات کو ایک "ذہنی انقلاب" سے منسوب کیا ہے۔ ان کے مطابق بہار حسین آبادی نے مرثیہ نگاری کے فن کو ایک نیا ڈھانچہ، ایک نئی جہت عطا کی ہے۔ ایک ایسی جہت جو فن مرثیہ نگاری کو رونے رلانے کے ذریعہ سے کہیں اوپر لے جاتی ہے اور جو کربلا کے المیے سے وابستہ کچھ کرداروں کو مثالی انسانوں کی شکل میں پیش کرتی ہے انتہائی حسین، بلکہ جو عام انسانوں کے دل میں تحریک کی ایک نہ بجھنے والی شمع بھی روشن کرتی ہے۔

ہیئت اور مواد کے لحاظ سے بہار حسین آباد کے فن کی بلندی صرف مرثیہ تک ہی محدود نہیں ہے، رباعی اور غزل کے معاملے میں بھی وہ نہ صرف اپنے معاصرین میں ممتاز ہیں، بلکہ آج بھی ان کی بیشتر غزلیں کلاسیکی اور جدید ادب کا حسین امتزاج ہیں۔ اس معاملے میں بہار حسین آبادی نے جہاں ایک طرف اپنی غزلوں میں فکری عناصر ڈالنے کی کوشش کی وہیں انھوں نے غزل کی زبان میں بھی کئی اہم اور دلکش تجربے کئے۔ ان کے دیوان میں جگہ جگہ ایسے اشعار مل جائیں گے، جو پڑھتے ہی زبان زد ہو جائیں گے اور جنھیں آپ چاہ کر بھی نہیں بھول پائیں گے۔

جز لے او مسیحائے زمانہ
تڑپتا ہے ترا بیمار ہر شب

سایہ کسی پری کا ہوا ہے کہ رات دن
سر دھنتے ہیں بہار مگر بولتے نہیں

دل دیا خوب کیا تم نے بہار
عشق تھا یہ کبھی جانا ہی نہیں

نرگس کو بھی ساتھ اپنے لیا تم نے بہار آج
بیمار ہو اور روتے ہو بیمار کے آگے

ہے در یار بیٹھ جاؤ بہار
کیسی ذلت ، کہاں کی رسوائی

رات ساقی سے لڑائی ہوگئی میری بہار
دے دیا تھا جام میں اس نے کف صہبا مجھے

دامن پہ ان کے چھینٹ نہ پڑجائے اے بہار
سیدھا رکھو گلا رخ شمشیر کی طرف

بہار حسین آبادی کی غزلیں ان کے صحت مند دماغ اور زندہ و متحرک رجحان کا آئینہ ہیں۔ ان کی غزلوں میں ہم عصر شاعروں کی فنی پختگی تو ضرور دکھائی دیتی ہے۔ لیکن ان کا ہلکا پن دکھائی نہیں دیتا۔ اردو غزل کی رسمی خصوصیات کو بھی اپنے اشعار میں ڈھالتے وقت انھوں نے ضروری سمجھا کہ حسن و عشق کے تقدس اور پاکیزگی پر کوئی حرف نہ آنے پائے۔

اپنی رباعیات میں بہار حسین آبادی اکثر قاری کو میر انیس کی یاد دلاتے ہیں۔

ابنائے زمانہ مجھے کب ڈھونڈیں گے
گر ڈھونڈنے کہئے تو سبب ڈھونڈیں گے
تا زیست مری قدر نہ سمجھیں گے بہار
کھو دیں گے مجھے ہاتھ سے تب ڈھونڈیں گے

بدبیں آنکھیں بہار بدبیں کی ہیں
حذلیل بشر میں ذلتیں اپنی ہیں
ایک انگلی اٹھا کے دیکھو اوروں کی طرف
تین انگلیاں خود اپنی طرف اٹھتی ہیں

موت آئے گی مرجائیں گے ڈرنا کیا ہے
ہے اس کی رضا یہی تو کرنا کیا ہے
اب تک نہ ہوئی جس کی حقیقت معلوم
وہ بھید تو کھل جائے گا مرنا کیا ہے

مجلس میں جو نکتہ چیں ہم ہوتے ہیں
واللہ وہ ارباب کرم ہوتے ہیں
بڑھ جاتی ہے اس سے اور بھی تزئین تخن
کانٹے تو مرے باغ کے کم ہوتے ہیں

پیری دل بریاں پہ نمک ریز ہوئی
لو توسن عمر کو یہ مہمیز ہوئی
رعشہ تھا ہی ، ہوا تنفس بھی شروع
بیٹھے ہو بہار اٹھو ہوا تیز ہوئی

انھیں جاندار رباعیات میں سے ایک رباعی پڑھ کر علامہ جمیل مظہری نے کہا تھا "اگر بہار نے زندگی بھر کچھ نہ کہا ہوتا اور یہی ایک رباعی کہتے تو یہ ایک رباعی ہی ان کو صف اول کے شعراء میں جگہ دینے کے لیے کافی تھی"۔

آخر بہار حسین آبادی جیسی غیر معمولی ذہانت اور خصوصیات کے حامل فنکار کی تصنیفات ایک صدی تک حصار وقت سے باہر، منظر عام پر کیوں نہیں لائی جاسکیں ؟ ڈاکٹر ذکی شان فاطمہ کی کتاب "بہار نیہ" اس مشکل سوال کا جواب بن کر سامنے آئی ہے۔

یہ کتاب صرف بہار کے ایک گمنام لیکن غیر معمولی ذہن کے شاعر کا تعارف نہیں ہے۔ یہ کتاب دراصل ان تلخ سچائیوں کی نقاب کشائی بھی ہے جو ادب کے میدان میں وقت کی کسوٹیوں پر پوری اترنے والی تخلیقات پر اکثر ایک موٹی تہہ بن کر بیٹھ جاتی ہے۔

غزلیں

شوق و دانش کو تولنے دیجے
اک نیا باب کھولنے دیجے

لعل کی طرح سرخ ہیں آنکھیں
اب تو الماس رولنے دیجے

کچھ ٹھہر کر زبان کھولیں گے
پہلے آنکھوں کو بولنے دیجے

مہر بر لب مژہ پہ آنسو ہیں
راز دل یوں ہی کھولنے دیجے

گرچہ اعلانِ بے وفائی ہے
آپ کا دل ٹٹولنے دیجے

ہے عدو ترش رو بھی جھوٹا بھی
زہر کانوں میں گھولنے دیجے



پیشِ لفظ کلامِ اکبر ہے
مجھ کو دیوان کھولنے دیجے

ہم اپنے درد دل کو نمایاں نہ کرسکے
پیدا لہو میں جوش فراواں نہ کرسکے

انسانیت ہے انس کے نکتہ میں مستتر
انساں وہ کیا ہے جو غم انساں نہ کرسکے

اس نے تو نعمتوں سے بھرا دامن مراد
ہم ہی علاج تنگئی داماں نہ کرسکے

برہم نظام عالم امکاں کریں گے کیا
جو تار تار اپنا گریباں نہ کرسکے

ترسی ہوئی نظر کو نہ دی دعوت جمال
سہمے ہوئے لبوں کو غزلخواں نہ کرسکے

یہ چودھویں کا چاند یہ تارے یہ کہکشاں
اکبر کے غمکدے کو فروزاں نہ کرسکے

جلال الدین اکبر
17-1-181/M/35, Darah Jang Colony, Madannapet
Hyderabad - 500 659

جدید اردو نظم

جاوید احمد انصاری
لکچرر شعبہ اردو
این - این کالج سنگھارہ
بہار یونیورسٹی مظفرپور
جنداہا (ویشالی) بہار

نظم اردو شاعری کی وہ صنف ہے جس میں ایک تنظیم ربط و تسلسل اور ارتقائی کیفیت پائی جاتی ہے۔ نظم میں شروع سے آخر تک تصورات میں مرکزیت کا ہونا ضروری ہے۔ نظم کے معنی موتی کو دھاگے میں پرونا ہے۔ موتی کے ہار کی طرح نظم کی ہر کڑی بھی آپس میں پیوستہ ہوتی ہے۔ عام طور سے نظم میں ایک ہی مضمون پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔

نظم کا لفظ نثر کے مقابلے میں بھی بولا جاتا ہے یعنی غیر موزوں کو نثر کہتے ہیں۔ اور کلام موزوں کو نظم۔ اس اعتبار سے قصیدہ، غزل، مثنوی، مرثیہ رباعی، قطعہ اور تمام دیگر اصناف سخن نظم کے تحت آئی ہیں۔ لیکن نظم کے ساتھ جب جدید کا لفظ استعمال ہوتا ہے تو اس کا مطلب وہ شاعرانہ تخلیق ہوتی ہے جو مسلسل اور مربوط ہو اور جس کے اندر صرف ایک خیال پیش کیا گیا ہو۔ چونکہ اس قسم کی تخلیق دیگر اصناف کے مقابلہ میں بعد کو وجود میں آئی ہے۔ اس لئے جدید کہی جاتی ہے۔

اگرچہ نظم جدید کی جدت میں کوئی شبہہ نہیں لیکن اس کے ابتدائی آثار دکنی دور ہی سے ملنے شروع ہو جاتے ہیں۔ دکنی شعراء کی مثنویات کے ٹکڑے مسلسل نظموں کا کام دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ محمد قلی قطب شاہ نے بھی متعدد نظمیں لکھی ہیں۔ اس طرح دہلی کے ابتدائی دور میں فائز اور حاتم کی نظمیں ملتی ہیں۔ لیکن نظم جدید کی اصل ابتداء نظیر اکبرآبادی سے ہوتی ہے جن کو عوامی شاعر کہہ کر ان کے دور میں اہمیت نہیں دی گئی۔

نئی تعلیم اور نئے سماجی شعور کی بدولت جو بدلتی ہوئے اقتصادی خیالات کا نتیجہ تھا ان کے یہ خیال بے کار نہیں گئے اور کچھ ہی دن گزرنے پر لاہور میں انجمن پنجاب کی بنیاد پڑی اور آٹھ مئی ۱۸۷۴ء کو انجمن پنجاب کے زیر اہتمام مشاعرہ کا آغاز ہوا۔ جس میں نئے طرز کی نظمیں پڑھی گئیں جو اردو نظم کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ مولانا آزاد نے غزل کے بجائے نظم کی ترویج کے سلسلہ میں بصیرت افروز تقریریں کیں اور شاعری میں اصلیت سے کام لینے، مقامی رنگ پیدا کرنے اور زندگی کے سچی مصوری کرنے کی استدعا کی اور کہا کہ ہم کوتل، چمپا اور چمبیلی، ارجن اور بھیم، گنگا اور جمنا، ہمالیہ اور دوسری مقامی چیزوں کو بالکل بھول گئے۔ اب اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم ان کی طرف بھی پورا دھیان دیں۔ وہ ان روایات سے رو گرداں نہیں ہونا چاہتے تھے جو پہلے سے چلی آرہی تھیں ان کا خیال تھا کہ شاعری کو اس زندگی کی قیادت کا بار قبول کرنا چاہیے جو ہمارے چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے۔ اس خطبے کے بعد مولانا آزاد نے ایک نظم پڑھی جو رات کی مختلف صورتوں کی عکاسی کرتی تھی انہوں نے نئے شعراء کو بھی متاثر کیا۔ انجمن کے جلسوں میں موضوعاتی نظمیں پڑھی جانے لگیں۔ مولانا حالی نے برکھارت، نشاط امید، حب وطن اور مناظر رحم و انصاف کے عنوان سے نظمیں پڑھیں جن کی ظاہری ہیئت اگرچہ مثنوی کی ہے لیکن ان میں زندگی کے بارے میں ایک اور نظم کی تعمیر کا ایک نیا شعور ملتا ہے۔ اس زمانہ میں آزاد اسمٰعیل میرٹھی اور صامن وغیرہ نے انگریزی نظموں کا اردو ترجمہ کرکے انگریزی نظم کے فنی اسالیب سے اردو نظم کو روشناس کرایا جس سے اردو نظم کی ترقی کے لئے مناسب فضا پیدا ہوئی۔

انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے آغاز میں "شرر" کے رسالہ "دلگداز" اور "سر عبد القادر" کے رسالہ مخزن نے "جدید اردو نظم" کو فروغ دینے نمایاں حصہ لیا۔ اس زمانہ میں اردو نظم میں ہیئت کے تجربے ہوئے۔ انگریزی نظم کے انداز پر مصرعوں کی نئی ترتیب، بندوں کی نئی تقسیم اور قافیہ ردیف کا نیا التزام سامنے آیا۔ نظم معرا اور آزاد نظم کے تجربے کیے گئے۔ اس دور کے شعراء میں علامہ محمد اقبال، نظم طباطبائی نادر، چودھری خوشی محمد، غلام بھیک نارنگ، سرور جہاں آبادی، ظفر علی خاں اور تلوک چند محروم کے نام قابل ذکر ہیں۔ موضوع اور فن کے اعتبار سے اردو نظم کے دامن کو نئی وسعتوں سے آشنا کرایا اور اردو نظم کو اپنے ملک کی ذہنی بیداری اور وطن پرستانہ جذبات کا آئینہ دار بنایا۔ شبلی اور چکبست نے سیاسی موضوعات اور مسائل پر نظمیں لکھیں۔

بیسویں صدی کے تیسری دہائی کے خاتمہ تک نوجوان شاعروں میں ایک طرف جوش ملیح آبادی، سیماب اکبرآبادی، حفیظ جالندھری، ساغر نظامی اور احسان دانش جیسے شاعروں نے مغربی ادب سے نسبتاً بیگانہ رہ کر اردو نظم کو قومی جذبات اور خیالات کی لے سے ہم آہنگ کیا تو دوسری طرف عبد الرحمان بجنوری، عظمت اللہ خاں، اختر شیرانی اور ڈاکٹر تاثیر نے مغربی شعر و ادب کے اثرات قبول کرکے نظم کو جدید احساس اور نئے شعری تجربات کے اچھوتے سانچہ میں ڈھالا اس دور میں نظم زندگی کی کروٹوں اور فرد کے بدلتے ہوئے کردار کی آئینہ دار بن گئی۔ علامتیں استعمال کرکے نظموں کو انفرادی رنگ دیا گیا۔ اختر شیرانی نے ہیئت کے تجربے کئے اور انگریزی اسلوب نظم سانیٹ کو مقبول بنانے کی کوشش کی۔ عبد الرحمان بجنوری اور تاثیر نے معرا اور آزاد نظم کے تجربے کئے۔ اس دور میں شعراء کے یہاں ایک نیا تصور مظاہرہ زندگی اور فطرت سے انسانی رشتوں کا ایک نیا احساس عشق کا بیباک اور والہانہ انداز اور ایسی جمالیاتی تصور پرستی ملتی ہے جو اس سے قبل عنقا تھی۔

۱۹۳۶ء میں ترقی پسند تحریک ظہور پذیر ہوئی۔ ترقی پسند تحریک نے زندگی کی طبقاتی بصیرت، انسانی دوستی کا ایک نیا اور صحت مند تصور وطن آزادی کا ایک نیا آدرش اور محنت کش عوام کو آفاقی بیداری کا نیا عزم دیا۔ اس تحریک نے نظم کی وسعتوں کو ایسے عہد کے آشوب زندگی اور اس کے گوناگوں مسائل کی گونج سے آشنا کیا۔ فیض، علی سردار جعفری، جاں نثار اختر، مجاز، مخدوم، ساحر، جذبی، اختر الایمان، حالی و دیگر ترقی پسند شعراء نے اپنے عہد کی سیاسی سماجی زندگی کی ہنگامہ آرائیوں اور ان سے پیدا ہونے والی ذہنی و جذباتی فضا کو ترقی پسند تحریک کے منشور کے مطابق اردو نظم کے سانچہ میں ڈھالنے کی کوشش کی اس دور میں کچھ شعراء ایسے بھی تھے جو راہ راست اس تحریک سے نہ جڑ سکے ان میں اہم نام میراجی، ن۔ م۔ راشد اور اختر الایمان وغیرہ کے ہیں جو بنیادی طور پر نظم کے شاعر ہیں جنہوں نے اپنی تخلیق میں صلاحیت اور بصیرت سے نئے تجربے کئے اور مواد، تکنیک اور تعمیر و جدت کے اعتبار سے اردو نظم کو مغربی شاعری سے استفادہ کرنے کا اہل بنایا اس عہد کی سب سے بڑی دین آزاد نظم ہے جو بادجود مخالفت کے عروج پر ہے۔ آزاد نظم وزن اور قوافی کے رائج ضابطوں کی قید سے آزاد ہوتی ہے۔ آزاد نظم میں شاعر بغیر کسی پابندی کے شاعرانہ جذبات مناسب اور موزوں الفاظ میں ادا کرتا ہے چنانچہ متعدد شعراء نے آزاد نظم کی مقبولیت کے اسباب کچھ اس طرح مہیا کر دیئے کہ کچھ روایتی غزل گو شعراء بھی اس شعر میں شریک ہوگئے اور معیاری آزاد نظموں کی تخلیق ہوئی۔

غلامی سے چھٹکارا پانے کے بعد اندرون ملک و بیرون ملک فرقہ پرستی تہذیبی قدروں کی شکست و ریخت، رنگ و نسل، ذات پات زبان و کلچر کا تنازعہ، ناقص تعلیم، سماج کا مکڑ مزاج، لاقانونیت مفلسی اور بیکاری اور استحصال کی فضاء میں جس نسل نے آنکھیں کھولیں اس میں اجتماعی فکر و احساس کا مادہ کم سے کم تر ہوتا گیا اور انسان کی انفرادیت کی اہمیت بڑھتی گئی اس وجہ سے اس دور کی فکری اساس میں اجتماعیت کی بجائے انفرادیت نے جگہ پائی۔ چنانچہ انفرادی فکر ہی جدید اردو نظم کی خصوصیت بن گئی جو فارم مواد علامتوں ہیئت اور شعری پیکروں سے عیاں ہے۔ دور حاضر میں سردار جعفری، کیفی اعظمی، اختر الایمان، بلراج کومل، حمایت علی شاعر، ساغر وحید اختر، شہریار اور ندا فاضلی وغیرہ جدید اردو نظم کے معتبر شعراء ہیں۔ جن کی فکری و فنی کاوشوں سے اردو نظم کے بیش بہا سرمایہ میں اضافہ جاری ہے۔

اس طرح "جدید اردو نظم" نے مناظر قدرت، قومی مضامین، حب الوطنی فلسفہ، طنز و مزاح انقلاب کے لئے تیاری سب ہی مضامین کو اپنے اندر جذب کر لیا اور زمانے کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر ہر رنگ پیش کیا۔

افسانہ نگار عمران الارشد سے پروفیسر اوج کمال کا انٹرویو

"کہتے ہیں حس کو عشق سے لے کر" "لندن ہی تو ہے کوچہ جاناں تو نہیں ہے" کے درمیان ۵۵ افسانوں کا سفر ہے۔ آخری افسانہ ۱۹۵۷ میں تحریر کیا اور "سور ادب کا قاری ہوں" ان باتوں کا اظہار برطانیہ میں مقیم پاکستانی افسانہ نگار عمران الارشد نے ایک ملاقات میں کیا۔ ان سے تفصیلی ملاقات ان کے بڑے بھائی سلطان الارشد کے مکان واقع لیاقت آباد میں ہوئی۔ سلطان الارشد صاحب کا انتقال حال ہی میں ہوا ہے۔ ان کے ہمراہ ان کی بہن معروف افسانہ نگار ماہو ارشد بھی لندن سے آئی تھیں۔ عمران الارشد کے بڑے بھائی سلمان الارشد کراچی سے نکلنے والے ادبی جریدے "الشجاع" کے مدیر تھے۔

سوال آپ کی عمر کتنی ہے؟

جواب ۶۷ سال

سوال ۶۷ برس میں ۳۸ برس آپ ادب سے دور رہے۔ اس عرصے میں آپ کا میدان سول انجینئرنگ رہا۔ گویا ۳۰ برسوں میں سن بلوغت کو نکال کر آپ کے پاس ۱۲ بچے جس میں نے ۵۵ افسانے لکھے۔ یہ رفتار کچھ زیادہ ہی تیز نظر نہیں آتی؟

جواب وہ دور ایک تحریکی دور تھا۔ ہندوستان میں تبدیلی آرہی تھی ہر صاحب فکر اپنے اپنے انداز میں سوچ رہا تھا۔ ۱۹۴۶ء میں بھوپال میں ترقی پسند مصنفین کی بنیاد پڑی۔ جس کا پروپیگنڈہ سکریٹری میں تھا اور جنرل سکریٹری بڑے بھائی سلمان الارشد تھے۔ جب کہ وحید الحسینی اس کے صدر تھے۔ اس زمانے میں اے۔ آر۔ رشدی، صہبا لکھنوی، قمر جمالی، ابراہیم یوسف، اشتیاق عارف، انجم سلمانی، کوکب جمیل اور محمد علی تاج معروف افسانہ نگار تھے۔ میرا پہلا افسانہ "کہتے ہیں جس کو عشق" دہلی کے ماہنامہ "قوم" میں شائع ہوا۔ قدوس صہبائی کے "نظام" میں تواتر سے افسانے شائع ہوتے رہے حتیٰ کہ انجمن ترقی پسند مصنفین نے ایک کتاب "خونی ہے ہندوستان" شائع کی جسے بعد میں سرکار نے ضبط کرلیا اور Ban لگادیا گیا۔ اس میں میرا افسانہ جسے میں آج بھی پسند کرتا ہوں "شگاف" شائع کیا گیا۔ یہ منتخب تحریروں پر مشتمل ایک کتاب تھی۔

سوال "خونی ہے ہندوستان" ضبط کرنے کی وجہ؟

جواب اس میں ہندو اور مسلمانوں کے خلاف ادبی مواد تھا، چونکہ ہم ترقی پسند معاشرے کو ہندو اور مسلمان کے عنوان سے دیکھنے کے تربیت یافتہ نہیں تھے لہٰذا اس کتاب کو ضبط ہونا ہی تھا یہ کتاب ۱۹۵۰ء میں ضبط کی گئی۔

سوال آپ کی صحبت کن افسانہ نگاروں کے ساتھ رہی؟

جواب ابراہیم جلیس، شوکت صدیقی، منظر سلیم اور خلیق ابراہیم خلیق سینیئر افسانہ نگار تھے اور ان ہی کی صحبت میں بیٹھا اور بہت کچھ سیکھا۔ تاہم وہ دور احمد ندیم قاسمی، کرشن چندر بیدی، غلام عباس، ممتاز مفتی، عصمت چغتائی، منٹو وغیرہ کا تھا، احمد ندیم قاسمی کا افسانہ "سناٹا" پڑھ کر آج بھی جسم میں جھرجھری سی پیدا ہوجاتی ہے یہ ایک معرکتہ الآرا افسانہ ہے۔

سوال ترقی پسند مصنفین کے جو مقاصد تھے یعنی مزدور تحریک، ہندو پاک میں عدم تشدد اور ادبی محاذ پر جنسی تحریروں کی مخالفت ان میں منٹو، عصمت چغتائی اور واجدہ تبسم سرفہرست تھیں جن کی مخالفت کی جاتی تھی۔ بعد ازاں آپ بھی ان کی تحریروں میں کھوئے اور آپ کے افسانے بھی جنسیات کی تقلید کرنے لگے، گویا یہ ترقی پسند مصنفین کے اصولوں سے بغاوت نہیں تھی؟

جواب ہم جنسیات نگاری کو گلی کوچوں میں پلنے والی جنسیات کے زمرے میں نہیں دیکھتے تھے خود لذتی کا احساس قاری اپنے طور پر پیدا کرتا ہے۔ ترقی پسند مصنفین کے جو کارکن ان افراد پر قدغن لگاتے تھے وہ ان کے بغیر آگے چلتے بھی نہیں تھے گویا گروپ بندی پیدا ہوگئی تھی۔ تاہم سب ترقی پسند ہی تھے۔

سوال اس ضمن میں آپ کا افسانہ کونسا تھا؟

جواب میرا افسانہ "چربے" تھا جو الکار میں شائع ہوا تھا یہ جنسی رجحان کا حامل تھا اس کی بعض

لائنیں اس قدر خوبصورت تھیں کہ ساقی فاروقی نے کہا کہ میرے ذہن میں یہ لائنیں کیوں نہیں آئیں۔

سوال کرشن چندر کے بارے میں کیا خیال ہے؟

جواب کرشن چندر مجھے پسند نہیں آئے ان کے پاس افسانہ نگاری نہیں بلکہ کہانی زیادہ ہوتی ہے اور وہ پریم چند کے طرز پر لکھتے تھے۔

سوال پاکستان کب ہجرت کی؟

جواب یکم جولائی ۱۹۵۰ء کو پاکستان آیا۔ اس وقت تک تقریباً ۵۰ افسانے لکھ چکا تھا۔

سوال پاکستان آنے کے بعد یہ شوق جاری رہا؟

جواب جی ہاں ۱۹۵۰ء تا ۱۹۵۷ء تک چار افسانے لکھے۔ "شکست سے پہلے"۔ "کالج کا ڈھانچہ"۔ "یچ کہہ دوں اے برہمن" اور "لندن ہی تو ہے کوچہ جاناں تو نہیں ہے" تیسرا افسانہ "یچ کہہ دوں اے برہمن" ۱۹۵۴ء میں "مشرب" میں شائع ہوا یہ ترقی پسندوں کے خلاف تھا اور چوتھا افسانہ لندن میں لکھا گیا۔

سوال "لندن ہی تو ہے کوچہ جاناں تو نہیں" یہ مصرعہ اور افسانے کا خیال ذہن میں کیسے آیا؟

جواب دراصل یہ مصرعہ طفیل احمد جمالی کے شعر کا ہے جس میں، میں نے معمولی تبدیلی کی ہے۔ مصرعہ ہے "جنت ہی تو ہے کوچہ جاناں تو نہیں ہے" جنت میں نے تبدیل کرکے لندن کردیا بات دراصل یہ ہے کہ ۱۹۵۷ء میں، میں سول انجینئرنگ کی تعلیم کے لئے لندن آگیا۔ ہمارا ذہن روایتی ہندوستانی تھا کہ مغرب میں ہر قسم کی آزادی ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ میں نے اس ذہن کو سامنے رکھتے ہوئے اور لندن میں چند برس گزارنے کے دوران یہ افسانہ لکھا۔ بعد میں احساس ہوا کہ ایسا نہیں ہے۔ یعنی لندن کوچہ جاناں ہے۔

سوال اس تبدیلی کی وجہ؟

جواب میری شادی ایک جرمن خاتون سے ہوئی۔ شادی سے قبل میں نے مغربی معاشرت کا عمیق مطالعہ کیا۔ جو ہم دیکھتے یا سمجھتے تھے ایسا نہیں ہے۔ ان کی تہذیب اور روایات ہیں۔ خواتین بغیر اجازت اور بزرگوں کے بغیر باہر نہیں نکلتی تھیں۔ عریانی کی تعریف مشرق اور مغرب میں مختلف ہے۔ اب ہر چیز سمٹ رہی ہے۔ پاکستان اور ہندوستان کی طرز معاشرت میں بھی بڑی تبدیلی آگئی ہے۔ لوگ لاعلمیت سے نکل رہے ہیں یہ سائنس کا ثمر ہے۔ پوری دنیا ابلاغیاتی گاؤں (Communication Village) کا روپ دھار رہی ہے۔ ہزاروں کا فاصلہ گھر آنگن ہوگیا ہے لہذا ہر چیز سمٹ گئی ہے۔ اس تبدیلی کو اپنا پسند قبول کریں یا نہ کریں محسوس ضرور کرسکتے ہیں۔

سوال آپ ترقی پسند مصنفین کے پروپیگنڈہ سکریٹری تھے کبھی سجاد ظہیر سے ملنے کا اتفاق ہوا؟

جواب جی ہاں ڈاکٹر رشید جہاں کے گھر میں ان سے ملا۔ علی سردار جعفری بھی موجود تھے۔ سجاد ظہیر انتہائی شریف اور منکسر المزاج تھے۔ واقعی انہیں بے بھائی پایا۔ لکھنؤ میں منعقدہ ترقی پسند کانفرنس کی روداد صہبا اور میری ہی تحریر کردہ ہے جو بھوپال کے "افکار" میں شائع ہوئی تھی۔ پھر ۷۳ء میں "افکار" کراچی کے "سجاد ظہیر نمبر" میں اس کانفرنس کا حوالہ دیا گیا تھا۔

سوال ۱۹۵۷ء تاحال کچھ نہیں لکھا، وجہ؟

جواب انجینئرنگ کی طویل تعلیم اس کی وجہ ہے۔ سول انجینئرنگ میں ایم۔ ایس۔ سی کیا۔ بعد ازاں سرے یونیورسٹی کے لئے پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ تیار کیا۔ جس جگہ کام کرتا ہوں وہاں سے مقالہ شائع کرنے کی اجازت نہ ملی لہذا پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری سے محروم ہوں۔ تاہم ادب کا قاری ہوں۔ لندن میں میری رہائش کے زون میں چھ لائبریریاں ہیں ہر ایک سے مستفید ہوتا ہوں اور کتاب آتی ہے مطالعہ کرتا ہوں بدقسمتی سے پاکستانی افسانہ اور شاعری کی کتابیں ہندوستان کے مقابلے میں کم آتی ہے۔ ہندوستان کا نیٹ ورک مضبوط ہے کتاب پڑھنے کو مل جاتی ہے۔ پاکستان کے وہ نام جو ہمارے زمانے میں تھے۔ ان کی کتابیں مل جاتی ہیں اور بمشکل چند اور نام باقی اللہ اللہ

سوال برطانیہ میں کون کون سے قلم کار اچھا لکھ رہے ہیں؟

جواب مقصود الہی شیخ، یوسف فاروقی اچھے افسانہ نگار ہیں۔ قیصر تمکین مشرقی اور مغربی ماحول کی خوب عکاسی کرتے ہیں وہ نہ صرف اچھے افسانہ نگار ہیں بلکہ اچھے اداریہ نگار اور مبصر بھی ہیں۔ افسانوں میں مغرب کی عکاسی حیدر ملو خوب کرتے ہیں۔ خواتین افسانہ نگاروں میں بانو ارشد، شاہدہ احمد، معین الدین رضویہ، فیروزہ جعفر، فیروزہ مکرجی، صفیہ صدیقی اچھی افسانہ نگار ہیں۔ نثر نگاروں میں معین الدین شاہ اچھے نثر نگار اور نقاد ہیں۔ خواتین شعراء میں نور جہاں نوری بانو ارشد، ریحانہ خان، سیما جبار، زاہدہ طباطبائی نزہت لکھنوی اچھی شاعرہ ہیں جب کہ ساقی فاروقی نخش لائلپوری، سعید الظفر، مختار الدین احمد اور مشیر علوی اچھے شعراء ہیں۔

سوال ادھر پاکستان میں کن شعرا سے متاثر ہیں؟

جواب کسی مبالغے کے بغیر کہوں گا کہ جوش فیض، حمایت، فراز، سرشار صدیقی سے متا

ہوں۔

سوال اور بھی شاعر ہیں احمد ندیم قاسمی، منیر نیازی، قتیل شفائی، افتخار عارف، جمیل الدین عالی، محسن بھوپالی، سحر انصاری، جاذب قریشی وغیرہ وغیرہ؟

جواب سب کو میں پسند کرتا ہوں۔ ادب کا قاری ہوں لہذا پڑھتا ہوں اور رائے قائم کرتا ہوں تاہم افتخار عارف کو میں شاعر نہیں مانتا، اسے گوپی چند نارنگ زندہ کئے ہوئے ہے۔ وہ اچھا منتظم، پی۔آر۔او اور تعلقات عامہ کا فنکار ہے۔

سوال خواتین شعراء کے بارے میں کیا خیال ہے؟

جواب ادا جعفری، زہرہ نگاہ، فہمیدہ ریاض، پروین شاکر، نجمہ خان اچھی شاعرہ ہیں۔

سوال پاکستانی افسانہ نگاروں میں کس کس سے متاثر ہوں؟

جواب زاہدہ حنا کے افسانوں میں زبان اچھی استعمال ہوتی ہے۔ لیکن مفہوم واضح نہیں ہوتا۔ علی حیدر ملک مجھے پسند ہیں واقعہ نگاری کرتے ہیں، زبان سلیس اور عام فہم ہے اس کے علاوہ ادبیات پر گہری نظر ہے۔ احمد ندیم قاسمی اور ممتاز مفتی سے تو سیکھا ہے ان کے افسانے موجودہ افسانہ نگاروں کے لئے مدرسے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ بانو قدسیہ، اشفاق احمد، رفیق چوہدری، رام لعل، جیلانی بانو، ڈاکٹر شفیقہ فرحت مجھے پسند ہیں۔

سوال فردوس حیدر، امراؤ طارق، گلنار آفریں پاکستان کی جانی پہچانی اور معروف افسانہ نگار ہیں ان کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب میری بد قسمتی میں نے انہیں نہیں پڑھا۔

سوال ان افسانوں کا نام بتلائیے جن سے آپ متاثر ہوئے اور جو آپ کے نزدیک معرکۃ الآرا ہوں؟

جواب احمد ندیم قاسمی کا "سناٹا" غلام عباس کا "بارہ گھنٹے" کرشن چندر کا "شکست" ابراہیم جلیس کا "چالیس کروڑ بھکاری" اور واجدہ تبسم کا "اترن"۔

سوال آپ نے افسانے اور افسانہ نگاروں پر اتنی بات کی ایک بہت ہی چھوٹا اور ابتدائی سوال کروں گا۔ افسانہ کیا اور اس کا مقصد کیا؟

جواب ایک چھوٹی سے مکمل کہانی جو قاری کو سوچنے پر مجبور کردے یہ کسی بھی وقت لکھا جاسکتا ہے جو محسوسات اور مشاہدات کے نتیجے میں تحریر پر اکساتا ہے۔

سوال افسانے کا مستقبل کیا ہے؟

جواب افسانے کا مستقبل ختم ہورہا ہے۔ لندن میں ناول پر Bookers ایوارڈ دیا جاتا ہے۔ ۱۹۹۴ء میں ۱۳۰ ناول شائع ہوئے۔ سات ناولوں کو ایوارڈ کے لئے چنا گیا۔ لیکن کوئی بھی ناول فروخت نہیں ہوا۔ پڑھنے کی جانب خصوصاً اچھے ادب کی جانب لوگوں کا رجحان ختم ہوگیا ہے سلمان رشدی کی کتاب Midnight Children کو جیوری نے ۲۰۰۰۰ پونڈ کا ایوارڈ دیا۔ جس میں پاک و ہند کی تقسیم کی رات یعنی ۱۲ بجے رات پر ناول لکھا گیا ہے۔ میرا ناول "کروٹ" اسی موضوع پر آج سے ۴۷ سال پہلے شائع ہوا ہے اسی طرح میرے ایک افسانے پر ہندوستان میں فلم "جان پہچان" بنی جس میں راج کپور اور نرگس تھے۔ مجھے بہت بعد میں پتہ چلا کہ کسی صاحب نے میرے افسانے کا خیال چرا کر فلم بنا ڈالی جو اس وقت کی کامیاب ترین فلم تھی۔

سوال آپ کی کتابیں؟

جواب "شگاف" افسانوں کا مجموعہ جس میں ۱۷ افسانے شامل ہیں ۱۹۵۶ء میں شائع ہوئی آج کل ناول کے ارتقاء پر کام کر رہا ہوں۔

سوال پاکستان کے سیاسی تناظر میں آپ کی رائے کیا ہے؟

جواب پچھلے سال میرے ساتھ کراچی میں ایک شام منائی گئی میں نے صدارتی کلمات میں جو جملے ادا کئے وہی میری رائے پاکستان کے سیاسی تناظر میں آج بھی ہے یعنی "آج تک وہ دیوار ہی نہیں بنی جس سے قوم ٹیک لگا کر کھڑی ہوسکے"۔

ooooo

تبصرۂ کتب

○ تبصرے کے لئے ہر کتاب کی ۲ جلدیں آنا ضروری ہیں

کتاب	جگت موہن لال رواں اور ان کی شاعری
تعداد صفحات	۲۶۲
مرتبہ	محمد اشفاق عارف
پبلیشرز	ماڈرن پبلیشنگ ہاؤس نئی دہلی ۲
مبصر	ڈاکٹر ظفر قدوائی

زیر نظر کتاب محمد اشفاق عارف کا تحقیقی مقالہ ہے۔ جس پر انھیں پی ایچ ڈی کی سند ملی ہے موصوف حاورہ کے گورنمنٹ گرلس کالج میں جیسا کہ لکھتے ہیں اردو شعبہ میں اسسٹنٹ پروفیسر ہیں۔ کتاب عنوانات کے اعتبار سے آٹھ ابواب پر مشتمل ہے۔ آخر کے دس صفحات میں انھوں نے اس کا ضمیمہ تحریر کیا ہے۔ اس کے بعد موصوف کے مطالعہ میں آئی ہوئی کتابوں کی فہرست ہے۔ رواں کی داستان حیات مرتب کرنے کی کوشش میں انھوں نے عام جادہ اور جلیل قدوائی کی کتاب تذکرے اور تبصرے ہی پر اکتفا کی ہے۔ وہ تمام شواہد جو موصوف کو رواں کے افراد خاندان سے مل سکتے تھے۔ مثلاً رواں کے سب سے چھوٹے بیٹے راجیندر شنکر جو کانپور میں رہتے اور وکالت کرتے ہیں مجھلے بیٹے ہرگیان شنکر کی اہلیہ مع اپنے بیٹوں کے اناؤ میں رواں کی ہی کوٹھی میں سکونت پذیر ہیں۔ ان سے بھی رجوع کرنے کی انھوں نے ضرورت نہیں محسوس کی۔ اردو کے رسائل مثلاً زمانہ، ادیب اور ہندوستانی وغیرہ سے بھی رواں اور ان کے کلام کے بارے میں اشفاق عارف کو مفید اور گرانقدر معلومات فراہم ہو سکتی تھیں اسی طرح گل کدہ (عزیز کا شعری مجموعہ) اور تسکین سرداوی کے نام عزیز کے ایک خط سے عزیز کے شاگردوں میں رواں کے مقام اور مرتبہ کو اجاگر کیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ اسی تحقیق و تفتیش کی کمی کی بنا پر ایسے سہو اور اغلاط کتاب میں رہ گئے ہیں جو عارف کی کوششوں کو داغدار کرتے ہیں مثلاً صفحہ ۱۹ پر آخری سطر میں لکھتے ہیں۔ "سب سے چھوٹے بھائی ترلوکی ناتھ نے وکالت اختیار کی اور آگے صفحہ ۲۹ پر اٹھارویں سطر میں اپنے ہی دعوے کا بطلان یوں کیا ہے "ان کے چھوٹے بھائی ترلوکی ناتھ کانپور میں سلسلہ ملازمت مقیم تھے"۔ حالانکہ ترلوکی نے کبھی ملازمت نہیں کی۔ رواں کے ایک بھائی کا نام کرتار کرشن لکھتے ہیں جبکہ وہ کرتا کرشن تھا۔ لطف یہ ہے کہ اپنے پیش کردہ غلط نامے میں اس کی تصحیح بھی نہیں کی ہے۔

جلیل قدوائی یا کرشن سہائے ہنکاری وحشی کی روایات کو انھوں نے سند مان کر اپنے موضوع کی آبیاری کی ہے۔ حالانکہ بیشتر روایات معتبر نہیں ہیں مثلاً جلیل قدوائی نے علالت کی بنا پر آرام کرنے کا دن اتوار لکھا ہے جبکہ یہ دوشنبہ تھا۔ وحشی نے رواں کی موت کا وقت بارہ بجے لکھا ہے حالانکہ ۱۱ بجے دن میں رواں فوت ہوئے تھے۔ تکمیل مثنوی کے سلسلے میں وحشی نے جس شعر کا حوالہ دیا ہے اس کا مصرعہ ثانی "گرم گرتا تھا بساط خاک پر" لکھا ہے جبکہ رواں کے مخطوطہ میں جو راقم کے پیش نظر ہے یا مطبوعہ نقد رواں میں "کھوتا تھا گر کے فرش خاک پر" ہے۔ دونوں مصرعوں کی معنویت یا بلاغت کو دیکھتے ہوئے رواں کے آہنگ کا تجزیہ بخوبی کیا جا سکتا ہے۔ کاش مصنف نے ایسی ضعیف روایات کا یا راویوں کا سہارا نہ لے کر تحقیق کی خشک راہوں کو بھی اختیار کیا ہوتا تو بلاشبہ رواں کے ساتھ منصفی بھی ہوتی اور اس کتاب کی افادیت بھی بڑھ جاتی۔ کتاب کے تنقیدی جزو کے بارے میں نہایت صاف گوئی سے عرض ہے کہ تنقید کے دائرہ کار میں مصنف اور اس کی تصنیف کے بارے میں معلومات کی فراہمی۔ متن کے ایک سے زیادہ مخطوطوں یا مطبوعہ نسخوں کے اختلاف تحریر کی نشاندہی اور اصل متن کا تعین۔ املا، تلفظ، معنی اور مطالب اور تصنیف پر ہونے والی بحثیں سب ہی چیزیں شامل ہیں۔ کسی ایک سے صرف نظر اصول تنقید سے پہلو تہی کے مترادف ہے۔ اس طرح اس جزو میں بھی تحقیق ضروری قرار پائی ہے۔

مصنف نے رواں کی شاعری کا پورا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے ان کے محاسن شاعری پر روشنی ڈالی ہے اور ساتھ ہی ان عوامل کی نشاندہی بھی کی ہے جن سے رواں کے کلام کو جلا اور توانائی ملی تھی۔ اشعار کی چھان بین اور ان کی تدوین کرنے کے علاوہ ان کی بحروں کی عروضی حیثیت کا بھی جائزہ لیا ہے جس سے ان کی صلاحیتوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ رباعیات رواں کا جائزہ کمزور لگتا ہے حالانکہ وہ رباعی ہی کے مرد میدان تھے۔ انھوں نے ہی سب سے پہلے رباعی میں فلسفیانہ رنگ و افکار کو سمو کر ایک نئے طرز کی بنیاد ڈالی اور اسے ترقی دے کر چرخ چہارم تک پہنچا دیا۔ اس سلسلے میں اثر لکھنوی یا ڈاکٹر سلام سندیلوی کی روایات ناقابل فراموش ہیں جو موصوف سے چھوٹ گئی ہیں۔

اس کے باوجود یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ تحقیق کی ان خامیوں پر اگر ایک طرف نگاہ پڑتی ہے تو دوسری جانب اشفاق عارف کے تنقیدی شعور کا اعتراف بھی ناگزیر ہے۔ بحیثیت مجموعی اس کا معیار وہی ہے جیسا کہ آج کل یونیورسٹیوں میں تحقیق کا ہے جس کے لیے اکیلے اشفاق عارف ذمہ دار نہیں ہیں۔ طلباء کو درس دینے کے ساتھ ساتھ اگر وہ اپنے مطالعہ کو وسعت دیں تو

ان سے اچھی توقعات وابستہ کی جاسکتی ہیں - کتابت صاف اور شگفتہ ہے اس کا گیٹ اپ جاذب نظر ہے پھر بھی اردو کے اس دور انحطاط میں اس کی قیمت دو سو روپیہ زیادہ ہے -

ooooo

کتاب	بے زبانی کا ہنر (غزلیں)
شاعر	ڈاکٹر سجاد سید
صفحات	۲۰۵
قیمت	۸۰ روپئے
مبصر	کوثر مظہری

شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی ۲۵

ڈاکٹر سجاد سید کے تجربات، زندگی کی ناکامیاں اور کامرانیاں ان کے شعری سرمایہ "بے زبانی کا ہنر" میں سمٹ آئی ہیں - انھیں یہ دعوا بھی ہے

رنگ لائے گا ہماری بے زبانی کا ہنر
عام ہو گا اب یہاں آتش بیانی کا ہنر

یہ حقیقت ہے کہ جو لوگ احساس اور رمز کی زبان سمجھتے ہیں وہ بے زبانی کا ہنر بھی خوب جانتے ہیں - ڈاکٹر سجاد سید کے پاس احساس کی دھاردار زبان ہے اور اسی احساس کی زبان کو بے زبانی سے تعبیر کیا گیا ہے - اس کا رشتہ عقل سے کم دل سے زیادہ ہوتا ہے - اس لیے وہ کہتے ہیں -

محبتوں میں حلاوت کہاں سے پیدا ہو
کہ تجھ کو دل پہ بھروسہ نہیں خرد پر ہے

شاعر کے احساس کا دریچہ دل میں کھلتا ہے جہاں سے صاف ستھری ہوا در آکر فرحت بخشتی ہے -

کھولو احساس کے دریچے کو
تازہ جھونکا نئی ہوا کا ہوں

ڈاکٹر سجاد سید کی شاعری اور ان کی شخصیت کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ شائستہ اور کلاسکی شاعری کے لیے شریف النفس ہونا ضروری ہے - مگر عہد رفتہ میں جن لوگوں نے اس روایت کی پاسداری کی ان کے مزاج اور شاعری کے مابین ایسا کوئی رشتہ بطور جزولاینفک نہ تھا - سجاد سید اور ان کی شاعری دونوں میں روایتی حزم و احتیاط، واردات قلبی اور اپنے احساس کی ترجمانی میں حد درجہ اخلاقی عوامل اور متانت کی پاسداری موجود ہے، جس کی طرف

پروفیسر شمیم حنفی نے بھی اس کتاب میں شامل اپنی آراء میں اشارہ کر دیا ہے - انھوں نے تو ڈاکٹر سجاد سید کو تہذیبی و جمالیاتی زندگی کا ترجمان بھی بتایا ہے - دو شعر دیکھیں -

سارے آنسو نہ گرانا دم رخصت سید
کچھ گہر بر سر مژگاں بھی سجائے رکھنا
ستم تو کرتا ہے لیکن دعا بھی دیتا ہے
مرا حریف مجھے حوصلہ بھی دیتا ہے

ڈاکٹر سجاد سید نے اپنی آنکھیں کھلی رکھی ہیں - انھوں نے اپنے عہد کے کرب و غم سے آنکھیں نہیں چرائی ہیں - وہ حالات حاضرہ، ظلمت شب اور انسانی زندگی کے مسائل کو بھی شعری لباس عطا کرتے ہیں -

شکوہ کس سے کریں کہ حاکم وقت
نشۂ اقتدار میں گم ہے
میرا دشمن سامنے تھا کس نے پھر
پیٹھ میں گھونپا ہے خنجر دوستو
کون ہے جو نگر کا راجہ ہے
خوف کتنا ہے کتنا ڈر ہے یہاں

بعض اشعار فنی نقطۂ نظر سے مزید توجہ چاہتے تھے مثلاً صفحہ ۸۵ پر مطلع ہے -

دل کی ہر امنگ کو لفظ دو بیان دو
عشق کو حجاب کیوں عشق کو زبان دو

حجاب اور زبان کا رشتہ کچھ پلے نہیں پڑتا - اسے یوں کہہ سکتے ہیں - "عشق بے زبان کیوں عشق کو زبان دو" - زباں کے ساتھ بے زباں کو علاقہ ہے جو مستحکم اور موزوں ہے -

کہیں کہیں کتابت کی غلطیاں راہ پا گئی ہیں - بہرحال اس شعری نمونے میں ایسے اشعار کثرت سے مل جائیں گے جو دل کی گہرائیوں سے نکلے ہیں اور وہیں جاکر یہ دم بھی لیتے ہیں یعنی اثر آفرینی کی کیفیت ہے - کبھی کبھی یہ محسوس ہوتا ہے کہ ڈاکٹر سجاد سید نے جیسے "میریت" کا جام نوش فرمالیا ہو - نمونتاً اشعار ملاحظہ فرمائیں -

ہے کوئی بات کہ چپ ہیں سید
حرف اظہار رہے ہیں ہم بھی
وہ مشت خاک ہوں ہو کہ جان کی خوشبو
ہر ایک چیز کو اک دن بکھر ہی جانا ہے

سب ہٹادو مرے سرہانے سے
میر کی اک کتاب رہنے دو

ooooo

کتاب	دوہا تجلی
شاعر	شاد ماگل کوٹی
قیمت	۲۵ روپئے
صفحات	۹۶ صفحات
ملنے کا پتہ	شاد ماگل کوٹی پراناگاؤں شرالکوپہ ۵۷۷۴۲۸ ضلع شیموگہ، کرناٹک
مبصر	ممتاز الحق (نئی دہلی)

اردو کے مستقبل کے سلسلے میں سب سے امید افزا یہ حقیقت ہے کہ پچھلی دہائیوں میں اردو ادبی مراکز سے دور کافی مقبول ہوئی ہے اور ادبی لحاظ سے اہم تصانیف بھی ان علاقوں کے شعراء اور ادیبوں نے پیش کی ہیں۔ دوہا تجلی کے مصنف شاد ماگل کوٹی کا تعلق کرناٹک کے دور افتادہ خطہ شرالکوپہ سے ہے۔ شاد ماگل کوٹی نے ادبی لحاظ سے غیر علاقے میں رہتے ہوئے دوہوں کا نمونہ پیش کرنے کی جسارت کی ہے۔ اس کے لئے وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔

دوہا ہندی کی ایک معتبر صنف سخن ہے۔ مخصوص ہیئت کی وجہ سے اس کے فارم میں ترمیم و اضافے کی گنجائش نہیں کے برابر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شعراء عام طور پر اس کی طرف متوجہ نہیں ہوئے ہیں۔ شاد ماگل کوٹی نے اردو میں دوہے کی صنف سخن روایت کو آگے بڑھایا ہے۔ شاد کے دوہے فارم اور آہنگ ہر دو لحاظ سے ہندی دوہوں سے بہت قریب ہیں۔ ساتھ ہی سادگی، شائستگی اور شیرینی سے لبریز ہونے کی وجہ سے اردو کی ادبی روایت سے بھی اس کا رشتہ کافی مضبوط ہے۔ اکثر اردو شعراء نے منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے ہی دوہے لکھے ہیں ایسے میں دوہے کو مستقل وسیلۂ اظہار کے طور پر اپنانا اور اس کا نمونہ ترتیب دینا ہمت پامردی اور قادر الکلامی کا ثبوت فراہم کرتا ہے جس طرح غزل گو شعراء ہر طرح کے خیالات اور موضوعات غزل میں پیش کرتے ہیں ٹھیک اسی طرح شاد نے مختلف موضوعات اور مسائل اپنے دوہوں میں برتنے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً حمد و نعت، عشق و محبت، پند و نصائح اور روز مرہ کے واقعات اور مسائل دوہوں میں پیش کرکے اپنی مہارت اور سخن شناسی کا ثبوت دیا ہے۔ حمد و نعت سے مملو یہ دوہے دیکھیے۔

اردو شاعری میں اس کی مثالیں کم ملتی ہیں۔

جگ سے کہوں پر سائیں، تم سے کہوں نہ جھوٹ
جگ روٹھے روٹھا رہے، تم مت جانا روٹھ

دور ہوا اندھیارا، چمکا عربی چاند
شاد ستارے بڑھ گئے، اک ہی پل میں ماند

عشقیہ موضوعات پر شاد نے بڑی تعداد میں دوہے کہے ہیں۔ ان دوہوں میں ریختی کی روایت کی طرح اظہار تحت عموماً عورت کی طرف سے کیا گیا ہے اور اس میں ہندوستانی رسم و رواج کی جھلک صاف دکھائی دیتی ہے۔

دیپ جلاکر پیار کے، جاگ رہی دلیر
سجنا، سجنا کہہ رہی، گھر کی ہر اک حیر

خوشیاں دشمن ہوگئیں، لٹ ہو گیا سہاگ
سپنے سندر جل گئے، پھوٹا میرا بھاگ

اکثر شعراء کسی خاص موضوع کے اسیر ہو کر اپنے محدود دائرے سے مشکل ہی سے باہر نکلتے ہیں۔ شاد نے اپنے دوہوں میں روزمرہ کی زندگی کے مسائل کرپشن، فرقہ واریت، کالا بازاری، انسانی قدروں کی پامالی، دکھاوا، الجھنیں، کسانوں اور مزدوروں کی بدحالی وغیرہ موضوعات کو برت کر اپنے یہاں بڑی رنگارنگی اور وسعت پیدا کرلی ہے۔

گوداموں میں بند ہے، نہیں دکاں میں مال
پچھلے دوارے سب بلے، اگلے دوارے کال

دین دھرم کے نام پر، گھر گھر بھڑکی آگ
گھوم رہا پھنکارتا، کرپٹا کا ناگ

ان داتا ہے دیش کا، سب جس سے انجان
قدم قدم پر سہہ رہا، آج وہی اپمان

۴۴۰ دوہوں پر مشتمل یہ مجموعہ کتابت اور طباعت کے لحاظ سے بھی صاف ستھرا ہے۔ امید ہے قارئین اسے پسند کریں گے۔

ooooo

کتاب	کتاب صحرا
شاعر	ڈاکٹر حنیف ترین
مبصر	ڈاکٹر ظفر عمر قدوائی

کتاب صحرا حنیف ترین کی نظموں پر مشتمل دوسرا شعری مجموعہ ہے

اس سے قبل موصوف اپنی غزلوں کی اشاعت "رباب صحرا" کے نام سے کرچکے ہیں۔

یوں تو حنیف ترین پیشے کے لحاظ سے ڈاکٹر ہیں لیکن ادبی ماحول سے بظاہر الگ تھلگ رہتے ہوئے شعر و سخن سے ان کی وابستگی ان کے گھریلو علمی اور ادبی ماحول کی دین کہی جاسکتی ہے۔

حنیف ترین کی نظمیں ان کے جذبہ و احساس سے پیدا شدہ کرب اور ان کی ذہنی ناآسودگی کا نتیجہ ہیں۔ دیار عرب میں رہتے ہوئے انھیں وطن اور اقرباء سے دوری کا قلق تو ہے ہی اس کے علاوہ عرب میں ان کے گرد و پیش یہاں کے مسائل نیز کائنات کے سبھی مناظر ہیں ہر سمت پھیلی ہوئی بے راہ روی اور طوائف الملوکی قوم و قبائل کے باہمی تنازعات۔ ایٹمی جنگ اور اس کے نتائج۔ جدید سائنسی آلات حرب اور ان کی تباہ کاریاں، عہد نو کے جنگویانہ رقص یہ ان کے لیے وجہ نشاط نہیں بلکہ اس سے ان کی تڑپ اور بڑھتی ہے۔ نظم "صحرا" اور "دوری" میں زندگی کی اسی بے چینی کا اظہار ہے اس کے علاوہ کہیں رت جگے اور تنہائی کا دکھ ہے تو کہیں لمس کی آنچ کی سوزش اس لیے سیم و زر کی سیکراں کھنک اور بہتات ان کو مسحور نہیں کرتی بلکہ اسے وہ محض فریب اور عہد نو کے ہر منظر کو التہاب قرار دیتے ہیں۔ ایسے ماحول میں جو نکہ وہ کوئی کشش نہیں پاتے اس لیے اسے ویرانے کا نام دیتے ہیں۔

سوچ بھری ہوئی
جو خیالوں میں تھی وہ جھلک چھن گئی
دل کی دمسار ہیں صرف ویرانیاں
تلخ ویرانیاں

ایسے مناظر میں حنیف ترین اپنا نظریہ یوں پیش کرتے ہیں۔

دھوپ سے پہلے اوروں میں   پھول سے پیار کی شبنم بانٹ
رونے دھونے والوں میں   سات سروں کے سرگم بانٹ

قول و عمل کے تضاد یا فرائض سے کوتاہی کے وہ محض خاموش تماشائی نہیں۔ خواہ طلباء ہوں یا حکام دونوں کی رگہائے غفلت پر اپنے طنز سے نشتر زنی بھی کرتے ہیں۔ یہاں تک دیوتاؤں کو بھی نہیں بخشتے۔

دیوتا نے سما کے مندر کو   خون کی بھینٹ لی خدائی کی

ہندوستاں کے پھل پرندے، موسم اور اس کی نیرنگیوں کے اذکار اور ان سب کے لیے ان کی للک موصوف کی حب الوطنی کا ثبوت فراہم کرتی ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ کسی غیر ملکی زبان کے طرز کو ہو بہو اختیار کرنا ممکن نہیں ہے اس لیے کہ ہر زبان کا اپنا ایک الگ مزاج اور لب و لہجہ ہوتا ہے جس کو بعینہ اردو میں داخل نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے باوجود جاپانی صنف ہائیکو جو ردیف و قافیہ سے مبرا تین مصرعوں کی نظم ہوتی ہے اس طرز میں بھی حنیف ترین نے کامیاب نظمیں اور حیات انسانی کے بولتے ہوئے مرقع بھی کھینچے ہیں جو لائق ستائش ہیں۔ ان کے خیالات میں تنوع اور ندرت اور فکر میں گہرائی ہے وہ اپنی مختلف حسیات کو لفظوں کا پیکر عطا کرنے کے فن سے پوری طرح واقف ہیں۔ ان کی نظموں کا خاص وصف غنائیت ہے۔

ایام طفولہ   درپن بڑھاپے کا   عقیدت

کچی عمر کیا جانے   عمر کی ڈھلانوں پر   سلگتی ریت پر صحرا میں کوئی
تتلیوں کا میلہ ہے   قہقہہ خموشی ہے   ہے مصروف عبادت دھوپ اوڑھے
خواب کی دو کانوں پر   اور اندھیرا جیوتی ہے   عقیدت میں بگولے ناچتے ہیں

حنیف ترین نوجوان ہیں اور ابھی ان کے ادبی سفر کی شروعات ہے۔ پھر بھی ان کی نظموں میں ان کی فنکاری اور انفرادیت جھلکتی ہے۔ اگر اسی طرح مشق سخن جاری رہی تو ان سے مستقبل کے نظم گویوں کو ایک نئی سمت اور ہموار راہ ملنے کی امید ہے۔ سرورق عرب کی صبح اور طلوع آفتاب کا دیدہ زیب منظر پیش کرتا ہے۔ کتابت صاف ستھری ہے۔ اور قیمت بھی کچھ زیادہ نہیں ہے۔

(XXXX)

کتاب	غبار احساس" (شعری مجموعہ)
شاعر	قاضی حسن رضا
صفحات	۱۲۸
قیمت	۵۰ روپے
تقسیم کار	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی ۲۵
مبصر	**افضال عاقل**

قاضی حسن رضا کا شمار اردو کے معتبر شعراء اور اچھے صحافیوں میں ہوتا ہے۔ ان کی ادبی صلاحیتوں کو بیدار کرنے میں مرحوم حسن نظیر اور ڈاکٹر مظفر حنفی کا مکمل تعاون رہا ہے۔ بعد ازاں ان کے استاد احسان الحمید نے اس "ادبی ذوق" کو پائیدار بنایا اور کھنڈوا کے کہنہ مشق شاعر سید ضیاء الدین ضیاء کی شفقت اور اصلاح نے ایک باکمال شاعر بنادیا۔

"غبار احساس" کی غزلیں عصری حسیت اور سماجی معنویت کی ترجمان

ہیں نیز روایت اور جدیدیت کا خوبصورت مرقع بھی ہیں - اشعار میں قاضی صاحب کا منفرد لب و لہجہ اور دلکش انداز بیان نظر آتا ہے - اس مجموعے کے اشعار دل کی گہرائی میں دبے ہوئے احساسات، جذبات اور تجربات ہیں جو لفظوں کی صورت میں نکھر گئے ہیں -

"غبار احساس" کے شاعر کو نئی فکر کو سلیقے سے برتنے اور روایت کی قید سے آزاد رہنے کا سلیقہ معلوم ہے - "نئی فکر" کے تعلق سے ایک شعر ملاحظہ فرمائیں -

کوئی نام و نسب باقی نہیں ہے
کسی گھر میں ادب باقی نہیں ہے

شاعر کو "روایت اور جدت" کو ساتھ لے کر چلتا ہے لیکن غزل کہنا آسان نہیں ہے اس کا احساس بھی ہے -

غزل کہنا کوئی آساں نہیں لیکن رضا تم بھی
روایت اور جدت کو ملاکر ساتھ چلتے ہو

حسن رضا کے یہاں "انا" کا استعمال بھی خوب ہے -

اپنی انا سے برسر پیکار میں ہی تھا
میدان کارزار میں تلوار میں ہی تھا

مری شدت نے میری انتہا نے
لیا تنہا مجھے میری انا نے

کرتے تھے جنگ اپنی انا کے خلاف جو
اس دور کے شہیدوں کے لشکر عجیب تھے

اس شعری مجموعے کا مطالعہ قارئین کو بصیرت و مسرت سے ہمکنار کرے گا -

(ززز)

کتاب	زنجیر بجائی جائے (شعری مجموعہ)
شاعر	انوار احمد قریشی نشتر آکولہ
صفحات	۱۶۸
قیمت	۵۰ روپے
ملنے کا پتہ	انوار احمد قریشی نشتر
	مومن پورہ آکولہ (۴۴۴۰۰۱)
مبصر	قاضی حسن رضا - قاضی پورہ

یہ آکولہ کے کہنہ مشق اور ہردلعزیز شاعر انوار نشتر کا عمر بھر کا تخلیقی اثاثہ ہے - کتاب سامنے آتے ہی مشہور آرٹسٹ شکیل اعجاز کے معجزنما، معنی خیز اور دلکش سرورق پر نظر پڑتی ہے - اور زبان سے بے ساختہ واہ نکل جاتی ہے - مضبوط جلد کے اندر محفوظ نہایت قیمتی، دیدہ زیب اور سفید کاغذ پر بے داغ کتابت بڑا جلی، روشن اور دیدہ زیب طباعت -

ایک حمد، نعت، اکیاسی غزلیں دو آزاد اور دو پابند نظمیں نیز چار گیت شامل ہیں - مشمولات پر ایک سرسری نظر ڈالتے ہی نشتر صاحب کی قادر الکلامی اور شاعری کی کم و بیش تمام مروجہ اصناف پر ان کی مکمل دسترس کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے - بنیادی طور پر نشتر کا طبعی میلان اور تخلیقی رجحان غزل سے ہم آہنگ ہے - جس کا ثبوت مجموعے میں شامل صحت مند اور لازوال روایت کے ساتھ ساتھ عصری حسیت، سماجی معنویت اور جدیدیت کے خوبصورت اور دلکش امتزاج سے معمور ان کی غزلیں ہیں - اور ہر غزل میں دو تین شعر ایسے ضرور مل جاتے ہیں - جن پر نظر تھم جاتی ہے اور جو نشتر کو ایک کامل فن شاعر ثابت کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی تخلیقی شناخت کو استحکام عطا کرتے ہیں -

نشتر صاحب کی شاعری پر اظہار خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر محبوب راہی نے اپنے پیش لفظ میں لکھا ہے "نشتر" نے بیش تر زندگی کے زیر اثر روایت سے یکسر انحراف نہیں کیا - بلکہ روایت اور جدیدیت کی خوشگوار اور دلکش آمیزش سے لازوال فن پارے تخلیق کئے ہیں - حسن و عشق کے فرسودہ مضامین اور گل و بلبل کی بوسیدہ علامتوں اور ترکیبوں سے کنارہ کشی کا جواز ان کے پاس ہے - ساتھ ہی وہ تخلیقی شعر کی نزاکتوں، فکر و تخیل کی نکتہ آفرینیوں اور فنی باریکیوں اور ضرورتوں پر بھی نظر رکھتے ہیں - اس لئے مجموعہ خرید کر پڑھنے کی سفارش کی جاسکتی ہے -

○ احوال و اخبار

تسنیم کوثر کے افسانوی مجموعہ

"بونسائی" کا پٹنہ میں اجراء

اردو بورڈ کے زیر اہتمام پچھلے دنوں بہار اردو اکیڈمی کے کانفرنس ہال (پٹنہ) میں نئی نسل کی نمائندہ افسانہ نگار محترمہ تسنیم کوثر کے افسانوی مجموعہ "بونسائی" کا اجراء ممتاز نقاد اور بہار اسٹیٹ یونیورسٹی سروس کمیشن کے چیرمین ڈاکٹر وہاب اشرفی کے ہاتھوں انجام پایا۔ تقریب کی صدارت دوردرشن کیندر پٹنہ کے نیوز ایڈیٹر جناب ضیاء الدین احمد نے کی اور مشہور افسانہ نگار محترمہ ذکیہ مشہدی نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی۔ اس تقریب میں مختلف شعبہ ہائے حیات سے تعلق رکھنے والے ممتاز دانشوروں کے علاوہ بڑی تعداد میں یونیورسٹی اساتذہ، طلباء اور خواتین نے شرکت کی۔

ڈاکٹر وہاب اشرفی نے کہا کہ افسانے کا لازمی عنصر جامعیت اور اختصار ہے جو تسنیم کوثر صاحبہ کے افسانوی مجموعہ "بونسائی" میں موجود ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس مجموعے کی بنیادی خوبی یہ ہے کہ اس میں عشق اور رومان کی ... سے ہٹ کر مسائل کے گرد کہانیوں کا تانا بانا بننے کی کوشش کی گئی ہے ... موجودہ معاشرہ جن مسائل سے دوچار ہے ان پر بھرپور ضرب لگائی گئی ہے ... اس مجموعہ کی کہانی "ملبہ" میں بہت ہی خوبصورتی کے ساتھ سوشل جسٹس ... کھوکھلے نعرے کا بخیہ ادھیڑا گیا ہے دراصل یہ مجموعہ آج کے المیے پر مبنی ہے۔

بزرگ افسانہ نگار اور بہار اردو اکادمی کے وائس چیرمین جناب احمد ... نے تسنیم کوثر کی زبان کی خصوصی طور پر تعریف کی۔ ان کے افسانوں میں فارسی اور ہندی کے تراکیب اور اشعار جابجا ملتے ہیں۔ اشعار کی روایت کو ... عین حیدر نے بھی روا رکھا تھا۔ اس سے ترسیل میں آسانی ہوتی ہے۔ ... نے کہا کہ تسنیم کوثر کے افسانوں میں بصیرت ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے ... سماجی مسائل کے متعلق وہ سوچتی ہیں۔ ان کی کتاب "بونسائی" بہت ... صورت اور بہت اچھی چھپی ہے۔

ممتاز افسانہ نگار اور شاعر اور بہار پبلک سروس کمیشن کے ممبر جناب ... مشہدی نے کہا کہ تسنیم کے افسانوں میں عصری حسیت اور کردار نگاری ... بدرجہ اتم موجود ہیں مثلاً "بونسائی" صرف اقدار کی شکست و ریخت کا نوحہ نہیں ہے اس میں موجودہ میکانکی دور کے تقاضوں کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔ محترمہ ذکیہ مشہدی نے اپنی فکر انگیز تقریر میں کہا کہ لوگ خواتین افسانہ نگاروں کو ایک علیحدہ خانے میں رکھنے کے قائل ہیں آپ جب کسی کی افسانہ نگاری کی قدر کا تعین کریں گے تو اس وقت جنس کے اعتبار سے الگ الگ معیار نہیں مقرر کئے جائیں گے البتہ کچھ اوصاف ضرور ہیں جو خواتین کی تحریروں کے ساتھ وابستہ کئے جاسکتے ہیں۔ ذکیہ مشہدی نے کہا میں نے اس مجموعے کے سبھی افسانے بغور پڑھے ہیں۔ یہ نہیں کہوں گی کہ وہ سب کے سب شاہکار ہیں لیکن ان میں کوئی بھی غیر معیاری اور گھٹیا افسانہ شامل نہیں ہے نہ ہی کسی ایک موضوع کو کئی افسانوں میں رگڑا گیا ہے۔ "لوٹ پیچھے کی طرف، پارس، ملبہ، گردش ایام" کئی افسانے ایسے ہیں جو ان کے پہلے افسانے "بونسائی" کے ہم پلہ ہیں۔ ایک افسانہ ہے دو مین اس میں موضوع اچھوتا نہیں ہے اور فکر کی گہرائی بھی نہیں ہے لیکن دلچسپ اور اثرانگیز ہے۔ ایک افسانہ مجھے سپاٹ محسوس ہوا اور وہ ہے ادھورے خواب۔ انھوں نے آگے کہا کہ خواتین کی زبان ہر طبقے اور ہر دور میں مردوں کی زبان سے ذرا مختلف رہی ہے۔ ان کے ڈکشن کی اپنی دلکشی ہے اور اپنی الگ کاٹ۔ اس کے علاوہ دوسری چیز ہے دردمندی۔ تسنیم کے یہاں ایک عورت کی بنیادی دردمندی اور زبان دونوں آشکارا ہیں۔ محترمہ ذکیہ مشہدی نے آخر میں کہا کہ خواتین کے ذیل میں ایک پریشانی کی بات یہ ہے کہ وہ پھلجھڑی کے مثل تیزی کے ساتھ جل کر بجھ جاتی ہیں۔ بہار کی خواتین میں صرف شکیلہ اختر ایسی دکھائی دیں جو مستقل مزاجی سے آخر آخر تک لکھتی رہیں۔ تسنیم کے تیور ویسے ہی نظر آرہے ہیں۔ یہ جتنی فعال ہیں اور جس مستقل مزاجی کے ساتھ لکھ رہی ہیں اس سے امید ہے کہ شعلہ درمیاں میں ہرگز نہیں بجھے گا۔ ان کا یہ مجموعہ اردو ادب کے لئے ایک نیک فال ہے۔

بہار اردو اکیڈمی کے سکریٹری اور افسانہ نگار جناب مشتاق احمد نوری نے مجموعے میں شامل مختلف کہانیوں کا نہایت خوبصورت تجزیہ پیش کیا۔ انھوں نے کہا "بونسائی" اس مجموعے کی شاہکار کہانی ہے۔ جناب نوری نے کہا کہ آج کی کہانیوں کا فقدان یہ ہے کہ ہم صرف شہروں کی کہانیاں لکھتے ہیں۔ فنیشور ناتھ رینو کو آنچلک کتھاکار کہا گیا تھا اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ اس کے کیریکٹرس دیہاتی تھے۔ تسنیم کوثر کی بیشتر کہانیوں میں آنچلک کتھا کی روایت زندہ ہے اور میں یہ دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ گاؤں کے ماحول کو اور کردار کو یہ جس خوبصورتی سے پیش کرتی ہیں اگر یہ روایت قائم رہی تو ایک اہم آنچلک کتھاکار کے روپ میں تسنیم کوثر کا بھی نام آئے گا۔

بہار انٹرمیڈیٹ کونسل کے چیرمین اور شعبہ نباتات کے پروفیسر ایم۔ او۔ صدیقی نے ہوتسائی کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ علم نباتات کے موضوع کو تسنیم کوثر نے جس خوبصورتی سے اپنی کہانی میں پیش کیا ہے اس سے مجھے حیرت ہوئی ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہم نے یہ تکنیک ایجاد کی لیکن اس کا مفہوم جس انداز سے تسنیم کوثر نے پیش کیا اس سے یہ لگتا ہے کہ اس کا صحیح مفہوم ہم نے آج ہی سمجھا ہے۔

اپنے صدارتی خطبہ میں جناب ضیاء الدین احمد نے کہا کہ تسنیم کوثر اتنی اچھی کہانیاں لکھ سکتی ہیں اس کا احساس مجھے ان کا افسانوی مجموعہ پڑھ کر ہوا۔ اس موقعہ پر محترمہ تسنیم کوثر نے اپنی فکر انگیز کہانی گردش ایام سنائی۔ محترمہ امیس فاطمہ صدر شعبہ اردو پٹنہ یونیورسٹی اور جناب شکیب ایاز نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ نظامت اردو بورڈ کے کنوینر ڈاکٹر ریں رامش۔ استقبالیہ تقریر جناب احمد بدر اور شکریہ کی رسم محبوب اقبال نے ادا کی۔

(××××)

سلطانہ مہر اور منظر شہاب کے اعزاز میں اردو فاؤنڈیشن کا جلسہ و نثری نظم پر مذاکرہ

نوئیڈا اردو فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام لاس اینجلس (امریکہ) سے آئی ہوئی ادیبہ و شاعرہ محترمہ سلطانہ مہر اور عظیم آباد سے آئے ہوئے مشہور شاعر منظر شہاب کے اعزاز میں خصوصی جلسہ منعقد کیا گیا۔ صدارت شاعر طراج کومل نے کی۔ ابتدا میں اردو فاؤنڈیشن کے کنوینر جناب رفعت سروش نے ادارہ کی سرگرمیوں اور مہمانان خصوصی کا تعارف کرواتے ہوئے کہا کہ اردو فاؤنڈیشن گزشتہ دس سال سے فعال ہے اور ادب و ثقافت کے اہم موضوعات پر مذاکرے منعقد کرتا رہا ہے۔ انھوں نے کہا کہ آج نثری نظم کے موضوع پر تبادلہ خیال ہوگا۔

مہمان خصوصی محترمہ سلطانہ مہر کا تعارف کرواتے ہوئے انھوں نے فرمایا کہ سلطانہ مہر ہمہ جہت ادیبہ ہیں۔ ان کے کئی ناول منظر عام پر آچکے ہیں ہم عصر شعرا و شاعرات پر انھوں نے تذکرے تالیف کئے ہیں اور اس کے علاوہ وہ کراچی سے خواتین کا ایک رسالہ "روپ" بڑے آب و تاب سے نکالتی رہی ہیں اور انھیں ایک مشہور اخبار روزنامہ جنگ میں کالم نگاری کا بھی فخر حاصل ہے۔ گزشتہ پانچ سال سے وہ لاس اینجلس (امریکہ) منتقل ہو چکی ہیں جہاں ان کی ادبی اور تخلیقی سرگرمیوں کا دائرہ وسیع تر ہو گیا ہے۔

جناب منظر شہاب کا تفصیلی تعارف جناب مظہر امام نے کرایا کہ وہ انجمن ترقی پسند مصنفین کے اہم رکن رہے ہیں۔ پٹنہ اور جمشید پور میں انھوں نے ترقی پسند تحریک کے فروغ کے لئے بہت کام کیا ہے۔ وہ ماہر تعلیم بھی ہیں اور مشہور شاعر ہیں۔

نثری نظم پر گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے رفعت سروش نے سید سجاد ظہیر اور خورشید الاسلام اور طراج کومل کی نثری نظموں کا خاص طور پر ذکر کیا اور کہا کہ یہ صنف ادب ابھی اردو میں اپنا کوئی مقام نہیں بنا سکی ہے اگرچہ ہندی اور دنیا کی مختلف زبانوں میں نثری نظم کا چلن عام ہے۔ انھوں نے اس موضوع پر اظہار خیال کے لئے جناب ابوالفیض سحر کو دعوت دی۔ انھوں نے کہا نثری نظم اردو میں ہنوز ایک تجربہ ہے اور اس کے مستقبل کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنا قبل از وقت ہوگا۔ ڈاکٹر شبانہ نذیر نے بحث میں حصہ لیتے ہوئے کہا کہ ہم جب کوئی نظم کہتے ہیں تو اس کا دھندلا سا خیال پہلے ہمارے ذہن میں آتا ہے۔ بعد میں اس خیال کو شاعری کے بندھے ٹکے اصولوں میں پیش کیا جاتا ہے۔ جناب مظہر امام نے نثری نظم ابتدا اور ارتقا پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ آج آزاد نظم ایک صنف کے طور پر اردو میں قائم ہو چکی ہے۔ جب کہ نثری نظم کو ایسا کوئی درجہ نہیں مل سکا۔ مختلف ادوار میں نثری نظم مختلف ناموں سے لکھی جاتی رہی ہے۔ جیسے "نثر لطیف" یا [illegible] لیکن اردو میں اس صنف کو مقبول ہونے میں ابھی وقت لگے گا۔ [illegible] نے اپنی شاعری کے حوالہ سے نثری نظم کے تجربوں پر روشنی ڈالی اور کہا میری تربیت شعر فہمی کی حد تک ہی نہیں مجھے عصری ادبی رسائل کے مطالعہ سے بھی شاعری کا شوق پیدا ہوا اور میں نے جو آہنگ اپنی شاعری میں [illegible] میں مغربی شاعری کے مطالعہ کا بھی کافی دخل ہے۔ تجربہ کے طور پر میں نے کچھ نظمیں نثر کے فارم میں لکھیں اور پھر انھیں آزاد نظم کی شکل دی اور اس نتیجہ پر پہنچا کہ خیال کی آمد کے ساتھ ہر نظم اپنی ہیئت خود طے کرتی [illegible]

اس سیر حاصل گفتگو کے بعد شعر و شاعری کا دور شروع ہوا۔ جس میں شعرائے کلام سنایا رفعت سروش، ملک زادہ جاوید، ڈاکٹر شبانہ [illegible] عشرت کرت پوری، ابوالفیض سحر، ڈاکٹر سجاد سید، کیلاش ماہر، [illegible] الدین، نعمان شوق، مشرف عالم ذوقی، سید ضمیر دہلوی، ذکی طارق [illegible] مظہر امام، بی بی سرایو ستو رند، منظر شہاب، سلطانہ مہر۔

شیخ سلیم احمد، ڈاکٹر رضیہ حامد، شمع افروز زیدی، ریحانہ [illegible] رہت، ڈاکٹر جگموہن نے خاص طور پر شرکت کی۔

مرسلہ سید جاوید زیدی (نوئیڈا)

ooooo

اولڈ بوائز علی گڑھ کا
آل انڈیا مشاعرہ کامیاب رہا

نئی دہلی میں اولڈ بوائز علی گڑھ کا پہلا آل انڈیا مشاعرہ، فکّی آڈی ٹوریم میں شان و شوکت سے پروفیسر شہریار کی صدارت میں منعقد ہوا۔ پروفیسر عنوان چشتی مہمان خصوصی تھے۔ ان حضرات کے علاوہ اس میں نفیس غازی پوری، منظور ہاشمی، ڈاکٹر شہپر رسول، ڈاکٹر اسعد بدایونی، اسد رضا، عمران عظیم (ایڈوکیٹ) اسلم چشتی ڈمائیوی، سکندر عاقل، نظر برنی، نور جہاں ثروت، تہمار ندیم، مخمور سعیدی، ثریا رحمان، مظہر امام، عادل حیات وغیرہ اور دوسرے بہت سے شاعروں نے کامیابی کے ساتھ مشاعرے کے سامعین کو اپنے کلام سے محظوظ کیا۔ ابتداء میں پیغام آفاقی (آئی پی ایس) نے ایک جامع تقریر کی۔ اور نظامت کا سلسلہ شروع کیا۔ سبھی شعراء نے کامیابی حاصل کی۔ عنوان چشتی نے البتہ اپنی کامیابی کا نیا ریکارڈ اس مشاعرے میں بنایا۔

مرسلہ عادل (دہلی)

ooooo

انوار نشتر کے شعری مجموعے کا
اجراء اور مشاعرہ

اکولہ کے کہنہ مشق شاعر انوار احمد نشتر قریشی کا اولین شعری مجموعہ "رہبر جانی جائے" حال ہی میں مہاراشٹر اردو اکاڈیمی کی جزوی مالی اعانت سے نہایت اہتمام اور سلیقے سے چھپ کر منظر عام پر آگیا ہے۔ پچھلے دنوں اس کے اجراء کے سلسلے میں ایک باوقار ادبی تقریب کا انعقاد عمل میں آیا۔ تقریب کی صدارت علاقہ ودربھ کے بزرگ اور مستند شاعر الحاج غلام حسین راز بالاپوری نے فرمائی۔ جب کہ شعری مجموعے کا اجراء خان محمد اظہر حسین۔ ایم۔ ایل۔ سی (سابق وزیر مملکت حکومت مہاراشٹر) کے دست مبارک سے عمل میں آیا۔ ڈاکٹر الحاج غلام جعفر خاں صاحب، ڈاکٹر الحاج محمد سالک صاحب اور ڈاکٹر بیرالال سایانی صاحب مہمانان خصوصی تھے۔ معززین شہر کی ایک کثیر تعداد نے شرکت کی۔

خان محمد اظہر حسین صاحب نے اجراء کی رسم انجام دیتے ہوئے انوار نشتر کی شخصیت اور شاعری کے مختلف پہلوؤں پر متاثر کن انداز میں روشنی ڈالی۔ ساتھ ہی حضرت راز بالاپوری نے نشتر صاحب کی شاعری کے فنی پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہوئے نہایت فکر انگیز مقالہ پڑھا۔ انوار نشتر کے خیر خواہوں نے کتاب کی چند جلدیں اعزازی رقمیں دے کر حاصل کیں۔ اسٹوڈنٹس رائٹس موومنٹ آکولہ کی جانب سے جاوید عزیزی اور ان کے ساتھیوں نے انوار نشتر کو ایک خوبصورت شال اور ہار پھول پیش کر کے ان کا اعزاز کیا۔ راز بالاپوری کی صدارت میں ایک عظیم الشان مشاعرے کا انعقاد عمل میں آیا جس میں کئی بیرونی و مقامی شعرائے شرکت فرمائی۔

مرسلہ جاوید، عزیزی (آکولہ)

ooooo

کلچرل اکیڈیمی جموں و کشمیر کی جانب سے
جگن ناتھ آزاد کی عزت افزائی

اکیڈیمی آف آرٹس کلچر اینڈ لنگویجز جموں و کشمیر نے جگن ناتھ آزاد کے اعزاز میں ایک سادہ و پروقار تقریب منعقد کی جس کی صدارت گورنر جموں و کشمیر کے ایڈوائزر شری بی۔ کے۔ گوسوامی نے کی۔

یہ تقریب جگن ناتھ آزاد کے زندگی بھر کے علمی اور ادبی کاموں کے پیش نظر منعقد کی گئی جس میں عمال حکومت اور سیاسی رہنما کے علاوہ ریاست کی تمام زبانوں کے مقتدر شعراء، ناقدین اور دوسرے اہل قلم حضرات نے شرکت کی۔ اس موقعے پر پروفیسر جگن ناتھ آزاد کی نظم و نثر پر مشتمل ان تمام دستیاب تصنیفات اور تالیفات کے علاوہ ان کتابوں کی بھی نمائش منعقد کی گئی۔ جو جگن ناتھ آزاد کے متعلق لکھی گئی ہیں۔ اسی طرح وہ رسائل بھی نمائش میں شامل تھے جن کے جگن ناتھ آزاد کے متعلق گوشے شائع ہوئے ہیں۔ ان کتابوں میں جگن ناتھ آزاد کے نعتیہ کلام کے ڈاکٹر حمید اللہ کے کیے ہوئے منظوم فرانسیسی ترجمے پر مشتمل وہ کتاب بھی شامل تھی جو پیرس سے شائع ہوئی ہے۔

تقریب کے صدر شری بی۔ کے۔ گوسوامی نے کہا کہ آزاد نے اپنی شاعری اور نثر دونوں کے ذریعے صرف اردو زبان و ادب ہی کی نہیں بلکہ ملک و قوم کی بھی خدمت کی ہے۔ ان کی شاعری نے جو بقول فراق "ایک دکھے ہوئے

دل کی پکار ہے"۔ ہندوستان اور پاکستان میں ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑنے کی کوشش کی ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے آزاد کی طویل نظم "وطن میں اجنبی" کا خاص طور سے ذکر کیا۔ ڈاکٹر ظہور الدین صدر شعبۂ اردو، جموں یونیورسٹی نے جگن ناتھ آزاد کی شخصیت، ادبی خدمات اور فلسفیانہ بصیرت پر ایک پر مغز مقالہ پیش کیا جس میں انھوں نے اس نکتے پر زور دیا کہ آزاد کی شاعری اور نثر دونوں دل کشی کی حامل ہیں۔ اور اس لئے ان کے مجموعہ ہائے کلام اور نثری تصانیف کے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں لیکن ان کی شاعری اور نثر کی اس دلکشی اور دل آویزی کے پیچھے جو فلسفیانہ بصیرت پنہاں ہے اس کی طرف نقادوں نے پوری طرح توجہ نہیں کی۔ دلکشی اور فلسفیانہ بصیرت کا یہ امتزاج آزاد کو اردو کے اہم شاعروں کی صف میں لے آتا ہے۔ ڈاکٹر ظہور الدین نے پروفیسر آزاد کے ساتھ تیس سالہ قربت کی بنا پر ان کی شخصیت اور کردار کے متعدد پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ جگن ناتھ آزاد دنیا بھر میں اردو کے سفیر ہیں۔ پھر بھی عالمی مقبولیت نے ان کے دل میں کوئی غرور کی کیفیت پیدا نہیں کی بلکہ انھیں سر سے پاؤں تک حلیمی اور انکسار کا پیکر بنا دیا ہے۔

اکیڈمی کے سکریٹری بلونت ٹھاکر نے جلسۂ اعزاز کا افتتاح کرتے ہوئے کہا جگن ناتھ آزاد کی نظم و نثر کی بدولت ریاست جموں و کشمیر کا نام دنیا کے علمی اور ادبی نقشے پر ایک مستقل مقام حاصل کر چکا ہے۔ اکیڈمی کی جانب سے شری بی۔ کے۔ گوسوامی نے پروفیسر آزاد کو شال پیش کی اور ان کی گل پوشی فرمائی۔

مرسلہ محمد اسد اللہ والی

(XXX)

ناروے کی راجدھانی اوسلو کی طرف سے جمشید مسرور کو ۱۹۹۶ء کا ایک لاکھ روپے کا ثقافتی انعام برائے ادب

دنیا بھر کے اردو داں حلقوں میں یہ خبر نہایت خوشی سے سنی جائے گی کہ شہر اوسلو کی طرف سے امسال سالانہ ثقافتی انعام برائے ادب جمشید مسرور کو دیا گیا ہے۔ ۹۔ جون کو اوسلو کے لارڈ میئر جناب PER DITLEV–SIMONSEN نے سٹی ہال کے ایک بارونق اجتماع میں جمشید مسرور کو اس ایوارڈ سے نوازا۔

ان انعامات کا سلسلہ ۱۹۲۹ء میں شروع کیا گیا تھا۔ تقسیم انعامات کے بعد جمشید مسرور کو اظہار خیال کے لئے منتخب کیا گیا۔ جمشید مسرور نے نارویجین زبان میں اپنی تقریر کے ہلکے پھلکے مزاح سے محفل کو کشتِ زعفران بنا دیا۔

جاری کردہ۔ طاہر خان، جنرل سکریٹری
ایشین آوٹس کونسل انٹرنیشنل (اوسلو)

آپ کی ڈاک (قارئین کے خطوط)

مراسلہ نگار کی رائے سے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے

"گنگا کو واپسی" ۵۸ ہزار روپئے میں

○ اس بار میرا کلکتہ کا چکر بہت مختصر رہا۔ یہ ایک اور سلسلے میں تھا اس لئے آپ سے ملاقات بھی مختصر رہی۔ معذرت خواہ ہوں کہ میری وجہ سے آپ چاہنے کے باوجود میرے لئے وہ کچھ نہ کرسکے جس کی طرف آپ نے فون پر بار بار اشارہ کیا تھا۔ پھر بھی آدھی شام جو آپ کے ساتھ گزری، خوب گزری۔ آپ کا دفتر دیکھا۔ آپ کی ترقی دیکھی۔ دل خوش ہوگیا۔

اب آپ کو اپنی ایک کہانی "گنگا کو واپسی" کی کہانی سناتا ہوں۔ کہانی تو "گھوڑے کا کرب" بھی بہت مشہور ہوئی ہے مگر فی الحال صرف اس کی سنیے اور خود ہی موازنہ کیجئے کہ ہم کہاں کھڑے ہیں اور کتنا پیچھے کھڑے ہیں۔

یہ افسانہ میں نے 1986ء میں لکھا تھا جو اردو میں "شاعر" بمبئی کے شمارہ نمبر گیارہ 86ء میں اردو کی نئی بستیاں نمبر میں شائع ہوا تھا۔ ہندوستان کی ایک بہت بڑی پنجابی ادیبہ نے جنہیں اس کی شہرت سنی تو خاص طور پر اپنے رسالے کے لئے مجھ سے مانگ لیا تھا اور میں نے اس شرط پر بھیج دیا تھا کہ چھپنے پر مجھے رسالے کی کاپی ضرور بھجوائی جائے گی۔ افسانہ شائع ہوا مگر پھر وہی ڈھاک کے تین پات، رسالے کی ایک کاپی تک کو ترستا رہا۔ آخر جب خود انڈیا گیا تو محترمہ کے ہاں حاضر ہوکر رسالے کی ایک کاپی حاصل کرسکا۔

یہ افسانہ آپ نے انشاء کے عظیم الشان "اسکنڈے نیویائی ادب نمبر" میں میرے گوشے میں بھی شامل کیا ہے۔ اب ذرا ادھر کی سنو۔ پہلے پہل جب ایک نارویجین ادیبہ نے انگریزی میں سنا تو فوراً اپنے ہفت روزہ رسالہ Familien (The Family) کے لئے مانگ لیا اور نارویجین میں ترجمے کے بعد دو ستمبر 86ء کی اشاعت میں شائع کردیا۔ اور رسالے کی دس کاپیوں کے ساتھ 3200 کرونر بطور معاوضہ پیش کئے۔ یہی افسانہ پھر میں نے نارویجین رائٹرس سنٹر کی منعقدہ سالانہ تقریب Book Day میں پڑھا اور 800 کرونے بطور معاوضہ حاصل کئے۔ اس کے بعد اسے ایک انتھولوجی کے لئے چنا گیا۔ ہوا یہ کہ ایک شام انتھولوجی کے مدیر کا فون آیا۔ مدعا یہ کہ اسے اسی وقت میرے پاس بھجواؤ کیونکہ کل صبح ہی اسے اشاعت کے لئے بھجوانا ہے۔ عرض کیا کہ اس وقت تو کوئی ہیلی کوپٹر اسے آپ کے پاس پہنچانے کو میرے پاس تیار نہیں۔ ہاں کل ضرور پہنچا دیا جائے گا۔ مدیر صاحب بولے۔ ہیلی کوپٹر تیار نہیں۔ ٹیکسی تو مل سکتی ہے۔ ٹیکسی ڈرائیور کو ہمارا ایڈریس دے کر افسانہ تھماؤ۔ ہم اسے ادائیگی کردیں گے۔ چنانچہ افسانہ بھجوا دیا گیا اور ایک بار پھر ایک ہزار کرونر معاوضہ وصول پایا۔

آپ کو سن کر خوشی ہوگی۔ اس بار انڈیا کے لئے ابھی پا بہ رکاب ہی تھا کہ صرف دو دن پہلے ایک ناشر کا خط ملا۔ لکھا تھا۔ آپ کا یہ افسانہ ناروے کے تمام پولی ٹیکنک ہائی اسکولوں کے ایڈوانس کورس میں پڑھانے کے لئے منتخب کرلیا گیا ہے۔ آپ اپنی اجازت دیں اور بنک اکاؤنٹ نمبر فون پر بتادیں۔ آپ کو سن کر مزید خوشی ہوگی کہ نارکیں ادباء میں سے ایک اسی خادم کا یہ افسانہ "اپنے الفاظ میں" نام کی اس خوبصورت کتاب کے لئے چنا گیا ہے۔

انڈیا سے واپس آیا تو بنک اکاؤنٹ میں ساڑھے چھ ہزار کرونر آئے پڑے تھے۔ اس طرح اسی ایک افسانے نے اب تک مجھے گیارہ ہزار کرونر تک کا معاوضہ دلادیا ہے جو آج کے انڈین کرنسی ریٹ کے حساب سے تقریباً اٹھاون ہزار روپئے بنتا ہے۔ سوچتا ہوں۔ کیا ہمارے ممالک اس سلسلے میں اب تک کنارے کنارے پھر رہے ہیں جب کہ ادھر کے چھوٹے چھوٹے ملک، جن میں چھ چھ سات سات مہینے گھاس کا ایک تنکا تک نہیں اگتا، ہمیں ہزارہا میل پیچھے چھوڑ گئے ہیں۔ شاید اسی لئے اللہ میاں نے اپنی برکتوں کے تمام دروازے ہم پر بند کر رکھے ہیں۔

اچھا اجازت - امسال اکتوبر یا نومبر میں انڈیا آؤں گا تو آپ سے ملاقات ہوگی۔

ہرچرن چاولہ (ناروے)

ooooo

○ عید نمبر کے مندرجات یعنی مضامین، غزلیں، افسانے، ترجمے مشاعرے کی روداد، کتابوں پر تبصرے وغیرہ خوبصورت اور معیاری ہیں۔ مجموعی طور پر شمارہ صوری اور معنوی دونوں حیثیت سے کافی خوبصورت ہے۔

سہیل غازی پوری (کراچی)

ooooo

○ مارچ، اپریل کا شمارہ پڑھا۔ "کھیل اور وطن کی محبت" آپ کے احساس کی تپش کا نتیجہ ہے ورنہ حالات تو جیسے ہیں، ہیں "احتراق الایمان" کا سوگ ہم نے "سیاست" حیدرآباد کی وساطت سے منایا۔ آپ کا اداریہ ان تحریروں میں مزید حسن و حزن شامل کرتا۔ قارئین "راوی" کا تاثر دوچند ہوتا

اختر الایمان کا تذکرہ ادھر سردار جعفری کے پھیپھڑوں اور درد دل کی وجہ سے کم کم رہا ہے۔ ہندوستان سے ایک "کلامیں اور شاعر" چھن گیا۔ (آپ کے اداریہ میں جو قلعہ ہوتا ہے اس کے فروغ و فراغ کے لئے وسعت داماں کی ضرورت بہرحال ہے!)

ڈاکٹر شکیل الرحمن کے تحقیقی مضمون کی دوسری قسط نے مزید شاد کام کیا۔ "چیکے چیکے" کدار ناتھ شرما کا افسانہ آخر میں ماں بیٹی کی Understanding کراتے کراتے ان کی Mis-Understanding میں ڈھل گیا۔ کچھ ایسی الٹ پلٹ ہوئی کہ یہ وہ جامہ بن گیا۔ جس کا کوئی الٹا سیدھا ہیں رہا۔ بقیہ نگارشات میں نارنگ ساقی کا "خاکوں کا مسیحا" مختصر مگر خوب و معتبر ہے۔ میں "مجتبیٰ حسین" کے کالم شوق سے پڑھتا ہوں، پڑھ کر دعا کرتا ہوں کہ یا اللہ سارے حیدرآبادی ان کی طرح دلی میں رہ کر اپنی تحریروں (اور مزاج میں) ویسا سجاؤ اور سلجھاؤ لا کر اپنی شخصیت کی دل پذیری بڑھا کیوں نہیں لیتے؟ انیس رفیع نے "بادبان" کا تجزیہ دل لگا کر کیا ہے۔ پاکستان اور ہندوستان کے رسائل کے مسائل میں یکسانیت ہے اس طرح دونوں ملکوں کے قابل مدیروں کے رویوں میں بھی بڑی مشترک مماثلتیں ہیں۔ ان کی فن سے لگن بہرحال ان کی Creditability بڑھاتی ہے۔ ان کے لئے انیس رفیع کی شرد ھا کلی سے مجھے اتفاق ہے۔

مقصود الٰہی شیخ، مدیر "راوی" براڈ فورڈ (برطانیہ)

(XXXX)

() مارچ، اپریل ۹۶ء کا خوبصورت شمارہ دو ایک روز قبل ملا۔ اختر الایمان کو آپ نے بہت بلند انداز سے خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ اب ایسا شاعر پیدا ہونا مشکل ہے۔

انیس رفیع نے "بادبان" پر خوب جم کر تبصرہ کیا ہے ان کو مبارکباد۔

رفعت سروش (NOIDA)

(XXXX)

() مارچ، اپریل ۹۶ء کے "انشاء" کا شمارہ موصول ہوا۔ "گفتنی کے تحت - کھیل اور وطن کی محبت" اور "اختر الایمان" فکر انگیز اداریے ہیں جن کے لیے آپ قابل مبارکباد ہیں - مذکورہ مشترکہ شمارے کی تمام شعری و نثری تخلیقات معیاری ہیں۔

مہتاب پیکر اعظمی برا کر صلع بردوان

(XXXX)

○ مارچ، اپریل کا شمارہ ملا۔ آپ کا اداریہ دعوت فکر دینے والا ہے۔ یہ نہایت دکھ کی بات ہے کہ ہندوستان اور پاکستان کی کرکٹ ٹیموں کے بیچ میچوں کو دونوں ملکوں میں کھیل نہیں سمجھا جاتا بلکہ آپسی جنگ سمجھا جاتا ہے ہندوستان اور پاکستان کے کھلاڑیوں نے مل کر ایک ٹیم بنا کر سری لنکا میں جب میچ کھیلا تھا۔ تو ہمیں بہت خوشی ہوئی تھی - اور ہم سوچنے لگے تھے کہ کھیلوں کے بارے میں کھلاڑیوں اور عوام کا رویہ بدل رہا ہے - لیکن بنگلور کے میچ کے بعد دونوں ملکوں میں جو ردعمل ہوا - وہ نہایت ہی مایوس کن تھا۔

"مشہور اردو روزنامے" میں چھپی خبر کے بارے میں آپ کا یہ کہنا بالکل درست ہے کہ "ساری تحریر کسی دماغی خلل کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے"۔ ایسے دماغی خلل کے خطرناک نتائج نکل سکتے ہیں - ہمارے ملک میں کئی گمراہ لوگ اب بھی پاکستان کی کرکٹ ٹیم کی جیت پر مٹھائیاں بانٹتے ہیں - حالانکہ ایسے لوگوں کی تعداد بہت ہی کم ہے - پھر بھی اس سے شرپسند، فرقہ پرست اور متعصب عناصر کو غلط اور خطرناک پروپیگنڈے کا موقع ملتا ہے - صحت مند صحافت کا تقاضا ہے کہ ایسی اشتعال انگیز خبروں اور مکتوبات کو اخباروں میں جگہ نہ دی جائے۔

جناب وجے صاحب کا ہندی افسانہ "نجات دہندہ کی تلاش" بہت پسند آیا بہت ہی خوبصورت افسانہ ہے آج کے دور کی حقیقتوں کے اتنا قریب ہونے کے باوجود کسی اخبار کی خبر یا رپورٹ نہیں لگتا۔ ایک عظیم افسانے کے تمام تکنیکی تقاضوں کو پورا کرتا ہے - نہایت ہی کامیاب اور پر اثر افسانہ ہے - افسانے کی زبان بھی نہایت عمدہ ہے - کچھ فقرے تو ضرب المثل اور کہاوتیں لگتے ہیں - ہمہ گیر سچائی معلوم ہوتے ہیں - مثال کے طور "اس دور میں سیاسی ٹوپی یا سفارش کے بغیر بھلا انصاف کیسے مل سکتا ہے" "روشنیہ کو لگا کہ گرمی کے باوجود تمام شہر کی ہریالی کمشنر کی کوٹھی پر پہرہ دیتی ہے - اور جمہوریت کی قسمت بنانے والی بستیوں کا جل بھی تشنہ لبی کا شکار رہتا ہے - جمہوریت کی معاشیات نہ جانے کیسے غریبوں کے ہاتھ میں ریت کا ڈھیر اور امیروں کے ہاتھ میں شربت کی بوتل بن جاتی ہے"۔ "جس پولیس پر عوام کے تحفظ کا دارومدار ہے وہ پالیٹکس کے ہاتھ میں مداری کا بندر بن کر رہ گئی ہے"۔ "اوتار اپنا کام پورا کر کے چلے جاتے ہیں - لیکن لوگوں کو معلوم ہی نہیں ہوتا - کیونکہ لوگ اب بھگوان کی شبیہہ بھی نیتاؤں کے چہروں میں تلاش کرتے ہیں"۔

میرے خیال میں یہ افسانہ ہم عصر ہندی، اردو ادب کے بہت اچھے افسانوں کی فہرست میں جگہ پائے گا۔ جناب وجے صاحب اتنا اچھا افسانہ لکھے

کے لئے مبارکباد کے مستحق ہیں - خدا کرے زور قلم اور زیادہ ہو - جناب حیدر جعفری سید کے بھی ہم شکرگزار ہیں کہ انھوں نے اتنے عمدہ افسانے کو اردو قارئین کے لئے ترجمہ کیا اور شائع کرایا -

ڈاکٹر نریش صاحب کی مختصر کہانیاں بھی کافی دلچسپ ہیں -

جناب اخترالایمان کے انتقال کا سن کر بہت افسوس ہوا - خدا انھیں غریق رحمت کرے - ودیانندجی کی کتاب جس کا "ایک مختصر اقتباس" آپ نے شائع کیا - ہماری گنگا جمنی تہذیب و ثقافت مذہبی رواداری اور اردو ادب کی ہمہ گیر روایات کا ایک نمونہ ہے -

(2)

○ نومبر 1995ء کے شمارہ کی تخلیقات اور اداریہ کے بارے میں میں نے ایک مفصل طویل خط لکھا تھا - لیکن اس وقت پوسٹ نہ کرسکا - اور اب تو بہت دیر ہو گئی ہے - اس لئے وہ مکتوب تو اب نہیں بھیج رہا ہوں - لیکن کچھ مختصر لکھے بغیر رہ بھی نہیں سکتا -

اپنے اداریہ کے آخر میں آپ نے اشوک سنگل صاحب اور ایسے دیگر لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا ہے کہ آپ "بھارت ماتا کے سپوتوں کو حسوں کی راہ پر لگانا چاہتے ہیں" دکھ کی بات تو یہ ہے کہ وہ نہ صرف حسوں کی راہ پر لگانا چاہتے ہیں بلکہ وہ کافی حد تک اس میں کامیاب بھی ہوگئے ہیں - بابری مسجد کا حادثہ اس کا ٹھوس ثبوت ہے - اور اس کے بعد ملک کا ماحول فرقہ وارانہ تعصب سے اور زیادہ بھر گیا ہے - اس سلسلے میں آپ کو ے ذاتی تجربہ سنانا چاہتا ہوں -

"اردو کے ایک سلجھے ہوئے ترقی پسند ادیب و شاعر جناب اطہر نیر صاحب رے دوست ہیں - پہلے وہ یہاں بھلائی اسٹیل پلانٹ میں نوکری کرتے تھے - لے سال وہ والنٹیری ریٹائرمنٹ لے کر اپنے گاؤں برہولیہ (ضلع دربھنگہ - ار) واپس چلے گئے ہیں - جب وہ یہاں تھے تو ہم اکٹھے کچھ ادبی رسالے منگوایا تے تھے - اور ہفتہ میں ایک دن مل کر ان تخلیقات کے بارے میں تبادلہ خیالات کیا کرتے تھے - عام طور پر میں ہر اتوار کو ان کے گھر جاتا تھا اور کچھ گھنٹے کٹھے بحث مباحثہ میں گزارتے تھے - ان کا گھر میرے گھر سے کچھ فاصلہ پر تھا - س لئے میں ہمیشہ اپنی کار میں ان کے ہاں جایا کرتا تھا - اس طرح کچھ مہینے رگئے - تو جناب اطہر نیر کو پتہ چلا کہ ان کے اردگرد پڑوس کے لوگوں میں ن کے متعلق کچھ کانا پھوسی چل رہی ہے - ان ہی دنوں بمبئی میں بم پھٹنے کے اثے ہوئے تھے - اور چونکہ میں قراقلی ٹوپی پہنے رہتا ہوں - جو میں بچپن سے سنا آیا ہوں - (میری پیدائش صوبہ سرحد میں ہوئی تھی اور وہاں یہ ٹوپی پہننے کا عام رواج ہے) - اس لئے وہ لوگ مجھے مسلمان سمجھتے تھے اور میں کئی ماہ سے ہر اتوار کو اطہر نیر کے ہاں آیا کرتا تھا - اور کبھی کبھی دوسرے محبان اردو بھی ہمارے ساتھ شامل ہو جاتے تھے - تو کچھ بیمار ذہنیت والے فرقہ پرستوں نے یہ شوشہ چھوڑا کہ یہ لوگ ہر ہفتے یہاں اکٹھے ہو کر میٹنگس کرتے ہیں - ضرور کچھ نہ کچھ سازش کی ہی پلان بناتے ہوں گے - اطہر نیر کے پڑوس والے کوارٹر میں ایک ٹریڈ یونین ورکر رہتے تھے - جب ان کو اس کانا پھوسی کا علم ہوا تو انھیں بہت صدمہ پہنچا اور دکھ ہوا - اور ساتھ میں غصہ بھی آیا - تب انھوں نے ان سب پڑوسیوں کو ان کی پراگندہ ذہنیت پر پھٹکارا اور ساتھ میں بتایا کہ یہ جو شخص کار میں اطہر نیر کے گھر آتا ہے - ہندو ہے اور اس کا نام رام پرکاش کپور ہے - تب ان لوگوں کو کچھ شرمندگی کا احساس ہوا" -

اسی نوعیت کے ایک تجربے کے بارے میں میں نے پہلے بھی انشاء کے ستمبر 1993ء کے شمارہ میں چھپے اپنے "خاص مکتوب" میں لکھا تھا - اس قسم کے اور واقعات کا بھی آج کل تجربہ ہوتا ہے - ان کے بارے میں پھر کبھی لکھوں گا -

رام پرکاش کپور، درگ (ایم - پی)

ooooo

○ ماہنامہ "انشاء" کا پابندی سے مطالعہ کرتا ہوں - ہر شمارہ اپنی انفرادیت کا مظہر ہے - "بابر نامہ" پر ڈاکٹر شکیل الرحمن صاحب کا تجزیاتی محاکمہ اس کتاب اور صاحب کتاب کے ہمہ جہتی پہلوؤں کو نمایاں کرنے کا آئینہ دار ہے - ڈاکٹر نریش کے ترجموں سے زیادہ ان کے "حسن انتخاب" کی داد دینی چاہیے کہ انھوں نے حالات سے مطابقت رکھنے والے افسانچوں کا ترجمہ کرکے عصری حسیت کا ثبوت پیش کیا ہے - ہر تخلیق اپنی جگہ نگینہ کا درجہ رکھتی ہے "تھاکوں کا مسیحا" کا انداز بڑا ہی دل گرفتہ ہے - "بادبان" پر انیس رفیع کا تنقیدی تجزیہ "خصوصی مطالعہ" کی حدوں سے تجاوز کرکے نقاد کے ایک رخی رویہ کی سمت پیش قدمی کرتا نظر آتا ہے - ہندی افسانہ بھی بہت خوب ہے، اداریے اور خورشید احمد کے مضمون پر مبارکباد قبول فرمائیے - شعری حصہ بھی کافی جاندار ہے - سب سے اہم بات تو آپ کے جریدہ کی خصوصی اشاعت "نیاز فتح پوری نمبر" کا اعلان ہے - اس انفرادی اعلان کے لئے بھی مبارکباد قبول فرمائیے -

مجید بیدار، اورنگ آباد (مہاراشٹر)

ooooo

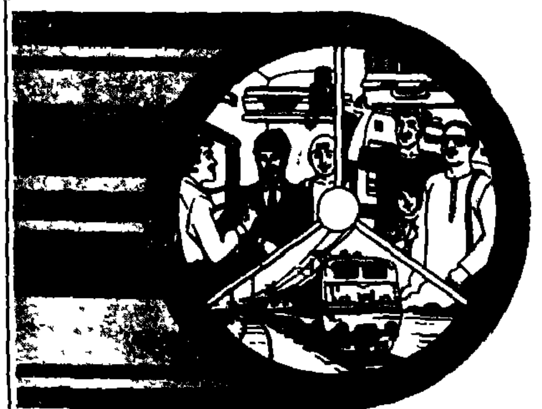
○ میری آنکھوں کے سامنے اس وقت جنوری فروری اور مارچ اپریل ۹۶ء کے شمارے ہیں - سرورق عمدہ، طباعت صاف ستھری اور کاغذ نفیس اور بہترین -

شمارہ ۱-۲ (جنوری فروری) کے تقریباً سبھی افسانے پسند آئے خاص کر حیوان (مقصود الٰہی شیخ) - سناٹا (جمیل آفتاب) اور مجروب شیشہ (مسعود مفتی) - مجروب شیشہ میں مفتی صاحب نے جس بات کی طرف اشارہ کیا ہے وہ قابل فکر ہے - کتنے افسوس کی بات ہے کہ جب کوئی شخص آج کل کوئی نیک کام انجام دیتا ہے تو لوگ اور یہ سماج اسے نفرت کا نشانہ بناتے ہیں جب تک "شرلو" جیسے لوگ اس سماج میں ہیں ماسٹر برکت علی صاحب جیسے لوگوں کی محبت، خلوص اور نیکی کا استحصال ہوتا رہے گا اور پھر اس سماج جو کہ "نوراں" کی طرح "بیوہ" ہے کا کیا ہوگا یہ ہم کو سوچنا ہے آج کے انسانوں میں اگر کوئی کہے کہ میں "شرلو" نہیں لیکن اس میں بھی کہیں نہ کہیں "شرلو" کی کوئی نہ کوئی نشانی ضرور ملے گی - ضرورت اس بات کی ہے کہ اس شرلو کو ختم کریں اور ہم سب ماسٹر برکت علی بنیں تب جاکے "نوراں" کا حال سدھر سکتا ہے ورنہ بات یہی ہوگی کہ "آپ دریا کے اس کنارے پر اور ہم اس کنارے پر ہو رہے ہیں اور آنسو دریا کی وسعت بڑھا رہے ہیں - تلاش خر (مزاحیہ) لطیف رشیدی کا بہت پسند آیا - ویسے بھی ان ہی "خروں" سے تو تمام کاروبار اور اہم سیاسی کام انجام دیے جا رہے ہیں کہیں بھی دیکھئے "خر" ضرور ملیں گے - کشمیری میں گدھے کو "خر" ہی کہتے ہیں اپنے برصغیر کو ہی دیکھئے "خروں" کی کیا خرمستیاں ہیں آج کا خر کل سر پر دولتی جھاڑ کر جب کرسی پر بیٹھ جاتا ہے تو سر سروہی کرتا ہے جو اس کا دل چاہتا ہے - کیا کریں ہم خود ہی ان "خروں" کو سر پر بٹھا دیتے ہیں شاید اس لئے کہ اچھی خصلت اور اچھے کردار کے "خر" میسر ہی نہیں ہیں - "دولتی جھاڑنا کوئی عیب نہیں ہنر سمجھا جاتا ہے دولتی - جھاڑیں تو رندہ باد رندہ باد" کیسے ہوگی - شکیل الرحمن صاحب کا مضمون "بابر نامہ" کی دونوں قسطیں بہترین مضمون کارآمد اور بامقصد ہے - اس کا بہت شکریہ - دوبئی میں سلیم جعفری کے اعزاز میں جشن سپاس کی رپورتاژ کے لئے آپ کا بہت شکریہ - تبصرۂ کتب ہمیشہ بہت اچھا رہتا ہے -

شمارہ مارچ، اپریل ۹۶ء میں گفتنی میں "کھیل اور وطن کی محبت" کو پڑھ کر بہت دکھ ہوا - اور کلکتہ میں جو کچھ ہوا وہ ناقابل فراموش ہے - لیکن امید ہے شائقین کرکٹ آئندہ ایسی شرمناک حرکت نہیں کریں گے -

"اختر الایمان" اداریہ پڑھا، ان کی وفات پر بہت دکھ ہوا - ان کے نام پر ایک مختصر نمبر بھی شائع کریں - افسانہ "چپکے چپکے" (کیدار ناتھ شرما) اور مضمون "خاکوں کا مسیحا" (ساقی فاروقی) بھی پسند آئے - دیگر تمام غزلیں و نظمیں دونوں شماروں کی بہت اچھی ہیں -

منظور چند سوگی، بارہ مولہ کشمیر



ماہنامہ انشاء کلکتہ

ISSN : 0971 - 6009

جلد : ۱۱ | ستمبر / اکتوبر ۱۹۹۶ء | شمارہ :

فہرست

منظومات ڈاکٹر مظفر حنفی / ظہور منصوری ۱۱ / ۱۲ ابو کیہ رپل

شفیع اللہ خاں راز اناوی / نصیر پرواز ۱۹ اوشا بھدوریا / منظر علی

نفیس بانو شمع ۲۰ سیدہ شان معراج / افضال عاقل / قاطمی داؤد

نوشاد مومن ۲۴

مدیر : ف۔ س۔ اعجاز

فی شمارہ : ۸ روپئے

زر سالانہ : ۹۰ روپئے

مغربی ممالک سے : £ 12 or US $ 20

رقومات بذریعہ منی آرڈر، بینک ڈرافٹ، چیک صرف "انشاء پبلی کیشنز" کے نام میں روانہ فرمائیں ورنہ قابل قبول نہ ہوں گی۔ برطانیہ سے BPO کے ذریعہ رقومات بھیجی جائیں۔

ماہنامہ انشاء پبلی کیشنز

خط و کتابت، مضامین بھیجنے اور ترسیل زر کا پتہ :

۲۵ بی زکریا اسٹریٹ، کلکتہ ۷۳ ۷۰۰۰ فون :

فہرست

ہندوستانی صحافت میں سماجی نظریہ

صحافت ایک بڑی سماجی ذمہ داری ہے۔ یہ اپنے خالص معنوں میں اخبار نویسی کا پیشہ ہے۔ جب صحافت کو اصول اور فن کی کسوٹی پر پرکھا جاتا ہے تو اسکی سماجی حیثیت کا تعین ہوتا ہے۔ متحرک اور اصل اخباروں کا کردار معاشرے کے حالات کے مطابق تیار ہوتا ہے۔ ایک اخبار کو عوام کے لئے مفید اور ناشر کے لئے منافع بخش ہونا چاہئے۔ ناشر کے لئے نفع بخش اس لئے ہونا چاہئے کہ وہ اسے ایک صنعت کے طور پر اختیار کرتا ہے اور اس میں اپنا سرمایہ لگاتا ہے۔ لیکن سماجی ذمہ داری کا احساس اس کے رویے کو عام صنعت کار یا سرمایہ کار سے مختلف راہ پر لگا دیتا ہے۔ کسی خبر یا مواد کے چھاپنے سے ناشر کا مالی نقصان ہو لیکن سماج کے ایک طبقے کے لئے اسکی اشاعت ضروری سمجھی جائے تو اخبار اس کو شائع کرنے میں عموماً تامل نہیں کرتا۔ اسی طرح کسی خبر کو چھاپ کر اخبار کا مالک کچھ منافع کما سکتا ہو لیکن اس کی اشاعت قومی مفاد اور اخلاق عامہ کو نقصان پہنچا سکتی ہو تو اسکی اشاعت سے گریز کیا جائے گا۔ لہٰذا معیاری اخبار صحافت کے اس مسلمہ اصول کے تحت چلائے جاتے ہیں کہ انہیں سماجی اور شعوری ذمہ داریوں کو نباہنا ہے۔ اور پیشہ ورانہ مقاصد کی تکمیل اس طور پر کرنی ہے کہ صحافت اخلاق کی سطح سے گرنے نہ پائے۔ یہ رویہ عام کاروباری رویے سے الگ ہے۔

مولانا وحید الدین خاں نے اپنے ایک حالیہ مضمون میں اخبار کی سماجی ذمہ داری کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ نہ وہ اخبار کو نصیحت سمجھتے ہیں اور نہ پروپگنڈا۔ مولانا لکھتے ہیں "یہ غیر حقیقت پسندانہ بات ہوگی کہ اخبارات کو ریفارمر یا مارل ٹیچر کے معیار پر جانچا جائے"۔ وہ والٹر لپمن کے اس خیال سے متفق ہیں کہ جس طرح گاڑی بنانے والا گاڑی بنا کر نقل و حمل کو فروخت کرتا ہے ٹھیک اسی طرح اخبار کا مالک معلومات فروخت کرتا ہے۔ مولانا اپنی عالمانہ رائے بیان کرتے ہیں کہ ہماری موجودہ صحافت میں بنیادی خرابی یہ ہے کہ وہ عمومی خبر رسانی کے اصول پر نہیں چلائی جاتی۔ مولانا سلیکٹو رپورٹنگ کے خلاف ہیں۔ ان کا مشاہدہ ہے کہ منتخب خبر رسانی سماجی تضاد کا اصل سبب ہے۔ اس سے ہندو کے دل میں مسلمان اور مسلمان کے دل میں ہندو کی طرف سے بدگمانی و کدورت پیدا ہوتی ہے۔ کیونکہ پڑھنے والا مخالف فرقے سے متعلق چھپی "بات نیوز" کا اثر قبول کرتا ہے اور اس مخالف فرقے کے بارے میں ایک مستقل بری رائے قائم کر لیتا ہے۔ ایک ہندو اور ایک مسلمان جو آپس میں میل جول رکھتے ہیں اور ایک دوسرے کے بارے میں اچھی انفرادی رائے بھی رکھتے ہیں جب اخبار میں ایسی منتخب خبریں مخالف فرقے سے متعلق پڑھتے ہیں تو اس فرقے کے بارے میں ان کی سماجی رائے بگڑ جاتی ہے۔ اس لئے وحید الدین خاں سماجی حالات کی مکمل رپورٹنگ چاہتے ہیں۔

انتخابی رپورٹنگ کے برخلاف مکمل یا عمومی خبر رسانی کی تائید میں واقعی وزن ہے لیکن مولانا اگر اخبار کو ریفارمر یا مارل ٹیچر نہیں مانتے اور اخبار کو نصیحت اور پروپگنڈا نہیں سمجھتے تو وہ اسے ریفارمر یا معلم اخلاق کی ذمہ داری کیوں سونپنا چاہتے ہیں۔ اگر اخبار کا مالک صرف معلومات فروخت کرتا ہے، کہ اس کا یہی کاروبار ہے تو اسے یہ کاروبار کرنے دیجئے۔ اس کے لئے یہ ہدایت کیوں کہ تم یہ کرو اور یہ نہ کرو۔ اس قول میں کیا وزن ہے کہ گاڑی بنانے والا نقل و حمل کو فروخت کرتا ہے۔ گاڑی بنانے والا صرف گاڑی فروخت کرتا ہے۔ اس حالت میں کہ اسے سڑک پر چلایا جا سکے۔ کوئی چاہے تو گاڑی خرید کر اپنے گیریج میں اسے برسوں بند کر کے رکھے۔ گاڑی فروخت کرنے والے کو اس میں کیا دلچسپی ہو سکتی ہے کہ گاڑی کو خریدار استعمال میں لاتا ہے یا نہیں۔ دراصل کسی شے کی عملی افادیت ہی اس کے مقصد تخلیق اور اس سے وابستہ سماجی ذمہ داری کا تعین کرتی ہے۔ اخبار کا سماج میں کیا درجہ ہے یہ معلوم کرنے کے لئے ان اخباروں میں موازنہ کر کے دیکھئے جو صرف خبریں بیچتے ہیں اور جو صرف خبریں نہیں بیچتے۔

جو اخبار صرف خبریں بیچتے ہیں ان کے خریداروں کا ان سے لگاؤ ایک نوعیت کا ہوتا ہے اور جو خبریں بیچنے کے ساتھ کسی سماجی اور شعوری ذمہ داری کو اپناتے ہیں ان کے قارئین کا ان سے لگاؤ دوسری طرح کا ہوتا ہے۔ اور دو قسم کے اخباروں میں زیادہ صحت مند اور پائدار اسے مانا

جاتا ہے جو سماجی اور شعوری ذمہ داری کو قبول کرتا ہے۔ چنانچہ وہ غیر ادیب ناشر جو صحافت میں روپے بٹورنے یا محض سیاسی مقصد کے لئے داخل ہوتا ہے وہ بھی اپنے عجز اور کسر پر پردہ ڈالنے کے لئے اپنی ضرورت کے تحت بیدار مغز اور اہل نظر صحافی کو اونچی سے اونچی تنخواہ کے عوض ادارت کا فریضہ سونپنا پسند کرتا ہے۔ چنانچہ وحید الدین خان کا یہ کہنا کہ اخبار کا مالک صرف معلومات فروخت کرتا ہے غلط ہے۔ صرف معلومات فروخت کرنے کا دھندا نیوز ایجنسیاں کرتی ہیں۔ اور یہ بات مولانا اچھی طرح جانتے ہیں۔ اخبار کسی خبر کو کیا اہمیت دیتا ہے یہ اسکی اپنی پالیسی، اپنے حلقہ قارئین کی دلچسپی اور اس کی تسلیم کردہ سماجی ذمہ داری اور تجارتی مقصد پر منحصر ہے۔ ہر اخبار کے اپنے ترجیحی پہلو ہوتے ہیں۔ چنانچہ سلیکٹو رپورٹنگ کے بغیر کوئی اخبار اپنی انفرادیت قائم نہیں کر سکتا۔ چونکہ ہندوستانی معاشرہ تفرقوں اور مذہبی امتیازات کا شکار ہے اس لئے اعتدال پسندی کی خاطر کوئی نیک خو ناصح صحافت کا ایسا رول اختیار کر لے تو اس سے کیا ہوتا ہے۔ یہاں لوگ ہر صبح اپنی زخمی انا کے لئے اخباری مرہم تلاش کرتے ہیں۔ مولانا وحید الدین خاں مغرب کی انگریزی اخباری صحافت کے دلدادہ ہیں اور ہندوستانی اخبار بینوں کی حد سے بڑھی ہوئی سیاسی دلچسپی کو وہ اچھی نظر سے نہیں دیکھتے۔ وہ رقمطراز ہیں "آج آپ ملک کے کسی گوشہ میں چلے جائیں ہر جگہ لوگوں کو سب سے زیادہ سیاسی موضوعات پر گفتگو کرتے ہوئے پائیں گے۔ یہ کوئی صحت مند علامت نہیں"

مولانا کا یہ نظریہ مغربی اور ہندوستانی معاشرے کے صحیح تقابلی جائزے پر مبنی نہیں ہے۔ ہندوستان کے لوگوں کا سیاسی مستقبل متعین نہیں ہے۔ یہ بے ایمان سیاستدانوں کی پیدا کردہ صورت حال ہے۔ ہندوستان کا سیاسی نظام دھرم اور ذات پات کے خانوں میں بٹا ہوا ہے۔ یہاں کا آدمی اپنی روٹی سے زیادہ اپنے مذہب کے تحفظ کی ضمانت چاہتا ہے۔ رشوت اور فراڈ کے زائیدہ سیاسی و اقتصادی نظام نے ذہنوں کو منتشر اور قدروں کو پامال کر ڈالا ہے۔ لہٰذا لوگ سیاست میں گہری دلچسپی لینے پر مجبور ہیں۔ یہ حالات کا تقاضا ہے۔ مولانا کو لوگوں کا سیاسی موضوعات پر گفتگو کرنا اچھا نہیں لگتا اور اخباروں میں سیاسی خبروں کا چھائے رہنا بھی ناپسند ہے۔ مولانا کے نزدیک یہ کوئی صحت مند علامت نہیں ہے۔ "صحت مند بات یہ ہے کہ لوگوں کو علمی، سائنسی اور تمدنی معلومات ملیں اور لوگ ان پر بحث و گفتگو کریں"۔

مولانا سائنسی ذہن رکھتے ہیں۔ نئی تبدیلیوں کا اثر بہت جلد قبول کر لیتے ہیں۔ اب ان کی تحریروں میں سائنس ہی سائنس نظر آتی ہے۔ ان کی لچکدار سائنسی طبیعت نے انھیں فائدہ بھی پہنچایا ہے اور یہ فائدہ ان پر آسمان سیاست سے ہی نچھاور ہوتا رہا ہے۔ یوں تو انھیں صحافت اور سیاست کی قربت پسند نہیں آتی اور اس قربت میں قومی اور اخباری پسماندگی کے اسباب نظر آتے ہیں لیکن اپنی تحریروں سے سیاسی اثرات کو وہ خود زائل نہیں کر سکے۔ حالیہ برسوں میں فرقہ وارانہ سیاست کا کوئی نزاعی مسئلہ ایسا نہیں جس پر خاں صاحب نے خاموش رہنا پسند کیا ہو اور مسلمانوں کو صبر کی تلقین نہ کی ہو۔ وہ سابقہ مسجد شکن سرکار کے پسندیدہ عالم بھی رہے ہیں۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ مولانا عام لوگوں سے کٹے ہوئے ہیں اور اسی وجہ سے سماجی مسائل کا جائزہ دور سے ہی لے پاتے ہیں۔ مغربی ممالک میں اخباروں میں سیاسی خبریں دوسرے نمبر پر آتی ہیں۔ سائنسی اور اقتصادی خبریں اول جگہ پاتی ہیں۔ یہ بات صحیح ہو سکتی ہے لیکن کیا وہاں کے اور یہاں کے حالات ایک ہیں؟ ہم کس سیاسی سطح پر جی رہی ہے۔ کون سی حکومت پائیدار ثابت ہو رہی ہے۔ کون سیاسی یا اقتصادی پالیسی دوررس اور مستقل ثابت ہو رہی ہے۔ کون سیاسی پارٹی مثبت انداز میں سوچ رہی ہے۔ اور ورلڈ بینک اور عوام کو کمزور نہیں کر رہی۔ سیاسی استحکام جب تک حالات سے برآمد نہیں ہو گا ہم اقتصادی انداز فکر کو (Sustain) نہیں کر پائیں گے۔ اور سائنسی طرز زندگی اختیار کرنا اس وقت تک عوام کے بس میں نہیں ہو گا جب تک معاشرہ سائنسی پیمانے کی زندگی کے اخراجات کا متحمل نہ ہو جائے۔ لہٰذا خود کفیل معاشرہ اور غیر خود کفیل معاشرہ میں فرق باقی رہے گا۔ مولانا نے ایک جگہ اپنے مضمون میں یہ بھی لکھا ہے کہ ہندوستان میں بڑے پیمانے پر اسٹرکچرل تبدیلیاں کی گئی ہیں۔ ۱۹۴۷ میں آزادی کا انقلاب، ۱۹۵۰ میں سوشلسٹ پیٹرن آف سوسائٹی بنانے کا فیصلہ، قومی حکومتوں کے قیام کے بعد ہزاروں اصلاحی قوانین کا پاس کیا جانا۔ اسی طرح ۱۹۷۷ء کا ٹوٹل ریولیوشن وغیرہ۔ مگر یہ تمام تبدیلیاں یکسر بے فائدہ ثابت ہوئیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسٹرکچرل تبدیلی کے نتیجہ خیز بننے کے لئے انٹلیکچول چینج کی زمین درکار ہے۔ ان کا خیال ہے "یہ فکری زمین سب سے زیادہ اخبارات بنا سکتے تھے۔ انھوں نے یہ کام کیا نہیں۔ اس لئے تمام اسٹرکچرل تبدیلیاں بے نتیجہ ہو کر رہ گئیں"۔

نجانے مولانا کو یہ خیال کیوں آیا کہ تمام معاشرتی، ذہنی اور معکوس کی تبدیلیاں صرف اخبارات ہی پیدا کریں گے۔ جبکہ نہ تو وہ اخبار کو صحت سمجھتے ہیں اور نہ پروپگنڈہ اور نہ اسے بدل نیچر اور ریفارمر ماننے کو تیار ہیں۔ ان کا پیشہ ورانہ نظریہ یہ ہے (اور شاید یہی ان کی عالمانہ رائے بھی ہے) کہ اخبار کا مالک صرف معلومات فروخت کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان کے معیاری پریس کا ایک بڑا حصہ ہر نازک موقع پر اپنی سماجی ذمہ داریوں کے نبانے میں پیش پیش رہا ہے۔ خبریں چوبیس گھنٹے گردش میں رہتی ہیں۔ اب تو سٹلائٹ اور انٹرنیٹ کے ذریعہ خبریں وصول کی جارہی ہیں اور نیوز مین (Newsmen) نئی آزمائش سے گزر کر اپنی اپنی اخباری ضرورت کے تحت انہیں ترتیب دیتے ہیں۔ آجکل تو بڑے انگریزی، ہندی، بنگالی، مراٹھی، گجراتی اخبارات میں عام خبروں کے علاوہ مکمل سائنس اور اقتصادیات (بزنس) کے کئی کئی صفحات روزانہ شامل ہوتے ہیں۔ کسی کو یہ شکایت نہیں ہونی چاہئے کہ اخبار ہندوستانی معاشرہ کو ایک سائنسی معاشرہ بنانے میں اپنا حصہ ادا نہیں کر رہا ہے۔ (اور یہ شکایت ہو بھی تو بس اردو اخبارات سے کی جاسکتی ہے جن کی بے بسی اور بیکسی کا حال کسی سے چھپا بھی نہیں ہے)۔

مولانا اس خیال کے بھی حامی ہیں کہ جس طرح ہمارے ملک میں جوڈیشل ایکٹوزم (Judicial activism) زوروں پر چل رہا ہے اسی طرح سماج سدھار کے لئے میڈیا ایکٹورم کو جاری کر دیا جائے۔ جوڈیشل ایکٹورم اور میڈیا ایکٹورم سے مولانا کی خاص مراد کیا ہے عیاں نہیں ہوا۔ شاید جوڈیشل ایکٹورم سے مراد ہو کہ جس طرح پچھلی بدعنوان کانگریس حکومت کے رہنماؤں اور وزیروں اور بی جے پی یا دیگر پارٹیوں کے بھی بعض لیڈروں کا کھایا پیا اگلوانے میں ہماری چھوٹی بڑی عدالتیں سی بی آئی اور دیگر چھان بین کی ایجنسیوں کو متحرک کر رہی ہیں اس طرح اخبارات بھی کرپشن کے معاملات کو زیادہ تحقیق اور جرأت کے ساتھ طشت ازبام کرنے لگیں۔ اگر یہی مراد ہے تو عرض ہے کہ جوڈیشل ایکٹورم غیر ضروری ہے۔ عدالتوں کا کام عدل قائم کرنا ہے۔ خصوصی معاملات میں ہی عدالتیں قومی ضمیر کو ٹٹولنے تک محدود رہ جائیں اور باقی چھوٹے معاملات جن کے فیصل ہونے یا انصاف حاصل کرنے کے انتظار میں لاکھوں لوگ عدالت کی سیڑھیاں چڑھنے اترنے میں اپنی جوتیاں گھس دیتے ہیں یا ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جاتے ہیں تو یہ کیسی عدالتی ایکٹورم ہے "فوری معاملات میں بڑی عدالتوں کی فوری سرگرمی صرف عوامی دلچسپی کی خاطر ہے۔ اسے عدالتی سنسنی یا عدالتی ہیرو ازم کا نام بھی دیا جاسکتا ہے اور تکلف نہ ہو تو اس کے لئے عدالتی دہشت یعنی (Judicial terrorism) کی اصطلاح بھی وضع کی جاسکتی ہے۔ مولانا اس کے متوازی میڈیا ایکٹورم کے نام پر اگر ایسی ہی کسی صحافتی دہشت یا میڈیا ٹیررزم کو فروغ دینا چاہتے ہیں تو اس تحریک کی شروعات جتنی بھی نیک کیوں نہ ہو اس کا انجام صحافتی بلیک میل پر ہوگا۔ خاص طور پر مولانا کے اس مشورے پر عملدر آمد میڈیا کے لوگوں کو جلد اس راہ پر لگا سکتا ہے کہ اخبار والے رپورٹنگ سے قبل کسی معاملے کی تہہ میں اترنے کے لئے سوشل ورکرس اور ریفارمرس سے رابطہ رکھیں اور ان کا تعاون حاصل کریں۔ ہندوستاں میں گلی گلی کوچے کوچے میں سوشل ورکر ملتے ہیں اور ان میں سے ۹۰ فی صد کی تعریف کن لفظوں میں کی جاسکتی ہے یہ شر فا اور اساروالے سبھی جانتے ہیں۔ شاید یہ مشورہ دیتے وقت مولانا نے برطانیہ کے سوشل ورکروں کا تصور کر لیا ہو جہاں سوشل ورکر ہونا واقعی ایک سماجی ذمہ داری ہوتی ہے۔

وقت آگیا ہے کہ ہندوستانی سیاست سے گندگی کو نکال پھینکا جائے۔ لوگوں میں صحیح سیاسی مذاق کو عام کیا جائے۔ اور صحافت پہلے سے زیادہ ذمہ داری کے ساتھ یہ فریضہ اختیار کرے۔ صحافت کی مبادیات اور ترجیحات معاشرے کی ضرورت کے تحت بدلتی رہتی ہیں۔ اس وقت مذہب اور سیاست کی آمیزش سے افراتفری پھیلی ہوئی ہے۔ معاشرے سے اس برائی کو دور کرنے میں صحافت بڑا رول ادا کر سکتی ہے۔ اور اسے کرنا چاہئے۔ ابھی اتر پردیش میں اسمبلی انتخابات کرائے جارہے ہیں۔ جیسا کہ ہوتا آیا ہے دہلی کے شاہی امام عبداللہ بخاری صاحب ہر انتخاب سے پہلے مسلمانوں کے لئے ایک فتویٰ جاری کرتے ہیں۔ اس بار انہوں نے بہوجن سماج پارٹی کی حمایت کا اعلان کر دیا ہے۔ ایسے حالات میں صحافت اور عوام کو سیاست میں دلچسپی کیوں نہ ہو۔ ایسی مذہبی اور سیاسی گھٹیا صحافتی مرہم ہی سے دور ہو سکتی ہے۔ وحیدالدین خان صاحب سے توقع تو یہ تھی کہ وہ اہل صحافت اور اہل وطن کی سیاسی نجات کے لئے زیادہ کار آمد نصیحت فرمائیں گے لیکن شاید انہیں سیاست کے سمندر میں الگ تھلگ جزیرے زیادہ پسند ہیں۔

اسعد انشاء ملک

غور و فکر کرنے کے بیان میں

از مکتوباتِ صدی

مکتوب ۶۰

حضرت مخدوم جہاں شیخ شرف الحق والدین

احمد یحییٰ منیریؒ

میرے بھائی شمس الدین اللہ تعالیٰ تم کو معزز بنائے۔ جانو کہ حضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے تفکر کو خداوندی کاموں میں غور و خوض کرنے کے لیے قائم فرمایا ہے اور کہا ہے **تفکروا فی الاء اللہ ولا تفکروا فی ذات اللہ** (غور و فکر کرو خدا کی کائنات اور مصنوعات میں مگر اس کی ذات میں فکر نہ کرو) جو کوئی خدا کی ذات میں غور و خوض کرے گا وہ بہت جلد کفر میں پڑ جائے گا۔ اس لیے کہ فکر کی جہاں تک پہنچ ہے وہ ایک حد کے اندر گھری ہوئی ہوتی ہے۔ اسی حد میں اسے فکر کرنے کا موقع حاصل ہو سکتا ہے۔ اور خدا کی ذات اور اس کی صفتیں حدود اور علم و عقل کے ادراک سے بالا و برتر ہیں۔ تو فکر اس کی مخلوقات میں کرنا چاہیے تاکہ وہ مخلوق کے رد و بدل، قائم و ثابت رہنا، رنگ بدلنا، کبھی ہونا اور کبھی نہ ہونا دیکھے اور مخلوقات کو اس کے وجود کے مرتبوں میں پہچانے۔ یہیں سے خدا کی پہچان کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ پھر طالب کو چاہیے کہ جب اپنے ظاہری اعمال کو پورا کر چکے تو وظیفہ، سنتوں اور فرض کے ادا کرنے کے بعد کسی کسی وقت تفکر بھی کرے۔ اور جہاں کے پیدا ہونے کے متعلق غور کرے کہ خدا کی اس میں کیا حکمت ہے۔ اور جو غور و فکر عالم آفرینش کے لیے کرے وہی اپنے نفس، دل اور جسم کے لیے بھی کرے اور اپنے مرتبے میں پیدائش سے لے کر اس وقت تک تلاش و جستجو کرے۔ اور طور و طریقے کو غور سے دیکھے۔ اور اس فکر کرنے میں شریعت کے راستے سے بھٹکنے نہ پائے۔ اور اپنے علم و عمل کی پونجی بنائے تاکہ رکاوٹ، ٹھہراؤ، شک و شبہہ اور تردد کی وجہ سے راستہ بند نہ ہونے پائے اور نفع کے لالچ میں پونجی برباد نہ کر دے۔ تاکہ اس تفکر کی برکت سے بصیرت کا خزانہ حاصل ہو اور معرفت کا نفع بٹور سکے۔ دوسرے لوگ جو برسوں کی عبادت و ریاضت سے حاصل کرتے ہیں، اسے تھوڑی ہی مدت میں حاصل ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ حضرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارہ فرمایا ہے۔ **تفکر ساعۃ خیر من عبادۃ ستین سنۃ** (ایک گھنٹے کا تفکر ساٹھ سال کی عبادت سے بہتر ہے۔ اور یہ فکر کرنا در حقیقت دین اور مخلوقات کی حالتوں اور خداوند کی حکمت کے بھیدوں میں غور و غوص کرنا ہے۔ اور یہی فکر ساٹھ برس کے عمل کرنے کے برابر ہے۔ اور لوگوں نے کہا ہے کہ خداوند تعالیٰ نے جہاں جہاں قرآن شریف میں نظر کرنے کو فرمایا ہے اس سے مراد تفکر کی نظر ہے اور اس کا فائدہ عبرت اور بصیرت کرنا ہے۔ اس لیے کہ انسان کی آنکھیں آسمان و زمین کے حالات کو پوری طرح معلوم نہیں کر سکتیں تو اس چیز کا دریافت کرنا جس کو پوری طرح سمجھ ہی نہیں سکتے بے فائدہ ہے۔ اور خداوند تعالیٰ کسی کام کا بے کار نہیں دیا کرتا۔ اور بینائی والوں کے سوا خدا کی بنائی ہوئی چیزوں کی حقیقت کوئی دوسرا نہیں جان سکتا۔ جس طرح ظاہری چیزیں اندھے نہیں دیکھ سکتے آنکھوں والا ان چیزوں کو بالکل ویسے ہی دیکھے گا جیسی کہ وہ ہیں۔ فضولیات کی طرف سے اس کی نظر بند ہو جائے گی۔ اور جس طرح ظاہری آنکھیں دیکھنے میں مختلف ہوا کرتی ہیں بعض کمزور، بعض قوی بعض جلد بعض دیر میں دیکھا کرتی ہیں، اسی طرح اہلِ دل لوگوں کی آنکھیں بھی بصیرت میں مختلف درجہ رکھتی ہیں۔ بعض آسمان تک بعض عرش تک اور بعض لوح و قلم تک اور بعض جس کی بصیرت کامل ہوتی ہے وہ ساری مخلوقات سے بالا خالق کو دیکھتی ہے۔ مذہب و ملت اور عقائد کے فرق کی اصل جڑ یہی ہے۔ غرض کہ تفکر کا مقصد علم اور معرفت کا فائدہ حاصل کرنا ہے۔ جب

م اور معرفت دل کو حاصل ہو گئی، دل کی حالت بدل جائے گی۔ جب دل کی حالت بدلے گی تو عمل اور اعضا کے کام بھی بدل جائیں گے۔ تب گردش
منزل میں پہنچ جائے گا اس کے بعد گردش سے روش کی منزل میں اور پھر روش کی منزل سے کشش کے مقام میں پہنچ جائے گا۔ اس مقام میں پہنچنے کے
یک ہی جذبہ میں خداوندی خدمات کی عنایت سے اس مقام پر پہنچ جائے گا جہاں کوئی جنات اور انسان اپنے مجاہدہ اور ریاضت کے زور سے نہیں پہنچ
ور تفکر کا پھل بے انتہا علم و احوال ہے جس کا حساب و شمار نہیں ہو سکتا۔ یہ اس لیے کہ اگر کوئی مرید تفکر کے راستوں اور طریقوں کو گننا اور
چاہے کہ کس کس طریقوں سے تفکر ہوتا ہے تو شمار نہ کر سکے۔ کیونکہ فکر کرنے کے طریقے بے انتہا ہیں۔ اور اس کے پھل بھی بہت ہیں۔ اور تفکر
کے متعلق بزرگوں کے بہت قصے ہیں۔ عبداللہ مبارک نے سہیل بن علیؒ کو دیکھا، تفکر کی حالت میں چپ چاپ بیٹھے ہوئے تھے۔ انھوں نے پوچھا کہاں
تک پہنچے؟ انھوں نے کہا صراط تک۔ خواجہ شریح رضی اللہ عنہ راستہ چل رہے تھے، درمیان میں کہیں بیٹھ گئے اور سر پر کمبل تان لیا اور زار زار
رونے لگے۔ لوگوں نے پوچھا کیا ہوا؟ آپ نے کہا میں اپنی عمر کے بیکار گزر جانے پر غور کر رہا ہوں۔ خواجہ داؤد طائی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک دن چاندنی
رات میں ملکوت آسمان کے متعلق تفکر کیا اور روئے۔ یہاں تک کہ روتے روتے پڑوسی کے گھر میں جا گرے۔ گھر کا مالک بستر سے ننگے بدن اچھل پڑا۔
سمجھا کوئی چور کودا ہے۔ جب حضرت داؤد کو دیکھا تو پوچھا آپ کو کس نے گرا دیا۔ آپ نے کہا مجھے اپنے گر پڑنے کا کچھ حال معلوم نہیں۔ محمد واسع
رحمۃ اللہ علیہ نے کہا۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد بصرے کا ایک آدمی ان کی والدہ کے پاس گیا اور پوچھا وہ کس طرح عبادت کیا کرتے
تھے؟ انھوں نے کہا کہ دن رات گھر کے ایک کونے میں پڑے رہتے تفکر میں غرق۔ خواجہ فضیل رضی اللہ عنہ نے کہا کہ تفکر ایک ایسا آئینہ ہے جو تیری
بھلائی اور برائی کو تجھے دکھا دیتا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھیوں سے پوچھا گیا کہ آج آپ جیسا روئے زمین پر کوئی شخص ہے؟ انھوں نے جواب
دیا، ہاں ہے۔ وہ شخص جس کی باتیں ذکر اور جس کا چپ رہنا فکر ہے اور اس کی نگاہیں عبرت ہیں وہ ہماری طرح ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ
نے فرمایا۔ اگر دو رکعت نماز تفکر کے ساتھ ادا کی جائے تو وہ رات بھر کی اس نماز سے، جو بے دلی کے ساتھ پڑھی گئی ہو کہیں بہتر ہے۔ اور تفکر کی
فضیلت میں لوگوں کے بیانات بہت ہیں۔ اس خط میں اسی قدر لکھنا کافی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہماری مدد فرمائے تاکہ ہم اس میں تفکر کرتے رہیں جیسا کہ چاہئے
اور تفکر کا طریقہ اچھی طرح ہم پر آسان کر دے۔ **بمنه وفضله انه هو المیسر والمعین** (اپنے فضل و کرم سے وہی آسان کرنے والا اور مددگار ہے)
اور اگر تم چاہتے ہو مگر میسر نہیں ہوتا تو دل چھوٹا نہ کرو کیونکہ خداوند کریم نے فرمایا ہے **ادعونی استجب لکم** (تم ہم کو پکارو، ہم تمہاری دعائیں
قبول کریں گے) حضرت موسیٰ کے دعا سے بڑھ کر کسی کا دعا نہیں۔ حضرت موسیٰ کے خلوص سے بڑھ کر کسی کا خلوص نہیں۔ حضرت موسیٰ کے شوق
سے بڑھ کر کسی کا شوق نہیں اس پر لن ترانی کی ٹھوکر یعنی تو ہم کو نہیں دیکھ سکتا۔ **هكذا قهر الاحباب** (دوستوں کا غصب و غصہ ایسا ہی ہوا
کرتا ہے) اے بھائی! ایک گروہ اس کی جستجو میں رات دن سرگرداں ہے، اور اس کو یہ جواب ملتا ہے **الطلب رد والطریق سد** (طلب رد کر دی
گئی اور راستہ بند کر دیا گیا)

تدبیر کند بندہ و تقدیر نہ داند تدبیر بہ تقدیر خداوند چہ ماند

(بندہ تدبیر کرتا ہے مگر اس کو تقدیر کی خبر نہیں۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت کے سامنے کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوتی)

بسیار خواستم کہ نہم سر بر آستانت من خواستم ولے چہ کنم چوں خدا نخواست

(میں نے بہت چاہا کہ تیری چوکھٹ پر اپنا سر رکھوں۔ میں نے تو چاہا لیکن کیا کروں اگر خدا ہی نہ چاہے)۔ اور ایک گروہ راستے سے بھٹکا ہوا
خواہشات نفسانی اور غفلت میں پڑا ہوا ہے۔ اس کے لیے غیب سے یہ آواز آتی ہے۔ **والله یدعوا الی دار السلام** (اللہ ان کو دار السلام کی طرف
بلاتا ہے)

(عبادت خانے سے بیگانہ بنا کر نکال دیتا ہے اور بت خانے سے یہ کہہ کر ساتھ لے آتا ہے کہ یہ میرا دوست ہے) - ایک شخص کو دیکھا گیا کہ وہ بغیر کھانے پینے کے ساماں اور بغیر سواری کے دوڑ رہا ہے - لوگوں نے پوچھا - کیا تیرے او پر حج واجب ہے ؟ اس نے کہا - میں یہ تو بہت دنوں کہ مجھ پر حج فرض نہیں ہے لیکن اس کو کیا کروں کہ مجھے گھر میں بیٹھنے بھی تو نہیں دیتے - ایک لڑکا کسی مکتب جانے سے بھاگ گیا تھا لڑکوں کو اسے پکڑ لانے کے لیے بھیجا - وہ زبردستی اس کو لیے جاتے تھے - ایک بوڑھے آدمی نے دیکھا اور جھوم کر کہنے لگا - کیا خوب ! زبردستی پکڑے لیے جارہا ہے تاکہ اپنی صفت اس کو عطا کرے - یاروں کے کلیجے ٹکڑے ٹکڑے ہوگئے - عقلیں اور آنکھیں اندھی ہو گئیں - ہونٹوں آنکھیں تعلقات مٹا دیئے گئے اور مہر لگا دی گئی - جیسا اس نے چاہا -

امروز بہانہ در انداختہ اند فردا آن کنند کہ دے ساختہ اند

(آج بہانے مقرر کر دیئے ہیں اور کل وہی کریں گے جو کچھ سوچ سمجھ رکھا ہے - والسلام

بقیہ تبصرہ کتب

تم سمیٹ جتنے ملیں دور دور تک
تیشے کے گھر کو لیے بچانے کی بات کر

مسکرا کر آپ نے دیکھا مجھے
آج کچھ جینے کی صورت ہوگئی

یوں کھلے عام جو تعریف کے پل باندھوگے
سستے داموں مری پہچان کا سودا ہوگا

تم پرستو مری تعظیم کرو
تم نے ہاتھوں سے سنوارا ہے مجھے

[illegible]

[illegible] محترم شمس الدین فریدی امروہوی صاحب کی سرگزشت "قلم اور تصویری" "دو آتشہ" سے [illegible] کیا گیا [illegible]
[illegible] شائع ہونے والی ہے۔ یہ ۵۰۰ کے قریب صفحات پر مشتمل اور مشہور اردو داں کی اسی (۸۰) سالہ زندگی کے
[illegible] تجربات، مشاہدات اور تاثرات سے معمور ہوگی جو نہایت رواں دواں اور سلیس اردو میں قلمبند کئے گئے ہیں
[illegible] کے مضمرات کی ایک جھلک۔ کشمیر، دہلی، کلکتہ اور امروہہ کو اہمیت افروز تاریخی حقائق [illegible] رنگ ہیں۔
امروہہ کی سماجی حالت، [illegible] اکابر، سید اور [illegible] کا ذکر [illegible] اور بچپن کی زندگی کا مفصل احوال۔
[illegible] میں تعلیم و تربیت کے کوائف اور وہاں کے سماجی حالات۔ بمبئی میں ۱۱ سالہ قیام۔ اخبار نویسی کا آغاز۔ آٹھ سال
[illegible] صحافت کی ادارت۔ وہاں کے اخباروں اور اخبار نویسوں سے تعارف۔ بمبئی اردو جرنلسٹس ایسوسی ایشن کا قیام
[illegible] کی خدمات۔ خلافت ہاؤس کے مقیمیں اور مہمانوں کا مفصل حال جو کسی اور جگہ نہیں مل سکتا۔ بمبئی سے
[illegible] کو روانگی اور آٹھ سالہ قیام (۴۹-۵۰) حیدرآباد کے حالات۔ اخباروں، اخبار نویسوں، شاعروں کے دلچسپ
[illegible] دہلی میں ایک سالہ قیام کا حال۔ ۵۰ء میں کلکتہ آمد اور یہاں کے حالات۔ پٹنہ میں آل انڈیا اردو ایڈیٹرس
کانفرنس کے قیام۔ کلکتہ کے اجلاس اور اس میں شیخ عبداللہ کی شرکت سے لے کر آج تک کا تذکرہ۔ آل انڈیا ایڈیٹرس
کانفرنس کے [illegible] کے اجلاس میں شرکت اور شمالی ہند کا دس روزہ مطالعاتی سفرنامہ۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت کچھ
[illegible] ایسے واقعات جو افسانوں، ناولوں، فلموں وغیرہ کا موضوع بن سکتے ہیں۔
کتاب کے بعض ابواب القلم میں مسلسل شائع ہو چکے ہیں۔ ایک اور مختصر باب اس شمارے کی زینت بن رہا ہے۔

مدیر القلم

[illegible] ہے کہ امروہہ کشمیر میں واقع ہے اور کشمیر جو بعد میں دہلی کلکتہ [illegible] ہندوستانی سیاست کے نشیب و فراز [illegible] رہا۔ اس
[illegible] اور بھی واقع پذیر ہوا۔ علاء الدین خلجی نے گجرات فتح کیا تو [illegible] کے علاوہ
[illegible] آئے جن میں راجہ کرن باگھیلا کی حسین [illegible] کولادیوی [illegible] ایک خادمت حسین [illegible] غلام ملک
[illegible] نے بادشاہ کے لئے لئے۔ کولادیوی کو تو [illegible] محل میں داخل کر لیا [illegible] اور باریوں
[illegible] کے جنگ میں ہلاک ہونے یا بادشاہ کے حکم سے قتل کئے جانے کے بعد ترقی کر [illegible] ملک یا امیر
[illegible] آخری دنوں میں علاء الدین شدید بیمار رہا جس [illegible]۔ اس کے ۱۹۸
[illegible] قریب نہیں۔ [illegible] راجہ کرن [illegible] بڑی حسین
[illegible] اس پر قبضہ کرنے کے [illegible] اس کی عمر

موجودگی میں اس کے محل پر حملہ کر کے اس کی بیوی پر قبضہ کرنا چاہا تو مادھو کے بھائی نے مقابلہ کیا اور مارا گیا۔ مادھو آیا تو یہ دل شکن داستان سن کر اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ آتش انتقام کو بجھانے کے لئے وہ سیدھا دہلی جاکر علاء الدین کا وفادار ہو گیا۔ اسے گجرات پر حملہ کرنے پر اکسانے لگا اور مال و دولت کے علاوہ کرن کی رانی کنولا دیوی کے حسن و جمال کی ایسی تصویر کھینچی کہ علاء الدین کے منہ میں پانی بھر آیا اور اس نے الغ خاں کو لشکر جرار دے کر گجرات پر حملہ کرنے اور کنولا دیوی کو چھین کر لے آنے کے لئے روانہ کر دیا۔ رہنمائی کے لئے مادھو بھی اس کے ساتھ گیا اور آخر کار سخت کشت و خون، لوٹ مار اور دار و گیر کے بعد کنولا دیوی دہلی آگئی۔ اگرچہ پہلی ملکہ مالک یا ماہرو خانم پہلے ہی سے موجود تھی اور ولی عہد خضر خاں الملقب بہ شمس الحق اسی کے بطن سے تھا۔ ماں بیٹے میں سخت اختلاف بھی تھا۔ مالک خانم نے محل میں اپنا اقتدار برقرار رکھنے کی یہ ترکیب سوچ رکھی تھی کہ وہ اپنے بھائی الپ خاں سنجر کی بیٹی سے خضر خاں کی شادی کرا دے گی۔

دوسری طرف کنولا دیوی بھی ہار ماننے والی کہاں تھی اس نے ایک دن بادشاہ سے فرمائش کر دی کہ اس کی دو بیٹیاں تھیں جن میں سے ایک تو مر چکی ہے دوسری دیول دئی باپ کے پاس ہے مگر اسے منگوا دیا جائے گا تو بڑی عنایت ہوگی۔ بادشاہ نے ملک کافور کو جو راجہ کرن کا خاتمہ کرنے اور مزید فتوحات حاصل کرنے کے لئے گجرات جا رہا تھا اس خدمت پر بھی مامور کر دیا۔ جب وہ وہاں پہونچا تو گجرات کے ناظم (گورنر) نے راجہ سے اپنی بیٹی کو کہا مگر اس نے انکار کر دیا اور لڑائی کی تیاری کرنے کے لئے دیوگڑھ گیا تو وہاں کے راجہ نے بھی دیول دئی کی خواہش ظاہر کی اور کرن نے جو پہلے نسلی امتیاز کی وجہ سے اس رشتے سے انکار کر چکا تھا اس کی بات مان لی اور بیٹی کو راجہ کے بھائی کے حوالے کر دیا۔ وہ اسے غیر معروف راستوں سے دیوگڑھ کو لے کر چلا مگر راستے میں شاہی فوج کی ایک ٹکڑی سے جو ایلورا کے غار دیکھنے جا رہی تھی مڈبھیڑ ہو گئی جس کے نتیجے میں دیول دئی فوج کے ہاتھ لگ گئی اور دہلی بھیج دی گئی۔ اس وقت اس کی عمر ۱۰-۱۲ سال کی ہوگی۔ خضر خاں کا دل اس پر آگیا ملکہ مالک نے شہزادے کی شادی اپنی بھانجی سے کرا دی۔ شادی بڑی شان و شوکت سے ہوئی مگر خضر خاں کے دل کو چین نہ آیا اور وہ دیول دئی کی آتش فراق میں جل کر کباب ہونے لگا تو ملکہ کو بھی اس پر رحم آگیا اور محل کے اندر ہی اس کا نکاح خاموشی سے اس کی معشوقہ سے کرا دیا۔ جس کا اس کے اطوار اور دل و دماغ پر بہت اچھا اثر ہوا اور وہ عبادت گزاری اور پارسائی کی زندگی پر قانع ہو گیا۔ (۷۱۳ھ) اس داستان سے ایک اہم نتیجہ یہ بھی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اجنتا اور ایلورا کے غاروں سے لوگ اس وقت بھی واقف تھے اور یہ دعوا غلط ہے کہ انیسویں صدی میں کسی انگریز نے ان کا پتہ چلایا تھا۔ فلک ناہنجار کو خضر خاں کا سکون قلب گوارا نہ ہوا۔ ملک کافور نے بیٹے کے خلاف باپ کو بھڑکایا کہ وہ سلطنت پر قبضہ کرنے کی کوشش کر رہا ہے اور اس سازش میں اس کی ماں اور اس کا ماموں اور خسر الپ خاں بھی شریک ہیں چنانچہ بادشاہ نے الپ خاں کو گجرات سے بلا کر قتل کرا دیا اور ملکہ کو دوسرے محل میں بھیج دیا اور خضر خاں کو امروہہ چلے جانے اور شاہی بلاوے تک وہیں رہنے کا حکم دے دیا جس کی اس نے تعمیل کی۔ مگر کچھ دنوں بعد ہی وہ اپنی خوشی سے دہلی چلا آیا تو بادشاہ نے بظاہر تو شفقت کا سلوک کیا مگر ملک کافور کے بھڑکانے پر گوالیار کے قلعے میں قید کر دیا۔ ۷۱۵ھ (۱۳۱۵ء) میں علاء الدین پر موت کا قابو چل گیا تو ملک کافور نے اس کے چھوٹے بیٹے شہاب الدین کو جس کی عمر صرف سات سال تھی برائے نام تخت پر بٹھا دیا اور خود حکومت کرنے لگا۔ یہ بیٹا دیوگڑھ (دولت آباد) کے راجہ رام دیو کی بیٹی کے بطن سے تھا۔ اب کافور نے ایک امیر کے ساتھ کچھ سپاہی بھیج کر خضر خاں اور اس کے دوست شادی خاں کی آنکھیں نکلوا دیں۔ دیول دئی نے جو اس کے ساتھ تھی قاتلوں کو اپنے ارادے سے باز رکھنے کی ناکام کوشش کی۔ اب کافور نے علاء الدین کے بیٹے مبارک کو بھی قتل کرانے کا سامان کیا مگر ملکہ جہاں مالک خانم نے اس کے داؤں کا توڑ کر کے قتل کے لئے مقرر کئے جانے والے لوگوں سے ہی کافور کا کام تمام کرا دیا۔ اس کے بعد مبارک نے شہاب کو اندھا کر کے گوالیار بھیج دیا اور خضر خاں سے دیول دئی کو اپنے حوالے کر دینے کو کہا۔ اس نے انکار کیا تو مبارک نے خضر خاں اور گوالیار کے قلعے کے تمام قیدی شہزادوں کے قتل کا حکم دے دیا۔ عورتیں اور بچے وہاں سے دہلی روانہ کر دیئے گئے جن میں دیول دئی بھی تھی جس کا ایک ہاتھ خضر خاں کے قاتل کی مزاحمت کرتے ہوئے زخمی ہو گیا تھا قطب الدین مبارک شاہ نے اس سے زبردستی نکاح کر لیا۔ پتا نہیں کہ کنولا دیوی گوالیار کے قیدیوں میں تھی یا نہیں اور علاء الدین کے بعد اس پر کیا افتاد پڑی۔ ممکن ہے اسے بھی زبردستی کی شادیوں سے دوچار ہونا پڑا ہو۔

خسرو خاں کا ہنگامہ

جس طرح علاء الدین کافور کا دیوانہ اور اس کا فرمانبردار تھا اسی طرح مبارک شاہ ایک نومسلم گجراتی غلام حسن عرف خسرو خاں پر فدا تھا۔ اس بادشاہ کو بے وقوف بنا کر شاہی محل میں اپنی ذات برواڑ کے گجراتی بھر لئے اور قلعے کی کنجیاں بھی حاصل کرلیں۔ ان لوگوں نے شاہی محل کو مندر میں تبدیل کردیا۔ خسرو نے شاہی خزانہ لٹا کر بہت سے حامی پیدا کرلئے مگر عام مسلمان برگشتہ ہوگئے اور راجپوتوں نے بھی نیچ ذات کہہ کر اس کا ساتھ دینے سے انکار کردیا پھر بھی اس نے اتنا ضرور کیا ایک رات مبارک شاہ کو اس کے بیوی بچوں سمیت قتل کرکے تخت اور دیول دئی پر قبضہ کرلیا۔ یہ حال دیکھ کر ملک غازی نے جو علاء الدین کے زمانے سے سندھ اور پنجاب کا ناظم تھا اور تاتاریوں کے ۲۹ حملے کامیابی سے روک چکا تھا دہلی پر حملہ کرکے خسرو خاں گجراتی کے چار مہینے کے راج کا خاتمہ کردیا اور وہ بھی کیفر کردار کو پہونچ گیا، اب چونکہ خلجی خاندان کا کوئی وارث نہ تھا اس لئے پرانے امیروں نے ملک غازی کو بادشاہ بنادیا اور تغلق خاندان کا دور دورہ شروع ہوگیا جس کا پہلا حکمراں ملک غازی غیاث الدین تغلق ہوا۔ اس کے بعد سے دیول دئی بھی گمنام ہوگئی اور پتہ نہیں وہ کہاں گئی اور اس پر کیا گزری۔

امیر خسرو نے جو نوجوانی ہی میں خضر خاں کے دربار سے وابستہ ہوگئے تھے دیول دئی کا نام دول رانی کرکے اپنی مشہور فارسی مثنوی دول رانی اور خضر خاں لکھی جسے مثنوی عشقیہ بھی کہا جاتا ہے۔ دول رانی سے خضر خاں کا نکاح ۷۱۳ھ میں ہوا۔ اس کے بعد ہی اسے امروہے میں نظر بند کیا گیا۔ ممکن ہے خضر خاں نے اس کے بعد ہی ان کو اپنی کہانی سنا کر اسے نظم کرنے کو کہا ہو۔ یہ مثنوی ۷۱۵ھ میں لکھی گئی تاہم یہ بات یقین کے ساتھ کہنا مشکل ہے۔ خضر خاں کے ساتھ امیر خسرو اور دول رانی نے بھی کچھ دن امروہے میں قیام کیا یا نہیں۔ مثنوی میں امروہے کا نام کئی جگہ آیا ہے۔

عورتیں اور فاتح

ہندوستان کے مسلم فاتحین اور حکمرانوں اور عام مسلمانوں پر سب سے بڑا الزام یہ ہے کہ انہوں نے علاقہ جات مفتوحہ میں لوٹ مار ہی نہیں بلکہ عورتوں کو خاص طور پر ان کے شوہروں اور دوسرے عزیزوں سے محروم کرکے ان پر زبردستی قبضہ کیا اور گھروں میں ڈالا یہاں تک ایک ایک عورت کے لئے ملک کے وسیع علاقوں کو تہ و بالا کرے اور خون کی ندیاں بہانے سے بھی گریز نہیں کیا۔ یہ الزام غلط بھی نہیں ہے لیکن اس پر بحث کرتے وقت وقتی حالات کو مد نظر رکھنا بھی ضروری ہے۔ اس زمانے میں ساری دنیا میں یہی رواج تھا کہ جنگ میں جو عورتیں ملیں ان سے ان لوگوں کے گھر بسائے جائیں جو عورتوں سے محروم ہیں۔ یہ ضرورت تھی مگر بادشاہوں اور امیروں کے لئے نہیں وہ عورتوں پر زیادہ تر ہوس رانی کے حد سے قبضہ کرتے تھے جو یقیناً اسلام کی تعلیمات اور اخلاق کے ضابطوں کے خلاف تھا مگر ہر زمانے کے ضابطے الگ ہی ہوتے ہیں۔ اس زمانے کا ضابطہ یہی تھا کہ حملے کرکے زر، زمین اور زن پر قبضہ کیا جائے۔

ہندو عورتوں کے مسلمانوں کے پاس جانے کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہوئی کہ اس زمانے میں ہندوستان کے دیہات میں غربت بہت زیادہ تھی اور عورتوں کو اقتصادی بوجھ خیال کیا جاتا تھا۔ تاریخ کی کتابیں ایسے واقعات سے بھری پڑی ہیں کہ ہندو دیہاتی اپنی بیٹیوں کو بھیڑوں بکریوں کی طرح شہروں میں لاکر مسلمانوں کے ہاتھ فروخت کرتے تھے۔ ان کی قیمتیں بھی کتابوں میں درج ہیں اور وہ عمر اور شکل و صورت کے درجے کے مطابق ۵۰ پیسے اور دو چار روپئے سے زیادہ نہیں۔ قحط کے دنوں میں تو بچوں کو موت کے منہ سے بچانے کے لئے مفت دئے جانے کا بھی رواج تھا اور یہ بھی حقیقت ہے کہ ایسے مصیبت کے دنوں میں بھوک سے مرتے ہوئے لوگ اپنے ہی بچوں کو کاٹ کر کھا لینے پر بھی مجبور ہوجاتے تھے۔ اس خریداری کے ذریعے مسلمان اپنی خانہ آبادی اس لئے زیادہ کرلیتے تھے کہ مالدار ہندو چھوت چھات کی وجہ سے کم ذات لوگوں کے عورتوں بچوں کو خریدنے اور پالنے کے روادار ہی نہ ہوتے تھے۔ اونچے خاندانوں خصوصاً راجپوتوں میں یہ رسم تھی کہ مرد میدان جنگ میں جوہر کرکے ہلاک ہوجاتے تھے تو ان کی عورتیں

خصوصاً محلاتی عورتیں آگ میں جل کر ستی ہو جاتی تھیں۔ یہ رسم جن لوگوں کی وجہ سے پڑی ان کی کون تعریف کر سکتا ہے۔

رہے مسلمانوں کے حملے اور فوجی مہمات تو اس کی توجیہ یہ ہے کہ اس زمانے میں کسی علاقے کی کوئی حد مقرر نہ تھی۔ جس نے کچھ جنگی طاقت حاصل کر لی اسی نے بساط بھر علاقہ فتح کر کے اس کا نام اپنی بادشاہت رکھ دیا۔ مسلمانوں کے حملے شروع ہونے سے پہلے ہر یہ علاقہ جسے آج برصغیر ہند، پاکستان اور بنگلہ دیش کہا جاتا ہے سیکڑوں ریاستوں میں بٹا ہوا تھا۔ ان کے حکمران آپس میں بھی لڑتے رہتے تھے۔ ہندو راجہ ایک دوسرے سے انتقام لینے کے لئے بیرونی مسلمانوں کو حملہ کرنے کی دعوت بھی دیتے تھے۔ جیسا قنوج کے راجہ جے چند نے شہاب الدین غوری کو دعوت دے کر کیا۔ اور یہ بھی محض اس لئے کہ پرتھوی راج اس کی بیٹی کو اٹھا کر لے بھاگا تھا۔ پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ مسلمانوں کے ہاتھوں جتنا خون ہندوؤں کا بہا اس سے زیادہ مسلمانوں کے ہاتھوں خود مسلمانوں کا بہا۔ مغلیہ دور میں مردم آزاری کا سلسلہ کمزور ضرور ہوا مگر صرف امیروں کی حد تک۔ جب ان کو عورتوں کو جہیز کی جگہ ڈولے ملنے لگے تھے مگر نیچی ذاتوں کے اور غریب ہندوؤں اور مسلمانوں کی سماجی حالت میں کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوئی۔ جس سے مخلوط نسلیں عالم وجود میں آتی رہیں اور خود مغل حکمرانوں کی بڑی تعداد کی مائیں بھی ہندو رانیاں بنتی رہیں۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ سلطنت مغلیہ کے روبہ زوال ہو جانے پر بھی یہ رواج قائم رہا۔ خاص بات یہ ہے کہ ایک زمانے میں مغل شہنشاہوں نے بھی راجپوت راجاؤں کو مغل شہزادیوں سے شادیاں کرنے کی دعوت دی تھی مگر انہوں نے بہ خاطر اپنے تہذیب و تمدن کو محفوظ رکھنے اور بہ ظاہر اسے گستاخی کہہ کر مسترد کر دیا تھا۔ پھر بھی اتنی رواداری ضرور پیدا ہو گئی تھی کہ مغلوں کی تقلید میں شیواجی نے بھی اپنے فوجیوں کو مغلوں یا مسلمانوں سے جنگ کے وقت مسجدوں، مزاروں، قرآن مجید اور عورتوں کی بے عزتی سے بچنے کی سخت تاکید کر دی تھی اور ان کی زندگی میں اس پر عمل کی مثالیں بھی ملتی رہیں۔ کشمیر کے حالات میں میں یہ باتیں اس وجہ سے شامل کرنے پر مجبور ہوا کہ اس میں ہندوؤں کو مسلمانوں کے اصلی یا فرضی مظالم کی بنیاد پر مشتعل کرنے اور ان کے دور حکومت کے آثار مٹانے اور مسلمانوں سے ان کے دس بیس پشتوں کے بزرگوں کا انتقام لینے کا بہت زور ہو گیا ہے جس سے سیکڑوں سال کی رواداری، میل جول اور اس لقائے باہم کی بنیاد ہلائی جا رہی ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے ملک میں کیا ساری دنیا کی تاریخ میں عورت اور کسان سب سے مظلوم مخلوق رہی ہے اور جاگیرداری نظام کے عیش و عشرت، عیاشی فحاشی اور جنگ و جدل کے سارے قلعے انہی کی لاشوں پر کھڑے کئے گئے ہیں۔ نجیب الطرفین اور نسل خالص جیسی اصطلاحیں صرف کتابوں میں تو مل سکتی ہیں مگر حقیقی زندگی میں ان کو تلاش کرنا تحصیل حاصل ہے۔

اب تو یہ برصغیر ۵۰ سال سے آزاد ہے مگر ہندوستان میں غریبوں کی بیٹیوں کی عصمت فروشی کے لئے خرید و فروخت بڑے پیمانے پر ہنوز جاری ہے۔ غریبوں کو کچھ پیسے ادھار کے نام پر دے کر ان کے مردوں، عورتوں اور بچوں کو برسوں بلکہ ساری عمر اور نسل در نسل کے لئے بندھوا مزدور بنانے کی شیطانی رسمیں آج بھی جاری ہیں۔ نو عمر لڑکوں کو قیدی بنا کر ان سے ۱۸-۲۰ گھنٹے کام لینے کی شکایت کس نے نہیں سنی۔ الغرض عورتوں اور کسانوں کی بدبختی کے معاملے میں مسلمانوں ہی کو مورد الزام قرار دینا کسی طرح بھی جائز نہیں۔ پاکستان میں آج بھی سندھ کے وڈیرے جائداد کی خاطر اپنی بہنوں اور بیٹیوں کی اللہ کو دھوکا دینے کے لئے قرآن شریف سے شادیاں کر رہے ہیں (نعوذ باللہ) اور بنگلہ دیش کی مسلمان عورتیں ہندوستان، پاکستان اور عرب ملکوں میں آج بھی فروخت ہو رہی ہیں۔

یہ شرمناک حالت ہے مگر اس کا کوئی علاج نظر نہیں آتا ہے۔

ظفر حنفی
PROFESSOR OF IQBAL CHA
UNIVERSITY OF CALCUTT
CAL -



ظہور منصوری نگاہ
M.P Electricity Board
Rewa (M.P) - 486001

رباعیات

○

لوں میں مقید ہیں پریشاں الفاظ
نہ بند، سسکتے ہوئے حیراں الفاظ
سامنے گونجے، شعر کہے، نظم لکھی
لفاظ، میرے کھوکھلے بے جاں الفاظ

○

ر خود کو سنبھالوں نہ میں آنسو کی طرح
یہ فن بھی ہے تاثیر میں جادو کی طرح
دن رات گھمائے مجھے صحرا صحرا
خوشبوئے سخن نافۂ آہو کی طرح

○

ہر گام پہ سو بار جھجکتی حیرت
آئینہ در آئینہ بھٹکتی حیرت
رہ بر نہ اگر جھوٹ سا ملتا اس کو
سچ کو کبھی پہچان نہ سکتی حیرت

○

احساس ہو مردار کہ تاریک ضمیر
نادیر لرزتی ہے کماں چھوڑ کے تیر
ظالم کا ہر اک فعل سزا ہے اس کی
زنجیر ہے زنجیر برائے زنجیر

○

یہ موسم گل اور یہ لو کے جھکڑ
پرنور فضاؤں میں یہ کالے اندھڑ
اس چاند کی چودہ کو لگا ہے کرفیو
چلنے لگی بندوق کہیں تڑ تڑ تڑ

○

محدود فضاؤں میں کدھر جاؤں میں
حبس میں کہیں گھٹ کے نہ مرجاؤں میں
لازم ہے پر و بال سنبھالے رکھنا
ایسا نہ ہو آپے سے گزر جاؤں میں

○

اوصاف کی توصیف تو ہوتی ہی ہے
قابل کی تعریف تو ہوتی ہی ہے
چھوٹے کا حق عزت، دولت، شہرت
بچے کو تکلیف تو ہوتی ہی ہے

○

سبزے کے نمو کو بھی ترستی ہوگی
بستی، کہ جسے دھوپ ہی ڈستی ہوگی
اے شبنم احساس پہ چلنے والے
سوچا ہے کہیں آگ برستی ہوگی

○

تم ساتھ چلوگے؟ نہ چلوگے شائد!
اشکوں میں ڈھلوگے؟ نہ ڈھلوگے شائد!
اس راہ میں گھنگھور اندھیرا ہے بہت
دن رات جلوگے؟ نہ جلوگے شائد!

○

وہ جذبہ و احساس کہاں سے لاؤں؟
جو ٹوٹ گئی آس، کہاں سے لاؤں؟
تم ڈھونڈ تو لائے ہو اب امرت لیکن
میں کھوئی ہوئی پیاس کہاں سے لاؤں؟

ریت گھروندا

شرون کمار ورما
180/11 کوچہ لمباں
امرتسر - 143006 (پنجاب)

وہ ایک ابر آلود، سرمئی شام تھی۔

بنسی نے رکشہ پیپل کے سائے میں لگا دیا تھا اور خود بیڑی سلگا کر، گدی پر نیم دراز ریلوے اسٹیشن کی بتی کو دیکھ رہا تھا جیسے وہ ان کی قسمت کا ارہ ہو۔ ریلوے کا محکمہ دہلی سے آنے والی گاڑی کے لیٹ ہو جانے کا تیسری بار اعلان کر کے خاموش ہو گیا تھا۔ بنسی کو عجیب سی خوشی اور اطمینان کا ساس ہوا تھا۔ خراب موسم، رات کا وقت اور دیر سے آنے والی ٹرین۔ وہ مسافروں سے منہ مانگا کرایہ وصول کر سکے گا۔

پیپل کے پتوں پر مینہہ کی پہلی بوندیں ٹپکیں تو بنسی لپکتا ہوا کھلے میں آگیا۔ خوش ہو کر آسمان کی طرف دیکھا۔ بادل گھرے ہوتے دیکھ کر لمبی ی سہائی اور خوش سا، دیسی شراب کے ٹھیکے کی بغل میں بنے ٹین کے شیڈ کے نیچے جا کھڑا ہوا۔ کچھ رکشہ والے اور وہاں بیٹھنے والا بوڑھا بھکاری وہاں پہلے ہی موجود تھے۔ پاس کھڑے مکندی نے پریشانی سے کہا۔

"بادل بہت گہرا ہے، کھل کر برسے گا"۔

"اچھا ہی ہے"۔ بنسی نے خوشی کا اظہار کیا۔

"کیا اچھا ہے"۔

موسم خراب ہو اور دیر ہو چکی ہو تو سواری زیادہ کرایہ دیتی ہے"۔

"اور اس مینہہ اور سردی میں جو رکشہ کھینچنا پڑے گا وہ"۔

"وہ تو ویسے بھی کھینچنا پڑتا ہے"۔

"آج کل سواریاں بہت سیانی ہو گئی ہیں۔ کم اور ہلکا سامان لے کر نکلتے ہیں لوگ، کرایہ زیادہ مانگو تو پیدل ہی چل دیتے ہیں"۔

"اس موسم میں بنسی نے آسمان کی طرف دیکھا تو اس کی نگاہیں زنگ آلود ٹین کی چھت سے ٹکرا کر پلٹ آئیں۔ "ہاتھ جوڑیں گے دیکھ لینا۔ مزہ ے گا بیوی بچے ساتھ ہوں تو صورت دیکھنے والی ہوتی ہے"۔

بارش ابھی تیز نہیں ہوئی تھی لیکن لگاتار ہو رہی تھی۔ ہوا کا جھونکا پیپل کے پتوں سے الجھتا آتا تو کپکپی سی چھڑ جاتی۔ بنسی کی گرم چادر اور پلاسٹک ٹ رکشہ کی سیٹ کے نیچے خانے میں محفوظ تھی۔ ریلوے اسٹیشن کے پورچ کے ایک کونے میں قلیوں نے آگ جلا رکھی تھی اور اس کے گرد بیٹھے ہاتھ سینک رہے تھے۔ بنسی نے سوچا ان میں جا بیٹھے۔ تھوڑا سا گرم ہو لے، ایک آدھ بیڑی پی لے۔ اس نے قریب کھڑے رکشہ والوں کی طرف دیکھا اور ارادہ ل دیا، پتا نہیں کب، کدھر کی سواری مل جائے۔ ٹھیکے کی کھڑکی کے سامنے چند آدمی کھڑے تھے۔ دروازے کے تختے پر نرخ لکھے تھے پوا سترہ روپے، ا ستیس روپے، بوتل ساٹھ روپے۔ احاطے میں پینے والوں کے ہنسنے اور بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ بنسی کو کپکپی سی محسوس ہوئی، حلق سوکھتا سا لگا

رکشے سے چلنے والے کے ہاتھ میں لو جاتا تھا۔ اس نے سوچا اس شخص سے پاؤ بھر شراب لے لے، اس طرح دونوں کو ایک ایک روپیہ بچ جائے گا۔ خالی ہوا
ں مطلب کے لئے رکشہ کے خانے میں رکھا تھا۔ لیکن اس نے پھر ارادہ بدل دیا۔ سواری مل جائے تو گھر پہنچ کر آرام سے پیئے گا۔ اگر سواری دور کی
ملی تو راستے سے دو سو گرام مچھلی بھی لے لے گا۔ اس نے ریلوے اسٹیشن کی طرف دیکھا۔ قلی کچھ اپلے اور رومال سے اکٹھی کی ہوئی چھوٹی چھوٹی لکڑیاں آگ
میں ڈال رہے تھے۔ پورچ میں، باہر اور سڑک پر کاریں کھڑی تھیں۔

انکوائری کے مائک سے ٹرین کے ایک گھنٹہ اور لیٹ ہو جانے کا اعلان کیا تو مکندی ذرا سی ہچکچاہٹ کے بعد شیڈ سے نکل کر کھلے میں آگیا۔ پل
پر بوندوں کو چہرے پر جیسے جھیلا پھر رکشہ لے کر سڑک پر نکل گیا۔

"مکندی ٹھہر جا، آج سواری ملے گی، میرا دل کہتا ہے"۔

"سردی سے جان نکلی جا رہی ہے، بارش تیز ہو گی اور گاڑی کا پتا نہیں، کب آئے"۔ مکندی پیڈل مارتا، بھیگتا پل کی طرف چلا گیا۔ اس نے کچھ
فاصلے پر، اندھیرے میں شاید کسی سواری سے بات بھی کی تھی، شاید سودا طے نہیں ہو سکا۔

"تو بھی سواریاں تو یہ موٹریں اور ٹیکسی وہیلر لے جائیں گے"۔ دوسرے رکشہ والے نے کہا۔

"گھبراتا کیوں ہے، شہر میں سب کے پاس تو موٹریں نہیں"۔ بنسی نے شاید خود کو سمجھایا اور حوصلہ دیا تھا۔ "اپنی اپنی قسمت کا سب کو ملتا
ہے"۔

وہ سی سی کرکے چلا گیا۔ بنسی نے زیادہ کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا۔ اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ ایک پل کو اسے اپنے نئے رکشہ کے ٹھیکے کا
خیال آیا۔ اس نے سوچا لاکھوں کی موٹریں بھیگ رہی ہیں یہ تو رکشہ ہے۔

ٹھیکے کے احاطے سے دو شرابی جھومتے ہوئے نکلے اور پیدل ہی شہر کی طرف چلے گئے۔ ایک نے رکشہ میں چلنے کی بات کی تھی۔ دوسرے نے یہ کہہ
کر اس کی بات کاٹ دی تھی کہ ایسے رنگین موسم میں رکشہ کے ٹپ میں دبک سکڑ کر بیٹھنا جہالت ہو گا۔ وہ بھکاری جو دیر سے وہاں بیٹھا تھا، اپنا بوسیدہ
کمبل اور بوریا لپیٹ کر اٹھا۔ کچھ دور جا کر پلٹ آیا، اندر کی جیب سے کچھ روپئے اور سکے نکال کر کمیٹی کی لائٹ میں گنے۔ ٹھیکے کی کھڑکی تک گیا اور بوتل لے
کر اپنی راہ ہو لیا۔ بنسی نے بھکاری کو غلیظ گالی دی۔ مانگ کر پیتا ہے حرام خور۔ اس نے بیڑی کے لئے جیب میں ہاتھ ڈالا تو یاد آیا کہ وہ آخری بیڑی بھی
ختم کر چکا ہے۔ کچھ دیر تو اس نے بیڑی کی طلب کو دبائے رکھا، پھر سائیکل ٹھیلے کی طرف بڑھ گیا۔ بنڈل لے کر لوٹا تو اسے پنڈلیوں میں درد کا احساس
ہوا۔ وہ اس اینٹ پر بیٹھ گیا، جس پر سر رکھے وہ بھکاری وہاں لیٹا تھا۔ نہ جانے کدھر، کتنی دور کی سواری ملے اس بارش میں۔

مائک نے ٹرین کے اور لیٹ ہو جانے کا اعلان کیا تھا۔ اپ گاڑی اب دس بجے کی بجائے رات ایک بجے آئے گی۔ اسے لگا جیسے ریلوے والوں
نے اسے دھوکا دیا ہے۔ بہت سی موٹریں چلی گئی تھیں۔ قلی بھی شاید گھروں کو چلے گئے تھے۔ پورچ میں دو چار قلی ہی رہ گئے تھے۔ شیڈ میں دوسرے
کھڑے دو رکشہ والے بھی تھک کر چلے گئے تھے۔ اب ڈیپل کے نیچے صرف بنسی کا رکشہ رہ گیا تھا۔ اسے عجیب سا اطمینان ہوا کہ اب وہ سواری سے منہ
مانگا کرایہ وصول کرے گا۔

باغ کی طرف جانے والی پتلی، تنگ سی گلی سے ایک عورت نکل کر، بجلی کے کھمبے کے قریب ایک بند دکان کے شیڈ تلے آکھڑی ہوئی تھی
بنسی نے دیکھا وہ تیس بتیس کے پیٹے کی، گٹھے بدن اور ناٹے قد کی عورت تھی۔ اس کی شلوار قمیض کا سنہرا گوٹہ رہ رہ کر لشکارے مار رہا تھا۔ بنسی سمجھ
گیا تھا کہ وہ گاہک کی تلاش میں نکلی ہے۔ سردی بہت بڑھ گئی تھی۔ پورچ میں روشن آگ بجھ چکی تھی۔ اب شیڈ میں بنسی کے علاوہ ایک کتیا رہ گئی تھی
وہ ٹھیکے کے احاطے سے ایک لمبی سی ہڈی اور روٹیوں کے ٹکڑے اٹھا لائی تھی اور مزے سے چبا رہی تھی۔ سڑک پر سے جب کوئی کار یا اسکوٹر گزرتا تو اس
کی تیز روشنی میں وہ عورت اور شراب کی بوتلیں ایک پل کو جگمگا اٹھتیں۔ پھر وہی اندھیرا، سردی اور پتوں پر ہوتی بارش۔ بنسی نے سوچا وہ بھی چلا
جائے لیکن اس میں اسے اپنی شکست کا احساس ہوا۔ اس نے سوچ لیا کہ اب وہ سواری لے کر ہی جائے گا۔

احاطے سے نکلنے والے آخری گاہک نے آسمان کی طرف دیکھا اور جھومتا ہوا پل کی طرف چل دیا۔ چند قدم جاکر وہ رکا۔ پلٹ کر عورت کی طرف دیکھا اور اس کے سامنے جا کھڑا ہوا، پھر وہ دونوں اس اندھیری گلی میں غائب ہوگئے جس سے وہ عورت نکلی تھی۔

بنسی جانتا تھا کہ وہ باغ کے شمال میں بہنے والے گندے نالے کے کنارے کھڑی کسی غلیظ جھونپڑی میں کچھ وقت گزاریں گے۔ چند روپوں کے لئے جھونپڑی کے مکین کچھ دیر باہر سردی میں بھیگ لیں گے۔ مٹی کے تیل کی زرد روشنی والی کپی، کھجور کی چٹائی، مچھر اور نالے کی بدبو۔

اب بنسی وہاں بالکل اکیلا تھا۔ ٹھیکہ بند ہوگیا تھا، احاطے کی بتیاں بجھادی گئی تھیں۔ وہ کتیا بھی کسی بھٹی کی تلاش میں چلی گئی تھی۔ بنسی کو لگا جیسے اس نے خودکشی کرلی ہو۔ بارش تیز ہوگئی تھی۔ اس کا رکشہ پوری طرح بھیگ چکا تھا سرد ہوا کا جھونکا اس کی ہڈیوں میں سے گزر گیا تھا۔

تبھی مائک پر اعلان ہوا کہ ریلوے لائن بارش میں بہہ جانے کے کارن گاڑی اب نہیں آئے گی۔ پشتے بہہ جانے سے یاتایات ٹھپ ہوگیا تھا۔ بنسی بے زاری سے بلغم تھوکا اور شیڈ سے نکل آیا۔ چند سکنڈ کھڑا بھیگتا رہا۔ پھر گدی پر بیٹھ کر پاؤں پیڈل پر ٹکادیئے۔ سڑک پر ایک تیز رفتار کار اس پر پانی کے چھینٹے اڑاتی گزر گئی۔ اسے چادر اور پلاسٹک کی شیٹ کا خیال بھی آیا لیکن وہ بھیگتا رہا جیسے خود کو سزا دے رہا ہو۔

باغ کے سوئمنگ پول والے گیٹ پر کسی نے اسے رکنے کا اشارہ کیا۔ وہ امید کی کرن کی ہلکی سی روشنی میں سواری کے پاس جاکر رک گیا۔ وہی عورت تھی۔

"مقبول پورہ۔ کیا لوگے"۔

"بیٹھ جا، جو مرضی ہو دے دینا"۔

"کیا مطلب۔ پہلے کھرا کرلو، تم رکشہ والے بعد میں جھگڑا کرتے ہو"۔

"مطلب وطلب کچھ نہیں" بنسی نے عورت کی طرف دیکھا اور رکشہ بڑھالے گیا۔

بارش تیز ہوگئی تھی۔

ندر پال طائر
293_New Plot
(Sarwal) Jammu _ 18000

غزل

م جس کا اک اک نقش مٹانے پہ تلے ہیں
دیوں اسی تہذیب کا دم بھرتے رہے ہیں

ب بند شیں، سب ضابطے جسموں کے لیے ہیں
ذبات کہاں خول کے پابند رہے ہیں

یے طور ہیں ہم الجھے ہوئے دیر و حرم میں
یا اس کی حقیقت ہے، اسے بھول چکے ہیں

وشبو ہے، نہ رنگت ہے، نہ شوخی نہ لچک ہے
ب کے مرے گلشن میں عجب پھول کھلے ہیں

اس بات کا وحشت میں ہمیں دھیان کہاں ہے
وہ جسم ہے کس کا جسے ہم نوچ رہے ہیں

ہر گھر میں ہے چھایا ہوا ماتم کا اندھیرا
روشن جو دیے ہیں وہ مزاروں کے لیے ہیں

کیا ہوگا کوئی اس سے بڑا سانحہ طائر
ہم اپنی تباہی کا سبب آپ بنے ہیں

شفیع اللہ خاں راز اٹاوی
Katra Purdal Khan.
Urdu Road. Etawah (U P)

غزل

جو ناداں خود کو فرزانہ کہے گا
زمانہ اس کو دیوانہ کہے گا

اسے پھولوں کے پیمانے ملیں گے
گلستاں کو جو میخانہ کہے گا

بدل دے اپنی مایوسی کا عالم
کہاں تک غم کا افسانہ کہے گا

زباں تو کھینچ لی ساقی نے لیکن
ہمارا حال میخانہ کہے گا

خرد مندوں کی نیندیں اڑ گئی ہیں
اب اپنا حال دیوانہ کہے گا

زمانے کی ریاکاری نہ پوچھو
خدا کے گھر کو بتخانہ کہے گا

اسے اے راز پیمانے ڈسیں گے
جو راز پیر میخانہ کہے گا

نصیر پرواز
N2/1092/B. Govindpura.
BHOPAL (M P)

غزل

سفر امید کی راہوں کا بے نشاں بھی نہیں
زمیں کے سر پہ مگر کوئی آسماں بھی نہیں

میں اپنی روح کی سچائیوں میں تابندہ
حیات میرے لئے کوئی امتحاں بھی نہیں

یقین قرب دلوں کو نہ چھو سکا لیکن
ہمارے بیچ کوئی ساعت گماں بھی نہیں

کہیں کوئی تو مرا اعتبار قائم ہے
شکست ذات کا سایا شکست جاں بھی نہیں

جہاں گزار سکوں، زندگی کے دو لمحے
مرا نصیب وہ خوابوں کا سائباں بھی نہیں

میں اپنے دل کے دریچوں میں جھانک آیا ہوں
ترے وجود کا احساس تو وہاں بھی نہیں

کسی نگاہ نے پونچھے نہیں مرے آنسو
یہاں تو کوئی محبت سے بدگماں بھی نہیں

لکھا ہے مجھ کو گھنی دھوپ کی تمازت نے
مرے بدن پہ ترے لمس کا نشاں بھی نہیں

یہ اور بات یقیں پر یقین نہیں میرا
چراغ اپنے اجالوں سے بدگماں بھی نہیں

تعلقات کی سب ساعتیں بجا پرواز
ترے لبوں پر مگر میری داستاں بھی نہیں

خوگر غم

شیخ سلیم احمد

Block D.131 B.

Sector 26

NOIDA – 201301

یہ اس زمانے کی بات ہے جب گاؤں شہر سے دور ہوا کرتے تھے۔ ہمارے گاؤں میں رامو نام کا ایک شخص رہتا تھا۔ اس کے پاس ایک بیل گاڑی تھی۔ یہ واحد ذریعہ تھا گاؤں والوں کو شہر سے جوڑنے کا۔ شہر جانا ہو۔ شادی میں جانا ہو، کٹی فصلوں کو منڈی پہنچانا ہو، رامو کو اطلاع دیدو۔ وہ صبح اپنی بیل گاڑی کے ساتھ حاضر ہو جاتا تھا۔ یہ بھی ہوتا تھا کہ سواریاں ہی اس کے گھر پہنچ جاتی تھیں۔ سیدھا سادا سچا محنتی رامو۔ اس طرح کے رامو ہر گاؤں میں ہوتے تھے۔ ہندوستانی گاؤں کا نمائندہ رامو۔

رامو اپنے بیلوں سے ویسا ہی پیار کرتا تھا جیسے اپنے بچوں سے۔ ان کی دیکھ بھال بھی اپنے بچوں کی طرح کرتا۔ بیل بھی اس کے اشاروں پر کھیلتے۔ اس کا ایک بیل اچانک مر گیا۔ رامو کو تو اپنے بیل کی موت کا دکھ ہوا ہی، بیل کی موت گاؤں والوں کے لیے بھی بڑا حادثہ تھا۔ ان کے معمولات پر برا اثر پڑنے لگا۔ رامو کے گھر کا تو چولھا ہی ٹھنڈا پڑ گیا۔ اسے جلدی ہی دوسرا بیل خریدنا پڑا۔ اس کے لیے اسے قرض لینا پڑا تھا۔ رامو کا نیا بیل جوان تھا اور خوبصورت بھی۔ بیل کیا تھا مردانہ وجاہت کا نمونہ۔ چمچماتی کھال۔ ترو تازہ جسم جس پر بھورے رنگ کی دھاریاں تھیں۔ واقعی وہ چیتا جیسا لگتا تھا۔ لمبی گردن، بڑی بڑی آنکھیں، ہرن کی طرح پھرتیلا، شیر کی طرح طاقتور۔ لوگ دیکھتے تو دیکھتے ہی رہ جاتے۔ رامو کی پسند کی تعریف کرتے۔ اپنے بیل کی تعریف سن کر رامو کا سینہ فخر سے تن جاتا۔

رامو کئی روز تک مہمان کی طرح اپنے بیل کی خاطر تواضع میں لگا رہا۔ نیا نیا بیل تھا۔ بڑے چاؤ سے خریدا تھا۔ کچھ دن کے لیے لاڈ پیار ضروری تھا۔ مگر رامو کے گھر کا چولھا ٹھنڈا پڑا تھا۔ یہ لاڈ زیادہ دن نہیں چل سکتا تھا۔ ایک دن آخر مہمان داری ختم ہو گئی۔

رامو گھر کے اندر سے جوا نکال کر لایا اور اسے بیل گاڑی میں کسنے لگا۔ نئے بیل نے پرانے بیل کی جانب سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔ جوان بیل بوڑھے بیل کے تجربے میں شریک ہونا چاہتا تھا۔ مگر بوڑھا بیل بے نیازی سے مسکرایا۔ اس مسکراہٹ میں اس کی زندگی کی کڑواہٹ بھی چھپی تھی۔ وہ بظاہر گھاس کھانے میں مصروف تھا مگر جوان بیل کی پریشانی کو خوب سمجھ رہا تھا۔ اسے اپنی جوانی کے دن یاد آ گئے جب پہلی بار اس کی گردن پر جوا رکھا گیا تھا۔ اس کی حالت بھی ایسی ہی تھی۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟"۔ آخر جوان بیل نے اپنے بوڑھے ساتھی سے پوچھ ہی لیا۔ بوڑھے بیل کی آنکھوں میں طنزیہ مسکراہٹ جھانکنے لگی۔ اپنی تھوتھنی کو ناند کی منڈیر پر رگڑتے ہوئے وہ بولا۔

"یہ جوا ہے۔ جوا، جو تمہاری گردن پر رکھا جائے گا"۔ یہ سن کر خوف کی ایک لہر جوان بیل کے جسم میں دوڑ گئی۔

"جوا؟ میں اسے اپنی گردن پر رکھنے نہیں دوں گا"۔ جوان بیل کے لہجے میں بغاوت تھی۔

"تم کچھ نہیں کر سکتے۔ جوا، ہم بیلوں کا مقدر ہے"۔ بوڑھے بیل نے جواب دیا۔ اس کی آواز میں صدیوں کی گھٹن مجسم ہو گئی تھی۔ دونوں بیلوں نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا۔ جوان بیل کی آنکھوں میں خوف تھا۔ مستقبل کے خدشے تھے۔ بوڑھے بیل کی آنکھوں

میں بے بسی تھی۔ مایوسی تھی۔ کرب حاوی تھی مگر اطمینان تھا جو صبر کے بعد پیدا ہوتا ہے۔

جوان بیل بوڑھے کا جواب سن کر گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ رامو جوتے کو گاڑی میں باندھ کر بیلوں کی طرف بڑھا۔ کھونٹے سے بیل کھول کر گاڑی کے سامنے لایا۔ سانٹا اس کے ہاتھ میں تھا۔ پہلے بوڑھے بیل کے کندھے پر اس نے جوا رکھا جو اس نے خوشی خوشی رکھوا لیا۔ اس کے بعد وہ جوان بیل کی طرف بڑھا۔ جیسے ہی اس نے اس کی کمر پر ہاتھ پھیرا بیل اچھل کر ایک طرف ہو گیا۔ رامو نے محبت سے پچکار کر اسے اپنی طرف کھینچا مگر وہ ٹس سے مس نہیں ہوا۔ رامو نے اور زور لگایا تو بیل نے سینگ دکھائے۔ رامو ڈر کر پیچھے ہٹ گیا۔ اس کی نگاہوں میں غصہ تھا۔ سرکشی تھی۔ رامو بہت دیر تک اپنے نئے مہمان کے ساتھ اسی طرح جوجھتا رہا۔ مگر بیل کو اپنے بس میں کرنے میں کامیابی نہیں ملی۔ مجبور ہو کر رامو نے کوشش ترک کر دی اور اپنے شہر کا پھیرا ملتوی کرنا پڑا۔

رات کو ناند میں رامو نے گھاس کے ساتھ اچھی طرح سانی کی۔ گھاس کو چنے کے راتب سے ذائقے دار بنایا۔ جوان بیل سے لپٹ کر پیار کیا۔ تھوڑی سردی تھی۔ اس کی کمر پر جھول بھی ڈالی۔ مگر جوان بیل کا غصہ کم نہیں ہوا۔ اس نے گھاس کو منہ بھی نہیں لگایا۔ گویا وہ بھوک ہڑتال پر تھا۔ مگر بوڑھے بیل کو لذیذ مل گئی تھی۔ وہ جم کر گھاس کھا رہا تھا اور جوان ساتھی کی طرف بھی دیکھتا جاتا تھا۔ اس کی نگاہوں میں ہمدردی تھی۔ وہ کچھ بولنا چاہتا تھا مگر خاموش رہنا ہی بہتر سمجھا۔ وہ خوب سمجھتا تھا وقت ایک دن اس کے ساتھی کو راہ راست پر لے آئے گا۔ راہ راست۔ صراط مستقیم۔ بوڑھے بیل نے صراط مستقیم پر چلنے کے فائدوں کو جان لیا تھا۔ عمر اور تجربہ نے اسے پختہ کار بنا دیا تھا۔ جوا گردن پر رکھوانے میں اب اسے لذت کا احساس ہوتا۔ برسہا برس سے جو اس کی گردن پر رکھا جا رہا تھا۔ اس کی گردن کا بالائی حصہ کثرت استعمال سے کالا پڑ چکا تھا۔ نمازی پیشانی پر جیسے سجدوں کا نشان۔ اپنے آقا کی رضا پالینے میں کیسی روحانی خوشی ملتی ہے۔ اس کی کھال بے حس ہو چکی تھی۔ کھال بے حس ہو جائے تو زندگی آرام سے گزرتی ہے۔ بوڑھے بیل نے اس راز کو پا لیا تھا۔ بوڑھے بیل میں ٹھہراؤ پیدا ہو گیا تھا۔ مہاتماؤں کی طرح سنجیدہ و پر وقار۔ وہ اپنے آقا کے اشاروں تک کو سمجھنے لگا تھا۔ آقا کی منشا، اس کے حکم سے ذرہ برابر انحراف نہیں کرتا تھا۔ مالک اور وہ یک رنگ ہو گئے تھے۔ مالک کے اشاروں و منشا کو سمجھنا ہی اس نے واحد مقصد حیات بنا لیا تھا۔ اس کی ذات میں اس نے اپنے وجود کو تحلیل کر دیا تھا۔ مالک جب گھر سے باہر نکلتا تو بوڑھا بیل اسے دیکھتے ہی کھڑا ہو جاتا۔ ایک فرماں بردار نوکر کی طرح۔ رامو جب گاڑی میں سواریاں بٹھا کر چلتا تو اسے ہنکارنے کی ضرورت نہ پڑتی۔ بوڑھا راستے کے تمام کھانچوں، گڑھوں، اونچ نیچ سب سے واقف تھا۔ تمام موڑوں کو جانتا تھا۔ مالک کو اپنی منزل تک پہنچانے کے لیے کونسا ٹرن لینا ہے وہ اس سے بھی واقف ہو گیا تھا۔ گاڑی میں اگر کوئی مسافر بیمار ہے تو اسے اس کا بھی احساس رہتا اور وہ ذرا سنبھل کر چلتا۔ رامو کبھی گاڑی میں پڑ کر سو جاتا تب بھی بوڑھا بیل چلتا رہتا اور منزل پر پہنچ جاتا۔ اس کا پرانا رفیق کار جو اب اس دنیا میں نہیں تھا پوری طرح اس کا ہمنوا بن گیا۔ اس لیے بوڑھے بیل اور رامو کو کسی پریشانی کا سامنا نہ تھا وہ تینوں یک رنگ ہو گئے تھے۔ رامو بھی اپنے بیلوں کے ساتھ رہتے رہتے ایک تیسرا بیل ہی معلوم ہوتا۔

پریشانی تو اس نئے بیل نے کھڑی کر دی تھی۔ جوں جوں جوان بیل کی ہٹ بڑھ رہی تھی رامو کی فکر بڑھ رہی تھی۔ وہ سوچنے لگا کہ پہلے تو اس کا وفادار بیل مر گیا۔ نیا بیل خریدا تو سیرت کا خراب نکل گیا۔ صورت کو لیکر کیا کوئی چاٹے۔ کام کا نہ کاج کا سو من اناج کا۔ رامو تھک ہار کر بیٹھ رہا مگر بیل ٹس سے مس نہیں ہوا۔ جب پیار و محبت ناکام ہو گئے تو رامو نے تشدد کا سہارا لیا۔ سونٹے سے خوب دھنائی کی۔ حکم کا بندہ بنانے کے لیے طاقت کا استعمال بھی ایک راستہ ہے۔ جانور کی سرشت بھی انسان پر گئی ہے۔

جوان بیل نے جوا تو کندھے پر رکھوا لیا۔ مگر صراط مستقیم پر چلانے میں کامیابی نہیں مل رہی تھی۔ وہ راستے بھر پریشانیاں کھڑی کرتا۔ محبت نے کام نہیں کیا، طاقت کا استعمال بھی بیکار ثابت ہوا۔ رامو کو غیر شعوری طور پر تیسری طاقت کا ادراک ہوا۔ حکمت و دانش اس نے اپنے جوان دوست کی نفسیات میں دلچسپی لینی شروع کی۔ اس نے محسوس کیا نیا بیل جب کسی ندی یا باغ کے پاس سے گزرتا تو اس میں ایک خوشگوار تبدیلی پیدا ہوتی۔ وہ سرکشی ترک کر دیتا تھا اور مستی میں تیز تیز قدم بڑھاتا۔ وہ اوبڑ کھابڑ اور سنگلاخ راستوں سے کبیدہ خاطر ہو جاتا۔ اس کے اندر کا باغی بیل سر

ھارتا۔ بوجھ زیادہ ہو تو بھی وہ حکم عدولی کرتا۔ ایک دن رامو کو اس وقت بڑی حیرانی ہوئی جب گاڑی اناج کی بوریوں سے بھری تھی۔ جوان بیل دڑھے بیل کے ساتھ قدم سے قدم ملاکر، بوجھ کی پرواہ کیے بغیر اونچے نیچے راستوں پر بھی جھوم کر چل رہا تھا۔ رامو نے غور کیا ایسی کیا نئی بات تھی؟۔ س نے بیل کی مستی کا راز دریافت کر لیا۔ زمیندار کا چھوکرا نوکر بوریوں پر بیٹھا بانسری سے نغمے فضا میں بکھیر رہا تھا۔ تو موصوف کو موسیقی سے بھی لگاؤ ھا۔ رامو نے سوچا ہوگا۔

ایک اور دن جب زمیندار کی فیملی کے افراد کسی شادی میں شرکت کے لیے جانے کے لیے رامو کے دروازے پر آئے۔ نوجوان بہو، بیٹی اور بچے رنگ برنگ کپڑے پہنے گاڑی میں سوار ہوئے۔ رامو کے جوان بیل نے اپنی سواروں کو بڑے غور سے دیکھا اور دیکھتا ہی رہا۔ ایک خوشی کا حساس اس کے چہرے سے نمایاں تھا۔ رامو نے جوا اس کے کندھے پر رکھا تو بیل نے ذرا بھی چوں چرا نہیں کی اور راستہ بھر بھی سرخوشی کے عالم میں ہلتا رہا۔ نوجوان عورتیں آپس میں مذاق دلگی کر رہی تھیں۔ بچے اچھل کود کر رہے تھے۔ اور جوان بیل کی آنکھوں میں مستی ناچ رہی تھی۔ نسوانی آوازوں پر اس کے قدم گویا رقص کر رہے تھے۔

سواریاں خوبصورت ہوں، بوجھ کے ساتھ کوئی گویا ہو، موسم خوش گوار ہو، راستے جنگلوں اور پہاڑوں کے بیچ سے ہو کر گزرتے ہوں تو جوان یل کا دل ترنگ سے بھر جاتا، وہ بوجھ کی پرواہ کیے بغیر ہوا سے باتیں کرنے لگتا۔ بوڑھے ساتھی کے کمزور قدم جوانی، جوش اور اس کی طاقت کا ساتھ ینے سے انکار کر دیتے۔

حکمت و دانش کا تقاضا تھا کہ رامو اپنی من مانی نہ کرے اور اپنے نئے بیل کے مزاج کا خیال رکھے۔ یہ تبدیلی بقائے باہمی کے لیے ضروری تھی۔ ایدقدرت سے اس کا سانچہ بناتے وقت کوئی غلطی ہوئی تھی۔ دن بھر کی محنت کے بعد دونوں بیل جب اپنے تھان پر جگالی میں مصروف ہوتے تو بوڑھا یل اپنے نوجوان ساتھی کی عجیب و غریب حرکتوں پر اسے چھیڑا کرتا۔ خدا نے تمہیں بیل تو بنایا، ایک شاعر کا خمیر بھی تمہاری مٹی میں ملا دیا" ۔ بوڑھے یل نے چٹکی لی۔ جوان بیل نے اس پر ایک ٹھنڈی آہ کھینچی اور بولا۔

"دوست! تم شاعر کہتے ہو، میں تو جانور بھی نہیں۔ انسان نے مجھے خصی کر کے میری حیوانیت سے بھی مجھے محروم کر دیا۔

دونوں خاموش ہوگئے۔ فضا میں پھر سناٹا چھا گیا۔ مدتوں دونوں نے ایک دوسرے سے بات نہیں کی۔

رامو کی زندگی کے ایام یونہی دکھ سکھ کے ساتھ گزرتے رہے۔ اس کی بیل گاڑی اونچے نیچے راستوں سے ہو کر گزرتی رہی۔ وقت کا پہیہ غیر محسوس طور پر تیزی سے گردش کرتا رہا۔ بوڑھا بیل اور بوڑھا ہوتا گیا۔ جوان پہلے جیسا جوان نہیں رہ گیا تھا۔ جوان بیل کی کھال لٹکنے لگی تھی۔ اس کی ران کے بالائی حصے کی کھال بے حس اور کالی ہو گئی تھی۔ کسی سریلی آواز پر اس کا من جھومتا نہیں تھا۔ حسین چہروں اور فطرت کے خوش نما نظاروں میں اس کے لیے کشش باقی نہیں رہی اور اب وہ ان کی مدد کے بغیر بھی گاڑی کا بوجھ خوش دلی کے ساتھ کھینچتا تھا۔

اپنے مالک کے اشاروں کو بوڑھے بیل کی طرح سمجھنے لگا۔ اس نے خود کو اپنے آقا کی رضا کا تابع بنالیا۔ گردن پر جوا رکھنے میں لذت محسوس ہونے لگی۔ زندگی آرام سے گزرنے لگی۔ اس کا جسم بوڑھا ہو رہا تھا۔ مگر سیرت جوان و تابندہ ہو رہی تھی۔ بوڑھے ساتھی کی طرح وہ بھی رامو کا چہیتا بیل بن گیا تھا۔

آہ! اردو کے ممتاز طنز و مزاح نگار دلیپ سنگھ کا ۱۸/اگست ۹۶ء کو نئی دہلی میں انتقال ہو گیا۔ یہ اردو کا ایک بڑا نقصان ہوا۔ ہم ان کے پسماندگان سے اپنے گہرے دکھ کا اظہار کرتے ہیں۔ ان کے گزر جانے سے ہمارا ایک بہت اچھا، پیارا اور مخلص دوست جاتا رہا۔ اس کی کمی کوئی پوری نہیں کر سکے گا۔ (مدیر انشاء)

غزلیں

چلتے چلتے اشک بہانا سب کے بس کی بات نہیں
محرومی کو یوں اپنانا سب کے بس کی بات نہیں

سچ کیا ہے سچائی کیا ہے لوگ تو کہتے رہتے ہیں
دروازے سے باہر آنا سب کے بس کی بات نہیں

پل دو پل کا دھندلا رشتہ جیون بھر کیوں ساتھ رہے
اپنی سانسوں کو جھٹلانا سب کے بس کی بات نہیں

مٹی کیا ہے آگ کہاں ہے پانی کیسا کہاں ہوا
ان سب سے انسان بنانا سب کے بس کی بات نہیں

مجبوری بنیاد بنا کر سب لوٹ کے اٹھ جاتے ہیں
ہاتھ پکڑ کر ساتھ نبھانا سب کے بس کی بات نہیں

اپنا ہو کے کتنے پربت بکھرے وقت کی آندھی میں
وقت سے لیکن لڑ کر لانا سب کے بس کی بات نہیں

ہم نے جس کو سب کچھ مانا اس نے دامن چھوڑ دیا
چلتے چلتے وش پی جانا سب کے بس کی بات نہیں

پھول تو ہر کمرے کی رونق گلدانوں میں سجتے ہیں
کانٹوں سے دامن الجھانا سب کے بس کی بات نہیں

کانچ کی نازک دیواروں پر پتھر کی چھت مت رکھنا
خوابوں سے دل کو بہلانا سب کے بس کی بات نہیں

اوشا بھدوریا
29/30, N-3, Hostel-2
Piplani, Bhel, Bhopal

علاج رنج و غم روح سے گزر جاتے
کتاب درد کی خوشبو سے ہم سنور جاتے

خوشی، خمار، تبسم، امید کی خوشبو
سرائے جاں میں کبھی بھول کے ٹھہر جاتے

ملی تمہاری ہمیں حیلۂ حیات ہوئی
بہانے نور کے ہوتے تو بے اثر جاتے

تمہارے قدموں کی جنت ہی سے سکون ملا
وگرنہ فتنۂ دنیا سے ہم تو ڈر جاتے

پناہ ہم کو کتابوں میں مل گئی صغریٰ
حصار شہر میں ہوتے تو بے ہنر جاتے

صغریٰ عالم
Alam Building,
Shah Bazar,
Gulbarga

خود کو یوں وقفِ سزا مت کرنا
لب کسی سے بھی وفا مت کرنا

شاخ پر ہے تو خوبصورت ہے
شاخ سے پھول جدا مت کرنا

یہ بھی ممکن ہے دلکشی کھو دے
چاند کو روز تکا مت کرنا

اب وہ چہرا بھی اجنبی ہوگا
اس دریچے پہ صدا مت کرنا

میں تو شمع ہوں جلنا فطرت ہے
تم میرے ساتھ جلا مت کرنا

نفیس بانو شمع
"Aabshar"
E-62, Abul Fazal Enclave
Jamia Nagar, Okhla
New Delhi - 110 025

کبیرا ہنسا بھی اور رویا بھی

ہرچرن چاولہ
(ناروے)

اردو ادیب نے اپنے ڈھائی سو صفحات کے ناول پر پبلشر سے ڈھائی پیسے یومیہ معاوضہ کی پیش کش پر پہلے تو تبسم کیا پھر زار و قطار رونے لگا۔ مدیر جمع پبلشر نے کہا۔ اگر آپ ہمارے دفتر میں بیٹھ کر اس طرح رونے لگیں گے تو لوگ یہی سمجھیں گے کہ ہم نے آپ کے ساتھ کوئی برا سلوک کیا ہے جب کہ ہم اپنے اصول کے خلاف آپ کو آپ کی تخلیق کا معاوضہ بھی دے رہے ہیں۔

ادیب کے ہونٹوں پر مدھر مدھر مسکان تیر گئی۔ وہ روتی اور ہنستی ہوئی آواز میں بولا "میں رو اپنے لئے رہا ہوں کہ چالیس سال قلم گھس گھس کر میں نے جھک ماری ہے۔ آپ کے لئے تو ہنس رہا ہوں"۔ اس کی رلاہٹ اور مسکراہٹ کا روپ ایسے تھا جیسے ہلکی ہلکی بارش بھی ہوتی رہتی ہے اور اس میں میٹھی میٹھی دھوپ بھی نکل آتی ہے۔

"آپ مجھے کچھ بھی معاوضہ نہ دیں صرف میرے ان کاغذات اور قلم دوات وغیرہ جن سے میں نے یہ ناول تحریر کیا ہے اور بجلی کا وہ بل ادا کریں جو میں نے اسے لکھتے ہوئے پورے ایک سال تک جلائی ہے یا پھر میری اس ایک سال کی محنت پر کھوئی بینائی اور پہلے سے زیادہ موٹی عینک لگ جانے کی قیمت ہی ادا کر دیں"۔

بڑا دفتر، قسم قسم کے کمپیوٹر، فرنیچر، کاریں اور خود آپ کا یہ بیان کہ ہمارا رسالہ ہزاروں کی تعداد میں چھپتا اور دنیا کے آٹھ دس ملکوں میں پہنچتا ہے، کو بھول کر آپ مجھے کچھ بھی نہ دیں۔ میں کیچوے کی طرح مٹی چاٹ کر گزارہ کر لوں گا اور پھر اس مٹی کو اگل کر بہترین کھاد کی صورت واپس مٹی میں شامل کر دوں گا تاکہ اس سے پھر خوبصورت اور رنگ برنگے ادبی پھل اور پھول پیدا ہوتے رہیں کہ اوپر والے نے ادیب بنا کر مجھے یہی فرض سونپا ہے اور میں ہنسا اس لئے بھی ہوں کہ آج مجھے معلوم ہوا کہ میں کتنا امیر د کبیر ہوں کہ ایک لاکھوں پتی مدیر اور پبلشر بھی میرے آگے ہاتھ پھیلائے میری تخلیق ایک بھیک کی طرح مجھ سے مانگ رہا ہے اور میں غریب ادیب ہو کر بھی اسے بھیک دے سکنے کی پوزیشن میں ہوں۔

آپ کا کئی انچ آگے بڑھا ہوا پیٹ چغلی کھا رہا ہے کہ اس میں اس کے سائز سے کچھ زیادہ ہی ٹھونسا جاتا رہا ہے مگر آپ کا خود کو بھوکا ستانا، مجھے آپ کو بھوکا سمجھنے پر مجبور کر رہا ہے تو لیجئے میں آپ کا شاہانہ معاوضہ بھی لوٹائے دیتا ہوں اگر آپ کو شرم آئے تو آپ بھی میری فائیل واپس کر دیں اور اگر نہ کر پائیں تو بھی کوئی بات نہیں۔ میں اب لٹنے کا عادی ہو چکا ہوں۔

سیدہ شان معراج
تدریچ گلی
امبکا پور (یو۔پی)

غزل

کچھ کم نہیں ہے ہم پہ یہ احسانِ آرزو
بیٹھے ہیں زیر سایۂ دامانِ آرزو

جس وقت ٹوٹ جائے سمجھئے کہ موت ہے
پیمانِ زندگی ہو کہ پیمانِ آرزو

دنیا میں جس قدر بھی عمل کے ہیں شاہکار
قائم سبھی ہوئے ہیں بہ عنوانِ آرزو

ہم خوش ہیں یوں کہ ہم کو بھی کہنے لگے ہیں لوگ
الحمد۔ سلیقہ شناسانِ آرزو

اے خسرو جمال ادھر بھی ہو اک نگاہ
پلکوں تک آگئے ہیں سفیرانِ آرزو

سوز نہاں دردِ جگر اضطراب دل
کیا کیا رفیق غم ہیں نگہبانِ آرزو

جذبوں کا اک طلسم ہے یادوں کا سلسلہ
راہ وفا سے تاحد امکان آرزو

افضال عاقل
72, Musalmanpara Road,
P O Garulia 743133
Dist North 24 Pgs (W B)

غزل

ہے چھلکنے کو پیالہ دھوپ کا
ساحلوں پر ہے علاقہ دھوپ کا

ایک بھونرے نے کہا مجھ سے یہ رات
لے گئی تتلی اجالا دھوپ کا

زندگی سنسان دریا ہوگئی
یہ بھی تو ہے اک تماشہ دھوپ کا

بادلوں کے شہر میں بارش مجھے
دے گئی کیسا حوالہ دھوپ کا

زندگی **عاقل** رہے جھلسی ہوئی
مجھ سے ہر دم ہے تقاضہ دھوپ کا

فاطمی داؤ سحر
معرفت ڈاکٹر ولی محمد صاحب
2/H/11 حالالین، پوسٹ علی پور
مومن پور کلکتہ 27

غزل

چاہت میں وہ بات نہیں ہے
خون کی اب برسات نہیں ہے

جس کو چاہوں اس کو پالوں
ایسی قسمت ساتھ نہیں ہے

پہلو میں جس کے نہ سحر ہو
ایسی کوئی رات نہیں ہے

کون ہے وہ آنکھوں میں جس کی
مایوسی کی بات نہیں ہے

ہے کوئی جو میری خاطر
سویا ساری رات نہیں ہے

اور کسی دن سننا لوگوں
آج کہانی ساتھ نہیں ہے

آنکھوں میں آنسو، بے مصرف کیوں
غم کی تو کچھ بات نہیں ہے

عالم ناسوت کا مسافر

سلیم خاں، ہمراز
J-6 (فرسٹ فلور) رام نگر لین، گارڈن ریچ
کلکتہ 700024

اب وہ بوڑھا بڑے انہماک سے اس کرم خوردہ کتاب کو پڑھنے میں مشغول ہو گیا تھا، جو اس نے ایک بوسیدہ تھیلے سے نکالی تھی۔ کمپارٹمنٹ میں تو اس وقت ایک ہیبت ناک خاموشی چھا گئی تھی۔ جب وہ سوار ہوا تھا۔ عجب وضع قطع کے لباس میں ملبوس، جسے پہلی ہی نظر میں دیکھ کر پرانی صدیوں کے کسی معبد کے کاہن کا گمان ہو رہا تھا۔ چہرے پر بیشمار جھریوں کے درمیان دو چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں ایک عجیب پر اسرار چمک عیاں تھی۔ اس کمپارٹمنٹ میں سارے اونگھتے ہوئے مسافر جاگ پڑے تھے۔ اور سبھی سہمی نگاہوں سے نووارد اجنبی کو دیکھ رہے تھے۔

"ٹرین پوری رفتار سے آگے بھاگی چلی جا رہی تھی۔ سر پر بجلی کا بلب پوری آب و تاب کے ساتھ اپنی روشنی بکھیر رہا تھا"۔

اس بوڑھے کے سامنے والے برتھ پر بیٹھا ہوا وہ نوجوان بہت دیر سے ایک ٹک اسے دیکھتے دیکھتے اب ماحول کی یکسانیت سے گھبرانے لگا تھا اس نے کئی بار چاہا کہ کچھ بول کر کمپارٹمنٹ کی طلسمی خاموشی کو توڑ دے مگر ہر بار اس کی آواز گلے میں دب کر رہ گئی۔ وہ گھبرا گیا اور دریچے سے باہر اندھیروں میں کچھ ڈھونڈنے لگا۔ درختوں کے ہیولے بڑی تیزی سے پیچھے کی طرف بھاگ رہے تھے۔ ان بھاگتے ہیولوں کو دیکھ کر جیسے اس کی قوت گویائی قوت لوٹ آئی۔ اور وہ اپنے پہلو میں بیٹھے مسافر سے بول پڑا۔

" ان درختوں کے پیچھے بھاگنے کا راز میں اب تک نہیں جان سکا " اپنی شخصیت کا طلسم ٹوٹتے دیکھ کر وہ بوڑھا چونک پڑا۔ اس نے کتاب بند کر دی۔ اس کی آنکھوں کی چمک اور تیز ہو گئی اور لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

"بیٹے دراصل یہ ہماری رفتار کا رد عمل ہے " بہت ہی مشفق آواز تھی۔

" بابا! تم کون ہو "

بیٹے تم مجھے بابا نہ کہو۔ اس لفظ پر مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میں ایک شیر خوار بچہ ہوں۔ دراصل تم مجھے جتنا سمجھ رہے ہو۔ اس سے کہیں زیادہ بڑا ہوں۔

" تمہاری چمکتی ہوئی آنکھیں دیکھ کر مجھے کچھ یاد آ رہا ہے۔ شاید میں تمہیں پہچان جاؤں، ذرا میں اپنے ذہن پر زور دے ڈالوں۔ ماما میں تمہارا نام بتلادوں گا۔

" نہیں تم نہیں بتلا سکتے تم جو مجھے سمجھ رہے ہو وہ میں ہرگز نہیں ہوں "۔

" پھر کیا ہو "

" یہ سوال تو خود میں بھی کبھی کبھی اپنے آپ سے کرتا ہوں "۔

" پھر بھی بتلادو کہ تم کہاں جا رہے ہو؟ "

میں ادھوری شخصیت کی تلاش میں جارہا ہوں   کبھی تم نے اس نصف شئے کو دیکھا ہے"

بوڑھے کی سوالیہ نگاہیں اس نوجوان کے چہرے پر ٹک گئیں۔ وہ گھبرا گیا۔

"نہیں   مگر تم تو مکمل نظر آرہے ہو   "بوڑھا مسکرایا۔

میں تو صرف اپنے وجود کا ایک حصہ ہوں۔ ایسے ایسے حصے نہ جانے کہاں کہاں بکھرے ہیں۔ جب وہ سارے مل جائیں گے تو میرے سفر کا مقصد پورا ہو جائے گا۔ بوڑھے کی بات اس نوجوان کی سمجھ میں نہ آسکی۔ وہ خاموش ہو گیا اور وہ بوڑھا پھر کتاب کی سطروں میں کھو گیا۔

یکایک سر پر جلتا ہوا بلب فیوز کر گیا۔ روشنی   اروشنی   "

کمپارٹمنٹ کے سارے مسافر چیخ پڑے۔ تم لوگ کیوں چیخ رہے ہو   مجھے پڑھنے کیوں نہیں دیتے   "

بوڑھے کی بارعب آواز پر سبھی خاموش ہو گئے مگر وہ نوجوان خاموش نہ رہ سکا۔

"کیا تم پڑھ رہے ہو   "

ہاں لیکن تم یہ کیوں پوچھ رہے ہو۔ کیا تمہیں نہیں دکھائی دیتا   "

"نہیں   بلب جو فیوز کر گیا ہے"۔

"نہیں   تم روشنیوں کے اس قدر عادی ہو چکے ہو کہ تم سے اندھیرے اور اجالے کی تمیز ختم ہو چکی ہے"۔

"بوڑھے کی آواز نہ تھی، جیسے کسی سانپ کی پھنکار تھی۔ اور کمپارٹمنٹ میں ایک بار پھر پر ہول سناٹا چھا گیا۔

زندگی



نوشاد مومن
۸۵ بی توپسیا روڈ، کلکتہ-۷۰۰۰۳۹

زیست سے میری
کل شب کو مڈ بھیڑ ہوئی جب
دیکھ کے میری سچائی کو اور عزت کو
نالاں ہو کر
برہم ہو کر
مجھ سے بولی
اب میں تم کو چھوڑ رہی ہوں
تم سے ناتہ توڑ رہی ہوں
کیونکہ تم تو
اول درجے کے احمق ہو
آنکھیں رکھ کر بھی اندھے ہو
اپنی آنکھوں سے تم دیکھو
عہد حاضر کے لوگوں کو
پا کر مجھ کو نکل گئے ہیں
کتنے آگے
لیکن تم تو
جہاں کھڑے تھے وہیں ہو اب تک
بلکہ پہلے سے بدتر ہو
سن کر اس کی باتیں، میرے منہ سے نکلا
مجھ کو خدارا
مت چھوڑو تم
مجھ سے ناتہ مت توڑو تم
آج سے میں بھی
چھوڑ رہا ہوں سچائی کو
آج سے میں نے جھوٹ کو رہبر مان لیا ہے!!

یوسف ناظم : ایک روٹی توے پر
دوسری تختے پر

رپورتاژ شکیل اعجاز
مومن پورہ - اکولہ ۴۴۴۰۰۱

یوسف ناظم صاحب کی پچاسویں ادبی سالگرہ میں شرکت کے لئے میں ۲/ جنوری کی دوپہر ۴ بجے باندرہ کے لکی (Lucky) ہوٹل پہنچا تو دیکھا پروگرام کے آثار تو درکنار، ماحول تک نہیں ہے۔ ہوٹل میں جابجا ٹیبل کرسیاں سجی ہیں اور لوگ بالک کھانے میں مصروف ہیں۔ سوچا شاید یوسف ناظم صاحب نے نئے سال کے موقع پر کوئی نیا تجربہ کرنے کی ٹھانی ہو کہ شرکاء و سامعین کھانے میں مسلسل مصروف رہیں۔ ایک ایک مضمون نگار ہوٹل کے کسی گوشہ میں آئے، اپنا مضمون پڑھے جسے حاضرین بیک گراؤنڈ موسیقی کی طرح سنیں۔ پھر مضمون نگار خود بھی جلدی سے اپنی ٹیبل پر آکر کھانے میں مصروف ہو جائے۔ لیکن ایک صاحب نے ہلکے سے میری آستین کھینچ کر اشارے سے بتایا کہ آپ کا Lucky ہوٹل، بغل میں ہے۔ وہاں میں ۴ بجے پہنچ چکا تھا اس وقت چند لوگ کرسیاں اور رسیاں اوپر لے جاتے نظر آئے۔ یہ اطمینان کر لینے کے بعد کہ رسیاں بینر لٹکانے کے لئے ہیں، میں نے جائے واردات پر ایک کرسی سنبھال لی۔ ساڑھے چار بجے سے شرکاء آنے شروع ہوئے، سامعین ۵ بجے سے۔ (زمانہ کتنا بدل گیا ہے)۔ چلئے ساڑھے پانچ بجے جلسہ کا آغاز ہوا۔

رفیعہ شبنم عابدی صاحبہ نے نظامت سنبھالی۔ "ششماہی" میاد" کے پہلے شمارہ یعنی یوسف ناظم نمبر کی رسم اجراء مجروح سلطانپوری صاحب نے انجام دی۔ یوسف ناظم صاحب کی ایک اور کتاب کی غیر متوقع رسم اجراء، سردار جعفری صاحب نے انجام دی اس کتاب کی اطلاع، یوسف ناظم صاحب کو بھی نہیں تھی۔ اب یوسف ناظم صاحب پر تنقیدی اور تاثراتی مضامین کا سلسلہ شروع ہوا۔ رفیعہ شبنم عابدی نے مائک پر اعلان کیا کہ اب ڈاکٹر صفی الدین صدیقی آج کے نوشہ میاں (یوسف ناظم) پر اپنا ایک مضمون سنائیں گے۔ لیکن صفی صاحب نے خود پر مضمون سنانا شروع کر دیا۔ دس منٹ بعد اس میں یوسف ناظم صاحب کا بھی کہیں کہیں ذکر آیا۔ حیدرآباد کے مزاحیہ رسالہ "شگوفہ" کے سنجیدہ ایڈیٹر مصطفٰے کمال صاحب کو اللہ نے بڑا نوازا ہے۔ یعنی وہ مائک پر کسی کو ڈانٹنے بھی آئیں تو صورت سے یہی لگتا ہے کہ معذرت کریں گے۔ اور یہی ہوا۔ انھوں نے معذرت کی کہ یوسف ناظم صاحب پر یہ خصوصی شمارہ "شگوفہ" کو شائع کرنا چاہیے تھا۔ مصطفٰے کمال، ڈاکٹر رفیق زکریا کے قریب ہی تشریف رکھتے تھے۔ اور لیڈر لوگ معذرت کے ساتھ وعدے ضرور کرتے ہیں۔ اس لئے کمال صاحب نے یہ دونوں کام مستقبل قریب میں انجام دینے کے وعدے کئے (یعنی خصوصی شمارہ نکالنے اور تقریب کرنے کے)

سردار جعفری صاحب نے پر مزاح تقریر کی اور تعجب کا اظہار کیا کہ یوسف ناظم صاحب کو ابھی تک ساہتیہ اکادمی ایوارڈ کیوں نہیں ملا۔ اور ان پی۔ ایچ۔ ڈی کیوں نہیں ہوئی۔ اس پر سامعین میں سے کسی نے کہا کہ آج کل ادب کے بھی بہت سے کام پیسوں کے بل پر ہو رہے ہیں۔ ڈاکٹر رفیق زکریا نے مائک سنبھالا تو انھیں پچھلی صفوں میں حسن کمال بیٹھے نظر آئے۔ کہا آپ یہاں ڈائس پر آجائیں آپ کا مصرف یہاں ہے۔ تھوڑی دیر بعد حسن

کمال مائک سے بول رہے تھے۔ "مجھے دراصل رفیعہ شبنم کو دعوت دینی ہے کہ وہ مائک پر آئیں اور اپنا مقالہ سنائیں۔ یہاں ڈائس پر میرا مصرف اب سمجھ میں آیا"۔ اس پر رفیعہ شبنم نے کہا کہ عورتیں تو بیکار چیزوں کو بھی مصرف میں لے آتی ہیں۔ رفیعہ شبنم نے بڑا خوشگوار مقالہ سنایا۔ اس میں یوسف ناظم صاحب ہی کے لکھے ہوئے یہ دو ٹکڑے بھی تھے جو بہت لطف دے گئے۔

(۱) "غالب بہت بڑے شاعر تھے۔ لیکن خود غالب کو اپنے کلام سے اپنی زندگی میں اتنی شہرت نہیں ملی۔ جتنی ان کی وفات کے بعد ان کا کلام نہ سمجھنے والوں کو ملی"۔

(۲) "غالب کا سر اور ان کی ٹوپی ایک دوسرے کے لئے بنے تھے۔ جس نے بھی اس ٹوپی کی نقل کرنی چاہی خود اس کی ٹوپی اس کے سر سے اتر گئی"

حیدرآباد کے ڈاکٹر راج بہادر گوڑ نے "نوشہ میاں" کو بنیاد بنا کر کئی ایک دلچسپ واقعات سناتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر گیان چند، یوسف ناظم کو شاعر ماننے کو تیار نہیں۔ ان کو یہ علم ہی نہیں کہ یہ شاعر ہیں۔ اس پر ممدوح صاحب نے کہا کہ گیان چند صاحب کو میرے بارے میں بھی علم نہیں کہ میں شاعر ہوں۔ گوڑ صاحب نے ایک اندر کی بات بھی سنائی کہ ایک دفعہ یوسف ناظم سے مسز یوسف ناظم نے شکایت کی آپ اپنے مضامین میں بیوی کا مذاق کیوں اڑاتے ہیں ناظم صاحب نے کہا وہ آپ نہیں۔ باہر والی بیوی ہیں۔

بعد ازاں یوسف ناظم صاحب کو کئی ادبی انجمنوں کی طرف سے ہار پھول، گلدستے اور شالیں پیش کی گئیں۔ سلطان علی صاحب (اس پروگرام کے روح رواں) نے گیارہ ہزار روپئے کا لفافہ پیش کیا تو ناظم صاحب نے فرمایا "میں نے ان سے پہلے ہی کہا تھا کہ یہ حرکت نہ کریں۔ اب کی ہے تو میں یہ رقم انہی کے ادارے کو پیش کرتا ہوں، اس پر سلطان علی خاں صاحب بے حد خوش ہوئے اور میں یہ سوچتا رہا کہ اکولہ میں بھی یوسف ناظم صاحب کے اعزاز میں جلسہ منعقد کر کے اکیس ہزار روپئے سے لبریز ایک لفافہ پیش کرنا چاہیئے۔ کیونکہ پچھلے دنوں، ہم نے جو مکان تعمیر کروایا ہے اس سلسلے میں ہم اتنی ہی رقم کے مقروض ہیں

مقدر حمید خیالی سعوں میں محو گفتگو تھے۔ مائک پر اعلان ہوا کہ اب مقدر حمید صاحب "تکمیل" گروپ کی طرف سے ناظم صاحب کو گلدستہ پیش کریں گے۔ وہ یہ اعلان سن نہ سکے۔ احباب کے اشارہ کرنے پر ڈائس کی طرف آئے اور جب دیکھا کہ ایک نوجوان گلدستہ لئے کھڑا ہے تو اسے وصول کر کے خود اپنی نشست کی طرف بڑھ گئے۔

حضرات اب اسعت گھنٹے کے لئے کھانے کا وقفہ ہے۔ مرغ، بریانی، آئسکریم، بھاجہ، کیک وغیرہ۔ بزرگوں نے کہا ہے کہ کھاتے وقت ادھر ادھر کی بات چیت نہیں کرنی چاہیئے لیکن اس معاملہ میں بزرگوں کا نافرماں بردار ہوں۔ تھوڑی دیر بعد ملتے ہیں۔

لیجئے دوسرا اجلاس شروع ہوا۔ اللہ کے نیک بندے مغرب کی نماز سے فارغ ہو چکے ہیں۔ آسمان تاروں بھرا ہے۔ روشنیاں ہر طرف نظر آرہی ہیں ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے۔ لیکن اس دفعہ ڈائس پر رفیق زکریا صاحب اور سردار جعفری صاحب نظر نہیں آرہے ہیں۔ جب کہ ندا فاضلی صاحب کا اضافہ ہوا ہے۔ الیاس احمد فسیحی "یوسف ناظم، دشمنوں کی نظر میں" سنا رہے ہیں۔ لیکن لگتا ہے کہ اپنے دل کی تمام باتیں دشمنوں کے نام سے بیان کر رہے ہیں۔ اب پروفیسر یداللہ مہدی کی باری ہے۔ واہ کیا خوب۔ بار بار واہ واہ کا شور بلند ہوا۔ چند جملے آپ بھی ملاحظہ فرمائیں۔

عنوان ہے "یوسف ناظم، طنز و مزاح کا ڈیپارٹمنٹل اسٹور" فرماتے ہیں۔

(۱) سچ پوچھئے تو ناظم صاحب کے لکھنے اور چھپنے میں کچھ ایسا تسلسل پایا جاتا ہے جیسے سگھڑ اور سلیقہ مند خواتین جب روٹیاں سنکتی ہیں تو ایک توے پر ہوتی ہے دوسری تختے پر۔

(۲) میں انھیں بزرگ نہیں مانتا۔ جو شخص بلا امتیاز سن و سال قاضی سلیم سے مظہر سلیم تک دونوں پیڑھیوں سے کندھے سے کندھا ملائے نوجوانوں کے سے دم خم کے ساتھ ادب کے مطلع پر مدستور چھایا ہوا ہے وہ بوڑھا یا بزرگ نہیں ہو سکتا۔

نثری اجلاس کے اختتام پر حاصل غزل شعری کی طرح حیدرآباد کے مسیح انجم صاحب، حیدرآبادی لب و لہجہ میں وہ زبردست چیز سنا رہے ہیں کہ

حاضرین ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو رہے ہیں۔

اس دلچسپ، طویل مضمون کی جھلک آپ بھی ملاحظہ فرمائیے۔

محدوش مالیہ نگر میں بعض ایسے شاعر بھی آبسے تھے جو توارد کے نام پر دوسروں کے مصرعے اڑا لیتے تھے۔ اور بعض افسانوں کے پلاٹ چراتے تھے۔ کالونی میں چوری کا بازار گرم ہو گیا۔ مصرعوں کے لڑ جانے، خیال کے ٹکرانے اور زمینوں کو چرانے کی شکایتیں عام ہو گئیں۔ پولیس کو حرکت میں آنا پڑا۔ ایک دفعہ پولیس والا، میدانِ سخن کے دو پہلوانوں کو تھانے میں لے آیا۔ شاعروں پر نظر پڑتے ہی انسپکٹر نے پوچھا کون ہیں یہ دونوں؟ اور کیا حرکت کر رہے تھے؟ کانسٹیبل نے اٹین شن ہو کر کہا سر۔ یہ دونوں مصرعے لڑا رہے تھے اور زمینیں چرا رہے تھے۔ انسپکٹر اردو سے صرف اس حد تک واقف تھا کہ مقامی گالیاں دے سکتا تھا۔ اس نے لڑنے اور چرانے کی مناسبت سے "مصرعہ" کو غنڈہ کا نام سمجھ کر پوچھا۔

WHO IS MISRA?

ایک شاعر نے کہا مصرعہ کسی کا نام نہیں ہے صاحب۔ پوئٹ Poet ۔

انسپکٹر نے گھورتے ہوئے پوچھا۔ " You are a poet?"

شاعر نے You کی جگہ I کو رکھ کر پھٹ سے جواب دیا۔

Yes ! I are a poet "

انسپکٹر نے شاعر کی انگریزی تو معاف کر دی لیکن ابھی غزل کی زمین کا مسئلہ حل طلب تھا۔ چنانچہ اس نے محل وقوع جاننے کے لئے پوچھا۔

" Where is the disputed land?"

شاعر نے فوراً جواب دیا۔ " In my pocket "

شاعر نے انسپکٹر کی حیرانی کو بھانپ کر بڑے فخر سے کہا۔ "انسپکٹر صاحب! یہ شاعری ہے۔ پولیس کی ڈائری نہیں ہے۔ شاعر زمین کو تو کیا، سورج کو بھی اپنی جیب میں رکھ سکتا ہے۔ بادلوں کو مرغا بنا سکتا ہے۔ ہوا کے سگریٹ بنا کر انہیں پانی سے سلگا سکتا ہے۔ اردو کا شاعر تو مرنے کے بعد بھی شعر کہہ سکتا ہے۔ آپ نہ تو سخن فہم ہیں نہ آپ کا اسٹاف سخن شناس۔ آپ سب کے سب بھرتی کے شعر ہیں"۔

یوسف ناظم صاحب تو اس طرح کے جلسوں سے ہمیشہ دور رہتے ہیں۔ پتہ نہیں انھوں نے یہ پچاسویں سالگرہ منانے کی اجازت کیسے دے دی وہ ابھی امریکہ سے آئے ہیں ضرور اس میں امریکہ کا ہاتھ ہے۔

اخترالایمان کی شاعری کی معنویت

اشفاق احمد

6-D ، مولانا محمد علی روڈ، کلکتہ - 23

اقبال کے بعد ابھرنے والی نسلوں میں اخترالایمان بحیثیت نظم گو ایک بڑی دراز قد شخصیت رکھتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ ترقی پسند تحریک نے اردو نظم کو نئی جہتوں سے روشناس کیا۔ جہاں تک کہ اس کے رد عمل میں بھی قابل فخر نظریہ شاعری ظہور میں آئی۔ مگر ترقی پسند تحریک کا شاید سب سے بڑا فیضان یہ ہے کہ اس کے وسیلے سے ادب میں تجربوں کا سلسلہ عام ہوا اور جب یہ تحریک کمزور پڑ کر جمود کا شکار ہوئی تو جدیدیت کے تازہ کار میلانات ادبی تجربوں کے فروغ میں ممد و معاون ثابت ہوئے۔

اخترالایمان کے بہت سے معاصرین بلکہ رفقاء ان دو تحریکوں اور ان کے متوازی گروہ حلقہ ارباب ذوق سے وابستہ تھے اور یہ وابستگی بڑی حد تک ادیبوں اور شاعروں کی شہرت کی ضمانت تھی۔ اخترالایمان فکری طور پر اس گروہ بندی سے الگ تھے۔ اس لئے اپنی انفرادیت کے باوجود آغاز میں انھیں وہ اعتبار حاصل نہ ہو سکا جو ہونا چاہیے تھا۔ اخترالایمان جس عہد میں شعور کو پہنچے وہ ادب میں ذہنی و فکری تغیرات کا دور تھا۔ چنانچہ ان کی شاعری کی تفہیم سے قبل اس عہد کے ادبی مزاج پر ایک سرسری نظر ڈالنا نامناسب نہ ہوگا۔

دنیا بھر کے ذہنی افق پر تذبذب اور تشکیک، انتشار اور بے یقینی کی پرچھائیاں لرز رہی تھیں۔ مطلع ہی گرد آلود ہو تو ذہن میں واضح خیالات کا ابھرنا دشوار ہوتا ہے۔ ستاروں پر کمندیں ڈالنے والی سائنسی ترقی جہاں انسان کی بے پناہ تعمیری صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کا موجب بنی وہاں سیاسی ریشہ دوانی کے نتیجے میں ارضیت کے فنا ہو جانے کا خوف انسان کو متزلزل کر رہا تھا۔ مصلحت کوشی، خود غرضی، مکر و فریب اور کساد بازاری کا چلن عام تھا۔ بہت سی لکیریں آپس میں گڈمڈ ہو چکی تھیں۔ سیاسی اور سماجی نظریات ہوں یا فلسفے اور مابعد الطبعیات کے وقیع مسائل انسان کو جذباتی سہارے مہیا کرنے میں ناکام ہو چکے تھے۔ اس عہد کا مزاج دراصل تشکیک کا مزاج تھا۔

شعر و ادب کی دنیا میں تشکیک اگر صحت مند ہو تو نئی تخلیقی قوتوں کا سرچشمہ بن سکتی ہے اور اگر غیر صحت مند اور مصنوعی ہو تو مریضانہ رجحانات کو جنم دیتی ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ اخترالایمان کی شاعری ابتداء سے ہی ان امکانات کا مظہر تھی جو صحت مند قدروں کے ترجمان ہوتے ہیں۔ اوپر جس پس منظر کا ذکر ہوا ہے، ان سے متصادم رہنے کے باوصف وہ ہر قدم پر تفکر میں ڈوبے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہاں مجھے خلیل الرحمن اعظمی کی بات یاد آتی ہے کہ "اخترالایماں کو لڑکپن ہی سے گوتم بدھ کی طرح سوچنے کی عادت پڑ گئی تھی"۔ شاید اسی لئے ان کے تفکر میں مانگے کا اجالا نہیں بلکہ اپنی ذات کا انکشاف ملتا ہے اور شاید اسی لئے کئی ادبی جماعتوں کے درمیان رہ کر بھی وہ کسی سے وابستہ نہیں ہوئے۔ انھوں نے ان تمام شرطوں کو نامنظور کر دیا جو تخلیقی شرطوں کے ماسواء ہوتی ہیں کیونکہ اس سے فن کار کی آزادی محدود ہو جاتی ہے۔ اور آزادی جیسی عزیز شئے کو کھونا انھیں کب گوارا ہو سکتا تھا۔

اخترالایمان کی شاعری کا بڑا حصہ علامتی یا نیم علامتی شاعری پر مشتمل ہے اور علامتی اسلوب کے اسرار قاری کو ذہنی دھچکے پہنچاتے ہیں یہ تو اچھا ہوا کہ انھوں نے اپنے مجموعوں پر طویل دیباچے لکھ کر ہماری بہت سی مشکلیں حل کر دی ہیں۔ "نیا آہنگ" کے دیباچہ میں یوں رقم طراز ہیں

"کیا زندگی کی کوئی اعلیٰ اور برتر قدریں نہیں جن کے لئے

انسان جدو جہد کرتا ہوا کوئی عورت میرا بائی بن گئی، کوئی آدمی کبیر داس کوئی بھگت سنگھ، کوئی چندر شیکھر، کوئی غالب، کوئی میر۔ کیا یہ سارے بہروپ صرف دال روٹی، پھونس کے ایک چھپر اور عورت کے لئے ہیں؟ کیا یہ بات ہر آدمی نے سوچی ہے یا سرمایہ داری سماج کی جمہوریت نے اس کے دماغ میں ڈالی ہے؟ کیا ہر انسان اپنے لئے خود سوچتا ہے یا سوچنے کا کام اسکے لئے دوسرے کرتے ہیں؟ وہ دوسرے لوگ کون ہیں؟ فلسفی، اجارہ داری سماج کے حاکموں کے دلال؟ سیاسی اور مذہبی رہنما؟ یا کوئی ایسا ادارہ جس کی بقاء اس میں ہے کہ انسان بھٹکتا رہے۔ دوڑتا رہے، صبح سے شام تک؟ اتنا تھک جائے دوڑتے دوڑتے کہ سوچنے کا اس کے پاس وقت ہی نہ رہے؟ یہ نعرے کون دیتا ہے؟ وہ جن کے نام لے کر نعرے لگائے جاتے ہیں وہ خود کیوں از کار رفتہ ہو جاتے ہیں؟ کیا یہ سب وقت کی بات ہے؟ وقت جو خود بھی مسلسل بہتا ہے اور اپنے ساتھ ہر چیز بہالے جاتا ہے؟ وقت اور قسمت کیا ایک ہی چیز کے دو نام ہیں؟ یہ لفظ کس کی اختراع ہے؟"۔

اس اقتباس میں جو سوالات اٹھائے گئے ہیں، ان میں عصری زندگی کے درد و داغ اور سوز و ساز کے بہت سے کوائف مضمر ہیں۔ اخترالایمان شاعر کا دل رکھتے ہیں، فلسفی کا نہیں۔ اور کسی شاعر کی کل متاع اس کی دردمندی اور زندگی کی بصیرت ہوتی ہے۔ اس لئے وہ زندگی کی معنویت کو کسی دلیل یا حجت سے باور یا رد نہیں کرتے بلکہ ایک حساس شاعر کی طرح سمجھنا چاہتے ہیں۔ ان کا مشاہدہ اور تجزیہ انھیں یہ گیان دیتا ہے کہ انسان کے آدرش اور عملی زندگی میں اتنا بعد اور اتنی دوری آگئی ہے کہ بیچ کے خلاء کو پر کرنا مشکل ہو گیا ہے۔ اس خلا اور دوری نے آدمی کو دو رخا بنا دیا ہے۔

"نیا آہنگ" زندگی میں محض آدرشوں اور عملی زندگی کے درمیاں ہی یہ فاصلہ نہیں پایا جاتا بلکہ فرد اور سماج کا باہمی رشتہ بھی جگہ جگہ سے ٹوٹ گیا ہے۔ وہ مزید لکھتے ہیں

"انسان اور انسانی سماج، آدمی اور معاشرہ ایک دوسرے سے دور جانے لگے، آدمی کو جینا تھا، زندہ رہنا تھا وہ سماج کے ساتھ سمجھوتہ کرنے لگا۔ شاعر نہیں کر سکا۔ بس اس دن سے شاعر دو شخصیتوں میں تقسیم ہو گیا۔ ایک شاعر اور ایک دنیادار یا عام آدمی۔ اس لئے میں آج کے شاعر کو ٹوٹا ہوا آدمی سمجھتا ہوں اور میری شاعری اسی ٹوٹے ہوئے آدمی کی شاعری ہے"۔ (نیا آہنگ)

یہ منتخب اقتباسات ان کی شاعری کے موضوعات کو سمجھنے میں مدد دیتے ہیں۔ ویسے اخترالایمان کے بیشتر موضوعات ان کے مجموعوں کے عنوانات کا نتیجہ ہیں۔ مثلاً گرداب، یادیں، آبجو، تاریک سیارہ نیا آہنگ، بنت لمحات، زمین زمین وغیرہ۔ یہ عنوانات اس امر کے اشارے ہیں کہ شاعر کا تفکر کن سمتوں اور علامتوں پر گامزن ہے۔ اپنے مطالعے کی سہولت کی خاطر میں نے ان کے موضوعات کو مندرجہ ذیل تین شقوں میں منقسم کیا ہے جن کے بطون سے ان کی شعری وحدت سامنے آتی ہے۔

(الف) وقت کے گزرنے کا شدید احساس۔ جس میں وقت کی سفاکی اور جبریت نہ صرف لمحوں کو ماضی بنا دیتی ہے بلکہ اس سے جڑی ہوئی تمام رعنائیوں کو کربہ المنظر بنا دیتی ہے۔ اور تسخیر قمر کا دعوی کرنے والا انسان ایک بے بس تماشائی کی طرح یہ سب دیکھتا رہتا ہے۔ ایسے میں یادوں کے سائبان تلے پناہ گزیں ہونا ایک فطری امر ہے۔

(ب) فرد کے مطالعے میں ان ماحدوں کی بازیافت جہاں فرد کی منقسم ہوتی ہوئی فردیت باعث تشویش ہے۔ اسے ہم موجودہ انساں کی لا شخصیت بھی کہہ سکتے ہیں۔

(ج) اقدار سے خالی ہوتے ہوئے معاشرے میں مادی اور روحانی اصولوں کی کشمکش۔

(الف) اخترالایمان کے یہاں وقت کا وہ تصو

اقبال کے یہاں پایا جاتا ہے۔ اخترالایمان کے نزدیک وقت و ماں تہذیبی اصالتوں کے تعین اور تبدیلی میں زبردست "محرک" کی حیثیت حاصل ہے۔ ان کے نزدیک وقت کی بے پناہ قوتیں ان تمام نقوش کو تہہ و بالا کر دیتی ہیں جو کسی قوم یا جماعت کو عزیز ہو سکتے ہیں۔ وقت کی یہی جبریت اور ناگزیریت اس المیہ احساس کو جنم دیتی ہے کہ انسان کے پاس گم ہوتے ہوئے نظاروں کا خاموش تماشہ دیکھنے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں۔ وہ چپ چاپ ان سمتوں اور راستوں کا زوال دیکھتا ہے جن سے گزر کر تاریخ کا یہ المناک موڑ آیا ہے۔ وقت کی بے رحم سیل ہر شئے اور قدر سے اس کی رعنائی چھین کر اسے فنا کے گھاٹ

اتار دیتی ہے ۔ یہ عمل مسلسل ہے ۔ اس لئے شاعر کا المیہ احساس بھی مسلسل ہے ۔ اس المیے کی تصویریں ان کی مختلف نظموں میں بکھری پڑی ہیں ۔ یہاں صرف چند مثالوں پر اکتفا کیا جاتا ہے

ایک ویران سی مسجد کا شکستہ سا کلس
پاس بہتی ہوئی ندی کو تکا کرتا ہے
اور ٹوٹی ہوئی دیوار پہ چنڈول کوئی
مرثیہ عظمت رفتہ کا پڑھا کرتا ہے

گرد آلود چراغوں کو ہوا کے جھونکے
روز مٹی کی نئی تہہ میں دبا جاتے ہیں
اور جاتے ہوئے سورج کے وداعی انفاس
روشنی آکے دریچوں کی بجھا جاتے ہیں
(مسجد)

نظم " مسجد " مذہبی اقدار کے زوال کی علامت کے طور پر استعمال ہوئی ہے ۔ چونکہ زوال کا عمل متواتر اور مکمل ہے اس لئے المیہ احساس کی تان ان مصرعوں پر ٹوٹتی ہے

تیز ندی کی ہر اک موج تلاطم بردوش
چیخ اٹھتی ہے وہیں دور سے فانی فانی
کل بہالوں گی تجھے توڑ کے ساحل کے قیود
اور پھر گنبد و مینار بھی پانی پانی

وقت کی جبریت اور اس کے ناگزیر تاریخی عمل کو اخترالایمان نے نہ صرف یہ کہ پرانی قدروں کے زوال کی صورت میں دیکھا ہے بلکہ عصر حاضر کے منظر نامے میں تحلیل شدہ عوامل کی شکل میں بھی پیش کیا ہے ۔ نظم " پرانی فصیل " اور " موت " کے بعد " عہد وفا " ۔ " محرومی " اور " تبدیلی " اس بدلتی ہوئی حقیقت کی آئینہ دار ہیں ۔ صنعتی تہذیب نے محض مادی اور کاروباری فتوحات کے لئے انسانی رشتوں اور رابطوں سے اس کی فطری معصومیت چھین کر ایک برہنہ سماج کی بنیاد ڈالی ہے ۔ ظاہر ہے کہ یہ صورتحال ایک احساس اور باضمیر شاعر کو کرب و اضطراب کے جہنم میں پہنچادے گا ۔ اخترالایمان نے پہلے وقت کو سب سے بڑے مجرم کے روپ میں دیکھا تھا

جب نسخہ کھلتا ہے
۱۸۵۷ء جاتا ہے
۱۹۴۷ء آتا ہے
(کالے سفید پروں والا پرندہ اور میری ایک شام)

مگر شعری سفر کے ارتقائی مدارج طے کرتے ہوئے ان کی فکر جس نہج پر ارتفاع پاتی ہے وہاں وقت کے بجائے معاصر انسان ہی اصل مجرم قرار پاتا ہے

کچھ ایسے ہیں جو زندگی کو مہ و سال سے ناپتے ہیں
گوشت سے ، ساگ سے ، دال سے ناپتے ہیں
خط و خال سے ، گیسوؤں کی مہک ، چال سے ناپتے ہیں
صعوبت سے ، جنجال سے ناپتے ہیں
یا اپنے اعمال سے ناپتے ہیں
مگر ہم اسے عرصہ پامال سے ناپتے ہیں
(اپاہج گاڑی کا آدمی)

(ب) اخترالایمان کے بعض ناقدین نے ان کی نظموں میں شخصی اور سوانحی حوادث کا سراغ لگایا ہے ۔ یہ کوشش ایسی بے درں بھی نہیں کیونکہ ان کا بچپن سخت عسرت اور تنگدستی میں گزرا تھا انھوں نے یتیم خانے میں عمر گزاری اور حصول تعلیم و معاش میں بڑی اذیتیں اٹھائی تھیں ۔ شاید یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنے دیباچوں میں جس " ٹوٹے ہوئے آدمی " کا ذکر شدومد سے کیا ہے اس کی حقیقی تصویر اپنی ہی زندگی میں پائی تھی ۔ طرز احساس کا تیکھا پن ، نفوس کی اس ہئیت کدائی کا محرک وہ نقطہ اتصال تھا جہاں خارجی ہورشتوں میں ذات شکست و ریخت سے دوچار ہوتی ہے ۔ نظم " ایک لڑکا " صرف اخترالایمان ہی کا شاہکار نہیں بلکہ جدید اردو شاعری کے ماتھے کا جھومر ہے جس میں ایک معصوم دیہاتی شخص کی ٹوٹی ہوئی شخصیت اور ٹوٹتی ہوئی معصومیت کی داستاں کو ڈرامائی زیر و بم کے ساتھ بیان کیا گیا ہے ۔ یہاں شاعر نے بڑی خوبی سے متکلم شخص (جو شاید خود شاعر ہے) کو دو خانوں میں رکھ کر مادی آسائش کی خاطر مشینی زندگی سے اس کے سمجھوتے کو ہدف ملامت بنایا ہے ۔ طنز کے وار کہیں تیکھے ، کہیں ملکے کہیں ابھرے اور کہیں تہہ داری کے ساتھ عصری زندگی کے ان پہلوؤں

پر پڑتے ہیں جو مادیت پرستی کے عادی مگر آورش اور اصولوں سے تہی ہو چکے ہیں اور آخر میں معصوم بچے کی مسکان بھری لے مایوسی کے بادل سے گویا امید کی کرنوں کو چھین لینے کا عزم سناتی ہے۔

ایک طرح سے دیکھا جائے تو اخترالایمان کا پورا تصور رومانی ہے۔ کیونکہ عصری زندگی کے تضادات، تعطّن اور تشنّج سے گھبرا کر وہ بچپن کی ان مہکتی یادوں میں پناہ گزیں ہو جاتے ہیں جہاں تردد کا شائبہ نہیں، ملاوٹ کا خوف نہیں۔ دیہات کا پاکیزہ اور صاف ستھرا ماحول زندگی کی سادگی سے عبارت ہے۔ ابھی یہاں صنعتی تہذیب کی ترقیوں نے ان بڑے شہروں کو جنم نہیں دیا ہے جو دیہی ماحول پر شب خون مار کر وہاں سے بھولے بھالے لوگوں کو اپنی طرف بلا کر اس کے پورے کردار کو مسخ کر دیتا ہے۔ اس نے مصلحت، منفعت اور موقع شناسی کے لیے طرح طرح سے سمجھوتے کئے اور اس طرح اس کی شخصیت کی تقسیم شروع ہوئی جو لاشخصیت پر ختم ہوتی ہے۔ اس لئے اخترالایمان جو ازل سے ہی افسردہ مزاج تھے، اب حد سے سوا مضطرب اور افسردہ خاطر ہوئے۔ ان کے مزاج کی یہ افسردگی مرتے دم تک ان کا پیچھا کرتی رہی۔

جیوں کی پگڈنڈی یوں ہی تاریکی میں بل کھاتی ہے
کون ستارے چھو سکتا ہے راہ میں سانس اکھڑ جاتی ہے
(پگڈنڈی)

میرے دامن میں نہ کلیاں ہیں نہ کانٹے نہ غبار
شام کے سائے میں وہ ماندہ سحر بیٹھ گئی
کارواں لوٹ گیا مل نہ سکی منزلِ شوق
ایک امید تھی سو خاک بسر بیٹھ گئی
(محرومی)

اخترالایمان کی متعدد نظمیں اس صورتحال کی غماز ہیں۔ جبر، سانی میں، بازآمد، تبدیلی، مفاہمت، ضمیر، شیشے کا آدمی، سیاشہر اس طرح کی ساسدہ نظمیں کہی جا سکتی ہیں۔

(ج) فرد اور معاشرے کے تصادم میں اخترالایمان نے جس ادراک کا ثبوت دیا ہے اس کی مثال دوسری جگہ نہیں ملتی۔ انھوں نے نہ تو ترقی پسندوں کی طرح کھلی رجائیت سے کام لے کر ایک مثالی معاشرہ کا تصور پیش کیا اور نہ ہی حلقہ ارباب ذوق والوں کی طرح روایت سے باغی ہو کر تمام سماجی رشتوں کی نفی کی۔ جدیدیت کی حامل شاعری میں بھی سماج سے بھاگ کر اپنی ذات کے خول میں بند ہو کر دروں بینی کے جو مرقعے ملتے ہیں اخترالایمان کے یہاں ایسا کوئی رجحان نہیں پایا جاتا۔ حق تو یہ ہے کہ ان کی شاعری کے بالاستعیاب مطالعے کے دوران ترقی پسند اور جدیدیت کی بحث بے معنی قرار پاتی ہے اور صرف شعری اوصاف کی خوشبو مشام جان کو معطر کرتی ہے۔ ادبی وابستگیوں کے دور میں ہر کاوش اپنی جگہ بذات خود ایک کارنامہ ہے۔ اخترالایمان کی انفرادیت کا راز یہی ہے کہ فیشن یا فارمولے کی خاطر وہ کسی تجربے کو راہ نہیں دیتے بلکہ اپنی کھلی آنکھوں سے زمانے کے مطلع پر خیر و شر، تاریکی و روشنی، خواب و حقیقت، تشکیک و تیقن، خیال و عمل، خرد و جنوں، ترتیب و انتشار، ماضی و حال، مادیت و روحانیت، معصومیت و بہیمت کا جو تماشہ دیکھا اسے عصری کائنات کے تانے بانے سے تعبیر کیا۔ اس تانے بانے میں ہر شئے ناہموار، کھردری اور مرکز سے ہٹی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ اس لئے وہ ٹھہر ٹھہر کر رک رک کر ہر چیز کو متشکک نظروں سے دیکھتے ہیں۔ گویا اثبات و نفی کے دوراہے پر کھڑے وہ یہ سوچتے ہیں کہ اس گنہ گار معاشرے کو کیا جواب دیں جس کی آنکھیں کسی بھی المیے پر نہیں بھیگتیں۔ اخترالایماں کا بنیادی مسئلہ یہ نہیں ہے کہ وہ معاشرہ کی خوشحالی کا خواب دیکھیں بلکہ عصری زندگی نے جو ناہمواریاں پیدا کی ہیں ان پر تاکیدی نشان لگائیں!

ان ناہمواریوں اور کھردرے پن کو (جو سماج نے انھیں مواد کے طور پر دیا) شعری زبان عطا کرنے میں انھوں نے بڑے بیباکی سے کھردرے اسلوب کا سہارا لیا اور اس بات کی قطعی پروا نہیں کی شاعری کو صرف تکلفاتی اور زرق برق لباس ہی زیب دیتا ہے جدید تر اردو نظم پر اخترالایمان کا شاید سب سے بڑا احسان یہی ہے کہ انھوں نے اپنے تجربات پر اسلوب و آہنگ کی وہ پرت رکھی جو رسمی، چکنی اور تکلفاتی (Sophisticated) نہ ہو تو نہ سہی، حقیقی تجربے کا برملا اظہار ضرور ہو۔ اس کے لئے انھوں نے علامت سازی اور پیکر تراشی سے آگے جاکر روزمرہ سے قریب، سپاٹ اور کھردرا اسلوب وضع کیا جس میں مواد کے ڈرامائی اور غیر متوقع بیانیہ اظہار کے امکانات زیادہ

سے زیادہ ہیں۔ ابتدا میں اخترالایمان نے فیض اور راشد کا اثر شعوری طور پر قبول کیا لیکن اپنی مخصوص افتاد طبع کے باعث وہ بہت جلد ان شعرا کے اسلوب سے دور ہوتے چلے گئے اور چونکہ انھوں نے ان دونوں شعرا کی بہ نسبت زیادہ لمبی عمر پائی اور زندگی کے حقائق میں تلخیوں کے نسبتاً زیادہ رنگ دیکھے، اس لئے ان کے یہاں فکر و اظہار کے کثیر ابعاد ملتے ہیں۔ ان کی ایک انفرادیت یہ بھی ہے کہ ان کے اسلوب کی نقل مشکل ہے۔ تکلف اور فارسیت سے عاری لفظیات، روزمرہ بلکہ بول چال کی زبان کا بے دریغ استعمال، ہندی الاصل لفظوں کا برمحل استعمال، اوپر اوپر سپاٹ اور خشک کھردرے لہجے میں ماضی اور حال، فرد کی لاشخصیت اور روحانی قدروں کے زوال کی کہانی سنانے والا۔ وہ بھی اس طرح کہ مجموعی طور پر یہ اسلوب نظم کی قوت بن جائے، بڑے جگر گردے کی بات ہے۔ آپ چاہیں تو اس اسلوب کو Frozen Symphony کا نام دے سکتے ہیں۔ اس پر مستزاد یہ ہے کہ ڈرامائی مونولاگ کو حسب موقع برت کر انھوں نے اپنی بیشتر نظموں کی فنی سطح بلند کرلی ہے

میں کس طرح سوچنے لگا ہوں
مجھے رقیبوں پہ کتنا شک ہے
یہ قومیت عجیب شئے ہے
سرشت میں کون سا نمک ہے
(ضمیر)

یک بیک شور ہوا ایک نیا ملک بنا
آنکھ جو کھولی تو دیکھا کہ زمیں لال ہے سب
تقویت ذہن نے دی، ٹھہرو، نہیں خون نہیں
پان کی پیک ہے یہ اماں نے تھوکی ہوگی
(کل کی بات)

مندرجہ بالا تجربے کی روشنی میں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اسلوب فکر اور اسلوب بیان ہر دو اعتبار سے اخترالایمان ہمارے دور کے COLOSSUS ہیں اور بقول شمس الرحمن فاروقی "گزشتہ ۳۰ برس میں اخترالایمان کی شاعری زندگی اور انسانی شخصیت کے رومانی (یعنی آورش پرست، امید افزا) تصور سے ہٹ کر انسانی وجود کی بے رنگی اور زندگی میں کم کوش احتیاط پر رنج کے اظہار کی راہوں سے گزرتی ہوئی ایک کربناک تلخی اور مستقبل سے مایوسی تک پہنچی ہے۔ ان کی شاعری کا یہ سفر ہمارے زمانے پر دردناک حاشیہ ہے کہ ہم مرتبہ انسانیت سے اس قدر گر چکے ہیں کہ ہمارے سب سے بڑے شاعر کو اپنے گرد و پیش میں عارضی مسرت والی کوئی شئے نظر نہیں آتی"۔

مختصر یہ کہ رواں صدی میں اقبال اور فیض کے بعد اخترالایمان کی آواز اردو شاعری کی سب سے پروقار آواز ہے۔ جدید نسل کے شعرا کے پاس ان سے سیکھنے کے لئے بہت کچھ ہے کہ کس طرح رومانی فریب کے بغیر وقت کی بربادی اور زوال آمادہ تہذیب کا کرب تحلیل کر لیے محسوسات کو زبان دی جاسکتی ہے، یوں کہ اس کے اثر سے معاصر زندگی کی تلخی کا سارا زہر ابل پڑے۔ اخترالایماں کی ایک نظم کے مصرعے ملاحظہ فرمائیں۔

گر کبھی پیٹ دباؤ گے میرا
جس قدر زہر ہے
سب الٹ دوں گا تم سب کے چہروں پر

فارم نمبر ۴

۱۔	مقام اشاعت ۔	کلکتہ
۲	وقفہ اشاعت:۔	ماہنامہ
۳	پرنٹر:۔	ف س اعجاز
•	قومیت:۔	ہندوستانی
•	پتہ ۔	۲ رائے کانی سیل کلکتہ ۔ ۲۳
۴۔	پبلشر:۔	ف س اعجاز
•	قومیت ۔	ہندوستانی
•	پتہ :۔	۲۵ بی زکریا اسٹریٹ کلکتہ ۔ ۷۳
۵۔	ایڈیٹر:۔	ف س اعجاز
•	قومیت:۔	ہندوستانی
•	پتہ ۔	۲۵ بی زکریا اسٹریٹ کلکتہ ۔ ۷۳
۶۔	ساجھیداری ۔ (کوئی نہیں) واحد ملکیت میں ف س اعجاز	

اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم و یقین کے مطابق درست صحیح ہیں۔ دستخط:۔ ف س اعجاز

قدر بلگرامی ایک تعارف

از ڈاکٹر ظفر عمر قدوائی

۱۸ ہرن باڑی لین، کلکتہ - ۷۳

اضلاع اودھ میں جن قصبوں کو شہرت اور ناموری نصیب ہوئی ان میں قصبہ بلگرام ضلع ہردوئی خاص اہمیت کا حامل ہے۔ اسی قصبہ میں ۱۲۴۹ھ میں قدر کی ولادت ہوئی۔ ان کا پورا نام غلام حسنین تھا جو ان کے چچا کا رکھا ہوا تاریخی نام ہے۔ قدر کے والد کا نام سید خلف علی تھا جن کا سلسلۂ نسب حضرت زیدؓ بن حضرت سجاد زین العابدین بن حضرت امام حسین علیہ السلام بن حضرت علی علیہ السلام پر منتہی ہوتا ہے۔ اس طرح قدر زیدی سید تھے۔ قدر کا خاندان اپنے علم و عمل زہد و اتقا کی بنا پر بلگرام میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔

رواج زمانہ کے مطابق قدر کی ابتدائی تعلیم کا آغاز بھی عربی فارسی سے ہوا۔ جس میں اپنے ذوق علم اور ذہانت کی بنا پر انہوں نے جلدی ہی مہارت حاصل کر لی۔ اسی شوق علم کو لے کر لکھنو آئے جو اس زمانہ میں شعر و شاعری کا گہوارہ بنا ہوا تھا چنانچہ اس شعری فضا میں پہونچ کر قدر نے بھی شعر گوئی کی طرف توجہ کی۔ چونکہ شاعری کو وہ ایک مستقل فن جانتے تھے اس لئے رموز شعر لسان علی سحر سے باقاعدہ طور پر سیکھے۔ اس کے بعد ابو علی بحر سے اصلاح سخن لیتے رہے۔ یہاں انہوں نے محمد رضا برق سے بھی کسب فیض کیا اور کچھ دنوں تک اپنے ایک عزیز صفیر بلگرامی کے توسط سے غالب کو بھی اپنا کلام دکھایا۔ اپنے ان اساتذہ کا ذکر قدر نے اپنی ایک رباعی میں یوں کیا ہے۔

سیکھے سحر و برق سے بندش کے بند   پھر غالب و بحر نے بتائے پیوند
مجھ سا بھی زمانے میں نہ ہوگا اے قدر   بدنام کنندۂ نکو نامے چند

بہت سے اہل کمال کی طرح قدر بھی قلت زر کا ہمیشہ شکار رہے۔ حالانکہ اس فکر میں انہوں نے بہت جدوجہد کی لیکن صحیح معنوں میں ان کو خاطر خواہ کامیابی میسر نہ ہو سکی۔ مجبوراً ہردوئی کے ایک پرائمری اسکول سے ملازمت کا آغاز کیا۔ دھیرے دھیرے یہاں سے ترقی پاکر سیتاپور میں ہیڈ ماسٹر ہوگئے۔ چونکہ فارسی کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے۔ اس لئے اس شہرت نے انہیں کیننگ کالج (فی زمانہ لکھنو یونیورسٹی) تک پہونچا دیا۔ یہاں پہونچ کر وہ بظاہر اطمینان کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ لیکن بقول صفیر بلگرامی وہ اس ملازمت سے مطمئن نہیں تھے۔ صفیر لکھتے ہیں۔

"بھائی قدر نے مجھ سے کہا تھا کہ عجب طرح کی بات ہے کہ قدر اور مدرس کے عدد ایک ہیں
میری قسمت میں اس نوکری کے سوا دوسری نوکری نہیں ہے"

ایک موقع پر کلکتہ میں ایک ملاقات کے دوران قدر نے ایک قصیدہ نظام دکن کی خدمت میں پیش کیا تھا جس سے خوش ہو کر موصوف ان کو اپنے ساتھ دکن لے گئے۔ لیکن یہاں کی آب و ہوا ان کو راس نہ آئی۔ ضیق النفس اور ضعف معدہ کی انہیں لکھنو میں بھی شکایت تھی۔ حیدرآباد آکر یہ اور بڑھ گئی۔ باوجود علاج و پرہیز کے جب کسی طرح افاقہ کی صورت نہ نظر آئی تو مجبوراً لکھنو لوٹ آئے۔ یہ وہ وقت تھا جب ان کا چراغ زندگی ٹمٹمانے لگا تھا چنانچہ لکھنو میں بھی انہیں شفا نصیب نہ ہو سکی آخرکار ۲۳/ ذی قعدہ ۱۳۰۱ھ بوقت دوپہر ان کا انتقال ہو گیا اور میر خدا بخش کی کربلا واقع تال کٹورہ لکھنو میں سپرد خاک ہوئے۔ قدر کے شاگرد منشی محمود احمد کا قطعہ تاریخ منظوم کیا جو قدر کی لوح مزار پر کندہ ہے۔

روز یکشنبہ وبست وسوم ذی قعدہ وا
بر دوپہر روز سہ ساعت چوں ملتجا بشد
آوخ از دلاوری چرخ ود آہنگ بود
کاں از علم از دہر یعنی استاد باشد
در رقم سال وفاتش حد سوری معنوی
در ہزار وسہ صد ویک قدر از دنیا بشد
۱۳۰۱ھ

قدر ساری زندگی تصنیف و تالیف میں مشغول رہے۔ حالانکہ دنیا سے لاولد رخصت ہوئے لیکن مندرجہ ذیل ایسا گنج گراں مایہ اپنی تخلیقات کا چھوڑ گئے ہیں جو ان کا نام مر کر بھی زندہ رکھے گا۔ جس کا قدر کو بھی بخوبی احساس تھا۔ چنانچہ اس کا اظہار یوں کیا ہے۔

ہم اپنے شعر کو اولاد سے بہتر سمجھتے ہیں   اسی سے بعد ہمارے چلے گا نام ہمارا

(۱) مثنوی قضا و قدر (۲) نظم الارکان (۳) قواعد العروض (۴) شرح مجموعہ سخن (۵) کلیات قدر (۶) مثنوی بادۂ ارغوانی (۷) عطر مجموعہ سب ہی کتابیں زیور طبع سے آراستہ ہو چکی ہیں ان کے علاوہ (۱) شرح قصاید عرفی (۲) مصطلحات اردو (۳) ابیات گلستان اور (۴) مثنوی لیلۃ القدر وغیرہ حلیہ طبع سے مزین نہ ہو سکیں۔

قدر نے جس دور میں آنکھ کھولی ادبی اعتبار سے یہ زمانہ اردو کی تعمیر و تزئین کا تھا۔ رنگین اور مقفیٰ عبارت آرائی کا دستور تھا۔ طرفہ یہ کہ سلطان اودھ کی سرپرستی اور داد و دہش نے غیر شاعر کو بھی شاعر بنا دیا تھا جو بقول قدر "اپنے تیشہ، مذاق سے لولے لنگڑے شعر گڑھ رہے تھے۔ اس طرح اردو شاعری میں نقائص بڑھتے جا رہے تھے"۔ قدر کی شاعری اسی ذہنیت اور ان کے تجربات کی عکاسی کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں قال سے زیادہ حال کا احساس ہوتا ہے۔ قدر سادگی اور سلاست کی اس رو کی طرف زیادہ مائل تھے جسے بعد میں سرسید اور حالی نے اوج کمال عطا کیا۔ انہوں نے مشکل الفاظ یا پیچیدہ تراکیب سے اجتناب کیا اور عام فہم و نیز بول چال کی برجستگی سے معمور زبان استعمال کی ہے مثلاً یہ شعر

ابھی تھا وصل کا اقرار اور ابھی انکار   چلو ہٹو انہیں باتوں سے قدر جلتے ہیں

یا یہ شعر

کوئی شعلہ میری آہوں کا بجھایا نہ گیا   اجی لاحول ولا دیدۂ تر کچھ بھی نہیں

چلو ہٹو برجستگی سے پوری طرح معمور ہے اور جلتے ہیں کی جس قدر تعریف کی جائے کم ہے اور دوسرے شعر میں اجی لاحول ولا کا لہجہ قابل داد ہے

ایک اور شعر

کوئی حکمت نہیں چلتی خدا کے کارخانہ میں   دھری رہتی ہے سب تدبیر جب تقدیر پھرتی ہے

یوں تو دھری عام بندی الفاظ ہماری روزمرہ بول چال کا ہے لیکن اس موقع پر اس کی معنویت اور بلاغت لائق صد ستائش ہے۔

قدر فلسفہ کے شاعر نہیں ہیں بلکہ اپنے عہد کی سچی تصویروں کے مصور ہیں۔ ان کا لہجہ مدھم اور لطیف ہے۔ اکثر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے کوئی ہمارے دل کی بات ہم سے کہہ رہا ہو اور یہ شاعر کوئی فرد غیر نہیں بلکہ ہم خود ہیں۔ ان کی عظمت کا راز خلوص، تجربہ، سچائی اور نیک نیتی اور نرم لہجہ میں مضمر ہے۔ اس میں شک نہیں کہ غم ان کا خاصہ ازلی تھا۔ اولاد نہ ہونے کا غم، پیشے سے ناآسودگی، بے وطن ہونے کا قلق یہ ایسے زخم تھے جو برابر

سہتے رہے۔ باوجودیکہ ہمیشہ وہ بہتر حالات اچھا ماحول اور پرسکون زندگی کے جویا رہے لیکن خاطر خواہ وہ کبھی مطمئن نہ ہوسکے۔ وہ غم پرست نہیں بلکہ غم نصیب تھے۔ ان کی بے چینیاں ان کی مایوسی کا اعلان نہیں بلکہ ان ناسازگار حالات کی دین ہیں جو انہیں فارغ البالی کے خواب نہ دکھا سکیں۔ آخر کار مجبوراً یہ کہہ کر خاموش ہوگئے

نہیں جنت نہ سہی خیر جہنم ہی سہی　　　　اتنا تھوڑا ہے مجھے تو کسی قابل کہنا

خلوص اور نیک نیتی سے عاری نئے سماج میں وہ گھٹن محسوس کرتے رہے۔ اسے صرف فریب سمجھتے رہے اور پرانے اقدار کے آرزومند رہے

اے قدر ایسا آدمی اپنی پسند ہے　　　　جو دل میں آیا کہہ دیا جو کچھ کہا کیا

قدر کی شاعری اس لحاظ سے بھی قابل قدر ہے کہ انہوں نے حالات اور وقت کا مقابلہ نہایت ہمت و پامردی سے کیا لیکن اپنے وقار اور عزت نفس کو کبھی مجروح نہ ہونے دیا۔ ان کا مزاج عاشقانہ تھا اس لئے خوباں سے چھیڑ بھی کرتے ہیں اور ان کی کج ادائیوں کی شکایت بھی۔

وصل ہوجائے تو جانوں سچ ہے اے وعدہ خلاف　　　　ورنہ یہ ہوں ہوں غلط، ہاں ہاں غلط، اچھا غلط

قدر کا سلسلہ تلمذ شیخ ناسخ تک پہونچتا ہے۔ اس لئے لکھنو اسکول کے اثرات مثلاً معشوق کے خد و خال کے اذکار لباس اور اشیاء آرائش کے تفصیلی بیانات معاملہ بندی وغیرہ نمایاں طور پر موجود ہیں مثلاً

ہنس کے بولے ابھی مسی ہے نہ کنگھی چوٹی　　　　بھاڑ میں جائے جو ہوتا ہے ترا دل بیتاب

مسی پہ گر تو مائل اے گلبدن نہ ہوتا　　　　اک نقطۂ سیاہ بھی تیرا دہن نہ ہوتا

حجاب کیسا لپٹ بھی جاؤ کہاں کا بوسہ زبان لاؤ　　　　قبا اتارو نقاب اٹھاؤ ہٹاؤ جھگڑا یہ ہے کہاں کا

ایک سمت ان کی اردو اگر آج کی اردو معلوم ہوتی ہے تو دوسری طرف پیچیدہ اور دقیق استعارات بھی کہیں کہیں نظر آجاتے ہیں۔

دانت تارے ہیں ہلال ابرو و سر قبہ عرش　　　　کہکشاں مانگ رخ و زلف پریشاں دن رات

روتا پھرا میں یاد میں گیسو کی ہر جگہ　　　　برسا تمام شہر میں پانی تمام رات

چند عام فہم اور عام محاورے کے اشعار بھی ملاحظہ کے قابل ہیں۔

یار غصے سے گل رعنا بنا　　　　بوسہ لیا لال پیلا ہوگیا

کہا ہم نے دل لے کے تم نے جلایا　　　　بگڑ کر وہ بولے کلیجہ تمہارا

گھڑی بھر میں ناراض دم بھر میں راضی　　　　مزاج ایسا ہے تولہ ماشہ تمہارا

جب چراغ صبح ہوتے ہی ان سے جدا کیا — آئے وہ رات تو نہیں یا آئے ہم نہیں

ایک موقع پر قدر نے ایک معرکہ آرا قطعہ تاریخ بھی کہا تھا جو ایک بڑے پتھر پر آرٹس فیکلٹی لکھنؤ یونیورسٹی میں آج بھی نصب ہے۔ اس قطعہ کی خاص بات یہ ہے کہ اس کے ہر مصرعہ سے سن تعمیر برآمد ہوتا ہے۔

گورنر جنرل عالی روش لارنس صاحب نے — بعہد و جد کل اٹھارہ سو سرسٹھ نومبر میں
نوی ڈالی بنائے خیر خود کیننگ کالج کی — مگر سد سکندر جس طرح وقت سکندر میں
عمارت بن چلی وہ بنتے بنتے بن گیا کالج — زبان عدل وزیر دولت سرچارج کوپر میں
ہمایوں فر ڈپٹی میرزا عباس خاں صاحب — ہیں سرکاری یہ ممبر منجملہ ممبر میں
سلامت یا خدا احکام منصور اور یہ کالج — ہیں جب تک نجم و مہ افلاک پر موتی سمندر میں
مکمل نظم وہ لکھی ہے قدر بلگرامی نے — ہیں سال عیسوی مقصود ہر اک مصرعہ تر میں

بایں ہمہ قدر بھی دوسرے شعرا کی طرح ناقدری زمانہ کے شاکی رہے۔ اور یہی کوفت وہ اپنے ساتھ لے گئے۔

قدر فن شعر کس کام آئے گا توبہ کرو — اس زمانے میں نہیں صاحب سخن کی احتیاج

امریکی صحافت میں دھوم مچانے والی ہستیاں

برنارڈ ڈاے ۔ دائمز برگر

" ہماری صحافت جابرانہ بھی ہے اور غلامانہ بھی ۔ یہ ہر زبردست کے آگے گھٹنے ٹیک دیتی ہے اور یہ صرف کمزور اور بے سہارا لوگوں پر حملہ کرتے وقت دلیر اور بے باک ہوجاتی ہے ۔ اہانت کرنا اس کی عادت ہے ، جیسے کتوں کا بھونکنا یا سانپوں کا پھپکارنا ۔ امریکی اخبارات خود کو قانون سے ماوراً طاقت سمجھتے ہیں " ۔

لگتا ہے یہ عبارت کسی ایسے شخص کی ہے جس کی گزشتہ چند برسوں کے دوران امریکی رپورٹروں کے ہاتھوں مٹی پلید ہوئی ہو ۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ اقتباس ۱۸۵۹ء کی ایک تحریر سے ہے جس کا عنوان ہے "ہمارا صحافتی گروہ ۔ امریکی اخباروں کی بدعنوانیوں اور جرائم کا پردہ چاک " ۔ اور اس کے لکھنے والے ہیں لامبرٹ ولر جو خود بھی ایک ایڈیٹر رہ چکے تھے ۔ ان گناہوں کی طرف انگشت نمائی کرنے والے وہ پہلے شخص بھی نہ تھے ۔

یہاں ، ہم اخبارات کے جن گناہوں کا تذکرہ کر رہے ہیں ان کا تعلق سنسر شپ ، رازداری ، مقدمات کی منصفانہ سماعت ، احتساب اور آزادیٔ اظہار کی ضمانت دینے والی پہلی آئینی ترمیم جیسے وزنی معاملات سے نہیں بلکہ اس عام خیال سے ہے کہ ذرائع ابلاغ سیاستدانوں کی نجی زندگی میں بہت زیادہ دلچسپی لیتے ہیں اور خبریں دیتے وقت انہیں کسی کی عزت کا ذرا بھی خیال نہیں ہوتا ۔ اس الزام میں کسی قدر صداقت بھی ہے ۔ اخباری ادارے طاقتور ہیں ۔ امریکی عوام اپنی سرپرستی کے ذریعہ ان کو ایسی طاقت عطا کرتے ہیں جو دیگر معاملات میں خود ان کو ناگوار ہے ۔ حالانکہ ان کا اصرار ہے کہ حقیقتاً وہ محض معلومات کرنے کے خواہش مند ہیں لیکن اصلیت اخبارات بہتر جانتے ہیں ۔

اگر کسی ایک شخص کو موجودہ نظام کا " بانی " کہا جاسکتا ہے تو اس کا نام جیمز گورڈن بینٹ ہے جو خود کو بجا طور پر امریکی صحافت کا نپولین تصور کرتا تھا ۔ وہ امریکی ثقافت کے معماروں میں سے بھی ایک ہے ۔ بینٹ ۱۷۹۵ء میں اسکاٹ لینڈ میں پیدا ہوا اور ۲۴ سال کی عمر میں خالی ہاتھ امریکہ آیا اور نامہ نگار بن گیا ۔ مئی ۱۸۳۵ء میں اس نے اپنی کل پونجی ۵۰۰ ڈالر لگاکر " نیویارک ہیرالڈ " جاری کیا ۔ بینٹ چار صفحات کے اس اخبار کا مالک ہی نہیں کچھ عرصہ تک واحد کارکن بھی تھا ۔

بینٹ تخیل پرست ، متکبر ، جھگڑالو اور انا پرست تھا ۔ جس وقت وہ صحافت کے منظر پر ابھرا ، بیشتر اخبارات سیاسی پارٹیوں یا طبقۂ اشراف کے ناظرین کے تھوڑے سے لوگوں کی سرپرستی سے چلتے تھے ۔ لیکن اس نے وعدہ کیا کہ ہیرالڈ عام لوگوں ، تاجروں ، مستریوں ، ملازمت پیشہ لوگوں ، کلرکوں اور ان کے افسروں سبھی کے لئے ہوگا ۔ اسے کسی انتخاب یا کسی امیدوار سے خواہ وہ صدر کا ہو یا کانسٹیبل کا ، کوئی سروکار نہیں ہوگا ۔ وہ کسی سیاسی مدد کے بغیر اپنے بل بوتے پر زندہ رہے گا ۔

بینٹ نے نیویارک کے لوگوں کو اپنی طرز کی خبروں کا بھوکا بنادیا ۔ اس نے پولیس کی عدالتی رپورٹیں ، کھیل کی خبریں ، اولیں انٹرویو اور قتل جیسی جرائم کی سنسنی خیز داستانیں شائع کیں ۔ اک طوائف ایلن جیوٹ کا اس کے شاندار قحبہ خانہ میں قتل ہوگیا ۔ بینٹ نے بذات خود جائے وقوعہ پر پہنچ کر نائکہ سے انٹرویو لیا اور ایک ایک تفصیل باریکی کے ساتھ بیان کی ۔

اس کی خصوصیت اہانت تھی ۔ اپنے اداریوں میں اس نے بدعنوان سیاستدانوں اور بداطوار تاجروں پر حملے کئے ۔ اسے جھکایا جاسکتا تھا اور نہ

ڈرایا جاسکتا تھا۔ خود ستائی اس کے اندر سے اہلتی تھی۔ مجروح اخلاقیات اس کے سامنے اپنا سر پیٹتی رہی۔ ۱۸۴۰ء میں نیویارک کے سات اخباروں نے ہیرالڈ کے خلاف اپنے اداریوں میں مہم چلائی۔ کمپنیوں نے تاجروں پر زور دیا کہ وہ اپنے اشتہارات رد کردیں۔ اس "اخلاقی جنگ" کا اخبار کی اشاعت (۵۱۰۰۰) پر معمولی اثر پڑا اور بالآخر وہ بھی ختم ہو گیا۔ ۱۸۷۲ء میں جب اس کی موت ہوئی تو وہ باعزت اور دولتمند تھا اور ہیرالڈ کا شمار دنیا کے بڑے اخبارات میں ہوتا تھا۔

۱۸۳۰ء کے عشرہ میں بینٹ کی طرح کوئی واحد شخص بیک وقت مالک مدیر اور نامہ نگار ہو کر تقریباً اپنے بل پر شہرت حاصل کر سکتا تھا۔ لیکن جوں جوں اخبارات بڑے ہوتے گئے ان کی ملکیت کمپنیوں کے ہاتھوں میں چلی گئی اور گمنام ہو گئی اور توجہ کا مرکز رپورٹر بننے لگے۔ مجھے یہ بات حال ہی میں ایک چھوٹی سی خبر نے یاد دلائی جس میں کہا گیا تھا کہ نیویارک ورلڈ کی نامہ نگار نیلی بلائی نے ۱۸۸۷ء میں دیوانگی کا ڈھونگ رچاکر نیویارک کے پاگل خانہ میں داخلہ حاصل کیا تھا۔ وہاں اس نے ایسی بدسلوکیاں دیکھیں کہ اسے "انسانی چوہے دان" کا نام دیا تھا۔

نیلی بلائی الزبتھ کوچرین کا قلمی نام تھا۔ اس نے ۱۸۸۵ء میں بیس سال سے بھی کم عمر میں رپورٹنگ شروع کی۔ اس نے فیکٹریوں میں کام کرنے والوں کی حالت زار، گندی بستیوں کی زندگی یا غریبی کی رپورٹیں دیں اور تمام حالات براہ راست جائے وقوعہ پر جاکر معلوم کئے۔ ۱۸۸۷ء میں اس نے نیویارک ورلڈ کے مدیر جوزف پلٹزر سے ملازمت حاصل کرلی۔ زاہد از ایک بار اس نے کسی خرابی کو بے نقاب کرنے کے لئے بھیس بدلا۔ وہ پاگل ہی نہیں، مٹھائی کی دوکان کی ملازمہ گرفتار شدہ معمولی چور، ریاستی قانون سازوں کو رشوت میں پھانسنے والی تاجر عورت اور خوش مذاقی میں معنیہ اور رقاصہ بھی بنی۔

لیکن بلائی کو سب سے زیادہ شہرت اس وقت ملی جب پلٹزر نے اسے ایک ایسی کہانی پر مامور کیا جس میں تفتیش سے زیادہ سنسنی تھی۔ ۱۸۸۹ء میں انہوں نے اسے دنیا کا چکر لگانے کے لئے بھیجا جو اس نے ۷۲ دن، ۶ گھنٹے اور ۱۴ سیکنڈ میں مکمل کرلیا۔ اس عرصہ میں نیویارک ورلڈ کے لاکھوں ناظرین سانس روکے ہوئے اس لڑکی کے راستہ میں پڑنے والے شہروں سے بھیجے گئے اس کے مراسلات کے منتظر رہے۔ وہ محض کہانی نہیں بیان کر رہی تھی بلکہ خود کہانی بن گئی تھی۔

اپنی صحافتی زندگی کے عروج کے زمانہ میں اس نے ایک دولتمند شخص سے جو عمر میں اس سے ۴۰ سال بڑا تھا، شادی کرلی اور صحافت کو خیرباد کہہ دیا۔ کچھ دنوں بعد اس کے شوہر کی موت ہو گئی اور کاروباری خسارہ میں اس کی چھوڑی ہوئی ساری دولت ختم ہو گئی۔ ۵۰ سال سے زاہد عمر میں اسے ایک اخبار میں چھوٹی سی تنخواہ پر واپس آنا پڑا اور ۱۹۲۲ء میں تقریباً گمنامی کی حالت میں اس کا انتقال ہو گیا۔

لیکن جنوری ۱۸۹۰ء میں دنیا کے سفر سے واپسی کے فوراً بعد کچھ دنوں کے لئے بلائی بطور نامہ نگار ایک نامور ہستی تھی۔ اور یہی بات قابل توجہ ہے۔ نامور صحافی خواہ اخبار کے ہوں یا ٹیلی ویژن کے، ناظرین کی بہت بڑی تعداد کو گرویدہ بنالیتے ہیں اور ناظرین صرف منافع نہیں بلکہ طاقت بھی ہیں۔ طاقت جو اختیارات کا بیجا استعمال کرنے والوں کی روک تھام کے لئے ضروری ہے۔ لیکن یہی طاقت ہمیں اگلی سنسنی کے انتظار میں بے چین رکھتی ہے۔ بینٹ اس کاروبار کے ان اولین لوگوں میں سے تھا جس نے اس راز کو پالیا تھا ۔

تبصرۂ کتب

○ تبصرے کے لئے ہر کتاب کی ۲ جلدیں آنا ضروری ہے۔

نام کتاب	مضامین گجرال (جناب اندر کمار گجرال کے اخبار سیاست میں چھپے ہوئے مضامین کا انتخاب)
طابع و ناشر	شعبہ اشاعت اخبار سیاست
صفحات	۱۳۶ - قیمت ۲۲ روپئے
ملنے کے پتے	سیل کاؤنٹر روزنامہ سیاست - حیدرآباد حسامی بک ڈپو - مچھلی کمان، حیدرآباد (اے پی) 500001

پاکستان کے مہاجر مگر کھلے دل و دماغ کے انسان، کئی زبانوں کے ماہر، مقرر اور مضمون نگار، مفکر، مدبر، ماہر سیاست، کامیاب مرکزی وزیر اور دانش مند سفیر، دوست ساز اور دوست نواز، مصلح اخلاق، دور ابتلاء میں اردو کے ہمدرد اور غم گسار، قومی سیاسی، ادبی معاشرتی زندگی کے سرگرم سالار، ہمہ صفت موصوف اور جامع کمالات ایک ہستی ہے جس کا نام اندر کمار گجرال ہے - ان سے ہندوستان اور پاکستان کا شاید ہی کوئی پڑھا لکھا انسان ناواقف ہو - ان کا دریائے فیض تو عام ہے مگر وہ حیدرآباد کے مایہ ناز اردو اخبار "سیاست" کے خاص کرم فرما ہیں اور اس کو اکثر اپنے رشحات قلم سے نوازتے رہتے ہیں - اور سیاست کے شعبہ اشاعت نے ان کی تحریروں کا مجموعہ شائع کرکے عام اردو پڑھنے والوں پر کرم فرمایا ہے - کتاب 19 مضامین پر مشتمل ہے جن میں سے زیادہ تر موصوف کے اردو ہی میں تحریر کردہ ہیں - کچھ انگریزی سے ترجمہ ہیں ایک بیدہ ویر میموریل لیکچر بھی ہے - یہ سب سدا بہار اور بصیرت افروز اور معلومات کا خزانہ ہیں اور ان سے ہر اردو داں والوں کو ضرور استفادہ کرنا چاہیے اور زمانے کو سمجھنے میں رہنما بنانا چاہیے۔

شروع میں مرتب جناب زاہد علی خاں ایڈیٹر سیاست کا مختصر دیباچہ ہے اس کے بعد مختصر مگر مکمل حالات زندگی اور مشہور مزاح نویس مجتبیٰ حسین کا گجرال صاحب کے متعلق دلچسپ خاکہ۔

ادارہ سیاست اس کتاب کی اشاعت پر بجا طور پر مبارک باد کا مستحق ہے

اور یہ سطریں لکھنے کے بعد خبر ملی کہ مرکز میں گجرال صاحب کو متحدہ ... وزارت میں شامل کر لیا گیا اور وہ ایک بار پھر حق بحق دار رسید کے مستحق ہوگئے ہیں لہذا ان کو دوہری مبارک باد۔

تبصرہ رئیس الدین فریدی

(XXXX)

نام کتاب	مخدوم محی الدین
مصنف	الیکسی سوخا چیف
ترجمہ	محمد اسامہ فاروقی
صفحات	۱۹۰ - قیمت سو روپئے
ملنے کا پتہ	ادارہ شعر و حکمت، حیدرآباد - ۵۰۰۴۸۲

مخدوم محی الدین یوں تو زیادہ تر ریاست حیدرآباد کے سیاسی اور شعری ہیرو کی حیثیت رکھتے ہیں مگر پورے ملک کے اندر اور اس کے باہر بھی ان کی کافی شہرت اور پذیرائی ہوئی خصوصاً سوویت یونین (آنجہانی) میں ان کے ترقی پسندانہ کام اور کلام کی وجہ سے ان کے بارے میں ملک کے اندر کافی لکھا گیا ہے اور اب اس میں ایک شاندار اضافہ روس کے ایک مشہور مصنف کی ان کے بارے میں لکھی ہوئی کتاب کے ترجمے کی اشاعت کی صورت میں - اس میں مخدوم کی زندگی اور شاعری پر مکمل تبصرہ ہے جس میں ناشرین مترجم اور ڈاکٹر مغنی تبسم نے کافی اضافہ کر دیا ہے۔

ہندوستانی سیاست، سیاسی جدوجہد اور معیاری کلام شاعرانہ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے بڑے کام کی چیز ہے۔

تبصرہ رئیس الدین فریدی

(XXXX)

نام کتاب	حکیم کلب علی شاہد امروہوی شخصیت اور فن
مرتبہ	خورشید مصطفےٰ رضوی امروہوی
صفحات	۱۹۰ قیمت - ۶۰ روپئے
ملنے کا پتہ	تخلیق کار پبلیشرز - ۱۷۷۹ کوچہ لکھنی رائے - دریا گنج نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

امروہہ ملک کی قدیم بستی ہے جس کی تاریخ دو ہزار سال کی ہے جس میں ایک ہزار سال اسلامی دور کی تاریخ کہتے ہیں - اس مدت میں امروہے نے

سیکڑوں عالم، فاضل، مصنف، شاعر، ادیب اور طبیب پیدا کئے جنھوں نے وطن میں اور وطن کے باہر نام کمایا اور خدمت خلق کے دریا کے دریا بہانے۔ ان میں سے ایک ادیب طبیب اور شاعر حکیم کلب علی طاہر بھی ہیں۔ جن کی ساٹھ سالہ علمی و فنی خدمات کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے ان کے بارے میں نئے اور پرانے تحریر شدہ مضامین کو ان کے حالات زندگی کے ساتھ ترتیب دے کر شائع کر دیا گیا ہے جو مقالاتی نوعیت کے ہونے کے باوجود علمی، ادبی اور فنی معلومات میں اضافے کا سبب ہو سکتے ہیں۔ مضمون نگار حضرات نے جو سب مستند اور معتبر اہل قلم ہیں اور جن میں پروفیسر نثار احمد فاروقی بھی شامل ہیں حکیم صاحب موصوف کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ غیر معمولی اخلاق و صفات کے مالک اور انتہائی مہذب اور بااصول آدمی ہیں اور ان کی زندگی کے حالات و واقعات پڑھ کر بہت کچھ حاصل کیا جا سکتا ہے اور زندگی کو سدھارا جا سکتا ہے۔

تبصرہ رئیس الدین فریدی

ooooo

نام کتاب	سوندھی مٹی کے بت
موضوع	شخصیات اور خاکے
مصنف	اقبال متین
قیمت	۷۰ روپئے
ملنے کا پتہ	مکتبہ شعر و حکمت، حیدرآباد

اقبال متین حیدرآباد کے ممتاز اہل قلم میں شامل ہیں اور انھوں نے اپنے قلم کی جولانی کے جوہر دیدہ اور نادیدہ اپنی پسندیدہ حاضر و غائب ہستیوں کے خاکے لکھنے میں دکھائے ہیں۔ کچھ دوسرے رشحات قلم بھی ہیں مگر کتاب میں خاکے ہی زیادہ ہیں جن کا تعلق زیادہ تر حیدرآباد کے ممتاز لوگوں سے ہے جیسے مخدوم محی الدین، سلیمان اریب، شاذ تمکنت، ڈاکٹر سید عبد الستار وغیرہ نادیدہ شخصیتوں کے خاکوں میں بلبل ہند سروجنی نائیڈو کا خاکہ بھی شامل ہے کیونکہ ان کا تعلق بھی حیدرآباد سے تھا۔ طرز نگارش اچھا ہے مگر لفظی صغول تعریفی حد سے زیادہ کی گئی ہے اور اپنی ذات کو نمایاں کرنے کی کمزوری سے بھی دامن نہیں بچا سکے۔ پوری کتاب مقالاتی رنگ میں رنگی ہوئی ہے جس سے حیدرآبادی خصوصاً اس نے گنجینۂ معلومات سے فیض حاصل کر سکتے ہیں۔ کتاب لکھنے اور چھپوانے کی کوشش قابل داد ضرور ہے اور جو لوگ مصنف کی کاوش کی قدر اور سرپرستی کرنے کے قابل ہوں اس کی طرف رجوع بھی کر سکتے ہیں۔

تبصرہ. رئیس الدین فریدی

ooooo

کتاب کا نام	اقبال اور مغربی مفکرین
مصنف	جگن ناتھ آزاد
ناشر	مکتبہ عالیہ، لاہور (پاکستان)
صفحات	۲۴۶۔ قیمت ۱۸۰ روپئے
مبصر	اشفاق احمد

پروفیسر جگن ناتھ آزاد کا شمار اقبال کے ماہرین میں ہوتا ہے۔ زیر نظر تصنیف ان کی شہرۂ آفاق کتاب ہے۔ یہ کتاب ہندوستان میں ۱۹۷۵ میں چھپی تھی۔ اس کے بعد پاکستان میں چار مرتبہ چھپی۔ اسی سے اس کی مقبولیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

اقبال اردو کے واحد شاعر ہیں جنھیں ہم بلا تامل مفکر شاعر کا درجہ دے سکتے ہیں۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ان کے کلام میں فلسفیانہ افکار و اراء موج تعین بن کر اس طرح سمائے ہوئے ہیں کہ انہیں الگ کرنے کی کوشش دراصل پانی کو پانی سے الگ کرنے کے مترادف ہوگی۔ پروفیسر آزاد نے بڑی عرق ریزی اور لگن سے اقبال کا مطالعہ ان مغربی مفکرین کے دائرہ میں کیا۔ جن کے نقوش کلام اقبال پر گہرے پڑے ہیں۔ انہوں نے مندرجہ ذیل ابواب کے تحت اپنے مطالعے کا نچوڑ پیش کیا ہے

(۱) اقبال اور فکر یونان
(۲) اقبال اور جدید فکر مغرب
(۳) اقبال اور نطشے
(۴) اقبال اور شوپن ہائر
(۵) اقبال اور کارل مارکس
(۶) اقبال اور نطشے
(۷) اقبال اور برگساں
(۸) اقبال اور دانتے
(۹) اقبال اور ملٹن
(۱۰) اقبال اور گوئٹے
(۱۱) اقبال اور آئن اسٹائن
(۱۲) حرف آخر

اقبال کی منظوم کلام میں عالمی فکر و نظر پر صحت مند تنقید ملتی ہے - وہ دل سے شاعر اور دماغ سے فلسفی تھے - بس ان دو دھاروں کا سنگم ہی ان کی ماحقاتی شاعری کی مثال ہے - انہوں نے دو بار یوروپ کا سفر کیا اور اس عہد کی بعض اہم شخصیتوں سے دو بدو گفتگو بھی کی تھی - جگن ناتھ آزاد نے تقریباً ان تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے جن سے فکر اقبال اور مغرب کے مماثل اور متنازعہ رشتے ظہور میں آتے ہیں - اگر ہم کلام اقبال کے فکری عناصر کی اجمال کے ساتھ نشاندہی کرنا چاہیں تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان میں عشق ، اثبات ، خودی ، عمل ، حرکت اور سخت کوشی کا تصور ، فقر و استغنا ، وجود انسانی کی روحانی اساس ، مشینی نظام کے خلاف احتجاج اور فرد و جماعت کے مفادات کے درمیان ہم آہنگی کی تلاش شامل ہے - اور مختصر طور پر زندگی ان کے لئے مترادف ہے حرکت ، قوت اور خیر کے - ان تصورات پر رومی ، نطشے اور برگساں وغیرہ فلسفیوں کی چھوٹ واضح طور پر محسوس کی جا سکتی ہے - لیکن حق تو یہ ہے کہ اقبال کے ساتھ سب سے بڑا چشمہ ، فیضان قرآن کریم ہے یا اسوۂ حسنہ ہے جو گویا قرآن کریم کی سب سے زیادہ محترم اور معتبر تفسیر ہے - یہی وجہ ہے کہ مغربی مفکرین سے اخذ و استفادہ کے باوصف انہوں نے حیات و کائنات کے عظیم الشان مسائل کو قرآن پاک کی روشنی میں پرکھا اور تعلیمات اسلام کی نور بیز کرنیں شعر کے قالب میں منتقل کیں - لیکن بقول آزاد "مغربی علم و فن کے جن چشموں سے انہوں نے اپنی پیاس بجھائی ہے ان کا ذکر بھی کشادہ دلی اور احسانمندانہ انداز سے کیا"۔

"اقبال اور کارل مارکس" کے باب میں کچھ افراط و تفریط سے کام لیا گیا ہے اور یہاں بیانات میں استدلال کی کمی نظر آتی ہے - پروفیسر آزاد نے بڑی حسن سے جہاں ان مفروضوں کا قلع قمع کیا ہے کہ اقبال کا مسلک اشتراکیت سے قریب ہے انہوں نے زور دے کر یہ بھی کہا ہے کہ اقبال اشتراکی اصولوں کے موید ہونے کے باوجود قرآن کریم سے چپٹے رہے اور ظاہر ہے کہ اشتراکی نظام سے کہیں بہتر نظام اسلام نے پیش کیا ہے - مگر اس باب کا ابتدائی حصہ مغالطہ انگیز ہے - یہاں اقبال اور نہرو اور جناح کے حوالے سے نظریہ پاکستان سے بحث کی گئی ہے - ایک نزاعی مسئلہ پر اقبال کو کھینچ کر لانا ، ادبی دیانت داری کے خلاف ہے - ویسے قیام پاکستان سے بہت پہلے علامہ اقبال کا انتقال ہو گیا تھا۔

مجموعی طور پر یہ کتاب "اقبالیات" کے ذخیرے میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے - اور دلچسپ بات تو یہ ہے کہ اس کتاب کے رد عمل میں کلیم الدین احمد مرحوم کی کتاب "اقبال ایک مطالعہ" بھی آئی تھی جس میں تقریباً ایسے ہی عنوانات سے بحث کی گئی ہے۔

ooooo

نام کتاب	تابدار (شعری مجموعہ)
شاعر	اسحاق ملک
زیر اہتمام	انجمن تعمیر ادب آندھرا پردیش
	سلطان پورہ حیدر آباد (اے پی)
ملنے کا پتہ	متصل شمس ہوٹل چادر گھاٹ حیدر آباد
قیمت	۳۰ روپئے (۳۰ ریال، ۲۰ امریکی ڈالر)
تبصرہ نگار	یوسف روش، ایم فیک (عثمانیہ)

فنون لطیفہ خصوصاً شاعری کا یہ المیہ ہے کہ نہ اس کی حد ہے نہ انتہا - خوش فہمی یا غلط فہمی سے اگر کوئی فنکار فن سے مطمئن ہو کر بے نیاز ہو جائے تو سمجھنا چاہیے کہ فن کی موت ہو گئی - خدا نہ کرے کہ اسحاق ملک پر ایسا کوئی مرحلہ آئے ورنہ ان کے جذبات و احساسات کا یہ شعری سفر یکلخت رک جائے گا جو نہ مطلوب ہے نہ مقصود۔

اللہ کرے مرحلہ شوق نہ ہو طے

مجموعہ کلام "تابدار اسحاق ملک کی شاعری کے دور دوم کا اچھوتا مرقع اور جذبات کا بھرپور آئینہ ہے جس میں غزلیں اور نظمیں پیش کی گئی ہیں - جذبہ حب الوطنی سے سرشار ، انسانیت کا حامی اور ستھرے ذہن کا یہ فنکار ایسی عبادت کا قائل نہیں جس میں اسرار بندگی وا نہ ہو سکیں - اسحاق ملک شعر کہنے کا منفرد لہجہ رکھتے ہیں - ان کے ہاں انسانی درد ، اخلاقی ہمدردی ، محنت کا شعور اور انسانیت سے پیار کہیں زیادہ تو کہیں کم ملتا ہے۔

نظمیں سر سید احمد خاں سے لے کر پی - سی - سرکار (جونیر) تک مختلف اہم شخصیتوں کے گرد گھومتی نظر آتی ہیں - جن میں ادبی و فلمی شخصیتیں بھی ہیں اور سیاسی ہستیاں بھی شامل ہیں - ان نظموں میں عقیدت کا بے پناہ اظہار ہے اور انسانی احترام عجیب نزاکت سے پیش کیا گیا ہے جن کا احساس مطالعہ کے بعد ہی گہرا ہو سکتا ہے۔

چند شعر حسن انتخاب کے لئے پیش کئے جاتے ہیں

ٹھہر کچھ دن تو اے دل مضطر
پل رہا ہے ابھی صدف میں گہر

بقیہ ۔۔ پر

احوال و اخبار

اردو اکادمی، دہلی کے سالانہ ایوارڈز کا اعلان

نئی دہلی اردو اکادمی دہلی کی گورننگ کونسل کا خصوصی اجلاس ۲۹/ جون کو دہلی سرکار کے وزیر اعلیٰ شری صاحب سنگھ ورما کی صدارت میں منعقد ہوا۔ دہلی کے وزیر اعلیٰ دہلی کی تمام اکادمیوں کے بہ لحاظ عہدہ چیئرمین بھی ہیں میٹنگ میں علاوہ دیگر امور کے ذیل کے ادبی و علمی ایوارڈ دینے کا فیصلہ کیا گیا۔ ۱۹۹۵ء کے کل ہند نوعیت کے بہادر شاہ ظفر ایوارڈ کے لیے جو ۵۱ ہزار روپے مالیت کا ہے اردو کے ممتاز محقق اور ماہر غالبیات کالی داس گپتا رضا کے نام کا اعلان کیا گیا۔ علمی و تحقیقی تحقیق کا ایوارڈ جناب خواجہ حسن ثانی نظامی کو، اردو صحافت کا ایوارڈ مولانا وحید الدین خاں کو، تخلیقی نثر کا ایوارڈ جناب ضمیر حسن دہلوی کو، اور اردو شاعری کا ایوارڈ جناب امیر آغا قزلباش دیا جائے گا۔ اور بہترین استاد (اردو میڈیم) کا ایوارڈ محترمہ شاہین اختر خاں کو دیئے جانے کا اعلان کیا گیا۔ یہ تمام ایوارڈ ۲۱ ہزار روپے مالیت کے ہیں۔ اردو خطاطی ایوارڈ جو گیارہ ہزار روپے مالیت کا ہے محمد سالم کو دیا جائے گا۔ اسی موقع پر ۱۹۹۴ء اور ۱۹۹۵ء میں شائع ہونے والی اردو کتابوں پر بھی انعامات کا اعلان کیا گیا۔ چار چار ہزار روپے کے ۱۵ اور دو دو ہزار روپے کے ۷ انعام کل ۲۲ کتابوں پر دیئے گئے۔ تفصیل حسب ذیل ہے۔

چار ہزار روپے مالیت کے انعامات

پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی (مولانا ابوالکلام آزاد) پروفیسر صغرا مہدی (سیر کر دنیا کی غافل) آمنہ ابوالحسن (یادش بخیر) ڈاکٹر محمد شاہد حسین (ڈرامہ فن اور روایت) ڈاکٹر سید جمال الدین (برطانوی راج میں مذہب اور سیاست) انجم عثمانی (شبلی ومشن نظریات) پروفیسر امیر عارفی (لیلیٰ کے خطوط اور مجنوں کی ڈائری) قاضی عبید الرحمان ہاشمی (سید عابد حسین) پروفیسر شارب ردولوی (تنقیدی مباحث) پروفیسر عتیق اللہ (ادبی اصطلاحات کی وضاحتی فرہنگ) سیدہ نسیم چشتی (تعاقب) نور جہاں ثروت (بے نام شجر) عطاء الرحمان قاسمی (دہلی کی تاریخی مساجد) ڈاکٹر خالد محمود (اردو سفر ناموں کا تنقیدی جائزہ) علاؤ الدین اسیر (بچوں کی رباعیاں)

دو ہزار روپے مالیت کے انعامات

ڈاکٹر اسد رضا زیدی (ماہیت الامراض) کرشن پوری (میری راہیں میری منزل) عبدالمعروف خاں (کاسہ خیال) امداد کرتپوری (خالق ذوالجلال) شہباز ندیم ضیائی (شہباز) ڈاکٹر توقیر احمد خاں (شعریات بال جبریل) مسعود الحق (استادوں کی تعلیم و تربیت)

اردو ناشرین ایوارڈ برائے ۹۴ اور ۹۵ء

معیار علی کیشنز (چار ہزار روپے) عاطف بک ڈپو (چار ہزار روپے) ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی (چار ہزار روپے) ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، (چار ہزار روپے)

جلسہ تقسیم ایوارڈ عنقریب منعقد کیا جائے گا جس میں دہلی کے وزیر اعلیٰ ایوارڈ تقسیم کریں گے۔

مرسلہ اردو اکادمی، دہلی

ooooo

نو تشکیل شدہ مہاراشٹر اردو اکادیمی کی سرگرمیاں

ممبئی نو تشکیل شدہ مہاراشٹر اردو اکادیمی نے اپنی سرگرمیوں کا آغاز فروری ۹۶ء سے کر دیا ہے، اس مختصر عرصہ میں گزشتہ بورڈ کے فیصلوں پر عمل کرنے کے ساتھ ہی دوسرے اہم کاموں کی جانب پیش رفت ہوئی ہے حکومت مہاراشٹر تعلیم نسواں میں خصوصی دلچسپی رکھتی ہے اور اس کے لیے کوشاں رہی ہے، اس سلسلے میں اکادیمی نے ممبئی کے ایس این ڈی ٹی ویمنس کالج میں شعبہ اردو کے قیام کی تجویز منظور کی، اس کے علاوہ ان سرکاری کالج جہاں اب شعبہ اردو قائم نہیں رہے، وہاں پر اردو شعبہ قائم کرنے کی سفارش کی گئی ہے۔ اس ضمن میں فی الحال ممبئی کے الفنسٹن اور سڈنہم کالج اور کولہاپور کے راجارام کالج میں شعبہ اردو کے قیام کے لیے محکمہ تعلیم سے رابطہ قائم کیا جارہا ہے۔

اردو اکادیمی اردو مراٹھی اور مراٹھی اردو لغت کے پروجیکٹ پر کام کر رہی ہے، اسی طرح مراٹھی ادب کی تاریخ اردو میں اور ریاست کی اہم اور تاریخی شخصیتوں پر تعارفی کتابوں کا سلسلہ شروع کرنے کا منصوبہ ہے۔ اکادمی مراٹھی ادب کی منتخب شہکار تخلیقات کو اردو میں تلخیص و ترجمہ کرکے شائع کرنے کا پروگرام بنا رہی ہے۔ اس کے علاوہ اکادیمی، مہاراشٹر کے قدیم اور شاعروں کے دواوین کے انتخابات شائع کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ سال

رواں کے دوران اکادمی حسب سابق اردو محفل، علاقائی ریاستی اور قومی سیمنار و مشاعرہ کے علاوہ کتب نمائش، صحافت ورکشاپ اور پرائمری اساتذہ کی تربیت کے لیے تدریسی ورکشاپ منعقد کرے گی۔

ہمارا اشتراردو اکادمی کی گزشتہ اسکیمیں مثلاً لائبریریوں کے لیے کتابی امداد، غیر اردو دانوں کے لیے کلاسس، کتابت کلاسس، کالج اور اسکولوں کی اردو تقریبات کے لیے امداد، معذور ادیبوں، شاعروں کی اعانت یک بابی ڈراموں کے مقابلے، مسودوں کی اشاعتی امداد اور کتابوں پر انعامات وغیرہ حسب سابق جاری ہیں۔ اکادمی کا بجٹ فی الحال 26.45 لاکھ روپئے ہے۔ اکادمی کی پرانی اور نئی اسکیموں کے لیے مزید بجٹ کی ضرورت ہوگی جس کے لیے محکمہ مالیات سے مطالبہ کیا گیا ہے۔

جاری کردہ   جی۔ایم۔نوپلنکر (ممبر سکریٹری)

ooooo

ساغر پالم پوری کی وفات

شری ایس۔ این۔ ورما کی صدارت میں تعزیتی جلسہ

شملہ ۶/ مئی بزم ادب ہماچل (رجسٹرڈ) اور انجمن ترقی اردو ہند (ہماچل پردیش) کی ایک مشترکہ نشست شری ایس - این - ورما (آئی اے ایس) کی صدارت میں منعقد ہوئی۔ جس میں ہماچل پردیش کے مشہور شاعر اور کہانی کار شری منوہر شرما ساغر پالم پوری جن کا انتقال ۳۰/ اپریل کو ہوا کی یاد میں ہماچل کے شعراء و ادباء نے اپنے گہرے دکھ کا اظہار کیا۔ متوفی ساغر پالم کی آتما کی شانتی کے لیے دو منٹ کی خاموشی اختیار کی گئی۔ اور ایک تعزیتی قرارداد پاس کی گئی۔ آں جہانی ساغر کے پس ماندگان سے ممبروں نے ہمدردی کا اظہار کیا اور ان کی ذہنی وقلبی صلاحیتوں کا ذکر کیا گیا۔ خصوصاً ان کی کثیر پہلو شخصیت، ان کی حس طنز و مزاح اردو، انگریزی، ہندی اور پہاڑی زبانوں پر ان کے یکساں عبور اور پہاڑی وارد و لٹریچر میں ان کی خدمات کا اعتراف کیا گیا۔ ساغر صاحب نے اپنی پہاڑی کویتاؤں کا مجموعہ "میں بنجارا گیتاں دا" ۱۹۸۵ء میں شائع کروائی تھی۔ ان کی شعری و نثری تحریریں اردو، ہندی پہاڑی اور ڈوگری رسائل میں متواتر شائع ہوتی رہی ہیں۔

ممبران نے تجویز فرمایا کہ ہماچل پردیش اکاڈمی آف آرٹس، کلچر اینڈ لینگویجز اور ڈپارٹمنٹ آف لینگویجز اینڈ کلچر کو اپنے شعبوں کی اشاعتوں میں ساغر صاحب کے لیے ایک خصوصی گوشہ شائع کرنا چاہیے جس سے ان کی زندگی اور ادبی خدمات روشنی میں آجائیں۔ ڈپارٹمنٹ اور اکاڈمی کو ساغر صاحب کی اردو منظومات حاصل کرکے شائع کرنا چاہیے کیونکہ آں جہانی اپنا اردو مجموعہ شائع نہیں کرواسکے تھے۔

شہاب للت (جنرل سکریٹری) بزم ادب، ہماچل

ooooo

عالمی یوم اردو (مشاعرہ)

ایک عظیم الشان مشاعرہ ڈاکٹر حنیف ترین کے گھر "بیت الاردو" الجریدہ (عراق اور سعودی سرحدی شہر) میں منعقد کیا گیا جس میں بزم احباب سخن عرعر (سعودی عربیہ) کے کارکنان شمطا احمد، رئیس لکھنوی، امتیاز اعظمی، ذاکر حسین ذاکر، محمد نسیم اعظمی، نعیم بیگ مہوی، غلام نبی شاکر (نائب صدر) اور ظفر علی وغیرہ نے ڈاکٹر حنیف ترین کا ہاتھ بٹایا۔ پروگرام تلاوت قرآن پاک سے شروع ہوا جس میں ڈاکٹر حنیف ترین، امتیاز اعظمی اور غلام نبی شاکر نے یوم اردو سے متعلق اپنے اپنے مقالے پیش کئے۔

مشاعرے کے آغاز سے پہلے ڈاکٹر حنیف ترین نے حمد پیش کی۔ امتیاز اعظمی نے نعت پاک پیش کرنے کے بعد بزم کی سالانہ کارگزاریاں بیان کی، جس کے بعد مشاعرے کا آغاز ہوا جو صبح کاذب تک چلتا رہا اس مشاعرے میں بدرالدین بابر کو بھی خراج تحسین ادا کیا گیا جو سعودی عرب سے مستقل طور پر وطن واپس جارہے ہیں اور اسی مجلس میں رحمت اللہ جری (حیدرآبادی) کی دو غزلیں بھی پیش کی گئیں جو اس بزم کے بانیوں میں سے ایک ہیں اور جو معروف شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ بزم کے سب سے پہلے صدر بھی رہ چکے ہیں اور اب سعودی عرب کو خیرباد کہہ چکے ہیں۔

جن شعراء کے کلام کو سامعین نے بے حد سراہا ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں   رحمت اللہ جری، حنیف ترین، امتیاز اعظمی، غلام نبی شاکر، عطاء اللہ خاں رامپوری، محمد نسیم اعظم گڑھی، ذاکر حسین ذاکر، محمد احمد، وصی اللہ بلیاوی، بدرالزماں بابر۔

ڈاکٹر حنیف ترین، صدر بزم احباب سخن عرعر (سعودی عربیہ)

ooooo

آپ کی ڈاک

خطوط نگار کی رائے سے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے

○ میرے خیال میں ماہنامہ "انشاء" کو شائع ہوتے ہوئے کوئی دس برس کا عرصہ گزر چکا ہے اور اس ایک دہائی میں اس نے بہت سا سفر طے کیا ہے اور اگر اسے اب اردو ادب کے سفر کا ایک سنگ میل کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اس کے اوراق کی تزئین اور نظم و نثر کے حصے آپ کی محنت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔

یہاں کے ادبی حلقوں میں بھی اسے بہت سراہا جا رہا ہے اور میرے تمام ادب نواز دوستوں کا خیال ہے کہ آپ کی اس کاوش کو برسوں تک بھلایا نہیں جا سکے گا۔

گلشن کھنہ۔ لندن

ooooo

○ انشاء کا اداریہ ہر ماہ سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔ محترم جناب رئیس الدین فریدی صاحب سے شمشیر سنگھ شیر کے مجموعۂ کلام "غم خانہ۔ شیر" پر تبصرہ کرتے ہوئے سہو ہو گیا ہے جہاں خیام کی ایک رباعی کا حوالہ دے کر دو مصرعے تحریر کئے گئے ہیں پہلا مصرع خیام کا ہے لیکن دوسرا مصرع خیام کا نہیں ہے اصل رباعی اس طرح ہے۔

ابریق مے مرا شکستی ربی
بر من در عیش را ببستی ربی
بر خاک فگندی مے گلگون مرا
خاکم بدہن مگر تو مستی ربی

رفعت امروہوی۔ احمد آباد

ooooo

○ مئی کے شمارے میں سلمان رشدی کے ناول سے متعلق قیصر تمکین کی تحریر بامعنی ہے۔ خواتین ان دنوں تمام رسائل میں کمزور ہی شائع ہو رہی ہیں۔ دراصل اب پھر اردو غزل وہاں پہنچ گئی ہے جہاں سے اس کے لئے نئی راہیں نکل سکتی ہیں اور اس سے انحراف کرنے کی بھی گنجائش ہے۔

احمد وصی۔ بمبئی

○ مارچ اپریل کے شمارے میں آپ کے دونوں اداریے حقیقت پر مبنی ہیں اور بہت تیکھے ہیں۔ ایڈوانی اور بال ٹھاکرے کی فرقہ وارانہ ذہنیت نے کھیل کے میدانوں کو بھی سیاسی اکھاڑہ بنا رکھا ہے۔ سو ناتھ بھٹی کا کرکٹ کا یہ ہندوستانی شیدائی ٹھاکرے اور ایڈوانی ہی کی ذہنیت کا پروردہ ہے۔ نہ انھیں معاف کیا جا سکتا ہے نہ اسے۔ آپ نے بہت مدلل طور پر دو ٹوک باتیں اپنے اداریے میں کی ہیں۔

دوسرے اداریے میں اختر الایمان کی شاعرانہ عظمتوں کا آپ نے نہ صرف کھلے دل سے اعتراف کیا ہے، ان کے ساتھ روا رکھی گئی کج فہمیوں کا بھی پردہ چاک کیا ہے۔ دونوں اداریے ذہن کو سوچ کے پہلو مہیا کرتے ہیں۔

حضور انورؐ پر خورشید احمد کا مضمون اور نارنگ ساقی کا "تماکوں کا مسیحا" بھی خوب ہیں۔

اقبال متین۔ نظام آباد

ooooo

○ ایک مدت سے آپ کی محبت "انشاء" کی صورت میں سمیٹ رہا ہوں اکثر رسید بھی نہیں دے پاتا مگر آپ کی محبت میں کمی نہیں آئی۔ انشاء جس پابندی اور مستعدی سے آپ نکال رہے ہیں اس کی تعریف نہ کرنا یقیناً ناانصافی ہوگی۔ تازہ شمارے میں مضامین کا انتخاب نہایت عمدہ ہے۔ اس کے علاوہ گراں قدر متفکرانہ اداریہ "کھیل اور وطن کی محبت" آپ کی ادبی و صحافتی دیانتداری کا مظہر ہے۔

نارنگ ساقی۔ نئی دہلی

ooooo

○ مارچ اپریل کا مشترکہ شمارہ پیش نظر ہے جس میں آپ کا اداریہ "بعنوان کھیل اور وطن کی محبت" آپ کے بے باک صحافتی کردار کا آئینہ دار ہے۔ انجام سے بے پرواہ ہو کر یہ کوتاہ بیں کرکٹ شیدائی ایک مریضانہ ذہنیت کا برملا اظہار کرتے رہتے ہیں جو بہر طور قابل مذمت ہے۔ نثری و شعری حصے حسب سابق وقیع اور معیاری ہیں۔

سعید رحمانی۔ کٹک (اڑیسہ)

ooooo

○ انشاء کی کمپیوٹر کتابت اور عمدہ طباعت جاذب نظر ہے - اپنے مواد اور تزئین و ترتیب کے اعتبار سے انشاء اپنی مثال آپ ہے پچھلے دو شماروں میں افسانے بھی اچھے چھپے ہیں اور تنقیدی مضامین و تبصرے معلوماتی اور سیر حاصل ہیں - شعری حصہ بھی کافی اچھا اور وقیع ہوا ہے - لیکن سرورق کی تصویریں ذرا مناسب نہیں لگتیں - ایک بہترین علمی ادبی پرچے کے سرورق پر دوشیزاؤں کی تصویریں بہت معمولی لگتی ہیں اور اسے زیب بھی نہیں دیتی ہیں اس طرف میرے احباب نے بھی توجہ دلائی ہے کیا ہی اچھا ہو کہ شمارے کی مناسبت سے کسی شاعر یا ادیب کی تصویر شائع کریں - جیسے تازہ شمارہ میں گوشہ شمشیر سنگھ کی مناسبت سے ان کی تصویر چھاپتے تو بہتر ہوتا۔

عظیم راہی ، اورنگ آباد (مہاراشٹر)

ooooo

○ انشاء مئی کے شمارے میں آپ نے درست کہا ہے کہ "کیا ادب مر رہا ہے" بھائی میری ناقص رائے میں تو ادب مر رہا ہے - اور زوال پذیر ہے - آپ دیکھیے حالیہ 20 برسوں میں ادب نواز اور ادیب کم ہوگئے ہیں اور ان کی جگہ ٹیلی ویژن اور فاسٹ میڈیا نے لے لی ہے - جس نے ہماری آنے والی نسلوں کو بھی پستی میں ڈال دیا ہے - ہماری نوجوان نسل نے اب رسالوں کو پڑھنا چھوڑ دیا ہے - اچھی اور معیاری کتابیں پڑھنی اور خریدنی چھوڑ دی ہیں - اور اس کے بدلے معیار سے نہایت گری ہوئی فلمیں زور شور سے سنیما اور ویڈیوز پر دیکھ رہے ہیں - اب ان صحت مند نوجوانوں کو "صحت مند لٹریچر" کی ضرورت نہیں رہی - کیونکہ اچھی اور دلچسپ چیزیں پڑھنے کو ان کے پاس وقت ہی کہاں ہے - حتیٰ کہ اپنی مادری زبان بولنے سے بھی یہ اچھے لوگ کترانے لگے ہیں -

نہ جانے کب ہمارا شعور بیدار ہوگا کہ ہماری بھی تہذیب ہے ، کلچر ہے - ہماری بھی زبان ہے - اور ان چیزوں کو اس نوجوان نسل نے زندہ رکھنا ہے نہ جانے کب ہم میں برداشت کا مادہ آئے گا - نہ جانے کب -

حضرت شاہ ، بریڈ فورڈ (برطانیہ)

ooooo

○ مئی کے شمارے کے سبھی مشمولات بہت پسند آئے - شمشیر سنگھ شیر کے مجموعہ رباعیات "خم خانہ شیر" سے متعلق پروفیسر گوپی چند نارنگ ، اعظم خاں اور رئیس الدین فریدی تینوں نے بڑی آزادی اور دلیری سے لکھا ہے - اور شراب "خم خانہ شیر" کو پڑھنے اور غور کرنے کا سامان بنا دیا ہے - میں یہ کتاب حاصل کرنا چاہتا ہوں - مگر یہاں دستیاب نہیں ہے - شاید دہلی میں مل جائے یا آپ کے یہاں دستیاب ہو -

آپ کا اداریہ "کھیل اور وطن کی محبت" بہت اہم ہے - لوگوں کو عبرت پکڑنی چاہیے -

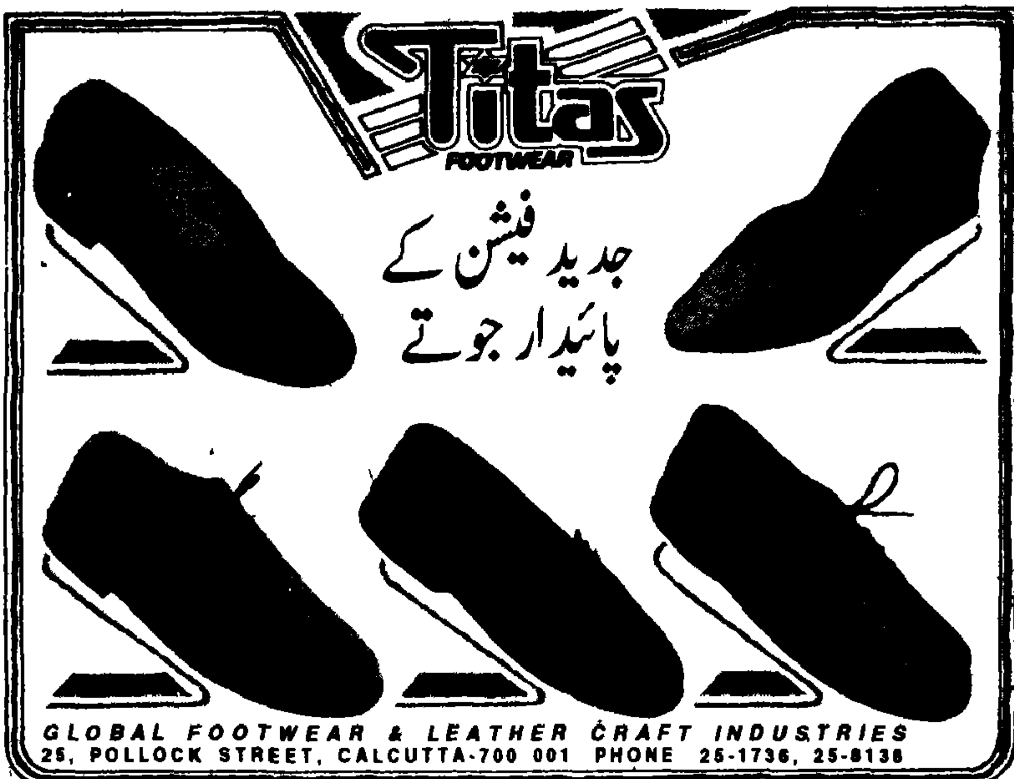
سجاد حسین ، لکھنؤ

ooooo

نیاز فتحپوری نمبر

تیاری کے آخری مراحل میں ہے۔




Titas
FOOTWEAR
جدید فیشن کے
پائیدار جوتے
GLOBAL FOOTWEAR & LEATHER CRAFT INDUSTRIES
25, POLLOCK STREET, CALCUTTA-700 001 PHONE 25-1736, 25-8136


انشاء پبلی کیشنز کی خاص مطبوعات
پہلی بار
حسن کے پیمانے اور
عشق کی نفسیات
سے واقف ہو جائیے۔
پڑھیے ف۔س۔ اعجاز کی مرتب کردہ
نفسیاتی پیشکش
ادیبوں کی حیاتِ معاشقہ
مجلد شہرڈی لکس ایڈیشن۔
انشاء سائز کے ۴۰۲ صفحات
REVISED PRICE LIBRARY EDITION
RS 200/- (INDIA)
US$ 20 (ABROAD)
وی پی ہیں بھیجی جائے گی۔ رقم پیشگی روانہ فرمائیں۔
ڈرافٹ کلکتہ کے کسی بنک پر واجب الادا ہوں۔
یوروپ کا سفرنامہ
مصنف: ف۔س۔ اعجاز
سیر و سیاحت کے ادب میں
ایک اہم اضافہ
ف۔س۔ اعجاز کا
ماسکو، اوسلو (ناروے)
کوپن ہیگن (ڈنمارک)
لندن اور پیرس کا سفرنامہ
ادب، تاریخ اور سیر و سیاحت کے شائقین کیلئے
ایک پرلطف، خوبصورت، باتصویر اور بامقصد
کتاب۔ اترپردیش اردو اکادمی سے انعام یافتہ
قیمت اندرون ملک: ۱۰۰ روپے
بیرونی ممالک ۱۵ امریکی ڈالر
کوئی کتاب پسند نہ آئے پر واپس بھیجی جا سکتی ہے۔
اس کی قیمت لوٹا دی جائے گی۔
انشاء
عالمی اردو افسانے
مرتبہ: ف۔س۔ اعجاز
۲۱ویں صدی کے باب اساطیت پر
۷۳ اولین دستکیں
۱۲ ممالک سے ۷۰ اردو افسانہ نگاروں کے
۷۳ تازہ افسانے
افسانہ کے عصری مسائل پر ایک بھرپور مباحثہ
اور ۳ وقیع مضامین بھی
مجلد لائبریری ایڈیشن
انشاء سائز کے ۳۶۸ صفحات
صوصفہ مصوری، حرف حرف موتی
قیمت (اندرون ملک) ۱۵۰ روپے
(بیرون ملک) ۲۰ امریکی ڈالر
INSHA PUBLICATIONS
8-A, KANAI SEAL STREET CALCUTTA 700 073

میٹرو مسافروں کا رہنما

کلکتہ میٹرو جدید شہری ٹرانسپورٹ نظام میں اپنے قائم کردہ اعلیٰ معیار اور وضع کردہ کلچر کے سبب ملک کا فخر بن گیا ہے۔ آپ لوگوں نے اسے ممکن بنایا ہے:

آپ کے محفوظ سفر کے لئے

- جب آپ سنیں "دروازہ بند ہو رہا ہے" تو ٹرین میں چڑھنے اور اس سے اترنے کی کوشش نہ کریں۔ دروازہ کھولنے کی کوشش نہ کیجئے اور نہ ہی اس پر جھکیے۔
- کیا آپ نے پلیٹ فارم کے کنارے پر سفید جلی دھاری "لکیر فاصل" کو دیکھا ہے؟ جب تک ٹرین بالکل رک نہ جائے اس کو پار نہ کریں۔ تیسری لائن میں ہائی وولٹ الکٹرک کرنٹ ہے۔ اس کو چھو لینا نقص جان کا باعث ہو گا۔
- میٹرو جگہوں پر تمباکو نوشی نہ کیجئے۔
- آگ بھڑکانے کا کوئی بھی سامان ساتھ لے کر نہ چلیں۔ یہ خطرناک ہے۔

میٹرو میں صفائی کے لئے

- کھانے کا کوئی سامان لئے ہوئے میٹرو میں داخل نہ ہوں۔
- میٹرو جگہوں کو کاغذ، مونگ پھلی کے چھلکوں وغیرہ سے گندہ نہ کیجئے۔
- میٹرو بے تمباکو علاقہ ہے۔ اسٹیشن کے داخلے کے باہر ہی سگریٹ کے ٹکڑے کوڑے دان میں پھینک دیں۔
- جابجا رکھے ہوئے کوڑے دانوں میں استعمال شدہ ٹکٹ پھینک دیں۔

ہماری مدد کیجئے تاکہ ہم آپ کی بہتر خدمت کر سکیں۔



میٹرو ریلوے
کلکتہ

مشرقی ہندوستان کا بہترین اور واحد بین الاقوامی اردو رسالہ

انشاء

ISSN : 0971 - 6009

جلد :۱۱ | نومبر/دسمبر ۱۹۹۶ء | شمارہ : ۱۱/۱۲

انشاء پبلیکیشنز IP

مدیر: ف۔س۔اعجاز

فی شمارہ : ۸روپئے

زرسالانہ : ۹۰روپئے

مغربی ممالک سے : £ 12
or
US $ 20

رقومات بذریعہ منی آرڈر، بینک ڈرافٹ، چیک صرف "انشاء پبلی کیشنز" کے نام میں روانہ فرمائیں ورنہ قابل قبول نہ ہوں گی۔ برطانیہ سے BPO کے ذریعہ رقومات بھیجی جائیں۔

فہرست

ماہنامہ انشاء۔انشاء پبلی کیشنز

خط و کتابت، مضامین بھیجنے اور ترسیل زر کا پتہ :
۲۵۔بی زکریا اسٹریٹ، کلکتہ ۷۳ ۰۰۰ ۷۔فون : ۲۵۔۶۱۱۶



شمیم گل کی نقاشو بھلا تصویر تو کھینچو

سکر وحِ تجرّد بھی کہیں پابند ہوتا ہے
شمیم گل کی نقاشو بھلا تصویر تو کھینچو

مومن

آجکل مصور مقبول فدا حسین کی مصوری وشو ہندو پریشد، شیو سینا اور بی۔جے۔پی۔کی زد پر ہے۔ وشو ہندو پریشد کی جمشید پور شاخ کے کنوینر لشمنت نرائن تیواری نے مقبول فدا حسین پر تعزیرات ہند کے تحت فوجداری مقدمہ دائر کر دیا ہے۔ فدا حسین پر الزام لگایا ہے کہ انہوں نے ہندو دیویوں کی ننگی اور مختلف جانوروں کے ساتھ سوالیہ پہلوؤں کی تصویریں بنا کر ان دیویوں کو بے عزت کیا ہے اور ہندوؤں کے جذبات بھڑکائے ہیں۔ بھوپال کے ایک ہندی رسالے "وچار ممانسا" کے پبلشر اور ایڈیٹر وجے شنکر واجپئی کے خلاف بھی مقدمہ کیا گیا ہے جس نے حسین کی بنائی ہوئی ان تازہ ترین تصاویر اور ان سے متعلق ایک مضمون "یہ چترکار ہے یا قصائی" شائع کیا تھا۔ واجپئی کو اس لئے ملزم بنایا گیا ہے کہ اس نے اس طرح مصور کے مقاصد کی تشہیر کی۔ اس سے ہندو تواپرستوں کی ذہنی الجھن کا پتہ چلتا ہے کیونکہ سچ یہ ہے کہ واجپئی نے اپنے طور پر ہندو فرقے کو لاحق حسین کے "مصورانہ حملے" سے بیدار کرنا چاہا تھا۔

تیواری نے اپنی پٹیشن میں کہا ہے کہ حسین نے علم کی دیوی سرسوتی کی جو تصویر بنائی ہے اس میں اس کی ننگی ٹانگیں دکھائی ہیں اور تصویر کے نیچے "سرسوتی" لکھا ہے۔ حسین نے فلم اداکارہ مادھوری دکشت کی تصویریں بھی بنائی ہیں۔ امیں سے ایک میں وہ مصور کے پہلو میں نظر آتی ہے۔ دیگر تصاویر میں دروپدی کو برہنہ دیکھا جا سکتا ہے۔ ایک سلف پورٹریٹ میں خود مصور کو کینوس پر ایک برہنہ عورت کا خاکہ بناتے ہوئے دیکھا جا سکتا ہے۔ ایک پینٹنگ میں ایک عورت سانڈ کے قریب مخصوص پوز میں کھڑی ہوئی ہے۔ ایک اور تصویر میں درگا شیر ببر کی پیٹھ پر ننگی بیٹھی دکھائی گئی ہے۔ تیواری کا الزام ہے کہ مقبول فدا حسین نے قصداً ہندوؤں کے مذہبی جذبات کو مجروح کیا ہے۔

اس بحث میں نیا کچھ نہیں ہے۔ اگرچہ یہ ہمیشہ کی طرح دلچسپ ہے۔ اگر VHP کے دلائل میں وزن ہے تو سب سے پہلے اسے ایلورا، کونارک اور کھجوراہو کے تاریخی ننگے بتوں کی نمائش پر پابندی لگوا دینی چاہئے۔ لیکن یہ قدیم ہندو کلچر سے بغاوت ہوگی۔ ایسا لگتا ہے یا تو ہندو توا واروں نے ہندوستانی آرٹ سے متعلق اپنے نظریے میں ترمیم کر لی ہے یا اپنے دھرم کو اب وہ نئی نظر سے دیکھنے لگے ہیں۔ ظاہر ہے عملی آرٹ کے بارے میں یہ نکتۂ نظر ان کی کوتاہ نظری، خوف اور جارحیت پر مبنی ہے اور سیاسی مقاصد سے پر ہے۔ ہندو آرٹ میں عمل مواصلت کبھی اخفا پسندی کا شکار نہیں تھا۔ سنسکرت میں لکھی ہوئی وتسایانا، کلیان مل، پنڈت کوکا وغیرہ کی تصانیف کو کون جھٹلا سکتا ہے جو جنسی آسنوں کی تفصیل بیان کرتی ہیں اور جہاں تک اصنام برہنہ کا تعلق ہے وہ قدیم کھنڈروں کے علاوہ کئی پوجا استھانوں میں بھی پائے جاتے ہیں۔ مقبول فدا حسین کے آرٹ کے اس کھلے اظہار میں ان کے اپنے اسٹائل کے سوا نئی بات کیا ہے۔

کلکتہ میں درگا پوجا منائی جانے والی ہے۔ حسب معمول پوجا کے شامیانوں میں دیویوں کے بت لگائے جائیں گے۔ اس کے بعد کالی پوجا کے موقع پر کالی دیوی کے بت لگائے جائیں گے۔ کون سا بت عریاں نہیں ہوگا۔ مٹی کے ان بتوں کو تیار کرنے والے کاریگر ہندو بھی ہیں اور بعض مسلمان بھی۔ یہاں شبیہ گری ایک پیشہ ہے۔ کلکتہ میں (اتفاق سے ہمارے پڑوس میں ہی) سب سے اچھے ٹھاکر بنائے جاتے ہیں۔ ہندو تہواروں سے پہلے مہینوں محنت کی جاتی ہے ان دیویوں اور دیوتاؤں کے بتوں کے ڈھانچے بنانے میں اور رنگ و روغن سے پہلے ان بتوں کے اعضاء اور خدوخال

کو زیادہ سے زیادہ چست اور پرکشش بنایا جاتا ہے۔ نیچرل فارم میں مزید تاثر پیدا کرنے کے لئے خاص حصوں کو ابھارا جاتا ہے۔ یہ بت چکنی مٹی کے ہوتے ہیں اور رنگ و روغن کے بعد ان کے ستر اور سینے مختصر ریشمی زرق برق کپڑوں سے چھپا دئے جاتے ہیں اور زیورات و دیگر لوازمات سے انہیں مزین کر دیا جاتا ہے۔ جس سے ان بتوں کی عریانی کو کمی رہ جاتی۔ یہ بت اپنی برہنگی یا نیم برہنگی سمیت مقدس سمجھے جاتے ہیں۔ ان کا تاریخی پس منظر مائتھولوجی کے مطابق پہاڑی، جنگلی اور زراعتی طرز زندگی اور دور وحشت کا عکاس ہوتا ہے۔ چنانچہ ہندو آرٹ کے حوالے سے عریانیت کا کوئی نظریہ حتمی اور فیصلہ کن نہیں کہا جاسکتا۔ جس معاشرے میں کسی نہ کسی صورت میں فحاشی ایک تاریخی مذہبی شعار رہی ہو وہاں یہ طے کرنا مشکل ہے کہ آرٹ کا کون سا نمونہ فحش ہے اور کون سا نہیں۔ فحاشی کے بارے میں اگر کوئی ٹھوس قانون مقرر ہو جو کسی معنوی تکرار کا شکار نہ ہو تو اس کا صحیح اطلاق کسی آرٹسٹ کے شہکاروں پر کیا جاسکتا ہے۔ نئی صورت حال میں زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ آرٹ جب معاملات تقدس کو چھو لینا چاہتا ہے تو اس کی آزادی سلب ہو جاتی ہے تاکہ فنکار کا عمل لوگوں کی دل آزاری کا باعث نہ بنے۔ لیکن آرٹسٹ کو اکثر ایسے حالات کا سامنا ہوتا رہتا ہے جب وہ اپنی سیاسی یا مذہبی ترجیحات سے الگ ایسی شبیہوں کا انتخاب کر گزرتا ہے جنکی کشش، دل آویزی یا اشتعال انگیزی اسے فور اًلبھاتی ہے۔

فدا حسین تو ایسی تصاویر برسوں سے بناتے آرہے ہیں اور دلدادگان فن ان کی پینٹنگز کی داد دیتے رہے ہیں۔ انہوں نے اب تک مصوری دی ہے بھلے ہی فن کو کوئی نظریہ نہ دیا ہو۔ لیکن یہ کیا کم ہے کہ ہندوستان میں مصوری کو ذوق عام کا درجہ دینے میں انہوں نے بڑا رول ادا کیا ہے۔ البتہ اب سیاست، مذہب اور آرٹ کے تراہے پر ایک نئی کشمکش جنم لے رہی ہے۔ جن عریاں مجسموں کا طبیعت پر صرف اس لئے کوئی اثر نہیں ہوا کرتا تھا کہ یہ ہمارے اجتماعی شعور کا معمولی اور مسلمہ حصہ ہیں، دھرم کے قصہ ہائے پارینہ کے دیدہ و شنیدہ مرقعات ہیں اب سیاسی فتنہ پرور اس سے لذت طلبی کا پہلو نکالنا چاہتے ہیں اور لوگوں کی فرقہ وارانہ و جنسی حس کو تیز کرنے کے درپے ہیں۔ اس سے ایک آزاد مصور کا تخیل صدمے کا شکار ہو سکتا ہے جسے تفہیم حیات و کائنات، حقیقت کی عکاسی اور اپنے عہد کی سچائی میں گہری دلچسپی ہوتی ہے۔ کرداروں کے ظاہری خدوخال اور ملبوسات اپنے کینوس پر منتقل کرنا ہی پورٹریٹ پینٹر کا اولین مقصد نہیں ہوتا۔ اسے اپنے کرداروں کی نفسیاتی خاکہ کشی بھی کرنی پڑتی ہے۔

حسین اپنی مصوری کے ماڈلوں کے لئے جانی پہچانی اور مقبول نسائی شبیہوں کا انتخاب کرتے ہیں۔ شاید اس طرح وہ عوام کے دماغ میں بسی مقبول ترین چہروں کی شناخت سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ مادھوری دکشت کا سراپا انہوں نے اپنی سیریز میں پینٹ کیا ہے۔ چہرے کے نقوش کسی تصویر میں نہیں بنائے ہیں۔ بس چہرے کی جگہ ایک ہالہ بنا ہے۔ پھر بھی ناظرین شناخت کر لیتے ہیں کہ یہ خاکہ کس کا ہے۔ چہرے کے حسن کی بجائے بے چہرگی کی جمالیات سے متاثر کرنا بھی ایک فن ٹھہرا۔ اسی طرح حسین نے ہندو کلچر کے اس پہلو پر انحصار کیا ہے کہ دیوی دیوتا فطری شکل میں درشن دیتے آئے ہیں۔ چنانچہ ہندو مائتھولوجی کے چندہ نسائی کرداروں پر خاکہ آزمائی کی ہے۔ ظاہر ہے ان کرداروں سے وابستہ پرانے ماحولی تصورات اور معتقدات ناظرین کو اس تجریدی عمل کو سمجھنے میں مدد پہنچاتے ہیں۔ شیوسینا اور وشو ہندو پریشد نے فضول ہنگامہ مچا رکھا ہے۔ شیوسینا کے ہندی ترجمان "دوپہر کا سامنا" نے ایک پورا صفحہ فدا حسین پر الزام تراشی میں صرف کیا ہے جس میں پیغمبر اسلام کے بارے میں بھی اہانتی جملے شائع کیے گئے ہیں۔ اس سے الزام تراشنے والوں کی نیت ظاہر ہوگئی ہے۔ فدا حسین کا ننگے پاؤں چلنا مشہور ہوا تھا۔ اب لگ رہا ہے اس دور کی ذہانت ہی ننگے پاؤں چل رہی ہے۔ حسین کا قد اتنا اونچا کرنے کی کیا ضرورت تھی؟

؎ میں اپنے گریبان کے ٹکڑوں کا ہوں پیرو
چلتے ہیں جنوں میں مرے پاؤں سے سوا ہاتھ

مومن

ناروینجن اردو شاعر جمشید مسرور کلکتہ میں
ماہنامہ انشاء کی جانب سے استقبالیہ اور مشاعرہ

پچھلے دنوں نارویجین اردو شاعر جمشید مسرور چیئرمین ایشین آرٹس کونسل اور مدیر ماہنامہ "بازگشت" اوسلو (ناروے) جنہیں ابھی حال میں شہر اوسلو کی میونسپلٹی کی جانب سے سال رواں کا ایک لاکھ روپے کا قابل قدر کلچرل ایوارڈ حاصل ہوا ہے ایک مشاعرے میں شرکت کیلئے کلکتہ تشریف لائے۔ اس موقع پر ماہنامہ انشاء نے منگل ۱۵ اکتوبر ۹۶ء کو بھارتیہ بھاشا پریشد میں انہیں استقبالیہ دیا۔ تقریب کی صدارت جناب احمد سعید ملیح آبادی مدیر روزنامہ "آزاد ہند" نے فرمائی۔ مدیر ماہنامہ انشاء جناب ف۔ س۔ اعجاز نے مہمانوں کا استقبال کیا اور حاضرین محفل سے جمشید مسرور کا ادبی تعارف ان کے رسمی تخلیقی پس منظر نیز نارویجین پس منظر کے حوالے سے کرایا۔ اس کے بعد جناب کریم رضا مونگیری مدیر روزنامہ "عکاس" نے جمشید مسرور کو پھولوں کا ہار پہنایا اور صدر محفل جناب احمد سعید ملیح آبادی نے انشاء کی جانب سے بطور یادگار ایک منقش طشت آرائش جمشید مسرور کو پیش کیا جس پر انگریزی میں یہ عبارت کندہ تھی: "یہ طشت جمشید مسرور کو ان کی اردو شاعری اور نارویجین شاعری کے اردو تراجم کی ستائش میں پیش کیا گیا۔"

اس کے ساتھ ہی کلکتہ کی ایک ادب نواز شخصیت ڈاکٹر شکیل اختر (ایم بی بی ایس) نے جمشید مسرور کو ایک پرستار کی حیثیت سے سونے کا ایک لاکٹ تحفے میں پیش کیا۔ ڈاکٹر شکیل اختر ایک سماجی شخصیت ہیں اور انشاء نواز ہیں۔ انہوں نے کہا کہ وہ یہ تحفہ شاعر کو اس لئے پیش کررہے ہیں کہ انشاء کے "اسکینڈے نیویائی ادب نمبر" میں شامل اس کی شاعری نے انہیں بہت متاثر کیا تھا۔ ازاں بعد جمشید مسرور سے درخواست کی گئی کہ وہ اپنے احوال و مشاغل سے حاضرین کو خود باخبر کریں۔ جمشید مسرور نے ۱۸ سال پہلے لاہور سے ہجرت کرنے سے لے کر تا حال اپنے کوائف اور تخلیقی معاملات بیان کئے اور ایشین آرٹس کونسل (اوسلو، ناروے) کے چیئرمین کی حیثیت سے اپنی تنظیمی مصروفیات کا بھی ذکر کیا۔ انہوں نے کہا غالب کے اس شعر "کلکتے کا جو ذکر کیا تو نے ہمنشیں + اک تیر میرے سینے پہ مارا کہ ہائے ہائے" نے نجانے کیوں میرے اندر کلکتہ آنے کی خواہش پیدا کر دی۔ بعض سامعین نے جمشید سے علمی و ادبی نوعیت کے سوالات کئے۔ خصوصاً افسانہ نگار انیس رفیع (اسسٹنٹ اسٹیشن ڈائریکٹر دوردرشن کیندر کلکتہ) اور ڈاکٹر مظفر حنفی پروفیسر اقبال چیئر کلکتہ یونیورسٹی کے استفسار پر جمشید مسرور نے نارویائی اردو شاعری کے خصوص میں اور نارویجین۔ اردو، نارویجین ترجمے کی مشکلات اور پیش رفت کے سلسلے میں اہم نکات سے آگاہ کیا۔ جناب رئیس الدین فریدی مدیر "روزنامہ ہند" اور انیس رفیع نے جمشید مسرور سے کچھ ایسا کلام سنانے کا اصرار کیا جو ہندوستانی یا برصغیر کی جمالیات لفظاً اور معناً مختلف ہو۔

تقریب کے دوسرے دور میں ڈاکٹر مظفر حنفی کی صدارت میں ایک کامیاب مشاعرہ ہوا جس میں ناظم مشاعرہ ف۔ س۔ اعجاز کی فرمائش پر شعراء نے اپنا منتخب کلام پیش کیا۔ مشاعرہ پڑھنے والوں کے اسمائے گرامی یہ ہیں۔ جناب جذب آنولوی، جناب عاصم شہنواز شبلی، محترمہ کوثر پروین، محترمہ زرینہ زریں، جناب شہود عالم آفاقی، محترمہ ریحانہ نواب، محترمہ شہناز نبی، جناب ف۔ س۔ اعجاز، جناب کول سیالکوٹی اور جناب رئیس الدین فریدی۔ صدر مشاعرہ سے پیشتر مہمان جمشید مسرور نے اپنی چند نظمیں اور غزلیں سنائیں اور تقریب



(اوپر کی تصویر میں بائیں سے) مدیر انشاء ف۔ س۔ اعجاز، مدیر روزنامہ آزاد ہند جناب احمد سعید ملیح آبادی، جمشید مسرور (نشان یادگار وصول کرتے ہوئے) (تشریف فرما) ڈاکٹر مظفر حنفی، جناب افضل اقبال۔ نیچے کی تصویر میں جناب کریم رضا مونگیری (مدیر روزنامہ "عکاس") جناب جمشید مسرور کو پھولوں کا ہار پہنا رہے ہیں





تصویر(۱) محترمہ شہناز نبی نظم سرا ہیں۔ (۲) ڈاکٹر شکیل اختر جمشید مسرور کو سونے کا لاکٹ پیش کر رہے ہیں۔ (۳) ہندی شاعرہ کسم جین اور جمشید مسرور۔ (۴) دائیں سے، محترمہ رریہ زریں، جناب ایس رفیع، محترمہ ساجدہ رحمن (افسانہ نگار)، محترمہ ریحانہ نواب (غزل سرا ہیں)، محترمہ کوثر پروین۔ (٦) دائیں سامنے) جناب شہود عالم آفاقی۔ (۸) جناب ظفر عمر قدوائی (تنقید نگار)، جناب رئیس الدین فریدی، جناب کنول سیالکوٹی۔ (۹) (دائیں سے)

کے اولین دور میں بڑے پیچیدہ سوالات کرنے والوں کی تشنگی مٹانے کے لئے بطور خاص یہ غزل پیش کی اور حاضرین کو مغرب بعید کی خالص فضا میں لے گئے۔

غزل

باہر دمکتی برف میں اندر مہکتی رات میں
اس کے بدن کا پھول ہے جیسے ہوا کے ہات میں
کھڑکی سے چھنتے چاند میں نزدیک آتشدان کے
زلفوں کا سایہ اوڑھ کے بیٹھی ہیں آنکھیں گھات میں
اس کے لبوں سے ٹوٹ کر سیماب سے گرنے لگا
گیلے گلابوں سے اڑے جگنو اندھیری رات میں
آئیں ہوائیں زور سے، ان قیدیوں کے شور سے
مہتاب اس کے ہاتھ میں، طاؤس میرے ہاتھ میں
پھولوں کے جھرمٹ میں گئیں، پیڑوں کے پیچھے چھپ گئیں
اپنی قبائیں چھوڑ کے سب گوریاں برسات میں
اک نیم روشن کنج کی جادوگری سمٹی ہوئی
شانوں کے سیمیں حرف میں، آنکھوں کی نیلی بات میں
اک دلو فن، اک شکریہ، ہونٹوں نے آنکھوں سے کہا
اس نے کہا کچھ جھینپ کر، میں نے کہا جذبات میں
جمشید عنبر میں نہا، ہے ساعتِ حمد و ثنا
حوروں کے مہرِ جاں بدن ملتے ہیں ان درجات میں

آخر میں صدر مشاعرہ ڈاکٹر مظفر حنفی نے اپنے منفرد انداز کلام سے نوازا اور اس تقریب پر اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا۔ ناظم استقبالیہ جناب افضل اقبال کو ان کے حسن انتظام کے لئے مدعوئین نے پر خلوص مبارک باد پیش کی۔ محفل میں مختلف اصناف فن کے نمائندہ لوگوں نے شرکت فرمائی۔

[رپورٹ: ثاقب فیروز]

تقسیم

گلزار

Boskiyann
Pali Hill. Bandra.
Bombay - 400050

زندگی کبھی کبھی زخمی چیتے کی طرح جست لگاتی دوڑتی ہے۔ اور جگہ جگہ اپنے پنجوں کے نشان چھوڑتی جاتی ہے ! ذرا ان نشانوں کو لکیر سے جوڑ کے دیکھیے تو کیسی عجیب تحریر بنتی ہے۔

چوراسی پچاسی (85-84) کی بات ہے جب کوئی ایک صاحب امرتسر سے اکثر خط لکھا کرتے تھے کہ میں ان کا "تقسیم" میں کھویا ہوا بھائی ہوں۔ اقبال سنگھ نام تھا ان کا اور غالباً خالصہ کالج میں پروفیسر تھے۔ دو چار خط آنے کے بعد میں نے انہیں ایک مفصل جواب بھی دیا کہ میں تقسیم کے دوران دہلی میں تھا اور اپنے والدین کے ساتھ ہی تھا، اور میرا کوئی بھائی یا بہن ان فسادات میں گم نہیں ہوا تھا، لیکن اقبال سنگھ اس کے باوجود اس بات پر مصر رہے کہ میں ان کا گمشدہ بھائی ہوں۔ اور شاید اپنے بچپن کے واقعات سے ناواقف ہوں، یا بھول چکا ہوں۔ ان کا خیال تھا کہ میں بہت چھوٹا تھا جب ایک قافلے کے ساتھ سفر کرتے ہوئے گم ہو گیا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ جو لوگ مجھے بچا کر اپنے ساتھ لے آئے تھے، ان لوگوں نے بتایا نہیں مجھے، یا میں ان کا اتنا احسان مند ہوں کہ اب کوئی اور صورت حال مان لینے کے لیے تیار نہیں۔ میں نے یہ بھی بتایا تھا انہیں 1947 میں، میں اتنا کم عمر بھی نہیں تھا۔ قریب گیارہ برس کی عمر تھی میری۔ لیکن اقبال سنگھ کسی صورت ماننے کے لیے تیار نہیں تھے۔ میں نے جواب دینا بند کر دیا۔ کچھ عرصے بعد خط آنے بھی بند ہو گئے۔

قریب ایک سال گزرا ہو گا کہ بمبئی کی ایک فلم کار، سائی پرانجپے۔ ان کا ایک پیغام ملا۔ کوئی ہربھجن سنگھ ہیں دہلی میں، مجھ سے بمبئی آکر ملنا چاہتے ہیں۔ وجہ ملاقات سائی نے نہیں بتائی، لیکن کچھ پر اسرار قسم کے سوال پوچھے جن کی میں ان سے توقع نہیں کرتا تھا، پوچھنے لگیں۔

"تقسیم کے دنوں میں تم کہاں تھے ؟"

"دہلی میں !" میں نے بتایا ! "کیوں ؟"

"یوں ہی !"

سائی بہت خوبصورت اردو بولتی ہیں، لیکن آگے انگریزی میں پوچھا۔

"اور والدین تمہارے ؟"

"دہلی میں تھے۔ میں ساتھ ہی تھا ان کے، کیوں ؟"

تھوڑی دیر بات کرتی رہیں، لیکن مجھے لگ رہا تھا جیسے انگریزی کا پردہ ڈال رہی ہیں بات پر، کیونکہ مجھ سے ہمیشہ اردو میں بات کرتی تھیں جیسے ابھی کہتی ہیں۔ بالآخر پھوٹ ہی پڑیں۔

دیکھو گلزار یوں ہے کہ، آئی ایم ناٹ سپوزڈ ٹو ٹیل یو، لیکن دہلی میں کوئی صاحب ہیں جو کہتے ہیں کہ تم تقسیم میں کھوئے ہوئے ان کے بیٹے ہو !"

یہ ایک نئی کہانی تھی۔

قریب ایک ماہ بعد امول پالیکر بمبئی کے مشہور ادا کار کا فون آیا کہنے لگے۔
"مسیز ڈنڈوتے تم سے بات کرنا چاہتی ہے۔ دہلی میں۔"
"میز ڈنڈوتے کون" ؟ میں نے پوچھا۔
"ایکس لائیٹنس منسٹر آف جنتا گورنمنٹ، مسٹر مدھو ڈنڈوتے کی پتنی۔"
"وہ کیوں ؟"
"پتہ نہیں۔ لیکن وہ کس وقت تمہیں کہاں پر فون کر سکتی ہے ؟"
میرا کوئی سروکار نہیں تھا مسٹر یا مسیز مدھو ڈنڈوتے کے ساتھ۔ کبھی ملا بھی نہیں تھا۔ مجھے حیرت ہوئی۔ امول پالیکر کو میں نے دفتر اور گھر کے اوقات بتا دیے۔

افسانہ بل کھا رہا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا یہ بھی اسی سائی والے افسانے کی کڑی ہے، لیکن امول پالیکر کیونکہ اداکار ہے اور اچھی اداکاری کر گیا اور مجھے اس کی وجہ نہیں بتائی، لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ اس وقت بھی وجہ ضرور جانتا ہوگا۔

کچھ روز بعد پرملا ڈنڈوتے کا فون آیا۔ انہوں نے بتایا کہ دہلی سے ایک سردار ہربجن سنگھ جی بمبئی آکر مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔ کیوں کہ ان کا خیال ہے میں تقسیم میں کھویا ہوا ان کا بیٹا ہوں۔ وہ نومبر کا مہینہ تھا۔ اتنا یاد ہے۔ میں نے ان سے کہا میں جنوری میں دہلی آرہا ہوں۔ انٹرنیشنل فلم اتسو ہیں۔ دس جنوری میں دہلی میں ہوں گا، تبھی مل لوں گا۔ انہیں یہاں مت بھیجئے۔ میں نے ان سے یہ بھی پوچھا کہ سردار ہربجن سنگھ کون ہے ؟ انہوں نے بتایا جنتا راج کے دوران وہ پنجاب میں سول سپلائی منسٹر تھے۔

جنوری میں دہلی گیا۔ اشوک ہوٹل میں ٹھہرا تھا۔ ہربجن سنگھ صاحب کے یہاں سے فون آیا کہ وہ کب مل سکتے ہیں۔ تب تک مجھے یہ اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ کوئی بہت معتبر بزرگ انسان ہیں۔ بات کرنے والے ان کے بیٹے تھے۔ احتراماً میں نے عرض کیا۔

"آپ انہیں زحمت نہ دیں۔ کل دوپہر کے وقت آپ تشریف لائیں۔ میں آپ کے ساتھ چل کر ان کے دولت خانے پر مل لوں گا۔

حیرت ہوئی یہ جان کر کہ سائی بھی وہاں تھی، امول پالیکر بھی وہاں تھے اور میرے اگلے روز کی اس اپوئنٹمنٹ کے بارے میں وہ دونوں جانتے تھے۔

اگلے روز دوپہر کو جو صاحب مجھے لینے آئے وہ ان کے بڑے بیٹے تھے۔ ان کا نام اقبال سنگھ تھا۔

پنجابیوں کی عمر ہو جاتی ہے، لیکن بوڑھے نہیں ہوتے۔ اٹھ کر بڑے پیار سے ملے۔ میں نے بیٹوں کی طرح ہی "پیری پونا" کیا۔ انہوں نے ماں سے ملایا۔

"یہ تمہاری ماں ہے بیٹا۔"

ماں کو بھی "پیری پونا" کیا۔ بیٹے انہیں دار جی کہہ کے بلاتے تھے۔ دوسرے بیٹے، بہوئیں، بچے اچھا خاصہ ایک پریوار تھا۔ کافی کھلا بڑا گھر۔ یہ کھلا پن بھی پنجابیوں کے رہن سہن میں ہی نہیں، ان کے مزاج میں شامل ہے۔

تمام علیک سلیک کے بعد کچھ کھانے کو بھی آگیا، پینے کو بھی آگیا اور دار جی نے بتایا کہ مجھے کہاں کھویا تھا۔

"بڑے سخت دنگے ہوئے جی۔ ہر طرف آگ ہی آگ تھی اور آگ میں جھلسی ہوئی خبریں، پر ہم بھی ٹکے ہی رہے۔ زمین دار مسلمان تھا اور ہمارے پتاجی کا دوست تھا اور بڑا مہربان تھا ہم پر، اور سارا قصبہ جانتا تھا کہ اس کے ہوتے ہوئے کوئی بے وقت ہمارے دروازے پر دستک بھی نہیں دے سکتا تھا۔ اس کا بیٹا اسکول میں میرے ساتھ پڑھتا تھا (شاید ایاز نام لیا تھا) لیکن جب پیچھے سے آنے والے قافلے ہمارے قصبے سے گزرتے تھے تو دل دہل جاتا تھا۔ اندر ہی اندر کانپ جاتے تھے ہم۔ زمین دار روز صبح اور روز شام کو آکر مل کے جاتا تھا۔ حوصلہ دے کر جاتا تھا۔ میری پتنی کو بیٹی سا رکھا تھا

اس سے۔

ایک روز دو بائیاں دیتا، ایسا ایک قافلہ گزرا کہ ساری رات چھت کی منڈیر پر کھڑے گزری۔ ہمیں نہیں سارا قصبہ جاگ رہا تھا۔ لگتا تھا وہی اخری رات ہے، صبح پرلے (قیامت) آنے والی ہے۔ ہمارے پاؤں اکھڑ گئے۔ پتہ نہیں کیوں لگا کہ بس یہی آخری قافلہ ہے۔ اب نکل لو۔ اس کے بعد کچھ نہیں بچے گا۔ اپنے محسن، اپنے زمین دار سے دعا کر کے نکل آئے۔

وہ روز کہا کرتا تھا۔

"میری حویلی پر چلو میرے ساتھ رہو۔ کچھ دن کے لیے تالا مار دو گھر کو۔ کوئی نہیں چھوئے گا۔"

لیکن ہم جھوٹ موٹ کا حوصلہ دکھاتے رہے۔ اندر ہی اندر ڈرتے تھے۔ سچ بتاؤں سمپورن کاکا، ایمان ہل گئے تھے۔ جڑیں، کانپنے لگی تھیں۔ سارے قافلے اسی راستے سے گزر رہے تھے۔ سنا تھا میانوالی سے ہو کے جموں میں داخل ہو جاؤ تو آگے نیچے تک جانے کے لیے فوج کی کمک مل جائے گی۔

گھر ویسے کے ویسے ہی کھلے چھوڑ آئے۔ سچ تو یہ ہے کہ دل نے بانگ دے دی تھی۔ اب وطن کی مٹی چھوڑنے کا وقت آگیا۔ کوچ کر چلو۔ دو لڑکے بڑے، ایک چھوٹی لڑکی آٹھ نو برس کی اور سب سے چھوٹے تم اودون کا سفر تھا۔ میانوالی تک، پیدل۔ کھانے کو جس گاؤں سے گزرتے کچھ مل جاتا تھا۔ دنگے سب جگہ ہوئے تھے۔ ہو بھی رہے تھے لیکن دنگے والوں کے لشکر ہمیشہ باہر ہی سے آتے تھے۔ میانوالی تک پہنچتے پہنچتے قافلہ بہت بڑا ہو گیا۔ کئی طرف سے لوگ آآکر جڑتے جاتے تھے۔ بڑی ڈھارس ہوتی تھی بیٹا، اپنے جیسے دوسرے بدحال کو دیکھ کر۔ میانوالی ہم رات کو پہنچے۔ اسی بیچ کئی بار بچوں کے ہاتھ چھٹے ہم سے، بدحواس ہو کر پکارنے لگتے تھے۔ اور بھی تھے ہم جیسے، اور کہرام سا مچا رہتا تھا۔

"پتہ نہیں کیسے یہ خبر پھیل گئی کہ اس رات میانوالی پر حملہ ہونے والا ہے۔ مسلمانوں کا لشکر آرہا ہے۔ خوف اور ڈر کا ایسا سناٹا کبھی نہیں سنا۔ رات کی رات ہی سب چل پڑے۔"

دارجی کچھ دیر کو چپ ہو گئے۔ ان کی آنکھ نم ہو رہی تھی۔ لیکن ماں چپ چاپ ٹکٹکی باندھے مجھے دیکھ رہی تھی۔ کوئی اموشن نہیں تھا ان کے چہرے پر دارجی بڑے دھیرے سے بولے!

"بس اسی رات اس کوچ میں چھوٹے دونوں بچے ہم سے چھٹ گئے۔ پتہ نہیں کیسے؟ پتہ ہوتو "

وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر چپ ہو گئے۔

مجھے بہت تفصیل سے یاد نہیں۔ بیٹے، بہویں کچھ اٹھیں، کچھ جگہ بدل کے بیٹھ گئے۔ دارجی نے بتایا۔

"جموں پہنچ کر بہت عرصہ انتظار کیا! ایک ایک کیمپ جاکر ڈھونڈتے تھے اور آنے والے قافلوں کو دیکھتے تھے۔ بے شمار لوگ تھے۔ قافلوں کی شکل میں ہی کچھ پنجاب کی طرف چلے گئے، کچھ نیچے اگر گئے۔ جہاں جہاں جس کسی کے رشتے دار تھے۔ جب مایوس ہو گئے ہم تو پنجاب آ گئے۔ وہاں کے کیمپ دیکھتے رہے۔ بس ایک تلاش ہی رہ گئی۔ بچے گم ہو چکے تھے، امید چھٹ چکی تھی۔"

"کوئی بیس بائیس سال بعد ایک جتھا ہندوستان سے جا رہا تھا۔ گردوارہ پنجہ صاحب کی یاترا کرنے۔ بس جی کر آیا جانے کے لیے۔ اپنا گھر دیکھنے کا بھی کئی بار خیال آیا تھا لیکن یہ بھلی مانس ہمیشہ اس خیال سے ہی ٹوٹ کے نڈھال ہو جاتی تھی"۔ انہوں نے اپنی بیوی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"اور پھر یہ گلٹ بھی ہم سے چھٹا نہیں کہ ہم نے اپنے قصبے کے زمین دار کا اعتبار نہیں کیا، سوچ کر ایک شرمندگی کا احساس ہوتا تھا۔"

بہرحال، ہم نے جانے کا فیصلہ کر لیا اور جانے سے پہلے میں نے ایک خط لکھا۔ زمین دار کے نام اور ان کے بیٹے ایاز کے نام بھی۔ اپنے کیے کی معافی بھی مانگی۔ اپنے ہجرت کے حالات بھی بتائے، پریوار کے بھی اور دونوں گمشدہ بچوں کا ذکر بھی کیا۔ ستیہ اور سمپورن کا۔ خیال تھا شاید ایاز تو نہ پہچان سکے، لیکن زمین دار افضل، ہمیں نہیں بھول سکتا۔ خط میں نے پوسٹ نہیں کیا، سوچا وہیں جاکے کروں گا۔ جیس پچیس دن کا دورہ ہے اگر ملنا

ہاہے گا تو چاچا افضل ضرور جواب دے گا۔ بلوایا تو جائیں گے، ورنہ ۔ اب کیا فائدہ قبریں کھول کے ، کیا ملتا ہے ؟"

ایک لمبی سانس لے کر ہر بجن سنگھ جی بولے !

"وہ خط میری جیب ہی میں پڑا رہا پنی جی ۔ میں مانا ہی نہیں ۔ واپسی میں کراچی سے ہو کر آیا اور جس دن لوٹ رہا تھا، پتہ نہیں کیا سوجھی ، میں نے اک میں ڈال دیا۔"

"نہ چاہتے ہوئے بھی ایک انتظار رہا، لیکن کچھ ماہ گزر گئے تو وہ بھی ختم ہو گیا ۔ آٹھ سال کے بعد مجھے جواب آیا" ۔

"افضل چاچا کا ؟" میں نے چونک کر پوچھا ۔ وہ چپ رہے ۔ میں نے پھر پوچھا "ایاز کا ؟" سر کو ہلکی سی جنبش دے کر بولے "ہاں ! اسی خط کا واب تھا ۔ "خط سے پتہ چلا کہ تقسیم کے کچھ سال بعد ہی افضل چاچا کا انتقال ہو گیا تھا ۔ سارا زمین دارا ایاز ہی سنبھالا کرتا تھا ۔ چند روز پہلے ہی ایاز کا نتقال ہوا تھا ۔ اس کے کاغذ پتر دیکھے جا رہے تھے تو کسی ایک قمیض کی جیب سے وہ خط نکلا ۔ ماتم پرسی کے لیے آئے لوگوں میں کسی نے وہ خط پڑھ کر نایا، تو ایک شخص نے اطلاح دی کہ جس گمشدہ لڑکی کا ذکر ہے اس خط میں، وہ ایاز کے انتقال پر ماتم پرسی کرنے آئی ہوئی ہے ۔ میانوالی سے ۔ اسے لاکر پوچھا گیا تو اس نے بتایا کہ اس کا اصلی نام ستیہ ہے ۔ وہ تقسیم میں اپنے ماں باپ سے بچھڑ گئی تھی اور اب اس کا نام دلشاد ہے ۔"

ماں کی آنکھیں اب بھی خشک تھیں، لیکن وارجی کی آواز پھر سے رندھ گئی تھی ۔

"واہگورو کا نام لیا اور اسی روز روانہ ہو گئے ۔ دلشاد وہیں ملی، افضل چاچا کے گھر ۔ لوجی اسے سب یاد تھا ۔ پر اپنا گھر یاد بہیں ۔ ہم مے پوچھا وہ لوئی کیسے ، بچھڑی کیسے، ہم سے تو بولی "میں چل چل کے تھک گئی تھی ۔ مجھے بہت نیند آ رہی تھی ۔ میں ایک گھر کے آنگن میں تندور لگا تھا اس کے پیچھے جاکے سو گئی تھی ۔ جب اٹھی تو کوئی بھی نہیں تھا ۔ سارا دن ڈھونڈ کے پھر وہیں جاکے سو جاتی تھی ۔ تین دن بعد اس گھر والے آئے تو انہوں مے حکایا مجھے یاں بیوی تھے ۔ پھر وہیں رکھ لیا کہ شاید کوئی ڈھونڈتا ہوا آجائے ۔ پر کوئی آیا ہی بہیں ۔ انہیں کے گھر نوکرانی سی ہو گئی ۔ کھانا کپڑا ملتا رہا ۔ پر بہت اچھی طرح رکھا اس مے ۔ پھر بہت سال بعد، شاید آٹھ نو سال بعد مالک مے مجھ سے نکاح پڑھ کے اپنی بیگم بنا لیا ۔ اللہ کے فضل سے دو بیٹے ہیں ۔ ایک اکستان ایئر فورس میں ہے، دوسرا کراچی میں اچھے عہدے پر نوکری کر رہا ہے ۔"

رائیٹرز کو کچھ کلیشے قسم کے سوالوں کی عادت ہوتی ہے، جس کی ضرورت نہیں تھی ۔ میں مے پوچھا

"وہ حیران نہیں ہوئی آپ کو دیکھ کر ؟ یا مل کر ؟ روئی بہیں ؟"

"نہیں ۔ حیران تو ہوئی، لیکن ایسی کوئی خاص متاثر نہیں ہوئی ۔" وارجی نے کہا ۔

"اور سمپورن ؟ ۔ اس کے ساتھ نہیں تھا ؟"

"نہیں اسے تو یاد بھی نہیں تھا" ۔

ماں نے پھر وہی کہا جو ان باتوں کے درمیان دو تین بار کہہ چکی تھی ۔

"پنی (سمپورن) تو مان کیوں بہیں جاتا ۔ کیوں چھپاتا ہے ہم سے ! اپنا نام بھی چھپا رکھا ہے تو نے ۔ جیسے ستیہ دلشاد ہو گئی، تجھے بھی کسی نے لزار بنا دیا ہو گا" ۔ تھوڑے سے وقفے کے بعد پھر بولی ۔

"گلزار کس نے نام دیا تجھے ؟ نام تو تیرا سمپورن سنگھ ہے !"

میں نے وارجی سے پوچھا ۔

"میری خبر کیسے ملی آپ کو ۔ یا کیسے خیال آیا کہ میں آپ کا بیٹا ہوں ؟"

"ایسا ہے پتر واہگورو کی کرنی تیس پینتیس سال بعد دھی مل گئی، تو امید بندھ گئی شاید واہگورو بیٹے سے بھی ملا دے ۔ اقبال مے ایک دن تمہارا انٹرویو پڑھا کسی پرچے میں اور بتایا تمہارا اصلی نام سمپورن سنگھ ہے اور تمہاری پیدائش بھی اسی طرف کی ہے ۔ پاکستان کی ۔ تو اس مے تلاش

روح کردی۔ ہاں میں نے یہ نہیں بتایا تھیں کہ اس کا نام اقبال افضل چاچا کا دیا ہوا ہے۔"
ماں نے پوچھا "کاکا تو جہاں مرضی ہے رہ اتو مسلمان ہو گیا ہے تو کوئی بات نہیں۔ پر مان تو لے تو ہی میرا بیٹا ہے، پی۔"
میں اپنے خاندان کی ساری تفصیل دے کر ایک بار پھر سر محجن سنگھ جی کو نا امید کر کے لوٹ آیا۔
اس بات کو بھی سات آٹھ سال ہو گئے۔
اب سن 1993 ہے!
اتنے برسوں بعد اقبال کی چٹھی ملی اور بھوگ کا کارڈ ملا کہ سردار ہر بجن سنگھ جی پر لوک سدھار گئے۔ ماں نے کہلوایا ہے کہ چھوٹے کو ضرور جھر
۔ے۔
مجھے لگا جیسے سچ مچ میرے دارجی گر رگئے۔

صاحبِ فن

ف۔س۔اعجاز

نظم

سانس آرے کی طرح کاٹ رہی ہے مجھ کو
اک فلک بوس عمارت کے تلے
خوبصورت سا شجر بن کے کھڑا
قد میرا ایک بلندی پہ تھا
انگلیاں اپنی جگہ پر ساکت
اور ہتھیلی پہ جمی چھال فقیروں جیسی
جس پہ دس پانچ کے سکوں نے نوازش کر کے
گہری باریک لکیروں کو مٹا ڈالا ہو
کالے پیسوں کے بنائے ہوئے سادہ دھبےّ
ہوں ہتھیلی پہ نمودار کہ پیشانی پر
صاف پہچان لئے جاتے ہیں، پیشہ کیا ہے
گورکن جس طرح اپنے نئے گاہک کے لئے
بھول بسری ہوئی اک قبر کا سینہ چیرے
مجھ سے اچھا تو یہ تاجر ہے عمارت جس کی
اک امر بیل کی مانند بڑھے جاتی ہے
جانے کیا چیز ہے قد روز نکل آتا ہے
آسماں اس کی طرف آپ جھکا آتا ہے
جتنی رشوت ملے اتنا ہی وہ جھک جاتا ہے!
اور میں اپنی جگہ
دھوپ پیتا ہوا خاموش کھڑا رہتا ہوں
صاحب فن ہے یہ معمار کہ جس نے مجھ کو
صدر دروازے پہ رکھا ہے سجاوٹ کے لئے
وقت کا کونسا پیشہ ہے مجھے علم نہیں
سانس آرے کی طرح کاٹ رہی ہے مجھ کو
اتنا بوڑھا ہوں کہ اب کونسی منزل سے گزروں؟

ناگپوت



ساجدہ عندلیب رحمٰن

1/M/H/10 Ibrahim Road

Calcutta – 700023

پورٹ بلیئر جزائر انڈمان کا ایک خوبصورت جزیرہ ۔ آنکھیں کھلیں تو سر پر نیلا آسمان چاروں طرف ٹھاٹھیں مارتا گہرہ سمدر سبز وادیاں۔ جولائی کا مہینہ اور بارش کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ ۔ کچھ دیر کے لیے بارش تھمتی، سورج اپنا موہنہ نکالتا جیسے کوئی انسانی سروں کے اوپر آئینے جھانک آتا ہے اور سطح آب پر خوبصورت ہنس کی مانند تیرتے دیپ ان میں جگمگ، جگمگ کرتے دکھائی پڑتے مگر پھر نہ جانے کہاں سے بادل گھر آتے اندھیرا چھانے لگتا اور زائیں زائیں تیز ہوا کے ساتھ بوندا باندی شروع ہونے لگتی ان کی آواز سے آواز ملاتی کالا پل کے ساحلی چٹانوں میں سر پٹختی لہریں ایک عجیب سماں باندھنے لگتیں ۔ شاید ان لہروں کو دڑوا مچھوارے کی تلاش تھی جو اکثر مچھلی پکڑنے کی خاطر ان چٹانوں پر گھنٹوں بیٹھا رہتا تھا پر نہ جانے اب وہ کہاں پوشیدہ ہو گیا تھا۔ کوئی کہتا کہ وہ ان لہروں میں سما گیا ہے تو کوئی کہتا نہیں ۔ تیز ہوا کے جھونکے اسے کہیں دور اڑا لے گئے دور بہت دور جہاں زمین و آسمان ایک دوسرے سے گلے ملتے نظر آتے ۔

ایسی ہی ایک شام ۔ نیلوفر کو اپنی کہانی کے لیے پلاٹ کی جستجو تھی ۔ پاس ہی اس کی پڑوسن رادھا گووند مندر کے پجاری پنڈت آتمارام کی اردھانگنی گوری دیوی براجمان تھیں ۔ نیلوفر کی کشمکش بڑھتی ہی چلی جا رہی تھی وہ بار بار قلم کے پچھلے حصے کو اپنی پیشانی پر رگڑتی کہ شاید کوئی ۔ گوری دیوی خاموش سی نظروں کو نیلوفر پر جمائے کسی خیال میں گم تھیں ۔ نیلوفر کی نظریں بھی کچھ لمحوں کے لیے ان پر ٹھہر گئیں ۔ سفید بے داغ ساڑی، کھچڑی بالوں پر یہاں وہاں پھیلی سیندور کی لالی، ماتھے پر سرخ بڑی سی بندی اور گلے میں کنٹھ مالا ۔ اس نے ایک سرسری سی نگاہ کمرے میں ڈالی کمرے کا تو حال ہی خستہ تھا۔ ہر شئے بے ترتیبی سے یہاں وہاں پڑی تھی۔

"توبہ" ۔ نیلوفر کو الجھن سی ہونے لگی اس کی آنکھیں چھت پر ٹک گئیں ۔ اچانک ایک آواز نے نیلوفر کو باہر کی جانب دیکھنے پر مجبور کر دیا ۔

"سالا ۔ یہ بھی کوئی آنے کا وقت ہے ؟" بسنت لال اپنے جگری دوست ملہوترہ سے مخاطب تھا ۔

"موسم کا خیال کر لیا ہوتا ۔" ملہوترہ جیب سے رومال نکال کر چہرے پر رگڑنے لگا پھر آسمان کی طرف دیکھتا ہوا بولا "اف ۔ یہ بارش تو تھمنے کا نام ہی نہیں لیتی ۔"

"ہاں ہاں تجھے تو ماؤنٹ ہیریٹ سے گزر کر آنا ہوتا ہے ۔" بسنت لال کے جملے میں طنز و مزاح کے ملے جلے اثرات تھے ۔ "سب جانتا ہوں ۔"

"کیا ؟ کیا جانتے ہو ؟" وہ آنکھیں نکالتا ہوا بولا ۔

"خوب گلچھرے اڑا رہے ہو اپنی سکریٹری انما تھومس کے ساتھ" بسنت لال کے چہرے پر ہلکا تبسم رقص کرنے لگا "بوڑھا ہو گیا پر شرم نہیں ۔"

"بوڑھا ہو گا تیرا باپ ۔" ملہوترہ نے آہستہ سے کہا ۔

"دیکھو میاں ۔ حد سے گزر رہے ہو ؟" بسنت لال نے مذاقاً آنکھوں کو نچاتے ہوئے کہا "باپ دادا تک پہنچ گئے ہو ہاں ؟"

"تم کیا سمجھتے ہو مجھے بھلا وہ والی بات نہیں معلوم ؟" ملہوترہ معنی خیز نظروں سے اسے دیکھنے لگا ۔

"کیا ... کیا ... معلوم ہے ؟" بسنت لال کی آنکھوں میں لرزہ سا طاری ہو گیا ۔

"روز نوکر کے ہاتھوں اسے گلاب بھجواتے ہو ..... " ملہوترہ مسکرا رہا تھا ۔

"تو اس سے کیا ؟ وہ تو میری کرائے دار ہے ۔" بسنت لال اس موضوع کو ختم کر دینا چاہتا تھا ۔

"کرائے دار ہے ...... پر ... پر ..... وہ تو تجھے انکل کہتی ہے ..... ہا ۔ ہا ۔ ہا ..... اب بول بیٹے بوڑھا کون ہے ؟ تو یا میں ؟ ہا ۔ ہا ۔ ہا ۔"

"اپنے دانت اندر کر ..... جب تو ہنستا ہے نا ؟ تو نہایت بدصورت لگتا ہے ...... بالکل Ugly duck یعنی بدنما بطخ کی طرح ۔"

"ابے جا ۔"

"چل چل سالے ۔"

ممدو ماما کے چائے اسٹال میں کھڑے ان دونوں کی نوک جھونک سن کر نیلوفر ہنس پڑی ۔

"یا خدا ! نوجوانوں کی صف میں کھڑے رہنا ان دونوں کو پسند ہے جب کہ حقیقت تو یہ ہے کہ دونوں ہی ساٹھ کے اوپر ہونے کو آئے ۔"

وہ بخوبی واقف تھی کہ ان زندہ دل بزرگوں کو نہ ہی ممدو ماما کے ہاتھوں بنی چائے سے دلچسپی ہے اور نہ ہی اس کی عجیب و غریب من گھڑت کہانیوں سے۔ ان کی دلچسپی کا مرکز تو ممدو ماما کی بیوی "ڈنگابی" ہیں ..... ! "ڈنگابی" آج بھی اتنی ہی پرکشش لگتیں جتنی کہ پچیس سال قبل تھیں ! نیلوفر جب بہت چھوٹی تھی گڑیا جیسی ، تب بھی اکثر انھیں اسی جگہ موجود ہنسی مذاق میں محو دیکھا کرتی تھی ..... ویسے ان دنوں یہ تمام باتیں نیلوفر کے گمان کی سرحد سے باہر تھیں ..... مگر آج ؟ آج اسے یہ سب سمجھ لینے میں ذرا بھی دقت پیش نہیں آتی ۔

"آں ..... ہاں ۔ ہاں !" وہ گلے کو کھنکھارتی ہوئی اب بھی انھیں ہی دیکھ رہی تھی ۔ مگر بسنت لال اور ملہوترہ دونوں ہی اس کی تعاقب کرتی نظروں سے بے خبر چائے کے گرم گرم گلاس کو ہونٹوں سے لگائے کنکھیوں سے ڈنگابی کو ہی دیکھ رہے تھے ۔

"چلتی ہوں سوا !" گوری دیوی یک بیک اپنی جگہ پر مضبوطی سے کھڑی ہو گئیں ۔

"جی ؟" نیلوفر چونک اٹھی

"ہے رام !" کہتی ہوئی وہ ہاتھوں کو اٹھاتے اپنے سر کے آنچل کو درست کرنے لگیں ۔

"جہالت کی بھی حد ہوتی ہے !" نیلوفر زیر لب بولی ۔

"جہالت ؟" ان کے ہاتھ رک گئے اور وہ ذرا سا مونہہ بنائے نیلوفر کو دیکھنے لگیں ۔ پھر بولی "نیلو بیٹیا ! ہم اپنی اور سے تھوڑی کہتے ہیں ..... یہ تو شاستروں کی باتیں ہیں ۔"

"جی ..... جی ..... اف !" نیلوفر سہم گئی کیونکہ اسے گمان بھی نہ تھا کہ اس کی سرگوشی بھی وہ اتنی آسانی سے سن لیں گی ۔

"ماسی ! میرا مطلب ہے .... !" نیلوفر چاہ کر بھی مزید کچھ نہ بول پائی اور گوری دیوی کی بوڑھی نمناک آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کرنے لگی ۔

"آہ !" شاید ان کی ممتا ہی انھیں مجبور کر رہی تھی کہ وہ یہ مان لیں کہ ان کا بیٹا اب دوسرا جنم لے کر ان کے گھر کے احاطے کو آباد کر چکا ہے ۔

لگاتار بارش کی وجہ سے نمک بھٹا بستی کے راستے ویران ہو چلے تھے ، بسنت لال و ملہوترہ اپنے اپنے گھروں کو لوٹ چکے تھے ..... "ٹپ ٹپ ٹپ" پانی کی موٹی موٹی بوندیں ممدو ماما کے اسٹال کی چھت پر گر گر کر ایک عجیب آواز پیدا کر رہی تھیں ! "ڈنگابی" اپنے پیروں کو بوسیدہ کمبل کے اندر ڈھکنے کی کوشش کر رہی تھی اور ممدو ماما ہتھیلیوں کو آپس میں رگڑ رگڑ کر گرما رہے تھے ان کی آنکھیں ایک اور گاہک کی متلاشی تھیں ۔

"دنیا بنانے والے کیا تیرے من میں سمائی ۔ کاہے کو دنیا بنائی !" اسٹال سے متصل بجلی کے کھمبے کے نیچے شرابی نادر سر کو جھکائے فلمی نغمہ گنگنا

رہا تھا ۔ نیلوفر جب بھی تنہا ہوتی تو اس دبلے پتلے شخص کی شبیہہ کو بڑی دلچسپی سے دیکھنے لگتی ۔ اس کے چہرے اور سر کے بچے بال سے اسے بآسانی پہچانا جاسکتا تھا ۔ اچانک ہی گھن گرج کے ساتھ نیلوفر کو زلزلہ جیسی دھمک کا احساس ہوا

"ہائے اللہ ۔" یہ بارش تو آندھی کا روپ اختیار کرنے لگی ہے مگر وہ اور اب تلک اسی حالت میں وہیں بیٹھا رہا ۔

"شاستروں میں لکھا ہے ۔" نیلوفر دہرانے لگی ۔

"مگر ماسی ۔" وہ گوری دیوی کی طرف مڑی "شاستروں میں تو یہی آیا ہے کہ انسان اپنے کرموں کے آدھار پر دوسرا جنم لیتا ہے ۔"

"ہاں ۔" سر کو جنبش دیتی ہوئی وہ بولیں ۔

"وہ تو اس لیے کہا گیا کہ آدمی اچھے کرم کرے ۔" وہ اپنے دوپٹے کی سلوٹوں کو درست کرتی ہوئی بولی ۔

"اچھے کرم ۔" ایک جھٹکے کے ساتھ نیلوفر کی نگاہوں کے سامنے گوری دیوی کے مرحوم بیٹے "بھولا رام" عرف "بھکو" کی تصویریں ابھرنے لگیں ۔ خوبصورت مگر بگڑا ہوا نوجوان ۔ شراب اور جوا کا رسیا ۔ بستی کے لوگ پجاری جی و گوری دیوی کو جتنی عزت کی نگاہ سے دیکھتے اتنا ہی "بھکو" کو دیکھ کر ناک بھوں چڑھاتے ۔ بھلے ہی پجاری جی بھی اس سے بیزار تھے مگر گوری دیوی ؟ وہ تو ماں تھیں "بھکو" ان کا بیٹا تھا ان کی کوکھ سے جنما

"توبہ ۔" نیلوفر نے گھبرا کر دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھک لیا اسے وہ منظر یاد آنے لگا جس دن آنگن میں بھکو کی لاش ایک سفید چادر میں لپٹی پڑی تھی اس کے گرد ہالہ ڈالے بستی والے کھڑے تھے گوری دیوی زار و قطار رو رہیں تھیں پجاری جی صبر کئے چپ چاپ بیٹھے تھے ۔

"بہوا ۔ پنر جنم پر تمہارا وشواس نہیں کیونکہ تم ۔"

"نہیں ۔ یہ بات نہیں ہے ۔" نیلوفر گوری دیوی کی باتوں کو کاٹتے ہوئے بولی ۔

"مجھے یاد ہے کہ میری موجودگی میں بھکو کی لاش کو جنگلی گھاٹ شمشان میں چتا کے حوالے کر دیا گیا تھا صرف یہی نہیں بلکہ اس کی استھی کو حریرہ رودس کے اس پار سمندر کے سپرد بھی کر دیا گیا پھر بھلا میں میں ۔" الفاظ اس کے حلق میں اٹکنے لگے ۔

"بہوا ۔" وہ کسی خیال میں گم ہو گئیں پھر بولیں "ہر دھرم کے الگ الگ رسم و رواج ہیں ہم ہندو ہیں سو ہم نے اپنے دھرم کے انوسار اپنے "بھکو" کی بھبھوتی کو پوجا کی کنڈلی میں تین دن رکھ کر جاپ کروایا تھا بڑے مندر کے پجاری "پارس ناتھ" نے اپنے ہاتھوں یہ کام سر انجام دیا تھا، جانتی ہو کس لیے ؟ "نیلوفر سمجھ گئی تھی کہ ان کا اشارہ کس طرف ہے مگر پھر بھی وہ خاموش ہی رہی ۔

"وہ اس لیے کہ ہمیں اندازہ ہو سکے کہ دوسرے جنم میں، ہمارا بیٹا کس روپ میں مل سکے گا ۔"

"پھر ؟"

"پھر کیا ؟ اس بھبھوتی پر ناگ دیوتائے کے چنہہ ملے ہاں ہاں ناگ دیوتا کے نشانات ۔ ۔" ان کی آنکھیں نم ہونے لگیں اور گلا رندھنے لگا ۔

"حد ہو گئی ۔ آپ سبھوں نے وہ نشانات دیکھ کر یہ مان لیا کہ بھکو اب سانپ کے شریر میں پرویش کر چکا ہے ۔"

گوری دیوی چہرے کو آنچل میں چھپانے سسکنے لگیں ۔

"سونے پر سہاگہ حال ہی میں آپ کے پرانے نیم کے پیڑ کی جڑ میں جب ایک سانپ نے بل بنا لیا تو آپ لوگوں کا وہم بھکو کے روپ میں حقیقت بن کر سامنے آگیا آپ کے خیال میں وہ آپ کے احاطے کو آباد کر چکا ہے ۔"

نیلوفر گوری دیوی کے جذبات کی پرواہ کئے بغیر سبھی کچھ کہہ دینا چاہتی تھی "سانپ مت کہو وہ بھکو ہے ۔" وہ اب بھی سسک رہیں تھیں ۔

"ماسی ۔ یہ تو وہم پرستی ہے ۔"

"پر . . پر .. اس سے پہلے تو کبھی کسی ناگ دیوتا نے ہمارے آنگن میں اپنا بسیرا نہیں بنایا تھا !"

"یہ تو اتفاق ہے محض ایک اتفاق !"

زر - زر - زر . اچانک ایک موٹر فراٹے بھرتی انکٹ راؤ کے دروازے پر آکر ٹھہر گئی ۔ خوبصورت سی ایک دوشیزہ موٹر سے اتر کر گھر یں داخل ہوگئی !

"پشپا راؤ !" نیلوفر کی نگاہیں اس کی طرف اٹھیں "اف ! بستی کا جادو کبھی بھکو بھی اس پر دل وجان سے فدا تھا انکٹ راؤ اور سدھا راؤ ی اکلوتی اولاد !"

پشپا راؤ دبے پاؤں شلوار کے پائینچے کو اوپر کی طرف اٹھاتی سیڑھیاں طے کرنے لگی !

"ہوں ! شاید بوائے فرینڈ نمبر آٹھ سے مل کر آرہی ہے !" نیلوفر کے لہجے میں نفرت کی ہلکی سی بو تھی ! پھر کھٹ کھٹ کھٹ . آنند رام، ورما جی، حمید بھائی اور گوپی ناتھ جیسے منچلوں کے گھروں کی کھڑکیاں کھلنے لگیں !

گوری دیوی کو یقین تھا کہ نیلوفر اسے پھر کچھ کہے گی مگر وہ تو سر کو کرسی کی پشت پر ٹکائے پشپا کی بے حیائی اور سراپے کا جائیزہ لے رہی تھی !

"چلتی ہوں پنڈت جی کے لیے روٹی لگوانی ہے اور بھکو کے دودھ کا بھی انتظام کرنا ہے !" نیلوفر کے خیالوں کا تسلسل ٹوٹا گوری دیوی جواب کا انتظار کئے بنا ناک کو پونچھتی آہستہ آہستہ سیڑھیوں سے اترنے لگیں !

"ہنر جنم !" اس کے اندر ایک بے کیفی سی پھیلنے لگی وہ سڑک پر ادھر ادھر تاک رہی تھی اچانک اس نے دیکھا کہ بارش کے قطروں کو چیرتا ایک شخص چلا آرہا ہے جب وہ بالکل نزدیک آگیا تو نیلوفر کو اسے پہچاننے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی وہ پنڈت آتمارام ہی تھے ۔ آتمارام تھے تو پجاری مگر اکثر وہ بستی والوں کو دھرم اور مذہب سے اوپر اٹھ کر جینے کے لیے کہا کرتے تھے ! بارش کی تیزی بدستور بڑھ رہی تھی اور دھیرے دھیرے ماحول پر دوبارہ سناٹا سا چھانے لگا تھا ! اسی اثناء میں ایک سرد ہوا کا جھونکا نیلوفر کے نازک جسم سے ٹکرایا اور اس کی آنکھیں خود بخود بند ہونے لگیں شاید اس پر نیند کا غلبہ طاری ہورہا تھا !

"پانی لاؤ !"

"ان کے موہنہ پر چھینٹے مارو !"

"نہیں نہیں انھیں ہسپتال لئے چلو !"

قریب سے اٹھتی شور و غل کی آواز سن کر نیلوفر کی آنکھیں کھل گئیں اور دھک دھک دل زور سے دھڑکنے لگا ! وہ یہاں وہاں نظریں دوڑانے لگی ۔ اسے سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہ آوازیں آتمارام جی کے آنگن سے اٹھ کر آندھی کی طرح پوری بستی کو اپنی لپیٹ میں لینے کی کوشش کر رہیں ہیں وہ برآمدے کی طرف آئی اس نے دیکھا کہ گوری دیوی کے صحن میں لوگوں کا جم غفیر اکٹھا تھا گوری دیوی بے حس و حرکت زمین پر پڑی تھیں ان کے موہنہ سے جھاگ نکل رہی تھی ان سے کچھ ہی دور پر زینت خانم اداسی کی تصویر بنی بیٹھی تھیں وہاں پشپا بھی پہنچ چکی تھی ۔ اس نے قیمتی سبز نائیٹی پہن رکھی تھی جس سے اس کے جسم کے پیچ و خم جھلکتے دکھائی پڑتے تھے ۔ اس کے کالے معطر بال اس کے گورے شانوں پر لہرا رہے تھے !

"یار ! ادھر دیکھو ! کیا مال ہے !"

"ہاں ! سالی آج زیادہ ہی سندر لگ رہی ہے !"

"ہاں دیکھو دیکھو ! حسن خود بیتاب ہے جلوہ دکھانے کے لیے !"

"یہ کوئی موقعہ ہے ---- کہنے کا ۔ کل اس سلسلے میں باتیں کریں گے ۔"

بسنت لال اور ملہوترہ آپس میں کھسر پھسر کر رہے تھے ۔

"میں نے کئی بار منع کیا کہ موذی جانوروں سے دوستی مت کریئے جی مگر ۔" سائرہ خانم نے موہنہ بسورتے ہوئے کہا ۔

"اب تو اگلے جنم میں انھیں بھی سانپ کا روپ دھارنا ہوگا ۔" سدھا راؤ نے آنکھوں کو ملتے ہوئے کہا ۔

"وہ کیوں ممی ۔" پشپا ان کے قریب کھسک آئی ۔

"کیوں کیا ؟" سدھا راؤ نے تیور چڑھاتے ہوئے کہا "ہوتا ہے ایسا جو آدمی سانپ کے کاٹنے سے مرتا ہے تو اس کے شریر میں سانپ کی آتما گھس آتی ہے اور وہ سانپ بن کر دھرتی پر آجاتا ہے ۔"

" Shit ۔" پشپا نے شانوں پر پڑے بال جھٹکا کر پیچھے کی جانب کر لئے اور کہا "یہ سب بیکار کی باتیں ہیں ۔"

"یہ تو مر گئیں پر پنڈت جی کے دل سے کوئی پوچھے کہ بیچارے پر کیا گزرتی ہوگی ۔" زیست بیگم نہایت ہی نرمی سے بولیں ۔

"جیون ساتھی کے بنا زندگی ۔" انکت راؤ نے کہا ۔

"ارے خدا کی مرضی میں کس کو دخل ہے ۔"

"واقعی ایسی موت بڑی دردناک ہوتی ہے ۔"

"پہلے تو بیٹا گیا اب پتنی بھی ہے بھگواں ۔

غرضیکہ جتنے موہنہ اتنی ہی باتیں پر ان سبھوں سے الگ تھلگ بہاری جی رنج و الم کی تصویر بنے گوری دیوی کے مردہ جسم کو دیکھ رہے تھے ان کی بوڑھی پیشانی پر ننھی ننھی بوندیں ابھر رہیں تھیں اور ہاتھ بری طرح کانپ رہے تھے ۔ یکایک وہ اپنی جگہ سے اٹھے اور لوگوں کے درمیاں آکر کھڑے ہوگئے ۔

"میں پوچھتا ہوں کیا دیوتا کسی کو نقصان پہنچاتے ہیں ؟ وہ چیخ کر مجمع سے مخاطب ہوئے ۔ ہر طرف خاموشی چھا گئی ۔ لوگ ایک دوسرے کا موہنہ تکنے لگے ۔

"جواب دو ۔" خاموشی اب بھی قائم تھی "دوستوں ۔ یہ ۔ جس نے میری پتنی کو ڈسا یہ کوئی دیوتا نہیں تھا ۔" وہ ہاتھ کے گچھے کو مضبوطی سے سر کے گرد باندھنے لگے ان کا سانس پھول رہا تھا پھر ایک تلخ مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر پھیلنے لگی ۔ "یہ کوئی سانپ بھی نہیں تھا ۔ یہ میرا بیٹا بھکو ہی تھا پھر وہ گوری دیوی کے نیلے جسم کا بغور جائزہ لینے لگے بھکو کو تو ڈسنے کی عادت تھی ہی وہ جب بھکو کے سریر کے ساتھ ہمارے یہاں رہ رہا تھا تب بھی اس نے ہمیں ڈس لیا تھا ۔ اور آج اپنے دوسرے جنم میں بھی کرموں سے باز نہیں آیا اس نے اسے تو ڈس لیا اب میری باری ہے ۔ ہا ۔ ہا ۔ ہا وہ مجھے بھی نہیں چھوڑے گا ۔ مجھے مجھے اور زور زور سے وہ اپنا سینہ ٹھونکنے لگے ۔

نیلوفر فوراً پلٹی اور دوڑتی ہوئی اس میز کے قریب آگئی جس پر کئی سفید کورے کاغذات بھی بکھرے پڑے تھے اس کا ہاتھ تیزی سے ان پنوں پر چلنے لگا "ناگپوت ۔" اسے اس کی کہانی کا پلاٹ تو مل گیا مگر ایک دل شگاف ہنسی اس کے کان کے پردوں کو اب بھی تاراج کر رہی تھی انسانوں کی ہنسی ! دھیرے دھیرے یہ ہنسی فضاؤں میں تحلیل ہوتی گئی ۔ باہر مکمل سکوت چھا چکا تھا ۔

غزلیں

نا امیدی میں امیدوں کا سفر جاری ہے
پھول کی چاہ میں کانٹوں کا سفر جاری ہے

اب بھی کچھ خواب بھٹکتے ہیں کھلی سڑکوں پر
اب بھی ٹوٹے ہوئے رشتوں کا سفر جاری ہے

اب بھی اک ہاتھ ہواؤں میں ہلا کرتا ہے
اب بھی بے شکل صداؤں کا سفر جاری ہے

اب بھی اڑتا ہے خیالوں میں دھواں ماضی کا
اب بھی بے نام عذابوں کا سفر جاری ہے

اب بھی دیوار کے اس پار سے آتی ہے صدا
اب بھی ویرانے میں روحوں کا سفر جاری ہے

اب بھی اک ٹوٹے ہوئے خواب سے رشتہ ہے مرا
اب بھی بھیگی ہوئی راتوں کا سفر جاری ہے

گیت گاتی ہے مرے گاؤں میں ساون کی پھوار
نیم کے پیڑ پہ جھولوں کا سفر جاری ہے

شکیل اعظمی
5/1808, Hind Stores
Saiyedpura, Main Road,
Surat- 395 003

اسباب رہائی کے نہ تدبیر میں ہوں گے
حلقے ہی شکستہ کسی زنجیر میں ہوں گے

الجھے ہوئے افکار جو تحریر میں ہوں گے
مفہوم نہ واضح کسی تفسیر میں ہوں گے

ہلکی سی ہواؤں سے عمارت تو نہ گرتی
پہلو کئی تخریب کے تعمیر میں ہوں گے

بے شور و شغب صاف گزر جائیں سکوں سے
وہ لمحے کہاں وقت کی تقدیر میں ہوں گے

عبرت کے لئے دیکھئے تاریخ کے اوراق
کچھ نام تو مٹتی ہوئی تحریر میں ہوں گے

ہے اپنا مقدر یہی خوابوں کا تسلسل
کچھ خواب نئے، خواب کی تعبیر میں ہوں گے

غنی اعجاز
مومن پورہ
اکولہ-۴۴۴۰۰۱

ہم بھلے ہی گلہ نہیں کرتے
کیا مگر دل دکھا نہیں کرتے

آیئے باز روٹھ جانے سے
دیکھئے ضد کیا نہیں کرتے

چوٹ جب تک کہ دل نہیں کھاتا
شعر دل کو چھوا نہیں کرتے

ہائے انساں کو ڈھونڈھنے والو
معجزے اب ہوا نہیں کرتے

آرزوئیں اڑان بھرتی ہیں
یہ پرندے تھکا نہیں کرتے

وہ کہیں گے نقیبؔ سنئے گا
جو کسی کی سنا نہیں کرتے

فصیح اللہ نقیبؔ
Lecturer K.M. Asghar Hussain
Jr. College,
Akola-444 001

روپ دھاری

محمد طارق

چاندور بازار

ضلع امراؤتی ۴۴۴۷۰۴ (مہاراشٹر)

گھسیارن ے ادھر ادھر دیکھا اور فوراً جوار کے گھنے کھیت میں گھس گئی کھیت میں جہاں جہاں گھاس اگی نظر آئی وہ اسے پھرتی سے اس کاٹ کر اکٹھا کرے لگی گھاس کاٹنے کا انداز ایسا تھا جیسے کسی مفلس کے ہاتھ خزانہ آگیا ہو اور وہ اسے لے کر فوراً فرار ہو جانا چاہتا ہو۔

گھسیارن کا کھرپا زمین سے لگی ہوئی گھاس پر ایسا تیزی سے چل رہا تھا جیسے ماہر حجام کا استرا مونڈن کرتے وقت سر کے بالوں پر تب تیزی سے چلتا ے حب زیادہ گاہک اپنا مونڈن کروانے کے لیے تیار بیٹھے ہوں۔

اس ے کم وقت میں بہت ساری گھاس کاٹ کر اکٹھا کر لی تھی۔ ابھی وہ گٹھا باندھنا ہی چاہ رہی تھی کہ ایک کرخت آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ اے! گھاس چور!

گھسیارن بری طرح ہڑبڑا گئی۔ پلٹ کر دیکھا تو اس کی گھگی بندھ گئی۔ اس کے پیچھے چند قدم کے فاصلے پر کھیت کا مالک کمر پر ہاتھ رکھے کھڑا تھا۔ استری کئے ہوئے بے شکن، سفید بے داغ، گھٹنوں تک لانبے قمیص اور پاجامے میں ملبوس، سر پر ٹوپی اور چہرے پر مشت بھر داڑھی فراخ پیشانی پر سجدوں کی کثرت سے پڑا ہوا مٹیالا نشان۔ جو اس کے چہرے پر سب سے زیادہ نمایاں تھا۔ ان جھریوں سے زیادہ نمایاں جو اس کی آنکھوں کے ساڑوں پر پڑی ہوئی تھیں۔ ان گڑھوں سے زیادہ نمایاں جنھوں ے اس کے رخساروں کو اپنا مسکن بنالیا تھا داڑھی اور ٹوپی سے جھلکتے ہوئے ان بالوں سے زیادہ نمایاں جن میں سفید جالا تنا ہوا تھا۔ کیوں کہ اس کے بالوں کی سفیدی چہرے کی جھریاں، پچکے ہوئے رخسار اس کی گزرتی ہوئی عمر کے مظہر تھے اور پیشانی کا گٹا اس کی جاری عبادت کا اعلان اس کے پنج وقتہ نمازی ہونے کا ثبوت۔

گھسیارن کی نگاہیں اس کے بے داغ سفید لباس پر نہیں ٹھہری تھیں۔ اس کی داڑھی اور سر کے سفید بالوں میں نہیں اٹکی تھیں چہرے کے جھریوں اور رخساروں کے گڑھوں میں نہیں اتری تھیں بلکہ گھسیارن کی نگاہیں کھیت کے مالک کے ماتھے کے اس گٹے پر جمی تھیں جو اس کے لاتعداد سجدوں کا ثبوت تھا۔

گھسیارن کے دل میں اس گٹے کو دیکھ کر امید کا ننھا سا دیا روشن ہو گیا تھا۔ گھاس چھین کر بھگا دینے کا خوف اس کے ذہن سے نکل گیا تھا اور اب وہ کھیت کے مالک کو اعتقاد آمیز نگاہوں سے تک رہی تھی۔

کھیت کا مالک تقی اللہ، گاؤں کا معزز آدمی، پچپن سال کا بوڑھا۔ اس کی نگاہیں گھسیارن کے بدن پر مرتکز تھیں۔

گھسیارن چالیس کے پیٹے میں، سانولی رنگت والی، بھاری بھرکم، محنتی جسم والی عورت تھی۔ روز گھاس لاکر بیچنا اس کا پیشہ تھا۔ گھاس خریدنے والے ہر قسم کے گاہکوں سے اس کا سابقہ پڑ چکا تھا۔ وہ تقی اللہ کی گھورتی ہوئی نگاہوں کو کیسے نہیں پہچانتی!

تقی اللہ گھسیارن کے دنبے کی طرح گوشت چڑھے ہوئے بھاری بھرکم کولھوں کا، مختصر سے میلے کچیلے بلاؤز میں ٹھونسے ہوئے بڑے بڑے پستانوں کا نظارہ کر رہا تھا۔ ایسا نظارہ جس میں ڈر اور خوف بھی شامل تھا۔

گھسیارن کی نگاہیں اب اس کے ماتھے کے گٹے پر نہیں تھیں بلکہ تقی اللہ کی آنکھوں کا معاینہ کر رہی تھی ۔

اب گھسیارن کی نگاہوں میں اعتماد و اعتقاد آمیز آس نہیں تھی ۔ بلکہ ایک عجیب طرح کی چمک پیدا ہو گئی تھی ۔ ایسی چمک جو پیشہ ور عورتوں کی آنکھوں میں گاہک کو دیکھ کر پیدا ہو جاتی ہے ۔

تقی اللہ کو ایسی عورتوں سے کبھی سابقہ نہیں پڑا تھا اس لیے وہ گھسیارن کی نگاہوں کی چمک کو نہیں سمجھ پا رہا تھا ۔ اندر ہی اندر ڈر رہا تھا گھبرا رہا تھا

اگر اس نے گالی گلوچ شروع کر دی   مجھ پر کھرپا لے کر ٹوٹ پڑی   یا پھر گاؤں جا کر میری عزت خاک میں ملانے کی کوشش کرنے لگی تو

پھر   تو پھر

تقی اللہ کے اندر کا شیطان اسے اکسانے لگا " کچھ نہیں ہوگا ، وہ گھاس بیچنے والی معمولی عورت ہے اور تم غیر معمولی شخصیت کے حامل ہو ۔ مارن متقی ، حاجی ، معزز شخص ، سماج میں تمہاری ایک حیثیت ہے ۔ امیج ہے ۔ تمہارے سامنے سماج میں اس کی کیا حیثیت ، کیا وقعت ا کون یقین کرے گا اس کی بات کا ۔ ڈرو مت آگے بڑھو ، ہمت سے کام لو ۔ جوار کا کھیت گھنا ہے ، باہر سے کچھ دکھائی نہیں دے گا ۔ اور دیکھنے والا ہے بھی کون ۔ جلدی کرو اس سے قبل کہ کوئی آجائے ۔ جلدی کرو   ایسے سنہری موقعے بار بار نہیں آتے ! "

" لے جائے دو ما گھاس ! " گھسیارن نے فحش انداز میں ایک آنکھ دبا کر کہا ۔

تقی اللہ اب اس کے انداز تکلم کا مطلب سمجھ گیا تھا ۔ اسے اس ایک لمحہ میں ایسا بھی لگا تھا جیسے اس معمولی عورت نے اس کی غیر معمولی شخصیت کے خول کے اندر جھانک کر دیکھ لیا ہے ۔ کیسے دیکھ لیا اس معمولی عورت نے میرے اندر جھانک کر ! تقی اللہ لمحہ بھر کے لیے حیرت زدہ ہو گیا تھا

پھر تقی اللہ کے اندر کا شیطان اس کے وجود کو تیس سال پیچھے کھینچ لایا تھا ! اب وہ خود کو پچیس سال کا جوان محسوس کر رہا تھا   اس کی رگوں میں بہتے ہوئے لہو کے اندر وہی سنسناہٹ پیدا ہو گئی تھی جو آج سے تیس سال قبل حجلۂ عروسی میں پہلی بار اپنی حسین و جمیل شریک حیات کے بدن کو دیکھ کر پیدا ہوئی تھی ۔ نہیں ، اس سے بھی زیادہ ۔ شدید پر کیف سنسناہٹ !

اب تقی اللہ کے دل میں کسی بات کا خوف نہیں تھا ۔ خدا کا بھی نہیں ۔ اسے اپنی مرحومہ بیوی بھی یاد نہیں آئی تھی جو اسے بے حد چاہتی تھی اتنا زیادہ کہ جب اس کی بیوی کو جگر کا سرطان ہوا تھا اور تقی اللہ بڑے پیمانے پر اس کا علاج کروانا چاہتا تھا تو بیوی نے یہ کہہ کر انکار کر دیا تھا کہ میرے علاج پر پیسے صرف کرنا فضول ہے جی !! اب میں زندہ نہیں رہنے والی ، میری ایک خواہش ہے ، میری موت کے بعد تم حج ضرور کر آنا میں تمہیں اپنا مہر بھی معاف کر دیتی ہوں

ایسی نیک بیوی کی یاد بھی تقی اللہ کے دل میں پھانس بن کر نہیں اٹکی تھی ۔

گھسیارن کا دھوپ میں چمکتا ہوا سانولا بدن اس کے حواس پر چھا گیا تھا جس کی تپش سے تقی اللہ کا تقویٰ اس طرح پگھل گیا جیسے آگ کے سامنے موم !

وہ تھوک نگل کر اوباش طبع انسان کی طرح بے محابا گھسیارن کی طرف بڑھا   گھسیارن نے کوئی مزاحمت نہیں کی ، نہ غصہ دکھایا ، نہ شرمائی نہ لجائی ، اس کی آنکھوں میں شہوت کا نشہ بھی نہیں تھا ۔ محرومی و بے بسی کا احساس بھی نہیں تھا ۔ نفرت بھی نہیں تھی ، محبت بھی نہیں ۔ ہر طرح کے جذبات سے اس کا چہرہ عاری تھا ۔ اس کا چہرہ اس کی آنکھیں ، اس کا سارا وجود ، وہ ایسی عورت تھی جس نے جینے کے لیے اپنے اندر کی عورت کو مار ڈالا تھا

تقی اللہ نے اس عورت سے اپنی دو آتشہ خواہش کو سرد کیا ۔ وہ گھاس لے کر کھیت سے بالکل نارمل حالت میں چلی گئی ۔ جیسے تقی اللہ نے اس کے ساتھ کوئی گناہ نہیں کیا ۔

اور تقی اللہ !

وہ کچھ لمحے بعد احساس گناہ کے کرب میں مبتلا ہو گیا۔ ایسا کرب جس سے اس کی روح کے تار جھنجھنا اٹھے تھے۔ اب اس کے اندر کا شیطان جانے کہاں رفوچکر ہو گیا تھا۔ اس شیطان کی جگہ اب اس کے اندر ایک انسان آکھڑا ہوا تھا جو اسے لعنت ملامت کر رہا تھا۔ ذلیل کر رہا تھا۔ اس کے وجود کو چھید رہا تھا

تقی اللہ جہالت اور مرجانے کی حد تک ذلت کے اذیت ناک احساس میں ڈوبا گڑگڑا رہا تھا۔ "خدایا ! یہ کیسا گناہ ہو گیا مجھ سے، کتنا بڑا پاپ کر لیا میں نے !"

یا خدا ! مجھے بخش دے، میرے گناہ کو معاف کر دے تو رحیم ہے، تو کریم ہے !!"

پھر تقی اللہ خود کو تسلی دینے لگا" مجھے خدا کی رحمت سے مایوس نہیں ہونا چاہیے، میں سجدے میں خدا سے اس گناہ کی رو رو کر معافی مانگوں گا، وہ بخشنے والا مہربان ہے، وہ غفور الرحیم ہے، مجھے ضرور معاف کر دے گا' ۔

تقی اللہ خود کو تسلی دیتے ہوئے مضمحل قدموں سے کھیت سے نکلا اور گاؤں کی طرف چل پڑا

جب وہ گاؤں میں پہنچا تو اس کی ملاقات دو پہلوان قسم کے لوگوں سے ہوئی۔ وہ دونوں گاؤں کے ایسے سماج سیوک تھے کہ گاؤں کے ہر اچھے برے کام میں اپنا دخل رکھنا ضروری سمجھا کرتے تھے، جو کام باتوں سے نہیں ہوتا اس کام کو وہ اپنی لاٹھیوں سے انجام دے دیا کرتے تھے۔

وہ تقی اللہ کو دیکھتے ہی اس کی طرف بڑے مضطربانہ انداز میں بڑھے۔ "حاجی صاحب ! آپ کو کچھ خبر ہے، گاؤں میں اب کھلے عام زنا ہو رہا ہے زنا۔ !"

"زنا۔ ! چچ چچ !" تقی اللہ نے آنکھیں نیچی کر کے کراہیت آمیز انداز میں سر ہلایا اور بولا۔ "زنا خدا کے نزدیک عظیم ترین گناہوں میں سے ایک قابل تعزیز گناہ ہے۔ اور زناکار مرد اور زناکار عورت پر رحم کھانا بھی گناہ۔ خدا کی ذات زانیوں کے لیے قہار ہے، جبار ہے سمجھے۔ !

پھر کچھ توقف کے بعد تقی اللہ نے پوچھا" کون ہے وہ زانی !" وہ ایک گھسیارن ہے، جانے کہاں سے آئی ہے، گاؤں کے کنارے جھونپڑا بنا کر رہتی ہے، رات بھر جسم فروشی کرتی ہے، موقعہ ملے تو دن میں بھی، گاؤں کے جوانوں کو کھلے عام خراب کر رہی ہے سالی !"

"چچ چچ۔ ! بڑی شرم اور افسوس کی بات ہے، گاؤں پر خدا کا قہر نازل ہو جائے گا۔ پاک کر دو ایسی عورت کو گاؤں سے، حدیث میں آیا ہے اگر کوئی برائی دیکھو، تم میں طاقت ہو تو ہاتھ سے روکو، یہ اول درجے کا ایمان ہے، اگر ہاتھ سے نہیں روک سکتے تو زبان سے روکو، یہ دوسرے درجے کا ایمان ہے، اگر ہاتھ سے بھی نہیں روک سکتے تو دل سے برا جانو۔ ! یہ تیسرے درجے کا ایمان ہے !

ٹھیک ہے حاجی صاحب ! اب ہم سمجھ گئے، ہم تو اول درجے کے ایمان والوں میں سے ہیں !" وہ دونوں پہلوان تقی اللہ کو سلام کر کے رخصت ہو گئے۔

تقی اللہ سیدھا گھر آیا۔ اول فرصت میں "غسل جنابت" کیا۔ پھر دو رکعت "صلوٰۃ التوبہ" پڑھی اور سجدے میں خدا سے رو رو کر اس گناہ کی معافی مانگی جو گھسیارن کے ساتھ کھیت میں سرزد ہو گیا تھا۔

دوسرے دن علی الصبح لوگوں نے گاؤں کے کنارے جھونپڑے کے سامنے گھسیارن کی لاش دیکھی جسے بڑی بے رحمی سے قتل کر دیا گیا تھا۔

لاش کے سرہانے گھسیارن کی بیٹی جو عنقریب جوانی کی دہلیز پر قدم رکھنے والی تھی چیخ چیخ کر رو رہی تھی

مجمع کے اکثر لوگ لڑکی کے بدن کو تک رہے تھے

غزلیں

اقبال سحرؔ انبالوی

مدیر ماہنامہ رشحات، لاہور

جس شخص سے لوگوں کو محبت نہیں ملتی
اس شخص سے اپنی بھی طبیعت نہیں ملتی

ہے جلبِ زر و مال میں معروف مسلمان
اتنا کہ نمازوں کی بھی فرصت نہیں ملتی

انسان معزز ہوا کردار کے باعث
عزت کبھی دولت کی بدولت نہیں ملتی

مزدور کو کس طرح ملے خون کی قیمت
اس کو تو پسینے کی بھی اجرت نہیں ملتی

ہر شہر میں کیوں لوگ لہو بیچ رہے ہیں
ماضی میں کوئی ایسی تجارت نہیں ملتی

جس جرم میں حاکم بھی ہو بستی کا ملوث
اس جرم کی بستی میں شہادت نہیں ملتی

ہر شعر کو سینچا ہے سحرؔ خونِ جگر سے
دنیائے سخن میں یونہی شہرت نہیں ملتی

ڈاکٹر شباب للت (شملہ)

لٹو دیا میں نے جس کی خاطر وہ شخص مجھکو رلا کے خوش تھا
جو میرے حصے کی روشنی تھی اسے وہ ظالم بجھا کے خوش تھا

پلک جھپکنے کی دیر ہی میں نصیب نے ڈور کاٹ ڈالی
پتنگ رنگیں خواہشوں کی میں آسمان میں بڑھا کے خوش تھا

تیری غلط فہمیوں سے ہم نے تمام پردے اٹھا دیے ہیں
ہزار حیلوں سے چاہے اپنی تو اپنی دھاندلی کو چھپا کے خوش تھا

گزشتہ شب کی رفاقتوں کی نہ پوچھئے واردات رنگیں
وہ شعلہ رخ شمع انجمن تھا، میں اپنا دامن جلا کے خوش تھا

ترے جرائم کی داستانیں اسی نے دوشِ ہوا پہ لکھ دیں
سمجھ کے ہمراز جس کو اپنے تو کارنامے سنا کے خوش تھا

اسی کی انصاف دشمنی کی شکایتیں ہر زبان پر تھیں
نگر نگر کا ہر ایک باسی اسی کے ہی ناز اٹھا کے خوش تھا

فصیلِ شہر جفا پہ یہ کٹے ہوئے جن کے سر ٹنگے ہیں
یہی وہ ٹولہ ہے بیکسوں کے لہو میں کل جو نہا کے خوش تھا

شبابؔ وہ شخص آج مجھ سے وفا کی خیرات مانگتا ہے
کبھی جو مجھ کو ستا کے خوش تھا، کبھی جو مجھ کو رلا کے خوش تھا

منصور احمد عثمانی منظرؔ

227، سی منٹو روڈ کامپلکس
نئی دہلی-002 110

عجیب شہر کا منظر دکھائی دیتا ہے
ہر ایک ہاتھ میں پتھر دکھائی دیتا ہے

وہ جس پہ لوٹ کے جانے کا اب سوال نہیں
وہ راستہ مجھے اکثر دکھائی دیتا ہے

یہ فیصلہ بھی تو ممکن نہیں کدھر جاؤں
ہر ایک سمت ترا گھر دکھائی دیتا ہے

ترے خیال کی جھیلوں سے جب بھی نکلا ہوں
اداسیوں کا سمندر دکھائی دیتا ہے

ملا جواب نظر سے سلام کے بدلے
یہ آج کل سے تو بہتر دکھائی دیتا ہے

جو مجھ سے میری نگاہوں سے دور ہے لیکن
حصارِ دل میں وہ اکثر دکھائی دیتا ہے

گہن میں دیکھ کے اک آفتاب کا منظر
ہر اک کو میرا مقدر دکھائی دیتا ہے

ظفر اقبال ظفر
۰، خیلدار ۔ فتح پور (یوپی)

غزل

بھور کے پیچ و خم پہچانتا ہوں
یں صدیوں سے سمندر آشنا ہوں

شناور ہی کوئی مجھ کو پڑھے گا
یں سطحِ آب پر لکھا ہوا ہوں

اندھیرے میں بھی میں روشن رہوں گا
یں زخموں پر ستارے ٹانکتا ہوں

مری ہر سانس خوشبو کا سفر ہے
کائے کس سے مل کر آرہا ہوں

اندھیرا ہی اندھیرا ہے فضا میں
زمیں کی تہہ میں سورج ڈھونڈتا ہوں

تری آنکھیں، ترے ہونٹوں کی باتیں
ٹوں سے استفادہ کر رہا ہوں

کھلی ہے تیسری اک آنکھ میری
پس منظر میں خود کو دیکھتا ہوں

خلک پھیلی ہوئی ہے میرے اندر
ستاروں کی زمیں کا راستہ ہوں

اندھیرے ہیں **ظفر** قسمت میں لیکن
س کو چاند تارے بانٹتا ہوں

حنیف نجمی
ماؤن مودہا ۔ پوسٹ راگول ضلع ہمیرپور (یو۔پی)



غزل

مجھ کو ہی نہیں تم کو بھی دھوکا ہے مری جاں
اس دور میں کس نے کسے چاہا ہے مری جاں

کہتے نہیں کیوں جسم کی آواز پہ لبیک
یہ بھی تو محبت کا تقاضا ہے مری جاں

میں چپ ہوں تو اب سانس کیوں رکتی ہے تمہاری
میں نے یہ ہنر تم سے ہی سیکھا ہے مری جاں

ہے تم کو اگر زعم بہت اپنی انا کا
دل میں نے بھی گروی نہیں رکھا ہے مری جاں

ہے تجھ سے گلہ اور نہ ترے گھر سے شکایت
قاتل تو مرا اپنا قبیلہ ہے مری جاں

اب حسن ہی تنہا یہاں ہر جائی نہیں ہے
اب عشق بھی بگڑا ہوا بچہ ہے مری جاں

اس ڈر سے کہیں تجھ پہ کچھ الزام نہ آجائے
بند آنکھوں سے میں نے تجھے دیکھا ہے مری جاں

اک تنکا بھی تجھ سے جو اٹھائے نہیں اٹھتا
ہاتھوں میں ترے بوجھ دعا کا ہے مری جاں

نجمی یہاں سکہ بھی اندھیروں کا رواں ہے
سورج بھی یہاں روز نکلتا ہے مری جاں

کامل اختر
۱۳ار اسپلنل ریج روڈ
چوتھی منزل ۔ کلکتہ 19

غزل

سانولی صورت کا دھڑکن میں اثر پیدا ہوا
میرے دریا میں اچانک پھر بھنور پیدا ہوا

اک ستارے کی طرح تھا آسمان شہر پر
ابر کے پیچھے سے جو بار دیگر پیدا ہوا

ریت سی جمنے لگی تھی شہر کی شریان میں
میں پلٹ آیا تو کیسا شور و شر پیدا ہوا

یہ سفر بھی کیا عجب ہے جس کا آتے ہی خیال
آنکھ میں اک دم سے عکسِ رہگزر پیدا ہوا

ایک نامعلوم منزل کی طرف چلتے ہوئے
حادثہ ہونے سے پہلے اس کا ڈر پیدا ہوا

یہ مویشی یہ چراگاہیں، یہ گھر یہ مرد و زن
پانیوں کے درمیاں کیسا نگر پیدا ہوا

کلام غالب میں ہندوستانی عناصر

ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط
کل گاؤں - 445203

آزادی ہند سے قبل پرمانند شرمانے کلام غالب میں ویدانت کی تلاش کی تھی۔ آپ کا مضمون رسالہ "آج کل" دہلی کے فروری ۱۹۴۶ کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ مضمون نگار چونکہ کوئی حتمی نتیجہ برآمد کرنے میں ناکام رہا تھا۔ اس لئے بعد میں کلام غالب میں ہندوستانی عناصر ڈھونڈھنے کو عبث سمجھا گیا۔ اور اس طرف توجہ بھی کم ہی دی گئی، درآنحالیکہ عبدالرحمٰن بجنوری شارح و مفسر غالب نے اس کلام کو ویدوں کے مماثل قرار دیا تھا۔

غالب جو مشاہدہ حق کی گفتگو بھی بادہ و ساغر کے بغیر نہیں کر سکتے، بت کافر کے پوجنے پر اس لئے بضد ہیں کہ ان کی اپنی دانست میں کعبہ سے ان بتوں کو نسبت ہے۔ انھیں پاس ناموس وفا، بت خانے میں مرے برہمن کو کعبہ میں گاڑنے پر متردد نہیں کرتی۔ کفر کی کشش انھیں کعبہ کو پس پشت ڈال کر کلیسا کی جانب بڑھا دیتی ہے۔ حتیٰ کہ وہ دیر میں احرام باندھ کر کعبہ میں ناموس بجانے میں عار نہیں مانتے۔

کعبہ میں جا بجائیں گے ناموس
اب تو باندھا ہے دیر میں احرام

وہ میر کی ہمنوائی میں "سبحہ صد دانہ توڑ" کر "زنار باندھ" لینے میں تکلف یا ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے۔ غالب کے نزدیک دیر و حرم آئینہ تکرار تمنا کے سوا کچھ بھی نہیں۔ ان کی شخصیت افکار دینیہ میں مجموعۂ الضدین ہے۔ ان کے "بت مشکل پسند" کو "شمار سبحہ" مرغوب ہے۔ وہ مسائل تصوف علم سرشاری و مے خواری میں بیان کرتے ہیں۔ لاموجود الا اللہ کے بادہ ناب کا رطل گراں چڑھائے ہوئے (وہ) کفر و اسلام اور نور و نار کو مٹائے ہوئے بیٹھے ہیں"۔ (خط بنام مرزا علائی مرقومہ ۷/مارچ ۱۸۶۲ء، مشمولہ غالب کے خطوط ج اول ص ۳۸۶)

وہ شرط طریق اخلاص کے پابند ہیں۔ انھیں نہ کفر سے غرض نہ اسلام سے رغبت۔ انھیں نہ سبحہ سے علاقہ نہ ساغر سے رابطہ۔ وہ تو بس اپنے آپ کو معرض مثال میں دست بریدہ گردانتے ہیں، لیکن نیک نیتی کا یہ عالم ہے کہ اخلاص کے بغیر صلہ کی لالچ میں کی جانے والی عبادت کے عوض ملنے والی جنت کو دوزخ میں جھونک دینے کو برا نہیں سمجھتے۔

غالب اگرچہ کعبہ و کلیسہ اور گبر و مسلمان میں توافق کے بجائے تطابق کے قائل ہیں، لیکن انھیں سرزمین ہند سے ایسا والہانہ لگاؤ ہے کہ "شمع حرم" کی بجائے انھیں "چراغ دیر" عزیز ہے۔ غدر میں دہلی کے اجڑنے کا انھیں جہاں قلق ہے وہاں بنارس کے گھاٹ انھیں اپنی طرف مائل کرتے ہیں۔ حسن شیریں سخن کے پانو دھو کر پینے میں انھیں عار محسوس نہیں کرتا کیونکہ وہ ہندی نژاد فارسی داں ہے۔ بنارس کے پنگھٹ پر انھیں حسینان سیم تن عریاں بدن، شوخ و چنچل کی ادائیں بہشت موعود کی حوروں کو بھلا دیتی ہیں۔ بادشاہوں اور امراء کے درباروں کی کنیزوں میں انھیں حوران بہشت کی نسبت راجہ اندر کی پریاں نظر آتی ہیں۔ دیوالی کے چراغاں اور ہولی کی رنگ رلیاں انھیں پسند ہیں۔ راجہ اندر، نل دمن اور جوگ مایا سے انھیں انسیت ہے۔ سایہ، گل پائے تخت ہندوستان کو غالب زمین مہر و وفا و اخلاص سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ غالب نے اپنے فارسی کلام کے ساتھ ہی اردو کلام میں بھی ہند کی روایات و اساطیر کو جا بجا استعمال کیا ہے۔ ذیل میں چند مثالیں پیش کی جا رہی ہیں۔

عروج آدم خاکی سے مہ و انجم کے سہمنے کو شاعرانہ خیال آرائی پر محمول کیا جا سکتا ہے۔ لیکن برادران وطن کے یہاں عروج آدم خاکی سے ساکنان

جنت کے دل دہل جانے کی روایت ملتی ہے۔ بلی راجہ کے یہاں سو ختنی قربانی (یگیہ) دینے کی تیاریاں زوروں پر ہیں۔ ہوم (آگ کا الاؤ) روشن کیا گیا ہے۔ آگ کو مزید بھڑکانے کے لئے گھی انڈیلا جارہا ہے۔ سادھو سنت جپ کر رہے ہیں۔ غرباء بلی راجہ کی مدح سرائی میں مشغول ہیں۔ اس کی سخاوت وجود کے اہل زمین و آسماں معترف ہیں۔ قربانی قبول ہوجانے پر بلی راجہ کی مملکت جنت تک وسیع ہوجائے گی اور اہلیانِ جنت بلی راجہ کے ماتحتین و باج گزار بن جائیں گے۔ داروغہ جنت اندر کو یہی خوف کھائے جارہا ہے۔ اب نہ رنبھا کے چتون کے تیر اسے گھائل کر رہے ہیں نہ مینکا اور اروشی کے حسن کا جادو اس پر کارگر ہورہا ہے۔ دل میں بس یہی کھٹکا لگا ہوا ہے کہ راجہ کی قربانی کہیں قبول نہ ہوجائے۔ اندر بھاگا بھاگا وشنو دیوتا کے پاس پہنچتا ہے اور بصد عجز اپنی بپتا سناتا ہے۔ سقوط جنت سے بچنے کا ایک ہی راستہ رہ گیا ہے کہ قربانی دینے والے کو قربانی قبول ہونے سے پہلے موت کے آغوش میں سلادیا جائے۔ لیکن یگیہ کے موقع پر جنگ تو حرام قرار دی گئی ہے۔ پھر دوسری صورت کیا ہو سکتی ہے ؟؟ وشنو دیوتا نے اندر کو دلاسا دے کر جنت میں بھیج دیا اور خود وامن (بونا) کا روپ لے کر بلی راجہ کے دربار میں پہنچ کر رہنے کے لئے تین پگ (تین قدم) زمین کی بھیک مانگی۔ وسیع سلطنت کے مالک بلی راجہ کو یہ سوال اپنے افتخار و شان کے خلاف محسوس ہوا، اس لئے فرط تکبر میں وامن کا سوال پورا کرنے کا وعدہ کرلیا۔ وامن نے پہلا قدم جو رکھا تو پوری زمین کو گھیر لیا، دوسرے قدم میں ساتوں آسماں۔ اب تیسرا قدم کہاں رکھوں ؟؟؟ بلی رجہ نے آزردہ ہوکر اپنا سر پیش کردیا۔ وامن نے تیسرا قدم جو سر پر رکھا تو بلی راجہ کو تحت الثریٰ پہنچادیا۔ اور اس طرح اہلیان جنت کو بلی راجہ کی باج گزاری سے بچالیا۔ اس ہندو وی روایت کی روشنی میں اب غالب کا یہ شعر ملاحظہ کیجئے۔

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب
ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقش پا پایا

تصوف کے پیچیدہ اور ادق دلائل و علل اور توضیحات و توجیہات میں الجھنے کی بجائے مندرجہ بالا روایت کی روشنی میں ہم اس شعر کو بآسانی سمجھ سکتے ہیں۔ یوں بھی مذکورہ شعر اسلامی تصوف کے بالمقابل ویداتی فلسفہ سے زیادہ لگا کھاتا ہے۔ سرحد ادراک سے پرے اپنا مسجود ماننے والے غالب کو تقیہ گاہ امکاں ایک نقش پا کے برابر محسوس کیوں نہ ہوگا کہ ان کا نقش قدم "چتاب موجہ رفتار" ہے۔ "بیاباں ماندگی" سے ان کا ذوق کم نہیں ہوتا بلکہ جادۂ اجزائے دو عالم پر "غالب کا "قدم وحشت" درسِ امکاں کے دفتر کھول دیتا ہے۔

اس شعر کو ویدانت سے قریب تر بتانے کی وجہ دوسری یہ بھی ہے کہ اگر اسے اسلامی نقطہ نظر سے جانچا جائے تو قرآن کی آیت " لاتنفذو " سورۂ رحمن آیت ۳۳) سے ٹکرائے گا۔ ایسی جرأت آزمائی غالب کی شان ایمانی سے بعید تر ہے۔ بہرحال "تسخیر کائنات" کی توضیح میں غالب کا یہ شعر آپ اپنی مثال ہے۔

"سپت رشی" (سات تاروں کا جھرمٹ) کے بارے میں ہندو اسطور میں ایک روایت ملتی ہے کہ دریا کنارے ایک رشی ریاضت کر رہے تھے۔ اعمال و مراقبہ میں ان کا سارا دن گزر جاتا۔ دنیا و مافیہا سے بے پرواہ وہ برسوں سے مراقبہ میں منہمک تھے کہ ایک دن راجہ کی رانیوں کے دل میں اس کے مراقبہ میں خلل ڈالنے کا خیال آیا۔ ازراہ مذاق وہ ساتوں رانیاں چاندنی رات میں دریا میں برہنہ ہوکر تیرنے لگیں۔ ان کے شور اور حسین چاندنی میں ان کے برہنہ جسموں کی دمک نے رشی کے جذبات برانگیختہ کردیئے جس کی وجہ سے اس کا مراقبہ ٹوٹ گیا اور رشی کی برسوں کی ریاضت پر پانی پھر گیا۔ طیش میں آکر اس رشی نے انھیں بددعا دے دی۔ جس کے زیر اثر وہ آسمان میں تاروں کا جھرمٹ بن کر جگمگانے لگیں۔ ان تاروں کے لئے ہندی نجوم میں "سپت رشی" کی اصطلاح رائج ہے۔ تاروں کے ایک ایسے ہی جھرمٹ کو فارسی میں "بنات النعش" کہتے ہیں۔ اس ہندوی روایت کے پس منظر میں غالب کا درج ذیل شعر کتنا حسین مفہوم دے رہا ہے۔

تھیں بنات النعش گردوں دن کو پردے میں نہاں
شب کو ان کے جی میں کیا آیا کہ عریاں ہوگئیں

بنات النعش کے عریاں ہوجانے کا خیال مذکورہ روایت کے کس قدر قریب ہے، بلکہ چربہ معلوم ہوتا ہے۔ وہاں رانیوں کا ذکر ہوا تو یہاں "بنات" کا لالازماً لایا گیا۔ وہاں آسمان میں چلے جانے کا ذکر ہے تو یہاں گردوں سے ان کی نسبت بتائی گئی ہے۔ ان کا دریا میں برہنہ ہوکر نہانے کا ذکر اس روایت میں ہے تو اس شعر میں ان کے عریاں ہوجانے کی تفصیل ہے۔ غرضکہ دن میں تاروں کے نہ دکھائی دینے کو "پردے میں نہاں" ہوجانا اور رات میں چمکنے کو "برہنہ ہوجانا" وغیرہ سیدھے سپاٹ غیر دلچسپ اور غیر شاعرانہ معنی کے علی الرغم مذکورہ روایت کے مفہوم پر اس شعر کا انطباق زیادہ بامعنی اور لٹریری ہوسکتا ہے۔

ہندوؤں کی پورانک کہانیوں میں راجہ نل اور دمینتی کا قصہ بڑا مشہور ہے۔ کہتے ہیں کہ دونوں میں بڑی گہری محبت تھی جو بالآخر ازدواجی رشتہ پر منتج ہوئی۔ لیکن کالیہ دیو (راکشس) کے نل کی روح میں حلول کرجانے کی وجہ سے نل برائیوں کی طرف مائل ہوگیا اور جوے میں اپنے چچازاد بھائی کے ساتھ اپنی حکومت ہار گیا۔ نتیجتاً اسے سلطنت چھوڑکر جنگل میں گزارا کرنا پڑا۔ اپنی حسین، خوبصورت اور چہیتی بیوی کی پریشانیاں جب نل سے دیکھی نہ گئیں تو ایک دن یہ سوچ کر کہ جنگل میں دمینتی جب اپنے آپ کو تنہا پائے گی تو ہوسکتا ہے وہ اپنے میکے چلی جائے گی، نل، دمینتی کو سوتا چھوڑ کر نکل گیا۔ آنکھ کھلنے پر دمینتی نے نل کو پہلو میں نہ پایا تو وہ تڑپ اٹھی اور دیوانہ وار جنگل میں نل کو ڈھونڈھتی رہی"۔ آگے یہ طویل قصہ بالآخر دونوں کے وصال پر ختم ہوتا ہے۔ بہرکیف یہ واقعہ غالب کے درج ذیل شعر کو پڑھ کر قاری کے ذہن میں مستحضر ہوسکتا ہے۔

ہوا ہے کاٹ کے چادر کو ناگہاں غائب
اگرچہ زانوئے نل پر رکھے دمن تکیہ

اس طرح اور بھی عرق ریزی سے ہم اگر کلام غالب کا تجزیہ کریں تو اور بھی کئی گوشے وا ہوسکتے ہیں اور ہم بآسانی غالب کی شاعری کی جڑوں کو بجائے ترک و ایران کے سرزمین ہند میں تلاش کرسکتے ہیں۔ اس لیے کہ غالب کی شاعری میں ہندوستانی خمیر رچا بسا ہے۔ انھیں ہندوستان سے والہانہ محبت تھی۔ ہندوستانی روایات و وضعداری کی انھوں نے دم واپسیں تک پاسداری کی۔

مغربی بنگال میں اردو شاعری : آزادی کے بعد



قسط اول

مظہر امام
176 - B. Pocket I
Mayur Vihar. Phase I.
Delhi - 110091

جب ملک میں آزادی کا سورج طلوع ہوا تو اجالے میں لاشوں کی قطاریں نظر آئیں اور ان کے جلو میں افسردہ چہروں کا کارواں، ایک اجنبی دیار میں قدم رکھتا ہوا، مگر جو اپنا شخص اپنے وطن ہی میں چھوڑ آیا تھا۔ بنگال دو حصوں میں بٹ کر مغربی بنگال اور مشرقی بنگال بن گیا تھا۔ مشرقی بنگال ایک نئے ملک کا حصہ بنا اور اس کا نیا نام "مشرقی پاکستان" ہوا۔ نئے مغربی بنگال کے علاقے سے تعلق رکھنے والے بہت سے خوش فکر شعراء اس نئے ملک کی طرف ہجرت کر گئے۔

پروفیسر رضا علی وحشت متحدہ بنگال کے سب سے اہم، معروف اور برگزیدہ شاعر تھے۔ ان کا شمار اردو کے معدودے چند صف اول کے غزل گویوں میں ہوتا تھا، جنھیں حسرت اور اقبال جیسے ہم عصر اور مداح میسر تھے۔ وحشت نے ہرچند غالب کے رنگِ سخن کا اتباع کیا اور غالب کے رنگ میں کہنے والوں میں سب سے ممتاز قرار دیے گئے، لیکن وہ غالب کے مقلد کی حیثیت سے نہیں، بلکہ اپنے کلام کے انفرادی رنگ و آہنگ کے باعث درجۂ اعتبار تک پہنچے۔ ان کے اشعار خیالات کی گہرائی اور گیرائی، الفاظ کے دل نشیں در و بست اور تراکیب کی خوش ادائی کے باعث فوراً اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ وحشت کو اہل بنگال نے سر آنکھوں پر بٹھایا۔ وہ "طوطیٔ بنگال" کہلائے۔ غالب کے یہاں انا تھی، تو وحشت کے یہاں انکسار۔ معاصرانہ چشمکیں کہاں نہیں ہوتیں۔ آزادی سے پہلے کلکتہ میں آرزو لکھنوی اور ناطق لکھنوی جیسے شعراء بھی تھے اور ان کے الگ الگ حلقے۔ ممکن ہے وحشت کو بھی اس کا احساس ہوا ہو کہ ان کے ہم وطن ان کی اتنی قدر و منزلت نہیں کرتے جس کے وہ مستحق ہیں

خیال تک نہ کیا اہلِ انجمن نے کبھی
تمام رات جلی شمع انجمن کے لیے

لیکن سچائی یہ ہے کہ وحشت ہمیشہ بنگال کے محبوب ترین شاعر رہے، اور جب وہ ہجرت کر کے ڈھاکہ چلے گئے، تب بھی کلکتہ سے ان کا رشتہ نہیں ٹوٹا، اور انتقال سے پہلے تک وہ اس دیار کو وقتاً فوقتاً اپنی تشریف آوری سے نوازتے رہے۔ ان کے اکثر اشعار زبان زد عام ہیں

مزا آتا، اگر گزری ہوئی باتوں کا افسانہ
کہیں سے ہم بیاں کرتے، کہیں سے تم بیاں کرتے

شرمندہ کیا جوہر بالغ نظری نے　　اس جنس کو بازار میں پوچھا نہ کسی نے

خیال ترک محبت تو بار بار آیا
مجالِ ترک محبت نہ ایک بار ہوئی

ہمارے پاؤں میں تم نے تو زنجیر وفا ڈالی　　تمہارے ہاتھ سے کیوں رشتۂ مہر و کرم چھوٹا

کچھ کچھ کر ہی ہوا ہوں موجِ دریا کا حریف
ورنہ میں بھی جانتا ہوں عافیت ساحل میں ہے

وحشت کے معاصرین میں آرزو لکھنوی اور ناطق لکھنوی نے اہل بنگال کو فیض سخن بخشا۔ آزادی کے بعد ان کے شاگردوں کے کئی حلقے نوجوان شعراء کی فنی تربیت کر رہے تھے۔ وحشت کے شاگردوں میں پروفیسر عباس علی خاں بیخود، سید میر محمود طرزی اور شاکر کلکتوی کا تعلق کلکتے سے قائم رہا۔ آصف بنارسی، واصف بنارسی، احسن احمد اشک وغیرہ نے ڈھاکے کو نیا مستقر بنایا۔ آرزو لکھنوی کے شاگردوں میں ناوک لکھنوی، حرم محمد آبادی، منی لال جوان سندیلوی اور نواب دہلوی کے نام فوری طور پر ذہن میں آتے ہیں۔ ناطق لکھنوی کے شاگردوں میں رضی ناطقی اور پیام ناطقی کسی زمانے میں کلکتے میں معروف تھے۔

جمیل مظہری کی شاعری سرزمین بنگال میں ہی پروان چڑھی، لیکن آزادی کے بعد وہ مستقلاً اپنے وطن بہار میں ہی قیام پذیر رہے۔ کلکتہ میں ان کی آمد بس عارضی اور مختصر ہوئی، اس لیے آزادی کے بعد کی اردو شاعری کا ذکر کرتے ہوئے انھیں مغربی بنگال سے وابستہ کرنا مناسب نہیں معلوم ہوتا

پروفیسر عباس علی خاں بیخود کے شعری ذوق کو کلاسیکی ادب کے براہ راست مطالعے اور روایت کے احترام نے بالیدگی عطا کی تھی۔ ان کے اشعار اپنی صفائی اور شستگی کے باعث پہچانے جاتے ہیں

التجاؤں کا ہماری اک تبسم ہے جواب
کیا کہو لیں ہم اسے، انکار ہے، اقرار ہے

انقلاب آیا، زمین و آسماں بدلے، مگر دل کی جو رفتار تھی، اب تک وہی رفتار ہے

یہ اختیار، بتوں کو خدا بناتا ہوں
یہ جبر، آج تک اک بندہ خدا ہوں میں

میر محمود طرزی بڑی باغ و بہار شخصیت کے مالک تھے۔ ادبی محفلوں کی روح رواں۔ ایسی شخصیتیں ایک خاص جذب و کشش رکھتی ہیں انہوں نے ۱۹۲۰ء میں تفریحاً پہلی غزل کہی تھی جس کا مطلع تھا

ہم دیکھ رہے ہیں تری مستانہ ادا کو
ساقی ابھی رہنے دے مئے ہوش ربا کو

اسلامیہ کالج کے مشاعروں نے ان سے یہ "تفریحی" شاعری ختم کرادی۔ وہ مولانا رضا علی وحشت سے اصلاح لینے لگے۔ دسمبر ۴۲ء تک دہلی میں مستقل قیام رہا۔ یہاں ان کے مشاہدات نے ایک نئی کروٹ لی۔ دہلی کی بربادی، قحط بنگال، دوسری جنگ عظیم، کلکتہ پر بمباری اور اسی طرح کے دوسرے واقعات و مشاہدات نے ان کے کلام میں حزن و ملال کے ساتھ احتجاج کے عناصر شامل کر دیے

یا کبھی ماضی کی آبادی میں جاکر غور سے کاروان وقت کا نقش کف پا دیکھیے
باپ اور بیٹے کے منہ سے اس کا لقمہ چھین لے بھوک میں انساں کی فطرت کو ننگا دیکھیے

میر محمود طرزی نے آخری دور میں "بھیوا" اور "پراناکوٹ" جیسی نظمیں لکھیں جو ان کے سماجی شعور کی آئینہ دار ہیں۔ ان کے کلام میں نئے حالات و مسائل کی طرف بڑے واضح اشارے ملتے ہیں۔ جوش و جمیل مظہری کے رنگ سخن سے وہ بطور خاص متاثر نظر آتے ہیں۔ انہوں نے ۱۳ اکتوبر ۵۸ء کو لکھا تھا

"میری شکستہ کشتی کو آگے بڑھانے میں جمیل مظہری نے ہر قدم پر میری رہبری کی ہے اور آج بھی وہ میرے رہبر ہیں"۔

طاہری علی شاکر کلکتوی، وحشت کے سب سے فرماں بردار شاگرد تھے۔ اور ان کی آخری عمر تک اپنا کلام اصلاح کے لیے ان کے پاس بھیجتے رہے شاکر کا کلام بے عیب ہے۔ خیالات اور مضامین روایتی ہیں، جنھیں طرز ادا کی بے تکلفی نے قابلِ توجہ بنادیا ہے۔ وحشت نے ۴۵ء میں انھیں اپنا جانشین مقرر کیا تھا

ذرا چشم کرم سے دیکھ لو تم سہارا ڈھونڈتا ہوں زندگی کا
حاصل نہ ہو اگر ہمیں یک گو نہ بے خودی دنیا کے حادثات سے گھبرا کے مر نہ جائیں

آرزو لکھنوی سے کسب فیض کرنے والوں میں حرم محمد آبادی کو خود استادانہ حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔ ان کے شاگردوں کا ایک وسیع حلقہ تھا اور ایک خاص دور میں کلکتہ کے اکثر مشاعروں کی صدارت وہی کیا کرتے تھے۔ حرم محمد آبادی کے کلام میں ایک سلاست، روانی، سادگی اور کلاسیکی رچاؤ ہے۔ زبان کی صحت اور صفائی کے اعتبار سے ان کا کلام "نووار دان کوچہ سخن" کے لیے مشعل راہ ثابت ہو سکتا ہے۔ (علی جواد زیدی نے بھی ان سے مشورہ سخن کیا ہے)

کہاں جاؤں تری محفل سے اٹھ کر
پلٹ کر پھر یہیں آنا پڑے گا

میں چھوڑے جارہا تھا کچھ افسانہ حیات اچھا ہوا کہ آپ نے بتلادیا مجھے
کیا جانے ہم نواؤں میں باقی رہا ہے کون چھوڑے ہوئے جہاں کو زمانہ ہوا مجھے

نواب دہلوی کے یہاں روایتی احساس کے ساتھ عصری مسائل پر تبصرے بھی ملتے ہیں

عجیب شان سے نواب گلستاں میں رہے کہ خار ہو کے بھی ہم چشم دشمناں میں رہے
بہار آتے ہی یہ گل بھی گلستاں میں کھلا کہ چار دن بھی نہ سکھ سے ہم آشیاں میں رہے

دیکھ لیں انقلاب دہر تیری کرشمہ سازیاں
صورت آدمی بہت، سیرت آدمی نہیں

آرزو سہارنپوری کسی خاص حلقے سے وابستہ نہیں رہے، اس لیے شاید انھیں وہ جگہ نہیں دی گئی جس کے وہ مستحق تھے۔ انھوں نے حسن عشق کے رسمی مضامین سے اجتناب برتا ہے اور حیات و کائنات کے مسائل کو ایک فلسفی کی طرح اپنی شاعری میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ آزادی کے دورِ بعد مغربی بنگال میں ترقی پسندانہ شاعری پروان چڑھ رہی تھی یا آرزو اسکول کی شاعری۔ آرزو سہارنپوری دونوں سے مختلف مزاج رکھتے تھے

میں اپنے طرز سخن کا ہوں آرزو موجد
جدا ہے سب سے مرے ذوق شاعری کا مزاج

وہ کسی "طرز سخن" کے موجد تو نہیں تھے، لیکن قابلِ لحاظ شعر ان کے مجموعہ کلام میں مل جاتے ہیں

جینے لگا سراغ مقامات راز کا احسان مند ہوں، غم ہستی گزار کے
شعور سجدہ ابھی خام ہے ترا، ورنہ تری تلاش میں خود سنگ آستاں ہوتا

اس عشق میں اور اس کے سوا کیا نظر آیا جو پردہ اٹھا ، اپنا سراپا نظر آیا
نقش ہستی پہ تبصرہ کیا ! زندگی راز اور موت بھی راز

وحشت کے بعد سرزمین بنگال کی سب سے بڑی شاعرانہ شخصیت بلاشبہ پرویز شاہدی کی ہے۔ اور اگر آزادی کے بعد وحشت کو مغربی بنگال کے شعری منظر نامے سے الگ کر دیا جائے تو پھر اس ریاست کے سب سے اہم اردو شاعر پرویز شاہدی ہی ٹھہرتے ہیں۔ پرویز ترقی پسند ادبی تحریک اور اشتراکی فلسفۂ حیات سے گہرے طور پر وابستہ رہے۔ اس نظریاتی وابستگی کی بناء پر انھوں نے کئی ہنگامی اور تبلیغی نوعیت کی نظمیں بھی لکھیں۔ لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ ایک باشعور فن کار تھے۔ ان میں غیر معمولی تخلیقی قوت اور طباعی تھی۔ وہ نئی نئی ترکیبیں اور پیکر تراشنے میں بڑی ذہانت کا مظاہرہ کرتے تھے۔ موضوعات کے تنوع اور مواد کے وزن و وقار کے علاوہ ان کا کلام فنی اور شعری محاسن کا ایک آئینہ خانہ ہے۔ ان کی آخری دس بارہ سال کی شاعری میں علامتی رنگ نمایاں ہے۔ ان کا ذہن فعال تھا اور نئے شعری مزاج سے اثر قبول کرنے میں انھیں کوئی تکلف نہیں تھا۔ ان کی نظم "بے چہرگی" میرے اس بیان کی تصدیق کرتی ہے۔ میں نے پہلے بھی لکھا ہے کہ اس نظم کی بناء پر میں پرویز شاہدی کو "جدیدیت کا پیش رو" کہتا ہوں

غرور برتری کے ساتھ اختلاج کمتری
یہ ریزہ ریزہ آدمی
یہ پارہ پارہ آدمی
ہزار چہرہ آدمی
معاشیات حرص کا ابھرتا خلفشار ہے
مجسم انتشار ہے
نظام بے مہار کا عظیم شاہکار ہے

پرویز شاہدی کی غزلیں بھی فکر کی تازگی اور گیرائی اور فنکارانہ صناعی کے اعتبار سے اپنی الگ شناخت رکھتی ہیں

موقع یاس کبھی تیری نظر نے نہ دیا شرط جینے کی لگادی ، مجھے مرنے نہ دیا
کم سے کم میں غم دوراں کو بھلا سکتا تھا پر تری یاد نے یہ کام بھی کرنے نہ دیا

O

دل والوں کی خاموشی ہی بار سماعت ہوتی ہے بے آوازی کرب فضا ہے ، تم بھی چپ ہو ہم بھی چپ
سکتے تک اب آپہنچا ہے بڑھتے بڑھتے کرب سکوت ہونٹوں پر کیا وقت پڑا ہے ، تم بھی چپ ہو ہم بھی چپ

O

ان پڑھ آندھی گھس پڑتی ہے توڑ کے پھاٹک محلوں کے "اندر آنا منع ہے" لکھ کر لٹکانے سے حاصل کیا ؟
ٹوٹی دھنک کے ٹکڑے لے کر بادل روتے پھرتے ہیں کھینچا تانی میں رنگوں کی سورج بھی ہے شامل کیا ؟

میں بہت ایمانداری سے محسوس کرتا ہوں کہ ترقی پسند شاعروں میں پرویز شاہدی، اپنے کئی مقتدر ہم عصروں سے برتر شاعر ہیں۔ لیکن انھیں مغنیان ادب نے ہمیشہ نظر انداز کیا ہے۔ یہ ناانصافی پرویز شاہدی کے ساتھ ہی نہیں، پوری اردو دنیا کے ساتھ بھی ہے۔
اشک امرتسری ایک "شعلۂ مستعجل" تھے۔ "ہوش درخشید"۔ ان کے بارے میں یہ کہنا بالکل درست ہے۔ ان کی شاعری ہمارے ادب میں

ایک مستقل جگہ بنانے کی اہلیت رکھتی ہے۔ کاش زندگی نے ان کے ساتھ وفا کی ہوتی یا اشک امرتسری کی شاعری کی عمر تھوڑی زیادہ بڑی ہوتی۔ لیکن کلکتہ کی ادبی محفلوں میں ان کے تعارف، مقبولیت اور عروج کا زمانہ ۱۹۵۱ء سے ۵۶-۱۹۵۵ء تک تھا۔ ان کی شاعری میں عام لوگوں کے دکھ درد کا اظہار احساس کی شدت اور جذبے کے خلوص کے ساتھ ہوا ہے۔ انھیں بیان پر غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔ نظیر اکبر آبادی کے رنگ کو انھوں نے اپنی شاعری میں زندہ کیا۔ "بنجارہ نامہ" ۔ "ٹن ٹن ٹن" ۔ "قومی" ۔ "پیسہ" ۔ "بلا آتا ہے" ۔ "زر علیہ السلام" وغیرہ ان کی بے حد کامیاب نظمیں ہیں۔ "بنجارہ نامہ" کا ایک بند ہے :

کیا دشت و دمن ، کیا سرو و سمن ، کیا صحن چمن ، کیا فوارہ
کیا شیشہ و مے ، کیا نغمہ و نے ، کیا رقص بتان مہ پارہ
کیا وائرلیس ، کیا ریڈیو سیٹ ، کیا پیانو ، بیجو ، اکتارہ
"سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارہ"

قافیوں کی ترتیب اور ہم وزن الفاظ کے انتخاب سے ایک مخصوص صوتی آہنگ کس خوبصورتی سے تراشا گیا ہے !

اشک امرتسری نظم کے شاعر تھے۔ انہوں نے غزلیں بھی کہی ہیں، لیکن ان پر نظم کا رنگ غالب ہے۔ اشک نے بڑے صبر آزما حالات میں زندگی گزاری۔ موت سے کچھ پہلے انہوں نے کہا تھا ۔

زندگی تل گئی مر مر کے جیے جانے پر
دیکھتا یہ ہے کہ اب موت میں دم ہے کہ نہیں

اور واقعی موت میں دم ان معنوں میں نہیں تھا کہ اشک امرتسری کا کلام آج بھی ہماری جوابی صلاحیتوں کو چھوتا ہے۔

ابراہیم ہوش نے صحافت کو ذریعہ معاش بنایا اور اسی کے ہو رہے، اس لیے ان کی شاعرانہ صلاحیتوں اور خوبیوں کی طرف کم توجہ دی گئی۔ ابراہیم ہوش اب سے کم و بیش ساٹھ سال پہلے ۳۳ء سے ۳۷ء کے درمیان مخدوم اسپورٹنگ پر نظمیں کہہ کہہ کر کلکتہ کے ادبی افق پر نمودار ہوئے تھے اور انھیں نظموں سے انھوں نے اپنے شعری امکانات کا لوہا منوا لیا تھا۔ موضوعاتی نظمیں کہنے کا انہیں خاص ملکہ تھا۔ انھوں نے خوبصورت غزلیں بھی کہی ہیں۔ ان کی زود گوئی ضرب المثل ہے۔ کلکتہ کی مخصوص زبان میں انھوں نے بڑی پر لطف شاعری کی ہے اور اس باب میں ان کا کوئی حریف نہیں۔ اپنی ذہانت صلاحیتوں کے باعث ابراہیم ہوش کا نام ایک زمانے میں پرویز شاہدی کے ساتھ لیا جاتا تھا۔

ہوش کا کلام انداز بیان کی پختگی، بندش کی چستی اور شیرینی کے لحاظ سے قابل توجہ ہے۔ ان کے یہاں ایک تھما تھما ٹھہرا ٹھہرا انداز ہے جس میں والہانہ پن کی آمیزش ہے ۔

بجلی گرا رہے تھے کل وہ ہنسی ہنسی میں
دل آگے بڑھ رہا ہے آج اس کی روشنی میں

جفا کو سامنے رکھ کر وفا سے میری نظر تو   تم اپنا جائزہ لے لو تو لینا امتحاں میرا

مجھ میں آئے تو کیسے آئے تری نظر کی کرشمہ سازی
جنھیں تھا فن چاک دامنی پر انھیں جنوں ہو گیا رفو کا

ابراہیم ہوش نے اپنے دور شباب میں ایک قطعہ کہا تھا ۔

خندہ زن مجھ پہ ہے شباب، کہ میں اپنی ہستی تباہ کر نہ سکا
عمر بھر ہوش! مفلسی کی قسم کوئی زریں گناہ کر نہ سکا

میرا خیال ہے ہوش اپنی مفلسی کے باوجود "زریں" اور "سیمیں" ہر طرح کے گناہ کرنے کے اہل رہے ہیں، کہ ان کی شاعری کو رعنائی اور لطافت انھیں لغزشوں سے ملی ہے۔

سالک لکھنوی ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں اور ان کی دلچسپیاں گوناگوں ہیں۔ انھوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز افسانہ نگاری اور افسانوں کے تراجم سے کیا تھا۔ ادبی تنقید و تجزیہ ان کا خاص میدان ہے۔ انھوں نے کئی خوبصورت انشائیے بھی لکھے ہیں۔ شاعری ان کی پہلی محبت کبھی نہیں رہی۔ لیکن وہ باقاعدگی کے ساتھ شعر کہتے رہے ہیں۔ نظمیں بھی اور غزلیں بھی۔ ان کی شاعری میں نمایاں طور پر ترقی پسندانہ خیالات کا اظہار ہوا ہے۔ ان کی غزلوں میں بھی اسی بناء پر ایک بلند آہنگی ہے

ستارے نقش پا میرے، ہے یزداں رازداں میرا کہاں پہنچا ہے سالک بڑھتے بڑھتے کارواں میرا
قفس میں ایک دن یوں موسم گل کی نوید آئی مری نظروں میں جیسے کھنچ گیا ہو آشیاں میرا

ہزاروں غنچے مسل چکے ہیں، ہزاروں کلیوں نے خون تھوکا
چمن ہمارا چمن نہیں ہے، یہ ایک مقتل ہے رنگ و بو کا

لیکن سالک لکھنوی کے یہاں اس طرح کے اشعار بھی ملتے ہیں

کہی کسی سے نہ روداد زندگی میں نے گزار دینے کی شئے تھی، گزار دی میں نے

بھلا کیا فائدہ ہے ماجرائے دل سنانے میں
کسی کا دکھ بھی کوئی بانٹ لیتا ہے زمانے میں

رضا مظہری کے کلام میں سادگی اور پرکاری ہے۔ جذبے اور احساس کے شاعر ہیں۔ انھوں نے اپنے احساس کے گرد مصنوعی فکر کی چادر نہیں لپیٹی۔ ان کی شاعری سہل ممتنع کا نمونہ پیش کرتی ہے۔ اس سادگی میں ایک حلاوت اور شیرینی ہے جو کلام کی تاثیر بڑھادیتی ہے۔ وہ کلاسیکی مزاج رکھتے ہیں، اور اسی لیے زبان و بیان کا ایک خاص لطف ان کی شاعری میں ہے

ہمارے بعد سننا دوسروں سے کہانی یہ ابھی پوری نہیں ہے
ہمت ہے تو میرے ساتھ آؤ کہتا ہے غبار کارواں کا

رضا وہ بھول جو تم سے ہوئی اظہار الفت میں
لیا جائے گا شاید زندگی بھر انتقام اس کا

کہہ رہا تھا کہ میرے ہو، صرف میرے ہو مگر یقین کبھی اعتبار ہو نہ سکا
میں ان کو پا کے بھی اپنا بنا سکا نہ رضا اس اختیار پہ بھی اختیار ہو نہ سکا

حسن نجمی سکندر پوری شاعر بھی تھے، افسانہ نگار بھی۔ ان کا قیام کافی عرصے تک کھڑگ پور میں رہا اور ان کی شاعری اور ادبی سرگرمیوں کے عروج کا زمانہ وہی ہے، مگر انھیں مغربی بنگال کے شاعروں میں شاذ ہی شمار کیا گیا۔ کلکتہ کی "مرکزیت" ان شاعروں اور ادیبوں کو اپنانے سے گریز کرتی رہی ہے جو اس شہر سے باہر رہتے ہوں۔ ویسے حسن نجمی کی شہرت مغربی بنگال تک محدود نہیں رہی۔ زبان و بیان پر ان کی گرفت مضبوط تھی۔ کلاسیکی

آب و رنگ نے ان کی شاعری کے چہرے کو مزید نکھار اور ترقی پسند تحریک سے وابستگی نے ان کے سماجی شعور کو توانائی بخشی۔ ان کے دو شعری مجموعے "شب چراغ" اور "کسک" شائع ہو کر ناظرین ادب سے خراج تحسین وصول کر چکے ہیں۔ انھوں نے کہا تھا

نجی جو اپنے عہد کی تاریخ بن گئے
ان شاعروں میں کاش مرا بھی شمار ہو

وہ اپنے عہد کی تاریخ تو نہیں بنے لیکن مغربی بنگال کی شاعری کا کوئی جائزہ حسن نجی کے تذکرے کے بغیر مکمل نہیں کہا جاسکتا

کوئی گنگیں کوئی خوش ہو کر صدا دیتا رہا
رات شہر دل کا ہر منظر صدا دیتا رہا

پھول پھول بام و در، راستے ہیں گل پیکر | وہ ادھر سے گزرے تھے یا بہار آئی تھی
پاس کا مسافر کیوں اٹھ کے دور جا بیٹھا | نام پوچھ لینے میں ایسی کیا برائی تھی
کتنا محترم تھا میں، بھولتا نہیں نجی! | ٹھوکر بھی مرے گھر میں سر جھکا کے آئی تھی

مصطفیٰ حیدری خاص طور پر اپنی رباعیوں کے حوالے سے پہچانے جاتے تھے۔ ایک زمانے میں ان کی یہ رباعی بہت مشہور ہوئی تھی

بجلی کی چمک قید کرو تو جانیں | کوندے کی لپک قید کرو تو جانیں
مانا کہ ہے گلشن پہ تمہارا قبضہ | پھولوں کی مہک قید کرو تو جانیں

مصطفیٰ حیدری کے مزاج میں جدت پسندی تھی۔ معانی آفرینی کی کوشش بھی ان کے اکثر اشعار سے ظاہر ہوتی ہے۔ وہ ایک خلاقانہ ذہن رکھتے تھے۔ لیکن شاید رسم عام سے متاثر ہونے اور بقول شخصے شاعروں کے قدم سے قدم ملانے کی کمزوری ان میں تھی جس کی وجہ سے ان کی انفرادیت ابھر نہ سکی، ورنہ مصطفیٰ حیدری کے یہاں یاد رہ جانے والے اور یاد رکھے جانے والے اشعار کی کمی نہیں ہے

ایسا بھی ایک وقت محبت میں آگیا | وابستہ میں کسی سے نگاہیں بچا گیا

کچھ اور مسافر بھی ہیں ہمراہ ہمارے
ہم اپنے سفینے کو ڈبو بھی نہیں سکتے

رباب و تیشہ و سیف و قلم تراشے ہیں | ہمیں خدا ہیں، ہمیں نے صنم تراشے ہیں

یہ رسم عام نہیں، پھر بھی ہم نے دیکھا ہے
خود اپنی آگ میں پروانے جلنے لگتے ہیں

ہر لمحہ بے شرم سوالی لگتا ہے | جینا تو اب ماں کی گالی لگتا ہے
لوگ سن کر بھی کچھ نہیں سنتے | جیسے درویش کی صدا ہیں ہم

ناظر الحسینی بھی جواں مرگی کا شکار ہوئے۔ وہ وحشت کے نوجوان شاگردوں میں تھے۔ نظم نگاری کی طرف زیادہ توجہ تھی۔ ترقی پسند شاعروں کے لب و لہجہ کا اثر نمایاں ہے۔ خاص طور پر "سحر قریب ہے"۔ "سوچ"۔ "شکریہ" وغیرہ نظمیں متوجہ کرتی ہیں۔ کبھی کبھی وہ غزل کا ایسا شعر بھی نکال لیتے تھے

اپنی منزل ڈھونڈ رہا ہوں | منزل سے کچھ دور نکل کے

مظہر انصاری نے بہت کم لکھا لیکن ان کی شاعری سے ایک رچے ہوئے شعور کا پتہ ملتا ہے۔ وہ عمدہ تر خیالات احساس اور جذبے کی تازگی بھی پیش کرتے ہیں :

مری آنکھوں نے کیا کھویا، ترے جلووں نے کیا پایا
حساب دوستاں دل ہی میں رہ جائے تو اچھا ہے

عزت اللہ اکرام بھی محفل ادب سے وقت سے پہلے ہی اٹھ گئے۔ عزت اللہ اکرام کا قیام کلکتے میں تقریباً دس سال رہا۔ ان کا پہلا مجموعہ کلام "بھالوں کے گیت" میں شائع ہوا تھا۔ ان کے یہاں غیر معمولی شاعرانہ قوت تھی، اور فن کے رموز و نکات پر گہری نظر رکھتے تھے۔ ان کا شمار اس دور کے ممتاز شاعروں میں ہوتا تھا۔ مغربی بنگال کی اردو شاعری کا ذکر کرتے ہوئے عزت اللہ اکرام کے کلام سے کسی طرح صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔ کلکتہ سے انھوں نے گہرا اثر قبول کیا ہے اور اس کے حسن اور رنگ کو اپنی طویل نظم "کلکتہ اک رباب" میں کمال خوبی سے پیش کیا ہے۔ میرا خیال ہے اس نظم کے باعث ہی ان کا نام تاریخ ادب میں محفوظ رہے گا۔

چورنگی جشن لقا ہے، کلکتہ اک کتاب
چورنگی ایک نغمہ ہے، کلکتہ ایک رباب
کلکتہ مدوجزر حقائق کا ایک خواب
کلکتہ خود سوال ہے، کلکتہ خود جواب
یہ ایک شہر سارے جہاں کی کمائی ہے
یہ اک غزل ہے، جس کا ہر اک شعر اکائی ہے

کلکتہ ان کی جذباتی زندگی پر شدت سے اثر انداز ہوا ہے۔ ان کے مجموعہ کلام "جلوہ نمو" میں کچھ رباعیاں ایڈن گارڈن کلکتہ کی یادگار ہیں۔ اور کچھ کلکتہ کے ایک روح پرور تہوار کے نقوش پیش کرتی ہیں :

تاروں بھرے آکاش کا منظر جیسے — پھولوں کی گھٹا برسے امڈ کر جیسے
تیوہار یہ کندن سے بدن لہرانے — پگھلے ہوئے سونے کا سمندر جیسے
لو دیتی سی کلیوں کی تمنائیں بھی — چھلکی کہاں وقت کی آشنائیں بھی
ملتے ہیں کئی دور کہ ہیں محو خرام — سیتائیں بھی، سلمائیں بھی، لیلائیں بھی

احسان دربھنگوی اپنی غیر معمولی تخلیقی قوت کی بنا پر نظم اور غزل دونوں اصناف میں کامیابی کے ساتھ اظہار کرنے پر قادر ہیں۔ ان کے کلام میں دل کشی اور توانائی ہے۔ حیات و کائنات کے مظاہر پر بھی ان کی نگاہ ہے اور عشق کے گوناگوں تجربات سے بھی وہ آشنا ہیں۔ "سوز دروں"۔ "التجا"، "پیمبر"، "مفلسۂ قوم" وغیرہ ان کی کامیاب نظمیں ہیں۔ غزلوں کے یہ اشعار اپنی تاثیر اور جذبے کی گیرائی کے باعث یاد رکھے جائیں گے .

وقت رخصت نہ مجھے دیدۂ تر سے دیکھو
اک نگہ کو نگہ کی نظر سے دیکھو

ہر ایک مقام سے گزرا ہوں بے نیازانہ — مگر یہ کوچۂ جاناں ہے، دیکھیے کیا ہو
میں زندگی سے بہت کچھ مطالبہ کرتا — تری نگاہ نے خاموش کر دیا مجھ کو
مانا کہ تھک چکے ہیں دم لیں تو کس طرح لیں — آگے بھی کارواں ہے، پیچھے بھی کارواں ہے

شوق کے ممکنات کو دونوں ہی آزما چکے — تم بھی فریب کھا چکے ، ہم بھی فریب کھا چکے
بڑی مشکلوں سے کاٹا ، بڑے کرب سے گزارا — ترے بعد کوئی لمحہ جو ملا کبھی خوشی کا

احسان دربھنگوی بھی ان شاعروں میں ہیں جو ناقدروں کی بے اعتنائی کا شکار ہوئے ۔

علقمہ شبلی بنگال کے ان نمایاں شاعروں میں ہیں ، جن کے نام اور کام سے پوری اردو دنیا آشنا ہے ۔ ان کی شاعری نے آب و رنگ زندگی اور اس کے متعلقات سے حاصل کیا ہے ۔ ان کے خیالات میں وسعت اور طرز اظہار میں تنوع ہے ۔ ان کے لہجے میں امید اور رجائیت ہے

تیرے رخ صبیح نے رنگِ سحر دکھا دیا
ظلمت شب نے بھی مجھے جینے کا حوصلہ دیا

ان کی آواز میں نرمی اور شائستگی ہے جو عصری مسائل اور زندگی کی تلخ حقیقتوں سے آنکھیں ملانے کے باوجود قائم ہے

آج کے ٹوٹتے لمحوں کی ہے دھڑکن جس میں — عصر نو کا وہ سلگتا ہوا لہجہ ہوں میں
ہوا تھا رات بتہ تیغ جو مرے ہاتھوں — اسے جو صبح کو دیکھا تو اپنا ہی سر تھا
جانے کب راہ گزر شوق کی ہوگی گل پوش — آج گزرے ہیں کئی آبلہ پا ، سنتے ہیں

علقمہ شبلی کی نظموں میں "آخری بس" ۔ "لفظ و معنی کا رشتہ" ۔ "خوشہ گندم" ۔ "انتظار" اور "کلکتہ" شاعر کے تجربوں کی صلابت اور قوت شعر گوئی پر مہر تصدیق ثبت کرتی ہیں ۔

سید سہیل واسطی کی عمر کا زیادہ عرصہ جمشید پور میں گزرا ۔ اپنی عمر کے آخری حصے میں انتہائی صبر آزما حالات میں وہ آسنسول آگئے تھے ۔ انھوں نے اپنے ادبی سفر کی ابتدا اپنے والد جناب امجد الغزی کی رہنمائی میں کی تھی جو فارسی اور عربی کے متبحر عالم تھے ۔ سہیل واسطی کو زبان و بیان اور فن عروض کے نکات سے کماحقہ واقفیت تھی ۔ ان کی ذہانت اور طباعی کے ساتھ فن کی جانب ان کا ریاض بھی ان کے کام آیا ۔ ان کی شاعری میں الفاظ ، جذبے اور خیال کے تابع نظر آتے ہیں ۔ رعنائی فکر ، معنی آفرینی اور جدت طرازی ان کے شعری جوہر کی اساس ہیں ۔ غم جاناں اور غم دوراں ان کی شاعری میں شیر و شکر ہوگئے ہیں ۔ وہ ہی بات نئے انداز سے کہنا چاہتے ہیں ۔ ان کی ساری شاعری جادہ عام سے الگ چلنے کی ایک کوشش ہے

کچھ نہ سمجھے گا کوئی لہجہ جاناں والا
بات دل والی ہے ، لہجہ غم دوراں والا

اس قدر بے تکلف ملاقات پھر کیا خبر ہو نہ ہو — آج رک جائیے آپ سے کچھ ہمیں مشورہ چاہیے
بات کی کہنگی اور فرسودگی کچھ نہیں واسطی! — ہاں ، مگر بات کہنے میں بھی اک نیا زاویہ چاہیے

نوازتا ہے ملا اختیار سب کو وہی
پھر اس کو اپنے پرائے میں امتیاز بھی ہے

شوقِ دیدار بھی ہے ، موقع دیدار بھی ہے — زندگی ان کے مگر بیچ کی دیوار بھی ہے

ہم کو دیکھنے والے دیکھتے ہیں یوں ہم کو
جیسے ہم نے برسوں سے آئینہ نہیں دیکھا

سہیل واسطی نے نظم نگاری میں بھی اپنے جوہر دکھائے ہیں۔ "بالاخانے کھلے ہوئے ہیں"۔ اور "فکر" ان کی جانی پہچانی نظمیں ہیں۔ ان کا مجموعہ م "سطح آئینہ" ان کے انتقال کے بعد شائع ہوا۔

قیصر شمیم نے چھٹی دہائی کے اوائل میں حمید انگسی کے نام سے لکھنا شروع کیا تھا۔ اور انجمن ترقی پسند مصنفین کے جلسوں میں باقاعدگی سے بحث کرتے تھے۔ انھیں دنوں ان کی ایک غزل "شاہراہ" میں چھپی تھی، جس کا مقطع تھا

چھٹ گئی شاعری کی مشق حمید ہائے کم بخت امتحان ۔ رکا

وہ ان دنوں کالج کے طالب علم تھے۔ پھر قیصر شمیم کے نام سے متعارف ہوئے اور تھوڑے ہی عرصے میں انھوں نے اردو دنیا کو اپنی جانب متوجہ رلیا۔ ان کے یہاں خیال کی تازگی بھی ہے اور اسلوب کی نادرہ کاری بھی۔ انگریزی، ہندی اور بنگلہ ادبیات پر ان کی گہری نگاہ ہے اور ان زبانوں سے نھوں نے خاطر خواہ استفادہ کیا ہے۔ انھوں نے غزلیں، نظمیں، گیت سب ہی لکھے ہیں۔ گیتوں میں ایک خاص لوچ اور نرمی ہے۔ انھیں مغربی بنگال کا احد گیت نگار سمجھنا چاہیے۔ زندگی کی ناکامیوں کے باوجود ان کے اشعار میں رجائیت ہے۔ "ساعتوں کا سمندر" ان کا مقبول مجموعہ کلام ہے۔ مغربی نگال میں جدید رنگ سخن اختیار کرنے والوں میں انھیں اولیت حاصل ہے اور انھوں نے بنگال کی نئی نسل کو متاثر کیا ہے۔ آئینہ۔آب ۔ "تاش کے پتے" "اسپ تازی شدہ مجروح"۔ "امکانات کا قتل" ان کی کامیاب نظمیں ہیں۔ اپنی ایک نظم "بتیسویں پہاڑ کٹنے کے بعد" میں وہ کہتے ہیں

لیکن وہ آرزو، وہ طرحدار آرزو
بتیسویں پہاڑ کے کٹنے کے بعد ہی
گھبرا کے پوچھتی ہے کہ کیا آگے جاؤ گے
کیا دوسرے پہاڑ پہ تیشہ چلاؤ گے
کب تک سیہ پہاڑ سے پیچ لڑاؤ گے؟
فرہاد کا یہ فرض کہاں تک نبھاؤ گے؟
حسن سحر کی تلاش ہے، وہ سحر پاؤ گے؟
ان ناگہاں سوالوں پہ پل بھر رکا ہوں میں
پھر مسکرا کے تیشہ لیے چل پڑا ہوں میں

ان کے اشعار کی تازہ کاری ان کے اپنے تجربے، مشاہدے اور احساس کی پروردہ ہے۔ وہ زبان و بیان کی لطافت، شستگی اور دل آسانی کا پورا خیال رکھتے ہیں

سانسا سرد ہوا کا ہوگا دھوپ اوڑھے ہوئے چلنا ہوگا
ناؤ ٹوٹی ہوئی ہے تو تختہ لے لے راہ میں پھر کوئی دریا ہوگا
زندگی ان دنوں کیا ہے قیصر! صحیلے والا سمجھتا ہوگا

رونق نعیم ان شاعروں میں ہیں جن کے نزدیک فن شاعری عبادت کا درجہ رکھتا ہے۔ وہ خود آگاہ بھی ہیں اور گرد و پیش کے حالات سے آشنا بھی بنگلہ شعر و ادب سے براہ راست رابطہ رکھنے کے باعث اس کی شاعری کو ایک خاص رنگ و آہنگ ملا ہے۔ ان کی خاص علامتوں میں ہوا، درخت، سایہ اہمیت رکھتے ہیں۔ بنگال کے سرسبز علاقے، ناریل کے درختوں کے سلسلے، چھوٹی موٹی ندیاں اور ان پر بنے ہوئے ہلکے پھلکے پل، رونق نعیم کی شاعری کے لیے سامان تحریک بنتے ہیں۔ ان کی بعض نظموں کے عنوانات یہ ہیں۔ پل، نیم کا پیڑ، ناریل کے درختوں سے، بے نام سائے، شبدوں کے پیڑ، پیلے

پتے، ڈائری کا ایک ورق، میں اسے کہہ چکا ہوں۔ وغیرہ۔ ایک نظم "چاقو" کا ابتدائی حصہ ملاحظہ فرمائیے

سنو
ہوا کے شفیق جھونکو!
کشادہ دل بادلوں کے ٹکڑو!
ندی کی معصوم نیک خصلت جوان موجو!
بچھر کے شعلوں کے ناگ ہر سو
ہرے ہرے رس بھرے نظاروں کو ڈس رہے ہیں
یہاں تو صدیاں گزر گئی ہیں، مگر ابھی تک
لطافتوں پر کثافتوں کے رذیل پتھر برس رہے ہیں

ان کے لہجے میں ایک دل گرفتگی اور گلوگیری ہے، جو غزلوں میں نمایاں ہو جاتی ہے

ہم کوئی برگِ خزاں ہیں کہ ہمیں
جس طرف چاہو اڑا لے جاؤ

پرچھائیوں کی بھیڑ تھی اپنا کوئی نہ تھا
میلے میں مجھ کو ڈھونڈنے والا کوئی نہ تھا

ایسی بھی ایک شام نظر سے گزر گئی
سونا تھا آسمان، پرندہ کوئی نہ تھا

ایسا کوئی نہیں جو مجھے کھول کر پڑھے
میں خط ہوں اک لفافے کے اندر پڑا ہوا

اویس احمد دوراں ہرچند اب بنگال میں نہیں رہتے، لیکن ان کی شاعری بچپن اور شباب کے دور سے اسی ریاست میں گزری ہے، اور مجھے یہ کہنے ں کوئی تکلف نہیں ہے کہ ان کی شاعری کا سب سے خوبصورت حصہ جو نکہت و نغمہ اور شباب و انقلاب سے عبارت ہے، اسی سرزمین کی پیداوار ہے۔ ے کے مجموعہ کلام "لمحوں کی آواز" کے بیشتر مشتملات کلکتہ ہی کے زمانے کی یادگار ہیں۔ دوراں کے کلام میں ایک بے تکلفی اور روانی ہے۔ وہ الفاظ اور ایک کو کبھی بوجھل نہیں ہونے دیتے۔ ان کے خیالات ایک تیز رو لیکن پرسکون ندی کی طرح رواں رواں رہتے ہیں۔ وہ شعر گوئی کی بھرپور لاحیت رکھتے ہیں۔ ایک خاص طرح کی غنائیت اور نغمگی ان کے کلام میں پائی جاتی ہے۔ وہ اشتراکیت کے علمبردار ہیں اور اپنے نظریاتی موقف کو اپنے م سے کبھی جدا نہیں ہونے دیتے۔ کاش وہ بلند بانگ تبلیغی شاعری سے اپنے آپ کو بچا سکتے اور اس طرح کی شاعری کو مناسب تب و تاب بخشتے!

پہلے پہل جب امبر کے نیچے ہم تم ملے تھے
خوشبو اڑی تھی، شمعیں جلی تھیں، غنچے کھلے تھے

کل ہی کی تو ہے یہ بات یارو، قاتل کے ڈر سے
ہر کوئی چپ تھا، پہرہ لگا تھا اور لب سلے تھے

کچھ دن یہاں بھی ظلم و ستم کی آندھی چلی تھی
کچھ دن یہاں بھی ہم جیسے لوگوں کے دل جلے تھے

کتنی سہانی بنگال کی وہ شام حسیں تھی
ہگلی کے رنگیں ساحل پہ دوراں جب وہ ملے تھے

کلکتہ کے نوجوان شاعروں میں کسی زمانے میں اصغر راہی کو بڑی مقبولیت حاصل تھی، وہ عدم کے رنگ میں چھوٹے چھوٹے مصرعوں کی غزلیں ا کرتے تھے۔ ان کی زبان میں سادگی، شیرینی اور سرمستی تھی۔ وہ بنگلہ دیش چلے گئے تھے، لیکن ان کی غزل گوئی نے کلکتہ میں ہی بال و پر نکالے تھے۔ ان

بقیہ ص ۴۵ پر

تبصرۂ کتب

○ تبصرے کے لیے ہر کتاب کی ۲ جلدیں آنا ضروری ہیں

بہار میں اردو کے فروغ کے لیے جابر حسین صاحب کی کوشش

نام کتاب — دستاویز
(اردو زبان اور رسم الخط سے متعلق)
مرتب — جابر حسین (کارگزار چیرمین بہار قانون ساز کونسل
صفحات — ۱۷۵
کاغذ۔ کتابت۔ طباعت معیاری
رعایتی قیمت — ۲۵ روپئے
ملنے کا پتہ — اردو شعبہ بہار قانون ساز کونسل۔ پٹنہ
تبصرہ نگار — رئیس الدین فریدی

۸۰۔۱۹۸۱ میں اردو بہار کی دوسری سرکاری زبان تسلیم کی گئی لیکن سرکاری دفاتر میں اس کی ترویج کی طرف برائے نام ہی توجہ ہوئی۔ خود اسمبلی اور کونسل میں بھی یہی حالت رہی۔ اپریل ۹۵ء میں جابر حسین کا تقرر کونسل کے کارگزار چیرمین کی حیثیت سے ہوا تو کونسل کے دفاتر میں اردو کے استعمال اور ترویج کے لیے ان کی رہنمائی اور ہدایت پر ٹھوس اقدامات کا سلسلہ شروع ہوا۔ تمام کاغذات جو پہلے صرف ہندی میں جاری کیے جاتے تھے اردو میں بھی جاری ہونے لگے۔ پھر اردو کے لیے ایک بااختیار علاحدہ ڈائرکٹریٹ کا قیام بھی عمل میں آگیا۔ سرکاری اردو مشاورتی کمیٹی میں بھی اردو کے مسائل اور ان کی پدبجائی کے بارے میں طویل اور پرمغز مباحث ہوئے جن میں اردو اور ہندی میں پیدا ہونے والی دوری کو کم کرنے اور دونوں کو قریب لانے کے بارے میں مفید مشورے بھی سامنے آئے۔ قومی یک جہتی اور علوم و فنون کی ترقی کے لیے اردو سے جداگانہ طور پر کام لینے اور اسے ترقی دینے کی تجویزیں بھی پیش کی گئیں یا ان سے اتفاق کیا گیا۔ اس لیے اردو کمپیوٹر سیکشن کا قیام بھی عمل میں آگیا۔ ۳۰/دسمبر ۹۵ء ہی سے بہار گزٹ ہندی کے ساتھ اردو میں بھی چھپنے لگا۔ اہم رپورٹوں کا ہندی کے ساتھ اردو میں بھی ترجمہ ہونے لگا اور کئی اہم رپورٹیں جن میں بھاگل پور کے فرقہ وارانہ فساد کے تحقیقاتی کمیشن کی رپورٹ، فکر اقلیتی فلاح کی رپورٹ، خواندگی کی تحریک کی رپورٹ وغیرہ کے اردو تراجم کونسل کے ذخیرے میں شامل ہو چکے ہیں۔ یہ کام اردو شعبے کے کارکنوں نے بڑے خلوص، مستعدی اور قابلیت سے انجام دیے ہیں۔

جابر حسین صاحب کی ماہرانہ رہنمائی میں بہار قانون ساز کونسل نے گاندھی جی کی ۱۲۵ویں سالگرہ کے موقعہ پر کونسل کے میگزین "ساکشیہ" کا ایک خاص مہاتما گاندھی نمبر بھی شائع کیا۔ پھر اسی رسالے کا شاندار غالب نمبر بھی شائع کرایا۔ اس سے پہلے کونسل کی طرف سے تلسی جینتی کی تقریبات کا بھی اہتمام ہوا تھا۔ غالب کے دو سو سالہ یوم پیدائش کی تقریبات کا سلسلہ ابھی جاری ہے اور ان کے اختتام پر ایک لاکھ روپئے کا غالب ایوارڈ بھی کسی مستحق غالب پسند کو دیا جائے گا۔ ان کا ایک اور قابل قدر اور لائق کارنامہ بہار قانون ساز کونسل کی ایک بھاشا کمیٹی کے تعاون سے اردو تنظیم کے زیر اہتمام ایک ورکشاپ کا انعقاد بھی ہے جس میں اردو کی ترقی کے لیے ایک پانچ سالہ منصوبہ مرتب کیا گیا اور اسے "سماجیاتی تقاضوں کا پس منظر اور اردو کی عملی ترجیحات" کے عنوان سے مرتب کرکے ایک عالمانہ اور فاضلانہ دیباچے کے ساتھ کونسل میں پیش کیا گیا اور اس پر سیر حاصل مباحثہ کے بعد اسے منظور کر لیا گیا تاکہ اردو کامل اعتماد اور عملی اقدامات کے ساتھ اکیسویں صدی میں داخل ہو۔

مزید خوشی کی بات یہ ہے کہ بہار کے وزیر اعلیٰ لالو پرشاد یادو جی بھی اس کام میں صاحب کی سعی بلیغ سے اظہار ہمدردی اور تعاون کر رہے ہیں۔ یہ بہت مختصر سا خاکہ ان کوششوں کا ہے جو جابر حسین صاحب کی توجہ اور رہنمائی سے بہار کی کونسل میں ہوئی ہیں اور جن سے نہ صرف بہار بلکہ سارا ملک بھی فائدہ اٹھا سکتا ہے اور بہار کونسل میں جو شمع روشن ہوئی ہے اس کی روشنی سارے ملک میں پھیل سکتی ہے اور اس پر وہ اور ان کے حامی اور ساتھی واقعی مبارک باد کے مستحق ہیں جن میں صرف مسلمان ہی نہیں کافی ہندو بھی ہیں۔ جہاں تک جابر حسین کی کوشش کا تعلق ہے اسے فرد سے زیادہ کسی ایک نام ہاد ادارے کی مجموعی کوشش پر بھی فوقیت دی جا سکتی ہے۔

دستاویز ان ہی کوششوں کا دستاویزی ثبوت ہے جس سے ہر ادارہ استفادہ کرکے راہ عمل تلاش کر سکتا ہے۔ پانچ سالہ منصوبے کے بارے میں انہوں نے بہی خواہان اردو سے مشورے بھی طلب کیے ہیں جو یقیناً ان کو میں ملیں گے۔ اس سلسلے میں ہمارا مشورہ صرف یہ ہے کہ اردو کے تحفظ اور ترویج کے لیے جو کوشش بھی ہوگی اسے سند قبولیت حاصل ہوگی اور اس

وقت بہترین مشورہ یہی ہو سکتا ہے کہ اردو کو جو کچھ ملا ہوا ہے اس پر گرفت مضبوط کی جائے - مزید ترقی اور بہتری کے لیے جو کچھ مل سکتا ہے وہ حاصل کیا جائے اور عملی تجربے سے کسی منصوبے میں جو خامیاں پائی جائیں ان کو ہمدردی کے ہوشمند حامیوں کے تعاون سے دور کرنے کی کوشش جاری رکھی جائے - لیکن یہ کام اسی وقت ہو سکتا ہے جب اردو کے حامی خواب غفلت سے بیدار ہو کر جابر حسین صاحب کی جدو جہد میں دل و جاں سے شریک ہو جائیں -

بہار حسین آبادی کے مرثیے

جابر صاحب کی خدمت اردو صرف بہار قانون ساز کونسل تک ہی محدود نہیں ہے وہ اردو مرکز اور بہار فاؤنڈیشن کے ذریعے بھی اردو کی خدمت کر رہے ہیں جس کا تازہ ثبوت بہار حسین آبادی کے سات مرثیوں کی مختصر کتابوں کی صورت میں اشاعت ہے - بہار مرحوم اس صدی کے ممتاز مرثیہ گو تھے اگرچہ انہوں نے اس فن میں انیس اور دبیر جیسی شہرت حاصل نہ کی - ان کے علوئے مرتبت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ علامہ جمیل مظہری بھی ان کے کمال مرثیہ گوئی کے مداح تھے - ان کے متعلق خود جابر صاحب کی یہ رائے بالکل درست معلوم ہوتی ہے کہ "بہار حسین آبادی نے اپنے مرثیوں میں نہ کوئی کمزور یا ضعیف تاریخی واقعہ نظم کیا ہے نہ جوش عقیدت میں مبالغہ آرائی کی سرحد تک پہونچے ہیں - انہوں نے مرثیے کو مذہبی عقائد کے حصار سے نکال کر ادب اور تنقید کی منزلوں تک پہونچا دیا"-

اردو مرکز اور بہار فاؤنڈیشن نے بہار مرحوم کے سات مرثیے پورے حسن صوری کے ساتھ قمر جنان ، کیمیائے سخن ، سرمایہ تحسین ، خاصان خدا ، ابن رسا ، گنج شہیداں اور نمود سخن کے عنوانوں کے ساتھ شائع کئے ہیں اور اسی طرح ایک مرثیہ منظوم لال ونشی کا بھی شائع کیا ہے ان میں سے ہر ایک کی قیمت دس روپئے ہے اور ملنے کا پتہ - بہار فاؤنڈیشن لوہیا نگر اور بک امپوریم سبزی باغ پٹنہ - یہ محرم کی مجلسوں میں بہت کار آمد ثابت ہو سکتے ہیں

ooo

نام کتاب	پتھروں کے شہر میں (گوالیار کا صد سالہ شعری ادب)
مرتب	شکیل گوالیاری
تقسیم کار	آزاد بکڈپو ، مسجد فراش خانہ لشکر گوالیار ۴۷۴۰۰۱

مبصر ڈاکٹر ظفر عمر قدوائی

کتاب جیسا کہ اس کے نام سے عیاں ہے گوالیار کا سو سال کی شعری سرگرمیوں کا جائزہ ہے - اس میں مرتب نے ۵۹ شعراء کے ذکر کو شامل کیا ہے جن میں ۲ شاعرات اور ۱۱ ہندو شعراء ہیں - ان کے علاوہ موتی خاں چونچ ، نظام ظرف اور فرید الدین دم کو انھوں نے ہزل گو کی حیثیت سے متعارف کرایا ہے - لیکن ان ہزل گو شعراء کے حالات نہایت اختصار سے درج کرتے ہوئے ان کا کوئی ایک شعر بھی بطور نمونہ نہیں دیا ہے - کتاب ۲۰۷ صفحات پر محیط ہے - جس کے صفحہ ۱ سے ۸ تک مرتب کا عرض حال ہے صفحہ ۹ تا ۱۴ گوالیار کا تعارف ہے - ۱۵ تا ۱۹ صفحات پر گوالیار کا سیاسی اور سماجی پس منظر ہے اور صفحہ ۲۰ سے ۲۰۷ تک گوالیار کا شعری اور ادبی منظر نامہ ہے -

مرتب نے اس کتاب میں گوالیار جیسے سنگلاخ زمین پر بسے ہوئے تاریخی شہر کی ادبی فضاؤں کا جائزہ لیتے ہوئے اس سارے منظر کو نہایت تفصیل سے پیش کیا ہے جس کی بناء پر یہاں پتھروں سے نباہ کرنے اور فنون لطیفہ کو پروان چڑھنے کے مواقع فراہم ہوئے - یہاں کے صوفی سنت ، سپہ سالار اور راگ رنگ کے علمبرداروں کا بھی انھوں نے ذکر کیا ہے - ان سب ہی کے ادکار سے مرتب نے یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح ان سب ہی نے اپنے اپنے طور پر باہمی میل جول ، محبت و یگانگت کا گوالیار کی فضاؤں میں رس گھولا کہ اخوت و یکجہتی یہاں کی تہذیب و معاشرت کی علامت بن گئی - مرتب نے ایسے سبھی حالات کو یکجا کر کے کتابی شکل دے دی ہے - اس کتاب کی فہرست میں شکیل نے شعراء کو شامل کیا ہے ان کے علاوہ گوالیار کے شعری اور ادبی سفرنامے میں چند اور نامور شعراء کا انھوں نے ذکر کیا ہے جو بے لوث پرورش لوح و قلم کرتے رہے ہیں - اور جن کی استوار کردہ راہیں بعد کے رہروان راہ ادب کے لیے مشعل راہ ثابت ہوئیں - بادی النظر میں یہ کتاب محض ایک تذکرہ ہے جس میں چند شعراء کے مختصر حالات اور ان کے کلام کے نمونے درج ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ شکیل گوالیاری کی یہ کاوش بحیثیت مجموعی گوالیار شناسی کے باب میں ایک مختصر ہی سہی دستاویزی حیثیت کی حامل ہے -

عہد حاضر کے تناظر میں یہ حقیقت اب صیغہ راز میں نہیں ہے کہ اردو ایک ایسے مخدوش دور سے گزر رہی ہے کہ اس کا مستقبل قطعی غیر یقینی محسوس ہوتا ہے - (اس کے اسباب و علل یا تدارک سے بحث کا یہ موقع نہیں ہے) ایسے حالات میں شکیل نے اپنے وطن کے شعراء کا تذکرہ قلمبند کر کے ان کی حیات بعد ممات کا سامان فراہم کر دیا ہے - اس کے علاوہ تذکروں کا ایک

بڑا فائدہ یہ بھی ہے کہ ان سے صرف یہی نہیں کہ ہم کسی ایک دور یا مقام کی شعری اور ادبی خدمات کا ادراک حاصل کرتے ہیں۔ بلکہ اس کی روشنی میں مستقبل کی تشکیل و تعمیر کے لیے ہم کو تحریک فکر و عمل بھی ملتی ہے۔ اردو کی تیرہ بختی کے اس زمانے میں جب کہ یہ محل حد سے فزوں بے توجہی یا بے اعتنائی کا ہی شکار نہیں ہے بلکہ اسے اپنی بقاء کے لیے نت نئی سازشوں اور حملوں سے بھی محفوظ رہنے کی سبیل کی ضرورت ہے۔ شکیل نے ایک خطہ خاص کا شعری و ادبی جائزہ لے کر ایک بڑی ادبی خدمت انجام دی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ تذکرے ہی وہ وسیلہ ہیں جو حال کو ماضی سے وابستہ کرتے ہیں ان کے عدم وجود کی بناء پر رفتہ رفتہ ہر ماضی حال سے لاتعلق ہوتا رہے گا اور اس طور ہماری گرانقدر ادبی اور تہذیبی اساس بھی گردش لیل و نہار میں پھنس کر معدوم ہو جائے گی۔

کتاب میں مضطر خیرآبادی، نارائن پرساد مہر، جاں نثار اختر، غنی گوالیاری، فیاض گوالیاری، رضا قریشی، نور بخش مشتاق، ڈاکٹر اختر نظمی، رؤف جاوید وغیرہ کے حالات تفصیل سے درج ہیں جب کہ درحالوانی، بحر گوالیاری، سید ممتاز علی تصور، استاد رفیع گوالیاری، امر گوالیاری، حسن خاں خلش، شمس گوالیاری، خوشتر گوالیاری، مضطر گوالیاری وغیرہ کے اذکار اتنے اختصار سے ہیں کہ تشنگی ذوق رفع نہیں ہو پاتی بلکہ اس میں اور اضافہ ہی ہوتا ہے۔ حکیم گوالیاری اور عبدالاحلی کے اذکار دلچسپ اور ان کی رنگین زندگی کی داستان لیے ہوئے ہیں۔ شکیل نے اپنے والد عبدالکریم شوق کے بیان میں جزئیات نگاری سے کام لیتے ہوئے اپنے رخش قلم کی باگ پر اپنی گرفت ڈھیلی کر دی ہے جو بھلی نہیں لگتی۔

کتاب کی زبان صاف سادہ اور رواں دواں ہے۔ کہیں کہیں تذکیر و تانیث کی غلطیاں رہ گئی ہیں۔ اس کی غلطیاں کاتب صاحب کی کرم فرمائیوں کا نتیجہ کہی جا سکتی ہیں لیکن شکیل گوالیاری اس سے بری الذمہ نہیں ہو سکتے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسودے پر نظر ثانی کی انھوں نے کوئی ضرورت نہیں محسوس کی ہے ورنہ شاید یہ داغ نہ رہ جاتے۔ بہ ایں ہمہ اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ یقین ہے کہ شائقین ادب اس کتاب کی پذیرائی کریں گے۔

○○○○○

نام کتاب ہجرتوں کے کرب
شاعر عاصی کاشمیری (برطانیہ)
ناشر دانش کدہ پبلشرز
۱۹۹ ایف ۲ ۔ میرپور، آزاد کشمیر
مبصر ڈاکٹر ظفر عمر قدوائی

زیر نظر کتاب عاصی کاشمیری کی ۱۴۱ غزلوں کا مجموعہ ہے۔ اس کے کل صفحات ۱۵۲ ہیں۔ مجموعہ میں شامل ۱۱۷ غزلیں صرف پانچ اشعار کی ہیں بقیہ ۲۴ غزلوں میں چھ چھ اشعار ہیں۔ اس التزام کو ہم موصوف کی خود اعتمادی یا خود انتقادی کہہ سکتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ عاصی نے اپنے پسندیدہ اشعار کا انتخاب خود ہی کیا ہے۔ کتاب میں دیباچہ یا پیش لفظ بھی نہیں ہے جس سے شاعر کے بارے میں یا اس ماحول اور محرکات کا پتہ چلتا جس میں ان کی تشکیل فکر و فن ہوئی ہے۔ اس طرح ان کے فنی یا تخلیقی ارتقا کا بھی پتہ نہیں چلتا۔

غزلوں میں عام طور پر رومانی اذکار، حسن و عشق کی چھیڑ چھاڑ، ہجر و وصال کے بیانات ہیں احباب کے سلوک اور وطن چھٹنے کا قلق انھیں بے چین کرتا ہوا شدت سے محسوس ہوتا ہے۔

اپنی خوشی سے ہم نے تو ہجرت نہ کی قبول
مجبور ہو کے اپنا وطن چھوڑنا پڑا

چنانچہ یہ عالم ہے کہ ع

خوں رلاتی ہے مجھے اپنے وطن کی خوشبو

اور یہ شدت اس وقت اور بڑھ جاتی ہے ع

جب بھی ملتا ہے وطن سے کوئی آنے والا

سماج میں قدم قدم پر بکھری ہوئی تلخ سچائیوں کو انھوں نے ایسے سلیقہ سے موضوع شاعری بنایا ہے کہ حس سے ان کی فنی عظمتوں کا احساس ہوتا ہے۔

خلوص دل سے ملتے ہیں بظاہر
پس پردہ عداوت ہو رہی ہے

بات کرنے کا سلیقہ بھی نہیں تھا جن کو
وہ بھی اب گرمیٔ گفتار تک آپہونچے ہیں

یہ کیا ہوا کہ صحن میں دیوار اٹھ گئی
جھگڑا تو بھائی بھائی میں تقسیم زر کا تھا

ملے دو وقت کی روٹی تو بس غنیمت ہے
سفید پوشی میں کتنی کمائیاں ہوں گی

عاصی اپنے دل میں زمانے کا درد سمیٹے ہوئے ہیں اور ان سارے اذکار کو انھوں نے نہایت صاف وسادہ زبان اور اکثر برجستگی سے معمور انداز میں بیان کیا ہے جس سے ان کی مہارت اور چابکدستی کا پتہ چلتا ہے وہ کسی حال میں سختی حالات سے ہراساں یا مایوس نہیں ہوتے بلکہ ہر ہنگام تنگ و ترش میں بھی وہ بیم و رجا کا پہلو نکال لیتے ہیں۔

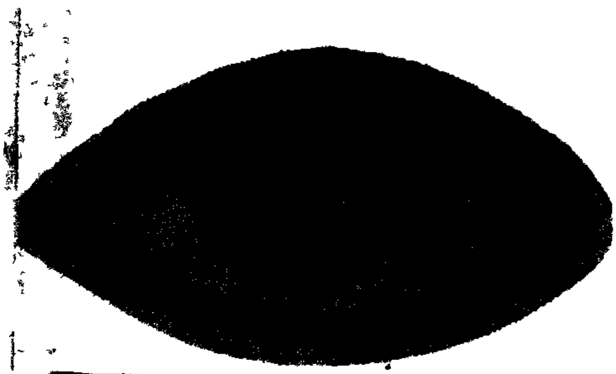
اگرچہ ماحول پرخطر ہے مگر نہیں اس قدر نہیں ہے
یہ جانتا ہوں کہ صبح ہوگی غبار شب معتبر نہیں ہے

عہد حاضر کی سب سے بڑی ضرورت یعنی اتحاد باہمی، اخوت یا بھائی چارگی عام کرنے کی یہ کوشش بھی دیکھیے۔

جو ہوسکے تو زمینوں میں پیار کاشت کرو
اگا رہے ہو جو نفرت کے دھان رہنے دو

شاعر یا ادیب اپنے عہد کا نباض ہوتا ہے۔عاصی اپنے اشعار کے توسط سے اس قول کے مصداق ہیں - انھوں نے غم جاناں کے ساتھ غم دوراں کو موضوع شاعری بنایا۔ اکثر اشعار میں اشارے اشارے میں دعوت فکر و عمل بھی دیتے ہیں لیکن اس احتیاط سے کہ ان پر ناصح ہونے کا الزام نہیں عائد کیا جاسکتا - اکثر اشعار میں صنائع لفظی و معنوی وغیرہ بھی نظر آتے ہیں جو ان کی غزلوں کو اور خوبصورت بناتے ہیں۔ بحیثیت مجموعی شاعر تو مسائل زمین سے بحث کرتا ہے لیکن اس کی فکر رسا اسے چرخ چہارم کی سیر کراتی ہے اس طرح حسن بلندیوں تک اس کے تخیل کی جولانگہ ہوتی ہے وہیں تک اس کی شاعری بھی ہوسکتی ہے "ہجرتوں کا کرب" ایسا ہی مجموعہ ہے جو یقیناً مقبول عام ہوگا

CLOSING_MARK



نیاز فتح پوری نمبر (شمارہ جنوری ۹۷ء) کی تیاریوں میں بے پناہ مصروفیت کے سبب اس شمارے کو نومبر اور دسمبر ۹۶ء کا مشترک شمارہ بنانا پڑا۔ امید ہے عید نمبر کے بعد سے کوئی شمارہ مشترک نہ ہوگا۔ اس سلسلے میں درپیش مشکلات کا ذکر عید نمبر (فروری ۹۷ء) میں کیا جائے گا تاکہ قارئین ان سے واقف ہو جائیں۔ (ادارہ)

بقیہ مغربی بنگال میں اردو شاعری......

کی غزلوں کا عمومی رنگ یہ ہے

ہنسی ہنسی میں مری آنکھ نم نہ ہوجائے
حضور دیکھیے ، اظہار غم نہ ہوجائے
کھنچے کھنچے سے نہ رہیے نیاز مندوں سے
جبین شوق کہیں اور خم نہ ہوجائے
کسی کی بارگہِ ناز ڈھونڈتا ہوں میں
مری نماز زمین حرم نہ ہوجائے
غزل تو راہی ترنم سے خوب پڑھتے ہو
کسی حسیں کی نگاہ کرم نہ ہوجائے

جاری

احوال و اخبار

سرونج میں شاندار جلسہ و مشاعرہ

گزشتہ دنوں سہ ماہی "انتساب" سرونج کے تیرہ برس مکمل ہونے پر سرونج میں بھوپال کے شاعر نسیم انصاری کی صدارت میں ایک شاندار ادبی جلسہ و مشاعرہ منعقد کیا گیا۔ سہ ماہی انتساب سرونج کے لیے ڈاکٹر سیفی سرونجی کی مسلسل جدوجہد کا ذکر کرتے ہوئے مہمان خصوصی حاجی انیس دہلوی (مدیر فلمی ستارے دہلی) نے فرمایا کہ اب یہ بات ساری اردو دنیا تسلیم کر چکی ہے کہ سرونج اور ڈاکٹر سیفی سرونجی لازم و ملزوم ہو گئے ہیں۔

ادارہ انتساب سرونج کے زیر اہتمام نئی نسل کے نمائندہ جدید شاعر سلیم انصاری کے مجموعہ کلام "فصل آگہی" اور مدھیہ پردیش کے قابل ذکر شاعر شکیل گوالیاری کی کتاب "پتھروں کے شہر میں" کی رسم رونمائی حاجی انیس دہلوی کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ سلیم انصاری و شکیل گوالیاری کے فکر و فن پر ڈاکٹر خالد محمود نے سیر حاصل تقریر کی۔

بعد ازاں منعقدہ کل ہند مشاعرے میں جناب نسیم انصاری، ظفر صہبائی، ڈاکٹر خالد محمود، شاہد میر، اقبال مسعود، شکیل گوالیاری، سلیم انصاری، وقار قریشی، بشر صہبائی، شاداں سرونجی، سیفی سرونجی، مسرور علی تاج، ظفر سرونجی، نفیس تقی، انجم سرونجی، ڈاکٹر صغیر شاد، مضطر نظامی اور اقبال منظر کے علاوہ سرونج کے قابل ذکر شعراء نے اپنا کلام سنایا۔ نظامت حفیظ عارف نے انجام دی۔ مہمان خصوصی حاجی انیس دہلوی نے سرونج کے ادب دوستوں، خصوصاً پیارے میاں نادان اور قدیر صحرا کا ذکر کیا۔ ڈاکٹر خالد محمود نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

مرسلہ سلیم انصاری، جبلپور

ΟΟΟΟΟ

"اردو تعلیم کے مسائل"

حلقہ فکر و فن کا ایک اہم مذاکرہ

پروفیسر ظفر احمد نظامی (ڈائرکٹر اکیڈیمک اسٹاف کالج، جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی) کی صدارت اور عطا عابدی کی نظامت میں مورخہ ۹/ جون ۱۹۹۶ء کو اکیڈیمک اسٹاف کالج میں حلقہ فکر و فن دہلی کے زیر اہتمام اردو تعلیم کے مسائل پر ایک اہم مذاکرہ اور شعری نشست ڈاکٹر محبوب راہی (اکولہ مہاراشٹر) اور قاضی حسن رضا (گڑگاؤں، ایم۔پی) کے اعزاز میں منعقد ہوئی۔ قاضی حسن رضا کو "مثالی معلم" ہونے کا صدر جمہوریہ ہند کی جانب سے "یوم اساتذہ" کے موقع پر ۵/جون کو ایوارڈ ملا ہے جو دس ہزار روپئے نقد، ایک تمغہ اور ایک شال پر مشتمل ہے۔ ڈاکٹر محبوب راہی بھی چند سال قبل یہ ایوارڈ حاصل کر چکے ہیں۔ مذاکرہ میں حصہ لیتے ہوئے قاضی حسن رضا نے بتایا کہ اردو تعلیم کے تعلق سے اردو اساتذہ اور ادباء خود ایک مسئلہ ہیں۔ وہ اپنے بچوں کو اردو سے نابلد رکھ رہے ہیں۔ جہاں یہ حالت ہو وہاں ان کی کتابیں کل کون پڑھے گا؟ انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ اردو کو خواص کے بجائے عوامی تحریک کی شکل دی جائے۔ ڈاکٹر محبوب راہی کا خیال تھا کہ بنیادی مسئلہ معیار کا ہے۔ اردو اسکولوں کے پست معیار کی وجہ سے اب بچوں کا داخلہ لوگ وہاں پسند نہیں کرتے۔ ایک اہم اور بڑا مسئلہ ان کی نظر میں ٹیچر بھی ہیں جو اپنے سبجیکٹ میں محنت نہیں کرتے۔ اردو کے ٹیچر رسالہ نہیں خریدتے۔ وہی لوگ رسالہ خریدتے ہیں جو چھپتے بھی ہیں۔ اردو تعلیم کا معیار بڑھے تو اس کی طرف لوگ رجوع بھی کر سکتے ہیں۔ پروفیسر عنوان چشتی نے اپنی طویل تقریر میں اردو تعلیم کے مسائل کا ذکر کرتے ہوئے اردو رسائل کی زندگی اور اس کے قتل کیے جانے کے عوامل پر روشنی ڈالی۔ ان کا کہنا تھا کہ اردو والے اردو کے دشمن نہیں ہیں۔

پروفیسر احتشام الواسع نے کہا کہ اردو والے اردو کے دشمن نہیں ہیں لیکن ان کا رویہ اردو کے ساتھ بہت زیادہ دوستانہ بھی نہیں ہے۔ ہم عملی سطح پر اردو دوستی والا رویہ اختیار نہیں کر رہے ہیں۔ پروفیسر ظفر احمد نظامی نے اپنی تقریر میں یہ سوال کیا کہ اردو کے مسئلے پر ہم حکومت ہی کی طرف کیوں دیکھتے ہیں؟ خود اپنے گھر سے کام شروع کیوں نہیں کرتے؟ اس سے ہمیں کس نے روکا ہے؟ ہم اگر ایک آدمی کو بھی ایک ماہ میں یا ایک سال میں اردو سکھانے یا اس کی سہولت پیدا کرنے کی ذمہ داری لیں تو مسئلہ کا بہت حد تک تدارک ہو سکتا ہے۔ حفیظ محمود بلند شہری نے مقررین کی باتوں کو سراہتے ہوئے کہا کہ ہر کام میں نیت کا معاملہ بہت ضروری ہے۔ بغیر خلوص کے کچھ نہیں ہوگا۔ لہٰذا ہم خلوص نیت کے ساتھ کام کو آگے بڑھائیں۔

شعری نشست میں مختلف شعراء نے اپنے اپنے کلام سے نوازا۔ ان شعراء میں مہمان شعراء قاضی حسن رضا اور ڈاکٹر محبوب راہی کے علاوہ پروفیسر عنوان چشتی، یوسف پاپا، ڈاکٹر خالد محمود، ڈاکٹر شبیر رسول، عزیز گھردی، سطوت

رسول، شہباز ندیم ضیائی، عطا عابدی، پروفیسر تنویر چشتی، اسرار جامعی، حفیظ محمود، راشد انور راشد، عادل حیات، سرور الہدیٰ، سکندر عاقل کے نام قابل ذکر ہیں - ان کے علاوہ اس مذاکرہ و نشست میں ڈرامہ نگار و اسکرپٹ رائٹر محمد علیم، صحافی شمشاد عالم، اسپورٹس رائٹر انجینئر فیروز احمد، شفیق الاسلام عمری و دیگر کئی اہل ذوق حضرات شریک ہوئے -

مرسلہ حلقۂ فکر و فن، نئی دہلی

ooooo

تسنیم کوثر کو لائنس کلب فیمنا پٹنہ کی جانب سے اپریسیشن (Appreciation) ایوارڈ

پٹنہ ۲۹/ جون ۹۶ء کو لائنس کلب فیمینا (Femina) پٹنہ کی جانب سے اپنے شعبوں میں نمایاں کارکردگی کے لیے جن چار خواتین کو ۹۵ - ۱۹۹۶ء کے اپریسیشن ایوارڈ سے نوازا گیا، ان میں نئی نسل کی ممتاز افسانہ نگار، دوردرشن کیندر اور آکاشوانی پٹنہ کی نیوز کاسٹر محترمہ تسنیم کوثر بھی شامل ہیں - یہ ایوارڈ جو ایک توصیفی سند، تمغہ اور مبلغ پانچ سو روپے کی رقم پر مشتمل تھا، ہوٹل چانکیہ کے شاندار دربار ہال میں منعقد ایک رنگا رنگ تقریب میں گورنر بہار عزت مآب ڈاکٹر اخلاق الرحمان قدوائی نے عطا کیا

لائنس کلب فیمینا کی سکریٹری مسز مِمو شنکر نے اپنی تقریر میں کہا کہ ٹیلیویژن اور ریڈیو نیوز کاسٹنگ میں تسنیم کوثر نے الفاظ اور آواز کی ہم آہنگی سے جو بلند معیار قائم کیا ہے اہل بہار و اس سے واقف ہیں - وہ ادب اور صحافت میں بھی کارہائے نمایاں انجام دے رہی ہیں - قومی یکجہتی پر مبنی ان کی سادی کہانی "ایک پودا تلسی کا" پر دیپانتر انعام دے چکی ہے - ان کے اردو افسانوی مجموعے "بولنسائی" کا ادبی حلقوں میں جس زبردست طریقے سے خیر مقدم کیا گیا، اس کی صدائے بازگشت انگریزی اور ہندی روزناموں میں بھی سنی گئی - مقامی روزنامہ "انقلاب جدید" میں انسانی زندگی کی کوتاہیوں اور کمزوریوں پر مبنی ان کا مقبول کالم "خدا جھوٹ نہ بلوائے" اصلاح معاشرہ کی طرف ایک مثبت کوشش ہے - ادب و ثقافت کے میدان میں ان کے اعتبار و اقتدار کے باعث مجھے فخر اور خوشی ہے کہ ہماری سلیکشن کمیٹی نے اس سال کے ایوارڈ کے لیے ان کا نام تجویز کیا -

ایوارڈ حاصل کرنے والی دوسری تین خواتین مسز گرلیس کور (اسٹیشن

ڈائرکٹر آل انڈیا ریڈیو پٹنہ)، مس پرتیبھا سنہا (سب انسپکٹرس آف پولیس) اور مس گیتا بوس (بیوٹیشن) ہیں - اس موقعہ پر مہمان خصوصی ڈاکٹر قدوائی کے علاوہ لائنس کلب کی صدر مسز سندھیا شرما نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا

مرسلہ ریحان غنی، پٹنہ

بقیہ آپ کی ڈاک

جن میں عمیق حنفی، محمود ایاز، باقر مہدی، محمد علوی، بمل کرشن اشک، مظہر امام، شاذ تمکنت، مخمور سعیدی، زبیر رضوی، خلیل مامون، کمار پاشی، صادق، عتیق اللہ، سلیم شہزاد، صلاح الدین پرویز، ساجدہ زیدی، زاہدہ زیدی، مظفر ایرج، قاضی سلیم، بشر نواز اور بلقیس ظفیر الحسن وغیرہ کے نام اہم ہیں -

انشاء کے تبصرے بے حد متوازن ہوتے ہیں، اس بار جگت موہن لال رواں اور ان کی شاعری (ڈاکٹر اشفاق عارف کا تحقیقی مقالہ) پر ڈاکٹر ظفر قدوائی اور بے زبانی کا ہنر (ڈاکٹر سجاد سید کی شعری کتاب) پر کوثر مظہری کے تبصرے پسند آئے -

سلیم انصاری، جبلپور

(xxxxx)

○ **جولائی** اگست ۱۹۹۶ء کے شمارہ میں جناب ہرچرن چاؤلہ کی ایک کہانی "گنگا کو واپسی" کی کہانی پڑھ کر بہت خوشی ہوئی - خدا کرے ان کا زور قلم اور زیادہ ہو - ہماری طرف سے ان کو دلی مبارکباد دیجئے - ہمیں فخر ہے کہ ہماری زبان کے ادب کی بین الاقوامی قدر شناسی ہو رہی ہے - اور اس کی عظمت کا اعتراف ہو رہا ہے -

جہاں ایک طرف "گنگا کو واپسی" کے بارے میں پڑھ کر خوشی ہوئی وہاں "ادارہ تعمیر ادب - لندن" کی تحریر پڑھ کر افسوس بھی ہوا - احمد ندیم قاسمی صاحب میرے پسندیدہ ادیب ہیں - میرے دل میں ان کے لیے بہت عزت ہے اور مجھے ان سے بہت عقیدت ہے - اس لیے ان "تین شعراء" میں ان کا نام دیکھ کر بہت دکھ ہوا - جذبات کو ٹھیس پہنچی -

جناب شاد باگل کوٹی کی کتاب "دوہا کلی" پر جناب ممتاز الحق کا تبصرہ مختصر مگر بہت ہی اچھا بے لاگ اور معتبر ہے - یہ تبصرہ پڑھتے وقت مجھے "دوہانجلی" پر ہی ایک اور تبصرہ یاد آگیا - یہ تبصرہ جناب رؤف خیر نے لکھا تھا - اور ماہنامہ سہیل کے جلد ۵۵ شمارہ ۱-۲ (۱۹۹۵ء) میں شائع ہوا تھا - یہ تبصرہ نہایت کم ظرف - تنگ نظر، کج بحثی اور متعصبانہ نقطۂ نظر سے لکھا گیا تھا -

رام پرکاش کپور، مدھیہ پردیش

آپ کی ڈاک

(قارئین کے خطوط)

[مراسلہ نگار کی رائے سے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے]

○ **انشاء** مارچ اپریل کا شمارہ بہت پسند آیا۔ زبان کی شائستگی، خیالات کی تہذیب اگر کہیں دیکھنا ہے تو انشاء کے اداریہ میں ہی نظر آتی ہے۔ کھیل کے میدان پر آپ کا تبصرہ نہایت موثر اور خوب ہے۔ اختر الایمان پر ہر چند کہ اختصار ہے لیکن اچھا احاطہ ہے۔ اگر اختر الایمان نمبر شائع کریں تو اچھا ہوگا۔ کیونکہ وہ اردو نظم کے نہایت بلند قامت شاعر ہیں۔ اور یہ کام انشاء ایسا ادبی جریدہ ہی کر سکتا ہے۔ ڈاکٹر شکیل الرحمن کا "مایر مامہ" کافی عمدہ مضمون ہے۔ اسی طرح مجتبی حسین پر نارنگ ساقی صاحب کا مختصر مضمون بھی پسند آیا۔ اختر ضیائی، خواجہ رضی حیدر اور شجاع خاور کی غزلیں بہت اچھی ہیں۔ رحمت امروہوی صاحب کا طرز انداز غالب بہت خوب لگا۔

حیدر طباطبائی، رطاسیہ

(xxxxx)

○ **جون** کا شمارہ پسند آیا۔ حضرت سید قاسم محمود صاحب کا مضمون "انسان کا مستقبل" عالمانہ شاہکار ہے، پرار معلومات ہے ان کی مزید کاوشوں کا انتظار رہے گا۔ "ولایت پاس" یعقوب مرزا کا افسانہ خوب ہے۔ مینگی سے کرسمس کیک لینے کے بعد روزی کے شکریہ کے الفاظ بڑے اچھے انداز میں ادا ہوئے ہیں۔ فاضل افسانہ نگار نے نہایت سلیقے سے ایک گالی کو الفاظ میں تحریر کی ہے ہر کیف نثر و نظم دونوں باب معیاری ہیں مبارکباد

شرف کمالی، کوٹھاور

(xxxxx)

○ **انشاء** مئی کا شمارہ موصول ہوگیا ہے حسب معمول نثر اور نظم اعلی اور دلچسپ ہیں۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کا شمشیر سنگھ شیر کی "نحریات" پر تبصرہ قابل ذکر ہے اور قابل تعریف۔ اور قطعات اور رباعیات یقیناً منفرد حیثیت کی حامل بلکہ حیران کن ہیں۔ شاعر اور تبصرہ نگار مبارکباد کے مستحق ہیں۔

خواجہ طارق محمود، رطاسیہ

○ **آپ** کی اس عنایت کے لیے شکرگزار ہوں کہ آپ نے مئی ۹۶ کے شمارے میں میری غزل کو اشاعت کے قابل تسلیم فرمایا۔ میری غزل کا مقطع اس طرح ہے ع "اس مسیحا سے تو بہتر ہے ستمگر شاہد" لیکن کاتب صاحب نے مسیحا کے بعد "ہے" زائد لکھ دیا ہے اسی طرح آپ کی غزل کے اس مصرع "ہر چہرے کی اوٹ میں ہم نے ہرجائی کو" میں شاید "پایا" یا "دیکھا" جو بھی آپ نے لکھا ہے چھوٹ گیا ہے۔ آپ کی غزلیں پسند ہیں۔

انشاء کے اسی شمارے میں ایک مضمون نگار جناب رئیس الدین فریدی صاحب نے صفحہ نمبر ۴۷ پر یہ انکشاف کیا ہے کہ "اقبال تراب جیتے تھے"۔ میں جناب رئیس الدین صاحب سے اس سلسلہ میں مزید معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔

محمد شاہد خاں، بچھ ور

(xxxxx)

○ **انشاء** معنوی طور پر بھی اور صوری طور پر بھی، بلاشبہ ایک اعلی رسالہ ہے۔ اس کے لیے وقت اور زر کے ساتھ ساتھ، مدیر اعلی کی سرشت میں ذوق استحسان کا وجود ناگزیر ہے۔ مبارک باد۔

حالیہ شمارے میں، کسم جین صاحبہ کا مضمون بہت کامیاب ہے۔ انہوں نے ہر چرن چاولہ صاحب کے اسلوب کا احاطہ خوب کیا ہے۔

مامون ایمن نیویارک

(xxxxx)

○ **انشاء** کا تازہ شمارہ ملا۔ ممنون ہوں کہ دفتری معاملات ختم ہو جانے کے بعد بھی آپ نے ذاتی تعلقات کا اعزاز قائم رکھا ہے۔ انشاء مجھے برابر مل رہا ہے۔

ہم سب جانتے ہیں کہ اردو کی ریڈر شپ گھٹ رہی ہے لیکن آپ کی اردو دوستی انشاء پڑھنے والوں کے ذوق کے احترام میں اس کی اشاعت کو جاری رکھے ہوئے ہے۔ یہ بلند ہمتی بھی ہے اور یقین محکم، عمل پیہم کا اظہار بھی!

ابھی تو اعلی تعلیم کی سطح پر اردو کی تدریس کا انتظام ہے۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں کے توسط سے اردو کے ڈاکٹر (پی۔ ایچ۔ ڈی) اور اساتذہ آج کل مل جاتے ہیں لیکن سوچئے، جب پرائمری لیول پر اردو کی تعلیم

نظر انداز ہوتی رہے گی (جیسا کہ سلسلہ بن چکا ہے) تو کیا دانشگاہوں میں بھی اردو کے شعبے بند نہیں ہوجائیں گے ؟ پرائمری سے گزر کر ہی سکنڈری اور اعلیٰ تعلیم تک پہنچا جاتا ہے۔

شخصیات پر مضامین پڑھنا مجھے پسند ہے اور پھر ان شخصیات کے بارے میں پڑھنا زیادہ اچھا لگتا ہے جن سے ملاقات ہوتی ہو یا ان سے شرف نیاز مندی جاری ہو۔ اس بار (شمارہ جون 96ء میں) آپ نے سعادت علی صدیقی اور ہرچرن چاولہ پر مضامین شائع کیے ہیں۔ دونوں ہی تاثراتی مضامین ہیں جو قاری کو گرفت میں لے لیتے ہیں۔ سعادت صاحب بڑی نفیس شخصیت کے مالک تھے۔ جس زمانے میں وہ دہلی یونیورسٹی سے ایم فل کر رہے تھے میں بھی شعبہ اردو میں ایک طالب علم تھا۔ سعادت صاحب سے ملاقات رہتی تھی۔ بلاشبہ وہ اردو کے ایک مخلص پرستار اور کھلے ذہن کے صاف دل شخص تھے۔ پروفیسر نثار احمد فاروقی نے اس پرخلوص شخصیت کی برسی پر اسے یاد کرکے ہم اردو والوں کو اس الزام سے بچایا ہے کہ ہم اپنے اردو دوستوں اور مہربانوں کو یاد نہیں کرتے۔

ہرچرن چاولہ پر شائع ہونے والا مضمون ہندی سے ترجمہ ہے مگر ترجمہ اتنا اچھا ہے کہ طبعزاد کا تاثر دیتا ہے۔ اس مضمون میں کسم جین نے چاولہ صاحب کے مزاج، برتاؤ، رویے اور نفسیات کا اچھا تجزیہ پیش کر دیا ہے وہ ان کی اچھی کہانیوں کی نشاندہی بھی کی ہے۔

اس شمارے میں یعقوب میرزا کا افسانہ "ولایت پاس" حاصے کی چیز ہے۔ اس افسانے کو پڑھ کر دل میں ایک کیل سی چبھ جاتی ہے لیکن نہ تو سچائی کو نظر انداز کیا جاسکتا ہے اور نہ حقیقت سے بچا جاسکتا ہے۔ یعقوب میرزا کا افسانہ ایک کڑوی سچائی کا اظہار ہے۔ بس یہی کہا جاسکتا ہے کہ جیسا دیس ویسا بھیس ۔ ظفر اوگانوی کے انتقال کے بارے میں جان کر افسوس ہوا۔ ایک صاحب علم، مخلص، ہمدرد اور اردو دوست اور چلا گیا۔ انا للہ

ایس۔ اے۔ رحمن، دہلی

ooooo

○ **انشاء** کا جون کا شمارہ قامت کہتر بہ قیمت بہتر کے مصداق صفحات کے باوجود اعلیٰ ادبی معیار رکھتا ہے۔ ہرچرن چاولہ کے فن اور حیات پر لکھا کسم جین کا مضمون نہ صرف چاولہ کی شخصیت اور فنی صلاحیتوں پر پوری روشنی ڈالتا ہے بلکہ کسی حد تک ان کی ذاتی زندگی کی تصویر بھی پیش کرتا ہے۔ "انسان کا مستقبل" ایک اعلیٰ پایہ کا سیر حاصل مضمون ہے جو اسلامی تعلیمات اور علم سائنس کے موازنے کے ساتھ ساتھ ان کے منطقی پہلو پیش کرتا ہے۔ ضیاء حسنی کا افسانہ کرب تنہائی اچھا ہے۔ پروفیسر نثار احمد فاروقی نے جناب سعادت علی صدیقی مرحوم کی حیات اور ادبی خدمات پر ہر پہلو سے روشنی ڈالی ہے۔ اردو دنیا میں نثار احمد فاروقی صاحب کی ہر بات کو درجہ استناد حاصل ہے۔

الفاظ کا جولائی / اگست کا شمارہ بھی مجھے موصول ہوگیا ہے۔ بیشتر حصہ پڑھ بھی لیا ہے۔ بخش لائلپوری صاحب نے اپریل ۱۹۹۶ء میں لندن میں منعقدہ مشاعرے پر گہرا اور زوردار طنز کیا ہے جو کلیتاً جائز ہے۔ انھوں نے پاکستان کے قدآور شاعر احمد فراز کی ہی زمین پر مذکورہ مشاعرے کی منظوم روداد طنزیہ انداز میں لکھ کر اپنے کمال فن کا مظاہرہ کیا ہے اور مذکورہ شاعروں کو درس عبرت دیا ہے میں بخش صاحب کی اس فنی کاوش پر انھیں مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ ہرچرن چاولہ صاحب نے اپنے مراسلے میں اپنی کہانی "گنگا کو واپسی" کے سلسلے میں بھارت کی دنیائے ادب کے ارباب بست و کشاد پر گہری چوٹیں کی ہیں۔ ان کا بیان برحق ہے۔ اس ملک میں اردو تخلیق کاروں کا جو حال ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں، ہر مرحلے پر ان کا استحصال ہوتا ہے اور ادیب خود نمائی کے جنون میں قدم قدم لٹتا ہے اور اس کی تخلیقی کاوشوں سے دوسرے لوگ استفادہ کرتے ہیں۔ کاتب سے لے کر پبلیشر، پریس، کاغذ فروش حتیٰ کہ جلد ساز تک اس کی تخلیقات سے ابھار رزق حاصل کرتے ہیں، اور وہ خالی ہاتھ بس اپنی تخلیقات شائع ہوجانے پر مطمئن اور خوش ہوتا ہے۔ ناروے جیسے چھوٹے ملک میں ادب اور ادیب کا کتنا احترام ہے اس ملک کے اشاعتی اجارہ داروں کو بھی اردو قلمکاروں کی زبوں حالی کی طرف دھیان دینا چاہیے اور سبق حاصل کرکے کسی حد تک تو ان کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ مقصود الہی شیخ کا افسانہ "غریب تماشہ" بہت پسند آیا۔ یہ مشرق اور مغرب کی تہذیبوں کی خوبصورت تقابلی تصویر پیش کرتا ہے قمر جہاں کی کہانی "محمد خوں" بھی اچھی ہے۔ بلبل کاشمیری اور عاصی کاشمیری کی شاعری میں وطن کی یاد اور غریب الوطنی کا کرب جھانکتا دکھائی دیتا ہے۔ شعری حصے میں غزلیں بھی معیاری ہیں۔ ادبی خبروں کی اشاعت الفاظ کا ایک مستحسن اقدام ہے۔

ہیرانند سوز، فرید آباد

ooooo

○ **اس** وقت میری میز پر جنوری عید نمبر سے جون ۹۶ء تک کے

رسائل موجود ہیں - اپنی شدید بیماری کی وجہ سے سب کے مطالعے سے تو قاصر رہا - لیکن جتنا دیکھا اور پڑھا اس کی جتنی تعریف کروں کم ہے - موضوعات کی بوقلمونی، مضامین کی نیرنگی - ہر صف اور ہر حلقے کے اہل قلم کی شمولیت، خوب سے خوب تر منظومات - مذہب سے سیاست اور سائنس تک کے مقالات غرض سب کو یکجا کرکے ایک ایسا گلدستہ آپ پیش کر رہے ہیں جو آج کے ادب کا مکمل منظر نامہ پیش کرتا ہے - کتابت، طباعت اور ٹائیٹل سادگی میں پرکاری کی مثال ہوتا ہے - اگر جائز تعریف کو برا نہ سمجھیں تو قبول کریں -

جون کے شمارے میں خاص طور پر مامون ایمن صاحب کی نعت پاک اور رتن چند اثر کی نظم "نقطۂ نظر" خاصے کی چیزیں ہیں - مضمون "انسان کا مستقبل" انتہائی اہم اور وقت کے تقاضے کے مطابق مضمون ہے - اگر یہ سلسلہ جاری رہے تو نہ صرف مسلمانوں کے لیے بلکہ اقوام عالم کے لیے بھی مشعل راہ بن سکتا ہے - جناب منصور عثمانی عبدالمتین جامی، صابر جوہری، ڈاکٹر مبارک انصاری کی غزلیں بہت پسند آئیں -

سید احمد سحر، شاہجہاں پور

(xxxx)

○ **اگست** ۹۶ء کا انشاء میرے زیر نظر ہے - حسب سابق بہت خوبصورت، بہت دیدہ زیب اور بہت پر کشش ہے - زیر نظر شمارے میں حصۂ نظم میں جناب عاصی کاشمیری، عفت زریں اور سیفی سرونجی کی غزلیات نے کافی متاثر کیا - افسانوں میں خورشید ملک، مقصود الٰہی شیخ اور قمر جہاں کے افسانے بہت خوب ہیں -

اخلاق سہسورتی، سہسوان

(xxxx)

○ **تازہ** شمارہ بہت اچھا ہے - عفت زریں کی غزلیں پسند آئیں ساتھ ہی جابر حسین کا مضمون بہت اچھا ہے -

فیاض رشک، دلاورپور، مونگیر

(xxxx)

○ **جولائی** اگست کا "انشاء" موصول ہوا - جیسا کہ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں رسالہ صوری اعتبار سے ماہ بہ ماہ نکھرتا جا رہا ہے - آپ نے رسالے کا جو مزاج بنایا ہے، وہ برقرار ہے - جو اس بات کا ثبوت ہے کہ آپ کے لکھنے والے آپ سے پوری طرح تعاون کر رہے ہیں -

مظہر امام، دہلی

(xxxx)

○ **انشاء** کا تازہ شمارہ پیش نظر ہے - آپ کا اداریہ "عالمگیریت کی مسلمہ حقیقت" الیکٹرانک میڈیا کے اس ترقی یافتہ عہد میں GLOBALISATION کے بدلتے ہوئے مفہوم اور اس کے منفی ؍ مثبت پہلو پر ایک ممکنہ بحث کا نقطۂ آغاز بن جانے کی صلاحیت رکھتا ہے -

مقصود الٰہی شیخ کا افسانہ "عبرت تماشہ" یورپ میں زوال پذیر تہذیبی قدروں کا عبرت آمیز منظر نامہ ہے - خورشید ملک کے افسانے "نمونہ بنام بیوی" کا مرکزی خیال عمدہ ہے، افسانے کی تکنیک اور اس کا بہاؤ بھی متاثر کرتا ہے لیکن افسانہ بغیر کسی CLIMAX کے بڑی خاموشی کے ساتھ ختم ہوگیا، جس سے افسانے کا سارا تاثر زائل ہوگیا -

پروفیسر جابر حسین نے بہار حسین آبادی کی بازیافت کرکے ایک نیک فریضہ انجام دیا ہے، جس کے لیے وہ بجا طور پر قابل مبارکباد ہیں - ہماری نسل کی بدنصیبی ہے کہ یہ بڑی آسانی سے اپنے LEGENDS کو فراموش کر دیتی ہے -

بہار حسین آبادی کا یہ شعر

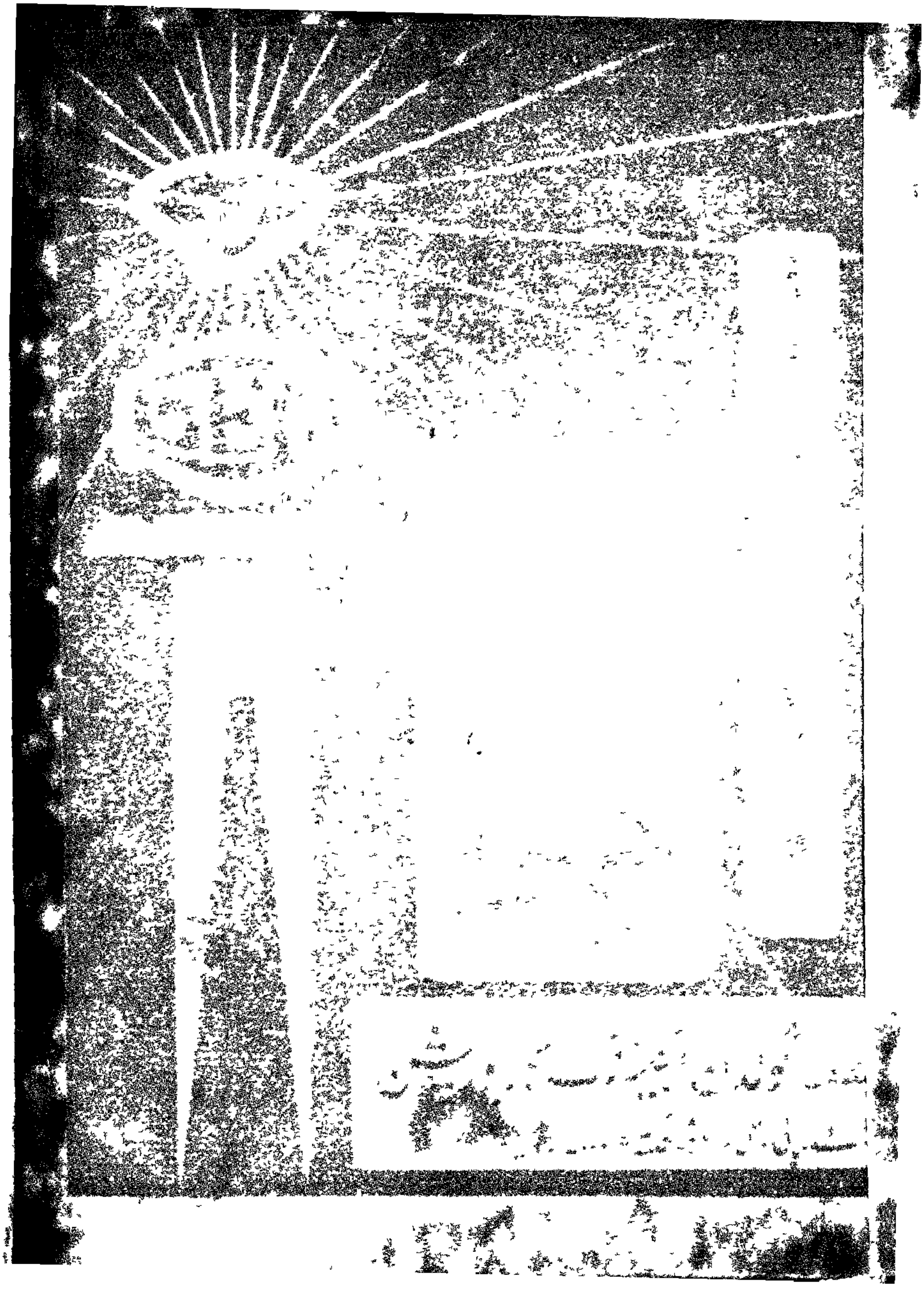
دامن نہ ان کے چھینٹ نہ پڑجائے اے بہار
سیدھا رکھو گلا رخ شمشیر کی طرف

آج بھی RELEVANT ہے -

برادرم جاوید انصاری کے مضمون "جدید اردو نظم" سے مجھے ذاتی طور پر اختلاف ہے - اول تو انھوں نے مضمون کے عنوان سے ہی انصاف نہیں کیا ہے، پھر مضمون کیا ہے اردو نظم کے سفر کا بے حد مختصر اور نامکمل اجمالی تعارف نامہ ہے - نہ جانے کیوں وہ جدید نظم کی اصطلاح کا اطلاق کسی دور سے اب تک کہی گئی تمام نظموں پر کرنا چاہتے ہیں - ان کا یہ جملہ "آزاد نظم میں شاعر بغیر کسی پابندی کے شاعرانہ جذبات مناسب اور موزوں الفاظ میں ادا کرتا ہے" بے حد گمراہ کن ہے - دراصل انھوں نے آزاد نظم کو ہر طرح سے آزاد سمجھ لیا ہے، جب کہ حقیقت اس کے برعکس ہے آزاد نظم بھی بحر کی پابند ہوتی ہے -

اس کے علاوہ انھوں نے دور حاضر کے جن معتبر جدید نظم گو شعراء کی فہرست مرتب کی ہے وہ قطعی نامکمل ہے - چند ایسے نظم گو شعراء کے نام چھوڑ دیئے گئے ہیں، جن کے بغیر جدید اردو نظم پر کوئی بھی گفتگو مکمل نہیں ہو سکتی -

بقیہ ۲۷ پر



Vol 11
Regd No D 162 85
Postal Regr No WB ... 5..

MAHNAMA INSHA
NOV DEC 96

ISSUE 11 12
R. N. I. Regn No 44083 86
ISSN 0971 6006

PRINTED AT INSHA PUBLICATIONS, 6-A KANAI SEAL ST., CAL-73
PRINTED PUBLISHED BY EDITOR & PUBLISHER ... AT FROM ... ZAKARIA ST. CAL 73